www.Ahlehaq.com

کو گمراہ کرے اور "کافروں" اور "فاجروں" کی تعریف کرکے اور ان کی اصلاح باطن اور قرب مدارج کا حکم لگا کر اپنے اوپر الزام لگائے جانے کا سبب بنتے بلکہ آنجناب کو تو یہ چاہیئے تھا، اور واجب تھا کہ ایسی جماعت کے عیوب اور برائیاں" تفصیل وار منظر عام پر لاتے تاکہ لوگ ان کی اقتدا اور ان کے ساتھ حسن ظن رکھنے سے باز رہتے اور گمراہی کے بھنور میں نہ پھنس جاتے بمطابق حدیث صحیح اُذْکُرُوا الْفَاسِقَ بِمَا فِیْهِ یَحْذَرُهُ النَّاسُ، (فاسق کا کچا چٹھا کھولو کہ لوگ اس سے دور بھاگیں)۔

اگر اسی قسم کی حقیر و معمولی دنیاوی اغراض ان پاک طینت حضرات کی نظر میں کوئی وقعت اور قدر و قیمت رکھتیں تو پھر جھوٹے مکر پیشہ اور دنیا طلب لوگوں میں جو ریاست و سیادت کی طمع میں اس قسم کے نازیبا امور کے مرتکب ہوتے ہیں اور خوشامد اور مفسدوں کی مدح سرائی میں جو ریاست میں لگے رہتے ہیں اور ان پاک باز، پاک طینت حضرات میں فرق ہی کیا رہ جاتا خدا جناب امیرؓ کے پاک دامن کو ان نجس دیاک دھبوں سے پاک صاف اور بچائے رکھے جو یہ نادان دوست غلط سلط تاویلات و توجیہات کے ذریعہ ان پر لگانے کے لئے ادھار کھائے بیٹھے ہیں،

اور بعض دوسرے عقلمندوں نے کہا ہے کہ اس عبارت سے آپ کا اشارہ کسی اور صحابی کی طرف تھا اور جو حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی موجودگی ہی میں فوت ہو گئے اور فتنہ رونما ہونے سے پیشتر ہی جہان سے سدھار گئے تھے۔ براوندی نے اسی قول کو پسند کیا اور اسی کو اختیار بھی کیا ہے،

واقعی ان لوگوں کی عقل و دانش پہ قربان ہو جانا چاہیئے جو بات کی خدا کی قسم لاجواب کی "

یہ لوگ تو آنکھ بند کرکے جو منہ میں آتا ہے کہہ جاتے ہیں مگر جس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے دانش و بینش اور عقل و شعور سے کچھ حصہ ملا ہے اسے تو بہر حال کوئی بات قبول یا رد کرنے میں غور و فکر ہی سے کام لینا چاہیئے اور اسی لئے ہم یہ دیکھیں گے کہ اوصاف مذکورہ در بیان جناب امیرؓ شخص مذکورہ پر منطبق ہوتے بھی ہیں یا نہیں،

اول تو یہ کہ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے عین حیات نزول وحی کا سلسلہ جاری تھا، آپ موجود تھے، تو اعمال کی ناہمواری، کجی کی درستی اور سنت کا قیام، یہ آپ کے علاوہ دوسرا کوئی کس استحقاق کی بنا پر کرتا اور کیوں کرتا اور اگر کرتا تو گمنام اور بے نشان کیوں رہتا، کسی کو اس کا نام و نشان کیوں معلوم نہیں ہوا اور کون عقلمند یہ بات باور کرلے گا، کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں ایک شخص مرے اور لوگوں کو مختلف اطراف میں پھٹنے والے چوراہے پہ چھوڑ جائے جو گمراہوں کی حیرانی کا باعث ہو تو اہل ہدایت کے لئے طلب یقین کا، حالانکہ پیغمبر صلے اللہ علیہ وسلم بنفس نفیس موجود ہیں، وحی کا نزول جاری ہے، فیض الٰہی دمبدم دین کی تکمیل اور نعمت کے اتمام میں شد و مد سے مصروف کار ! ۔

اور بعض امامیہ نے کہا ہے کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ کی غرض اس بیان سے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ پہ تعریض کرنا ہے اور اس بات پہ سرزنش کہ وہ شیخین رضی اللہ عنہما کی سیرت پہ نہ چلے اور ان کے زمانہ میں فتنہ و فساد پیدا ہوا یہ توجیہ و تاویل پچھلی دو توجیہات سے بھی زیادہ لچر و لغو ہے،

اول۔ تو اس وجہ سے کہ اگر تعریض ہی مقصود تھی تو اس سے بہتر عبارت سے بھی ہو سکتی تھی یہ دس قسم کے جھوٹ بیان کرنے کی کیا ضرورت تھی، دوسرے یہ کہ سیرت شیخین اگر پسندیدہ ہے تو ان کی خلافت

برحق ثابت ہو گئی اور اگر پسندیدہ نہیں تھی تو جناب عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو اس کے ترک پر سرزنش کیوں ہو رہی ہے، تیسرے اس عبارت سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شیخین رضی اللہ عنہما سے مخالفت ہرگز ظاہر نہیں ہوتی نہ ظاہراً نہ اشارۃً، پھر یہ کہ عبارات کوفہ کے خطبوں میں اس وقت بیان ہو رہی ہیں، جب نہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ موجود تھے نہ ان کو نشاد رنت ...، بلکہ ظاہر کیا اپنے زمانہ میں امور خلافت کے پورے طور پر سرانجام نہ پانے پر حسرت وافسوس ہے، اس خیال کے پیش نظر کہ خلیفہ اول رضی اللہ عنہ کی تدبیر تقدیر کے کیسے موافق رہی کہ سارے کام پوری آسانی سے بے کھٹکے ظہور پذیر ہوتے رہے،

اور پھر اگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی ڈانٹ ڈپٹ ہی مقصود تھی تو لاگ لپیٹ کے بغیر صاف صاف یوں کیوں نہ فرمایا کہ انہوں نے ایسا ایسا کیا، اور ایسا نہ کرنا چاہیے تھا،

کیونکہ اگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی توبیخ سے اگر کوئی خطرہ تھا تو وہ اہل شام ہی سے تھا کیونکہ وہی اپنے آپ کو ان کا مددگار کہتے تھے، اور وہ خطرہ تو دیسے خود ہی برسر رہا تھا اور پھر جب اہل شام حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل کی نسبت یقینی طور پر آنجناب رضی اللہ عنہ کی طرف کرتے تھے تو خطرہ کی کوئی بات ہی نہ تھی، بمصداق اس مثل کے کہ میں تو ڈوبا ہوا ہوں مجھے تری کا کیا ڈر!

اقوال عترت کے منجملہ ایک وہ قول بھی ہے جس کو امامیہ نے جناب ابی محمد حسن عسکری سے ان کی تفسیر میں نقل کیا ہے،

أنه قال عن النبي صلى الله عليه وسلم لما بعث الله موسى ابن عمران واصطفاه نجيا وفلق له البحر ونجى بني إسرائيل وأعطاه التوراة والألواح رأى مكانه من ربه عز وجل فقال يا رب لقد أكرمتني بكرامة لم تكرم بها أحدا قبلي فهل في أنبيائك عندك من هو أكرم مني فقال الله تعالى يا موسى أما علمت أن محمدا أفضل عندي من جميع خلقي فقال يا رب إن كان محمد أفضل عندك من جميع خلقك فهل في آل الأنبياء أكرم من آلي قال عز وجل يا موسى أما علمت أن فضل آل محمد على جميع آل النبيين كفضل محمد على جميع المرسلين فقال يا رب إن كان فضل آل محمد عندك كذلك فهل من صحابة الأنبياء أكرم عندك من أصحابي قال يا موسى أما علمت أن فضل صحابة محمد على صحابة جميع المرسلين كفضل آل محمد على آل جميع النبيين فقال

انہوں نے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے روایت کی کہ جب اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو مبعوث فرما کر اپنی ہمکلامی کے لئے انتخاب فرمایا ان کے لئے دریا میں راستے کھول دیئے۔ بنی اسرائیل کو نجات بخشی اور تختیوں کی شکل میں توریت عنایت فرمائی اور انہوں نے اپنے رب سے اپنا قرب جان لیا تو عرض کی کہ اے میرے رب تو نے مجھے وہ عزت بخشی جو مجھ سے پہلے کسی کو نہ بخشی تو کیا تیرے انبیا میں ایسا ہے جو مجھ سے زیادہ باعزت ہو؟ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے موسیٰ کیا تم کو معلوم نہیں کہ محمد میرے نزدیک تمام مخلوقات سے زیادہ افضل ہیں، حضرت موسیٰ نے کہا کہ اگر محمد تیرے نزدیک تمام مخلوقات سے افضل ہیں تو کیا انبیا کی اولاد میں کوئی ایسا ہے جو میری اولاد سے زیادہ بزرگ ہو تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا تم کو پتہ نہیں کہ محمد کی اولاد تمام انبیاء کی اولاد سے بزرگ تر ہے اس پر موسیٰ بولے کہ اگر محمد کی اولاد تیرے نزدیک

مُوسٰى إِنْ كَانَ فَضْلُ مُحَمَّدٍ وَآلِ مُحَمَّدٍ وَأَصْحَابِ مُحَمَّدٍ كَمَا وَصَفْتَ فَهَلْ فِي أُمَمِ الْأَنْبِيَاءِ أَفْضَلُ عِنْدَكَ مِنْ أُمَّتِي ظَلَّلْتُ عَلَيْهِمُ الْغَمَامَ وَأَنْزَلْتُ عَلَيْهِمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى وَفَلَقْتُ لَهُمُ الْبَحْرَ فَقَالَ اللّٰهُ يَا مُوسٰى إِنَّ فَضْلَ أُمَّةِ مُحَمَّدٍ عَلٰى أُمَمِ جَمِيعِ الْأَنْبِيَاءِ كَفَضْلِي عَلٰى خَلْقِي۔

ایسی افضل ہے تو کیا انبیاء کے ساتھیوں میں کوئی ایسا ہے کہ میرے ساتھیوں سے زیادہ باعزت ہو تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا تمکو خبر نہیں کہ محمد کے ساتھی تمام رسولوں کے ساتھیوں سے افضل ہیں جیسے ان کے اولاد تمام انبیا کی اولادوں سے، موسیٰ بولے کہ اگر محمد ان کی اولاد ان کے ساتھیوں کی فضیلت ایسی ہے جیسی آپ نے فرمائی تو انبیاء میں سے کسی کی امت ایسی ہے جو تیرے نزدیک میری امت سے افضل ہو جن پر تو نے ابر کا سایہ فرمایا ان پر من وسلویٰ نازل کیا اور دریا میں ان کے لئے راستے بنائے اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے موسیٰ محمد کی امت کی فضیلت تمام انبیا کی امتوں پر ایسی ہے جیسی میری ذات کی فضیلت تمام مخلوق پر۔"

اب ان بزرگ امام کی اس روایت، سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت کا دو طریقوں سے ثبوت ملتا ہے،

اول:۔ اس طرح کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے آپ کی مصاحبت از روئے کتاب واجماع اہل سنت وشیعہ قطعی الثبوت ہے جیسا کہ قرآن مجید میں ہے اِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ جب کہ انہوں نے اپنے ساتھی سے فرمایا تو غم نہ کر۔ اور یہاں سے صاحب سے مراد بالاجماع حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہی ہیں، اور پھر یہ بھی کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے آپ کی محبت، خصوصیت اور ہمرازی اس قدر مشہور زمانہ ہوئی کہ ہر خاص ساتھی اور محرم راز کو بطریق ضرب المثل ان ہی کی صفت سے یاد کیا جاتا ہے کہ فلاں فلاں کا رفیق غار ہے" لہذا ان کی افضلیت حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے تمام اصحاب پر صفت محبت میں ثابت ہو گئی اور یوں وہ کم از کم تمام انبیاء کے ساتھیوں سے تو قطعاً افضل ہوئے اور جو انبیاء کے تمام اصحاب میں افضل ہو وہ ہی خلافت وامامت کے لائق ہو گا اس لئے کہ ان میں بھی تو اس لیاقت وقابلیت کے بہت سے گزرے ہیں مثلاً کالب یوقنا جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اصحاب میں سے تھے۔ اور حضرت یوشع علیہ السلام کے بعد آپ کے خلیفہ ہوئے اور آصف بن برخیا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے اصحاب میں تھے اور اس قابلیت کے مالک،

اور اگر ان امور سے قطع نظر بھی کریں تو ان کے ہاتھ سے عام مسلمانوں پر ظلم چہ جائیکہ عترت رسول پر یا ان کے حقوق غصب کرنا تو سرزد ہو ہی نہیں سکتا ورنہ تو پھر افضلیت کہاں فضیلت بھی ہاتھ سے جاتی رہیگی،

دوم:۔ اس طرح کہ جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے صحابہ جملہ پیغمبروں کے اصحاب سے افضل قرار پائے تو اہل سنت رسول اللہ پر جور وظلم ان کی حق تلفی اور اس عالی قدر وعالی مرتبہ خاندان کی تحقیر واہانت وہ کس طرح کریں گے جب کہ سارے پیغمبروں کے اصحاب میں سے کسی نے ایسی حرکت کبھی نہ کی ہو،

اگر یہ حضرات دیگر انبیاء کے اصحاب کے ہم رتبہ بھی ہوتے تب بھی ضروری ہوتا کہ ایسے ناشائستہ کام ان سے سرزد نہ ہوں چہ جائیکہ ان سے افضل ہوں اور پھر بھی ان سے ان امور کا ارتکاب ہو۔

اس مرتبہ کے لحاظ سے امام فخرالدین رازی، رحمۃ اللہ علیہ کی ایک بحث بڑی دلچسپ اور ذہن نشین کرنیکے

www.Ahlehaq.com

www.Ahlehaq.com

لائق ہے۔ وہ فرماتے ہیں، کہ میرے نزدیک رافضیوں کا فرقہ عقل اور اپنے رسول کے ساتھ نیک اعتقادی میں حضرت سلیمان علیہ السلام کی چیونٹی سے بھی گیا گذرا ہے، کیونکہ اس چیونٹی نے تو اپنے ماتحت افراد سے یوں خطاب کیا، يَا أَيُّهَا النَّمْلُ ادْخُلُوا مَسَاكِنَكُمْ لَا يَحْطِمَنَّكُمْ سُلَيْمَانُ وَجُنُودُهُ وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ اے چیونٹیوں اپنے ٹھکانوں میں گھس جاؤ ایسا نہ ہو سلیمان اور ان کے لشکری ان جانے میں تم کو روند ڈالیں،

گویا وہ چیونٹی اتنا تو سمجھتی تھی کہ فوجی اور لشکری، ظلم و ستم ڈھانے میں جری بے باک اور بے دھڑک ہوتے ہیں، مگر سلیمان علیہ السلام کے فوجی ان کی صحبت کی تاثیر سے اتنے مہذب ہوگئے ہیں اور نبی کی سرسری سی صحبت ان پر اس حد تک اثر انداز ہوگئی ہے کہ دیدہ و دانستہ ایک چیونٹی پر بھی ظلم نہ کریں گے بلکہ پاؤں تلے بھی نہ روندیں گے اور یہ رافضی اشرف المخلوقات ہوتے ہوئے اتنا سمجھنے سے قاصر ہے کہ سرتاج الانبیاء حضرت خاتم المرسلین صلے اللہ علیہ وسلم کی صحبت ہمدم نے ان کے اصحاب حاضر باش اور آپ کے یار غار اور رفیق غمگسار پر اتنا بھی اثر نہ کیا ہو، اور خیانت، شرارت اور شیطنت ان سے مٹا ڈال ہو۔

کیا صحبت پیغمبر سے انہوں نے منفی اثر لیا تھا اور ناشائستہ باتوں سے دوسرے لوگوں کی نسبت ان پر زیادہ تسلط جمالیا تھا جو یہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی نور نظر ان کے داماد اور نواسوں کو بحالت بے کسی رنج پہنچاتے ان پر ظلم ڈھاتے ان کے گھروں کو نذر آتش کرتے اور ان کو بے وسیلہ و بے قدر کرتے ان کے باغ و زمین ضبط کرتے ان کے روزینے روکتے رہے اور ہمیشہ ان کی ایذا رسانی کی فکروں میں لگے رہے تفو برتو اے چرخ گردان تفو!

اقوال عترت میں سے ایک اور قول وہ ہے جس کو علی بن عیسیٰ اردبیلی امامی اثنا عشری نے اپنی کتاب کشف الغمہ عن معرفۃ الائمہ میں نقل کیا ہے۔

أَنَّهُ سُئِلَ الْإِمَامُ أَبُو جَعْفَرٍ عَلَيْهِ السَّلَامُ عَنْ حِلْيَةِ السَّيْفِ هَلْ يَجُوزُ فَقَالَ نَعَمْ قَدْ حَلَّى أَبُوبَكْرٍ الصِّدِّيقُ سَيْفَهُ بِالْفِضَّةِ فَقَالَ الرَّاوِي أَتَقُولُ هٰكَذَا فَوَثَبَ الْإِمَامُ عَنْ مَكَانِهِ فَقَالَ نَعَمْ صِدِّيقٌ نَعَمْ صِدِّيقٌ نَعَمْ صِدِّيقٌ فَمَنْ لَمْ يَقُلْ لَهُ الصِّدِّيقَ فَلَا صَدَّقَ اللّٰهُ قَوْلَهُ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ۔

جناب ابو جعفر سے تلوار کے زیور کے بارے میں سوال کیا گیا کہ وہ جائز ہے یا نہیں آپ نے فرمایا جائز ہے اس لئے کہ ابوبکر صدیق نے اپنی تلوار پر چاندی جڑوائی ہوئی تھی راوی نے حیرت سے پوچھا کیا آپ ایسا (یعنی صدیق) کہتے ہیں؟ یہ سن کر آپ اچھل پڑے، اور فرمایا ہاں صدیق ہاں صدیق ہاں صدیق! اور جس نے آپ کو صدیق نہ کہا اللہ اس کے قول کو دنیا و آخرت میں سچا نہ کرے،،

مذہب و دین اور قرآن کریم کے طے شدہ اصولوں کی روشنی میں انبیاء کے بعد صدیقین کا درجہ ہے اور یہ تمام امت میں افضل شمار ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس کے ثبوت میں آیات ذیل ملاحظہ ہوں،

فَأُولٰئِكَ مَعَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِينَ وَحَسُنَ أُولٰئِكَ رَفِيقًا۔

پس یہ ان لوگوں کے ساتھ ہیں جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا (وہ انعام یافتہ حضرات) انبیاء صدیق شہداء اور صالحین ہیں اور یہ بہت ہی اچھے ساتھی ہیں،

(۲)۔ مَا الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ إِلَّا رَسُولٌ وَأُمُّهُ

عیسیٰ بن مریم اور کچھ نہیں ہیں، مگر رسول اور ان

صِدِّيقَةٌ - کی والدہ صدیقہ ہیں،

(۳) - وَالَّذِيْنَ آمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصِّدِّيْقُوْنَ وَالشُّهَدَآءُ عِنْدَ رَبِّهِمْ لَهُمْ اَجْرُهُمْ -

اور جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں پہ ایمان لائے وہی اپنے رب کے نزدیک صدیق و شہداء ہیں، ان کے لئے ان کا اجر ہے،

اور اس افضلیت سے قطع نظر بہت سی دیگر آیات اور احادیث سے یہ یقینی طور پر ثابت ہے کہ صدیق کا لقب تعریفی لقب ہے جو باعتبار مرتبہ شہید و صالح سے برتر ہے قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے یوسف علیہ السلام کو یہ لقب دیا - یوسف ایھا الصدیق اور خود امامیہ کی کتابوں میں مروی اور ثابت ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خود اپنے لئے یہ لقب استعمال فرمایا - انا الصدیق الاکبر (میں صدیق اکبر ہوں) بلکہ مستقبل میں آنے والوں کے مقابلہ میں اسے اپنے اندر ہی منحصر قرار دیا، لا یقولھا بعدی الا کذاب (یہ لقب میرے بعد وہی استعمال کرے گا جو کذاب ہو گا) یہی سبب ہے کہ ائمہ نے اپنے لئے یہ لقب استعمال نہیں کیا اور کہیں استعمال ہوا بھی ہو تو وہ حقیقی معنی میں نہیں بلکہ بطور مجاز ہو گا،

اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے من بعدی فرمایا اس سے صاف طور پر معلوم ہے کہ آپ کے علم میں یہ بات تھی کہ اس امت میں آپ سے پہلے بھی کوئی صدیق گذر چکا ہے جس کا یہ لقب مشہور تھا اور اس کی صفت صدیقیت برحق اور قابل تسلیم تھی،

اگر کوئی یہ کہے کہ انحصار صدیقیت پر نہیں، اکبریت پر ہے، کہ کوئی صدیق تو ہو سکتا ہے مگر مجھ سے اکبر نہیں ہو گا، تو اس کے باوجود بھی لفظ بَعْدِیْ سے صدیقیت کبریٰ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ہی کے لئے قرار پاتی ہے،

حاصل کلام یہ کہ جس شخص کے لئے "امام معصوم" لفظ صالح استعمال فرمائیں تو جور و فسق، ظلم و غضب کا احتمال اس شخص صالح سے بالکل جاتا رہتا ہے ایسا نہ ہو تو "امام معصوم" پہ دروغ گوئی کا الزام آئے گا۔

اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ جس کسی شخص کو ایک "امام معصوم" نے اس قدر شدید تاکید سے نہ صرف صدیق کہا ہی ہو، بلکہ اس کی صدیقیت کا اعتقاد تمام مکلف مخلوق پر واجب قرار دیا ہو اور اس کا انکار کرنے والے کو بددعا دی ہو تو ایسے شخص کے متعلق کیا خیال اور کیا گمان کرنا چاہیئے،

اگر ایسے شخص کی امامت و خلافت نہ مانی جائے یا ان کے متعلق یہ عقیدہ رکھا جائے کہ انہوں نے حقدار امامت (بزعم خود) کی امامت غصب کر لی تو یہ تو ان کی صدیقیت کا انکار ہو گا اور اس سے تو امام معصوم کی بددعا میں شریک ہو جائیں گے۔

علمائے امامیہ اس روایت کی بحث سے زچ اور لاجواب ہو کر اب اس کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتے کہ اس روایت ہی سے انکار کر دیں کیونکہ اس روایت کو تقیہ پر محمول کر کے بھی پیچھا نہیں چھوٹے گا۔ کیونکہ کشف الغمہ کوئی نایاب کتاب نہیں جہاں تہاں دستیاب ہے اور اگر کوئی تعصب و عناد سے مجبور ہو کر کسی ایک کتاب (یا ایک ایڈیشن) سے اس روایت کو حذف بھی کر دے تو دوسرے نسخے (اور سابقہ ایڈیشن) اس کی خود تردید کریں گے،

www.Ahlehaq.com

www.Ahlehaq.com

پیچھا چھوٹنے کی البتہ ایک صورت ہو سکتی ہے کہ چونکہ اہل سنت نے بھی اپنی کتابوں میں یہ روایت بیان کی ہے، اس لئے فرقہ امامیہ کے پرہیز گار علماء، شریک روایت علماء اہل سنت کی کم مائیگی علم (یعنی اپنے مقابلہ میں ہیٹا سمجھ کر) روایت سے انکار کر دیں تو ان سے یہ کچھ بعید بھی نہیں، مگر یہ ذہن نشین کر لیں کہ پھر اس اصول کی تمام دینی اور شرعی امور میں پابندی کرنی ہوگی، اور یوں ان کا کلمہ، نماز اور بہت سے امور شرع اس انکار کی نذر ہو کر ختم ہو جائیں گے، اور ان سے متعلق ساری روایات سے دست بردار ہونا پڑے گا کیونکہ ان میں بھی اہل سنت شریک روایت ہیں،

چنانچہ روایت بالا کو اہل سنت میں سے دار قطنی نے سالم بن ابی حفصہ سے روایت کیا ہے کہ اس نے کہا۔

دَخَلْتُ عَلٰی اَبِیْ جَعْفَرٍ فَقَالَ اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَتَوَلّٰی اَبَا بَکْرٍ وَ عُمَرَ۔ اَللّٰھُمَّ اِنْ کَانَ فِیْ نَفْسِیْ غَیْرَ ذَالِکَ فَلَا نَالَتْنِیْ شَفَاعَۃُ مُحَمَّدٍ صلی اللہ علیہ وسلم یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ قَالَ سَالِمٌ اُرَاہُ قَالَ ذَالِکَ مِنْ اَجْلِیْ۔

جب میں ابی جعفر (رحمۃ اللہ علیہ) کی خدمت میں حاضر تھا تو آپ نے فرمایا اے اللہ (تو گواہ رہ) میں ابو بکر و عمر (رضی اللہ عنہما) سے محبت رکھتا ہوں اے اللہ اگر میرے دل میں اس کے علاوہ کوئی اور جذبہ پایا جائے ہو تو قیامت کے دن محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی شفاعت سے مجھے محروم رکھ سالم کہتا ہے کہ میرا خیال ہے آپ نے ایسا میری وجہ سے کہا،

تمام محدثین کا اتفاق ہے کہ یہ سالم بن ابی حفصہ شیعہ تھا، اور یہ روایت بھی اس کی شیعیت کو ثابت کرتی ہے، اور جناب ابو جعفر رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو سنانے کے لئے ہی یہ الفاظ فرمائے کہ ممکن ہے یہ میرے خیالات اور عقائد سن کر ہی اپنے غلط و بے کار عقیدہ اور گمان باطل سے تائب ہو جائے،

یہ روایت یہاں اس غرض سے بیان کی گئی ہے کہ جناب امام کے کلام میں تقیہ کا احتمال نہ رہے کیونکہ یہاں آنجناب نے اس سلسلہ میں شرط و جزاء ذکر کر کے اپنے خدا سے اپنے لئے کفر کی دعا فرمائی اس لئے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی شفاعت سے بالاجماع کافر ہی محروم ہوگا اور امام معصوم کی دعا مقبول ہی ہوتی ہے، اگر شرط پوری ہو جائے تو جزا پوری ہونے میں کوئی شک ہی نہیں رہتا:

اب اسی امر زیر بحث پر اہل سنت کی روایات ملاحظہ فرمائیے!

دار قطنی نے عروہ بن عبد اللہ سے روایت کی ہے،

قَالَ سَاَلْتُ اَبَا جَعْفَرٍ عَنْ حِلْیَۃِ السَّیْفِ فَقَالَ لَا بَاْسَ فَقَدْ حَلّٰی اَبُوْ بَکْرِ الصِّدِّیْقُ سَیْفَہٗ قَالَ قُلْتُ تَقُوْلُ الصِّدِّیْقُ قَالَ نَعَمْ صِدِّیْقٌ نَعَمْ صِدِّیْقٌ نَعَمْ صِدِّیْقٌ مَنْ لَّمْ یَقُلِ الصِّدِّیْقُ فَلَا صَدَّقَ قَوْلَہٗ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ۔

کہتا ہے میں نے ابی جعفر سے تلوار کے زیور کے بارے میں پوچھا، آپ نے فرمایا کوئی حرج نہیں کیونکہ ابو بکر صدیق نے اپنی تلوار پر جڑاؤ کرایا تھا، میں نے آپ سے کہا آپ ان کو صدیق کہہ رہے ہیں، فرمایا ہاں صدیق ہاں صدیق ہاں صدیق (اور) ہاں صدیق جو ان کو صدیق نہ کہے، دنیا و آخرت میں اس کے قول کی کوئی تصدیق نہ کرے گا،

اور علامہ ابن جوزی رحمہ کی کتاب صفوۃ الصفوہ میں جو روایت بیان ہوئی ہے اس میں یہ الفاظ زائد ہیں فَوَثَبَ وَثْبَةً وَّاسْتَقْبَلَ الْقِبْلَةَ " (پس وہ اچھل پڑے اور قبلہ رخ ہو کر لہٰذا یہ روایت جو کشف الغمہ کی روایت کے مطابق ہے بددعا کو ظاہر کرتی ہے، اور تقیہ کی کوئی گنجائش نہیں رکھتی،

اور شیعوں کے نزدیک یہ بات طے شدہ ہے کہ جناب ابو جعفر اور جناب جعفر صادق رحمہما اللہ سونے کی مہروں سے مہر شدہ کتاب کی رو سے تقیہ سے روک دیئے گئے تھے، اس لئے ان کی روایات کو تقیہ پر محمول نہیں کیا جاسکتا اور یہ بات انشاء اللہ اپنے موقعہ پر ان کی معتبر کتابوں کے حوالہ سے بیان کی جائے گی،

اور دار قطنی ہی نے ایک اور روایت جناب ابی عبد اللہ ابن محمد بن صادق کے حوالہ سے بھی بیان کی ہے جو انہوں نے اپنے والد محترم سے بیان کی ہے،

اَنَّ رَجُلًا جَاءَ اِلٰی اَبِیْہِ زَیْنِ الْعَابِدِیْنَ عَلِیِّ ابْنِ الْحُسَیْنِ فَقَالَ اَخْبِرْنِیْ عَنْ اَبِیْ بَکْرٍ وَّعُمَرَ فَقَالَ عَنِ الصِّدِّیْقِ قَالَ وَتُسَمِّیْہِ الصِّدِّیْقَ قَالَ فَلِلّٰہِ ثَکِلَتْکَ اُمُّکَ قَدْ سَمَّاہُ الصِّدِّیْقَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَالْمُهَاجِرُوْنَ وَالْاَنْصَارُ وَمَنْ لَّمْ یُسَمِّہٖ صِدِّیْقًا فَلَا صَدَّقَ اللّٰہُ قَوْلَہٗ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ اِذْهَبْ فَاَحِبَّ اَبَا بَکْرٍ وَّعُمَرَ۔

ایک شخص میرے والد زین العابدین رحمہ اللہ کے پاس آکر بولا مجھے ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کے متعلق کچھ بتایئے آپ نے کہا صدیق کے بارے میں؟ وہ بولا آپ بھی انہیں صدیق کہتے ہیں۔ آپ نے فرمایا تجھے تیری ماں روئے، خدا کی قسم ان کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے صدیق کا لقب دیا اور مہاجرین و انصار نے ان کو صدیق نام سے پکارا، اور جو ان کو صدیق نہ کہے اللہ اس کے قول کو دنیا و آخرت میں سچا نہ کرے جا اور ابو بکر و عمر سے محبت کر (رضی اللہ عنہما)۔

اب جب اس مسئلہ میں واضح و صاف آیات اور عترت پاک کے غیر مبہم اقوال کے بیان سے فارغ ہو چکے تو بجائے اس کے کہ نتیجہ مرتب کرنے کے لئے مقدمات کی ترکیب یا اشکال کی ترتیب میں لکھیں جو اس مدعا پر دلالت کرتے ہیں لگے ہاتھوں بعض ایسے دلائل بھی یہاں ذکر کئے دیتے ہیں، جو قرآن و سنت سے ماخوذ ہیں اور ادنیٰ تامل و تفکر سے ناظر و قاری کو مقصد و مدعا تک پہنچا دیتے ہیں،

(۱) اللہ تعالیٰ نے صحابہؓ کی اس جماعت کو جو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے خلیفہ بننے کے وقت موجود تھی اور امور خلافت میں آپ کی معین و مددگار تھی، مختلف القابات سے سرفراز فرمایا کہیں انہیں اُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَائِزُوْنَ (وہی کامیاب و کامگار ہیں، فرمایا تو کہیں رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ (اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے) ایک جگہ جنت کے وعدے اور اجر عظیم کی خوشخبری کا شرف بخشا تو دوسری جگہ بلندی درجات اور اپنی رحمت و عنایت اور رضامندی کی بشارت سے خوشدل!

اب بھلا کوئی یہ بتائے۔ کہ ایسی معزز، مکرم اور انعامات الٰہیہ کی مورد، اور جنت اور رضا الٰہی کی حقدار جماعت کسی ایسی بات پر متفق ہونے کا سوچ بھی سکتی ہے جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے حکم کے صریح مخالف ہو اور اس سے آپ کا عہد ٹوٹتا ہو، ہرگز نہیں، وہ تو ایسی کسی بات کا تصور تک نہیں کر سکتی، جو قرآنی بشارات کی تکذیب یا رسول اللہ کے کسی ادنیٰ حکم کی نافرمانی کا موجب بنے!

www.Ahlehaq.com

(۲) صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کی توصیف میں اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں یہ الفاظ فرمائے،

حَبَّبَ إِلَيْكُمُ الْإِيمَانَ وَزَيَّنَهُ فِي قُلُوبِكُمْ وَكَرَّهَ إِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوقَ وَالْعِصْيَانَ۔

تمہارے دلوں میں ایمان کی محبت پیوست کردی تمہارے دلوں کو اس سے مزین و روشن کیا اور کفر بدکاری و بدعملی اور گناہ کی نفرت و کراہت تمہارے دل میں ڈال دی۔

اب اسے کون مان سکتا ہے کہ اس شان کے افراد با جماعت باہم متفق ہو کر کفر و فسق اور عصیان کا ارتکاب کریں گے اور یہ ایک دو دن ماہ، سال نہیں بلکہ زندگی بھر ایسا ہی کرنے پر بضد رہیں گے،

(۳) تقسیم فئے والی آیت میں فقراء مہاجرین کے ذکر کے بعد اولئک ھم الصادقون (وہی سچے ہیں) فرمایا ہے، اور سارے ہی مہاجرین حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا خلیفہ کہتے تھے اب اگر کوئی ان کو خلیفہ برحق نہ مانتے تو گویا وہ ان مہاجرین کو جھوٹا کہتا ہے جن کو خدا نے سچا کہا تھا، (اب وہ اپنی اوقات خود پہچان لے)۔

(۴) حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے ان حضرات نے بیعت کی تھی جو دینی معاملات میں اپنے بیٹوں بھائیوں باپوں اور عزیز و اقارب کسی کا بھی پاس ولحاظ نہ کرتے تھے، موقع آتا تو دینی تقاضے کی خاطر اپنے پیاروں کو اپنے ہاتھ سے جام مرگ پلا دیتے تھے، جہاد کی سختیوں پر وہ صابر تھے مشقت برداشت کرتے تھے، کسی مخالفت سے نہ ڈرتے نہ دبتے! اور دین کی خاطر اور اللہ کے کلمہ کو بلند کرنے کیلئے بار بار اپنی جان ہتھیلی پر رکھے دشمن کے رو در رو ہوتے۔ اور یہ خواہش کرتے کہ اللہ تعالیٰ یہ جان کا نذرانہ قبول کرے اور دشمن کا کوئی وار کام کر جائے،

اور یہ سب وہ ہیں جن کی خود امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے خطبات میں شہادت دی ہے، جو انشاء اللہ باب مطاعن الصحابہ میں بیان ہونگی ایسی حالت اور اوصاف والی جماعت اگر کسی بات پر اتفاق کرے تو یقیناً وہ امر خلاف شرع ہرگز نہیں ہوگا،

(۵) حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت پر تمام صحابہ نے اتفاق کیا اور جس بات پر تمام صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اتفاق کر لیں، وہ حق ہے اور اس کے خلاف بات باطل ہوگی، اس دلیل کی پختگی کے لئے اب امیر المومنین رضی اللہ عنہ کا وہ کلام ملاحظہ کریں جو نہج البلاغہ جیسی کتاب میں جسے تمام شیعہ بہت ہی معتبر و صحیح سمجھتے ہیں روایت کیا گیا ہے، آپ نے ایک گفتگو کے دوران فرمایا۔

اَلْزِمُوا السَّوَادَ الْأَعْظَمَ فَإِنَّ يَدَ اللّٰهِ عَلَى الْجَمَاعَةِ وَإِيَّاكُمْ وَالْفُرْقَةَ فَإِنَّ الشَّاذَّ مِنَ النَّاسِ لِلشَّيْطَانِ كَمَا أَنَّ الشَّاذَّ مِنَ الْغَنَمِ لِلذِّئْبِ،

سواد اعظم میں شامل رہو کہ جماعت پر اللہ کا ہاتھ ہوتا ہے۔ اور دیکھو پھوٹ اور تفرقہ سے بہت بچو کیونکہ جماعت سے بچھڑ کر اکیلا رہ جانے والا شیطان کا ایسا ہی شکار ہے جیسے ریوڑ سے علیحدہ ہو جانے والی بکری بھیڑیئے کا،

نہج البلاغہ کی جو شرح امامیہ نے لکھی ہے اس میں تحریر ہے کہ امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کے

www.Ahlehaq.com

www.Ahlehaq.com

متعلق یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچی ہے، کہ آپ نے جناب معاویہ رضی اللہ عنہ کو یہ تحریر ارسال کی۔

أَلَا إِنَّ لِلنَّاسِ جَمَاعَةً يَدُ اللّٰهِ عَلَيْهَا وَغَضَبُ اللّٰهِ عَلٰى مَنْ خَالَفَهَا فَنَفْسَكَ نَفْسَكَ قَبْلَ حُلُوْلِ الْغَضَبِ۔ — آگاہ رہو کہ لوگوں کی جمعیت پر اللہ کا ہاتھ ہوتا ہے اور اس جماعت کے مخالف پر اللہ کا غضب پس اپنے آپ کو اس کا غضب نازل ہونے سے پہلے بچا لو۔

اس کا کچھ حصہ رضی شریف نے بھی نقل کیا مگر (اپنی عادت سے مجبور ہو کر) اس کا بالائی حصہ کھا گیا ہے، کیونکہ وہ اس کے مذہب سے ٹکراتا تھا، جو سراسر تفرقہ پہ مبنی ہے، اور اس کا آخری حصہ بیان کر دیا ہے کہ۔

إِتَّقِ اللّٰهَ فِيْمَا لَدَيْكَ وَانْظُرْ فِيْ حَقِّهِ عَلَيْكَ۔ — جو تمہارے قبضہ میں ہے، اس کے بارے میں اللہ سے ڈرو اور اس کا حق جو تم پر ہے ذرا دھیان سے اس کی دیکھ بھال کرو،

اور انہیں امامیہ و معتزلہ کی شروح نہج البلاغہ میں جناب معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف لکھے ہوئے خطوط میں سے ایک خط کا مضمون یہ ہے،

مَا كُنْتُ إِلَّا رَجُلًا مِّنَ الْمُهَاجِرِيْنَ أَوْرَدْتُ كَمَا أَوْرَدُوْا وَأَصْدَرْتُ كَمَا أَصْدَرُوْا۔ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَجْمَعَهُمْ عَلَى الضَّلَالِ۔ — میں بھی مہاجرین کا ایک فرد تھا، جیسے وہ آئے میں بھی آیا اور جیسے وہ لوٹے میں بھی لوٹا۔ اور ان کو اللہ تعالیٰ ضلالت و گمراہی پر اکٹھا نہیں کرے گا،

رضی نے پورے خط کو باقی رکھ کر کسی ایک جگہ نقل نہیں کیا، بلکہ اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے کسی کو کہیں کسی کو کہیں، بیان کیا۔ اسی خط کے ایک ٹکڑے کو اس نے نہج البلاغہ میں یوں درج کیا ہے،

أَمَّا بَعْدُ، فَقَدْ وَرَدَ عَلَيَّ كِتَابُ امْرِئٍ لَيْسَ لَهُ بَصَرٌ يَهْدِيْهِ وَلَا قَائِدٌ يُرْشِدُهُ۔ — میرے پاس ایک ایسے شخص کا خط آیا ہے جس کے پاس نہ آنکھیں کہ راستہ دیکھ سکے نہ اس کا کوئی راہبر ہے جو اس کو راستہ پر لگائے،

اور اسی خط کو ایک نئے خط کا سرنامہ بنا دیا اور اس کی یہی عادت اور فطرت ہے یہ شخص جناب امیر رضی اللہ عنہ کے خطبوں اور خطوں کا یہی حشر کرتا ہے اپنے مذہب کے مطابق ان کی قطع برید کر کے ان کا حلیہ بگاڑتا اور ان کی تحریف کرتا ہے،

(۶) حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جب حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے گذشتہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم سے متعلق استفسار کیا گیا تو آپ ان کا وہ وصف بیان فرمایا جو ولایت کو لازم ہے، آپ نے فرمایا۔

كَانُوْا إِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ هَمَلَتْ أَعْيُنُهُمْ — ان کا حال یہ تھا کہ جب ان کے سامنے ذکر الٰہی

www.Ahlehaq.com

حتی تبتل جباههم ماءً وکما یمیل الشجر یوم الریح العاصف خوفاً من العقاب ورجاءً

کیا جاتا تو ان کی آنکھیں برس پڑتیں حتیٰ کہ ان کے جبڑے تر ہو جاتے اور وہ خوف عتاب اور امید ثواب سے اس طرح کانپنے لگتے جس طرح سخت آندھی میں درخت جنبش کرتا ہے،

پھر ایک اور مرتبہ انہیں حضرات صحابہ کے متعلق فرمایا،

احب اللقاء الیهم لقاء الله وانهم یتقلبون علی مثل الجمر فی ذکر معادهم

ان کو سب سے محبوب چیز اللہ سے ملاقات تھی اور وہ آخرت کے ذکر پر چنگاری کی طرح پہلو بدلتے تھے بے چینی کا اظہار کرتے تھے،

تو ایسی جماعت یا اس کے ایک فرد کا کسی باطل امر یا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے کسی حکم کے خلاف اصرار کرنا محالات میں سے ہے،

(۷)، صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی خلافت کا ایک ثبوت اس جماعت کا آپ کی بیعت کرنا ہے، جنکی تعریف میں جناب سجاد رحمۃ اللہ علیہ صحیفہ کاملہ کی دعاؤں میں بھی اللہ تعالیٰ کی جناب میں مناجات کرتے وقت کہ جو بندگان خاص کے ساتھ راز و نیاز کا وقت ہے رطب اللسان ہیں، بلکہ ان کے متبعین کے حق میں بھی طویل طویل دعائیں ان الفاظ میں فرماتے تھے،

اللهم واوصل الی التابعین لهم باحسان الذین یقولون ربنا اغفر لنا ولاخواننا الذین سبقونا بالایمان خیر جزائک الذین قصدوا سمتهم وتحروا وجهتهم ومضوا فی قفو آثارهم والایتمام بهدایة منارهم یدینون بدینهم علی شاکلتهم لم یثنهم ریب فی قصدهم ولم یختلج منه،

اے اللہ ان کے ان متبعین کو بہترین صلہ اور جزا عطا فرما جنہوں نے اخلاص کے ساتھ ان کی پیروی کی اور جو اپنی دعاؤں میں کہتے تھے اے ہمارے رب ہماری اور ہمارے ان بھائیوں کی جو ایمان کے ساتھ ہم سے پہلے گذرے مغفرت فرما، جنہوں نے اپنا رخ ان کے رخ پر رکھا اور ان کی طرف کا قصد رکھا اور ان کے نشان قدم پر چلے اور ان کی قائم کردہ علامات ہدایت کو قبول کیا انہیں کے طریقہ پر ان کا دین اختیار کیا کوئی شک ان کو نہ اپنے ارادہ سے باز رکھ سکتا تھا، اور نہ ہی کوئی شک ان کے دل میں کھٹکتا تھا۔ الیٰ آخرہ،،

اب امام معصوم" جن کے متعلق اپنی تعریف فرمائیں اور وہ بھی اللہ تعالیٰ کی جناب میں مناجات کے وقت جو پوشیدہ باتوں کا جاننے والا ہے، کہ ایسے وقت تقیہ کا خیال بھی کفر اور باطل پر اصرار ہے تو ان کے مراتب کا کیا ٹھکانا۔

اس لئے کہ امام کے متعلق یہ سوچنا اور خیال کرنا محال و ممتنع ہے کہ انہوں نے حق کو چھپایا یا باروداری برتی ہو اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے خاندان پر ظلم و غضب کو روا رکھا ہوا۔

(۸)، کلینی نے باب السبق الی الایمان میں بحوالہ ابو عمر زبیری جناب ابی عبداللہ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے

قلت لابی عبد الله ان للایمان درجات ومنازل یتفاضل المؤمنون فیها عند الله قال

میں نے ابی عبداللہ سے پوچھا کہ کیا ایمان کے بھی درجے اور مرتبے ہوتے ہیں، کہ اس کی وجہ سے مومنین اللہ تعا

نَعَمْ قُلْتُ صِفْهُ لِي رَحِمَكَ اللهُ حَتّٰى أَفْهَمَهُ قَالَ إِنَّ اللهَ سَبَقَ بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ كَمَا يُسْتَبَقُ بَيْنَ الْخَيْلِ يَوْمَ الرِّهَانِ ثُمَّ فَضَّلَهُمْ عَلٰى دَرَجَاتِهِمْ فِي السَّبْقِ فَجَعَلَ كُلَّ امْرِئٍ مِنْهُمْ عَلٰى دَرَجَةِ سَبْقِهِ لَا يَنْقُصُهُ فِيْهَا مِنْ حَقِّهِ وَلَا يَتَقَدَّمُ مَسْبُوْقٌ سَابِقًا وَلَا مَفْضُوْلٌ فَاضِلًا تَفَاضَلَ بِذٰلِكَ أَوَائِلُ الْأُمَّةِ وَأَوَاخِرُهَا وَلَوْ لَمْ يَكُنْ لِلسَّابِقِ إِلَى الْإِيْمَانِ فَضْلٌ عَلَى الْمَسْبُوْقِ إِذًا لَلَحِقَ آخِرُ هٰذِهِ الْأُمَّةِ أَوَّلَهَا نَعَمْ وَلَتَقَدَّمُوْهُمْ إِذَا لَمْ يَكُنْ لِمَنْ سَبَقَ إِلَى الْإِيْمَانِ الْفَضْلُ عَلٰى مَنْ أَبْطَأَ عَنْهُ وَلٰكِنْ بِدَرَجَاتِ الْإِيْمَانِ قَدَّمَ اللهُ السَّابِقِيْنَ وَبِالْإِبْطَاءِ عَنِ الْإِيْمَانِ أَخَّرَ اللهُ الْمُقَصِّرِيْنَ لِأَنَّا نَجِدُ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ مِنَ الْآخِرِيْنَ مَنْ هُوَ أَكْثَرُ عَمَلًا مِنَ الْأَوَّلِيْنَ وَأَكْثَرُهُمْ صَلٰوةً وَصَوْمًا وَحَجًّا وَزَكٰوةً وَجِهَادًا وَإِنْفَاقًا وَلَوْ لَمْ يَكُنْ سَوَابِقُ يُفَضَّلُ بِهَا الْمُؤْمِنُوْنَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا عِنْدَ اللهِ لَكَانَ الْآخِرُوْنَ بِكَثْرَةِ الْعَمَلِ مُقَدَّمِيْنَ عَلَى الْأَوَّلِيْنَ وَلٰكِنْ أَبَى اللهُ عَزَّ وَجَلَّ أَنْ يُدْرِكَ آخِرُ دَرَجَاتِ الْإِيْمَانِ أَوَّلَهَا وَيُقَدَّمَ فِيْهَا مَنْ أَخَّرَ اللهُ أَوْ يُؤَخَّرَ فِيْهَا مَنْ قَدَّمَ اللهُ قُلْتُ أَخْبِرْنِي عَمَّا نَدَبَ اللهُ عَزَّ وَجَلَّ الْمُؤْمِنِيْنَ إِلَيْهِ مِنَ الْاِسْتِبَاقِ إِلَى الْإِيْمَانِ فَقَالَ قَوْلُ اللهِ عَزَّ وَجَلَّ وَسَابِقُوْا إِلٰى مَغْفِرَةٍ مِنْ رَبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْأَرْضُ أُعِدَّتْ لِلَّذِيْنَ آمَنُوْا بِاللهِ وَرُسُلِهِ وَقَالَ وَالسَّابِقُوْنَ السَّابِقُوْنَ أُولٰئِكَ الْمُقَرَّبُوْنَ وَقَالَ وَالسَّابِقُوْنَ الْأَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهَاجِرِيْنَ وَالْأَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِإِحْسَانٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ فَبَدَأَ بِالْمُهَاجِرِيْنَ عَلٰى قَدْرِ دَرَجَةِ سَبْقِهِمْ ثُمَّ ثَنّٰى بِالْأَنْصَارِ ثُمَّ ثَلَّثَ بِالتَّابِعِيْنَ لَهُمْ بِإِحْسَانٍ فَوَضَعَ كُلَّ قَوْمٍ عَلٰى قَدْرِ دَرَجَاتِهِمْ وَمَنَازِلِهِمْ عِنْدَهُ ثُمَّ ذَكَرَ مَا فَضَّلَ اللهُ بِهِ أَوْلِيَاءَهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ فَقَالَ عَزَّ وَجَلَّ تِلْكَ الرُّسُلُ

کے نزدیک باعتبار درجات گھٹتے بڑھتے ہوں؟ آپ نے فرمایا۔ ہاں! میں نے کہا آپ پر اللہ مہربانی فرمائے مجھے اس کی ذرا تفصیل تو بتائیے کہ میں بھی اس کو سمجھ لوں آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے مومنین میں باہم ایک دوسرے کو اسی طرح سبقت دی ہے، جس طرح گھڑ دوڑ میں گھوڑوں کو ایک دوسرے پہ سبقت دی جاتی ہے، پھر سبقت کے درجہ کے لحاظ سے ان کو فضیلت مرحمت فرمائی، لہٰذا ان میں سے ہر آدمی کو اس کی سبقت کے درجہ پہ رکھا اس میں سے اس کا حق بالکل کم نہیں کرتا نہ پیچھے رہ جانے والا آگے بڑھ جانے والے

آگے ہو سکتا ہے، نہ مفضول دجسپر فضیلت دیگئی افاضل پر فضیلت پا سکتا ہے اس طرح سے امت کے اگلوں اور پچھلوں میں باعتبار سبقت گھٹت بڑھت ہوئی ہے اور اگر ایمان میں پیچھے رہ جانے والوں پر فضیلت نہ رکھتا تو اس امت کے بعد والے مراتب میں پہلے والوں پر فضیلت نہ صرف جا ہی ملتے بلکہ آگے بھی نکل جاتے اگر ایمان میں پہل کرنے والوں کو اپنے بعد ایمان لانے والوں پر نہ دے دی گئی ہوتی لیکن اللہ تعالیٰ نے درجات ایمان میں سابقین کو آگے بڑھایا اور ایمان میں تاخیر کر کے پیچھے رہ جانے والوں کو پیچھے رکھا، مومنین میں بلحاظ عمل تم پچھلوں کو اگلوں سے زیادہ نہیں پاؤ گے، نہ نماز روزہ میں نہ حج و زکوٰۃ میں نہ جہاد میں نہ راہ خدا میں خرچ کرنے میں اگر یہ سابقتیں نہ ہوتیں کہ جن کی وجہ سے ایک دوسرے سے اللہ کے نزدیک بڑھا ہوا ہے تو بعد والے عمل کے لحاظ سے اگلوں سے آگے نکل جاتے لیکن اللہ تعالیٰ نے اسے پسند نہیں فرمایا کہ بعد والا پہلے والے جتنے درجات ایمان پالے یا اللہ نے جسے پیچھے ڈالا ہو وہ آگے بڑھ جائے یا جس کو اللہ تعالیٰ نے آگے بڑھایا ہے وہ پیچھے رہ جائے راوی نے کہا مجھے اس سے بھی مطلع فرمائیے کہ

www.Ahlehaq.com

www.Ahlehaq.com

فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ مِنْهُمْ مَنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجَاتٍ اِلٰى اٰخِرِ الْاٰيَة۔ وَقَالَ وَلَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِيِّيْنَ عَلٰى بَعْضٍ وَقَالَ اُنْظُرْ كَيْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَقَالَ وَلَلْاٰخِرَةُ اَكْبَرُ دَرَجَاتٍ وَّاَكْبَرُ تَفْضِيْلًا اِلٰى اٰخِرِ الْحَدِيْث۔ وَقَالَ فِيْ اٰخِرِهٖ فَهٰذَا ذِكْرُ دَرَجَاتِ الْاِيْمَانِ وَمَنَازِلِهٖ عِنْدَ اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ۔

وہ سبقت ایمانی کیا ہے جس کی طرف اللہ تعالیٰ نے مومنین کو رغبت دلائی ہے، تو آپ نے فرمایا وہ اللہ کا قول (وسابقوا الی مغفرۃ من ربکم الخ) ہے اور سبقت کرو اللہ کی مغفرت کی طرف اور جنت کی طرف جس کا عرض (چوڑائی) آسمان اور زمین کے برابر ہے جو اللہ ورسول اللہ پر ایمان لانے والوں کے لئے تیار کی گئی ہے۔ اور فرمایا (اللہ تعالیٰ نے) اور پہل کرنے والے تو پہل کرنے والے ہی ہیں اور وہی مقرب ہیں۔ نیز فرمایا (اللہ نے) کہ پہل کرنے والوں میں اولین مہاجرین وانصار اور ان کے مخلص پیروکار (متبعین) ہی وہ ہیں جن سے اللہ راضی ہوا اور وہ راضی ہوئے اللہ سے۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے مہاجرین کا ذکر ان کے درجہ سبقت کے لحاظ سے پہلے کیا، دوسرے درجہ پر انصار کا ذکر فرمایا اور درجہ سوم پر تابعین کا ذکر کیا، جنہوں نے صدق دل سے اپنے پہلوں کی اتباع کی۔ پس اللہ کے نزدیک جس گروہ کا جو درجہ مقرر ہے اس نے اس کو اسی درجہ پر رکھا اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنے اولیا (کو علیٰ ہم ذکر) جو فضیلت دی اس کا ذکر کیا اور فرمایا یہ رسول ہیں کہ جن میں سے بعض کو بعض پر ہم نے فضیلت دی ہے، ان میں سے بعض وہ ہیں جنہوں نے اللہ تعالیٰ سے کلام فرمایا۔ اور بعض کے درجات بلند فرمائے الخ اور فرمایا بے شک ہم نے بعض انبیاء کو بعض دوسروں پر فضیلت بخشی اور فرمایا دیکھو ہم نے ایک کو دوسرے پر کس طرح فضیلت دی، اور ارشاد فرمایا آخرت اپنے درجات اور فضیلت میں بہت بڑی ہے الخ۔

اختتام حدیث پر کہا یہ ہے ان درجوں اور مرتبوں کا ذکر جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایمان میں قائم ہیں۔
اس روایت سے صاف پتہ چل گیا کہ درجۂ ایمانی میں مہاجرین وانصار سب سے بلند وبالا تر ہیں، ان کے بعد والا کوئی ان سے ہمسری نہیں کر سکتا۔

چنانچہ ذیل میں درج شدہ آیات قرآنی بھی اسی پر دلالت کرتی ہیں،

(١) اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا۔ پکے مومن وہی ہیں،

اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ۔ یہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بلند مرتبت ہیں،

لَا يَسْتَوِيْ مِنْكُمْ مَنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقَاتَلَ۔ فتح مکہ سے قبل خرچ کرنے والے یا لڑنے والے کے کو برابر نہیں،

اب ایسا شخص جو اتنا عظیم المرتبت ہو وہ ایسے ناشائستہ امور پر اصرار کرتا یا ان پر اجتماع واتفاق کرے محال در محال ہے!

(٩) نہج البلاغہ کے شارحین نے اپنے ہاں ایک خط نقل کیا ہے، جو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جناب معاویہ رضی اللہ عنہ کو لکھا تھا۔ اس خط میں حضرت ابوبکر صدیق وحضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما کے ذکر کے بعد ان کے متعلق یہ الفاظ تحریر فرمائے،

www.Ahlehaq.Com

لَعَمْرِيْ اِنَّ مَكَانَهُمَا فِي الْاِسْلَامِ لَعَظِيْمٌ وَاِنَّ الْمُصَابَ بِهِمَا لَجُرْحٌ فِي الْاِسْلَامِ شَدِيْدٌ رَحِمَهُمَا اللّٰهُ وَجَزَاهُمَا بِاَحْسَنِ مَا عَمِلَ،

میری جان کی قسم ان دونوں کا اسلام میں بہت بڑا مقام ہے اور ان دونوں کا اٹھ جانا اسلام کے لئے بڑا کاری زخم ہے اللہ تعالیٰ ان دونوں پر اپنی رحمت فرمائے اور ان دونوں کے اعمال کی بہترین جزا مرحمت فرمائے،

اگر شیعوں کے بقول یہ حضرات "ظالم و غاصب" تھے تو ایک "امام معصوم" ان کی ایسے شاندار الفاظ میں مدح و توصیف کیسے کر سکتے تھے،

تعجب اور حیرت کی بات ہے کہ یہ خط صاحب نہج البلاغہ نے خود بھی نقل کیا مگر اسی خبث باطنی کے ساتھ جو اس کی طبیعت ثانیہ بن چکی ہے، یعنی تحریف سے یہاں بھی باز نہیں رہا، الفاظ عبارت کو آگے پیچھے تو کیا ہی ہے کوئی بات جو اس کے مذہب پر چوٹ لگاتی تھی، اس کو اس نے عبارت سے ساقط بھی کر دیا ہے چنانچہ اس کتاب کے تمام شارحین نے اس بات کا اعتراف بھی کیا ہے کہ اس خط کی نقل میں بدنی سے ایسی بے ربطی اور بے ترتیبی عمل میں آئی ہے کہ عبارت میں ایسی گڑبڑ اور مطلب میں ایسی گنجلک پیدا ہو گئی ہے کہ شراح اس کی توجیہ اور عبارت کی ترکیب سے عاجز آ گئے،

بحث امامت بلا فصل

اہل تشیع حضرت علی رضی اللہ عنہ کی امامت بلا فصل ثابت کرنے کے لئے بہت سی دلیلیں بیان کرتے ہیں جن کی چھان پھٹک اور تحقیق و تفتیش کی گئی، تو معلوم ہوا کہ بہت روایتیں تو ایسی ہیں، جو موضوع بحث سے بالکل ہی ہٹی ہوئی ہیں، اور بہت سی روایتیں ایسی ہیں جو موضوع اہل سنت کے ذخیرہ علمی و دینی سے چرائی گئی ہیں، اس اجمال کی تفصیل ملاحظہ ہو،

اس سلسلہ میں ان کے دلائل تین قسم کے ہیں،

(۱) وہ آیات و احادیث جو حضرت علی و اہل بیت رضوان اللہ علیہم کے مناقب و فضائل میں وارد ہوئی ہیں۔ یہ سب اہل سنت کی ذکر کردہ ہیں جو انہوں نے خوارج اور نواصب کے مقابلہ میں لکھی اور بیان کی کیونکہ یہ لوگ حضرت علی و اہل بیت رضوان اللہ علیہم کی شان میں لعن و طعن کر کے اپنی عاقبت خراب کرتے رہتے تھے، اب یہ شیعوں کی بے وقوفی ہی ہے، کہ وہ جناب امیر کی امامت بلا فصل ثابت کرنے کے دلائل کے طور پر ان کو اہل سنت ہی کے مقابلہ پہ لے آئے!

ان کے اگلوں نے جب علم کلام و اصول میں اہل سنت و معتزلہ کی شاگردی کر کے کچھ شد بد حاصل کر لی اور کچھ سمجھداری آ گئی اور دلائل مرتب کرنے سے بھی کچھ واقف ہو گئے تو انہوں نے ان مقدمات علمی میں کچھ الٹ پھیر اور چند من گھڑت کلمات کا ان میں اضافہ کر کے اپنے مفید مطلب بنا لیا حالانکہ وہ پھر بھی ان کے مفید مطلب نہ تھے، مگر غیر بزعم خود وہ اپنے کو یہی سمجھتے تھے، تب انہیں دلائل کی تہذیب و اصلاح کے لئے ان کی ایک کتاب

www.Ahlehaq.com

"کتاب الالفین" کے نام سے تصنیف ہوئی،

ظاہر ہے ان حالات کے تحت اہل سنت کے لئے ان دلائل کے جوابات دینا نہ مفید ہے، نہ مناسب البتہ ان کے یہ دلائل اس مقصد سے نقل ضرور کئے جائیں گے کہ ان بزرگواروں کی دانشمندی اور خوش تقریری بے نقاب ہو، اور مصنوعی کلمات اور زبردستی کے بڑھائے ہوئے مقدمات پر واقفیت حاصل ہو،

(۲) وہ دلائل ہیں جن سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا استحقاق خلافت بحیثیت خصوصی ثابت ہوتا ہے اور یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ آپ ایک وقت و مدت خاص و معینہ میں خلیفہ برحق اور امام مطلق ہیں،

یہ دلائل بھی وہ ہیں، جو اہل سنت ان خوارج و نواصب کے مقابلہ میں بیان کرتے تھے جو آپ کی خلافت و امامت کے منکر تھے اور آپ کے مرتبہ امامت میں ردو قدح کرتے تھے،

ان دلائل سے جو کچھ سمجھ میں آتا ہے وہ صرف یہ کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ خلافت راشدہ کے مستحق ہیں اور آپ کی خلافت شارع کی پسندیدہ ہے، نہ ان میں وقت و زمانہ کی تعیین ہے نہ اس بات کی تشریح کہ ان کا زمانہ خلافت زمانہ نبوت سے متصل ہے یا منفصل،

یہ بات چونکہ اہل سنت کے مذہب کے مطابق اور ان کے مطلب کا خلاصہ ہے، اس لئے ان روایات کے جواب کی طرف وہ کیوں متوجہ ہوں! ہاں کہیں کہیں ان مقدمات پر تنبیہ و تنقید ضرور ہوگی، جو انہوں نے بے ضابطہ طور پر گھڑ گھڑ کر دلائل میں شامل کر لئے ہیں اور اپنے خیال خام میں اس پر بڑے خوش کہ کارے کردم،

(۳) وہ دلیلیں جو جناب امیر رضی اللہ عنہ کی امامت پر بلا تفصیل دلالت کرتی ہیں، یا آپ کے غیر سے امامت سلب کرتی ہیں، یہی وہ دلیلیں ہیں کہ جن پر مذہب شیعہ کی بنیاد قائم ہے اور ان کی روایت و نقل میں، یہ تنہا ہیں، اس قسم کی دلیلیں اول تو بہت کم ہیں، اور جو ہیں بھی تو ان کے مقدمات ناقابل تسلیم ہیں، کیونکہ ان کی تردید کے لئے بصورت ثقلین "کتاب اللہ، و عترت رسول اللہ جیسے سچے گواہ اور عادل شاہد موجود ہیں"،

لہذا اس کتاب میں موقع کی مناسبت سے کچھ نہ کچھ بحث تینوں قسم کے دلائل پر کی جائے گی البتہ قسم آخر کو ذرا تفصیل سے سامنے لایا جائے گا، اور ہر بنا رغلطی اور موقع ننگ پر ضرور تنبیہ کی جائیگی، تاکہ ان کی دلیلوں کی حقیقت الم نشرح ہو جائے،

اس بحث میں ضابطہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے، اتنی بات تو ضروری ہونی چاہئے کہ ان دلائل کے مبادیات اور مقدمات ایسے ہوں جو اہل سنت کے ہاں بھی قابل تسلیم ہوں اس لئے کہ ان دلائل سے مقصود اہل سنت ہی کو تو الزام دینا ہے، ورنہ اپنی جگہ تو سارے ہی بادن گز کے بنتے ہیں،

شیعوں کی وہ روایات اور اصول جو ابواب ماسبق میں تفصیلاً مذکور ہوئے وہ تو اہل سنت کے نزدیک ذرہ برابر نہ قابل قدر ہیں نہ لائق توجہ البتہ وہ دلائل جو آیات قرآنی پر مشتمل ہوں یا احادیث متفق علیہا پر یا پھر وہ عقلی دلائل جن کے مقدمات طرفین کے نزدیک مسلم ہوں یا پھر وہ طعن آمیز اقوال جو خلفائے ثلاثہ رضوان اللہ علیہم کی خلافت کے انکار کے سلسلہ میں بیان کئے جاتے ہیں، موضوع گفتگو بن سکتے ہیں ہم نے چونکہ باب

www.Ahlehaq.com

مطاعن کو مستقل طور پر کتاب ہذا کا جزء بنایا ہے، اس کو چھوڑ کر باقی کے تین اصناف دلائل پہ یہاں گفتگو کرتے ہیں،

ان کی طرف سے پہلی آیت یہ ہے،

إِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُولُهُ وَالَّذِينَ آمَنُوا الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رَاكِعُونَ

بے شک تمہارا ولی، اللہ ورسول اور وہ مومن ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں، اور زکوٰۃ دیتے ہیں اس حال میں کہ رکوع کئے ہوئے ہیں،

اس آیت کے متعلق یہ حضرات کہتے ہیں کہ اہل تفسیر کا اس پہ اتفاق ہے کہ یہ آیت جناب امیر رضی اللہ عنہ کی شان میں نازل ہوئی کہ آپ نے حالت رکوع میں ہی ایک سائل کو اپنی انگشتری دی تھی،

پھر انما کا کلمہ حصر چاہتا ہے اور ولی سے مراد اوامر چلانے والا یا نافذ کرنے والا ہے اور ظاہر ہے یہاں وہ تصرف عام مراد ہے جو سب مسلمانوں پر ہے، اور جو امامت کا مرادف ہے اس کا قرینہ یہ ہے کہ ان کی ولایت کو خدا اور رسول کی ولایت کے ساتھ ذکر کیا ہے لہذا آپ کی امامت ثابت ہوگئی اور آپ کے علاوہ دوسروں کی امامت کی نفی، کیونکہ انما حصر پہ دلالت کرتا ہے اور یہی مدعا ہے،

اس کا جواب چند صورتوں میں دیا جا سکتا ہے، اول بطریق نقض، کہ یہ دلیل آپ کے بیان کے مطابق جناب امیر کے پہلے والے ائمہ کی جس طرح نفی کرتی ہے اسی طرح آپ کے بعد کے ائمہ کی تردید بھی یہی آیت ساتھ ساتھ ہی کر رہی ہے، اور آپ کی اسی تقریر سے بعد میں آنے والوں کی امامت کی نفی بھی اس سے نکلتی ہے جس کا لازمی نتیجہ یہی نکلے گا کہ حضرات حسنین رضی اللہ عنہما، اور بعد کے ائمہ کی امامت برحق نہ ہو، اگر شیعہ اس انکار کے لئے تیار ہیں، تو چشم ما روشن دل ما شاد بلا کھٹکے اس دلیل سے ضرور استدلال کریں،

خلاصہ کلام یہ کہ یہ استدلال جس وجہ سے اہل سنت کے مقابل لایا گیا ہے کلمہ حصر پہ مبنی ہے اور حصر جس طرح اہل سنت کے لئے مضر ہے اسی طرح بلکہ اس سے زیادہ شیعوں کے لئے مضر ہے کیونکہ اس صورت میں اگر جناب امیر سے قبل کے ائمہ کی تردید ہوتی ہے تو بعد کے ائمہ کی بدرجہ اولی ہوتی ہے، گو مذہب اہل سنت باطل قرار پاتا ہے مگر شیعہ مذہب کی عمارت بھی زمین بوس ہوئی جا رہی ہے، اس کا باطل ہونا تو حقیقت ہے ہی اسی کے ساتھ اس کی بنیاد ہی نیست و نابود ہوئی جا رہی ہے اگر اہل سنت کے تین اماموں پہ زد پڑتی ہے تو شیعوں کے تو بارہ امام ہاتھ سے جا رہے ہیں، تین اور بارہ کا فرق امید ہے وہ بھی بخوبی سمجھتے ہوں گے، جناب امیر تو دونوں فریق کے نزدیک امام و خلیفہ ہیں، باقی سب اگلے پچھلے اس اعزاز سے محروم ہوں گے،

(ترجمہ شعر) گو میری تو مشت خاک ہی برباد ہوئی، مگر خوشی اس کی ہے کہ رقیب تو نامراد گیا،

اگر وہ نقض کا جواب یہ دیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ولایت وقت کے ایک حصہ میں منحصر ہے یعنی اپنے عہد امامت میں نہ حضرات حسنین وائمہ مابعد کے وقت میں، تو ہم اس اتفاق پر ان کو مبارکباد پیش کرتے ہیں، ہمارا عقیدہ و مذہب بھی تو یہی ہے کہ آپ کی ولایت عامہ ایک محدود وقت کے ساتھ مخصوص

تھی۔ یعنی جب آپ خلیفہ مقرر ہوئے اس سے پہلے نہیں کہ وہ خلفاء ثلاثہ کا دور تھا،

اگر وہ یہ کہیں ، کہ جناب امیر خلفاء ثلاثہ کے عہد میں اگر ولایت عامہ سے خالی مانے جائیں تو ان کے لئے ان کی ذات میں نقص لازم آئے گا بخلاف سبطین کی امامت کے وقت کہ اس وقت آپ زندہ ہی نہ تھے، کسی دوسرے کا امام ہونا اس وقت آپ کی ذات میں نقص شمار نہیں ہوگا کیونکہ موت تمام دنیوی احکام و ذمہ داریوں سے بری الذمہ کر دیتی ہے، تو ہم کہیں گے، یہ ایک دوسرا مستقل استدلال ہوا، آیت سے تو استدلال نہ رہا، کیونکہ یہ استدلال مذکور دو مقدمات پر استوار ہے ایک یہ کہ صاحب ولایت عامہ کا کسی دوسرے کی ولایت میں ہونا خواہ کسی وقت میں بھی ہو نقص کا سبب ہے دوسرے یہ کہ صاحب ولایت عامہ میں کسی طرح بھی اور کسی وقت بھی نقص پیدا نہیں ہو سکتا۔ تو یہ دونوں مقدمات آیت سے کہاں سمجھے جاتے ہیں، یہ صورت اصطلاح مناظرہ میں فرار کہلاتی ہے کہ ایک دلیل کو چھوڑ کر دوسری جا پکڑنا جب کہ پہلی دلیل کے مقدمات کا جھگڑا نہ اقرار سے نہ اثبات سے طے ہوا ہو،

اور اگر ہم جھوٹے کو گھر تک پہنچانے کی خاطر اس فرار کو نظر انداز کر دیں اور نئے استدلال کے مقدمات کی طرف توجہ دیں تو ہم کہیں گے کہ یہ دونوں مقدمات ہی غلط ہیں، اور یہ استدلال ہی اس وجہ سے باقی نہیں رہتا کہ اس صورت میں حضرات حسنینؓ ولایت مستقل سے محروم ہو جاتے ہیں کہ وہ جناب امیر کی موجودگی میں ان کی ولایت میں تھے اور پھر خود جناب امیرؓ کی ولایت سے بھی یہ استدلال ختم ہو جاتا ہے، کہ وہ بھی حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے عہد میں مستقل ولایت نہیں رکھتے تھے بلکہ حضور کی ولایت کے زیر سایہ تھے،

لہذا معلوم ہوا کہ صاحب ولایت کا دوسرے کی ولایت میں کچھ عرصہ کے لئے رہنا نقص نہیں ہے اور اگر نقص ہے تو صاحب ولایت عامہ میں یہ کوئی عیب نہیں ہے تو وہ استدلال ہی مع مقدمات کے غلط ہوا جس کی طرف چھلانگ لگائی تھی

ایک دوسرا جواب جناب شیخ ابراہیم کردی رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے اہل سنت نے یہ دیا ہے کہ الذین امنو میں بوقت خطاب ولایت مراد نہیں کہ خطاب کا زمانہ نبی کا زمانہ اور عہد تھا، اور امامت نبی کے بعد نبی کی نیابت ہے اس کے حین حیات نہیں تو لامحالہ بعد ہی کا زمانہ مراد ہوگا اور بعد کی کوئی حد نہیں، وہ ایک منٹ بعد ہو سکتا ہے تو ایک یا چند سال بھی ہو سکتا ہے، لہذا یہ دلیل بھی وجہ نزاع نہیں ہو سکتی اور یوں شیعوں کا مدعا امامت بلافصل غتربود ہو گیا۔

اور اگر ان کی دلیل کے مقدمات پر تفصیلی نظر ڈالیں تو اجماع مفسرین کا ان کا دعویٰ بھی غلط اور ناقابل تسلیم ہے اس لئے کہ علماء تفسیر تو اس آیت کے نازل ہونے کے سبب میں مختلف الرائے ہیں، ابو بکر نقاش جو ان کے ہاں کی مشہور تفسیر کا مصنف ہے جناب ابو جعفر محمد باقر رحمۃ اللہ علیہ سے یوں روایت کرتا ہے کہ نزلت فی المھاجرین والانصار، (یہ آیت مہاجرین و انصار کے بارے میں نازل ہوئی)، کسی کہنے والے نے کہا کہ ہم نے تو سنا ہے یہ علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے حق میں نازل ہوئی تو آپ نے فرمایا کہ وہ بھی تو انہی میں سے تھے، اور یہ روایت الذین اور جمع کے صیغوں یقیمون، یؤتون، وھم راکعون کے بہت مناسب اور موزوں ہے،

www.Ahlehaq.com

اور مفسرین کی ایک جماعت نے کہا کہ عکرمہ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت حضرت ابی بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی شان میں نازل ہوئی اور اس آیت کا ربط پچھلی آیت سے جو مرتدین کے قتال کے بارے میں ہے اسی قول کی تائید کرتا ہے،

اب یہ قول کہ یہ آیت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شان میں اتری، اور بحالت رکوع سائل کو انگوٹھی دینے کا یہ قصہ! تو یہ روایت تنہا ثعلبی نے روایت کی ہے، اور سارے ہی محدثین اس روایت کو رتی بھر اہمیت نہیں دیتے اور اس کو "حاطب اللیل" کہہ کر پکارتے ہیں، اس لئے کہ اسے خشک و تر میں کوئی تمیز نہیں، غلط سلط سب باتیں روایت کر دیتا ہے، یہ تفسیری روایات کلبی سے لیتا ہے، ابی صالح کہتا ہے کہ تفسیری روایات میں اس کی روایت سب سے زیادہ رکیک ہوتی ہے،

قاضی شمس الدین بن خلکان نے کلبی کے حال میں لکھا ہے کہ یہ عبداللہ بن سبا یہودی کے ان ساتھیوں میں سے ہے جو کہتے تھے کہ علی بن ابی طالب مرے نہیں اور وہ دنیا میں پھر آئیں گے،

ثعلبی کی بعض روایات کا سلسلہ محمد بن مروان اسدی الصغیر پر ختم ہوتا ہے جو کٹر رافضی تھا اور سلسلہ کذب و دروغ کی ایک کڑی کے طور پر جاتا ہے،

لباب التفسیر کا مصنف کہتا ہے کہ یہ آیت عبادہ بن الصامت رضی اللہ عنہ کے حق میں اس وقت نازل ہوئی جب انہوں نے حلفائے یہود سے بیزاری و نفرت ظاہر کی۔ جب کہ عبداللہ بن ابی (مشہور منافق) نے بیزاری کا اظہار نہیں کیا بلکہ ان کی حمایت وخیر خواہی پر تلا رہا۔

یہ قول آگے آنے والی آیت یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْیَھُوْدَ وَالنَّصٰرٰی اَوْلِیَآءَ (مومنو یہود ونصاریٰ کو دوست نہ بناؤ) سے پوری مناسبت رکھتا ہے۔

پھر مفسرین کی ایک جماعت یہ کہتی ہے کہ جناب عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ جو علماء یہود میں سے تھے جب اسلام لے آئے تو ان کے پورے قبیلے نے ان کا بائیکاٹ کر دیا انہوں نے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت مبارکہ میں اس کی اطلاع بایں الفاظ فرمائی یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اِنَّ قَوْمَنَا ھَجَرُوْنَا (یا رسول اللہ ہماری قوم نے ہمیں چھوڑ دیا) تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی اور قواعد فن حدیث کی رو سے یہ قول بہ نسبت دوسرے تمام اقوال کے زیادہ صحیح ہے،

آیت مذکورہ بالا متعلقہ امامت کے سلسلہ کا دوسری طرح سے جواب یہ ہے کہ لفظ ولی۔ محب۔ ناصر۔ صدیق اور صاحب تصرف سب معانی کے لئے آتا ہے اور ان سب میں مشترک ہے

اور مشترک لفظ سے کوئی خاص معنے اسی وقت مراد لئے جا سکتے ہیں، جب اس کے لئے کوئی خارجی وجہ موجود ہو۔

اور یہاں اس آیت سے اگلا کلام اس آیت میں ناصر کے معنے کی تائید کرتا ہے کیونکہ یہ آیت مومنوں کی تسلی، دلی تقویت اور مرتدوں سے ان کے خوف کو دور کرنے کی خاطر نازل ہوئی اور آنے والا کلام محب و صدیق کے معنے کو متعین کرتا ہے،

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَكُمْ هُزُوًا وَّلَعِبًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَالْكُفَّارَ اَوْلِيَاۗءَ

اے ایمان والو ان کو جو تمہارے دین کو مذاق و کھیل بناتے ہیں خواہ وہ اہل کتاب ہوں جن کو تم سے پہلے کتاب دی گئی یا وہ کافر ہوں دوست مت بناؤ۔

معلوم ہو گیا کہ یہاں اولیاء کے معنے محب و صدیق کے متعین ہیں کیونکہ یہود و نصاریٰ اور کافر کو کوئی مسلمان امام نہیں بناتا اور نہ ہی وہ آپس میں ایک دوسرے کو اپنا امام بناتے ہیں،

پھر کلمہ حصر اِنَّمَا بھی انہیں معنے کو چاہتا ہے، کیونکہ قاعدہ کے مطابق حصر کی وہیں ضرورت پیش آتی ہے جہاں کسی نزاع، شک اور شرکت کے اعتقاد کا احتمال ہو۔ اس امر پر اجماع ہے کہ اس آیت کے نازل ہونے کے وقت امامت اور ولایت تصرف کے سلسلہ میں نہ کوئی جھگڑا تھا نہ شک بلکہ نصرت و امداد اور محبت کا مسئلہ درپیش تھا،

تیسرے طریقہ سے جواب یہ ہے کہ اس اصولی قاعدہ کے مطابق جو سنی و شیعہ دونوں ہی متفق ہے عموم لفظ کا لحاظ ہوتا ہے خصوص سبب کا نہیں۔ لہٰذا آیت کا مقصد یہ ہو گا کہ ولایت عامہ چند اشخاص میں منحصر کر دی جائے اور ان اشخاص میں جناب امیر بھی داخل ہیں، کیونکہ جمع کے صیغے اور کلمہ الذین کے الفاظ عمومی ہیں یا بقول مرتضیٰ و ابن مطہر حلی بعض اور نہایہ نامی تصنیف میں مذکور ہے۔ الفاظ عمومی کے مساوی ہیں، ایسی صورت میں جمع کو واحد پر محمول کرنا دشوار ہے اور اسی طرح عام کا خاص پر محمول کرنا خلاف اصل ہے کہ بغیر ضرورت ایسا نہیں کیا جا سکتا۔

اور اگر شیعہ یہ کہیں کہ یہاں ایسا کرنے کی ضرورت ہے کہ رکوع کی حالت میں سائل کو صدقہ دینے کا واقعہ ایک شخص سے صادر ہوا ہے تو ہم کہیں گے کہ اس آیت سے اس قصہ کا پتہ کہاں چلتا ہے جس کی وجہ سے لفظ کو عموم پر محمول نہ کر سکیں بلکہ وہم راکعون ایک عطفی جملہ ہے، جو اگلے جملوں پر معطوف ہے اور موصول کا صلہ ہے یعنی الذین ھم راکعون یا یقیمون الصلوٰۃ سے حال ہے، بہر صورت یہاں رکوع سے خشوع مراد ہے اصطلاحی رکوع نہیں!

اس پر اگر شیعوں کو یہ اعتراض ہو کہ رکوع سے خشوع مراد لینا، خود شارع کے کلام میں لفظ کو غیر شرعی معنے میں استعمال کرنے کے مرادف ہے جو خلاف اصل ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ خود قرآن مجید میں دوسری جگہ رکوع، خشوع کے معنے میں آیا ہے، اور استعمال ہوا ہے،

چنانچہ ارشاد ہے۔ وَارْكَعِيْ مَعَ الرّٰكِعِيْنَ رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کر، حالانکہ یہ بالاجماع ثابت ہے کہ پہلے کی امتوں کی نماز میں اصطلاحی رکوع موجود نہیں تھا، یا فرمایا خَرَّ رَاكِعًا بیں گر پڑا رکوع کرتے ہوئے اور ظاہر ہے اصطلاحی رکوع میں خر اور سقوط نہیں ہوتا اب جب کہ رکوع کے مشہور معنی مجازی خشوع کے ہو گئے تو طے شدہ قاعدہ کے مطابق اس لفظ کو بلا ضرورت بھی محمول کر سکتے ہیں،

بلکہ ہم تو الٹ کر یہ کہتے ہیں کہ یُؤْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ سے سائل کو انگشتری صدقہ کر دینے کے معنے سمجھنا لفظ رکوع کو غیر شرعی معنی پر حمل کرنے کی مانند ہے، اب جو تم اس کا جواب دو وہی ہمارا جواب بھی رکوع

www.Ahlehaq.com

میں سمجھ لو، بلکہ اقامت صلوٰۃ کے بعد رکوع کا ذکر ہمارے خیال کی تائید ہے تاکہ بے جا تکرار لازم نہ آئے، اور صلوٰۃ کے بعد زکوٰۃ کا ذکر کرنا تمہاری تردید کرتا ہے کہ قرآنی عرف میں جہاں کہیں زکوٰۃ صلوٰۃ سے متصل بیان ہوئی ہے اس سے فرض زکوٰۃ مراد ہوتی ہے نہ کہ مطلقاً صدقہ!

اور اگر رکوع کو اس کے حقیقی معنے پر ہی محمول کریں تب بھی وہ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ سے حال واقع ہوگا اور تمام مومنین کو شامل ہوگا۔ اس لئے کہ مومنوں کی نماز کو یہود کی نماز سے جدا کرتا ہے جس میں رکوع نہیں ہوتا اس صورت میں بعد والی آیت میں جو یہود سے ترک موالات کا حکم ہے بہت چسپاں ہوتا ہے،

اور اگر یُؤْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ سے حال واقع ہو تو معنے کے لحاظ سے یہ نہ صفت ہوگا نہ تعریف بلکہ یہ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ میں نقص کا باعث ہوگا اس لئے کہ نماز کا درست اور تعریف تو یہ ہے کہ وہ اس عمل سے پاک ہو جس کا تعلق نماز سے نہیں، خواہ وہ عمل قلیل ہو یا کثیر، فرق صرف اتنا ہے کہ عمل قلیل مفسد نماز نہیں جب کہ عمل کثیر مفسد نماز ہے، بہر حال اقامت صلوٰۃ کے معنی میں دونوں ہی صورتیں کسی نہ کسی مقدار کا نقص پیدا کرتے ہیں، اور کلام الٰہی کو تناقص پر محمول کرنا جائز نہیں۔ اور پھر اسی کے ساتھ ایک اور بات یہ بھی ہے کہ امامت کی حقیقت میں اس قید کو دخل بھی نہیں۔ کہ جس میں یہ صفت ہو وہ امام ہو اور جس میں نہ ہو وہ قابل امامت نہیں۔

لہٰذا اگر امامت کے حکم کو اس قید کے ساتھ معلق یا موقوف کیا جائے تو نعوذ باللہ اللہ تعالیٰ کا کلام بے کار ثابت ہوگا یہ ایسا ہی ہے کہ جیسے کوئی کہے کہ تمہاری بادشاہت کے قابل وہ شخص ہے جس کے کپڑے سرخ ہوں تو کیا بات ہوئی۔

اور اگر ان سب باتوں کو نظر انداز بھی کر دیں تو بھی یہ آیت اگر حضرت امیرؓ کی امامت کے حصر کی دلیل ہوگی تو دوسری آیات اس کے متعارض ہوں گی، اور شیعوں کو بھی ان معارض آیات سے خلفاء ثلاثہ کی امامت سے بھی استدلال کرنا پڑے گا اور کوئی دلیل قابل استدلال اسوقت ہوتی ہے جب معارضات سے محفوظ ہو۔ خلفاء ثلاثہ رضوان اللہ علیہم سے متعلق آیات اوپر بیان ہو چکیں،

اور تعجب تو ملا عبداللہ صاحب اظہار الحق پر ہوتا ہے کہ وہ اس گروہ کا کچھ سمجھدار اور پڑھا لکھا لگتا ہے، مگر وہ بھی اس استدلال کو صحیح ثابت کرنے کے لئے بڑی کوشش اور تگ ودو میں پڑ گیا اور چند بے سروپا باتوں کے سوا کوئی پُرمغز علمی بات نہ لا سکا۔

ہم صرف اس غرض سے کہ اس فرقہ کی ممتاز شخصیات کے مبلغ علمی اور ان کی دانشمندی روشنی میں آجائے ان کی باتیں نقل کرتے ہیں۔ اور جہاں جہاں ان کو غلطی لگی اس کی نشاندہی بھی ساتھ ساتھ کرتے جا رہے ہیں،

ایک بات ملا عبداللہ نے یہ کہی ہے کہ خدا اور اس کے رسول کے ساتھ محبت اور دوستی کا حکم وجوبی ہے تو جو مومن ان اوصاف سے متصف ہوں ان کے ساتھ بھی محبت و دوستی کا حکم وجوبی ہو جانا چاہیئے کیونکہ کلام بھی ایک ہے، اور قصہ بھی ایک۔ اور جس کا موضوع ایک ہو، اور محمول بھی ایک اور کئی صورتوں میں ایک دوسرے پر معطوف بھی ہوں تو یہ جائز نہیں کہ ایک جگہ تو حکم کو بطریق وجوب مانیں اور دوسری جگہ بطریق ندب (مستحب) اور ایک لفظ کو ایک ہی استعمال میں دو معنوں کے لئے لینا یہ بھی جائز نہیں، لہٰذا اس آیت کے مفاد اور مطلب

کے بموجب مومنین متصفین بصفات مذکورہ کی ولایت اور دوستی واجب ہوگی، اور ان کی دوستی مطلقاً بغیر کسی قید و جہت کے ہونے میں خدا اور رسول کی دوستی سے تیسرے درجہ پہ ہوگی، اب اگر مومنین سے سارے مسلمان مراد ہوں اور پوری امت اس اعتبار سے کہ سارے مسلمان ان صفات سے متصف ہو سکتے ہیں، تو یہ ناقابل عمل ہے کیونکہ ہر شخص پہ سب سے تعارف ہی دشوار ہے چہ جائیکہ ان سے دوستی رکھنا یہ تو اس سے بھی دشوار تر ہے،

پھر بعض وجوہ سے کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک مومن کی دوسرے مومن کے ساتھ دشمنی مباح ہو جاتی ہے بلکہ واجب لہٰذا یہاں اس آیت میں مراد حضرت علی مرتضیٰ (رضی اللہ عنہ) ہی ہوں گے،" ملا جی کی بات ختم ہوئی،

ان کی اس تحریر میں عقلمندوں کو تھوڑا سا غور و فکر کرنا پڑے گا، تب ہی اس فرقہ کے علماء کی "فہم علاء" کا صحیح اندازہ ہو سکے گا۔

یہ بات ظاہر ہے کہ تمام مومنین کے ساتھ محبت و دوستی بسبب صفت ایمانی کسی قید و جہت سے مخصوص نہیں بلکہ عام ہے، جیسے موالات ایمانی کہتے ہیں، اگر کسی سبب سے عداوت مباح کیا واجب بھی ہو تب بھی موالات ایمانی کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا، اس معاملہ میں ہم فیصلہ کا حق شیعہ حضرات کو ہی دیتے ہیں وہ بتائیں کہ شیعہ باہم ایک دوسرے سے دوستی اور محبت اتحاد مذہب شیعیت کی ہی وجہ تو رکھتے ہیں اور یہ دوستی کسی قید کے ساتھ مقید بھی نہیں اور نہ کسی جہت سے مخصوص اسی کے ساتھ ساتھ دنیاوی معاملات میں چپقلش اور عداوت بھی ہو جاتی ہے تو کیا اس وقت محبت مذہبی ختم ہو جاتی ہے: یا اسے کوئی نقصان پہنچتا ہے؟۔

اور اگر اس آیت کو سمجھنے میں انہیں کوئی مشکل پیش آ رہی ہے یا اسے سمجھنا محال خیال کر رہے ہیں تو پورے قرآن سے یہ کیسے چشم پوشی کر سکتے ہیں۔ ایک دوسری آیت دیکھئے۔

اَلْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَاءُ بَعْضٍ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَيُطِيْعُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ اُولٰٓئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللّٰهُ۔

مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے باہم دوست ہیں۔ اچھی باتوں کا حکم کرتے ہیں اور منکرات سے منع کرتے ہیں، نماز قائم کرتے، زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ و رسول کی اطاعت کرتے ہیں، "اللہ عنقریب ان پر رحم فرمائے گا،

اور اگر ایمانی دوستی سب مومنین سے عام اس سے کہ وہ مطیع ہوں یا نافرمان خدا اور رسول کی دوستی سے تیسرے درجہ پہ ہو تو اس میں کونسی عقلی خرابی لازم آتی ہے ہاں خرابی اس وقت ہے کہ یہ تینوں دوستیاں ایک درجہ اور مرتبہ کی ہوں اور جب خدا کی محبت اصل ہوئی اور رسول کی محبت اس کے تابع اور مومنین و عام مسلمانوں کی اس کے تابع تو یہ تینوں محبتیں برابر کب ہوئیں اور موضوع و محمول کے اتحاد کا قضیہ یہاں متحقق نہیں یہ تو ملا جی کی ایک دھونس ہے جو اہل سنت کے جاہل لوگوں کو ڈرانے اور مرعوب کرنے کے لئے، یہ منطقی اصطلاحیں بولنے لگا ہے کہ لوگ اس کو منطقی سمجھ کر اس کے کلام میں رد و قدح کرنے کی جرأت نہ کریں،

پھر کچھ ہوش آیا تو "متعدد ہوں" مگر ایک دوسرے پہ معطوف" کا ٹکڑا لگا دیا مگر اتنا نہیں سمجھ سکا

www.Ahlehaq.com

کہ بصورت تعدد و عطف یہ مقدمہ نا قابل تسلیم ہے، کیونکہ عطف حکم کی شرکت کے لئے ہوتا ہے جہت کی شرکت کے لئے نہیں عقلیات میں سے اس کی مثال یہ ہے کہ مثلاً یہ کہیں،

اِنَّمَا الْمَوْجُوْدُ فِی الْخَارِجِ الْوَاجِبُ وَالْجَوَاهِرُ وَالْاَعْرَاضُ، — البتہ خارج میں موجود ہونیوالی چیزیں واجب جواہر اور اعراض ہیں،

حالانکہ واجب کی طرف وجود کی نسبت جہت وجوب کے ساتھ ہے، کیونکہ اس کا وجود ضروری ہے اور دائمی ہے، بخلاف جواہر و اعراض کے کہ ان کا وجود ممکن ہو سکتا ہے واجب نہیں، دگو حکم وجود میں سب برابر ہیں)۔

اور شرعیات میں اس کی مثال اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے،

قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ۔ — آپ کہئے یہ میری راہ ہے اللہ کی طرف اعتماد سے بلاتا ہوں میں بھی اور میرے ساتھی بھی،

حالانکہ دعوت الی اللہ پیغمبر پر تو واجب ہے اور دوسروں پر مندوب اسی لئے اصولیوں نے کہا ہے کہ قرآن فی النظم قرآن فی الحکم کا موجب ہے، بلکہ اس قسم کے استدلال کو مسالک مردودہ میں سے لکھا ہے،

اور اگر اس کو بھی جانے دیں تو یہ تو ظاہر ہے کہ صرف وجوب محبت میں شرکت سے کوئی خرابی لازم نہیں آتی جو کچھ خرابی ہے وہ اصالت اور تبعیت کے درجہ و مرتبہ کے اتحاد و یکسانیت میں ہے،

پھر ملا جی نے تمام مومنین سے من حیث الایمان محبت رکھنے کو خصوصیت کے ساتھ ہر مومن کو پہچاننے پر موقوف ٹھیرایا ہے، حالانکہ ایسی کوئی کثرت نہیں جس کو عنوان اور حدود سے نہ پہچانا جا سکے اگرچہ وہ غیر متناہی کیوں نہ ہو۔ پھر متناہی کا کیا ذکر! مثلاً کل عدد فهو نصف مجموع حاشیه۔ ہر عدد اپنے کناروں کا نصف ہے) اس حکم سے تمام اعداد کی طرف اجمالی توجہ تو ہو گئی، حالانکہ مراتب اعداد بلا شبہ غیر متناہی ہیں یا مثلاً یوں کہیں کل حیوان حساس (ہر حیوان احساس رکھتا ہے اس میں تو جنس حیوان کے ہر فرد کے لئے ذی حس ہونے کا حکم لگا گیا ہے۔ حالانکہ حیوان کی تمام انواع بھی ہم کو معلوم نہیں اصناف و افراد کا علم تو کیسے ہو سکتا ہے،

یہ بیچارہ ملا۔ کہ اسے اجمالی ملاحظہ کا بھی پتہ نہیں چلا جسے ایک عامی سے عامی بھی جانتا ہے اور یہ مسکین عنوان و معنون کے فرق سے بھی آگاہ و آشنا نہیں،

اور اگر اس بحث کو جو علم معقول سے تعلق رکھتی ہے، نا قابل توجہ قرار دے کر تسلیم نہ کریں تو ہم دینی مسلمات کے متعلق ان سے پوچھیں گے اور کہیں گے کہ مثلاً تمام کفار سے بحیثیت کفر ترک موالات کرنا اور ان سے دشمنی رکھنا واجب ہے یا نہیں۔ اگر یہ کہدیں کہ واجب ہے تو وہی خرابی لازم آئے گی کہ سب کی پہچان اور معرفت حاصل نہیں اگر کہیں کہ واجب نہیں تو پھر یزید و مروان سے ان کی دشمنی کس طرح ثابت ہو گی اور قرآنی آیات کا کیا جواب دیں گے فرقہ ہائے مومنین میں تو معرفت ایمانی کی مدد سے ہم امتیاز کر بھی سکتے ہیں مگر انواع کفر کا تو ہمیں بالکل پتہ ہی نہیں تھا کہ ان میں نوعی امتیاز کر سکیں۔ اشخاص و افراد کا امتیاز تو بعید کی بات ہے،

www.Ahlehaq.com

اور پھر ان کا اعتراض موالاۃ علویہ (اولادِ علی) سے بھی ٹوٹتا ہے جو ان کے اعتقادات میں داخل ہے کیونکہ علوی حضرات اور ان کی گنتی معلوم کرنا جب کہ وہ اکناف عالم میں پھیلے ہوئے ہیں عام مومنین ہی کی طرح کی مشکل سے کم نہیں،

ملا عبد اللہ کی مندرجہ بالا بات کی طرح ان کی ایک اور بات یہ ہے کہ وہ کہتا ہے کہ خود اہل سنت کی بعض احادیث سے پتہ چلتا ہے کہ بعض صحابہ نے خود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے گذارش کی کہ آپ اپنا خلیفہ نامزد فرما جائیں چنانچہ مشکوٰۃ میں حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کی روایت یوں بیان کی گئی ہے،

قَالُوا يَا رَسُولَ اللهِ لَوِ اسْتَخْلَفْتَ قَالَ لَوِ اسْتَخْلَفْتُ عَلَيْكُمْ فَعَصَيْتُمُوهُ عُذِّبْتُمْ وَلٰكِنْ مَا حَدَّثَكُمْ حُذَيْفَةُ فَصَدِّقُوهُ وَمَا أَقْرَأَكُمْ عَبْدُ اللهِ فَاقْرَؤُوهُ رَوَاهُ التِّرْمِذِي

صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ کیا اچھا ہوتا کہ آپ کسی کو خلیفہ مقرر فرما دیتے آپ نے ارشاد فرمایا میں اگر کسی کو خلیفہ بناتا اس کے بعد تم اس کی نافرمانی کرتے تو اس کی وجہ سے تمکو عذاب دیا جاتا لیکن (اس سلسلہ میں) ابو حذیفہ جو حدیث تم کو سنائے اس کو سچ جانو، اور جو چیز (جس طرح) تمکو عبد اللہ پڑھائے اسکو پڑھو رواہ الترمذی)

اسی طرح آپ سے اس شخص کے بارے میں بھی دریافت کیا گیا جو خلافت و امامت کے لائق ہو اس کی روایت حضرت علی رضی اللہ عنہ سے سند وہ روایت فرماتے ہیں،

قِيلَ يَا رَسُولَ اللهِ مَنْ نُؤَمِّرُ بَعْدَكَ قَالَ إِنْ تُؤَمِّرُوا أَبَا بَكْرٍ تَجِدُوهُ أَمِينًا زَاهِدًا فِي الدُّنْيَا رَاغِبًا فِي الْآخِرَةِ وَإِنْ تُؤَمِّرُوا عُمَرَ تَجِدُوهُ قَوِيًّا أَمِينًا لَا يَخَافُ فِي اللهِ لَوْمَةَ لَائِمٍ وَإِنْ تُؤَمِّرُوا عَلِيًّا وَلَا أَرَاكُمْ فَاعِلِينَ تَجِدُوهُ هَادِيًا مَهْدِيًّا يَأْخُذُ بِكُمُ الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ رَوَاهُ أَحْمَدُ.

آپ سے عرض کیا گیا کہ یا رسول اللہ ہم آپ کے بعد کس کو امیر بنائیں؟ آپ نے فرمایا اگر ابو بکر کو اپنا امیر بنا لوگے تو اسے امین پاؤگے، دنیا سے بیزار آخرت کے طلبگار، اور اگر عمر کو امیر بنا لوگے تو اسے مضبوط امانتدار پاؤگے جو اللہ کے معاملہ در راستہ میں کسی بھی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈرتا اور اگر تم علی کو امام بناؤگے، اور میرا خیال ہے تم ایسا نہیں کروگے تو اس کو ہدایت کرنے والا اور ہدایت یافتہ پاؤگے تم کو سیدھے رستے پر لگائے گا۔ رواہ احمد۔

یہ التماس اور استفسار بتاتا ہے کہ نزول آیت کے وقت بموجودگی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم امر امارت میں تردد موجود تھا تو اس صورت میں انما کے معنی باطل نہ ہوئے تمت کلامہ،

یہاں بھی بات غور و فکر کی ہے، اس لئے کہ محض سوال و دریافت، تردد کا تقاضہ نہیں کرتا ہاں جناب نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا جواب سننے کے بعد باہمی مشورہ کرتے اور امیر بنانے میں ایک دوسرے سے مختلف الخیال ہوتے اور نزاع و جھگڑا کرتے تو البتہ انما کے معنے متحقق ہوتے اس وقت یہ کہہ سکتے تھے کہ ان میں تردد و شک پایا جاتا تھا، صرف التماس و استفسار انما کی ضرورت نہیں، یہ موقع تراق کا ہے جیسا کہ علم معانی کے ابتدا میں بحث موکدات اسناد میں اس کا ذکر ہے، کہ ایسے موقعہ پہ انّ کا استعمال ہوتا ہے انما کا نہیں۔ آہ بے چارے ملا جی! کہ ان کو ابھی تک انّ اور انما میں بھی تمیز کرنا نہ آیا،

اور اگر ان کا دل رکھنے کی خاطر، تردد کی موجودگی مان بھی لیں تو یہ کہاں سے معلوم ہوا کہ یہ تردد نزول آیت سے پہلے تھا یا بعد میں پیدا ہوا ہو، اگر پہلے تھا تو متصل تھا یا کچھ فاصلہ سے، اگر متصل تھا تو یہ اتصال اتفاقی تھا یا یہ واقعہ آیت کے نزول کا سبب بھی تھا، یہ تمام امور سند صحیح کے ساتھ ہنوز تشنۂ بیان ہیں اور مقام استدلال میں خالی خولی احتمالات کی کوئی گنجائش نہیں دوسرے اسباب نزول کوئی عقلی امر نہیں، بغیر خبر صحیح کے محض احتمالات پر کوئی کیوں کان دھرے ان سے کس طرح ثبوت فراہم کرے اس کو تو مفسرین ہر دو فرقہ میں سے کسی نے بھی سبب نزول قرار نہیں دیا تو معلوم ہوا کہ یہ واقعہ نزول آیت کے متصل نہیں تھا ممکن ہے بعد کا واقعہ ہو بہر صورت یہ ان کے مفید مطلب بالکل نہیں،

اور طرفہ تماشا یہ کہ جو حدیث بیان کی ہے وہ کلمہ انما کے ساتھ واضح خلاف اور منافات رکھتی ہے کیونکہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا جواب اس سوال کے ذیل میں ہے کہ لائق خلافت و امامت کون ہے اور جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ ان اشخاص میں سے ہر ایک کو استحقاق خلافت ہے لیکن ترتیب اسما میں در حقیقت شیخین کو مقدم رکھنے کی طرف اشارہ ہے،

تو اس حدیث میں حضور کے جواب اور سائل کے سوال میں صاف منافات نکلی کیونکہ آیت میں تو انما خلافت کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لئے مخصوص کر رہا ہے اب اگر آیت کو حدیث سے مقدم مانیں تو رسول اللہ کا فرمان قرآن کے مخالف ہوتا ہے اور اگر آیت حدیث سے بعید ہے تو قرآن سے نبی کریم کے قول کی تردید و تکذیب لازم آتی ہے اور اس بات کی یہاں گنجائش نہیں کہ یہ کہدیں کہ ایک نے دوسرے کو منسوخ کر دیا، کیونکہ حدیث و آیت دونوں باب اخبار سے ہیں اور اخبار میں نسخ جائز نہیں، اور اس کے ساتھ یہ بات بھی ہے کہ چونکہ ان میں سے ایک کا دوسرے پر تقدم و تاخر معلوم نہیں تو منافات کے سبب، ہر دو کا عمل ساقط ہوا۔

اگر وہ یہ کہیں کہ حدیث خبر واحد ہونے کی وجہ سے مسئلہ امامت میں قابل تمسک نہیں تو ہم کہیں گے کہ پھر یہ تردد اور اثبات نزاع میں بھی قابل استدلال نہیں رہے گی،

پھر ایک بات یہ بھی ہے کہ خود آیت کے ساتھ استدلال بھی تردد و نزاع کے ثبوت پر موقوف ہے اور وہ ثبوت ہے نہیں تو شیعوں کا اس آیت سے استدلال بھی غلط ہوا کیونکہ مسئلہ امامت میں ایسی آیت سے بھی استدلال جائز نہیں جس کی خبر واحد پر موقوف ہو،

اور پہلی حدیث میں استخلاف کو امت کے حق میں ترک اصلح فرمایا پس اگر آیت انما ولیکم اللہ استخلاف پر دلالت کرے تو جناب الٰہی سے ترک اصلح کا صدور لازم آئے گا، جو محال ہے لہذا پہلی حدیث ان کو منع کرتی ہے کہ اس مسئلہ میں اس آیت سے استدلال نہ کریں،

یہ ان کے چیدہ اور برگزیدہ علماء کی باتیں ہیں کہ علمی جلالت شان رکھتے ہوئے بھی کوئی ڈھنگ کی بات نہیں کہہ سکتے پھر ان کی دوسری پادر ہوا باتیں جو ان کے منہ سے بے سوچے سمجھے نکلتی ہیں ہم نقل کرنے بیٹھ جائیں تو خواہ مخواہ وقت کا ضیاع ہو گا اور بات بے فائدہ لمبی ہو جائے گی،

ان کے بعض اقوال میں سے ایک یہ ہے کہ آیت،

www.Ahlehaq.com

إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا — اے اہل بیت اللہ چاہتا ہے کہ تم سے نجاست دور کرکے تم کو پورا پورا پاک کردے،

کے بارے میں سارے مفسرین متفق القول ہیں کہ یہ آیت حضرت علی بی بی فاطمہ اور حضرات حسنین رضی اللہ عنہم کے حق میں نازل ہوئی اور تاکیدی پہلو کے لحاظ سے ان کی عصمت کا ثبوت دیتی ہے، اور غیر معصوم امام نہیں ہوتا۔

یہاں بھی مقدمات گڑبڑ ہیں۔ اول تو اجماع مفسرین ان کے اتفاق قول کا دعوٰی ہی غلط ہے، اس لئے کہ ابن ابی حاتم حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کرتا ہے کہ یہ آیت ازواج مطہرات کے حق میں نازل ہوئی ہے، اور ابن جریر عکرمہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتا ہے کہ وہ علی الاعلان کوچہ و بازار میں یہ کہتے پھرتے تھے کہ یہ آیت ازواج مطہرات کے بارے میں اتری ہے، اور سیاق و سباق آیت کے لحاظ سے یہی بات ظاہر و صحیح ہے، کیونکہ يَا نِسَاءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَأَحَدٍ مِّنَ النِّسَاءِ سے اطعن بلکہ والحکمۃ تک ازواج مطہرات ہی سے خطاب ہے اور امر و نہی کا تعلق انہیں سے ہے، تو اب ایک سلسلہ کلام میں دوسروں کا حال لے آنا اس تنبیہ کے بغیر کہ پہلا کلام ختم دوسرا شروع، طریقہ بلاغت کے خلاف ہے جس سے قرآن مجید کو پاک جاننا اور ماننا چاہیئے پھر بیوتکن کا لفظ بڑھا کر بیوت ازواج مطہرات کی طرف اشارہ کرنا بھی اسپر دلالت کرتا ہے کہ آیت میں اہل بیت سے ازواج مطہرات ہی مراد ہیں اس لئے کہ ازواج مطہرات کے بیوت کے علاوہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا اور کون سا بیت تھا یا ہو سکتا تھا،

ملا عبداللہ کہتا ہے کہ بیوتکن میں بیوت کو جمع کی صورت میں لانا اور اہل بیت میں واحد کی صورت میں یہ بتاتا ہے کہ ان کے بیوت بیت نبوت کے علاوہ ہیں اگر وہ اہل بیت ہوتیں تو کلام یوں ہوتا واذکرن ما یتلی فی بیتکن بجائے بیوتکن کے۔

اب ذرا انصاف سے کام لے کر دیکھیں کہ یہ پڑھے لکھے عالم و دانشمند ملا جی کتنی بے مغز اور پوچ بات کہ رہے ہیں۔ اہل بیت میں بیت کو جو اسم جنس ہے جس کا اطلاق قلیل و کثیر سب پر ہوتا ہے، اس اعتبار سے کہ اس کی نسبت و اضافت آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف ہے مفرد لائے کہ ازواج مطہرات کے سب گھر اس اضافت کے اعتبار سے ایک گھر کی جگہ ہیں اور بیوتکن میں چونکہ اضافت ازواج مطہرات کی طرف ہے اور وہ متعدد ہیں، اس اعتبار سے جمع کا صیغہ لائے

اور ملا عبداللہ نے جو یہ کہا ہے کہ معطوف معطوف علیہ میں فاصلہ لانا اگرچہ طویل ہو کوئی حرج کی بات نہیں اس لئے کہ اس آیت کریمہ میں یہ واقع ہے أَطِيعُوا اللَّهَ وَالرَّسُولَ فَإِن تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا عَلَيْهِ مَا حُمِّلَ پھر آیت کے ختم پر فرمایا وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ مفسرین کا قول ہے کہ اقیموا الصلوٰۃ کا عطف اطیعوا الرسول پر ہے تمت کلامہ

ان کا یہ قول پہلے قول سے بھی زیادہ لچر اور پوچ ہے اس لئے کہ معطوف علیہ و معطوف میں فاصلہ ایسے اجنبی امر سے جو نحوی اعراب کے اعتبار سے کوئی تعلق نہ رکھتا ہو بے شک جائز ہے لیکن یہ فاصلہ

www.Ahlehaq.com

www.Ahlehaq.com

ہمارے لئے موجب نقص نہیں اس لئے کہ ہماری بحث کا تعلق اس اجنبیت اور مغائرت ہی سے ہے جو اگلی پچھلی آیات کے موقع و محل کے اعتبار سے پیدا ہوتی ہے اور بلاغت کے خلاف یہ صورت ہے وہ نہیں،

اور یہ بات جو انہوں نے بعض مفسرین کے حوالہ سے نقل کی ہے کہ اقیموا الصلوٰۃ اطیعوا الرسول پر معطوف ہے صریحاً غلط ہے اس لئے کہ اقیموا الصلوٰۃ کے بعد پھر اطیعوا الرسول آیا ہے، اس صورت میں عطف الشیٔ علی نفسہ (کسی چیز کا عطف خود اسی چیز پر) لازم آتا ہے،

اور اس سے بھی زیادہ لچر اور مضحکہ خیز بات انہوں نے یہ کہی ہے کہ "آیات میں مغائرت انشائی اور خبری کا ہے کیونکہ آیت تطہیر جو جملہ ندائیہ اور خبریہ ہے اور اس کے قبل و بعد امر و نہی ہے۔ یہ انشائیہ ہے اور انشائیہ کا عطف خبریہ پر قطعاً ممنوع ہے"

اول تو آیت تطہیر میں حرف عطف ہے ہی کہاں بلکہ وہ تو اَطِعْنَ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ میں جو اطاعت کا امر ہے اس کی علت ہے اور انشائیہ کو خبریہ کی علت ٹھیرانا، پورے قرآن و حدیث اور فصحاء و بلغاء عرب کے کلام میں مشہور اور رائج ہے مثلاً یہ کہتے ہیں، اِضْرِبْ زَیْدًا اِنَّہٗ فَاسِقٌ یا اَطِعْنِیْ بِاَعْلٰی مُرَادِیْ اِنَّمَا اُرِیْدُ اَنْ اُکْرِمَکَ اور اگر وَاذْکُرْنَ کا عطف مراد لیتا ہے، تو اس کے معطوف علیہ، اَطِعْنَ قَرْنَ اور دوسرے سابق حکم ہیں نہ کہ اِنَّمَا۔

یہیں سے ان کے علماء کی عربی دانی کی پول بھی کھل جاتی ہے اور نحو و صرف میں اتنی وامنح کوتاہی کے باوجود چاہتے یہ ہیں کہ کلام اللہ کے مفسر بنیں، شاید خواب میں کسی چوہے کو اونٹ بنتے دیکھ لیا ہوگا یا ہلدی کی گرہ پاکر پنساری بننے کا خواب دیکھنا چاہتے ہوں گے،

اور عنکم میں مذکر کے صیغہ کا استعمال اھل کے لفظ کے لحاظ سے ہے اہل عرب کا یہ قاعدہ ہے کہ جب کسی ایسی چیز کو جو حقیقت میں مؤنث ہو مذکر لفظ سے تعبیر کرنا چاہتے ہیں تو اس کے لئے مذکر کا صیغہ استعمال کرتے ہیں جیسے قرآن مجید کی اس آیت میں

اَتَعْجَبِیْنَ مِنْ اَمْرِ اللّٰہِ رَحْمَتُ اللّٰہِ وَبَرَکَاتُہٗ عَلَیْکُمْ اَھْلَ الْبَیْتِ اِنَّہٗ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ۔

اللہ کے حکم سے جو تم پر رحمتیں اور برکتیں ہیں تو اے اہل بیت کیا تم ان پر تعجب کرتی ہو۔ اللہ بے شک تعریف کیا ہوا بزرگ ہے،

اور ترمذی نیز صحاح کی دوسری کتابوں میں جو یہ روایت ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے چار افراد کو اپنے کمبل کی تکل میں لے کر یہ دعا فرمائی،

اَللّٰھُمَّ ھٰؤُلَآءِ اَھْلُ بَیْتِیْ فَاَذْھِبْ عَنْھُمُ الرِّجْسَ وَطَھِّرْھُمْ تَطْھِیْرًا

اے اللہ یہ میرے اہل بیت ہیں ان سے ناپاکی دور کر اور ان کو پورا پورا پاک فرما دے۔

اور جب ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا اسوقت آئیں اور کہا کہ مجھے بھی ان میں شریک فرما لیجئے تو آپ نے فرمایا۔ اَنْتِ عَلٰی خَیْرٍ وَّاَنْتِ عَلٰی مَکَانِکِ (تم تو میری ہو ہی اور تمہارا تو خود ایک مقام ہے یہ واقعہ صاف طور پر اس بات کی دلیل کہ آیت تطہیر ازواج مطہرات ہی کے حق میں نازل ہوئی تھی اور یہ

چار تھیں چونکہ آپ کے جگر پارے اور عزیز تھے مگر آیت کا مصداق نہ تھے اس لئے آپ نے ان کو بھی اس وعدہ الٰہی میں شریک کرنے کی خصوصی دعا فرمائی اگر آیت انہیں کے حق میں اتری ہوتی تو اس اہتمام سے دعا کی کیا ضرورت تھی اور ایک حاصل شدہ بات کی خاطر آپ دوبارہ کیوں کوشش فرماتے اور اسی لئے آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کو اس میں شریک نہیں فرمایا کہ ان کے لئے تو وعدہ الٰہی نازل ہو چکا تھا اس لئے ان کے حق میں یہ دعا تحصیل حاصل ہوتی،

اور اہل سنت کے محقق علماء کا یہ خیال ہے کہ گو یہ آیت خطاب تو ازواج مطہرات سے کر رہی ہے لیکن چونکہ اعتبار عموم لفظ کا ہوتا ہے خصوص سبب کا نہیں اس لئے تمام اہل بیت اس بشارت میں داخل ہیں اور حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے جو چار افراد کے لئے دعا فرمائی وہ کسی سبب خاص کی بنا پر فرمائی،

اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ صلے اللہ علیہ وسلم نے سیاق وسباق کلام یا کسی قرینہ سے یہ محسوس فرما لیا ہو کہ یہ آیت ازواج مطہرات کے لئے ہی خاص ہے۔ دیگر اہل بیت اس سے مراد نہیں تو آپ نے خصوصیت کے ساتھ چار اشخاص کے لئے دعا فرمائی۔ اور بیہقی کی صحیح روایت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ایسا ہی معاملہ آپ نے اپنے محترم چچا حضرت عباس اور آپ کی اولاد کیلئے بھی فرمایا، بیہقی نے ابی اسید الساعدی سے یہ روایت بایں الفاظ نقل کی ہے

قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِلْعَبَّاسِ بْنِ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ يَا أَبَا الْفَضْلِ لَا تَرِمْ مَنْزِلَكَ أَنْتَ وَبَنُوكَ غَدًا حَتَّى آتِيَكُمْ فَإِنَّ لِي بِكُمْ حَاجَةً فَانْتَظَرُوهُ حَتَّى جَاءَ بَعْدَ مَا أَضْحَى فَدَخَلَ عَلَيْهِمْ وَقَالَ السَّلَامُ عَلَيْكُمْ فَقَالُوا وَعَلَيْكَ السَّلَامُ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهُ قَالَ كَيْفَ أَصْبَحْتُمْ قَالُوا أَصْبَحْنَا بِخَيْرٍ نَحْمَدُ اللّٰهَ فَقَالَ لَهُمْ تَقَارَبُوا فَتَزَحَّفَ بَعْضُهُمْ إِلَى بَعْضٍ حَتَّى إِذَا أَمْكَنُوهُ اشْتَمَلَ عَلَيْهِمْ بِمُلَاءَتِهِ ثُمَّ قَالَ يَا رَبِّ هٰذَا عَمِّي وَصِنْوُ أَبِي وَهٰؤُلَاءِ أَهْلُ بَيْتِي فَاسْتُرْهُمْ مِنَ النَّارِ كَسَتْرِي إِيَّاهُمْ بِمُلَاءَتِي هٰذِهِ قَالَ فَأَمَّنَتْ أُسْكُفَّةُ الْبَابِ وَحَوَائِطُ الْبَيْتِ وَقَالَتْ آمِينَ آمِينَ آمِينَ

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے عباس بن عبدالمطلب سے فرمایا اے ابو الفضل کل جب تک میں تمہارے پاس نہ آؤں تم اور تمہارے لڑکے باہر گھر سے نہ جائیں مجھے تم سے کچھ کام ہے۔ پس وہ آپ کے منتظر رہے یہاں تک کہ آپ چاشت کے بعد تشریف لے آئے، اور ان کے پاس پہنچ کر السلام علیکم فرمایا ان سب نے جواب میں وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ کہا پھر آپ نے فرمایا صبح کیسی گذری سب نے کہا خدا کا شکر ہے خیریت سے گزری پھر آپ نے فرمایا قریب قریب آجاؤ وہ سب کھسک کر آپ کے قریب مل جل کر بیٹھ گئے تب آپ نے ان سب کو اپنی چادر مبارک کی بکل میں لے لیا اور فرمایا اے میرے رب یہ میرے چچا ہیں، میرے باپ کے سگے۔ اور یہ میرے اہل بیت۔ تو ان کو آتش دوزخ سے اس طرح آڑ میں لے لے جس طرح میں نے ان کو اپنی چادر کی اوٹ میں لے لیا ہے راوی کا بیان ہے کہ آپ کی اس دعا پہ گھر کے در و دیوار بام و در سب نے تین مرتبہ آواز بلند آمین کہی۔

ابن ماجہ نے بھی یہ روایت مختصراً اپنے ہاں بیان کی ہے اور دوسرے محدثین نے بھی یہ قصہ متعدد طریقوں سے اعلام النبوۃ میں روایت کیا ہے۔

www.Ahlehaq.com

www.Ahlehaq.com

"ملا عبد اللہ نے یہ کہا ہے کہ بیت سے مراد بیت نبوت ہے، اور اس میں تو شک نہیں کہ اہل بیت کا لفظ باعتبار لغوی معنی ازواج کو بھی شامل ہے بلکہ اس فرد پر بولا جاتا ہے جو اس گھر میں رہتا بستا ہو، مثلاً خدام غلام وغیرہ۔ لیکن اس پہ اتفاق ہے کہ یہ وسیع لغوی معنے مراد نہیں لہذا اس سے مراد خمسہ آل عبا ہوں گے جن کی تخصیص حدیث کسا نے کی"

اس کی یہ بات بھی پہلے بیان شدہ باتوں جیسی ہی ہے۔ کیونکہ اس وسیع لغوی معنے کے مراد لینے میں جو قباحت ان کو لازم آتی ہے، وہ عصمت کی عمومیت ہے اگر یہ سب کو مراد لے لیتے ہیں، تو سب کو "معصوم" بھی ماننا پڑے کیونکہ وہ اہل بیت کی معصومیت پر اس آیت ہی سے تو استدلال کرتے ہیں،

اور جب اہل سنت شیعوں کے ساتھ اس بات میں متفق نہیں کہ اس آیت سے عصمت سمجھی جاتی ہے اور خمسہ آل عبا۔ اور ازواج مطہرات میں عصمت (معصومیت) کے قائل نہیں، تو اس عمومی معنے مراد لینے میں ان سے کیوں متفق ہونگے یہ تو ایک طرح سے اللہ تعالیٰ کی رحمت کے وسیع دائرہ کو تنگ کرنا ہوگا،

پھر اگر وہ وسیع لغوی معنی مراد نہ بھی ہوں تب بھی وہ اس لحاظ سے کہ اگلی پچھلی آیات کے قرائن مراد کو متعین کر رہے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ باعتبار عرف عقل بھی اس لفظ کو ان لوگوں کے لئے مخصوص کرتی ہے، جو گھر میں سکونت پذیر ہوں اور عادۃً ان میں انتقال، تحول اور تبدل کا سلسلہ جاری نہ ہو مثلاً ازواج و اولاد نہ کہ خادم، غلام اور کنیزیں، کہ یہ تبدیلی، رد و بدل کا نشانہ بنے رہتے ہیں

خادم نوکری چھوڑ کر دوسرے کے پاس چلا جا سکتا ہے غلام و کنیز کی ملکیت بدل سکتی ہے وہ بک کر کسی اور مالک کے پاس چلے جا سکتے ہیں، یا بخشش کے طور پر کسی کو دیئے جا سکتے ہیں یا آزاد ہو کر یہ گھر چھوڑ دیتے ہیں، اور حدیث کسا۔ اہل بیت کے ساتھ ان چند اشخاص کو اس وقت مخصوص کرتی جب اس تخصیص کا کوئی اور فائدہ نظر نہ آتا۔ حالانکہ یہاں اس کا دوسرا فائدہ یہ پیش نظر ہے کہ صرف ازواج مطہرات کے مخاطب ہونے کے سبب یہ خیال پیدا نہ ہو کہ یہ چند اشخاص اہل بیت میں نہیں۔

کتنی حیرت اور تعجب کی بات ہے کہ پورا عالم اسلام، کیا سنی یا شیعہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی ازواج کے ذکر کے وقت ہمیشہ ان کی تعظیمی لقب "مطہرات" سے یاد کرتا ہے، چنانچہ نور اللہ شوستری اور ملا عبد اللہ مشہدی اور ان کے دوسرے علماء کی تحریروں میں ہزاروں جگہ لکھا دیکھا گیا ہے اور ظاہر ہے یہ لقب اسی آیت تطہیر سے لیا گیا ہے اور لفظ مطہرات بلا ریب و شک اور بے دغدغہ ان کے منصف لوگوں کی زبانوں پہ جاری ساری رہتا ہے، اس کے باوجود اگر کوئی ان سے یہ کہدے کہ آیت تطہیر ازواج نبی صلے اللہ علیہ وسلم کی طہارت و تطہیر کا پتہ دیتی ہے، تو ان کی رگ پھول جاتی ہے،۔ اور لڑاکا مرغ کی طرح (بحث و جدال میں) الجھ پڑتے اور جھگڑنے لگتے ہیں،

اب رہا یہ مسئلہ کہ یہ آیت عصمت پہ دلالت کرتی ہے یا نہ، تو یہ چند بحثوں پر مبنی ہے ایک تو یہ کہ کلمہ لیذھب عنکم الرجس ترکیب نحوی میں کیا واقع ہوا ہے۔ آیا یہ یرید کا مفعول لہ ہے یا مفعول بہ دوسرے اہل بیت سے کیا مراد ہے، اور تیسرے رجس سے کیا مراد ہے۔

ان تینوں امور میں بحث و گفتگو کی بڑی گنجائش ہے، اس پر کی گئی بحثوں کے لئے بڑی بڑی کتب تفاسیر کی طرف رجوع کرنا چاہیئے، رد و کد کے بعد اگر نتیجہ یہ نکلے کہ لیذھب مفعول بہ ہے اور اہل بیت کا انحصار انہیں چار اشخاص میں ہے۔ اور رجس سے مراد مطلق گناہ ہیں۔ پھر بھی اس آیت کی عصمت پر دلالت قابل تسلیم نہیں بلکہ یہ اس وقت بھی عدم عصمت پر ہی دلالت کریگی۔ کیونکہ کسی پاک چیز کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ہم اس کو پاک کرنا چاہتے ہیں زیادہ سے زیادہ اس ارادہ کے وجود میں آنے کے بعد ان چند اشخاص کا گناہ سے محفوظ رہنا ثابت ہوگا اور یہ حفاظت بھی اہل سنت کے اصول کے ماتحت ہوگی، شیعہ اصول کے بموجب نہیں کیونکہ ان کے نزدیک ارادۂ الٰہی، مراد الٰہی کے وقوع کے لئے لازم نہیں۔ اللہ تعالیٰ بہت سی چیزوں کا ارادہ کرتا ہے مگر شیطان یا بنی آدم اس کو وقوع میں نہیں آنے دیتے، اس کی تفصیل باب الٰہیات میں گزر چکی، اور اگر مقصود الٰہی عصمت ہی ظاہر کرنا ہوتا تو اس کے لئے یوں عبارت لائی جاتی،

اِنَّ اللّٰہَ اَذْھَبَ عَنْکُمُ الرِّجْسَ وَطَھَّرَکُمْ تَطْھِیْرًا اور یہ ایسی صاف و ظاہر بات ہے جسے غبی اور معمولی سمجھ کا آدمی بھی سمجھ سکتا ہے چہ جائیکہ ذکی، اور علامہ!

اور پھر اگر یہ کلمہ عصمت کو ثابت کرتا ہوتا تو پھر تمام صحابہ بالعموم اور اصحاب بدر بالخصوص سب کے سب معصوم ہوتے اس لئے کہ ان کے حق میں تو یہ کلمہ کئی مرتبہ فرمایا گیا ہے، مثلاً۔

وَلٰکِنْ یُّرِیْدُ لِیُطَھِّرَکُمْ وَلِیُتِمَّ نِعْمَتَہٗ عَلَیْکُمْ وَلَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ۔ — اور لیکن چاہتا ہے کہ تم کو پاک کرے اور تم پر اتمام نعمت کرے تاکہ تم شکر بجالاؤ،

وَیُذْھِبَ عَنْکُمْ رِجْزَ الشَّیْطَانِ۔ — اور دور کر دے تم سے شیطانی گندگی کو۔

ان دو لفظوں سے جن سے عصمت کا اظہار ہوتا ہے ان آیات میں تو صحابہ کے لئے اتمام نعمت کی مہربانی و عنایت مزید ثابت ہو گئی کیونکہ اتمام نعمت تو اس وقت تک تصور میں بھی نہیں آ سکتا جب تک گناہوں اور شر شیطان سے حفاظت نہ کی جائے،

اب وہ تخصیصات جو لفظ تطہیر اور اذہاب رجس سے بطریق احتمال و شک ثابت کی جارہی تھیں، کہاں گئیں وہ تو غبار کی طرح ہوا میں اڑ گئیں،

تیسری بات وہ یہ کہتے تھے کہ غیر معصوم امام نہیں ہوتا ان کا یہ خیال بھی سراسر باطل اور ناقابل تسلیم ہے۔ کتاب اللہ اور عترت رسول دونوں اس کی تردید کرتی ہیں،

پھر اگر اسے مان بھی لیں تو اس دلیل سے جناب علی رضی اللہ عنہ کی صرف امامت ثابت ہوئی لیکن یہ کہ وہ امام بلا فصل تھے یہ کیسے ثابت ہوا۔

کیا یہ جائز ہے کہ سبطین محترمین رضی اللہ عنہما میں سے کوئی ایک جناب امیر رضی اللہ عنہ کے عین حیات امام ہو سکتا ہے!۔ اگر نہیں۔ تو اس طرح یہ کیسے جائز و ممکن ہے کہ حضرت امیر رضی اللہ عنہ کی خلافت اگرچہ خلفائے ثلاثہ رضوان اللہ علیہم کے بعد ہو مگر وہ ہوں "امام بلا فصل" ایسی بات سے استدلال کرنا جس کا کوئی قائل ہی نہ ہو علم و عقل سے عاجزوں کا کام ہے، کیونکہ معترض کا جب کوئی مذہب نہ ہو تو وہ اعتراض سے کیسے

بخش دے گا،

ان کے سابقہ سلسلہ کے مسائل میں سے ایک بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے،

- قُلْ لَا اَسْئَلُکُمْ عَلَیْہِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّۃَ فِی الْقُرْبٰی۔ آپ کہئے کہ میں تبلیغ دین الٰہی کے سلسلہ میں بجز اپنے قرابتداروں سے محبت کے تم سے کوئی بدلہ نہیں مانگتا۔

اس وقت سب نے پوچھا یا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم آپ کے وہ قرابتدار کون ہیں، جن کی محبت ہم پر واجب کی گئی ہے، آپ نے فرمایا، علی۔ فاطمہ اور ان کے دو بیٹے (رضی اللہ عنہم) واضح رہے کہ یہ آیت تو اہل سنت کی دلیل ہے جو وہ نواصب کے مقابلہ میں اہل بیت کی محبت کو واجب ثابت کرنے کی غرض سے پیش کرتے ہیں، چنانچہ علامہ قرطبی اور دوسرے اہل سنت جو شام کے نواصب سے مناظرہ کرتے تھے اس آیت کو اپنی دلیل کے طور پہ پیش کرتے تھے، شیعوں نے اسے ان کی کتابوں سے چرایا اور خلفائے ثلاثہ رضوان اللہ علیہم کی خلافت کی نفی کی دلیل بنا بیٹھے اور دلیل میں دو تین کلمے اپنی طرف سے بڑھا کر یوں کہنے لگے "کہ اہل بیت کی محبت واجب ہے اور جس کی محبت واجب ہو اس کی اطاعت بھی واجب ہوتی ہے گویا یوں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اطاعت واجب ہوئی، اور یہی امام ہونے کے معنے ہیں۔ اور ان کے علاوہ کسی کی محبت واجب نہیں لہٰذا اطاعت بھی واجب نہیں،،

اس استدلال کا جواب یہ ہے کہ اس آیت کی مراد کیا ہے اس میں مفسرین کا زبردست اختلاف ہے طبرانی اور امام احمد رحمہما اللہ۔ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت اسی طرح کی ہے لیکن اکثر محدثین نے اس روایت کو کمزور ثابت کیا ہے کیونکہ یہ آیت سورہ شوریٰ کی ہے اور پوری کی پوری سورہ شوریٰ مکی ہے جب کہ حضرات حسنین کی پیدائش کا تو کیا سوال بی بی فاطمہ الزھرا رضی اللہ عنہا حضرت علی سے منسوب تک نہ ہوئی تھیں،

پھر اس سند میں کٹر شیعہ بھی گھسے ہوئے ہیں محدثین میں سے جس کسی نے اس شیعہ کو سچا سمجھا ہوگا وہ اس کے ظاہری حالات کو دیکھ کر اور اس کے عقیدہ سے ناواقف ہوتے ہوئے کہا ہوگا اور گمان غالب یہ ہے کہ اس شیعہ نے بھی جھوٹ نہیں بولا ہوگا بلکہ روایت بالمعنی کی ہوگی،

حدیث میں لفظ اہل بیتی ہوگا اس نے اپنے عقیدہ کے مطابق اہل بیت کی تشریح انہیں چار سے کر دی چنانچہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ روایت جوں کی توں بیان کی ہے اس کے الفاظ یوں ہیں۔ اَلْقُرْبٰی مَنْ بَیْنَہٗ وَبَیْنَ النَّبِیِّ صلے اللہ علیہ وسلم قَرَابَۃٌ (قربیٰ وہ ہیں جس کے اور نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے درمیان قرابت ہو)

اور قتادہ، سدی کبیر اور سعید بن جبیر رحمہم اللہ نے وثوق سے کہا ہے کہ آیت کے یہ معنی ہیں، "کہ میں تم سے دینی دعوت اور تبلیغ مذہبی کا کوئی صلہ نہیں مانگتا لیکن تم سے اپنے ساتھ دوستی چاہتا ہوں اس قرابت کی بنا پر جو تمہارے ساتھ رکھتا ہوں"

www.Ahlehaq.com

www.Ahlehaq.com

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی بخاری میں یہ روایت تفصیل سے مذکور ہے کہ قریش میں کا کوئی خاندانی سلسلہ ایسا نہ تھا، جس سے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا رشتہ قرابت نہ ہو، لہذا آپ نے اس کی یاددہانی فرمائی اور اس قرابت کے حق کی ادائیگی چاہی کہ کم ازکم ایذا رسانی سے تو باز رہیں، جو صلہ رحمی کا ادنیٰ درجہ ہے اس صورت میں یہ استثنا منقطع ہے،

چنانچہ امام رازی رحمہ اللہ علیہ اور تمام مفسرین متاخرین نے اس معنی کو پسند کیا ہے اس لئے کہ پہلے معنی شان نبوت کے مناسب نہیں یہ تو دنیاداروں کی خصلت ہے کہ جب کوئی کام کرتے ہیں، تو اس کا صلہ اولاد و اقارب کے لئے چاہتے، اگر انبیا کی بھی یہی روش ہو تو ان کے اور عام دنیاداروں کے مابین فرق و امتیاز کیا رہ جائے اور پھر ان کے اقوال و افعال میں لوگوں کی شک و شبہ کرنے کا بہانہ بھی ہاتھ آ سکتا تھا، اور یوں بعثت کا مقصد ہی فوت ہو جاتا،

اور پھر ان معنوں کے مطابق یہ آیت بہت سی دوسری آیات کے منافی بھی ہو جاتی جیسے کہ دوسری جگہ ارشاد ہے،

مَا سَأَلْتُكُمْ مِنْ أَجْرٍ فَهُوَ لَكُمْ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَى اللَّهِ ۔	جو اجر میں تم سے چاہوں وہ تمہارے لئے میرا اجر تو اللہ کے ذمہ ہے،
أَمْ تَسْأَلُهُمْ أَجْرًا فَهُمْ مِنْ مَغْرَمٍ مُثْقَلُونَ ۔	کیا تم ان سے اجر مانگو گے یہ تو آپ ہی ڈنڈ سے بوجھل ہو رہے ہیں،

اور سورہ شعراء میں تمام انبیاء علیہم السلام کی زبان سے اجرت طلبی سے انکار نقل فرمایا ہے تو نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم جو افضل الانبیاء ہیں، کب اجر طلب فرما سکتے تھے کیا اس صورت میں آپ کا مقام ان انبیاکرام سے نیچا نہ ہو جاتا۔ حالانکہ ایسا ہونا خلاف اجماع ہے،

دوسرا جواب یہ ہے کہ ہم یہ مفروضہ تسلیم نہیں کرتے کہ جو واجب المحبت ہو وہ واجب الاطاعت بھی ہو اور نہ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ جو واجب الاطاعت ہو وہ امام یعنی رئیس عام بھی ہو،

پہلی صورت کی یہ دلیل ہے کہ اگر محبت کا واجب ہونا اطاعت کے واجب ہونے کو لازم ہوتا تو یہ ضروری ہوتا کہ تمام علوی حضرات واجب الاطاعت ہوں اس لئے کہ شیخ بابویہ نے اپنی کتاب الاعتقاد میں لکھا ہے کہ باجماع امامیہ علوی کی محبت واجب ہے،

اور پھر اس سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ اس دلیل کی بنا پر بی بی فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا بھی امام ہوں حالانکہ یہ خلاف اجماع ہے، اور اس کی بنا پر یہ بھی لازم آتا ہے کہ یہ چاروں حضرات حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ میں بھی امام ہوں اسی طرح جناب حسنین رضی اللہ عنہما حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں بھی امام ہوں حالانکہ یہ صورت بالاتفاق غلط اور باطل ہے،

دوسری صورت یہ کہ اگر ہر واجب الاطاعت خلافت کبریٰ کا مالک ہے تو ہر نبی کو بھی خلافت کبریٰ کا مالک ہونا چاہیئے۔ حالانکہ یہ غلط ہے اس لئے کہ مثلاً حضرت شمویل نبی واجب الاطاعت تھے، اور حضرت طالوت

خلافت کبریٰ کے مالک۔ خود قرآن ارشاد میں فرمایا ہے،

إِنَّ اللَّهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوتَ مَلِكًا۔ اللہ تعالیٰ نے طالوت کو تمہارا بادشاہ کرکے بھیجا۔

ہماری طرف سے ایک اور جواب یہ ہے کہ ہم یہ بھی تسلیم نہیں کرتے کہ محبت صرف ان ہی چار حضرات کی واجب ہے بلکہ دوسرے بھی اس میں شریک ہیں، چنانچہ حافظ ابوطاہر سلفی نے اپنی مشیخت میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے۔

قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صلی اللہ علیہ وسلم حُبُّ أَبِي بَكْرٍ وَشُكْرُهُ وَاجِبٌ عَلَى كُلِّ أُمَّتِي۔

ابوبکر (رضی اللہ عنہ) کی محبت اور ان کا شکر یہ میری ساری امت پر واجب ہے،

ابن عساکر نے بھی حضرت انس رضی اللہ عنہ سے ابوطاہر سلفی جیسی روایت نقل کی ہے، اور ایک دوسرے طریقہ سے سہل بن سعد ساعدیؓ سے یہ روایت مروی ہے، اور حافظ عمر بن محمد خضر الملا اپنی سیرت میں یوں روایت کرتا ہے،

عَنِ النَّبِيِّ صلی اللہ علیہ وسلم أَنَّهُ قَالَ إِنَّ اللَّهَ تَعَالَى فَرَضَ عَلَيْكُمْ حُبَّ أَبِي بَكْرٍ وَعُمَرَ وَعُثْمَانَ وَعَلِيٍّ كَمَا فَرَضَ عَلَيْكُمُ الصَّلَاةَ وَالزَّكَاةَ وَالصَّوْمَ وَالْحَجَّ۔

نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تم پر ابوبکر، عمر، عثمان، اور علی رضی اللہ عنہم، کی محبت اسی طرح فرض کی ہے جس طرح نماز، روزہ زکوٰۃ اور حج تم پر فرض کئے،

ابن عدی نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے،

عَنِ النَّبِيِّ صلی اللہ علیہ وسلم أَنَّهُ قَالَ حُبُّ أَبِي بَكْرٍ وَعُمَرَ إِيمَانٌ وَبُغْضُهُمَا نِفَاقٌ

نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کی محبت ایمان ہے اور ان دونوں سے بغض نفاق،

اور ابن عساکر نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے،

أَنَّ النَّبِيَّ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ حُبُّ أَبِي بَكْرٍ وَعُمَرَ مِنَ الْإِيمَانِ وَبُغْضُهُمَا كُفْرٌ

نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کی محبت ایمان کا جز ہے اور ان سے بغض کفر

اور ترمذی نے روایت کی،

أَنَّهُ أُتِيَ بِجَنَازَةٍ إِلَى رَسُولِ اللَّهِ صلی اللہ علیہ وسلم فَلَمْ يُصَلِّ عَلَيْهِ وَقَالَ إِنَّهُ كَانَ يُبْغِضُ عُثْمَانَ فَأَبْغَضَهُ اللَّهُ۔

ایک جنازہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس لایا گیا آپ نے اس کی نماز نہیں پڑھی اور یہ فرمایا یہ عثمان رضی اللہ عنہ سے بغض رکھتا تھا تو اللہ نے بھی اس سے بغض رکھا

یہ روایات اگرچہ اہل سنت کی کتابوں سے مذکور ہیں لیکن چونکہ شیعہ اہل سنت کو الزام دینا چاہتے ہیں، اس لئے اس سلسلہ کی تمام روایات کو پیش نظر رکھے بغیر یہ مقصد حاصل نہیں ہوتا اپنے مطلب کی ایک آدھ روایت سنا دینے سے وہ دھونس میں نہیں آسکتے،

اور اگر شیعہ اہل سنت کو تنگ کرنے سے باز نہ آئیں تو کتاب اللہ اور عترت رسول کے اقوال سے بھی ان کو جواب دے کر ان کا منہ بند کیا جاسکتا ہے،

www.Ahlehaq.com

اللہ تعالیٰ نے فرمایا یحبھم و یحبونہ۔ یہ بالاجماع مرتدین سے لڑنے والوں کے حق میں ہے اور دنیا جانتی ہے کہ خلفائے کرام ان کے سرگروہ تھے اور اللہ تعالیٰ جس سے دوستی رکھے وہ واجب المحبت ہے اسی طرح اور بھی آیات ہیں،

خلافت بلا فصل کے سلسلہ میں ان کی طرف سے آیت مباہلہ بھی پیش کی گئی ہے،

قُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَاَبْنَآءَكُمْ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَكُمْ وَاَنْفُسَنَا وَاَنْفُسَكُمْ الخ	کہئے کہ آؤ ہم تم بلائیں اپنے اپنے بیٹوں عورتوں اور اپنے اپنے نفسوں کو۔

شیعہ کہتے ہیں کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضور صلے اللہ علیہ وسلم مباہلہ کے لئے گھر سے نکلے اور علیؓ فاطمہؓ، اور حسنینؓ کو ساتھ لیا تو معلوم ہوا کہ ابنیاء سے مراد حضرت حسن حسین رضی اللہ عنہما اور انفس سے حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں، گویا جناب امیر نفس رسول ٹھیرے اور یہ تو ظاہر ہے کہ نفس کے حقیقی معنے مراد لینا تو محال ہے، لامحالہ مساوی کے معنے ہوں گے اب جو مساوی رسول ہو تو وہ یقیناً دوسروں سے افضل اور اولیٰ بالتصرف ہوگا اس لئے کہ افضل و اولیٰ بالتصرف کا مساوی بھی افضل و اولیٰ بالتصرف ہوگا تو وہ امام ہوگا کیونکہ امام وہی تو ہے جو افضل و اولیٰ بالتصرف ہو۔ تک سک سے درست اور نظم و ترتیب کے ساتھ دلیل کی یہ تقریر ہمارے لفظوں میں ہے خود شیعہ علماء میں اتنا سلیقہ بھی نہیں کہ وہ ما فی الضمیر قاعدہ ضابطہ میں پیش کر سکیں دراصل ان پر اس کتاب کا یہ بڑا احسان ہے کہ ان کی اکثر بے ترتیب غیر منظم دلیلوں کو مناسب ترتیب اور مدلل و تقریر سے آراستہ و پیراستہ کیا اگر کسی کو ہماری یہ بات ماننے میں تامل ہو تو وہ ان کی کتابوں کو اٹھا کر دیکھ لے۔ کہ ان کا کلام کسقدر پراگندہ، بے ربط و بے جوڑ ہے یہاں تک کہ وہ اپنا مطلب بھی واضح نہ کر سکے۔

یہ آیت بھی دراصل اہل سنت کی دلیل ہے جس سے انہوں نے نواصب کے مقابلہ میں استدلال کیا سبب استدلال تو ظاہر ہے کہ جناب امیر اور دیگر افراد کو بوقت مباہلہ ساتھ لے جانا کسی وجہ اور سبب ترجیح پر مبنی ہے اور وہ دو حال سے خالی نہیں۔ یا تو وجہ یہ ہوگی کہ آپ ان حضرات کو عزیز و پیارا جانتے تھے مقصد یہ تھا کہ جب ان کو مباہلہ کے وقت جو بظاہر خطرہ ہلاکت سے خالی نہ تھا لے آئیں گے تو مخالف کو آپ کی نبوت کی صداقت پر پورا وثوق اور اعتماد پیدا ہوگا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش میں جس کی آپ خبر دے رہے ہیں ہرگز شک نہ کریں گے کیونکہ کوئی بھی عقلمند جب تک اپنے دعویٰ کی سچائی پر پورا یقین رکھتا ہو خود کو اور اپنے پیاروں کو معرض ہلاکت میں نہیں ڈالا کرتا۔ نہ اس پر قسم کھاتا ہے۔

اکثر اہل سنت و شیعوں نے یہ وجہ پسند کی ہے۔ اور ملا عبد اللہ نے اظہار الحق میں اس کو پسند کر کے ترجیح دی ہے،

اس بنا پر اس آیت سے ان حضرات کا حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے نزدیک عزیز و محبوب ہونا ثابت ہوگا چونکہ پیغمبر حب و بغض نفسانی سے پاک ہوتا ہے اس لئے لامحالہ ان سے محبت دین، تقویٰ و صلاح پر مبنی ہوگی تو ان حضرات میں یہ صفات ثابت ہوئیں اور چونکہ نواصب کا مذہب اس کے خلاف ہے اس

کے خلاف ہے، اس لئے یہ آیت ان کے مقابلہ میں کار آمد و مفید رہی۔

یا ان حضرات کو اپنے ساتھ لے جانے کی وجہ و مقصد یہ تھا، کہ یہ حضرات بھی نجران کے کافروں پر بددعا میں شریک ہو جائیں۔ اور آپ کی بددعا پر آمین کہیں۔ کہ ان کی آمین کے سبب جلد درجہ قبولیت کو پہنچے، اکثر شیعوں نے یہ احتمال اور وجہ بیان کی ہے، ملا عبد اللہ نے بھی اس کا ذکر کیا ہے اس صورت میں بھی ان بزرگوں کے دینی مرتبہ کی بلندی اور ان کا مستجاب الدعوات ہونا ثابت ہوتا ہے، اور نواصب کے مقابلہ میں یہ بھی فائدہ سے خالی نہیں۔

نواصب نے دونوں وجوہ پر رد و قدح کرتے ہوئے کہا ہے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا ان حضرات کو اپنے ہمراہ لے جانا نہ وجہ اول کی بنا پر تھا نہ وجہ ثانی کی بنا پر، بلکہ مخالف کے لئے الزامی پہلو مدنظر تھا، کیونکہ کفار کے نزدیک یہ تسلیم شدہ اور ثابت شدہ امر تھا کہ جب تک قسم کے وقت اولاد و داماد کو حاضر نہ کریں اور ان کی ہلاکی پر قسم نہ کھائیں قسم معتبر نہیں۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے بھی بغرض الزام یہی صورت اختیار فرمائی اور ظاہر ہے کہ اولاد و اقارب کیسے بھی ہوں بہر حال لوگوں کے خیال میں غیروں سے زیادہ عزیز و پیارے ہوتے ہیں گو اس شخص کی نظر میں وہ ایسے نہ ہوں۔

ہماری طرف سے شیعوں کے استدلال کے سلسلہ میں یہ جواب ہے کہ اس طرح مباہلہ کرنا اور اولاد کی قسم کھانا حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے نزدیک مسلم نہ تھا اگر ہوتا تو شریعت میں ایسی قسم آئی ہوتی حالانکہ شریعت میں تو اس پر ممانعت وارد ہوئی، یعنی اولاد کو حاضر کر کے قسم نہ کھائیں نتیجہ یہ نکلا کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ سب کچھ مخالف کو خاموش اور لاجواب کرنے کے لئے کیا،

اسی طرح دوسری وجہ بھی ٹھیک نہیں کیونکہ نجرانی وفد کی ہلاکی و تباہی کوئی بڑی اہم بات نہ تھی نہ کوئی سنگین امر تھا، اس سے زیادہ اور سخت تر حوادث سے حضور صلے اللہ علیہ وسلم دوچار ہوئے مصائب و دکھ جھیلے مگر کبھی بھی ان پیاروں سے دعا میں مدد کے خواستگار نہ ہوئے،

اور یہ متفق علیہ امر ہے کہ کفار کے ساتھ مقابلے اور معارضہ میں پیغمبر کی دعا مقبول ہوتی ہے ورنہ تو پھر پیغمبر کی تکذیب لازم آتی ہے اور بعثت کی غرض فوت ہوتی ہے اور پیغمبر کو خود اپنی دعا کے قبول ہونے میں کس طرح شک لاحق ہو سکتا ہے کہ وہ دوسروں کی آمین کی مدد لیتے۔ لہذا یہ وجہ بھی باطل و فاسد و غلط ثابت ہوئی،

اس موقع پر اس بحث کو طول دینا نامناسب سمجھتے ہوئے اسے یہیں ختم کرتے ہیں حاصل بحث یہ ہے کہ ثبوت مدعا کے لئے دراصل یہی آیت دلیل ہے شیعہ از راہ تعصب خواہ مخواہ اہل سنت کے مقابلہ میں یہ دلیل پیش کر بیٹھے۔

شیعوں کے اس آیت سے استدلال میں بہت سی خامیاں اور قابل گرفت باتیں پائی جاتی ہیں، اول یہ بات قابل تسلیم نہیں کہ انفسنا سے مراد جناب امیر ہیں، بلکہ خود حضور صلے اللہ علیہ وسلم بنفس نفیس مراد ہیں،

www.Ahlehaq.com

اس قول کو غلط ثابت کرنے کے لئے علماء شیعہ نے یہ احتمال و شبہ بیان کیا ہے کہ انسان اپنے آپ کو نہیں بلا یا کرتا ان کی یہ بات تو اس گاؤدی کی بات کی طرح ہے کہ کسی گاؤں سے چلا آ رہا تھا کہ کسی عالم نے پوچھا کہ میاں یہ تو بتاؤ کہ کیا اس گاؤں میں ہل بھی چلاتے یا ہل بھی گھومتے ہیں، تو وہ کہنے لگا، ارے بھائی کچھ سوچ کے تو بات کر ہل کو نہ وہ چلاتے ہیں نہ وہ چلتے ہیں، بیلوں کو چلاتے ہیں اور وہی چلتے ہیں،

پھر عرف قدیم و جدید میں یہ محاورات ہمیشہ استعمال میں آتے رہتے ہیں،

دَعَتْهُ نَفْسُهٗ اِلٰی کَذَا اَدْعُوتُ نَفْسِیْ اِلٰی کَذَا۔ اس کے نفس نے اس کو اس طرف بلایا میں نے اپنے نفس کو اس طرف بلایا۔

یا قرآن مجید کی یہ آیت،

فَطَوَّعَتْ لَهٗ نَفْسُهٗ قَتْلَ اَخِیْهِ۔ رغبت دلائی اس کے نفس نے اس کو اپنے بھائی کے قتل کی۔،

یہ بھی بولتے ہیں اٰمَرْتُ نَفْسِیْ۔ میں نے اپنے نفس کو حکم دیا یا۔ شَاوَرْتُ نَفْسِیْ میں نے اپنے نفس سے مشورہ کیا۔ اسی طرح کے اور بھی بہت سے استعمالات فصحاء کے کلام میں پائے جاتے ہیں پس نَدْعُ اَنْفُسَنَا کے حاصل معنی نُحْضِرُ اَنْفُسَنَا کے ہوئے یعنی حاضر کریں ہم اپنے نفسوں کو،

پھر ایک قابل لحاظ بات یہ بھی ہے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی جانب کے انفسنا سے جناب امیرؓ مراد ہوں تو کفار کی جانب کے انفسکم کا مصداق کون ہوگا، حالانکہ نندع میں بحیثیت فریق ثانی وہ بھی شریک ہیں، اور یہ معنے ہو نہیں سکتے کہ ہم نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم ان کو اور ان کے بیٹوں کو بلائیں۔ جب کہ آپ تعالوا فرما چکے ہیں لہذا معلوم ہوا کہ جناب امیر، حضرات حسنین رضی اللہ عنہم کی طرح ابناءنا میں حکماً نہ حقیقۃً داخل ہیں، اور عرف میں داماد کو بیٹا ہی شمار کیا جاتا ہے،

اور نفس، قریب، شریک نسب دین و ملت کے معنے میں بھی استعمال ہوتا ہے جیسا کہ آیا ہے تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَهُمْ مِّنْ دِیَارِہِمْ نکالتے ہیں وہ اپنے نفسوں کو (شریک مذہب لوگوں کو) اپنے

یا۔ وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ۔ مت نام دھرو اپنے نفسوں کا (اپنے شریک دین بھائیوں کا)

یا۔ وَلَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بِاَنْفُسِهِمْ خَیْرًا جب یہ بات مومنوں اور مومنات نے سنی تھی تو اپنے نفسوں کے ساتھ گمان نیک کیوں نہیں کیا (ہم ملت افراد کے ساتھ)،

لہذا جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے اتصال نسبی، قرابتی اور مصاہرت حاصل تھا اور اتحاد دینی، ملی، وہم صحبتی اس قدر زیادہ حاصل تھا کہ جس کی بنا پر آپ نے ان کے حق میں یہ تک فرمادیا علی منی وانا من علی۔ تو آپ کو نفس سے تعبیر کیا تو یہ کون اچنبھے کی بات ہے اور اس سے مساوات کب لازم آتی ہے، جیسی آیات بالا میں نہیں آتی،

دوسرے یہ بات بھی ہے کہ اگر تمام صفات میں مساوات مراد لیں تو ضروری ہے کہ جناب امیر تمام پیغمبر

www.Ahlehaq.com

خصوصیات میں بھی آپ کے شریک ہوں۔ مثلاً نبوت رسالت خاتمیت تمام مخلوق کی طرف بعثت چار بیویوں سے زائد نکاح کا جواز قیامت کے دن ارفع و اعلیٰ درجہ پر فائز ہونا شفاعت کبریٰ کا حصول مقام محمود کا حصول وحی کا نزول وغیرہ وغیرہ حالانکہ ان اوصاف میں، شرکت بالاجماع باطل ہے، اور اگر بعض اوصاف میں مساوات مراد لیں تو اس سے ان کا مقصد حاصل نہیں ہوتا۔ کیونکہ افضل واولیٰ بالتصرف کے ساتھ بعض صفات میں مساوات افضل واولیٰ بالتصرف نہیں بناتی، ظاہر بات ہے،

اور اس آیت کو امامت کی دلیل ماننے سے یہ لازم آتا ہے کہ جناب علی رضی اللہ عنہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے عین حیات بھی امام ہوں، اور یہ بات بالاتفاق غلط ہے، اور اگر کسی خاص وقت کی قید لگائیں، کہ اس وقت نہیں اس وقت! تو اگرچہ اس پر بھی کوئی لفظی دلیل آیت میں نہیں مگر پھر بھی مدعا ثابت نہیں ہوگا کیونکہ کسی نہ کسی وقت کی خلافت وامامت تو اہل سنت بھی مانتے اور ثابت کرتے ہیں، ان کا مدعا بلا فصل تو ثابت نہ ہوا۔

ان کی ایک اور دلیل یہ آیت ہے،

اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرٌ وَّلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ۔ — البتہ آپ ڈرانے والے ہیں اور ہر ایک قوم کے لئے ایک ہدایت دینے والا ہے،

اس سلسلہ میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک متفق علیہ روایت ان الفاظ میں منقول ہے،

عَنِ النَّبِيِّ صلے اللہ علیہ وسلم اَنَّهٗ قَالَ اَنَا الْمُنْذِرُ وَعَلِيٌّ الْهَادِيْ — نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا میں ڈرانے والا ہوں اور علیؓ ہادی ہیں،

یہ روایت بسلسلہ تفسیر ثعلبی کی روایت ہے اور اس کی مرویات ساری ہی درجہ اعتبار سے گری ہوئی ہیں، اور یہ آیت بھی انہیں دلائل میں سے ایک ہے جو اہل سنت نے نواصب کی تردید میں بیان کئے ہیں، یہ آیت نہ اکیلے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی امامت پر دلالت کرتی ہے اور نہ دوسروں کی امامت سے انکار پر اس لئے کہ کسی کا ہادی ہونا اس کے امام ہونے کا ہرگز متقاضی نہیں۔ اور نہ ہی دوسرے کی ہدایت کی نفی کو مستلزم اور اگر صرف ہدایت امامت پر دلالت کرے تو یہ اصطلاحی امامت ہوگی جو اہل سنت کے ہاں پیشوائے دین کے معنوں میں مستعمل ہے، اس میں کوئی جھگڑا ہی نہیں اللہ تعالیٰ کا ارشاد۔

وَجَعَلْنَاهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا۔ — ہم نے ان کو امام بنایا کہ وہ ہماری احکام کے ساتھ ہدایت کرتے ہیں جب انہوں نے صبر کیا۔

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ — تم میں ایک جماعت ایسی ہونی چاہیئے جو بھلائی کی طرف بلائے اچھی باتوں کا حکم کرے اور برائیوں سے روکے

اسی قسم کی اور بھی آیات اس سلسلہ کی موجود ہیں،

ان کے دلائل میں کی ایک دلیل یہ آیت ہے وَقِفُوْهُمْ اِنَّهُمْ مَّسْئُوْلُوْنَ انہیں روک کے رکھو ان سے پوچھ پاچھ ہوگی۔

اس کے بارے میں یہ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی ایک مرفوع روایت یوں بیان کرتے ہیں کہ انہوں

www.Ahlehaq.com

نے کہا وَقِفُوْهُمْ اِنَّهُمْ مَسْئُوْلُوْنَ عَنْ وِلَايَةِ عَلِيِّ بْنِ اَبِیْ طَالِبٍ،

دراصل یہ تمسک تو پھر روایت سے ہوا۔ آیت سے تو نہیں ہوا اور ان کی روایات کا جو حال ہے وہ سب کو معلوم ہے۔ اہل سنت کے نزدیک سب بے اعتبار ہیں، خصوصاً یہ روایت جو مسند فردوس دیلمی میں بیان کی گئی ہے اور یہ وہ کتاب ہے جو خصوصیت کے ساتھ ضعیف اور بے اصل روایت سے بھری ہوئی ہے اور پھر یہ روایت کہ اس کی سند میں تو خاص طور پر ضعیف اور مجہول الحال راوی ہی بھرے ہوئے ہیں جو ہرگز کسی درجہ میں بھی قابل حجت نہیں اور اصول مسائل میں تو بالکل بھی نہیں،

اور پھر قرآن کا نظم بھی اس روایت کی تکذیب کرتا ہے کیونکہ اس میں مشرکین کے حق میں خطاب ہے، وَمَا يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اور مشرکین سے پہلا سوال تو شرک اور غیر اللہ کی عبادت کے بارے میں ہوگا۔ علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی ولایت سے نہیں ہوگا نظم قرآنی دلالت کرتا ہے کہ مَا لَكُمْ لَا تَنَاصَرُوْنَ (تمہیں کیا ہو گیا کہ مدد نہیں کرتے) کا سوال اس جملہ استفہامیہ کے مضمون سے ہے، جو محض ڈانٹ ڈپٹ، اور غیرت دلانے کی غرض سے ہے، کسی اور مقصد سے نہیں اسی لئے عاملان قرأت کا اس پر اجماع ہے کہ آیت تلاوت کے وقت مسئولون پر وقف نہ کیا جائے،

پھر اگر روایت کو صحیح بھی مان لیا جائے اور نظم قرآن میں بے ربطی کا سوال نہ بھی اٹھایا تب بھی ولایت سے مراد محبت ہوگی۔ ریاست کبریٰ تو اس صورت میں مراد نہیں ہوگی جو محل نزاع ہے اور چلو وہ ہی مراد لے لیں تب بھی مفید مقصد نہیں کیونکہ آیت اپنے مضمون کے لحاظ سے اس عقیدہ کو واجب کرتی ہے کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ کسی وقت امام ہیں، اور بالکل یہی عقیدہ اہل سنت کا ہے،

واحدی نے بھی اپنی تفسیر میں یہ روایت ان الفاظ سے بیان کی ہے کہ عن ولایۃ علی واھل البیت ظاہر ہے سارے کے سارے اہل بیت تو امام نہیں تھے، شیعہ بھی اس کے قائل نہیں،

ایسی صورت میں تو ولایت کو محبت پر محمول کرنا یقینی ہو گیا۔ اس لئے کہ ولایت ایک مشترک لفظ ہے اور خارجی قرائن اور اندازوں سے اس کے ایک معنی متعین ہو گئے،

خلاصہ کلام یہ ہے کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ کی محبت اور نفس امامت کا جہاں تک تعلق ہے سب اس پر متفق الخیال و عقیدہ ہیں، اہل سنت کا بھی یہی عقیدہ ہے، بحث تو دراصل جناب امیر رضی اللہ عنہ کے خلیفہ بلا فصل ہونے میں تھی اور یہ بات کہ آپ کے علاوہ کوئی اور صحابی مستحق امامت نہیں اس آیت کا اس موضوع سے کوئی تعلق سرے سے ہی نہیں ہے،

موضوع بالا کے سلسلہ کی ایک یہ آیت بھی یہ حضرات پیش کرتے ہیں۔

وَالسَّابِقُوْنَ السَّابِقُوْنَ اُولٰٓئِكَ الْمُقَرَّبُوْنَ — پہل کرنے والے تو پہل کرنے والے ہی ہیں وہی مقرب ہیں،

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک مرفوع روایت ان الفاظ کے ساتھ مروی ہے،

اَنَّهٗ قَالَ اَلسَّابِقُوْنَ ثَلٰثَةٌ فَالسَّابِقُ اِلٰى مُوْسٰى عَلَيْهِ السَّلَامُ يُوْشَعُ بْنُ نُوْنٍ وَالسَّابِقُ — انہوں نے کہا سابق تین ہیں، موسیٰ علیہ السلام کی نسبت سے یوشع بن نون اور عیسیٰ علیہ السلام کے حوالہ سے

اِلٰی عِیْسٰی عَلَیْہِ السَّلَامُ صَاحِبُ یٰسٓ وَالسَّابِقُ اِلٰی مُحَمَّدٍ صلی اللہ علیہ وسلم عَلِیُّ ابْنُ اَبِیْ طَالِب۔ — صاحب یٰسین اور جناب محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے کے لحاظ سے جناب علی بن ابی طالب (رضی اللہ عنہ)

پہلی بات تو یہ کہ استدلال بھی حدیث سے ہوا آیت قرآنی سے نہیں، یہ حدیث طبرانی اور مردویہ کے نزدیک حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے اور دیلمی کے نزدیک حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے لیکن سندوں کا مدار ابوالحسن اشقر پر ہے جو بالاجماع ضعیف ہے عقیلی نے کہا ہے کہ وہ شیعہ ہے جس کی روایت ناقابل قبول ہے اور یہ حدیث منکر ہے جس کی کوئی اصلیت نہیں بلکہ اس میں بناوٹی اور گھڑی ہوئی ہونے کی علامات پائی جاتی ہیں، اس لئے کہ صاحب یٰسین حضرت عیسٰی علیہ السلام پر ایمان لانے والوں میں سے نہیں ہے بلکہ آپ کے رسولوں (قاصدوں) پر اول ایمان لانے والوں میں سے ہے جس کا پتہ نص سے چلتا ہے،

اب جو حدیث اخبار و قصص میں مدلول کتاب سے متناقض و خلاف ہو اور اس سے ٹکرائے وہ محدثین کے طے شدہ اصولوں کے اعتبار سے موضوع اور گھڑی ہوئی ہے۔

دوسری بات یہ کہ سابق کا انحصار صرف تین میں خلاف عقل ہے، کیونکہ ہر نبی کا کوئی نہ کوئی ایک سابق ہوگا اور پھر رد کرو، یہ کیا ضروری ہے کہ ہر نبی کا سابق ریاست عظمٰی کا مالک ہو، اور متقرب امامت کا مستحق قرار پائے اور پھر اگر روایت صحیح بھی قرار پائے تو یہ صریح آیت کے تناقض ثابت ہوتی ہے، کیونکہ انہیں سابقین کے متعلق فرمایا ہے،

ثُلَّۃٌ مِّنَ الْاَوَّلِیْنَ وَقَلِیْلٌ مِّنَ الْاٰخِرِیْنَ — ایک جماعت ہے پہلوں سے اور تھوڑے ہیں پچھلوں سے

ثُلَّۃ جمع کثیر کے معنے میں بولا جاتا ہے جو دو آدمیوں پر نہیں بولا جاتا اسی طرح ایک کو قلیل نہیں کہہ سکتے نتیجہ ظاہر ہے کہ آیت میں سبق (پہل) حقیقی مراد نہیں، بلکہ سبق عرفی یا اضافی مراد ہے، جو جماعت کثیر کو شامل ہے اس کی دلیل ایک دوسری آیت ہے

وَالسَّابِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِیْنَ وَالْاَنْصَارِ — اور سابقین اولین مہاجرین و انصار سے۔

اور قرآن کا ایک حصہ دوسرے کی تفسیر کرتا ہے قاعدہ معروف و مشہورہ ہے!

پھر یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ شیعوں اور سنیوں دونوں کے اجماع سے یہ بات ثابت ہے کہ سب سے پہلے حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا اسلام لائیں۔ اور اگر ایمان میں سبقت ہی امامت کے لئے کافی ہے تو پھر یہ لازم آتا ہے کہ وہ بھی امامت کے قابل ہوں اور یہ بات بالاجماع غلط ہے اگر یہ کہا جائے کہ وہ عورت ہیں، تو ہم کہیں گے کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ کی امامت میں بھی کوئی مانع ہوا ہوگا اور وہ ان کی امامت کے وقت کا ابھی نہ آنا تھا جب یہ مانع نہ رہا تو امام آپ ہو گئے اور وہ مانع خلفاء ثلاثہ رضوان اللہ علیہم ہیں (کہ ان کا زمانہ پہلے تھا) اور جو آپ کی نسبت جمہور اہل سنت کے نزدیک اصلح تھے، یا خلفاء ثلاثہ کے بعد آپ کا باقی رہنا۔ اور ان حضرات کی موت آپ سے پہلے ہونا۔ یہ توجیہ تفضیلیہ کی ہے، اس لئے کہ وہ کہتے ہیں،

لَوْ کَانَ اِمَامًا عِنْدَ وَفَاتِ النَّبِیِّ صلی اللہ علیہ — اگر وہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت امام

وسلم لم يبق احد من الخلفاء الائمة وماتوا في عهده، وقد سبق في علم الله ان الخلفاء اربعة فلزم الترتيب على الموت

ہوتے تو خلفاء میں سے کسی کو امامت نہ ملتی اور وہ انہیں کے عہد میں وفات پاتے حالانکہ علم الٰہی میں یہ بات تھی کہ خلفاء چار ہوں گے اس لئے موت میں ترتیب لازم ہوئی،

حاصل گفتگو یہ ہے کہ آیات قرآنیہ سے شیعوں کے سارے کے سارے تمسکات اور استدلالات ایسے ہی اونگے بونگے ہیں۔ اور کتاب النعین کا مصنف بھی اسی طرح کی بہت سی آیات اپنے مدعا کی دلیل میں بیان کرتا ہے یہ تو ان کے چیدہ اور برگزیدہ اہل علم کا حال ہے باقی کا جو حال ہوگا اس کا ان پر قیاس کیا جاتا ہے۔ قیاس کن زگلستان من بہار مرا۔

ان کے دعاوی اور تقریرات کا اصول کلی یہ ہے کہ آیات پر ان کے استدلالات اسوقت تک پورے نہیں اترتے اور نہ احتمالات اور شکوک دور ہوتے ہیں جب تک ان کی گھڑی ہوئی، بناوٹی ناقابل تسلیم ناقابل عمل اور مردود روایات کو بطور لاحقہ ان کے ساتھ شامل نہ کریں،

اس لئے ان کے استدلالات میں کوئی علمی لطیفہ یا دلچسپی بھی نہیں ہوتی لیکن چونکہ ان کی چشم بصیرت پر تعصب کا گہرا اور دبیز پردہ پڑا ہوا ہے، اس لئے ان کی اچھے اور برے میں تمیز کی حس ہی نہ رہ گئی ان کو تو اپنی من گھڑت اور بناوٹی باتیں ہی دنیا جہاں کے علوم اور باتوں سے اچھی معلوم ہوتی ہیں

آیات کا معاملہ تو آپ نے ملاحظہ فرما لیا اب وہ احادیث ملاحظہ فرمائیے جو یہ اپنے مدعا و مقصد کے حاصل کرنے میں بطور دلیل پیش کرتے ہیں، اور ایسی احادیث کی تعداد کل بارہ ۱۲ ہے۔

(۱) ان میں سے پہلی حدیث غدیر خم ہے کہ ان کی کتابوں میں جس کا ذکر بڑے دھوم دھڑکے اور آن بان سے آتا ہے اور یہ بزعم خود اس کو اپنے مدعا کے لئے نص قطعی خیال کرتے ہیں، اس کا حاصل یہ ہے کہ بروایت بریدہ بن الحصیب اسلمی حجۃ الوداع سے واپسی پر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم جب غدیر خم نامی ایک مقام پر جو مکہ و مدینہ کے درمیان پڑتا ہے فروکش ہوئے، تو آپ نے شریک سفر ساتھیوں کو اپنے پاس بلایا اور ان الفاظ میں ان کو خطاب فرمایا۔

يا معشر المسلمين الست اولى بكم من انفسكم قالوا بلى۔ قال من كنت مولاه فعلي مولاه اللهم وال من والاه وعاد من عاداه

اے مسلمانوں کی جماعت کیا میں تمہاری جانوں سے زیادہ تمہارے نزدیک پسندیدہ نہیں ہوں سب نے عرض کیا بلاشک (ایسا ہی ہے) فرمایا میں جسکا مولیٰ ہوں علی بھی اس کے مولیٰ ہیں، اے اللہ جو علی کو دوست رکھے تو بھی اسے دوست رکھ اور جو اس سے دشمنی رکھے تو بھی اس سے دشمنی رکھ۔

اس روایت کے نتیجہ کے طور پر بات جو یہ کہتے ہیں وہ یہ ہے کہ مولیٰ سے مراد اولیٰ بالتصرف ہے اور اسی کو امام کہتے ہیں،

اس طریق استدلال وحجت میں پہلی خرابی اور خامی تو یہ ہے کہ سارے کے سارے اہل زبان (عرب) اس کے

منکر ہیں کہ اولیٰ کے معنے مولیٰ ہوں۔ بلکہ وہ کہتے ہیں کہ مفعل بمعنی افعل کسی جگہ اور کسی بھی مادہ میں استعمال نہیں ہوتا چہ جائیکہ اس خاص مادہ میں ابو زید لغوی اسے جائز کہنے والا اکیلا ہے اور دلیل میں ابو عبیدہ کا قول بیان کرتا ہے جس نے ہی مولیٰکم کی تفسیر اولیٰ لکم۔ سے کی ہے لیکن عام اہل زبان عربوں نے اس کے مذہب اور تمسک کو غلط بتایا ہے، اور کہا ہے کہ اگر اس کا قول صحیح ہو تو ہمیں فلان اولیٰ منک کی جگہ فلان مولیٰ منک کہنا چاہیئے۔ حالانکہ یہ غلط اور بالاجماع نامقبول ہے اسپر یہ کہا گیا ہے کہ ابو عبیدہ کی تفسیر حاصل معنی بیان کرتی ہے۔ مولیٰکم کی تفسیر اولیٰ سے کرنے کا یہ مطلب ہے کہ آگ تمہارا ٹھکانا ہے جائے بازگشت اور وہ جگہ جو تمہارے لائق ہے یہ نہیں کہ مولیٰ بمعنے اولیٰ ہے۔

دوسری بات یہ کہ مولیٰ بمعنی اولیٰ ہو بھی تو بالتصرف سے اس کا صلہ ٹھیرانا کس لغت سے ثابت ہو سکتا ہے، اولیٰ بالمحبت یا اولیٰ بالتعظیم مراد ہو! اور پھر یہ کیا ضروری ہے کہ جہاں کہیں اولیٰ کا لفظ سنیں اس سے اولیٰ بالتصرف مراد لے لیں۔ مثلاً ایک جگہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے

اِنَّ اَوْلَى النَّاسِ بِاِبْرٰهِيْمَ لَلَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ وَهٰذَا النَّبِيُّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا۔

بے شک ابراہیم علیہ السلام سے نزدیک وہ لوگ ہیں جنہوں نے ان کی اور اس نبی کی پیروی کی اور جو ایمان لائے،

اور ظاہر ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کے متبعین اولیٰ بالتصرف نہیں ہیں،

تیسری بات یہ کہ روایت کے بعد کے الفاظ اللّٰھم وال الخ صاف پتہ دیتے ہیں، کہ لفظ خواہ مولیٰ ہو خواہ اولیٰ، ولایت سے مراد محبت ہے کیونکہ مولیٰ اگر متصرف فی الامر کے معنے میں ہوتا یا اولیٰ سے اولیٰ بالتصرف مراد ہوتا تو یوں فرمانا قرین قیاس تھا، کہ "اے خدا اس کو دوست رکھ جو اس کے تصرف میں ہو اور اس کو دشمن رکھ جو اس کے تصرف سے باہر ہو"، دوستی اور دشمنی کا ذکر اس بات کی صاف دلیل ہے کہ مقصد دوستی کو واجب ٹھیرانا ہے اور دشمنی سے ڈرانا تصرف و عدم تصرف، مقصد ہی نہیں۔

یہ بات واضح اور ظاہر ہے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے معمول واجبات ہی نہیں بلکہ سنن نشست و برخاست اکل و شرب وغیرہ کے آداب تک اس خوش اسلوبی سے بیان فرمائے ہیں کہ ان کے مرادی معنے ہر اس شخص کی سمجھ میں بے تکلف آجاتے ہیں جو عربی زبان سے واقفیت رکھتا ہو خواہ وہ حاضر ہو یا غائب اور درحقیقت بلند معیار بلاغت بھی یہی ہے اور منصب ارشاد و ہدایت بھی اسی کا تقاضا کرتا ہے،

اتنے اہم اور اعلیٰ پایہ کے مسئلہ میں بھی اگر آپ اسی قسم کے کلام پر اکتفا فرمائیں کہ باعتبار لغت عرب اس کے معنی و مفہوم تک کبھی رسائی نہ ہو سکے۔ تو نعوذ باللہ یہ تو آپ صلے اللہ علیہ وسلم کی فصاحت و بلاغت کے قصور کا اقرار ہوا اور اس سے بھی آگے بڑھ کر تبلیغ و ہدایت کے معاملہ میں سستی روا رکھنے کا الزام لگانا ہوا جس کا کوئی ادنیٰ مسلمان بھی تصور نہیں کر سکتا،

لہٰذا معلوم ہوا کہ آپ صلے اللہ علیہ وسلم کے پیش نظر یہی معنی ہیں جو آپ کے کلام سے بے تکلف سمجھ میں آتے ہیں کہ جیسے پیغمبر کی محبت تم پر فرض ہے ایسے ہی علی رضی اللہ عنہ سے دشمنی رکھنا بھی حرام ہے یہی اہل سنت کا مذہب ہے،

اور اہل سنت کی سخن فہمی بھی اس کی تائید کرتی ہے، چنانچہ ابو نعیم نے جناب حسن مثنیٰ بن امام حسن سبط رسول رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ جب آپ سے دریافت کیا گیا کہ آیا حدیث من کنت مولاہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت پر نص ہے؟ تو آپ نے فرمایا کہ اگر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اس سے خلافت مراد لیتے تو لوگوں کے ذہن نشین کرنے کے لئے اس کو وضاحت سے بیان فرماتے کیونکہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سب لوگوں سے زیادہ فصیح اور واضح البیان صاف گو تھے، اس مراد کے لئے آپ یوں فرماتے،

يَآ أَيُّهَا النَّاسُ هٰذَا وَلِيُّ أَمْرِي وَالْقَائِمُ عَلَيْكُمْ بَعْدِي فَاسْمَعُوْا لَهٗ وَأَطِيْعُوْهُ،

اے لوگو یہ میرے معاملہ کے مختار کار ہیں اور میرے بعد تم پر نگران۔ پس ان کی بات سننا اور ان کی اطاعت کرنا،

پھر جناب مثنیٰ نے کہا خدا کی قسم اگر خدا و رسول، جناب علی رضی اللہ عنہ کو اس کام کے لئے منتخب کرتے اور جناب علی، اس حکم کی پاسداری نہ کرتے اور اس پر کاربند نہ ہوتے تو خدا اور رسول کی عدم پیروی کے سبب امت کے سب سے بڑے خطاکار شمار ہوتے،

اس پر ایک شخص بولا کہ کیا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ نہیں فرمایا کہ جس کا میں مولا ہوں علی بھی اس کے مولا ہیں۔ تو آپ نے فرمایا سنو میاں، خدا کی قسم اگر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی اس قول سے مراد خلافت ہوتی تو وضاحت کے ساتھ صاف فرما دیتے جس طرح نماز روزہ کی وضاحت فرمائی اور یوں ارشاد فرماتے

يَآ أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّ عَلِيًّا وَالِيُ أَمْرِكُمْ مِنْ بَعْدِي وَالْقَائِمُ فِي النَّاسِ بِأَمْرِي،

لوگو! علی میرے بعد تمہارے امور کے مختار ہوں گے اور لوگوں میں میرے معاملات کے نگران۔

پھر اس صورت میں یہ حدیث ایک زمانہ میں دو ولایتوں کے جمع ہونے کی کھلی دلیل ہے کیونکہ اس میں لفظ بعد کی قید نہیں ہے رہیں جب اور جس وقت، جس کا مولا ہوں، علی بھی اسی وقت اس کے مولا ہیں) بلکہ سلسلہ کلام جیسا کہ ظاہر ہے ہر دو ولایتوں کی مساوات و برابری بہر حیثیت و بتمام وقت، کو چاہتا ہے حالانکہ یہ بڑی واضح بات ہے کہ جناب امیر کی شرکت آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ولایت میں آپ کے عین حیات ممتنع و محال و ناممکن ہے،

لہٰذا یہ اس بات کی دلیل اول ہے، کہ مراد وجوب محبت ہے، اور دو محبتوں کے جمع ہونے میں نہ کوئی اشکال ہے نہ قباحت (مع تمہیں چاہوں تمہارے چاہنے والوں کو بھی چاہوں) بلکہ ایک محبت دوسری محبت کا تقاضا کرتی ہے، البتہ دو تصرفات کے یک وقت جمع ہو جانے میں بہت سی خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں،

اور اگر کلام، اس قید کے ساتھ مقید کریں کہ اس سے امامت فی الوقت اور فوری مراد نہیں ہے بلکہ کچھ عرصہ کچھ وقت ٹھہر کر مراد ہے تو پھر یہ "اتفاق مومناں مبارک ہو" کیونکہ اہل سنت خود آپ کے عہد میں و بعد بیعت خلافت، آپ کی خلافت و امامت کے قائل ہیں،

اب رہی یہ بات کہ اس طرز کلام کے ساتھ حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی کو کیوں مخصوص فرمایا تو اس کا سبب بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ جناب رسالتمآب صلے اللہ علیہ وسلم کو بذریعہ وحی یہ معلوم ہو گیا تھا کہ عہد مرتضوی

www.Ahlehaq.com

میں فتنہ و فساد اور بغاوت کی آگ بھڑک اٹھے گی اور کچھ لوگ آپ کی خلافت سے منکر ہو جائیں گے تو اسی لئے آپ کو مغموم فرمایا۔

اور ایک طرفہ تماشا یہ ہے کہ ان کے بعض علما اس بات کے ثابت کرنے میں کہ مولیٰ سے مراد اولیٰ بالتصرف ہے، حدیث کے ابتدائی الفاظ الست اولی بالمومنین من انفسھم سے دلیل لاتے ہیں، یہ وہی بات ہے جو ہم اوپر بیان کر آئے ہیں، کہ ان کو جہاں اولیٰ کا لفظ نظر آتا ہے تو فوراً ہی وہاں بالتصرف کا دم چھلا لگانے دوڑ پڑتے ہیں یہاں کون سا داعیہ ہے کہ اس سے اولیٰ بالتصرف کے ہی معنی لیں بلکہ یہاں بھی معنی محبت مراد لینا ہی اچھا ہے۔ کہ (کیا میں مومنوں کو ان کی اپنی جانوں سے زیادہ پیارا نہیں) اس لئے یہاں کا اولیٰ ولایت بمعنے محبت سے مشتق ہے جس کا مطلب یہی ہے کہ "کیا میں مومنوں کو ان کی جانوں سے زیادہ محبوب و پیارا نہیں" تاکہ اجزاء کلام اور ایک سلسلہ میں منسلک جملوں میں تناسب اور ربط برقرار رہے، اور حسن کلام دو چند ہو۔ پھر اس خطبہ کا اصل مطلب یہ ہو گا،

"اے گروہ مسلماناں! یہ تو ہے ہی کہ تم مجھ کو اپنی جانوں سے زیادہ دوست رکھتے ہو، تو جو کوئی مجھ کو دوست رکھتا ہے وہ علی کو بھی دوست رکھے اے اللہ جو اس کو دوست رکھے تو بھی اسے دوست رکھ اور جو اس سے دشمنی رکھے تو بھی اسے دشمن رکھ"

عقلمند وہی ہے جو اس کلام کے ربط کو ملحوظ رکھ کر کلام کے تسلسل کو دیکھے، حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد الست اولی بکم من انفسکم" آیت قرآنی سے ماخوذ ہے۔ اسی لئے اس کو اہل اسلام کی تسلیم کردہ بات کو بنیاد بنا کر اس پر آئندہ کے کلام کو موقوف فرمایا۔ اور قرآن میں یہ لفظ ایسے موقعہ اور جگہ پہ آیا ہے جہاں اولیٰ بالتصرف کے معنے مناسب ہی نہیں لگتے۔

النَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَاَزْوَاجُهٗ اُمَّهَاتُهُمْ وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰی بِبَعْضٍ فِیْ كِتَابِ اللّٰهِ۔	نبی مومنوں کے ساتھ خود ان کے نفس سے بھی زیادہ تعلق رکھتے ہیں، اور ان کی ازواج مسلمانوں کی مائیں ہیں از روئے کتاب اللہ رشتہ دار باہم ایک دوسرے سے زیادہ تعلق رکھتے ہیں، بہ نسبت دوسرے مومنین کے،

لہٰذا اس آیت کا سلسلہ کلام بتا رہا ہے کہ اس میں متبنٰی کی نسبت حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف کرنے سے انکار ہے یعنی زید بن حارثہ کو زید بن محمد نہیں کہنا چاہیئے اس لئے کہ آپ کی نسبت تمام مسلمانوں سے ایک شفیق باپ کی سی ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ اور آپ کی ازواج مطہرات اہل اسلام کی ماؤں کے بمنزلہ ہیں اور اہل قرابت نسبت کرنے میں غیروں سے زیادہ حقدار ہیں، اور بہتر بھی، اگرچہ مشفقت اور تعظیم میں دوسرے ہی زیادہ ہوں،

لہٰذا نسبت کا دارومدار قرابت پہ ہوا جو متبنٰی میں موجود نہیں، اس کا مدار شفقت و تعظیم پر نہیں، یہ ہے کتاب اللہ اور حکم خدا کا مفہوم و مطلب اب اس میں اولیٰ بالتصرف" کو کسی نوع کا بھی دخل نہیں لہٰذا یہاں وہی معنے مراد ہوں گے جو حدیث میں ہیں،

اور اگر حدیث کی ابتدائی عبارت میں اولیٰ سے مراد اولیٰ بالتصرف لیں تو بھی مولیٰ، اولیٰ بالتصرف سے

کوئی مناسبت نہیں رکھتا۔ اس لئے کہ اس صورت میں یہ عبارت مخاطبین کی توجہ اور بیداری کے لئے ہوگی کہ پوری توجہ اور ہمہ تن گوش ہو کر آئندہ آنے والی بات سنیں اور اس فرمودہ کو حکم واجب جان کر اس کی اطاعت پر کمر بستہ ہو جائیں، جس طرح ایک باپ بیٹے کو وعظ و نصیحت کے وقت کہتا ہے کہ کیا میں تیرا باپ نہیں ہوں بیٹا اس سوال سے چوکنا ہو جاتا ہے، کہ باپ کہنا کیا چاہتا ہے، کہ ایسے یقینی تعلق کو سوال بنا رہا ہے وہ اقرار کرتا ہے تو باپ جو باتیں کہنا چاہتا ہے، کہدیتا ہے، تاکہ جس تعلق کا اس نے ابھی اقرار کیا ہے اس کا پاس خاطر کرتے ہوئے تعمیل حکم کرے اور اطاعت شعاری کا ثبوت دے اور اس کے مطابق عمل پیرا ہو۔

پس اس جگہ الست اولی بالمومنین من انفسہ، سولہ اللّٰہ ایکم" یا الست نبیکم" کے مثل ہے آئندہ کے کلام سے ایک لفظ کے ذریعہ نسبت ڈھونڈنا اور چاہنا نہایت بے وقوفی ہے، اس عبارت سے سارے کلام کو جو ربط ہے، وہی کافی ہے،

اور اس سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ان کے بعض باریک بین لوگ محبت و دوستی کے مقصود نہ ہونے کی دلیل میں کہتے ہیں کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ کے ساتھ دوستی اس آیت۔

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ مومن اور مومنات باہم ایک دوسرے کے دوست ہیں، کے ضمن میں ثابت ہے۔ یہ حدیث بھی اگر اس معنی کا فائدہ دے تو کلام بے فائدہ اور لغو ہو جائے گا،

یہ "زیرک لوگ" اتنا بھی سمجھنے سے قاصر ہیں کہ ایک شخص کی دوستی کا ثبوت سب کے ضمن میں اور چیز ہے، اور اسی شخص کی دوستی کا وجوب خصوصی پہلو سے کچھ اور چیز اگر کوئی شخص اللہ کے سارے نبیوں اور رسولوں پر ایمان لاتا ہے مگر محمد صلے اللہ علیہ وسلم کا اسم گرامی زبان پر نہیں لاتا تو اس کا ایمان معتبر نہیں یہاں خاص جناب امیر رضی اللہ عنہ کی ذات سے دوستی منظور ہے اور آیت میں دوستی وصف ایمانی کے باعث، جو عام ہے مقصود تھی؛ پھر اگر آیت و حدیث کا مضمون مل بھی گیا تو اس میں قباحت کی کیا بات ہے پیغمبر کا کام ہی ہوتا ہے کہ مضامین قرآن کی بار بار تاکید اور اس کی یاد دہانی کرتا رہے خصوصاً جہاں کہیں کہ مکلفین کی طرف سے احکام قرآنی میں غفلت وسستی یا عمل میں کوتاہی روغنا ہو، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا،

وَذَكِّرْ فَاِنَّ الذِّكْرٰى تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِيْنَ۔ اور نصیحت کرتے رہیئے کہ نصیحت مومنوں کو نفع دیتی ہے

اور قرآن مجید میں کوئی مضمون ایسا نہیں جس کی تاکید کئی آیات میں نہ کی گئی ہو۔ پھر پیغمبر صلے اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے اس کی تاکید مزید کرائی گئی، تاکہ بندوں پہ حجت کو لازم اور ان پہ نعمت کو پورا فرمائیں جس نے قرآن پڑھا اور اسے سمجھا ہوگا وہ ایسے کلام کو پوچ نہیں کہہ سکتا، ورنہ پھر روزہ نماز زکوٰۃ و تلاوت قرآن کے بارے میں نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی تاکیدات بھی سب یوں ہی ہوں گی،

اور خود شیعوں کے نزدیک جناب امیر کی امامت کی نص کو بار بار دہرانا اور اس پر تاکید کرنا بھی لغو اور بیکار ٹھیریگا۔

اور اہل تاریخ و سیر کے کلام کی روشنی میں اگر اس خطبہ کا سبب و مقصد معلوم کرنا چاہیں تو صاف معلوم ہوگا کہ یہاں پیش نظر جناب امیر رضی اللہ عنہ کی دوستی اور محبت کا ثبوت ہے اس لئے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ

عنہم کی وہ جماعت جو ملک یمن کی مہم میں آپ کے ہمرکاب تھی انہوں نے سفر سے واپسی پر حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے آپکی چند شکایات کا چرچا کیا جو بے جا تھیں۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ خیال فرما کر کہ یہ باتیں لوگوں کی زبانوں پر آگئی ہیں اگر دو چار کو روکوں گا تو خاطر خواہ اثر نہ ہوگا ممکن ہے کوئی نا عاقبت اندیش اسے جانبداری اور پاسداری تعلق پر محمول کرے اور وہ بات ختم نہ سمجھے لہذا آپ نے انفرادی فہمائش کے بجائے خطبہ عام دیا اور اور الست اولی بالمومنین من انفسہم کے کلمہ سے شروع فرمایا جو نص قرآن سے تھا۔ یعنی جو کچھ کہہ رہا ہوں از راہ خیر خواہی و شفقت ہے، اسے جانبداری یا پاسداری پر محمول نہ کریں اور نہ میرے تعلق خاطر کا باعث سمجھیں۔ چنانچہ محمد بن اسحاق اور دیگر اہل سیر نے اس قصہ کو بتفصیل بیان کیا ہے۔

(۲) اس سلسلہ کی دوسری حدیث وہ ہے جو بخاری مسلم میں جناب براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ غزوہ تبوک کے موقعہ پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اہل بیت کی مستورات و بچیوں پر خلیفہ مقرر فرمایا اور خود غزوہ کے لئے تشریف لے گئے۔ اسوقت جناب امیر رض نے عرض کیا یا رسول اللہ۔

أَتُخَلِّفُنِي فِي النِّسَاءِ وَالصِّبْيَانِ۔ کیا آپ مجھے عورتوں اور بچوں پر خلیفہ بنا رہے ہیں،

آپ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

أَمَا تَرْضَى أَنْ تَكُونَ مِنِّي بِمَنْزِلَةِ هَارُونَ مِنْ مُوسَى إِلَّا أَنَّهُ لَا نَبِيَّ مِنْ بَعْدِي — کیا تم اس پر خوش نہیں کہ تم میرے لئے ایسے ہو جیسے ہارون موسیٰ (علیہما السلام) کے لئے تھے ہاں مگر میرے بعد کوئی نبی نہیں،

اس کے متعلق یہ کہتے ہیں کہ منزلۃ" اسم جنس ہے جو متکلم کی طرف منسوب ہے اس لئے تمام منازل کو عام ہوگا۔ تاکہ اس سے استثنے صحیح ہو سکے۔ اور جب مرتبۂ نبوت کو اس سے مستثنیٰ کر دیا تو اب وہ تمام منازل و مراتب جو حضرت ہارون علیہ السلام کے لئے ثابت تھے وہ جناب امیر رضی اللہ عنہ کے لئے بھی ثابت ہوں گے۔ اور ان میں سے امامت کا صحیح ہونا اور ان کی اطاعت کا فرض ہونا بھی شامل ہے، اگر حضرت ہارون علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد زندہ رہتے تو جو مرتبہ ان کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حین حیات حاصل تھا۔ اس سے موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد وہ محروم قرار پائیں تو یہ ان کا نبوت سے معزول ہونا کہا جائے گا اور نبی کا نبوت سے معزول ہونا جائز نہیں کیونکہ اس میں توہین کا پہلو نکلتا ہے۔ لہذا یہ مرتبہ جناب امیر رض کو بھی حاصل ہوا اور یہی امامت ہے"

در اصل یہ حدیث بھی اہل سنت کی دلیل ہے جو وہ جناب امیر کی فضیلت اور آپ کے عہد میں آپ کی امامت کے اثبات میں پیش کرتے ہیں۔ کیونکہ اس حدیث سے پتہ چلتا ہے کہ جناب امیر رض امامت کا استحقاق رکھتے تھے،

اب ہم اس موضوع پر کہ آپ کے علاوہ کوئی امام نہ تھا اور جناب امیر بلا فصل امام تھے بحث کا آغاز کرتے ہیں۔ لہذا ہم کہتے ہیں کہ یہ بات اس حدیث سے معلوم نہیں ہوتی،

گو نواصب نے اہل سنت کے استدلال پر رد و قدح کی ہے اور یہ کہا ہے کہ (عورتوں بچوں کی خلافت

www.Ahlehaq.com

وہ خلافت ہی نہیں تھی جو ہمارے تمہارے درمیان زیر بحث ہے کہ اس خلافت کی سپردگی سے اس خلافت کا ثبوت بہم پہنچ سکے کیونکہ باجماع اہل سیر سے یہ بات ثابت ہے کہ اسی موقعہ پر محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کو مدینہ کا صوبہ دار سباع عرفطہ رضی اللہ عنہ کو مدینہ کا کوتوال اور جناب ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کو اپنی مسجد کا امام نماز بنایا اگر جناب علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی خلافت عام ہوتی تو پھر ان امور کے کیا معنے تھے، لہذا معلوم ہوا کہ یہ خلافت محض امور خانگی کی غور و پرداخت اور اہل وعیال کی دیکھ بھال سے عبارت تھی جب کہ اس قسم کی دیکھ بھال ایسے آدمی سے سرانجام پا سکتی ہے جو محرم ہو اور اندرون خانہ کے حالات سے آگاہی رکھتا ہو اسی وجہ سے ایسے کاموں کے لئے لڑکے داماد یا ان جیسوں کو ہی مقرر کیا جاتا ہے، بہرحال ایسا استخلاف خلافت کبریٰ کو نہیں چاہتا،

بفضلہ تعالیٰ اہل سنت نے ان تمام اعتراضات کے شافی اور مسکت جوابات اپنی کتابوں میں دیئے ہیں جو اپنی جگہ اور مقام پر موجود ہیں،

شیعوں کے اس حدیث سے طریق استدلال کو جس انداز میں ہم نے ترتیب دے کر بیان کر دیا ہے اس سے درحقیقت ان کی بات سمجھ میں آنے کے قابل ہو گئی ہے ورنہ ان کی اپنی کتابوں میں اگر دیکھا جائے تو یہی استدلال عبارت ایسی واہی تباہی اور پراگندہ باتوں پر ختم ہوتی ہے جس سے کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوتا۔

بہرحال ان کا یہ استدلال بھی کئی خرابیوں کا مجموعہ ہے اول یہ کہ اسم جنس جو علم کی طرف مضاف و منسوب ہو وہ تمام اصولیوں کے نزدیک الفاظ عموم سے نہیں بلکہ اس کی تصریح کی ہے کہ وہ عہد کے لئے ہے مثلاً غُلَامُ زَیْدٍ وغیرہ کہ اس میں خاص غلام مراد ہے اگر ایسا نہ ہو تو پھر ان مثالوں میں کوئی کیا کہے گا۔

رَکِبْتُ فَرَسَ زَیْدٍ (میں زید کے گھوڑے پر سوار ہوا۔) لَبِسْتُ ثَوْبَ زَیْدٍ (میں نے زید کے کپڑے پہنے) اور رَأَیْتُ ابْنَ زَیْدٍ (میں نے زید کے لڑکے کو دیکھا) کہ ظاہر ہے کہ یہاں عموم باطل ہے،

اور کلام زیر بحث میں بھی خصوصیت کا قرینہ موجود ہے اور وہ جناب امیر رضی اللہ عنہ کا قول اتخلفنی فی النساء والصبیان' ہے،

یعنی جس طرح حضرت ہارون علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خلیفہ تھے جب وہ کوہ طور پر تشریف لے گئے، اسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوہ تبوک پر تشریف لے جانے کے بعد خلیفہ تھے، اور وہ استخلاف جو غیر موجودگی کی مدت کے ساتھ مقید ہو، وہ مدت کے ختم ہو جانے کے بعد ساتھ ہی ختم ہو جاتا ہے چنانچہ وہ حضرت ہارون علیہ السلام کے حق میں بھی ختم ہو گیا۔ اور استخلاف کے اس صورت میں ختم ہونے کو معزول ہونا نہیں کہتے جو کسی کی اہانت کا سوال پیدا ہو،

اب رہا استثناء تو اس میں عموم اس وقت پایا جاتا ہے، جب کہ استثناء متصل ہو اور یہاں استثناء متصل نہیں بلکہ منقطع ہے لفظی اور معنوی قرائن اس کی تائید کرتے ہیں،

لفظی قرینہ یہ کہ لا نبی بعدی جملہ خبریہ ہے جس کو منازل حضرت ہارون سے مستثنیٰ نہیں کر سکتے اور اگر جملہ کی تاویل مفرد سے کریں تو الّا کے داخل ہونے سے الّا کا حکم عدم النبوت ہو گا۔ اور ظاہر ہے کہ عدم النبوت آپ کے منازل میں سے ہے نہیں جو استثناء صحیح ہو۔

اور معنوی یہ کہ منجملہ منازل حضرت ہارون ؑ میں سے ایک ان کا عمر میں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بڑا ہونا ہے دوسرے یہ کہ بلحاظ زبان ان سے گویائی میں فصیح تر تھے تیسرے یہ کہ نبوت میں ان کے شریک تھے چوتھے یہ کہ وہ باعتبار نسب ان کے حقیقی بھائی تھے اور یہ تمام منازل، حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حاصل نہیں تھے لہذا اگر استثناء کو متصل ٹھیرائیں اور منزلۃ ، کو عموم پہ محمول کریں تو معصوم کے کلام پر حرف آتا ہے اور پھر یہ بھی ہے کہ ہم اسے تسلیم ہی نہیں کرتے کہ منازل ہارون علیہ السلام میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد ان کی خلافت بھی تھی، اس لیے کہ اگر وہ موسیٰ علیہ السلام کے بعد زندہ بھی رہتے تو تبلیغ و ہدایت میں وہ مستقل رسول ہوتے اور یہ مرتبہ ان کے ہاتھ سے کبھی نہ جاتا اور یہ مرتبہ خلافت سے منافات رکھتا ہے کیونکہ خلافت تو اس مرتبہ کی نیابت ہے اور اصل، اصل ہے۔ نیابت، نیابت، باہم نیابت کو اصل سے کیا علاقہ!۔

لہذا معلوم ہو گیا کہ اس طرز تقریر و استدلال سے جناب امیر رضی اللہ عنہ کی خلافت پایۂ ثبوت کو ہرگز نہیں پہنچی،

تیسرے یہ جو بات کہی گئی ہے، کہ یہ مرتبہ اگر حضرت ہارون علیہ السلام سے زائل ہو جاتا تو یہ ان کی معزولی ہوتی اور نبی کا معزول ہونا جائز نہیں، اس کے متعلق ہمارا کہنا یہ ہے کہ کام کے ختم ہوتے کو عزل کہنا عرف کے خلاف تو ہے ہی لغت کے بھی خلاف ہے، کیونکہ شاہ و حکام اپنے دار السلطنت سے باہر جاتے وقت نائبوں اور اپنے گماشتوں کو اپنا جانشین مقرر کر جاتے ہیں، اور ان کی مراجعت و واپسی کے بعد ان کی جانشینی ختم ہو جاتی ہے تو اسے کوئی بھی معزولی نہ کہتا ہے نہ سمجھتا ہے اور ان کے حق میں نہ اسے اہانت کا سبب مانا جاتا ہے، اور دل ہی دل سے کوئی عزل ہی سمجھتا رہے تو جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد حضرت ہارون علیہ السلام نبوت کے مستقل درجے سے سرفراز ہوئے جو خلافت سے ہزار درجہ اعلیٰ و ارفع ہے تو یہ ان کے حق میں توہین و تحقیر کیوں ہونے لگی بلکہ وہ تو اس طرح کا ہوتا کہ ایک وزیر کے مرنے کے بعد نائب کو عہدہ نیابت سے ہٹا کر مستقل وزیر بنا دیا جائے، یہاں تو اعزاز بڑھتا ہے تحقیر و توہین کا کیا کام!

بات کا ایک پہلو اور ہے کہ جب حضرت امیرؓ کو حضرت ہارون علیہ السلام سے تشبیہ دی گئی اور یہ معلوم ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی حیات میں غیر موجودگی کے وقت حضرت ہارون علیہ السلام آپ کے خلیفہ ہوتے تھے اور آپ کی وفات کے بعد یوشع بن نون اور کالب بن یوقنا خلیفہ ہوئے تو اس سے لازم آیا جناب امیرؓ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی عین حیات آپ کی غیر موجودگی میں تو آپ کے خلیفہ ہوں مگر وفات کے بعد نہ ہوں بلکہ دوسرے ہوں تاکہ تشبیہ پوری پوری صحیح ہو سکے۔ کیونکہ کلام رسول میں موجود تشبیہ کو ناقص قرار دینا تو رسول کی شان میں انتہائی بے ادبی ہے،

اور اگر ان سب باتوں سے صرف نظر بھی کر لی جائے تو اس حدیث سے خلفائے ثلاثہ رضوان اللہ علیہم کی خلافت کی نفی کیسے ثابت ہوئی اور وہ بھی ثابت نہیں تو اصل مدعا کہاں حاصل ہوا۔ بہت کھینچ تان کر زیادہ سے زیادہ جو بات ثابت کی جا سکتی ہے وہ جناب امیرؓ کی خلافت کا استحقاق ہے اور بھی کسی وقت اور اسے تو اہل سنت پہلے ہی سے مانتے ہیں،

(۳) تیسری حدیث وہ ہے جو حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً منقول ہے کہ۔

اَنَّهٗ قَالَ اِنَّ عَلِيًّا مِنِّيْ وَاَنَا مِنْ عَلِيٍّ وَّهُوَ وَلِيُّ كُلِّ مُؤْمِنٍ مِّنْ بَعْدِيْ۔

جناب رسالتمآب صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا علی مجھ سے ہیں اور میں علی سے اور وہ میرے بعد ہر مومن کے ولی ہیں،

یہ حدیث باطل اور ناقابل استناد ہے کیونکہ اس کی سند میں اجلح نامی ایک شخص ہے جو شیعہ تھے اور روایات میں گڑبڑ کا اتہام اسپر لگا ہوا ہے، جمہور علماء نے اسے ضعیف کہا ہے لہذا اس کی روایت حجت میں پیش نہیں کی جاسکتی۔

دوسری بات یہ کہ اس کے الفاظ مشترک" میں سے ہیں، تو کیا قرینہ ہے اور کیا ضروری ہے اس سے اولی بالتصرف ہی مراد لیں دوسرے معنے بھی مراد ہو سکتے ہیں، اور پھر ایک بات یہ کہ وہ کسی وقت کے ساتھ مقید نہیں اہل سنت کا مذہب پہلے معلوم ہو ہی چکا کہ وہ یہ مانتے ہیں کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد جناب امیر کسی وقت ضرور واجب الاطاعت امیر تھے،

(۴) چوتھی حدیث استدلال وہ ہے جو حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے ان الفاظ میں مروی ہے،

اَنَّهٗ كَانَ عِنْدَ النَّبِيِّ صلے اللّٰه عليه وسلم طَائِرٌ قَدْ طُبِخَ لَهٗ اَوْ اُهْدِيَ اِلَيْهِ فَقَالَ اَللّٰهُمَّ ائْتِنِيْ بِاَحَبِّ النَّاسِ اِلَيْكَ يَاْكُلُ مَعِيْ هٰذَا الطَّيْرَ فَجَاءَهٗ عَلِيٌّ۔

نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے خوان نعمت پر ایک پرندہ تھا جو آپ کے لئے لگایا گیا تھا، یا ریکا پکایا بطور ہدیہ پیش ہوا تھا، اس وقت آپ نے فرمایا اے اللہ اپنے اس بندہ کو جو سب لوگوں سے زیادہ محبوب ہو میرے پاس بھیج تاکہ وہ اس پرندہ کے تناول میں میرے ساتھ ہو اس وقت حضرت علی تشریف لے آئے،

پہلی بات تو یہ کہ اس بھنے ہوئے پرندہ کے بارے میں روایات مختلف اللفظ ہیں بعض میں سمانی ہے جو ایک پرندہ کا نام ہے، بعض میں حباری یعنی چرزہ ہے، اور بعض میں حجل کا لفظ ہے یعنی چکور،

اس روایت کو اکثر محدثین نے موضوع قرار دیا ہے، اس کے موضوع ہونے کی تصریح کرنے والوں میں حافظ شمس الدین جزری کا نام بھی ہے اور امام حدیث شمس الدین ابو عبداللہ محمد بن احمد دمشقی ذہبی (معروف بہ علامہ ذہبی) نے اپنی کتاب تلخیص میں لکھا ہے،

لَقَدْ كُنْتُ زَمَانًا طَوِيْلًا اَظُنُّ اَنَّ حَدِيْثَ الطَّيْرِ لَمْ يُحْسِنِ الْحَاكِمُ اَنْ يُّوْدِعَهٗ فِيْ مُسْتَدْرَكِهٖ فَلَمَّا عَلَّقْتُ هٰذَا الْكِتَابَ رَاَيْتُ الْقَوْلَ مِنَ الْمَوْضُوْعَاتِ الَّتِيْ فِيْهِ،

بہت دنوں تک میرا بھی خیال رہا کہ حاکم نے اپنی کتاب میں حدیث طیر کو ذکر کرکے اچھا نہیں کیا جب میں نے اس کتاب پر حاشیہ لکھا تو معلوم ہوا کہ انہوں نے اسے موضوعات کے زمرہ میں رکھا ہے،

اور اس کے ساتھ ساتھ یہ روایات ان حضرات کے لئے مفید مطلب بھی نہیں کہ قرینہ اس بات پر دلالت کر رہا ہے کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے ہم طعامی کے لئے جناب امیر اللہ تعالیٰ کے نزدیک محبوب ترین لوگوں میں سے تھے اور بے شک جناب امیر ایسے ہی تھے کیونکہ بیٹے کا یا جو بمنزلہ بیٹے کے ہو اس کا شریک طعام ہونا

www.Ahlehaq.Com

کھانے کے لطف کو دوبالا کر دیتا ہے اور اگر مطلق احب بھی مراد لیں تو بھی مدعا کو ثابت کرنے میں قاصر رہیں گے۔ کیونکہ مخلوق میں خدا کا محبوب ترین ہونے کے لئے یہ لازم و ضروری نہیں کہ وہ ریاست عامہ کا مالک بھی ہو۔ بہت سے اولیاء کبار اور انبیاء عالی مقدار مخلوق میں اللہ کے نزدیک محبوب ترین تھے، مگر ریاست عامہ کے مالک نہ ہو سکے،

مثلاً حضرت زکریا و حضرت یحییٰ علیہما السلام بلکہ حضرت شمویل علیہ السلام بھی، کہ جن کے زمانہ میں جناب طالوت ریاست کے مالک تھے جیسے قرآنی آیت شاہد ہے،

ایک احتمال یہ بھی ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اس وقت مدینہ منورہ میں رہتے ہوں اور یہ دعا خاص حاضرین کے بارے میں ہو نہ کہ غائبین کے بارے میں۔ اس کی دلیل آپ کا ائتنی فرمانا ہے اس لئے کہ غائب شخص کو دور دراز کی مسافت سے ایک لمحہ میں ہمطعامی کے لئے خرق عادت کے طریقہ سے لے آنا یہاں متصور نہیں، اور انبیاء کرام علیہم السلام اللہ تعالیٰ سے خرق و معجزہ کا سوال صرف کفار کے مطالبہ کے وقت ہی کرتے ہیں، ورنہ پھر جنگ و جہاد یا کسی اور کام کے لئے اسباب ظاہری کی تیاری کی کیا ضرورت تھی تمام امور خرق عادت سے انجام فرما لیا کرتے،

اور یہ ممکن ہے اس سے مراد ایسی ہی ہو جیسے عام بول چال میں لوگوں کی ہوتی ہے جیسے یہ کہنا مَنْ اَحَبُّ النَّاسِ اِلَیْکَ۔ تیرے نزدیک سب لوگوں میں محبوب ترین کون ہے: اور یہ استعمال بہت رائج اور مشہور ہے اسی طرح اہل زبان کا یہ قول فلان اعقل الناس وافضلھم (لوگوں میں فلاں بڑا عقلمند اور ان سے افضل ہے)۔

اور بالغرض یہ مدعا کے لئے دلیل ہو بھی تو یہ ان صریح و صحیح احادیث کا مقابلہ نہیں کر سکتی جو کھلے اور صاف الفاظ میں حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی خلافت پر دلالت کرتی ہیں، مثلاً۔

اِقْتَدُوْا بِالَّذِیْنَ مِنْ بَعْدِیْ اَبِیْ بَکْرٍ وَّ عُمَرَ۔ میرے بعد دین کے معاملہ میں ابوبکر اور عمر کی پیروی کرنا

(۵) پانچویں حدیث وہ جو حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے،

اِنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اَنَا مَدِیْنَۃُ الْعِلْمِ وَعَلِیٌّ بَابُھَا۔ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں علم کا شہر ہوں اور علی اس کا دروازہ ہیں،

یہ حدیث بھی خرابیوں سے خالی نہیں یحییٰ بن معین نے کہا، اس کی کوئی اصل نہیں امام بخاری نے کہا یہ "منکر" ہے۔ ترمذی نے کہا کہ "منکر غریب ہے" ابن جوزی نے اسے موضوعات میں شمار کیا ہے شیخ تقی الدین ابن دقیق العید نے کہا کہ علماء حدیث نے اس کا کوئی ثبوت نہیں پایا شیخ محی الدین نووی، حافظ شمس الدین ذہبی، اور شیخ شمس الدین جزری نے اس کو موضوع بتایا ہے،

لہٰذا ایسی روایت سے جو موضوع ہو اور جسے اہل سنت نے احتجاج و تمسک کے دائرہ سے باہر کر دیا ہو، استدلال و تمسک کرنا اور وہ بھی اہل سنت ہی کو الزام دینے کے لئے علماء شیعہ کی دانشمندی کا کچھ اچھا مظاہرہ نہیں،

www.Ahlehaq.com

اس کی مثال تو ایسی ہے کہ کسی شخص نے اپنے ملازم کی بد دیانتی، خیانت اور غلطیوں سے آگاہ ہو کر ملازمت اور گھر سے نکال دیا ہو اور منادی عام کے ذریعہ اعلان بھی کرا دیا ہو کہ اس کو فلاں فلاں قصوروں اور غلطیوں کی بنا پر نکال دیا گیا ہے اب اس سے میری ذمہ داری پر کوئی لین دین نہ کرے میں اس کی کسی بات و معاملہ کا ذمہ دار نہیں ہوں۔ پھر بھی کوئی احمق جس کی اس نوکر سے شناسائی ہو وہ اس سے لین دین کرے اور تقاضے کے لئے مالک کو پکڑے، تو کون اس احمق کو عقلمند کہے گا،

اور پھر یہ روایت ان کے مفید مطلب بھی نہیں، چلو مان لیا کہ جناب امیرؓ شہر علم کا دروازہ ہیں مگر یہ کیا ضروری ہے کہ وہ ریاست عامہ کے مالک ہوں اور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد خلیفہ بلا فصل بھی، زیادہ سے زیادہ آپ کے لئے جو بات ثابت ہوگی وہ یہ کہ شرائط امامت میں سے ایک شرط بوجہ اکمل آپ میں پائی گئی اور پھر ایک شرط پائی جانے سے تو مشروط کا وجود لازم نہیں آتا۔ نا۔ جب اس کے ساتھ یہ بات بھی ہو کہ وہی شرط یا اس سے بھی زیادہ دوسروں میں بروایت اہل سنت ثابت ہو۔ مثلاً حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

مَا صَبَّ اللّٰهُ شَيْئًا فِيْ صَدْرِيْ إِلَّا وَقَدْ صَبَبْتُهُ فِيْ صَدْرِ أَبِيْ بَكْرٍ

اللہ تعالیٰ نے میرے سینہ میں کوئی چیز نہیں ڈالی جو میں نے ابوبکر کے سینے میں نہ ڈالدی ہو،

یا مثلاً لو کان بعدی نبی لکان عمر

میرے بعد اگر کوئی نبی ہوتا تو وہ عمر ہوتے۔

اگر اہل سنت کی روایات کا اعتبار کرنا ہے تو ہر جگہ کریں ورنہ ان کے منہ ہی نہ آنا چاہیئے، کیونکہ یہ ایک آدھ روایت سے مات کھانے والے نہیں،

(۱۲) اس حدیث کو امامیہ نے مرفوعاً روایت کیا ہے،

أَنَّهُ قَالَ مَنْ أَرَادَ أَنْ يَّنْظُرَ إِلٰى آدَمَ فِيْ عِلْمِهِ وَإِلٰى نُوْحٍ فِيْ تَقْوَاهُ وَإِلٰى إِبْرَاهِيْمَ فِيْ حِلْمِهِ وَإِلٰى مُوْسٰى فِيْ بَطْشِهِ وَإِلٰى عِيْسٰى فِيْ عِبَادَتِهِ فَلْيَنْظُرْ إِلٰى عَلِيِّ بْنِ أَبِيْ طَالِبٍ۔

آپ نے فرمایا جو آدم کے علم کو، نوح کے تقوی کو ابراہیم کے حلم کو موسیٰ کی سختی کو عیسیٰ کی عبادت کو دیکھنا چاہے تو اسے چاہیئے کہ علی بن ابی طالب کو دیکھ لے،

اس حدیث سے ان کا طریق استدلال یوں ہے کہ اس روایت سے انبیاء علیہم السلام کے ساتھ جناب امیر کی ہم صفتی ظاہر ہوئی۔ اور انبیاء دوسروں پہ افضل ہیں اور افضل کا مساوی بھی خود افضل ہوتا ہے لہذا حضرت علی رضی اللہ عنہ دوسروں سے افضل ہوئے، اور امامت کا حقدار افضل ہی ہوتا ہے دوسرا کوئی نہیں۔

اگر اللہ تعالیٰ نے کسی کو عقل کی نعمت دی ہے تو وہ اس استدلال و تمسک کی سرتاپا خرابیاں کھلی آنکھوں دیکھ سکتا ہے اول تو یہ کہ یہ روایت اہل سنت کی احادیث میں سے نہیں۔ ابن مطہر نے اپنی کتابوں میں کبھی تو اس کو بیہقی کی طرف منسوب کیا ہے اور کبھی بغوی کی طرف حالانکہ ان دونوں کی تصانیف میں اس روایت کا نشان تک نہیں، افتراء و بہتان سے اہل سنت کو الزام دینے کا طریقہ ان کا فطری جوہر ہے،

www.Ahlehaq.com

جب کہ اس طریقہ سے نہ ان پہ الزام آسکتا ہے، نہ وہ اس دعوٰی سے مرعوب ہو سکتے ہیں اہل سنت کا یہ طے شدہ قاعدہ ہے کہ ایسی حدیث حجت و تمسک کے لائق نہیں جو ائمہ حدیث نے اپنی کتاب میں درج تو کیا ہو مگر صاحب کتاب نے کتاب میں مندرج احادیث کی صحت کا التزام و اہتمام نہ کیا ہو جیسا کہ امام بخاری، مسلم اور دیگر اصحاب صحاح نے التزام کیا ہے۔ اور اس حدیث کی نہ صاحب کتاب نے بالخصوص تصریح کی ہے اور نہ کسی ثقہ اور محدث نے:

اسی محدثین کی وہ جماعت جو پچھلے طبقہ میں گزری ہے مثلاً دیلمی، خطیب، ابن عساکر وغیرہ جب انہوں نے دیکھا کہ محدثین سلف احادیث صحاح و حسان کو خوب جانچ پرکھ کر مرتب کر گئے اور اس کوشش میں کوئی پہلو تشنہ نہیں چھوڑا تو انہوں نے ضعیف و موضوع روایات پہ توجہ دی یا ان روایات پہ جن کی اسانید یا متون میں الٹ پھیر کیا گیا تھا، اور بیاض کی صورت میں ان کو جمع کیا تاکہ ان پہ نظر ثانی کریں اور موضوعات کو حسان سے الگ کر لیں۔ لیکن فرصت کی کمی اور عمر کی کوتاہی کے سبب اس اہم کام کو سرانجام نہ دے سکے اور یہ کام ان کے بعد والوں نے انجام دیا اور ان میں فرق کرنے اور تمیز دینے کی ذمہ داری کو پورا کیا۔ چنانچہ علامہ ابن جوزی نے موضوعات کو علیحدہ کیا اور اس کے مقابلہ میں حسان لغیرہا کو مقاصد حسنہ میں جدا لکھا۔

ادھر علامہ سیوطی نے تفسیر در منثور کی شکل میں کام کیا۔

اور اس قسم کے مجموعوں کے مرتبین نے اپنی کتابوں کے مقدمات میں یہ بات صاف لکھ دی کہ یہ مجموعہ کس غرض کے لیے مرتب کیے گئے اور ان میں کس کس طرح کی روایات ہیں۔ لہذا ان کتابوں کا حال و حیثیت خود مرتبین سے معلوم ہو جانے کے بعد ایسی روایات سے استدلال و تمسک کہاں تک جائز ہے اسی سے صاحب جامع الاصول نے یہ بات نقل کی ہے کہ خطیب بغدادی نے شریف مرتضٰی سے جو رضی کا بھائی تھا شیعی روایات کو لیا ہے اور اس غرض سے ان کو یکجا و مرتب کیا کہ ان کی جانچ کر کے اور بحث کر کے یہ پتہ چلائے کہ ان کی کوئی اصل بھی ہے یا نہیں۔

حاصل کلام یہ کہ یہ حدیث زیر بحث تو ایسی بھی نہیں جو اہل سنت کی کسی کتاب میں مروی ہو گو بطریق ضعیف ہی ہو!

دوسرے یہ کلام محض تشبیہ کے طور پہ ہے کہ جناب امیرؓ کی بعض صفات کو انبیائے مذکورین کے بعض صفات سے تشبیہ دینا مقصود ہے، اور تشبیہ جس طرح مشہور ہے حروف تشبیہ کاف کَاَنَّ مثل نحو کے ساتھ ہوتی ہے،

اس طرح بھی ہوتی ہے۔ چنانچہ علم بیان میں طے شدہ ہے کہ مَنْ اَرَادَ اَنْ یَنْظُرَ اِلَی الْقَمَرِ لَیْلَۃَ الْبَدْرِ فَلْیَنْظُرْ اِلٰی وَجْہِ فُلَانٍ کا کلام بھی تشبیہ میں داخل ہے (جو لیلۃ البدر میں چاند دیکھنا چاہے اسے چاہیے کہ فلاں کا چہرہ دیکھ لے)

اور یہ شعر بھی تشبیہ ہے،

لَا تَعْجَبُوْا مِنْ بِلَا غِلَالَتِہٖ		قَدْ زُرَّ اَزْرَارُہٗ عَلَی الْقَمَرِ

(اس کے جامہ کتان کے پھٹ جانے پر تعجب نہ کرو یہ تو چاند پر تکمہ لگا یا گیا ہے)
اور متنبی کے یہ دو شعر بھی، تشبیہ کے ہیں۔

تَشَرَّفَتْ ثَلٰثَ ذَوَائِبَ مِنْ تَحْلِیْفِھَا فِیْ لَیْلَۃٍ فَاَرَتْ لَیَالِیَ اَرْبَعًا
وَاسْتَقْبَلَتْ قَمَرَ السَّمَاءِ بِوَجْھِھَا فَاَرَتْنِیَ الْقَمَرَیْنِ فِیْ وَقْتٍ مَّعًا

(۱) بوقت شب معشوقہ نے پیچھے کی طرف اپنے تین گیسو بکھیر دئے تو لوگوں کو تین راتیں یکبار دکھائیں،
(۲) اور اپنے چہرے سے آسمانی چاند کے سامنے آئی تو مجھ کو دو چاند ایک ساتھ دکھائے!
اور اگر اس سے بھی قطع نظر کریں تو یہ استعارہ ہوگا جس کی بنا تشبیہ پر ہے اور تشبیہ یا استعارہ میں مشبہ کو مشبہ بہ کے ساتھ مساوی جاننا پہلے درجہ کی بے وقوفی ہے،
چنانچہ اشعار میں یہ بات عام ہے کہ بادشاہوں کے صحن کی خاک کو مشک کے ساتھ اور وہاں کے سنگریزوں کو مروارید و یاقوت سے تشبیہ دیتے ہیں اور ان دونوں میں مساوات کو کوئی بھی نہیں مانتا۔
یہ شعر دیکھئے۔

اَرَی بَارِقًا بَادَ بَرْقِ الْفَرْدِ یَوْمِضُ فَیَکْشِفُ جِلْبَابَ الدُّجٰی ثُمَّ یَغْمِضُ
کَاَنَّ سُلَیْمٰی مِنْ اَعَالِیْہِ اَشْرَفَتْ فَمَدَّ لَنَا کَفًّا خَضِیْبًا وَ تَقْبِضُ

(۱) میں دیکھتا ہوں کہ بجلی تنہا مٹی کے تودہ پہ چمکتی ہے تو اندھیری کا پردہ چاک کر دیتی ہے اور پھر چھپا دیتی ہے،
(۲) گویا کہ سلیمیٰ اس ٹیلہ کی طرف متوجہ ہے پس مہندی لگی ہتھیلیاں کو کھول دیتی ہے اور پھر بند کر لیتی ہے
اب اس شعر کے مضمون سے یہ لازم نہیں آتا کہ سلیمیٰ کا مہندی لگا ہاتھ چمک اور درخشندگی میں بجلی کے برابر ہو۔
اہل سنت کی احادیث صحیحہ میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو حضرت ابراہیم و حضرت عیسیٰ علیہما السلام کے ساتھ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو حضرت نوح اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کے ساتھ اور حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے تشبیہ دی گئی ہے،
لیکن چونکہ فرقہ اہل سنت عقل خداداد سے بہرہ ور ہے اس لئے وہ اس تشبیہ کو انبیاء مذکورین کے ساتھ ان اصحاب گرامی کے برابر ہو جانے پر محمول نہیں کرتے مشبہ کو اپنے مقام پر اور مشبہ بہ کو اپنے مرتبہ پہ رکھتے ہیں،
بلکہ اس قسم کے کلمات میں تشبیہ سے اس طرف اشارہ خاص ہے کہ پیغمبر کے مختص اوصاف میں سے اس شخص میں جو وصف ہے وہ اس درجہ اور مرتبہ کا نہیں ہے،
بدر کے قیدیوں کے متعلق نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر و حضرت عمر رضی اللہ عنہما سے جب مشورہ طلب فرمایا تو اس کا قصہ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے یوں منقول ہے۔
قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلے اللہ علیہ وسلم مَا — انہوں نے کہا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

تَقُوْلُوْنَ فِیْ هٰؤُلَاۗءِ، اِنَّ مَثَلَ هٰؤُلَاۗءِ کَمَثَلِ اِخْوَةٍ لَّهُمْ کَانُوْا مِنْ قَبْلِهِمْ قَالَ نُوْحٌ رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَی الْاَرْضِ مِنَ الْکَافِرِیْنَ دَیَّارًا وَقَالَ مُوْسٰی رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰۤی اَمْوَالِهِمْ وَاشْدُدْ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ الاٰیة وَقَالَ اِبْرَاهِیْمُ فَمَنْ تَبِعَنِیْ فَاِنَّهٗ مِنِّیْ وَمَنْ عَصَانِیْ فَاِنَّکَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ وَقَالَ عِیْسٰۤی اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُکَ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّکَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ،

تم ان کے بارے میں کیا کہتے ہو۔ بے شک ان کی مثال ان کے ان بھائیوں کی سی ہے جو ان سے پہلے تھے (یعنی جس طرح بعض انبیاء صفات جمال و لطف مظہر ہیں اور بعض صفات جلال و قہر کے۔ اسی طرح ابوبکرؓ صفات جمال کا مظہر ہیں اور عمرؓ صفات جلال کا مظہر) نوح علیہ السلام نے فرمایا اے میرے پروردگار زمین پر بسنے والے کسی کافر کو بھی نہ چھوڑ! اور موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا اے میرے پروردگار ان کے مال ناپید کر اور ان کے دلوں پر سختی ڈال، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا پس جس نے میری نافرمانی کی تو بس تو بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے اور عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا اگر تو ان کو عذاب دے گا تو وہ تیرے بندے ہیں اور اگر بخش دے گا تو ان کو بس تو غالب اور حکمت والا ہے،

یہ روایت حاکم نے بیان کی اور اس کی تصحیح کی ہے،

اور حضرت ابی موسیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے،

اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَهٗ یَا اَبَا مُوْسٰی لَقَدْ اُعْطِیْتَ مِزْمَارًا مِّنْ مَزَامِیْرِ اٰلِ دَاوٗدَ

نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا اے ابو موسیٰ تمکو حضرت داؤد علیہ السلام کی خوش آوازیوں میں سے خوش آوازی مرحمت ہوئی ہے،

نیز فرمایا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے۔

مَنْ سَرَّهٗ اَنْ یَّنْظُرَ اِلٰی تَوَاضُعِ عِیْسَی ابْنِ مَرْیَمَ فَلْیَنْظُرْ اِلٰی اَبِیْ ذَرٍّ۔

جس شخص کی یہ خواہش ہو کہ وہ عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کی تواضع کا نمونہ دیکھے تو اسے چاہیے کہ ابی ذر کو دیکھے

اسے استیعاب میں اسی طرح بیان کیا گیا ہے،

ترمذی نے اسی کو مختلف الفاظ میں روایت کیا گیا ہے یعنی،

قَالَ مَا اَظَلَّتِ الْخَضْرَاۗءُ وَلَا اَقَلَّتِ الْغَبْرَاۗءُ اَصْدَقَ لَهْجَةً مِّنْ اَبِیْ ذَرٍّ شَبِیْهَ عِیْسَی ابْنِ مَرْیَمَ یَعْنِیْ فِی الزُّهْدِ

فرمایا نیلگوں آسمان نہیں سایہ فگن ہوا کسی پر اور نہ اٹھایا کسی کو زمین نے اپنی پشت پہ جو زیادہ راست گو ہو ابی ذر (رضی اللہ عنہ) سے جو زہد میں عیسیٰ بن مریم علیہما السلام سے مشابہ ہیں،

تیسرے یہ کہ افضل کی کسی ایک صفت میں مساوات و برابری افضلیت کا سبب نہیں کیونکہ اس افضل میں اور جو صفات ہیں ان کی وجہ سے وہ افضل ہی رہا،

پھر یہ بات جسے ہم بارہا دہرا چکے ہیں کہ افضلیت کا تقاضا ریاست کبریٰ کو کب ہے،

چوتھے یہ کہ اس حدیث سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فضیلت خلفاء پر اس وقت تو ثابت

www.Ahlehaq.com

ہو سکتی ہے کہ وہ انبیاء کرام علیہم السلام کے ساتھ ان باطنی صفات میں مساوی نہ ہوں اور اس سے انکار بہت ہی مشکل ہے۔ بلکہ اگر اہل سنت کی کتابوں کی واقعی چھان بین کی جائے تو جناب ابوبکر و جناب عمر رضی اللہ عنہما کے متعلق انبیاء کرام علیہم السلام سے مشابہت کی اتنی حدیثیں ملیں گی، کہ ان کا کوئی ہم عصر اس کا مقابلہ نہ کر سکے گا۔

اسی لیے محققین صوفیہ رحمہم اللہ نے لکھا ہے کہ حضرات شیخین رضی اللہ عنہما کمالات نبوت کے حامل ہیں، اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کمالات ولایت کے حامل، چنانچہ انبیاء کے کام یعنی کفار سے جہاد، احکام شریعت کو رواج دینا، ملت کی اصلاح، بحسن و خوبی شیخین رضی اللہ عنہما کے ہاتھوں سرانجام پائے اور اولیا کے کام مثلاً تعلیم طریقت ارشاد، حال و مقامات سالکین، نفس کے امور سے آگاہی اور دنیا میں زہد کی ترغیب زیادہ تر حضرت علیؓ سے مروی و منقول ہے۔

اور یہ بات عقل سے سمجھی جا سکتی ہے کہ ملکات کا سراغ ان افعال کے صدور سے لگ سکتا ہے جو ان کے ساتھ مخصوص ہے،

مثلاً اگر ایک شخص میدان کارزار میں ثابت قدمی دکھاتا ہے اور اپنے ہم جنسوں کے مقابلہ میں تیغ زنی اور نیزہ بازی میں بازی لیجاتا ہے، تو یہ اس کی شجاعت نفسی کی واضح دلیل ہے۔ بلکہ محبت و عداوت، خوف و امید اور دوسرے باطنی امور بھی انہیں معاملات و افعال کے ذریعہ سے معلوم ہو سکتے ہیں،

اسی قیاس پر کسی شخص کے کمالات باطنی کے پتہ لگانے میں کہ آیا وہ کمالات نبوت کا حامل ہے یا کمالات اولیاء کا۔ اس کے خارجی افعال سے جو انہیں دو عمدہ اوصاف سے تعلق رکھتے ہیں، امتیاز حاصل ہوتا ہے اور شیعوں کی خود اپنی کتابوں سے منقول اس حدیث سے کہ اِنَّكَ يَا عَلِيُّ تُقَاتِلُ لِلنَّاسِ عَلٰى تَاوِيلِ الْقُرْآنِ كَمَا قَاتَلْتُهُمْ عَلٰى تَنْزِيلِهِ ۔ میں واضح اشارہ ہے اسی تفرقہ و امتیاز کی طرف ہے کیونکہ شیخین رضی اللہ عنہما کی جنگ و جہاد تنزیل قرآن پر تھی گویا ان کا عہد، عہد نبوت کا ہی بقایا حصہ ہے اور جناب امیر رضی اللہ عنہما کا دور، دور ولایت کا آغاز ہے اسی لئے شیوخ طریقت اور ارباب معرفت و حقیقت آنجناب کو باب ولایت محمدیہ کا فاتح اور ولایت مطلقہ انبیاء کا خاتم لکھتے ہیں، یہی سبب ہے کہ اکثر اولیاء اللہ کے فرقوں کے سلسلے آنجناب ہی پر ختم ہوتے ہیں، اور وہ سب ندیوں کی طرح آپ کی ہی ذات بحر صفات سے پھوٹتے ہیں،

بالکل اسی طرح جس طرح فقہا شریعت و مجتہدین ملت کی شاگردگی کے سلسلے حضرات شیخینؓ یا ان کے متبعین تک پہنچتے ہیں مثلاً عبد اللہ بن مسعود و معاذ بن جبل، زید بن ثابت اور عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہم اور ان ہی کے قطرات علمیہ سے سب کے سب سیراب ہوتے ہیں،

اب حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اولاد میں جس معنی کی امامت باقی رہی اور بس کہ۔ لیے وہ ایک دوسرے کو وصی بناتے رہے وہ ارشاد و ولایت کے قطب اور سرچشمہ ہونے کے معنی میں تھی گویا آپ ہی کی طرح آپ کی ذریت بھی ارشاد و ولایت کا چشمہ فیض بنی رہی اور یہی وجہ ہے کہ اس امر کا تمام مخلوق پر لازم ہوتا ان ائمہ کرام سے مروی نہیں بلکہ وہ اپنے چیدہ اور منتخب دوستوں اور برگزیدہ مصاحبوں کو اس فیض خاص سے مشرف

فرماتے اور ان کی استعداد کے موافق اس دولت سے نوازتے۔ اور ان میں کے ناسمجھ ان تمام اشارات کو ریاست عامہ اور امور ملک و مال میں استحقاق و تصرف پر ڈھالتے رہے اور یوں گمراہی کے بھنور میں ڈبکیاں کھاتے رہے،

اور یہی راز ہے کہ جناب امیر اور آپ کی ذریت کرام رضی اللہ عنہم کو پوری امت پیروں، مرشدوں کی طرح مانتی اور عقیدت رکھتی ہے۔ اور دنیا کے کاموں کو ان سے وابستہ سمجھتی ہے اور فاتحہ درود نذر و منت ان کے نام سے اسی طرح رائج ہیں جس طرح پیروں اور مرشدوں اور دیگر اولیاء اللہ کے ساتھ ہوتا ہے مگر ان معاملات میں شیخین رضی اللہ عنہما کا نام کوئی نہیں لیتا، اور نہ نذر و منت، مجالس و اعراس میں ان کو شریک کرتے ہیں نہ اس قسم کے دنیاوی کاموں سے انہیں وابستہ کرتے ہیں، مگر ان سے محبت و عقیدت رکھتے اور ان کے فضل و کمال کے معتقد ہیں،

(۷) ساتویں حدیث وہ ہے جس کی روایت جناب ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے کرتے ہیں کہ مَنْ نَاصَبَ عَلِيًّا الْخِلَافَةَ فَهُوَ كَافِرٌ۔ جس نے خلافت کے لئے حضرت علیؓ سے جھگڑا کیا وہ کافر ہے، اہل سنت کے ہاں اس روایت کا کوئی اتہ پتہ، نام و نشان مطلق نہیں!

ابن مطہر حلی نے اس روایت کی نسبت اخطب خوارزم کی طرف کی ہے اول تو خود ابن مطہر نقل روایات میں بدنامی کی حد تک خائن ہے، اور پھر اخطب کٹر زیدیہ ہے،

پھر اس کی کتاب جو مناقب امیر المومنین میں ہے اس روایت کے وجود سے خالی ہے، باوجود تلاش اس کا کھوج نہیں لگایا جا سکتا۔ اور اگر ہو بھی تو وہ اس لئے غیر معتبر ہوگی کہ یہ ان احادیث صحیحہ کے مخالف ہے جو خود امامیہ کی کتابوں میں موجود ہیں، مثلاً جناب امیر رضی اللہ عنہ ہی کا یہ قول نہج البلاغہ میں موجود ہے، اس کا ذکر پہلے بھی آچکا ہے،

أَصْبَحْنَا نُقَاتِلُ إِخْوَانَنَا فِي الْإِسْلَامِ عَلَى مَا دَخَلَ فِيهِ مِنَ الزَّيْغِ وَالْاِعْوِجَاجِ۔

اور اگر اس حدیث کو معتبر بھی مان لیں تو اس حدیث کا مضمون اس وقت متحقق ہو سکتا ہے کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ نے کسی وقت مطالبہ خلافت کیا بھی ہو، اور اس وقت کسی دوسرے نے ان سے اسے چھیننا چاہا ہو حالانکہ ایسا واقعہ کسی زمانہ میں بھی پیش نہیں آیا،

خلفائے ثلاثہ رضوان اللہ علیہم کے زمانہ میں تو جناب امیر رضی اللہ عنہ نے خلافت کا مطالبہ ہی نہیں کیا جیسا کہ امامیہ کی اپنی کتابوں میں موجود ہے۔ کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم آپ کو وصیت فرما گئے تھے کہ اگر کوئی مددگار نہ ہو تو اس معاملہ میں سکوت اختیار کریں چنانچہ اسی وصیت کی پاسداری میں آپ خلفاء ثلاثہ رضوان اللہ علیہم کی خلافت کے زمانہ میں خاموش رہے اور جب آپ نے خلافت کا مطالبہ کیا اس وقت بھی حضرت طلحہ، زبیر اور ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہم نے بھی خلافت چھیننے کی نہ کوئی کوشش کی نہ مطالبہ کیا۔ ان حضرات کا مطالبہ تو صرف اتنا تھا کہ اب آپ باقتدار امیر ہیں تو، حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے قاتلین کی تفتیش اور ان کے بارے میں قصاص کا جلد بندوبست فرمائیں۔ دیگر سازشوں کی درپردہ مساعی سے رفتہ رفتہ یہ معاملہ جانبین کے قصد و ارادہ کے علی الرغم جنگ و جدال کی شکل اختیار کر گیا۔ چنانچہ کتب سیر اور جناب امیر کے خطبات اسپر گواہ ہیں،

پھر اگر یہ بھی تسلیم کر لیں تو لفظ کفر سے (حقیقی کفر نہیں بلکہ) کفران نعمت مراد ہے اس لئے کہ اس پر سب متفق ہیں، کہ آپ کے عہد میں آپ کی خلافت اتنی بڑی نعمت تھی جس سے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں اور اس پر دلیل لفظ خلافت ہے کیونکہ خلافت بالاجماع زمین میں تصرف کے ساتھ مشروط ہے اور یہ تصرف آپ کو خلفائے ثلاثہ رضوان اللہ علیہم کے عہد میں ملا ہی کہاں (جو کوئی اسے چھینتا یا انکار کرتا) اسی لئے حدیث میں لفظ امامت نہیں آیا۔ اور اگر اس کو مان بھی لیں۔ تو قرآن مجید کی آیت استخلاف میں خلفائے ثلاثہ کی خلافت کے منکر کو بھی کافر فرمایا ہے اور آیت کو اسی پر ختم بھی فرمایا ہے،

وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذَالِكَ فَاُولٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُوْن۔ (اور جو کوئی اس آیت کے سننے اور اس کا علم ہو جانے پر کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو خلیفہ بنایا ہے اس کے بعد انکار کرے وہی کامل فاسق ہے)

اور محدثین کا اس پر اجماع ہے کہ اخطب زیدی کی ساری روایات مجہول الحال ضعیف راویوں سے منقول ہیں اور یہ کہ اس کی اکثر روایات منکر اور موضوع ہیں اسی لئے فقہائے اہل سنت اس کی روایات سے کوئی حجت و دلیل نہیں دیتے اور اسی وجہ سے علماء اہل سنت سے اس کا نام پوچھا جائے تو کوئی اسے نہیں پہچانتا۔

ان حالات میں اہل سنت کو اس زیدی کی روایت کے حوالہ سے الزام دینا بالکل اسی قصہ کی طرح ہے کہ ایک بوڑھا سنی عاشورہ کے دنوں میں کہیں جا رہا تھا، راستہ میں ایک سانپ دکھائی پڑا یہ اپنے بڑھاپے کے سبب سانپ کو مار نہ سکتا تھا، اتفاقاً وہاں سے ایک شیعہ نوجوان گزر رہا تھا۔ اس کو آواز دیکر بلایا اور کہا اے شیعہ بھائی تجھے عثمان غنی رض کا واسطہ اس سانپ کو مار ڈال۔ یہ سنکر شیعہ جوان واویلا کرنے اور فریاد کرنے لگا کہ مسلمانوں میری فریاد سنو، دیکھو یہ کس کو، کس کا واسطہ دیکر کن دنوں میں، کس جانور کو مارنے کے لئے کہہ رہا ہے!

(۸) وہ حدیث جس کی ان الفاظ میں روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

اَنَا وَعَلِيُّ بْنُ اَبِيْ طَالِبٍ نُوْرًا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ قَبْلَ اَنْ يَّخْلُقَ اٰدَمَ بِاَرْبَعَةِ عَشَرَ اَلْفَ عَامٍ فَلَمَّا خَلَقَ اللّٰهُ اٰدَمَ قَسَمَ ذَالِكَ النُّوْرَ جُزْئَيْنِ فَجُزْءٌ اَنَا وَجُزْءٌ عَلِيُّ بْنُ اَبِيْ طَالِبٍ

(میں اور علی بن ابی طالب بشکل نور اللہ تعالےٰ کے سامنے چودہ ہزار سال رہے جب اللہ تعالیٰ نے آدم کو پیدا کیا تو اس نور کے دو حصے کئے بس ایک حصہ میں اور ایک حصہ علی بن ابی طالب ہیں)

اہل سنت کے نزدیک یہ روایت بالاجماع موضوع ہے۔ اس کی اسناد میں ایک راوی محمد بن خلف مروزی ہے یحییٰ بن معین نے اسے کذاب کہا ہے۔ دارقطنی نے اسے متروک کہا ہے اور اس کے جھوٹا ہونے کے بارے میں کسی نے اختلاف نہیں کیا۔ اس روایت کا ایک دوسرا سلسلہ سند بھی ہے جس میں ایک راوی جعفر بن احمد ہے۔ یہ متعصب رافضی اور جھوٹی روایات کرنے والا ہے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کی برائی اور ان کی سب و شتم کے سلسلہ میں روایات گھڑا کرتا تھا،

اور اگر اسے کسی درجہ میں قابل لحاظ مان لیں تو یہ ایک دوسری روایت کے مخالف ہے جو اس سے فی الجملہ بہتر ہے اس کی سند میں کوئی جھوٹا اور وضاع نہیں ہے جسے امام شافعی رحمہ اللہ علیہ نے اپنی سند سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

www.Ahlehaq.com

كُنْتُ اَنَا وَاَبُوْبَكْرٍ وَعُمَرُ وَعُثْمَانُ وَعَلِيٌّ بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ قَبْلَ اَنْ يَّخْلُقَ اٰدَمَ بِاَلْفِ عَامٍ فَلَمَّا خَلَقَ اَسْكَنَنَا ظَهْرَهٗ وَلَمْ نَزَلْ نَنْتَقِلُ فِي الْاَصْلَابِ الطَّاهِرَةِ حَتّٰى نَقَلَنِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى اِلٰى صُلْبِ عَبْدِ اللّٰهِ وَنَقَلَ اَبَابَكْرٍ اِلٰى صُلْبِ اَبِيْ قُحَافَةَ وَنَقَلَ عُمَرَ اِلٰى صُلْبِ الْخَطَّابِ وَنَقَلَ عُثْمَانَ اِلٰى صُلْبِ عَفَّانَ وَنَقَلَ عَلِيًّا اِلٰى صُلْبِ اَبِيْ طَالِبٍ۔

میں، ابوبکر، عمر، عثمان و علی تخلیق آدم سے ہزار سال پہلے اللہ تعالیٰ کے سامنے تھے جب ان کو پیدا کیا تو ہمیں ان کی پشت میں قائم فرمایا اور یوں ہم پاک پشتوں میں منتقل ہوتے رہے حتیٰ کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے عبداللہ کی صلب میں منتقل کیا تو ابوبکر کو ابو قحافہ کی عمر کو خطاب کی عثمان کو عفان کی اور علی کو ابی طالب کی صلب میں منتقل فرمایا۔

اس حدیث کی موید ایک دوسری مشہور حدیث بھی ہے، وہ یہ ہے،

اَلْاَرْوَاحُ جُنُوْدٌ مُّجَنَّدَةٌ مَا تَعَارَفَ مِنْهَا ائْتَلَفَ وَمَا تَنَاكَرَ مِنْهَا اخْتَلَفَ

ارواح فوج در فوج جمع تھیں وہاں آپس میں جن جن کی شناسائی ہوئی ان میں دنیا میں بھی الفت رہی اور جن میں ناآشنائی تھی وہ دنیا میں بھی باہم انجان رہے۔

اور ساری تگ و دو اور رد و کد کے بعد بھی یہ روایت ان کے مدعا پر دلالت نہیں کرتی کیونکہ جناب امیرؓ کی نور نبوی میں شرکت بھی ان کی امامت بلا فصل ثابت نہیں کرتی ان ہر دو کے درمیان تلازم اس طرح ثابت ہونا چاہیئے کہ اعتبار کا غبار بھی اسے نہ چھو سکے مگر اس کے ثبوت میں مشکلات کے مراحل حائل ہیں۔ جناب امیر کو حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے جو قرب حاصل تھا، اس میں تو کوئی کلام نہیں کلام تو اس میں ہے کہ یہ قرب امامت بلا فصل کا سبب ہے، یا نہیں! اگر قرب نسبی ہی صرف امامت کا سبب ہوتا تو حضرت عباس رضی اللہ عنہ امامت و خلافت کے زیادہ حقدار تھے کیونکہ آپ چچا بھی تھے اور والد بزرگوار کے شریک اصل بھی! اور ظاہر ہے چچا، چچا زاد بھائی سے عرفاً و شرعاً اقرب ہے،

اور اگر کوئی یہ کہے کہ جناب عباس رضی اللہ عنہ نور سے محروم تھے اس لئے لیاقت امامت سے محروم ہوئے کیونکہ نور عبدالمطلب حضرت عبداللہ اور جناب ابوطالب میں بٹ گیا دوسرے بیٹوں کے حصہ میں نہیں آیا تو ہم یہ کہیں گے کہ اگر نور کی قوت و کثرت پر مدار تقدم ہے تو پھر حضرات حسنین رضی اللہ عنہما قوت و کثرت ہر دو جہت سے جناب امیر رضی اللہ عنہ سے بھی امامت میں احق اولیٰ ہوں گے باعتبار قوت تو اس طرح کہ جب نور بٹا تو حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا حصہ حضور ہی کو ملا اور وہی نور حضرات حسنینؓ کو تقسیم ہوا۔ بخلاف جناب امیر کے کہ آپ اصل نور میں ہی شریک تھے، نور پیغمبر میں تو شریک نہیں تھے۔ اور ظاہر ہے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے حصہ کا نور دوسرے کے نور سے زیادہ قوی ہے،

اور بلحاظ کثرت اسطرح کہ حضرات حسنین رضی اللہ عنہما اپنے اندر نور مصطفوی اور نور مرتضوی دونوں رکھتے تھے، اور دو نور ایک نور سے قطعاً زیادہ اور اکثر ہے!۔

(۹) وہ حدیث جو عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ خیبر کے دن آپ نے فرمایا۔

لَاُعْطِيَنَّ الرَّايَةَ غَدًا رَجُلًا يُّحِبُّ اللّٰهَ وَ

کل میں جھنڈا ایسے شخص کو دوں گا جو اللہ و رسول سے

رَسُوْلَہٗ وَیُحِبُّہُ اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ یَفْتَحُ اللّٰہُ عَلٰی یَدَیْہِ۔ محبت رکھتا ہے اور اللہ و رسول اس کو محبوب رکھتے ہیں، اللہ تعالیٰ اس کے ہاتھ پہ فتح دے گا۔

یہ حدیث صحیح تو ہے ہی اور قوی الروایت بھی، یہ اہل سنت کے سر کا جھومر اور آنکھوں کی روشنی ہے اور خوارج و نواصب کے اقوال کو رد کرنے کی خاطر اپنی کتابوں میں بڑے اعتماد و وثوق سے درج بھی کرتے ہیں مگر افسوس ہے کہ شیعوں کا مدعا اس روایت سے بھی ثابت نہیں ہوتا کیونکہ خدا و رسول کا محب محبوب ہونا بھی اس بات کو مستلزم نہیں کہ وہ امام بلا فصل بھی ہو۔ (اور اگر انہیں اس پہ اصرار ہی ہو تو ہم کہتے ہیں کہ جو خدا و رسول کو محبوب تھے وہی امام بلا فصل ہوئے یعنی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ) کیونکہ ان دو صفتوں کا کسی ایک شخص کے لئے ایک کلام میں ثابت کرنا دوسروں سے ان صفات کی نفی نہیں کرتا اور یہ ہو بھی کیسے سکتا ہے جب کہ اللہ تعالیٰ نے یُحِبُّھُمْ وَیُحِبُّوْنَہٗ، خود حضرت ابوبکر اور ان کے رفقاء رضی اللہ عنہم کے بارے میں فرمایا ہو یا اہل بدر کے حق میں ارشاد فرمایا۔

اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِہٖ صَفًّا کَاَنَّھُمْ بُنْیَانٌ مَّرْصُوْصٌ۔ بے شک اللہ تعالیٰ ان کو محبوب رکھتا ہے جو اس کی راہ میں صف بستہ ہو کر قتال کرتے ہیں گویا وہ سیسہ پلائی ہوئی ایک دیوار ہیں،

اور اس میں کوئی شک نہیں اللہ جسے دوست رکھے اس کا رسول بھی ان کو دوست رکھتا ہے اور مومنوں میں جو اللہ کو دوست رکھتا ہے وہ اس کے رسول کا بھی محب ہے!

اور اہل مسجد قبا کی شان میں ارشاد فرمایا ہے:

فِیْہِ رِجَالٌ یُّحِبُّوْنَ اَنْ یَّتَطَھَّرُوْا وَاللّٰہُ یُحِبُّ الْمُطَّھِّرِیْنَ اس میں ایسے لوگ ہیں جو طہارت کو بہت پسند کرتے اور اللہ تعالیٰ طہارت پسند لوگوں کو محبوب رکھتا ہے،

اور حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اِنِّیْ اُحِبُّکَ (میں تم کو دوست رکھتا ہوں)۔

وَلَمَّا سُئِلَ مَنْ اَحَبُّ النِّسَاءِ اِلَیْکَ قَالَ عَائِشَۃُ قِیْلَ مِنَ الرِّجَالِ قَالَ اَبُوْھَا۔ اور جب آپ سے پوچھا گیا (اہل بیت مستورات میں سے) آپ کو کون سی زیادہ محبوب ہیں، تو آپ نے فرمایا عائشہ پوچھا گیا کہ مردوں میں سے کون! فرمایا ان کے والد۔

اگر شیعوں کو یہ اشکال ہو کہ جب خدا و رسول کا محب و محبوب ہونا دوسروں میں بھی پایا گیا تو پھر جناب امیر رضی اللہ عنہ سے اس کی تخصیص نہ ہی حالانکہ یہاں (واقعہ خیبر میں) تخصیص ہونی چاہیئے تو اس کے جواب میں یہ کہا جائیگا کہ یہاں تخصیص باعتبار مجموع صفات کے ہے یعنی بلحاظ یفتح اللّٰہ علٰی یدیہ اور چونکہ علم الٰہی میں جناب امیر رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں پہ اس کی فتح مقدر تھی، اس لئے وہ سب صفات مجموعی حیثیت سے جناب امیرؓ کے ساتھ مخصوص ہوئیں گو علیحدہ علیحدہ دوسروں میں پائی جاتی ہیں۔

پھر اس صفت کا ذکر جو دوسروں میں بھی مشترک ہے۔ یہاں ایک لطیف نکتہ کی طرف اشارہ کرتا ہے،

Www.Ahlehaq.com

وہ یہ کہ حدیث صحیح میں وارد ہے إِنَّ اللّٰهَ يُؤَيِّدُ هٰذَا الدِّيْنَ بِالرَّجُلِ الْفَاجِرِ (بے شک اللہ تعالیٰ اس دین کی مدد و تائید فاجر شخص سے بھی کرا دیتا ہے)

لہٰذا اگر صرف قلعہ کی فتح جناب امیر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پہ بیان کر دی جاتی تو وہ آپ کی فضیلت و بزرگی کا سبب نہ ہوتی، اسی وجہ سے ان صفات کو پہلے ذکر فرمایا۔

دوسرا جواب تخصیص کا یہ ہے کہ کلام عرب بلکہ تمام قوموں کی گفتگو میں پہلے ایک خبر بطور تمہید ہوتا ہے اور مقصود اس کے بعد کا حصہ ہے۔ جیسے رجلا کا لفظ اس حدیث میں۔ یا جیسے کہتے ہیں زید ایک مرد عقلمند ہے۔ تو یہاں زید کا مرد ہونا بیان میں مقصود نہیں بلکہ اس کا عقلمند ہونا مقصود بیان ہے۔ اسی طرح یہاں بھی مقصود تو يَفْتَحُ اللّٰهُ عَلٰى يَدَيْهِ سے آپ کی تخصیص ہے اور يُحِبُّهُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَيُحِبُّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ محض تمہید بیان ہے۔

(۱۰) یہ حدیث، رَحِمَ اللّٰهُ عَلِيًّا اَللّٰهُمَّ اَدِرِ الْحَقَّ مَعَهٗ حَيْثُ دَارَ اللہ علی پر رحم کرے اے اللہ حق کو علی کے ساتھ گھما وہ جدھر گھومے۔

اہل سنت بھی اس حدیث کو سر آنکھوں پہ جگہ دیتے ہیں مگر اس کو کیا کیا جائے کہ شیعوں کا مدعا یعنی امامت بلا فصل اس سے بھی ثابت نہیں ہوتا۔ یہ حدیث اس مدعا سے دور کا واسطہ بھی نہیں رکھتی یوں تو جناب عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کے متعلق بھی یہ فرمایا ہے، اَلْحَقُّ مَعَ عَمَّارٍ حَيْثُ دَارَ۔ (حق عمار کے ساتھ ہے وہ جدھر بھی گھومے بلکہ حضرت عمر الفاروق رضی اللہ عنہ کی حدیث میں تو حضرت عمر کے ساتھ حق کی معیت کی خبر دی جا رہی ہے بخلاف جناب امیر رضی اللہ عنہ کے کہ وہاں ان کے حق میں اللہ تعالیٰ سے دعا کی جا رہی ہے کہ حق ان کے ساتھ گھومتا رہے۔) اب اخبار و دعا کا فرق جو ہے وہ کسی پر پوشیدہ نہیں۔ خاص طور پر شیعوں کے طے شدہ اصول کے مطابق کیونکہ وہ نبی کی ہر دعا قبول ہونا ضروری خیال نہیں کرتے چنانچہ ابن بابویہ قمی نے ایک روایت بحوالہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بیان کی ہے، کہ آپ نے اپنے رب سے دعا کی کہ آپ کے سب اصحاب کو آپ کی محبت پر جمع کر دے الیٰ آخر الروایت۔ (یہ روایت پہلے گزر چکی ہے)

اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حق میں بعدی بھی فرمایا جس سے آپ کی امامت کے صحیح ہونے اور ہر اس شخص کی صحت امامت کا جس کو آپ امام سمجھیں خفیف اشارہ نکلتا ہے،

اگر شیعوں کی طرح اہل سنت کا بھی یہ عقیدہ و مذہب ہوتا کہ نبی کے علاوہ بھی کوئی اور معصوم ہو سکتا ہے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی عصمت پر یہ پہلی دلیل ہوتی مگر چونکہ یہاں شیعوں کے پیش نظر اہل سنت کی روایات سے تمسک اور ان کو الزام دینا ہے اس لئے یہ ضروری ہے کہ ان کی تمام روایات کو قبول کریں۔

اہل سنت کے بعض ظریف الطبع حضرات نے شیعوں کے مقابلہ میں حدیث اَدِرِ الْحَقَّ مَعَهٗ حَيْثُ دَارَ سے حضرت ابوبکر و حضرت عمر رضی اللہ عنہما کی خلافت صحیح ہونے پر استدلال کیا ہے، اس لئے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ہر معاملہ میں ان کے ساتھ تھے بیعت میں ساتھ تھے ان کی متابعت فرماتے، جمعہ و جماعت میں ان کے ہمراہ نماز کی ادائیگی میں امور ریاست میں مشورہ دینے میں ان کے دست راست لہٰذا اس سے قیاس مساوات بنتا ہے

کہ حق علیؓ کے ساتھ ہے اور علیؓ ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہیں، لہٰذا حق بھی ابوبکر و عمرؓ کے ساتھ ہے اور مقدمہ اجنبیہ جو اس قیاس میں صحت کا نتیجہ کا مدار ہے سچا ہے اس لئے کہ مقارن کا مقارن مقارن ہوتا ہے،

حاصل کلام یہ ہے کہ یہ استدلال اپنی جگہ بہت مضبوط اور ٹھوس ہے گو ذکر کرنے والے نے بطور لطیفہ و ظرافت اس کو بیان کیا ہے اس لئے کہ شیعوں کی اس روایت کے مطابق ہے جو نہج البلاغہ میں ہے یہ کتاب ان کے نزدیک اصح الکتب اور متواتر ہے چنانچہ یہ بات ثابت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فتنہ نہاوند کے فرو کرنے کے لئے خود بنفس نفیس جانا چاہا تو مشورہ میں صحابہ کی آراء مختلف ہوگئیں، بعض نے اس اقدام کی حمایت کی اور بعض نے آپ کو ایسا کرنے سے روکا، تب آپ نے جناب مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے مشورہ کیا آپ نے اس سلسلہ میں جو کچھ فرمایا وہ ہم تفصیل سے باب ہفتم کے عقیدہ ششم میں تحریر کر آئے ہیں وہاں اس کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے،

جناب امیر رضی اللہ عنہ نے جو کچھ فرمایا اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ آپ دل و جان سے حضرت فاروق رضی اللہ عنہ کے ناصر و معین ناصح و امین تھے۔ اگر معاذ اللہ آپ دل میں ان کی طرف سے کوئی گرہ رکھے ہوتے تو اس سے زیادہ اچھا موقعہ کب آسکتا تھا، کہ ان کو مہم کی طرف جانے کا مشورہ دیتے اور جب وہ اور ان کے عساکر جنگ میں الجھ جاتے یا شکست سے دوچار ہو تو آپ حجاز میں جو اسلام کا دارالسلطنت تھا، صاحب تصرف قرار پا جاتے تو لوگ چار و ناچار آپ کی اتباع کے لئے سر جھکا دیتے مگر آپ کے قلب مبارک میں نہ کوئی کھوٹ تھا اور نہ آپ اپنے کو ان حضرات کے زمرہ سے علیحدہ شمار فرماتے تھے، بلکہ اس روایت سے تو واضح اشارہ اسی بات کا ملتا ہے کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ اپنے آپ کو زمرہ ابوبکر و عمر میں شمار فرماتے تھے، اسی لئے آپ نے یہ ارشاد الفاظ ارشاد فرمائے

و نحن علی موعود من اللہ۔

اور نہج البلاغہ ہی میں یہ بھی مذکور ہے کہ جب حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے غزوہ روم کے متعلق حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مشورہ طلب کیا تو آپ نے فرمایا۔

مَتیٰ تَسِیرُ إِلیٰ هٰذَا الْعَدُوِّ بِنَفْسِكَ فَتَلْقَهُمْ فَتُنْكَبْ لَا تَكُنْ لِلْمُسْلِمِینَ كَانِفَةٌ دُونَ أَقْصیٰ بِلَادِهِمْ وَلَیْسَ بَعْدَكَ مَرْجِعٌ یَرْجِعُونَ إِلَیْهِ فَابْعَثْ إِلَیْهِمْ رَجُلًا مُجَرَّبًا وَاحْفِزْ مَعَهُ أَهْلَ الْبَلَاءِ وَالنَّصِیحَةِ فَإِنْ أَظْهَرَهُ اللّٰهُ فَذَاكَ مَا تُحِبُّ وَإِنْ تَكُنِ الْأُخْرَیٰ كُنْتَ رِدْءًا لِلنَّاسِ وَمَثَابَةً لِلْمُسْلِمِینَ

ترجمہ "آپ بنفس نفیس دشمن سے مقابلہ کے لئے جائیں گے اور اگر شکست کھا کر واپس ہوں گے تو مملکت کے آخری سرے سے لے کر یہاں تک مسلمانوں کے لئے کوئی جائے پناہ نہ ہوگی نہ آپ کے بعد کوئی ایسا ٹھکانہ و مرکز ہوگا کہ لوگ وہاں جمع ہو جائیں لہٰذا ایک آزمودہ کار آدمی ان کے مقابلہ کے لئے بھیجئے اور ساری اونچ نیچ سمجھا کر اس کا حوصلہ و ہمت بلند کیجئے۔ اگر اللہ تعالیٰ نے اسے غلبہ و فتح عطا فرمائی تو ہم اللہ کا شکر ادا کریں گے اور اگر نتیجہ برعکس نکلا تو آپ لوگوں کے لئے پشت پناہ اور جائے امن ثابت ہوں گے،،

اور مزے کی بات یہ ہے کہ شیعہ اس قسم کی روایات کو جو ان کی اصح اور متواتر الروایت کتابوں میں موجود ہیں، پڑھتے اور سنتے ہیں، تو ان دیکھی اور ان سنی خیال کر کے گزر جاتے ہیں، اور جھوٹوں کی گھڑی ہوئی افترا آمیز روایتوں کو صد درجہ کی مخالفت اور منافقت کی بنا پر باہم روایت کرتے اور پھیلاتے ہیں ان کے مقابلہ کی ان صحیح

www.Ahlehaq.com

روایات کو دیکھ کر اوسان خطا ہو جاتے ہیں، تو آئیں بائیں کرتے ہوئے کبھی تو یہ کہنے لگتے ہیں کہ جناب امیر کی یہ پیروی اور متابعت شیخین رضی اللہ عنہما کے حق میں محض اس وجہ سے تھی کہ آپ کے معاون اور مددگار کم تھے اور پھر جب خود اپنی صحیح السند وہ روایات دیکھتے ہیں جو جناب امیر رضی اللہ عنہ کی قوت غلبہ اور اعوان و انصار کی کثرت پر واضح طور پر دلالت کرتی ہیں، تو شرمندہ اور نادم ہوتے ہیں مثلاً وہ روایت جو ابان بن ابی عباس نے سلیم بن قیس ہلالی سے کی ہے۔ یا اس کے علاوہ کچھ اوروں نے بعض دوسروں سے نقل کی ہے کہ

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جناب امیر رضی اللہ عنہ سے فرمایا۔

وَاللهِ لَئِنْ لَمْ تُبَايِعْ اَبَا بَكْرٍ لَاَقْتُلَنَّكَ فَقَالَ لِیْ عَلِیٌّ لَوْلَا عَهْدٌ عَهِدَهٗ اِلَیَّ خَلِیْلِیْ لَسْتُ اَخُوْنُهٗ فَعَلِمْتَ اَیُّنَا اَضْعَفُ نَاصِرًا وَاَقَلُّ عَدَدًا

خدا کی قسم اگر تم نے ابوبکر کی بیعت نہ کی تو میں تمکو قتل کر دوں گا جواب میں جناب علی نے فرمایا اگر وہ عہد نہ ہوتا جو مجھ سے میرے خلیل نے لیا ہے اور جس کو میں توڑنا نہیں چاہتا تو پتہ چل جاتا کہ ہم میں سے کس کے مددگار کمزور یا عدد میں کم ہیں،

یہ روایت ڈنکے کی چوٹ کہہ رہی ہے کہ جناب امیر کا سکوت محض اسی بات کی وجہ سے تھا کہ آپ اپنے خلیل نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے سن چکے تھے کہ خلافت بلا فصل اول ابوبکر کا حق ہے، پھر عمر کا رضی اللہ عنہم، اور اس بات پر کہ عہد مذکور یہی ہے اصول شیعہ کے موافق برہان عقلی بھی ہے۔ کہ اگر امامت کا حق حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ہوتا اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم، باوجود انصار و اعوان کے جیسا کہ اس روایت سے آشکار ہے آپ کو شیخین رضی اللہ عنہما سے جھگڑا نہ کرنے کی وصیت فرما جاتے تو اس سے یہ لازم آتا ہے کہ نعوذ باللہ آپ امر الٰہی کو معطل چھوڑ دینے کی وصیت فرما گئے ہوں کیونکہ اس صورت میں جناب امیر کو" اہل باطل کے اتباع کی وصیت فرما گئے اور امامت کو لطف سے محروم فرمایا حالانکہ اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا تھا، یا ایها النبی حرض المومنین علی القتال اے نبی مومنوں کو لڑائی پر ابھاریئے اس وقت کہ دس کافروں کے مقابل ایک مسلمان ہوتا تھا، جناب رسالتمآب صلے اللہ علیہ وسلم بڑی تاکیدات سے جہاد پر آمادہ فرماتے تھے، اور جب دین مکمل ہوا اور اتمام نعمت ہوچکا تو آپ شیر خدا جیسے شخص کو بزدلی اور خوف کا سبق دیں تبلیغ احکام کو ترک کرائیں فتنہ فساد، تحریف کتاب اللہ اور تبدیل دین کو روا رکھیں العیاذ باللہ شان نبوت و رسالت کو اس وصیت سے دور کا واسطہ بھی نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اَیَامُرُکُمْ بِالْکُفْرِ بَعْدَ اِذْ اَنْتُمْ مُسْلِمُوْنَ (کیا تمہارے مسلمان ہونے کے بعد وہ تم کو کفر کا حکم دیتے ہیں)۔

اور کبھی شرمندگی مٹانے کے لئے یہ کہتے ہیں کہ جھگڑے سے کنارہ کشی اور جناب امیر رضی اللہ عنہ کی خلفاء ثلاثہ رضوان اللہ علیہم کے ساتھ موافقت، وفاداری اور صلح جوئی میں محض افعال الٰہی کی اقتداء مد نظر تھی۔ یہ توجیہ ابو جعفر طوسی کے پوتے ابن طاؤس کی ذہنی اختراع ہے جسے دوسروں نے بھی سینوں سے لگالیا ہے حالانکہ یہ ایسی توجیہ ہے کہ نہ اس کا سر ہے نہ پیر کیونکہ افعال الٰہی کی اقتداء واجب تو کیا ہوتی جائز بھی نہیں البتہ امتثال اوامر ضروری ہے خدا تعالیٰ کا فعل تو بعض اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ کافر کی مدد کرتا ہے اور مسلمان صالح کو نکال دیتا ہے حالانکہ یہ کسی مسلمان کے لئے بھی جائز نہیں، کہ کافر کی مدد کرے اور مسلمان کو قتل کردے شان بندگی تو یہی ہے کہ اپنے مالک و آقا حکم کی

www.Ahlehaq.com

تعمیل کرے اور اسے قبول کرے نہ یہ کہ اس کے افعال کی نقل کرنے لگے اس دنیا میں تعلقات بندگی و آقائی میں جو سراسر مجازی و مجازی میں اس قسم کا رویہ معیوب بھی ہے اور مطعون بھی، چہ جائیکہ حقیقی بندگی و آقائی میں۔

اور یہ جو کہا جاتا ہے کہ اطمینان سے کام لینا اور کام میں جلدی نہ کرنا قابل تعریف ہے تو یہ بات اچھے اور نیک کاموں کے لیے نہیں اس لیے کہ مثلاً آقا اپنے رسولوں پیامبروں اور غلاموں کو فوری حکم صادر کرے اور وہ سستا پن دکھائیں یا سستی کریں تو وہ کھلم کھلا نافرمانی کے داغ سے داغدار ہوں گے جیسا کہ فرمایا۔ وَإِنَّ مِنكُمْ لَمَن لَّيُبَطِّئَنَّ البتہ تم میں سے بعض ایسے ہیں جو نکلنے میں دیر لگاتے ہیں، اور جلد بازوں کی تعریف میں فرمایا اُولٰٓئِكَ يُسَارِعُونَ فِي الْخَيْرَاتِ وَهُمْ لَهَا سَابِقُونَ (یہی ہیں جو اچھے کاموں میں جلدی کرتے ہیں اور یہی سبقت لے جانے والے ہیں، اسی لیے یہ مثل مشہور ہے نیک کام میں سوچ بچار کی حاجت نہیں! (در کار خیر حاجت ہیچ استخارہ نیست)

اور امام کے لئے دھیما پن کس طرح جائز ہو سکتا ہے جبکہ مخلوق کی ہدایت اور گمراہوں کی رہنمائی اس کے ذمہ لازم ہے کیونکہ سستی اور دھیمے پن سے بہت سے واجبات ہاتھ سے نکل جائیں گے اور پھر اطمینان کی بھی کوئی حد ہونی چاہیے پچیس سال کا عرصہ کوئی اطمینان میں نہیں گزارتا۔

اگر اس پہ یہ کہا جائے کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ کی یہ آہستہ روی امر الٰہی کی وجہ سے تھی اس لیے ترک واجب لازم نہیں آتا تو ہم کہیں گے کہ اس سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک جناب امیر کی امامت وجود میں نہیں آئی ہوگی ورنہ امام کا مقرر کرنا اور حکم دینا کہ آہستگی برتے اور لوازم امامت کو معطل رکھے، دونوں باتیں باہم متضاد و مخالف ہیں اس کی مثال تو ایسی ہے کہ کوئی بادشاہ کسی کو قاضی مقرر کرے اور کہے کہ پچیس سال تک اپنی قضا کا اظہار نہ کر کوئی مقدمہ اپنے سامنے پیش نہ ہونے دے اور وادو آدمیوں کے بارے میں لب نہ ہلا۔ یہ الفاظ تو واضح طور پر ایک ہی بات ظاہر کرتے ہیں کہ ابھی صرف قضا کا وعدہ ہے، قاضی کا تقرر عمل میں نہیں آیا۔ پچیس سال بعد وہ قاضی ہوگا۔

اگر اس کو ظاہر پر محمول کریں تو یہ کھلا تناقض ہوگا۔ اور قاضی کے تقرر سے جو غرض و مقصد مدنظر ہوتا ہے اس کا فوت ہونا لازم آئے گا یہ کوئی عقلمندی کی بات نہ ہوگی اس کی قباحت کسی سے پوشیدہ نہیں۔ اللہ تعالیٰ ان باتوں سے پاک اور بالا و برتر ہے

اور ایک بات اس سے یہ بھی نکلتی ہے کہ جب جناب امیر رضی اللہ عنہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آہستگی برتنے کے لئے مامور ہوئے، اور آپ نے دعوائے امامت قطعاً ظاہر بھی نہ فرمایا تو لامحالہ مکلفین آپ کی اتباع اور پیروی نہ کرنے میں معذور ہوں گے۔ اب اگر وہ دین و دنیا کے اہم کاموں کو انجام دینے کے لیے اس درمیانی مدت میں کسی اور کو نامزد کر لیں تو وہ عتاب و عقاب کے سزاوار ہوں گے کیونکہ اللہ تعالیٰ کسی کو اس کی برداشت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا،

(۱) یہ حدیث جو حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے،

اَنَّ النَّبِيَّ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ لِعَلِيٍّ اِنَّكَ تُقَاتِلُ عَلٰى تَاوِيْلِ الْقُرْاٰنِ كَمَا قَاتَلْتُ عَلٰى تَنْزِيْلِهٖ	نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے جناب علی سے فرمایا کہ تم تاویل قرآن پر لڑو گے جیسا کہ میں تنزیل قرآن پر لڑا۔

یہ حدیث بھی اثبات مدعا سے بالکل کوئی تعلق نہیں رکھتی کیونکہ حدیث کا ماحصل صرف یہ ہے کہ تم کسی وقت تاویل قرآن پر قتال کرو گے۔ اہل سنت کا مسلک بھی یہی ہے کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ اپنی لڑائیوں میں حق بجانب

اور آپ کے مخالفین خطا کار، اس حدیث میں وہ کونسی وجہ ہے جس سے آپ کی امامت بلا فصل ثابت ہو سکے۔ بلکہ یہ بالکل ظاہر ہے کہ تاویل قرآن پہ قتال اور امامت بلا فصل میں ایک کو دوسرے کے ساتھ کسی رتبہ سے بھی کوئی تلازم نہیں، لہذا اس حدیث کو اہل سنت کے مقابلہ میں لانا انتہائی ناسمجھی کی بات ہے،

ہاں اس کو اہل سنت کے مذہب کی دلیل ٹھہرائیں تو یہ درست ہوگا۔ کیونکہ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ کسی وقت امام ہوں گے، اور تاویل قرآن پر قتال فرمائیں گے اور ان کے قتال کا وقت معلوم ہی ہے کہ کب تھا۔

اور پھر یہ حدیث اہل سنت کے اس دعوے کی دلیل بھی ہو سکتی ہے کہ حق۔ جناب امیر رضی اللہ عنہ کی طرف تھا اور آپ کے مخالف خطا پر تھے، کہ قرآن کے معانی سمجھنے میں ان سے خطا ہوئی اور ایک اجتہادی غلطی کے شکار ہوئے۔

یہ شیعوں کی بدقسمتی ہے کہ بے وقوفی کے سبب اس قسم کی احادیث کو اس مقام پر لاتے اور اپنی ندامت و شرمندگی کا سامان اپنے ہاتھوں کرتے ہیں، کیونکہ یہ احادیث تو ان کی تائید کے بجائے علی الاعلان ان کی تردید کرتی ہیں ظاہر ہے کہ تاویل قرآن بالاجماع کفر نہیں اگر قرآن کے ظاہری معنے سے غلط فہمی کی بنا پر نیک نیتی کے ساتھ تاویل کرلے اور اصلی معنوں تک رسائی نہ ہونے کے سبب انکار کر بیٹھے تو اس کے کفر میں بھی کلام ہے نہ کہ جو معنی خفی یعنی تاویل سے منکر ہو۔ حالانکہ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ آپ سے لڑنے والے کافر ہیں، جیسا کہ طوسی کی تجرید العقائد میں صاف موجود ہے،

(۱۲) بارہویں حدیث وہ ہے جو حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے،

عَنِ النَّبِیِّ صلی اللہ علیہ وسلم اِنِّیْ تَارِکٌ فِیْکُمُ الثَّقَلَیْنِ مَا اِنْ تَمَسَّکْتُمْ بِہِمَا لَنْ تَضِلُّوْا بَعْدِیْ اَحَدُہُمَا اَعْظَمُ مِنَ الْاٰخَرِ کِتَابُ اللّٰہِ وَعِتْرَتِیْ۔

نبی رحمت صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں تم میں دو مرکز ثقل چھوڑے جاتا ہوں جب تک تم ان دونوں کو تھامے رہو گے تو میرے بعد بھی گمراہ نہ ہو گے ان میں سے ایک دوسری سے بڑھ کر ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی کتاب (قرآن مجید) اور میری عترت،

یہ حدیث بھی احادیث ماسبق کی طرح اصل مدعا سے کوئی تعلق نہیں رکھتی آخر وہ ایسی کونسی مجبوری اور ضرورت ہے کہ مالک ریاست کبریٰ ہی سے تمسک و استدلال ہو اور اگر اسے مان لیں تو اس کے ساتھ ساتھ ایک اور بھی تو حدیث صحیح ہے کہ،

عَلَیْکُمْ بِسُنَّتِیْ وَسُنَّۃِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِیْنَ الْمَہْدِیِّیْنَ مِنْ بَعْدِیْ تَمَسَّکُوْا بِہَا وَعَضُّوْا عَلَیْہَا بِالنَّوَاجِذِ۔

تم پر میری سنت اور ہدایت یافتہ خلفائے راشدین کی سنت میرے بعد لازم ہے اسے تھام لو اور مضبوطی کے ساتھ دانتوں سے پکڑ لو۔

اور پھر چلو تمہارا کہا ہی سہی لیکن لغت عرب میں عترت اقارب کے معنے میں آتا ہے۔ اگر اس کی دلالت امامت پر ہوگی تو حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے تمام اقارب ائمہ واجب الاطاعت ہونے، لازم ہوں گے، خصوصاً عبداللہ بن عباس، محمد بن الحنفیہ، زید بن علی، حسن مثنیٰ، اسحاق بن جعفر صادق رحمہم اللہ اور ان جیسے، دیگر اہل بیت!۔

www.Alhaq.com

اور صحیح حدیث میں یہ بھی ہے کہ خُذُوْا شَطْرَ دِیْنِکُمْ عَنْ هٰذِهِ الْحُمَیْرَآءِ (اپنا آدھا دین اس حمیراء سے لو.
یعنی حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے)

وَاهْتَدُوْا بِهَدْیِ عَمَّارٍ وَتَمَسَّکُوْا بِعَهْدِ ابْنِ اُمِّ عَبْدٍ (عمار سے روش ہدایت سیکھو، اور عبد اللہ بن
مسعودؓ کی وصیت کو مضبوطی سے تھام لو)

وَرَضِیْتُ لَکُمْ مَا رَضِیَ لَکُمْ ابْنُ اُمِّ عَبْدٍ وَاَعْلَمُکُمْ بِالْحَلَالِ وَالْحَرَامِ مُعَاذُ بْنُ جَبَلٍ۔ (عبد اللہ بن مسعود تم سے جس بات پر خوش ہوں میں بھی اس پر خوش ہوں۔ اور تم میں معاذ بن جبلؓ حلال وحرام کا زیادہ علم رکھنے والے ہیں)

اسی طرح کی اور بھی بے شمار احادیث صحیحہ موجود ہیں، خصوصاً آپ کا یہ فرمان اِقْتَدُوْا بِالَّذَیْنِ مِنْ بَعْدِیْ اَبِیْ بَکْرٍ وَعُمَرَ (میرے بعد دین میں ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کی پیروی کرو) اور یہ حدیث تو شہرت وتواتر کی حد تک پہنچی ہوئی ہے تو اب یہ لازم آیا اور ضروری ہوا کہ سب ہی اشخاص امام ہوں۔

اس کے علاوہ اگر یہ حدیث عترت دلیل امامت ہو تو جناب امیر رضی اللہ عنہ سے جو حدیث مروی ہے، اور جسے شیعہ متواتر مانتے ہیں کہ اِنَّمَا الشُّوْرٰی لِلْمُهَاجِرِیْنَ وَالْاَنْصَارِ۔ کس طرح ٹھیک ثابت ہوگی،

اور اسی طرح حدیث مَثَلُ اَهْلِ بَیْتِیْ فِیْکُمْ مَثَلُ سَفِیْنَةِ نُوْحٍ مَنْ رَکِبَهَا نَجٰی وَمَنْ تَخَلَّفَ عَنْهَا غَرِقَ (تم میں میرے اہل بیت کی مثال نوح کی کشتی کی سی ہے کہ جو اس میں سوار ہوگیا نجات پاگیا اور جو پیچھے رہ گیا ڈوب گیا) صرف اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ فلاح وہدایت ان سے محبت ودوستی سے وابستہ ہے اور ان کی اتباع پر موقوف، اور ان کی محبت ودوستی سے روگردانی ہلاکت وتباہی کا باعث!۔

اور بفضلہ تعالیٰ سارے فرق اسلامیہ میں سے اہلسنت ہی کو یہ سعادت نصیب ہے اور دیگر مذاہب کے مقابلہ میں صرف انہی کے مذہب ومسلک کی یہ خصوصیت ہے کہ انہوں نے تمام اہل سنت کی محبت کی رسی کو پورے طور پر تھام رکھا ہے، اس طرح نہیں کہ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْکِتٰبِ وَتَکْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ (کتاب کی ایک بات مانتے ہیں، اور کچھ کا انکار کرتے ہیں)

بلکہ انبیاء کرام علیہم السلام کے ایمان کے بموجب کہ لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ (ہم اس کے رسولوں میں سے کسی کے ساتھ فرق نہیں کرتے) بعض سے محبت یا ان پر ایمان اور بعض سے عداوت یا کفر اختیار نہیں کرتے،

اور ان شیعوں کا یہ حال ہے کہ ان میں کا کوئی فرقہ تمام اہل بیت کو دوست نہیں رکھتا، بعض ایک طائفہ سے دوستی رکھتے ہیں تو باقیوں سے بغض عداوت۔ اور بعض دوسرے طائفہ سے، یہی حال ان کے اتباع وپیروی کا ہے، بخلاف اہل سنت کے کہ کسی ایک پر انحصار کریں سب سے روایات لیتے ہیں، اور ان سے تمسک واستدلال کرتے ہیں چنانچہ ان کی کتب تفسیر وفقہ وحدیث اس پر گواہ ہیں، اگر کتب اہل سنت کا اعتبار نہ کریں تو پھر مرویات شیعہ کا کیا جواب ہے جن کو اس کتاب میں نقل کیا ہے اور جو عقائد الٰہیہ سے لے کر فروع فقہیہ تک اہل سنت کے مذہب کے موافق ہیں،

اس موقعہ پر بعض خوش طبع شیعہ، دلفریب تقریر جھاڑتے ہیں، ہم نے مناسب سمجھا کہ اس کو یہاں نقل کرکے

Www.Ahlehaq.Com

ان کی فریب بازی کو واضح کردیں،

وہ کہتا ہے کہ اس حدیث میں اہل سنت کی سفینۃ نوح سے تشبیہ اشارہ کرتی ہے کہ تمام اہل بیت کی محبت اور سبکی اتباع نجات وفلاح کے لئے ضروری نہیں، اس لئے کہ اگر ایک شخص نے کشتی کے ایک کونے میں اپنی جگہ پکڑلی تو بلا شبہ اس کو ڈوبنے سے نجات مل گئی ساری کشتی میں چکر لگاتے پھرنا کبھی اس کونے میں کبھی اس کونے میں، نہ اس کا کوئی عادی ہوتا ہے نہ اس پر عمل کرتا ہے، لہٰذا جب شیعہ نے کسی اہل بیت سے تعلق رکھا اور ان کی اتباع کو اپنا مقصد ٹھیرا لیا تو بلا شبہ اسے راہ نجات مل گئی۔ اور اہل سنت کا یہ الزام کہ انہوں نے بعض کی اطاعت ترک کی صحیح نہ رہا۔

بحمد اللہ اہل سنت اس کا شافی جواب دے سکتے ہیں، اور دو طرح سے۔ اول بطریق نقض والزام۔ کہ اگر یہی بات ہے تو امامیہ کو چاہیئے کہ زیدیوں، کیسانیوں، ناؤسیوں اور افطحیوں میں سے کسی کو نہ گمراہ کہیں نہ ان کی تکفیر وتفسیق کریں بلکہ ان کو ناجی اور بامراد خیال کریں، کیونکہ ان میں سے ایک ہر فرقہ نے اس وسیع کشتی کا ایک گوشہ پکڑا ہوا ہے اور اس کو اپنا ٹھکانا بنا لیا ہے، اور بقول تمہارے ایک گوشہ ہی ڈوبنے سے بچانے کے لئے کافی ہے، بلکہ اس صورت میں تو بارہ اماموں کی تعین بھی خطرہ میں پڑ جائے گی کیونکہ کشتی کا تو ایک کونہ ہی نجات کے لئے کافی ہے، بارہ گوشوں کی کیا ضرورت ہے۔

اور امام وہی ہے جس کی اتباع نجات آخرت کی موجب ہو، اور پھر یوں تو اثنا عشریہ ہی نہیں پورا سلسلہ امامیہ ہی زیروزبر اور درہم برہم ہو جائے گا، یہی بات زیدیہ کہیں تو یہی بات ان کے خلاف بھی جائیگی گویا اس صورت میں شیعوں کے فرقوں میں سے کوئی فرقہ اپنے لئے، کوئی خاص مذہب مخصوص نہیں کر سکتا۔ بلکہ ان کو چاہیئے کہ اپنے سب ہی مذاہب کو مبنی برحق اور صواب ودرست سمجھیں۔ حالانکہ ان کے مذاہب میں باہم جو تناقض اور تضاد ہے اس کو معلوم کرنے کے لئے کسی علمی گہرائی میں جانے کی بھی ضرورت نہیں۔ اور اجتہادیات کے علاوہ تناقض کے دونوں اطراف کو حق جاننا اجتماع نقیضین کا قائل ہونا ہے جو محال ہے،

دوسرا جواب بطریق حل ہے وہ یہ کہ ایک کونہ میں جگہ پکڑ لینا اس وقت ڈوبنے سے بچا سکتا ہے کہ دوسرا کونہ اس کی تخریب کاری سے محفوظ رہے اور وہ وہاں سوراخ نہ کرنے لگے اگر ایک کونہ میں مقیم رہ کر دوسرے کونہ میں سوراخ کرے گا تو ہرگز ڈوبنے سے نہ بچ سکے گا اور شیعی فرقوں میں ایک بھی فرقہ ایسا نہیں جو ایک کونہ میں بیٹھا ہو اور دوسرے کونہ میں سوراخ نہ کر رہا ہو،

ہاں اہل سنت اگرچہ دوسرے گوشوں میں بھی چلت پھرت رکھتے ہیں مگر ان کی کشتی اس کے باوجود محفوظ وسالم ہے تو اس کی وجہ یہی ہے کہ انہوں نے کسی گوشہ میں سوراخ نہیں کیا کہ ادھر سے موج دریا کشتی میں داخل ہو جائے اور کشتی کو ڈبو دے،

اور یہ مقام شکر ہے کہ اہل سنت کی اس روش کے سبب نواصب وخوارج کے اشکالات واعتراضات کا دفعیہ بھی آسان وسہل ہوا کہ انہوں نے عقلی دلیل سے ان دونوں احادیث کا انکار کیا ہے اور ان میں کمزوریاں نکالی ہیں، اور کہا ہے کہ ان دونوں حدیثوں کا مطلب ممتنعات عقلیہ کی تکلیف کو روا رکھتا ہے جو بالبداہت محال و

ناممکن ہے۔ اور وہ اس طرح کہ اگر تمام اہل بیت سے تمسک کیا جائے تو ان کے آپس کے عقائد و فروع میں تناقض کی حد تک اختلاف کے سبب امت کو نقیضین کے جمع کرنے کی تکلیف دینا ہے جو بالکل ہی محال ہے اور اگر تمام کی جگہ بعض سے تمسک کریں تو تعیین سے ہوگا یا بلا تعیین کے اگر پہلی صورت ہو تو بغیر مرجح کے ترجیح لازم آتی ہے،

یعنی جب سب اہل بیت فوقیت میں برابر ہیں تو ایک کو دوسرے پر ترجیح کیسی، اور پھر ان میں بھی ہر ایک کو تعیین حق کی روایات میں سخت اختلاف پیش آیا۔ لہٰذا پھر وہی اجتماع النقیضین یا ترجیح بلا مرجح کا الزام لگتا ہے،

دوسری صورت میں مختلف عقائد اور مختلف شریعتوں کا ایک دین میں خلاف شارع سمجھا جانا لازم آجاتا ہے جس کی صاف تردید اس کلام الٰہی سے ہوتی ہے، لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَمِنْهَاجًا (تم میں سے ہر ایک کے لئے ہم نے ایک دین اور ایک راستہ بنایا) اور ضرورت دینیہ کی وجہ سے اس کا محال ہونا لازم آتا ہے،

ان اشقیا کے ان اشکالات و اعتراضات سے پوری ملت شیعہ عہدہ برآ نہیں ہو سکتی تا آنکہ اہل سنت کی روش اختیار نہ کریں،

اور شیعوں کے عقلی دلائل کا جہاں تک تعلق ہے تو وہ حد و شمار سے بھی باہر ہیں "الفین" اور دوسری کتابوں نے ان کا احاطہ کیا ہے،

یہاں اہل سنت کے لئے مفید قاعدہ کلیہ بیان کیا جاتا ہے جس سے وہ ان کی ہر دلیل کا توڑ اور ہر مسئلہ کو حل کر سکتے ہیں پہلے تو یہ بات ذہن نشین کر لیں کہ اس مدعا پر جو عقلی دلیل ہوگی وہ تین حال سے خالی نہیں (۱)، اس کے سب مقدمات عقلی ہوں گے جیسے اس کتاب میں بیان کردہ دلائل میں پانچویں دلیل (۲) یا بعض عقلی ہوں گے بعض نقلی (جیسے دلیل اول یا (۳) سب نقلی ہوں گے۔ (جیسے دلیل دوم) یہ اصطلاح گو مشہور اصطلاح کے خلاف ہے، کہ دلیل عقلی وہ ہے، جو محض مقدمات عقلیہ سے مرکب ہو۔ اور دلیل نقلی وہ جس کا ایک مقدمہ نقلی ہے،

بہر حال ہر سہ عقلی دلائل، یقینی طور پر ماخوذ ہوں گے شرائط امامت سے، یا موانع امامت اور طریق تعیین سے تو گویا اس صورت میں تمام دلائل کی بنیاد امامت کی بحث قرار پائے گی اور امامت کی بحث، نبوت کے تابع ہے جس کی وہ (امامت) نائب ہے، اور وہ خود یعنی بحث نبوت فرع ہے الٰہیات کی جس کی وہ بھی نائب ہے کیونکہ نبوت خدا کی رسالت کا نام ہے۔

پس جب شیعوں کے اصول اور ان کے مسلمات کا تینوں مباحث میں، کتاب اللہ عترت رسول اور عقل، کے خلاف ہونے کے سبب قلع قمع کر دیا گیا تو گویا ان کے دلائل تینوں مرحلوں میں مسدود کر دیئے گئے اور ان کے شبہات کا نسب نامہ تین پشتوں تک مجروح کر دیا گیا،

اس کو ہم ایک مثال سے واضح کرتے ہیں کہ مثلاً یہی مقدمہ جو ان کے دلائل میں بہت آیا ہے کہ امام کا منصوص علیہ ہونا (یعنی اس کی امامت پر نص کا ورود ہوا ہو) واجب ہے، اس کی اصل اور بنیاد ان کا یہ عقیدہ ہے، نَصْبُ الْإِمَامِ وَاجِبٌ عَلَى اللّٰهِ۔ (امام کا مقرر کرنا اللہ پر واجب ہے)

اور اس بنیاد (اصل) کی بنیاد یہ عقیدہ ہے، بَعْثُ النَّبِيِّ وَاجِبٌ عَلَى اللّٰهِ (نبی کو پیدا کرنا اللہ تعالیٰ پر واجب ہے۔ اور اس اصل کی اصل کی اصل یہ عقیدہ ہے اَلتَّكْلِيْفُ وَاجِبٌ عَلَى اللّٰهِ (بندوں کو مکلف کرنا اللہ تعالیٰ پر واجب ہے

www.Ahlehaq.com

www.Ahlehaq.com

اور اس اصل کی اصل کی اصل کی اصل یہ عقیدہ ہے، اَللُّطفُ وَاجِبٌ عَلَى اللّٰهِ لطف و مہربانی اللہ تعالیٰ پر واجب ہے)۔

جب ان مذکورہ بالا چار مباحث کو عقل نے کتاب اللہ اور عترت رسول جیسے دو معتبر و عادل گواہوں کی شہادت و گواہی سے باطل و غلط ثابت کر دیا تو اس مقدمہ کے باطل و غلط ہونے میں کون سا شبہ باقی رہ جاتا ہے یا رہ سکتا ہے۔ لہٰذا اس قاعدہ کی رو سے ان کے تمام دلائل کی حالت باعتبار مقدمات و مواد کے عقلمند کے سامنے روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے، اور پھر ان کے اشکال مکڑی کی تلوار کا کھلونا جو بچوں کا دل بہلاتا ہو، یا شیر کی کھال ثابت ہوتی ہے جس کو بوڑھے بھی روندتے پھرتے ہیں۔ اسی لئے درحقیقت ان کے دلائل کے بیان سے اس کتاب میں بفضلہ تعالیٰ کوئی گھبراہٹ یا دغدغہ نہیں ہے البتہ ان کے وہ چند دلائل جن کو یہ عروۃ الوثقیٰ (مضبوط کھونٹا) یا "عمدۃ القوی" (چیدہ قوت) خیال کرتے ہیں، ہم بطور نمونہ یہاں قلمبند کرتے ہیں، تاکہ ان کے باقیماندہ دلائل کی حقیقت بھی کھل جائے جن سے وہ بھی کما حقہ واقف نہیں ہیں، ایسی دلیلیں کل چھ ہیں،

<u>پہلی دلیل</u>:۔ یہ کہ امام کے لئے واجب ہے کہ معصوم ہو، اور جناب امیر رضی اللہ عنہ کے علاوہ کوئی معصوم نہیں لہٰذا وہی امام ہوں گے کوئی اور نہیں اور یہی مدعا ہے،

اس دلیل میں صغریٰ و کبریٰ دونوں ناقابل تسلیم ہیں، صغریٰ اس لئے کہ حضرت امیر رضی اللہ عنہ نے صراحۃً فرمایا اِنَّمَا الشُّوْرٰى لِلْمُهَاجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ۔ (مشورہ کا حق مہاجرین وانصار ہی کو ہے، اور ظاہر ہے کہ مہاجرین و انصار کی جماعت میں جس نے ان کو خلیفہ چنا کوئی معصوم نہ تھا اور یہ بھی ہے کہ جب آپ نے خوارج کا یہ کلام سنا کہ لا امرۃ (خلافت کوئی چیز نہیں)، تو آپ نے فرمایا لَا بُدَّ لِلنَّاسِ مِنْ اَمِيْرٍ بَرٍّ اَوْ فَاجِرٍ (لوگوں کے لئے کوئی امیر ضروری ہونا چاہئے خواہ وہ نیک ہو یا بد۔) نہج البلاغہ میں بھی یہ روایت موجود ہے،

لیکن اس کو اگر تسلیم بھی کرلیں تو نبی کے سوا کسی دوسرے اور شخص کا معصوم ہونا معلوم نہیں ہو سکتا کیونکہ علم و معلومات کے تین ہی تو اسباب ہیں۔ حواس سلیمہ۔ عقل، اور خبر صادق ہے ظاہر ہے کہ عصمت چونکہ اس ملکہ کا نام ہے جو گناہوں اور برائیوں کے صدور کو روک دے تو یہ حس میں نہیں آسکتی، رہی عقل تو وہ بھی افعال و آثار کی مدد کے بغیر اس ملکہ کا پتہ نہیں چلا سکتی، اور افعال و آثار کی رہنمائی یہاں نصیب نہیں، اس لئے کہ اول تو شخص معین و مخصوص کے تمام افعال و آثار کا معلوم کرنا دائرہ امکان سے باہر ہے خصوصاً دل کی پوشیدہ اور چھپی ہوئی نیتوں و ارادوں مثلاً عقائد فاسدہ حسد و بغض وجذبہ خود پسندی ریا اور دوسرے نازیبا اخلاق وغیرہ۔

اور پھر اگر اس کے تمام اچھے افعال و آثار موجودہ کا پتہ کسی طرح لگ بھی جائے تو اس کے ماضی و مستقبل کی کون ضمانت دے گا۔ انسان کا حال تو یہ ہے کہ صبح وہ کچھ ہے تو شام کو کچھ، نفس اس کے ساتھ لگا ہوا ہے شیطان سا دشمن دم کے ساتھ ہے، برے ہمدموں میں گھرا ہوا ہے، ہو سکتا ہے کہ صبح وہ مومن ہے تو شام کو ایمان کو خیر باد کہہ چکا ہو! برصیصا، اور بلعم باعور کے قصے اس جگہ عبرت کے لئے بہت کافی ہیں، دوسری طرف دعائے ماثورہ يَا مُقَلِّبَ الْقُلُوْبِ ثَبِّتْ قَلْبِيْ عَلٰى دِيْنِكَ وَطَاعَتِكَ (اے دلوں کو لوٹ پلٹ کرنے والے میرے دل کو اپنے دین اور اپنی طاعت پر جمادے اس بیماری کے کھٹکے سے بچانے کے لئے بڑی اکسیر ہے،

اور بفرض محال یہ سب کچھ معلوم بھی ہو جائے تو حقیقت عصمت کا پتہ کیسے چلے گا، یعنی یہ کہ گناہ کا اس سے سرزد ہونا ممتنع و محال ہے۔ زیادہ سے زیادہ اس بات کی کوشش کریں گے کہ معلوم کر لیں کہ اس سے گناہ سرزد نہیں ہوا جس کو محفوظیت کا مرتبہ کہتے ہیں، جو عصمت کے لئے کافی نہیں تا وقتیکہ اس کا گناہوں کا امتناع معلوم نہ ہو۔

اب رہی خبر صادق تو وہ دو قسم کی ہوتی ہے متواتر، اور خبر خدا اور رسول۔ ظاہر ہے متواتر کو یہاں کوئی دخل نہیں اسلئے کہ حس کی شرط کے ساتھ انہا علم ضروری کو مفید نہیں اور غیر محسوسات میں جو زیر بحث ہیں غیر مفید ورنہ پھر فلاسفہ کی عالم کے قدیم ہونے کی خبر علم ضروری کو مفید ہوگی جو بالاجماع باطل ہے۔ اور خدا اور رسول کی خبر یہاں اصول شیعہ کے مطابق علم کی موجب نہیں اول تو یوں کہ اخبار میں بدآ جائز ہے تو یہ ممکن ہو سکتا ہے کہ ایک وقت ایک شخص کی عصمت کی خبر دیں اور دوسرے وقت میں اسی شخص کے عشق کی! اور اس کی ایک خبر ہم تک پہنچے اور دوسری نہ پہنچے اسی طرح ارادہ میں بھی بصورت باجماع شیعہ جائز ہے کہ ایک وقت میں ایک شخص کی عصمت سے ارادہ متعلق ہو اور دوسرے وقت میں اس کے فسق سے!۔

لہٰذا ایسی حالت میں اطمینان و اعتماد اٹھ گیا اور اس پر سے اعتماد جاتا رہا۔ کہ یہ شخص آخر وقت تک عصمت پر قائم رہے گا بھی!

دوسرے یہ کہ خدا اور رسول کی خبر اطلاع، مکلفین کو یا تو معصوم کے ذریعہ پہنچیگی یا بواسطہ تواتر کے اپہلی صورت میں دَور لازم آئے گا۔ کیونکہ اس کی عصمت بھی تو اسی خبر سے ہم ثابت کرتے ہیں اگر اس خبر کو بھی عصمت سے ثابت کریں تو یہ ایک چیز کا خود اپنے پر موقوف ہونا ہوگا۔

دوسری صورت میں یہ سقم ہے کہ خود شیعوں کے نزدیک ہر تواتر علم یقینی کو مفید نہیں مثلاً، موزوں پر مسح کا تواتر، وضو میں پاؤں دھونے کا تواتر اور الی المرافق اور امتھی اہب من امنہ الفاظ قرآن کا تواتر اور قعدہ نماز میں التحیات کے صیغہ کا تواتر اور اس طرح کے اور بہت سے تواتر کہ شیعہ ان سب تواتروں سے انکار کرتے ہیں پس کسی خاص تواتر کی تعیین درکار ہوگی مگر وہ بھی غیر مفید ہے کیونکہ تواتر سے علم یقینی ناقلین کی کثرت سے حاصل ہوتا ہے اور جب ایک دو باتوں میں جھوٹ کھل گیا تو سارے اقسام سے اعتماد جاتا رہیگا۔

اب رہا دلیل کا مقدمہ کبریٰ۔ (یعنی سوائے جناب امیرؓ کے کوئی معصوم نہیں تھا)، تو وہ اس لئے قابل تسلیم نہیں کہ آنجنابؓ نے اپنے دوستوں سے خود یہ فرمایا۔

لَا تَكُفُّوا عَنْ مَقَالَةٍ بِحَقٍّ وَمَشُوْرَةٍ بِعَدْلٍ فَاِنِّيْ لَسْتُ بِفَوْقِ اَنْ اُخْطِئَ وَلَا آمَنُ مِنْ ذَالِكَ فِيْ فِعْلِيْ۔	تم حق بات کہنے اور منصفانہ مشورہ دینے سے باز نہ رہو اس لئے میں خطا و لغزش سے بالاتر نہیں ہوں نہ اپنے فعل میں ایسی باتوں سے مامون ہوں۔

بحوالہ نہج البلاغہ۔

ظاہر ہے کہ ایک معصوم ایسے الفاظ استعمال نہیں کر سکتا خصوصًا اسی کلام کے یہ آخری الفاظ۔

اِلَّا اَنْ يُلْقِيَ اللّٰهُ فِيْ نَفْسِيْ مَا هُوَ اَمْلَكُ بِهٖ مِنِّيْ	مگر یہ کہ ڈالدے وہ میرے دل میں وہ چیز جس کا وہ مجھ سے بہتر مالک ہے،۔

www.Ahlehaq.com

www.Ahlehaq.com

یہ الفاظ ان کی عدم عصمت پہ واضح دلیل ہے۔ کیونکہ معصوم کو تو اللہ تعالیٰ اس کے نفس کا مالک بنا دیتا ہے جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کَانَ اَمْلَکُکُمْ لِاِرْبِهٖ ان کو اپنے نفس پر تم سے زیادہ قابو تھا)

علاوہ ازیں جناب امیر سے بطور دعا یوں بھی منقول ہے اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِیْ مَا تَقَرَّبْتُ بِهٖ اِلَیْكَ ثُمَّ خَالَفَهٗ قَلْبِیْ (اے اللہ تو میرے اس عمل کو بخش دے جس کے ذریعہ میں نے تیرا قرب ڈھونڈنا چاہا مگر میرے دل نے اس کی مخالفت کی)۔

یہ سارا کلام نہج البلاغہ میں اسی طرح بیان کیا گیا ہے،

دوسری دلیل :- یہ کہ امام کو چاہئے کہ اس نے کبھی کفر نہ کیا ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے لَا یَنَالُ عَهْدِی الظّٰلِمِیْنَ (میرا عہد ظالموں کو نہیں پہنچتا اور کافر ظالم ہے کیونکہ فرمایا ہے وَالْکٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (اور کافر ہی ظالم ہیں) یا ارشاد فرمایا اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ (بے شک شرک بڑا ظلم ہے) اور سوائے حضرت امیر کے سب نے بت پرستی کی ہے لہذا آپ کے علاوہ کوئی دوسرا امام نہ ہوگا اور آپ امامت کے لئے متعین ہوئے،

اس دلیل کا جواب یہ ہے کہ امامت کی یہ شرط نہ کسی شیعہ نے اپنی کتب کلامیہ میں لکھی ہے نہ کسی سنی نے نہ قرآن کی کسی آیت میں اس کا ذکر ہے، نہ کسی حدیث میں اس کا حوالہ ہے،

یہ صرف شیعی علماء نے حضرات خلفائے ثلاثہ رضوان اللہ علیہم کی امامت وخلافت سے انکار کرنے کے سلسلہ میں تراشی ہے اس کا وجود ان کے سینہ پر کینہ کے علاوہ کہیں نہیں ملتا،

ظاہر ہے کہ شرعی اور دینی امور میں سے کسی دینی امر میں کفر سابق کا کسی نہج اعتبار نہیں کیا گیا ہے، بلکہ ایمان لانے کے بعد سو سال کا بوڑھا کافر اور پشتینی مسلمان جس کی ستر پشتیں اسلام پہ گزری ہوں دونوں برابر ہیں تو پھر اس میں یہ شرط کیوں ملحوظ رکھی جاتی اور آیت لاینال الخ سے اس جگہ استدلال مضحکہ خیز ہے اور مغالطہ دینے کی کوشش ناتمام کے سوا کچھ نہیں۔ کیونکہ آیت کا مقصد یہ ہے کہ شرعی ریاست ظالم کو نصیب نہیں ہوتی اس لئے کہ عدل وانصاف امامت کبریٰ، قضا، احتساب اور عمارت تمام شرعی درجات میں شرط ہے تاکہ ان منصوبوں پہ فوائد مرتب ہوں اور ہر امارت وریاست میں ظالم کا تقرر چند در چند فسادات کا باعث ہوتا ہے لہذا کفر وظلم اور امامت میں منافات ثابت ہوئی اور دو منافی ومخالف باتیں ایک ذات میں بیک وقت جمع نہیں ہو سکتیں علیحدہ زمانوں اور وقتوں میں جمع ہو سکتی ہیں،۔ چنانچہ اہل سنت کا مذہب یہی ہے کہ بوقت امامت امام کے لئے یہ چاہیئے کہ وہ مسلمان ہو اور عادل ہو نہ یہ کہ اسنے امامت سے پہلے کفر وظلم نہ کیا ہو، اسی لئے اس شخص کو جو پہلے کفر میں مبتلا رہا ہو یا ظلم پیشہ ہو۔ ایمان لانے کے بعد اسے کافر وظالم کہنا نہ لغت وعرف میں اور نہ شرع میں ہرگز جائز نہیں۔

اور اصول میں یہ بات طے شدہ ہے کہ جس میں مبداء فی الحال قائم ہو اس پہ مشتق کا اطلاق حقیقت ہے اور دوسرے میں مجاز اور وہ مجاز بھی مطرد نہیں کہ ہر جگہ ہو جو موقع مشہور ومعروف ہوں وہیں ان کو بولنا چاہیئے جیسا کہ اپنے مقام پہ یہ بات ثابت کی جا چکی ہے کہ مجاز ہر جگہ استعمال نہیں ہوتا ورنہ پھر انسان کے علاوہ ہر طویل کو کھجور کا تنہ کہہ سکیں گے، اور ہر بوڑھے کو بچہ! یہ بڑا سخت مغالطہ ہے۔ اسی طرح سونے والے کو

جاگنے والا غنی کو فقیر، پیٹ بھرے کو بھوکا، مردہ کو زندہ اور زندہ کو مردہ کہہ سکیں گے۔

علماء حنفیہ میں سے ابوالحسن زاہد نے معالی العرش الی معالی الفرش میں ایک طویل حدیث میں کہا ہے،

اِنَّ اَبَا بَكْرٍ رضی اللہ عنہ قَالَ لِلنَّبِیِّ صلی اللہ علیہ وسلم بِمَحْضَرٍ مِنَ الْمُهَاجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَعَيْنُكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنِّیْ لَمْ اَسْجُدْ لِصَنَمٍ قَطُّ فَنَزَلَ جِبْرِيْلُ عَلَيْهِ السلام وَقَالَ صَدَقَ اَبُوْبَكْرٍ۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے مہاجرین و انصار کی موجودگی میں حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا یارسول اللہ آپ کی عمر کی قسم میں نے کبھی کسی بت کو سجدہ نہیں کیا اسوقت جبریل علیہ السلام نازل ہوئے اور کہا کہ ابوبکر نے سچ کہا۔

اہل سیر و تواریخ نے بھی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے حالات میں یہ بات لکھی ہے کہ آپ نے کبھی بت کو سجدہ نہیں کیا۔ لہذا الحمد للہ کہ اس شرط کی رو سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت کی صحت پر بھی اجماع ہوا۔

تیسری دلیل ۱۱ یہ کہ امام کی امامت نص سے ثابت ہونی چاہیئے اور نص سوائے حضرت امیر رضی اللہ عنہ کسی کے حق میں نہیں۔ لہذا آپ کے علاوہ کوئی امام نہ ہوگا۔

یہاں بھی صغری و کبری دونوں ناقابل تسلیم ہیں۔ صغری تو اس لیے کہ امیر المومنین کا کلام بابت مشورہ ابھی گزرا ہے، اس کا آخری جز یہ ہے فَاِنِ اجْتَمَعُوْا عَلٰی رَجُلٍ وَسَمَّوْهُ اِمَامًا كَانَ لِلّٰهِ رِضًى (مشورہ کا حق مہاجرین و انصار کو ہے وہ اگر کسی شخص کو چن کر اس کو امام کہیں تو یہ رضائے الہی اور خوشنودی رب کا ذریعہ ہوگا۔)

اور کبری اس سبب سے ناقابل تسلیم ہے کہ اگر کوئی نص وارد ہوئی تو وہ قرآن میں ہوتی یا حدیث میں اور ہر دو کا حال پورا معلوم ہوا کہ ان میں کوئی ایسی نص نہیں ہے اور پھر یہ بھی بات قابل لحاظ ہے کہ نص اگر وارد بھی ہوتی تو لامحالہ متواتر ہونی چاہیئے تھی کیونکہ اصول اور بنیادی عقائد میں خبر واحد کا کوئی اعتبار نہیں اور کوئی جانتا نہ جانتا اہل بیت کرام اس سے ضرور واقف ہوتے حالانکہ وہ اس کا انکار فرماتے ہیں،

اور اگر نص وارد ہوتی تو سبھی اماموں کے حق میں ہوتی جب کہ حال یہ ہے کہ ہر امام کی وفات کے بعد ان کی اولاد دعوائے امامت میں باہم مختلف ہوئی،

اگر نص ہوتی تو یہ اختلاف اور سر پھٹول کیوں ہوتی، اور کیوں ایک دوسرے کو ناحق اور نااہل بتاتے۔

اگر نص ہوتی تو نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی جانب سے ابلاغ کی دو صورتیں ہوتیں یا تو اس کو لوگوں کو بحد تواتر اس کی تبلیغ فرماتے، یا نہیں، پہلی صورت میں وہ حاملین نص (جن کو حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ علم ہوگیا) موقع آنے تک یا تو اسے چھپائے رکھتے یا ظاہر کر دیتے دوسری شق لامحالہ بالاجماع باطل ہے (کہ وہ اگر تھی تو ظاہر نہیں ہوئی) اور پہلی شق ہو تو پھر وہ تواتر سے اعتماد اٹھا دیتی ہے۔ اور متواترات میں کذب کا دخل لازم آتا ہے اور نبی کریم کی تبلیغ کی دوسری صورت میں کہ آپ اس کو حد تواتر تک نہ پہنچائیں مکلفین سے حجت اٹھ جاتی ہے اور نص کا فائدہ ختم ہو جاتا ہے، بلکہ نعوذ باللہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق ترک تبلیغ کا الزام آتا ہے،

چوتھی دلیل ۱۱ کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ ہمیشہ خلفاء ثلاثہ رضوان اللہ علیہم کے ستم رسیدہ رہے اور ان سے شاکی رہے اور خود کو ہمیشہ مظلوم و مقہور ہی ظاہر فرمایا اور یہ سب کچھ اس لئے تھا کہ آپ سے امامت چھین لی گئی تھی تو امامت آپ کا حق ہوئی نہ کسی اور کا کیونکہ آپ کی صداقت کو سب بالاجماع مانتے ہیں،

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ روایات بھی اس لئے ناقابل تسلیم ہیں کہ اہل سنت کو تلاش و جستجو کے باوجود ان روایات کا کوئی اتہ پتہ کھوج سراغ نہیں مل سکا بلکہ اس کے برخلاف ایسی متواترہ حدیثوں تک ان کی رسائی ہوئی ہے جو ان میں باہم موافقت و خیر خواہی، دعا و ثنا، اور ایک دوسرے کی طرف مدد و تعاون کا ہاتھ بڑھاتا ثابت کرتی ہیں،

اس سلسلہ میں امامیہ کی روایات دو طرح کی ہیں۔ ان میں اکثر اہل سنت کی روایات کے موافق ہیں جن کا حاصل یہ ہے کہ آپ خلفائے ثلاثہ رضوان اللہ علیہم کے حین حیات ان کے موافق، و خیر اندیش و ہمدرد رہے اور کبھی اپنے نیک مشوروں سے دریغ نہ کیا۔ چنانچہ خلیفہ ثانی جناب عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے مشورہ کا قصہ بحوالہ نہج البلاغہ صفحات ماسبق میں بیان ہو چکا ہے۔

اسی طرح ان حضرات ثلاثہ کی وفات کے بعد بھی آپؓ ان کے ثنا خواں رہے اور ان کے اعمال کو سراہتے رہے ان کی بھلائی، عافیت اور نجات پر شہادت دیتے رہے۔ جیسا کہ یللہ در ابی بکر والی عبارت کا پورا خطبہ جو بحوالہ نہجۃ البلاغہ گزشتہ اوراق میں ذکر ہوا اس پر صاف اور واضح دلالت کرتا ہے،

اور شیعوں کی بہت سی روایات، اہل سنت کی روایات کے خلاف بھی ہیں، لہٰذا اہل سنت نے متفق علیہ روایات کو لے لیا اور مختلف فیہ کو جن کو شیعہ حضرات اپنے راویوں کے کچے چٹھے سے واقف ہونے کے باوجود روایت کرتے ہیں نظر انداز کر دیا، کیونکہ شیوۂ عقلا و دانشمنداں یہی ہے کہ وہ متفق علیہ کو لیتے اور مختلف فیہ سے کنارہ کش رہتے ہیں،

اس سلسلہ کی شیعی روایات نہج البلاغہ، کشف الغمہ اور صحیفہ کاملہ سے اوراق ماسبق میں کافی تفصیل سے بیان کی جا چکی ہیں، رہیں اہل سنت کی روایات تو وہ بھی اس سلسلہ میں حد و شمار سے باہر ہیں،

اب ہم کتاب الموافقہ ابن سمان سے جو اسی مقصد کے تحت تصنیف ہوئی حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے حق میں ایک روایت بطور نمونہ پیش کرتے ہیں۔ جو معاملہ امامت زیر بحث کی پوری وضاحت کرتی ہے اگر کوئی ماہر لسان عرب حضرت امیر رضی اللہ عنہ کی اس عبارت کو اس عبارت سے جو نہج البلاغہ کی روایت میں ہے ملائے اور موازنہ کرے تو اس میں سر مو فرق نہ پائے گا۔ یہ ہمارا ذمہ ہے،

اور انصاف کی بات تو یہ ہے کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ کے کلام میں کوئی بناوٹ نہیں کر سکتا۔ اس کو جانچنے اور دیکھنے کے لئے البتہ عربی میں مہارت اور متکلم کے بارے میں سلیقہ شناسی ضرور درکار ہے یہ نہیں کہ عربی لغات سے اجنبی محض بلاغت کلام سے متاثر ہو کر فریفتہ ہو جائے، اور اسے پرکھ اور تمیز کا مادہ نصیب نہ ہو،

رَوَی الْحَافِظُ اَبُوْ سَعْدِ بْنُ السَّمَّانِ وَغَیْرُہٗ مِنَ الْمُحَدِّثِیْنَ اَیْضًا عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ عَقِیْلِ بْنِ اَبِیْ طَالِبٍ اَنَّہٗ لَمَّا قُبِضَ اَبُوْ بَکْرِ الصِّدِّیْقُ وَسُجِّیَ عَلَیْہِ ارْتَجَّتِ الْمَدِیْنَۃُ بِالْبُکَاءِ کَیَوْمِ قُبِضَ فِیْہِ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَجَاءَ عَلِیٌّ بَاکِیًا مُسْتَرْجِعًا وَھُوَ یَقُوْلُ اَلْیَوْمَ اِنْقَطَعَتْ خِلَافَۃُ النُّبُوَّۃِ فَوَقَفَ عَلٰی بَابِ الْبَیْتِ الَّذِیْ فِیْہِ اَبُوْبَکْرٍ مُسَجًّی فَقَالَ رَحِمَکَ

ترجمہ:۔ حافظ ابو سعید بن سمان اور دوسرے محدثین نے بھی محمد بن عقیل بن ابی طالب سے روایت کی ہے کہ جب حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے وفات پائی اور آپ کو چادر میں لپیٹ دیا گیا۔ تو پورا مدینہ آہ و بکا سے لرز اٹھا اور وہی کیفیت لوگوں پر طاری تھی جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے وصال کے وقت پیش آئی تھی حضرت علی رضی اللہ عنہ باچشم گریاں برزبان انا للہ تشریف لائے اور کہنے لگے آج

اللہ یا ابا بکر کنت الف رسول اللہ وانیسہ ومستراحہ وثقتہ وموضع سرہ ومشاورتہ کنت اول القوم اسلاما واخلصہم ایمانا واشدہم یقینا واخوفہم للہ واعظمہم غناء فی دین اللہ عز وجل واحوطہم لرسولہ واشفقہم علیہ واحدبہم علی الاسلام وایمنہم علی اصحابہ واحسنہم صحبۃ واکثرہم مناقب وافضلہم سوابق وارفعہم درجۃ واشبہہم برسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہدیا وسمتا ورحمۃ وفضلا وخلقا واشرفہم عندہ منزلۃ واکرمہم علیہ واوثقہم عندہ جزاک اللہ عن الاسلام وعن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وعن المسلمین خیرا کنت عندہ بمنزلۃ السمع والبصر صدقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حین کذبہ الناس فسماک اللہ فی تنزیلہ صدیقا فقال عز من قائل والذی جاء بالصدق وصدق بہ اولئک ہم المتقون فالذی جاء بالصدق محمد صلی اللہ علیہ وسلم وصدق بہ ابو بکر واسیتہ حین بخلوا وقمت معہ عند المکارہ حین عنہ قعدوا وصحبتہ فی الشدۃ احسن الصحبۃ ثانی اثنین وصاحبہ فی الغار والمنزل علیہ السکینۃ ورفیقہ فی الہجرۃ وخلیفتہ فی دین اللہ عز وجل وفی امتہ احسنت الخلافۃ حین ارتد الناس وقمت بالامر ما لم یقم بہ خلیفۃ نبی نہضت حین وہن اصحابک وبرزت حین استکانوا وقویت حین ضعفوا ولزمت منہاج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی اصحابہ اذ کنت خلیفۃ حقا ولم تنازع ولم تضرع برغم المنافقین وکبت الکافرین وکرہ الحاسدین وضغن الفاسقین وغیظ الباغین وقمت بالامر حین فشلوا او نطقت حین تعتعوا ومضیت بنور اللہ اذ وقفوا

نبوی خلافت کا خاتمہ ہوگیا، پھر اس گھر کے دروازہ پر جس میں حضرت ابو بکر ملفوف تھے کھڑے ہوئے اور فرمانے لگے اے ابو بکر اللہ تم پر رحم فرمائے تم رسول اللہ کے مسکن الفت وانس راحت واعتماد تھے اور آپ کے اسرار کی قرارگاہ آپ کی امت میں تم اسلام سے مشرف ہونے والے پہلے فرد تھے ایمان میں سب سے زیادہ پر خلوص، تقوی میں سب سے زیادہ مضبوط سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والے سب سے زیادہ اللہ کے دین کی مدد پر کمر بستہ، ان کے رسول کا سب سے زیادہ لحاظ کرنے والے، ان پر ان سب سے زیادہ شفیق سب سے زیادہ اسلام کے غمخوار، ان کے اصحاب کے لئے سب سے زیادہ قابل بھروسہ، باعتبار صحبت سب سے زیادہ محبوب تر، فضیلتوں میں سب سے زیادہ بڑھے ہوئے باعتبار سبقت سب سے افضل، باعتبار درجہ سب سے بالاتر، سب سے زیادہ رسول اللہ سے مشابہ باعتبار طرز و روش، رحمت و بزرگی میں، عادت و خصلت میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے نزدیک سب سے زیادہ درجہ میں اشرف ان سے زیادہ باعزت آپ کے نزدیک سب سے زیادہ درجہ میں اشرف ان سے زیادہ باعزت آپ کے نزدیک سب سے زیادہ قابل بھروسہ آپ کے نزدیک اللہ تعالیٰ ان کو اسلام رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور مومنین کی طرف سے جزائے خیر عطا فرمائے،

تم ان کے لئے کان اور آنکھ کی طرح تھے، جب لوگوں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کی تو تم نے تصدیق کی اسی لئے قرآن میں تمہارا نام صدیق رکھا پس فرمایا صاحب عزت نے، یہ قول، جو سچ بات لایا۔ اور جس نے اس کی تصدیق کی وہ سب تقوی والے ہیں،

تو سچ بات لانے والے محمد صلے اللہ علیہ وسلم ہیں اور جنہوں نے ان کی تصدیق کی وہ ابو بکر ہیں۔

تم نے رسول اللہ کے ساتھ اس وقت ہمدردی کی

www.Ahlehaq.com

فَاتَّبَعُوكَ وَهَنُوا وَكُنْتَ أَخْفَضَهُمْ صَوْتًا وَأَعْلَاهُمْ
فَوْقًا وَأَقَلَّهُمْ كَلَامًا وَأَصْوَبَهُمْ مَنْطِقًا وَأَطْوَلَهُمْ
صَمْتًا وَأَبْلَغَهُمْ قَوْلًا وَأَكْبَرَهُمْ رَأْيًا وَأَشْجَعَهُمْ
وَأَعْرَفَهُمْ بِالْأُمُورِ وَأَشْرَفَهُمْ عَمَلًا كُنْتَ وَاللهِ لِلدِّينِ
يَعْسُوبًا أَوَّلًا حِينَ نَفَرَ النَّاسُ عَنْهُ وَآخِرًا حِينَ فَشِلُوا
كُنْتَ لِلْمُؤْمِنِينَ أَبًا رَحِيمًا إِذْ صَارُوا عَلَيْكَ عِيَالًا
تَحَمَّلْتَ أَثْقَالَ مَا ضَعُفُوا عَنْهُ وَرَعَيْتَ مَا أَهْمَلُوا
وَحَفِظْتَ مَا أَضَاعُوا وَعَلَوْتَ إِذْ هَلَعُوا وَصَبَرْتَ إِذْ
جَزِعُوا وَأَدْرَكْتَ أَوْتَارَ مَا طَلَبُوا وَرَاجَعُوا رُشْدَهُمْ
بِرَأْيِكَ فَظَفِرُوا وَنَالُوا بِكَ مَا لَمْ يَحْتَسِبُوا وَجَلَّيْتَ
عَنْهُمْ فَأَبْصَرُوا وَكُنْتَ عَلَى الْكَافِرِينَ عَذَابًا صَبًّا وَ
لِلْمُؤْمِنِينَ رَحْمَةً وَأُنْسًا وَحِصْنًا فَطِرْتَ وَاللهِ
بِعَنَائِهَا وَفُزْتَ بِحِبَائِهَا وَذَهَبْتَ بِفَضَائِلِهَا وَأَدْرَكْتَ
سَوَابِقَهَا لَمْ تُفْلَلْ حُجَّتُكَ وَلَمْ تَضْعُفْ بَصِيرَتُكَ وَ
لَمْ تَجْبُنْ نَفْسُكَ وَلَمْ يَزِغْ قَلْبُكَ كَالْجَبَلِ لَا تُحَرِّكُهُ
الْعَوَاصِفُ وَلَا تُزِيلُهُ الْقَوَاصِفُ كُنْتَ كَمَا قَالَ
رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَمَنَّ النَّاسِ عَلَيْهِ فِي
صُحْبَتِكَ وَذَاتِ يَدِكَ وَكَمَا قَالَ ضَعِيفًا فِي بَدَنِكَ قَوِيًّا
فِي أَمْرِ اللهِ مُتَوَاضِعًا فِي نَفْسِكَ عَظِيمًا عِنْدَ اللهِ جَلِيلًا
فِي أَعْيُنِ الْمُؤْمِنِينَ كَبِيرًا فِي أَنْفُسِهِمْ لَمْ يَكُنْ لِأَحَدٍ
فِيكَ مَغْمَزٌ وَلَا لِقَائِلٍ فِيكَ مَهْمَزٌ وَلَا لِأَحَدٍ فِيكَ مَطْمَعٌ
اَلضَّعِيفُ الذَّلِيلُ عِنْدَكَ قَوِيٌّ عَزِيزٌ حَتَّى تَأْخُذَ بِحَقِّهِ
وَالْقَوِيُّ الْعَزِيزُ عِنْدَكَ ضَعِيفٌ ذَلِيلٌ حَتَّى تَأْخُذَ مِنْهُ
الْحَقَّ اَلْقَرِيبُ وَالْبَعِيدُ عِنْدَكَ سَوَاءٌ أَقْرَبُ النَّاسِ
إِلَيْكَ أَطْوَعُهُمْ لِلّٰهِ وَأَتْقَاهُمْ لَهُ شَأْنُكَ الْحَقُّ وَ
الصِّدْقُ وَالرِّفْقُ وَقَوْلُكَ حُكْمٌ وَحَتْمٌ وَأَمْرُكَ حِلْمٌ وَ
حَزْمٌ وَرَأْيُكَ عِلْمٌ وَعَزْمٌ فَأَبْلَغْتَ وَاللهِ لَهُمُ السَّبِيلَ
وَسَهَّلْتَ الْعَسِيرَ وَأَطْفَأْتَ النِّيرَانَ وَاعْتَدَلَ بِكَ
الدِّينُ وَقَوِيَ الْإِيمَانُ وَثَبَتَ الْإِسْلَامُ وَالْمُسْلِمُونَ

جب لوگوں نے ان سے جان چرائی تم نے ان کی مصیبتوں میں اسوقت پشت پناہی کی جب لوگ ان کی مدد سے بیٹھ رہے تھے تم سختی کے زمانہ میں آپ کے اچھے ساتھی بنے رہے، تم دو میں کے دوسرے اور غار میں ان کے ساتھی تھے جس پر سکینت اتری تم ہجرت میں ان کے رفیق تھے اللہ عزوجل کے دین اور آپ کی امت میں تم ان کے خلیفہ تھے جب لوگ مرتد ہوگئے تو تم نے خلافت کے امور بہترین انداز میں نبھائے اور امور ریاست کو ایسا سنبھالا کہ کسی نبی کے خلیفہ کے ہاں اس کی مثال نہیں، جب تمہارے ساتھی سست پڑ گئے تو تم مضبوطی کے ساتھ قائم رہے جب وہ تھک گئے تو تم سامنے آئے جب انہوں نے کمزوری دکھائی تو تم نے قوت کا مظاہرہ کیا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں تم رسول کے راستہ پر رہے اس لئے کہ تم خلیفہ برحق تھے نہ تم نے کسی سے جھگڑا کیا نہ کوئی تمہارے مقابل آیا منافق ناخوش کافر ذلیل، حاسد رنجیدہ، فاسق خوار، باغی گمراہ رہے جب لوگوں نے بزدلی دکھائی تم نے کام سنبھالا جب لوگ گنگ ہوگئے تو تم ہی بولے جب اور لوگ کھڑے رہ گئے تو تم چل نکلے، اس لئے سب نے تمہاری پیروی کی تو ہدایت پائی، تم پست آوازی میں سب سے زیادہ اور پیش روی میں سب سے بلند، ان سے زیادہ کم گو، ان سے زیادہ راست گو ان سے زیادہ سکوت پسند ان سے زیادہ گفتگو میں اثر انداز رائے وبندگی میں سب سے بڑھ کر کاموں کی انجام دہی میں سب سے زیادہ بہادر کاموں کو ان سے زیادہ پہچاننے والے ان سے زیادہ کام میں شرافت پسند، اللہ کی قسم تم پیشوائے دین تھے اول جب لوگ اس سے بھاگے اور آخر میں جب لوگ بزدل ہوئے تم مومنوں کے لئے شفیق باپ کی طرح تھے جب وہ بال بچوں کی طرح تمہارے سایۂ عاطفت میں آپڑے تو تم نے ان کے کمزوروں کا وہ بوجھ اٹھایا جس کو وہ نہ اٹھا سکے جس کی وہ حفاظت نہ کر سکے اس کی تم نے حفاظت کی

www.Ahlehaq.com

فَظَهَرَ اَمْرُ اللّٰهِ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُوْنَ فَسَبَقْتَ وَاللّٰهِ سَبْقًا بَعِيْدًا وَاَتْعَبْتَ مَنْ بَعْدَكَ اِتْعَابًا شَدِيْدًا وَفُزْتَ بِالْخَيْرِ فَوْزًا عَظِيْمًا فَجَلَلْتَ عَنِ الْبُكَاءِ وَعَظُمَتْ رَزِيَّتُكَ وَهَدَّتْ مُصِيْبَتُكَ الْاَنَامَ فَاِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ،

جس کو انہوں نے ضائع کیا اس کی تم نے نگہبانی کی جب وہ مصیبت سے بے قرار ہوئے تو تمہاری بیقراری ان سے بھی زیادہ رہی، جب وہ دل چھوڑ بیٹھے تو تم صبر پر ڈٹے رہے۔ وہ جو ڈھونڈتے رہے اور نہ پایا تم نے اسے پا لیا تم نے اپنی رائے سے ان کی رہنمائی کی تو وہ کامیابی سے ہم کنار ہوئے اور تمہارے طفیل ان کو وہ کچھ ملا جس کا ان کو وہم گمان بھی نہ تھا۔ تم سے ان پر ہر چیز ایسی واضح کی کہ ان کو بینائی مل گئی تم کافروں پر اک عذاب تھے تو مومنوں کے لئے سراپا رحمت وانس اور فراخی! اللہ کی قسم تم ان مراتب کی بلندی پر اڑے رہے پھر اس کے قرب سے کامیاب ہوئے تم نے برگزیدہ درجے حاصل کئے اور ان سے آگے کے مراتب پائے۔ نہ تمہاری حجت کمزور رہی نہ تمہاری سوجھ بوجھ میں ضعف آیا۔ نہ تمہارا نفس بزدل ہوا، نہ تمہارا دل بہکا گویا تم ایک پہاڑ تھے جس کو نہ طوفان ہلا سکتا تھا، نہ ہوا کے جھونکے اس کو اپنی جگہ سے ڈگمگا سکتے تھے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے مطابق تم زیادہ احسان کرنے والے تھے حضور صلے اللہ علیہ وسلم پر اپنی رفاقت اور دولت نثار کرنے میں۔ اور آپ صلے اللہ علیہ کے فرمان کے مطابق تم ضعیف بدن مگر اللہ کا حکم بجالانے میں قوی تھے۔ نفس میں تواضع پسند، اللہ کے نزدیک بلند، مومنوں کی نظر میں بزرگ، ان کے دلوں میں با وقعت کسی کو تم پر طعن کرنے کی نہ تاب و مجال اور نہ کسی کینے والے کو تمہارے بارے میں نازیبا گفتگو کرنے کی ہمت نہ کسی کو طمع کا ایسا موقع کہ تم پر قابو پا سکے کمزور ذلیل تمہارے نزدیک قوی و عزیز تھے جب تک ان کا حق نہ دلا دیتے اور قوی و عزیز تمہارے نزدیک کمزور و ذلیل تھے تاوقتیکہ تم اس سے کسی کا حق نہ لے لیتے دور و نزدیک تمہارے لئے برابر تھے جو اللہ سے زیادہ ڈرنے والا اور اس کا زیادہ مطیع تھا وہی سب سے زیادہ تمہارے قریب تھا تمہارا کام حق پرستی راست گوئی اور نرمی تھا۔ اور تمہارا قول حکمت آمیز، دلنشین اور مضبوط، اور تمہارا حکم بردباری اور دانائی پر مبنی تھا، پس اللہ کی قسم تم نے ان کو راہ راست پر لگایا ان کے مشکل راستوں کو آسان بنایا۔ فتنہ کی آگ بجھائی تمہاری وجہ سے دین ٹھیک ہو گیا اور ایمان طاقتور اسلام اور مسلمان نے اپنے قدم جمالئے احکام الٰہی ظاہر ہوئے گو کافر اس پر کڑھے، اللہ کی قسم تم بہت آگے بڑھ گئے اور اپنے بعد والوں کو تھکا مارا تم نے کھلم کھلا بھلائی حاصل کی اور تم اس سے بالاتر ہو کہ تم پر کوئی روئے اگر تمہاری جدائی کی مصیبت بہت سنگین ہے اور اس نے لوگوں کو جھنجوڑ ڈالا ہے، اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ۔ ہم اللہ ہی کے لئے ہیں اور اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں"

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ فصیح و بلیغ خطاب حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی ستائش میں ہے گویا آپ کی طرف سے ہدیہ تحسین و عقیدت کا اظہار انتہائی بلند معیار سے اظہار ہے،

اگر آپ کے ان تمام خطبات و کلمات کو جو آپ نے حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کی شان میں ارشاد فرمائے اور جو اہل سنت کی کتب میں بطریق وثوق و عدالت، بلکہ بطریق تواتر و شہرت منقول ہیں یکجا کیا جائے تو ایک ضخیم کتاب تیار ہو سکتی ہے اور ایک مستقل دفتر رضی کی نہج البلاغہ کے برابر مرتب ہو سکتا ہے،

ہو سکتا ہے کہ کسی کے دل میں یہ سوال اٹھے کہ شکایت و ظلم سے متعلق جو روایات شیعہ کتب میں مروی ہیں اگر ان سب کی سب کو ان کے پیشواؤں کی من گھڑت اور بناوٹی کہا جائے تو یہ بات دل کو نہیں لگتی کہ اتنی بڑی جماعت

ساری کی ساری جناب امیر پر افتراء باندھنے پر تل جائے۔ لہٰذا اس میں کہیں نہ کہیں، کوئی غلطی لگی ہے، آخر وہ کیا ہے؟
اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بات اوراق ماسبق میں گزر چکی ہے کہ ان کے ناسمجھ راویوں نے تجسیم و بداء وغیرہ میں ائمہ پر جھوٹ تھوپا ہے۔ اور ائمہ نے ان کی تکذیب کی ہے۔ حالانکہ عقائد الٰہیہ کا رتبہ کہاں اور عقائد صحابہ کہاں البتہ ان روایات کی تکذیب بھی دوسرے شیعوں کے ذریعہ ان تک پہنچی لیکن مثلاً عن صحابہ کے سلسلہ میں تو کوئی تکذیب ان تک نہیں پہنچی اگر پہنچی بھی ہو تو ان کے خیال میں اس کی تکذیب صراحت سے نہ آئی ہو۔ جیسا کہ نہج البلاغہ اور صحیفہ کاملہ کے حوالہ سے سب کچھ تفصیلاً بیان ہو چکا۔

اصل مسئلہ یہ ہے کہ یہ سب کے سب چونکہ صحابہ سے بغض رکھنے اور ان کے متعلق عقائد بد رکھنے میں متفق الخیال ہیں، اس لئے وہ تکذیب کی روایت کر کے خود اپنی تردید کیونکر نے لگے، اس کو ظاہر کر کے اپنے پاؤں پر کلہاڑی کیوں مارنے لگے۔ اس لئے یہ اپنے پچھلوں کے جھوٹ کو پالتے پوستے رہے بلکہ بلی کے گو کی طرح چھپاتے رہے اور یوں یہ جھوٹ رفتہ رفتہ اس فرقہ کے متفق علیہ جھوٹ کی شکل اختیار کر گیا، اور یہ جھوٹ اتنے زور شور اور باقاعدہ منصوبہ بندی سے بولا گیا کہ وہ ان کے لئے سانپ کے منہ کی چھچھوندر بن گیا، کہ نگلے گا تو اندھا اگلے گا تو کوڑھی۔ یہ جھوٹ ان کی زندگی و موت کا مسئلہ بن گیا اور اپنے ہاتھ سے کون اپنی قبر کھودنے لگا، اور عقائد الٰہیہ سے متعلق جھوٹ ایسا نہیں اس لئے اس کے متعلق دونوں کا طرح روایات بیان کرنے میں کوئی حرج نہیں، سمجھتے، اس لئے دونوں طرح کی روایت ملتی ہیں،

اس کے باوجود بھی ان سب کی غلطی کا ایک نشان بھی ہے وہ یہ کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ کے وہ خطابات جو رضی نے نہج البلاغہ میں جمع کئے ہیں ان میں اور دوسرے خطبوں میں جو جناب امیر کی صحیح مراد کو ظاہر کرتے ہیں اور شیعوں کے خیال و گمان کی تردید کرتے ہیں، جن کو حذف اور ساقط کیا مثلاً یہی خطبہ مذکورہ بالا جو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی ستائش میں گزرا اس میں جناب امیر قریش کی شکایت فرماتے ہیں، اور ان کے حق میں بددعا فرماتے ہیں مگر یہ فرقہ اپنی بدگمانی اور دلی بغض کے سبب سمجھتا ہے کہ ان قریش سے خلفائے ثلاثہ رضوان اللہ علیہم مراد ہیں اور ان کے مددگار، حاشا و کلا ایسا بالکل نہیں ہے بلکہ آپ کا اشارہ ان نوجوانان قریش کی طرف ہے جن کا شمار صحابہ کرام میں نہ تھا بلکہ خلیفہ اول و دوم کے عہد خلافت میں یہ سن بلوغ و عمر تمیز تک بھی نہ پہنچے تھے اور عہد امیر المومنین میں عقل و رشد ناقص حاصل کیا اور بڑے بڑے کاموں میں دخل در معقولات کرنے لگے اور انہوں نے جناب امیر اور آپ کے رفیقوں دوستوں مثلاً حضرت طلحہ حضرت زبیر اور ام المومنین رضی اللہ عنہم میں شکر رنجیاں اور نار اضگیاں پیدا کیں اور ایک بڑے زبردست فساد برپا کرنے کا سبب بنے اور پھر خود آنجناب کی مدد و معاونت سے بھی دستکش ہو گئے اور آپ کے اوامر و نواہی ماننے سے بھی منکر ہو کر بیٹھ رہے اور سستی کا مظاہرہ کیا۔ اور یہ ان کی ہی روش سے ہوا کہ مخالف کے لشکر سارے شہروں پر قابض ہو گئے اور جناب امیر کا اقتدار صرف کوفہ عراق اور خراسان تک محدود ہو کر رہ گیا۔ چنانچہ صحیح روایات سے ثابت ہے کہ جب حضرت امیر رضی اللہ عنہ نے کشتگان جنگ جمل پر گزر کیا تو ان میں عبدالرحمن بن عتاب ابن اسید جو ام المومنین رضی اللہ عنہا کے طرفداروں میں سے تھے کو کشتہ دیکھا تو آپ نے صد درجہ افسوس کا اظہار فرمایا اور رو کر یوں فرمایا۔ هٰذا يَعْسُوبُ قُرَيْشٍ ثُمَّ قَالَ جَدَعْتُ أَنْفِي وَ شَفَيْتُ نَفْسِي، (یہ قریش کا سردار ہے میں نے اپنی ناک کاٹ لی اور اپنے آپ کو تسلی دی)۔

شیعوں کا عالم یہی ہے کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ کے کلام کو اپنے معتقدات اور اپنے گمراہ پیشواؤں کے جذبات

پر ڈھال لیتے ہیں، بلکہ آیات و احادیث کو بھی اسی اسلوب اور نقطہ نظر سے دیکھتے اور سمجھتے ہیں تو اس بیماری کا کیا علاج ہے ورنہ یہ تو قیامت تک بھی ممکن نہیں کہ صحابہ کرام جن کے حق میں یہ آیات نازل ہوئی ہیں،

اَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوٰى وَكَانُوْٓا اَحَقَّ بِهَا وَاَهْلَهَا،	اور ان کو تقویٰ کی ملت پہ جمائے رکھا اور وہ اس کے زیادہ مستحق بھی ہیں، اور اہل بھی،
(۲) اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ۔	وہ کافروں پہ سخت اور مومنوں پر مہربان ؛
(۳) حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَكَرَّهَ اِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْيَانَ	اللہ تعالیٰ نے تمکو ایمان کی محبت دی اور اس کو تمہارے دلوں میں مرغوب کر دیا اور کفر و فسق و عصیان سے تم کو نفرت دے دی،

ان سے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی مخالفت یا آپ کے خاندان کی ایذا رسانی سرزد ہو سکے اگر کسی کا یہ عقیدہ ہوگا تو وہ قرآن و حدیث متواترہ کی تکذیب کا مرتکب ہوگا،

پانچویں دلیل :- حضرت امیر رضی اللہ عنہ نے امامت کا دعویٰ بھی کیا اور بطور تائید معجزہ بھی دکھایا مثلاً خیبر کا دروازہ اکھاڑنا چٹان کو اٹھا لینا۔ یا جنوں سے جنگ و مقاتلہ کرنا اور سورج کو لوٹا لانا اس لئے وہ اپنے دعوے میں سچے ہوں گے اور امام ہوں گے،

ان لوگوں کا یہ کلام اہل سنت کے اس استدلال سے ملتا جلتا ہے جو وہ پیغمبر صلے اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے اثبات میں پیش کرتے ہیں، مگر یہ مشابہت صرف اسلوب بیان میں ہے مقدمات کی صحت میں نہیں ہے

اول تو اسی میں کلام ہے کہ امامت کا اثبات معجزہ سے ہوتا ہے کیونکہ معجزہ تو نبوت کے ثابت کرنے کے لئے ہوتا ہے، امامت، قضا، احتساب، افتاء، اجتہاد، کسی کی سلطنت، لشکر کی امارت اور وزارت یا دیگر شرعی عہدوں کے لئے نہیں ہوتا اس کی وجہ یہ ہے کہ نبوت چونکہ براہ راست خدا کی طرف سے ہوتی ہے، اس لئے اس کا اثبات معجزہ کی شکل میں خدا کی طرف سے تصدیق کئے بغیر ممکن نہیں۔ بخلاف امامت کے کہ وہ نبی کے فرمان اور آپ کے سونپنے سے ثابت ہوتی ہے،

پھر یہ بات بھی ہے کہ معجزہ سے نبوت کا ثبوت بھی محض عادت الٰہی کی بناء پر ہے، اور اللہ تعالیٰ کی یہ عادت صرف انبیاء کرام علیہم السلام کے بارے میں ہے، ان کے علاوہ کسی سے متعلق بھی یہ عادت نہیں رہی اس لئے اس کی دلالت بھی انبیاء کرام کے ساتھ مخصوص رہے گی،

اس بات کی دلیل یہ ہے کہ کوئی شخص مدعی بن کر کسی دوسرے شخص پر کسی قسم کا دعویٰ دائر کرے اور ثبوت میں کوئی معجزہ پیش کرے تو شرعاً اس کا یہ ثبوت بالکل معتبر نہیں کیونکہ شریعت میں ثبوت دعویٰ کا ایک طریقہ گواہ دینا ہے معجزہ کا اظہار نہیں، یہی حال تمام دعاوی اور معاملات کا ہے۔ جب امامت بھی پیغمبر علیہ السلام کے متعین کرنے یا ارباب حل و عقد کے انتخاب سے وجود میں آئی ہو تو اس پر معجزہ کس طرح دلیل بن سکے گا،

دوسرے یہ بات بھی غلط ہے کہ تینوں خلفاء کے زمانہ میں آپ نے امامت کا دعویٰ کیا جبکہ خود امامیہ کی روایات بھی انفرادی قرار دے کر تردید کرتی ہے۔ اور تقیہ کا واجب سمجھنا بھی اس کو باطل قرار دیتا ہے اور آنحضرت صلے اللہ

Www.Ahlehaq.com

www.Ahlehaq.com

علیہ وسلم کی اس پر سکوت کی وصیت اس دعوے کے سراسر منافی ہے، اور یہ سب امور امامیہ کے نزدیک آسمان سے نازل ہونے والی وحی کی طرح ثابت ہیں،

تیسرے جناب امیر رضی اللہ عنہ سے خوارق عادات اور کرامات کا صدور و ظہور بالکل قابل تسلیم ہے لیکن یہ امر تو خلفائے ثلاثہ رضوان اللہ علیہم نیز دیگر صحابہ و اولیاء اللہ رحمہم اللہ سے بھی بطریق تواتر و شہرت ثابت ہے، رہا باب خیبر کا قصہ تو یہ واقعہ تو حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی موجودگی کا ہے، اس وقت امامت کے دعویٰ کا امکان اور گنجائش ہی کہاں!

اب رہی جنات سے لڑائی تو کتب اہل سنت سے تو اس کا کوئی سراغ نہیں ملتا یہ محض شیعوں کی روایت ہے کہ جب آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم غزوہ بنی المصطلق کے لئے روانہ ہوئے تو جبرائیل علیہ السلام نے راستہ میں خبر دی کہ فلاں کنوئیں میں جن اکٹھے ہوئے ہیں اور آپ کے لشکر پر حملہ کرنا چاہتے ہیں، تو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے جناب امیر کو بھیجا اور آپ نے ان کو قتل کیا"!

اگر اس روایت کو صحیح بھی مان لیں تو بھی معجزہ تو یہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم ہی کا ہوگا البتہ کرامت جناب امیر کی ہوگی مگر جس وقت امامت کا وجود ہی نہ تھا تو اس کے لئے یہ شہادت کیسی، کیونکہ معجزہ کے لئے دعویٰ کی شرط بالاجماع ہے، علی بن عیسیٰ اردبیلی نے کشف الغمہ میں لکھا ہے کہ یہ مقابلہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے حکم سے تھا، تو اس سے معاملہ ہی صاف ہوگیا کہ یہ آپ کا معجزہ تھا۔

اور چٹان کے اٹھا لینے والی بات کا بھی اہل سنت کی کتابوں میں کوئی وجود نہیں صرف شیعہ امامیہ اور زیدیہ کی کتابوں میں اس کی روایت ملتی ہے، اخطب خوارزم جوزیدی ہے اپنی کتاب میں یوں بیان کرتا ہے کہ "جناب امیر جب جنگ صفین کے لئے روانہ ہوئے تو راستہ میں ساتھیوں کو سخت پیاس لگی مگر پانی آس پاس دستیاب نہ تھا جناب امیر نے اس وادی میں واقع ایک گرجا کے قریب اشارہ فرمایا یہاں کھدائی کرو دوران کھدائی سامنے ایک چٹان آگئی جس کو اکھاڑنے اور ہلانے سے سب عاجز آگئے، تو اس کی اطلاع آپ کو دی گئی چنانچہ آپ خود اس گڑھے میں اترے اور اس چٹان کو وہاں سے اٹھا کر دور پھینک دیا اس کے نیچے میٹھے اور ٹھنڈے پانی کا چشمہ نکل آیا ساری فوج نے وہ پانی پیا اور خوب سیراب ہوئے۔ جب گرجا کے راہب نے یہ کرشمہ دیکھا تو ایمان لے آیا۔ اور کہنے لگا کہ ہم نے اپنی پرانی کتابوں میں لکھا دیکھا ہے کہ ایک شخص ان اوصاف کا اس گرجا کے قریب پڑاؤ کرے گا اور اس چٹان کو اٹھالے گا وہ دین حق پر ہوگا۔

اس کلام کا حاصل بس اتنا ہی تو نکلا کہ اگر یہ کرامت ثابت بھی ہو تو آپ کی اور کرامتوں کی طرح یہ بھی ایک کرامت ہوگی امامت کے دعوے کا یہاں کوئی ذکر ہی نہیں، نہ اہل شام کے مقابلہ میں یہ قصہ پیش آیا اگر ایسے موقعہ پر یہ واقعہ پیش آتا بھی تو وہ اہل سنت کے لئے راحت قلب ہوتا شیعوں کے دعوے سے اس کو کیا تعلق ہوتا کیونکہ اس وقت تو بالاجماع جناب امیر رضؓ کی امامت، امامت حق تھی۔ اور مد مقابل مخالف اور ناحق!

اور رہا سورج کا لوٹنا تو اکثر محدثین (رحمہم اللہ) جو اہل سنت ہیں مثلاً طحاوی وغیرہ نے اس قسم کی روایت کو صحیح تسلیم کیا ہے اور یہ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کا بلاشبہ ایک معجزہ ہے کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ کی نماز عصر فوت ہونے کے اندیشہ سے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی دعا سے یہ واقعہ پیش آیا۔ تو آپ نے نماز عصر ادا فرمائی۔ اس وقت

www.Ahlehaq.Com

امامت کا دعویٰ کہاں تھا، اور کون ان کا مخالف اور منکر تھا،

چھٹی دلیل :۔ یہ کہتے ہیں کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ کے بارے میں کسی موافق یا مخالف نے کوئی ایسی روایت بیان نہیں کی جس میں آپ پر طعن، و قدح ذاتی طور پر وارد ہوتا ہو، بخلاف خلفائے ثلاثہ رضوان اللہ علیہم کے ان کے بارے میں موافق و مخالف ہر دو نے ایسی بہت سی روایات بیان کی ہیں جو ان کی ذات میں قدح و برائی کا سبب ہیں اور ان کے استحقاق امامت کو سلب کرتی ہیں، لہذا جناب امیر جو امور مخالفت امامت سے بری اور صاف ہیں امامت کے لئے مخصوص ہوئے،

اس دلیل میں عجیب انداز کی گڑبڑ اور مغالطہ آمیزی کی گئی ہے، اس لئے کہ اہل سنت اور معتزلہ جو ان تینوں خلفاء رضوان اللہ علیہم کی امامت کے قائل اور موافق ہیں، ان سے ہرگز کوئی ایسی روایات مروی نہیں، جو ان حضرات کی خردہ گیری ظاہر کرتی ہو، رہے شیعہ تو وہ چونکہ ان حضرات ثلاثہ سے بغض و عناد شدید رکھتے ہیں اس لئے انہوں نے ضرور اپنی روایات میں ان کو نشانۂ ملامت و طعن بنایا ہے۔ حالانکہ ان میں بھی کوئی طعن کی بات نہیں، سے آگے چل کر باب مطاعن میں ہم انشاء اللہ ان کا پول کھولیں گے،

اگر ان امور کو جو انہوں نے اپنی روایات میں طعن کا سبب بنایا ہے، موجب طعن مانیں تو لازم آتا ہے کہ وہ انبیاء کرام علیہم السلام کے حق میں بھی طعن و قدح پیدا کریں۔ بلکہ اگر کوئی شیعی کتب کا ذرا گہری نظر سے مطالعہ کرے تو ان کو انبیاء کی شان میں طعن آمیز باتوں سے پُر اور بھری ہوئی پائے گا، اس بحث کا اچھا خاصہ حصہ تو اوراق ماسبق میں بیان بھی ہو چکا ہے،

اور ان کا یہ کہنا کہ جناب امیر کے بارے میں کسی موافق یا مخالف نے قادح و عیب روایت بیان نہیں کی دوسرا مغالطہ ہے۔ کیونکہ اہل سنت اگر مخالف ہیں تو یہ ان کا سفید جھوٹ ہے کیونکہ وہ تو آپ کی صحت امامت کے معتقد ہیں وہ تو مخالف ہیں ہی نہیں، وہ ایسی روایات بیان ہی کیوں کرنے لگے اور اگر مخالف سے مراد نواصب اور خوارج ہیں تو انہوں نے تو اس سلسلہ میں اتنے لمبے چوڑے افتراد اور طومار باندھے ہیں کہ ورق کے ورق سیاہ کر ڈالے اور ایسی خرافات و لغویات بک کر اپنے منہ کالے کئے ہیں کہ ہم اس کتاب میں سوء ادب کے خیال سے ان کا ذکر بھی نہیں کر سکتے لیکن معاملہ ایسی قوم سے بحث کا ہے جو لغویات و خرافات اور لعن طعن میں ان سے بھی بڑھی ہوئی ہے۔ تو نقل کفر کفر نباشد کے مصداق ان کی کتابوں سے بقدر قلیل بطور نمونہ یہاں درج کرتے ہیں۔

واضح رہے کہ عبدالحمید ناصبی مغربی کی کتاب سے پتہ چلتا ہے کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ سے متعلق طعن آمیز باتیں و مطاعن، دو قسم کی ہیں، ایک وہ جن کی روایات میں نواصب تنہا ہیں، اہل سنت اور شیعہ محبان ان روایات کا انکار کرتے ہیں، ایسی روایات نہ قابل اعتبار ہیں اور نہ ایسی کہ ان کی وجہ سے کوئی الزام عائد کیا جا سکے اس لئے کہ وہ محض افتراء اور جھوٹ و بہتان پہ مبنی ہیں۔ مثلاً قتل عثمان غنیؓ میں آپ کی شرکت، یا قذف حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا میں آپ کا حصہ لینا اور یہ آیت نازل ہونا۔

وَالَّذِیْ تَوَلّٰی کِبْرَهٗ مِنْهُمْ لَهٗ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ۔ ان منافقوں میں سے جو اس بہتان عظیم کا ذمہ دار بنا ہے اس کے لئے عذاب عظیم ہے،

دوسری قسم وہ جو اہل سنت اور شیعوں کی کتابوں میں سے جو اس بہتان عظیم کے ساتھ منقول و مروی ہیں،

Www.Ahlehaq.Com

اس قسم کے مطاعن واقعی قابل توجہ اور جواب طلب ہیں،

چنانچہ اہل سنت اور شیعہ دونوں نے اپنی اپنی جگہ ان کے جوابات دیئے ہیں۔

شیعوں میں رضی نے "تنزیہ الانبیاء و الائمہ" نامی کتاب میں۔ اور اہل سنت میں سے ابن حزم نے اپنی کتاب کتاب الفیصل میں۔ اس قسم کے بہت سے مطاعن کا جواب دے کر ان کا رد کیا ہے،

ان میں ایک یہ ہے کہ قتل عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے بعد ان کے اموال و اسلحہ پر جناب امیر رضؓ خود قابض و متصرف ہو گئے ہر چند ان کے وارثوں نے مانگا مگر ان کو نہ دیا۔ حالانکہ مسلمان کا مال کسی طرح حلال نہیں۔ چنانچہ ولید بن عتبہ نے اس بارے میں چند اشعار کہے ہیں،

(۱)	اَلَا مَا لِلَّیْلِیْ لَا تَغُوْرُ کَوَاکِبُہٗ	اِذَا غَابَ نَجْمٌ لَاحَ نَجْمٌ یُرَاقِبُہٗ
(۲)	بَنِیْ ہَاشِمٍ رُدُّوْا سِلَاحَ ابْنِ اُخْتِکُمْ	لَا تَنْہَبُوْہُ لَا تَحِلُّ مَنَاہِبُہٗ
(۳)	بَنِیْ ہَاشِمٍ لَا تَعْجِلُوْنَا فَاِنَّہٗ	سَوَاءٌ عَلَیْنَا قَاتِلُوْہُ وَ سَالِبُہٗ
(۴)	وَاِنَّا وَاِیَّاکُمْ وَمَا کَانَ مِنْکُمْ	کَصَدْعِ الصَّفَا لَا یَرْاَبُ الصَّدْعَ شَاعِبُہٗ
(۵)	بَنِیْ ہَاشِمٍ کَیْفَ التَّعَاقُدُ بَیْنَنَا	وَعِنْدَ عَلِیٍّ سَیْفُہٗ وَحَرَائِبُہٗ
(۶)	لَعَمْرُکَ لَا اَنْسٰی ابْنَ اَرْوٰی وَقَتْلَہٗ	وَہَلْ یَنْسَیَنَّ الْمَاءَ مَا عَاشَ شَارِبُہٗ
(۷)	ہُمْ قَتَلُوْہُ کَیْ یَکُوْنُوْا مَکَانَہٗ	کَمَا غَدَرَتْ یَوْمًا بِکِسْرٰی مَرَازِبُہٗ

(۱) خبردار! یہ میری رات کو کیا ہوا کہ اس کے ستارے ڈوبتے ہی نہیں جب ایک ستارہ ڈوبتا ہے تو اس کے مقابل دوسرا ستارہ ظاہر ہو جاتا ہے،

(۲) اے بنی ہاشم اپنے بھانجے کے ہتھیار واپس کر دو، اور ان کو نہ لوٹو ان کا لوٹنا جائز نہیں،

(۳) اے بنی ہاشم ہم سے جلد بازی نہ کرو ہمارے نزدیک ان کے قتل کرنے والے اور ان کو لوٹنے والے برابر ہیں،

(۴) ہم تم اور جو کچھ تمہاری طرف سے ہوا ہے پتھر کا وہ شگاف ہے جسے کوئی بھرنے والا بھر نہیں سکتا،

(۵) اے بنی ہاشم ہم میں اور تم میں صلح کس طرح ہو سکتی ہے جب کہ علی کے پاس ان کا تیر و تلوار ہے،

(۶) تیری جان کی قسم میں نہ عثمان کو بھولوں گا اور نہ ان کے قتل کو اور کیا پانی کے پینے والا تا زندگی اس کو بھول سکتا ہے۔

(۷) انہوں نے اس کو اس لئے قتل کیا کہ اس کی جگہ لے لیں۔ جیسا کہ کسریٰ کے ساتھ ایک دن اس کے امیروں نے کیا تھا۔

ایک دوسرا طعن یہ کہ آپ نے امہات الاولاد (وہ باندیاں جن کے اولاد ہو جائے) کے بارے میں اپنے مختلف مذاہب ظاہر فرمائے اور کسی ایک پر نہیں جمے! پہلے ان کی فروخت کے قائل تھے، پھر عہد عمر فاروق رضی اللہ عنہ میں جب ان کی فروخت کے حرام ہونے پر اجماع ہوا تو آپ اس اجماع سے متفق ہو گئے۔ پھر اپنی خلافت کے زمانہ میں ان کی فروخت صحیح ہونے پر فتویٰ صادر فرمایا اسی لئے قاضی شریح نے آپ سے دو بدو گفتگو کی اور کہا کہ "رَأْیُکَ فِی الْجَمَاعَۃِ اَحَبُّ اِلَیْنَا مِنْ رَأْیِکَ وَحْدَکَ" (آپ کی وہ رائے جو جماعت کے ساتھ ہے ہمیں آپ کی

www.Ahlehaq.com

تمہاری رائے سے زیادہ پسند ہے) حالانکہ آپ نے خود یہ فرمایا تھا کہ اَلَا اِنَّ یَدَ اللّٰہِ عَلَی الجَماعَۃِ وَغَضَبَ اللّٰہِ عَلٰی مَنْ خَالَفَھَا خبردار جماعت پر اللہ کا ہاتھ ہے اور جو اس کی مخالفت کرے اس پر اللہ کا غصہ ہے) اور قرآن میں یہ ارشاد موجود ہے،

وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ سَبِیْلِ الْمُؤْمِنِیْنَ (آخر آیت تک) لہٰذا آپ نے صاف طور پر اجماع کی مخالفت فرمائی

ان مطاعن میں سے ایک اور یہ ہے کہ آپ نے دادا کے حصہ وراثت میں مختلف فیصلے صادر فرمائے اور کسی پر بھی برقرار نہ رہے حالانکہ خود ہی یہ بھی ارشاد فرمایا مَنْ اَرَادَ اَنْ یَتَقَحَّمَ جَرَاثِیْمَ جَھَنَّمَ فَلْیَقُلْ فِی الْجَدِّ (جو جہنم میں جانے کا ارادہ کرے اسے چاہیے کہ مسئلہ جد میں کلام کرے) ان ہی میں سے ایک وہ ہے جس کی بخاری نے بایں الفاظ روایت کی ہے اِنَّ عَلِیًّا اُتِیَ بِزَنَادِقَۃٍ فَحَرَّقَھُمْ بِالنَّارِ (حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس کچھ زندیق لائے گئے تو آپ نے ان کو آگ میں جلوادیا۔

یہ بات حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کو بہت بری لگی اور جناب امیر کو بھی ندامت ہوئی،

آگ سے جلادینے کا یہ قصہ شیعی کتب میں بھی موجود ہے شریف مرتضیٰ نے تنزیہ الانبیاء والائمہ میں روایت کی ہے، اِنَّ عَلِیًّا حَرَّقَ رَجُلًا اَتٰی غُلَامًا فِیْ دُبُرِہٖ (جناب علی رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو جس نے اغلام کیا تھا، جلوادیا۔

حالانکہ حدیث لَا تُعَذِّبُوْا بِالنَّارِ (آگ سے عذاب نہ دو) کی صحت پر اجماع ہے،

ایک طعن یہ ہے کہ آپ نے شراب پینے کی سزا میں بطور حد ایک شخص کے اسی کوڑے لگوائے اور جب وہ مرگیا تو اس کی دیت (خون بہا) بھی ادا فرمادی اور فرمایا اِنَّمَا وَدَیْتُہٗ لِاَنَّ ھٰذَا الشَّیْءَ فَعَلْنَاہُ بِرَاْیِنَا (ہم نے یہ خون بہا اس لئے دیا کہ یہ فعل ہم نے اپنی ذاتی رائے سے کیا تھا) حالانکہ خود عہد عمر رضی اللہ عنہ میں شراب کی حد کے سلسلہ میں آپ نے ہی ان کو مشورہ دیا تھا کہ اس حد میں اسی کوڑے ہونے چاہئیں اور دلیل یہ تھی کہ اِذَا سَکِرَ ھَذٰی وَاِذَا ھَذٰی اِفْتَرٰی (جب مستی چھا جائے گی تو اول فول بکے گا۔ اور جب بکواس کرے گا تو افترا باندھے گا) گویا آپ کو اپنے اجتہاد میں شک و تردد ہوگیا۔

ایک طعن یہ ہے کہ ولید بن عقبہ کے آپ نے چالیس کوڑے لگائے اور یوں آپ نے حد شرعی میں لحاظ مروت اور رواداری سے کام لیا۔ کیونکہ ولید بن عقبہ کا حضرت عثمان غنی شہید رضی اللہ عنہ سے رشتہ قرابت تھا۔

ایک طعن یہ ہے کہ ایک شخص پر اس کے اقرار کی وجہ سے حد قصاص لازم ہوتی تھی آپؓ نے وہ حد معاف فرما دی۔ حالانکہ یہ خلاف شرع ہے۔ حکم تو اَلنَّفْسَ بِالنَّفْسِ (جان کا بدلہ جان) کا ہے،

ایک طعن یہ ہے کہ مولاۃ حاطب پر رجم کرایا حالانکہ وہ کنیز (باندی) تھی جس پر رجم نہیں ہوتا۔

ایک طعن یہ بھی ہے کہ جناب زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے مکاتب (قسم غلام) کے معاملہ میں آپ کو الزام دیا کہ مسئلہ تو یہ ہے کہ اگر غلام کے ذمہ زر مکاتبت میں سے ایک درہم بھی باقی ہے تو وہ پورا غلام باقی ہے، مگر جناب امیرؓ کا خیال تھا کہ وہ جتنی ادائیگی کردیگا اس کے قدر آزاد ہوجائے گا۔ اور مابقی کے برابر غلام رہے گا جیسا کہ صحاح میں منقول ہے،

اور ایک طعن یہ ہے کہ پہلے تو آپ دو بچوں کے فیصلہ پر راضی ہو گئے پھر فرمانے لگے لَقَدْ عَثَرْتُ عَثْرَةً لَا اَجْبُرُ لَهَا وَسَوْفَ اَكِيْسُ بَعْدَ هَا جَدِّدَ الْمَرِيْرِ (میں نے ایسی ٹھوکر کھائی ہے جس کی کوئی تلافی نہیں اب اس کے بعد بہت ہوشیاری سے کام لوں گا) حالانکہ پنچایت کا حکم ٹھکرانا جائز نہیں۔"

ایک طعن یہ بھی کہ بمطابق روایت شعبی اِنَّ عَلِيًّا قَطَعَ يَدَ السَّارِقِ مِنْ اُصُوْلِ الْاَصَابِعِ (حضرت علی نے چور کا ہاتھ انگلی کی جڑوں سے کاٹا) گویا آپ حد سارق سے ناواقف تھے، اور جو شخص اقامت حدود ہی سے ناواقف ہو وہ امامت کے لائق نہیں۔"

ایک طعن یہ بھی ہے کہ آپ نے اپنے بچوں میں بعض کی بعض کے خلاف گواہی کو قبول فرمایا حالانکہ بات صاف صاف ظاہر ہے کہ بچوں کی بات کا کوئی اعتبار نہیں۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ہے وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ (اور گواہ بناؤ دو گواہ مردوں میں سے)

ایک طعن یہ ہے کہ آنکھ کی دیت میں، نصف دیت کا لینا، قصاص لینے والے کانے (جس کی ایک آنکھ پھوڑ دی گئی ہو) کو مقرر فرمایا، حالانکہ حکم اَلْعَيْنُ بِالْعَيْنِ (آنکھ کے بدلے آنکھ) کا ہے۔

ایک طعن یہ بھی ہے کہ آپؓ نے بچہ پر سرقہ کی حد جاری فرما دی جیسا کہ کتب شیعہ میں موجود ہے حالانکہ آپ نے خود روایت فرمائی ہے کہ "رُفِعَ الْقَلَمُ عَنْ ثَلٰثَةٍ عَنِ الصَّبِيِّ حَتّٰى يَبْلُغَ (تین سے قلم اٹھا لیا گیا (یعنی وہ مکلف نہیں ہیں) بچہ سے جب تک وہ بالغ نہ ہو جائے)

ان میں سے ایک یہ ہے جس کی روایت محمد بن بابویہ قمی نے الفقیہ میں کی ہے۔

اَنَّهٗ جَاءَ رَجُلٌ اِلٰى اَمِيْرِ الْمُؤْمِنِيْنَ وَاَقَرَّ بِالسَّرِقَةِ اِقْرَارًا يُقْطَعُ بِهِ الْيَدُ فَلَمْ يَقْطَعْ يَدَهٗ۔

امیر المومنین رضی اللہ عنہ کے پاس ایک شخص آیا اور اس نے چوری کا اقرار کیا جس سے قطع ید کی حد لگنی چاہیے تھی مگر آپ نے اس کا ہاتھ نہیں کاٹا۔ حالانکہ حدود قائم نہ کرنا گناہ کبیرہ ہے،

ایک طعن یہ بھی ہے کہ جب نجاشی شاعر عین رمضان میں شراب نوشی کے جرم میں پکڑا ہوا آیا تو آپ نے حد شرعی سے بیس کوڑے زیادہ اس کے لگائے۔ جب کہ حد شرعی پر زیادہ جائز نہیں،

ایک طعن یہ ہے کہ شریف مرتضیٰ نے "تنزیہ الانبیاء والائمہ" میں یہ روایت بیان کی ہے کہ اَنَّهٗ عَلَيْهِ السَّلَامُ اُتِيَ بِمَالٍ مِنْ مُهُوْرِ الْبَغَايَا فَقَالَ اِنَّ نُحُوْرَهٗ حَتّٰى يَجِيْئَ عَطَاءُ غَنِيٍّ وَبَاهِلِهٖ (امیر المومنین رضی اللہ عنہ کی خدمت میں جب فاحشہ عورتوں کی کمائی کا مال پیش کیا گیا تو آپ نے فرمایا اسے اٹھائے جاؤ تا آنکہ مالداروں اور اس کے اہل کی عطایا وصول ہوں) حالانکہ فاحشہ عورتوں کی اجرت حرام ہے،

ایک طعن یہ ہے کہ آپ نے دراہم میں سود کا حکم دیا جو حکم رسول کی صریح مخالفت ہے، جیسا کہ آپ کا ارشاد ہے لَا تَبِيْعُوا الدِّرْهَمَ بِالدِّرْهَمَيْنِ (درہم کو درہم کے بدلے نہ بیچو)

ایک طعن یہ ہے کہ آپ کی بعض باتوں سے دعوائے الوہیت ظاہر ہوتا ہے مثلاً خطبۃ البیان جو رجال شیعہ میں سے اصبغ بن نباتہ سے منقول ہے اَنَا اٰخِذُ الْعَهْدِ عَلَى الْاَرْوَاحِ فِي الْاَزَلِ اَنَا الْمُنَادِيْ

www.Ahlehaq.com

لهم الست بربكم - ازل میں روحوں سے میں نے ہی عہد لیا اور میں نے ہی انہیں پکار کر کہا کہ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں۔ اسی طرح آپ کا قول - أنا منشئ الأرواح (ارواح کا پیدا کرنے والا میں ہی ہوں) یا خطبۃ الافتخار میں آپ کا وہ قول جس کی روایت رجب بن محمد بن رجب برسی حلی نے اپنی کتاب مشارق انوار الیقین فی الکشف عن امیرالمومنین میں با این الفاظ کی ہے، أنا صاحب الصور - أنا مخرج من في القبور (میں صاحب صور ہوں اور میں ہی اہل قبور کو قبروں سے نکالنے والا ہوں)

یا آپ کا یہ قول۔

أنا حي لا يموت - أنا جاوزت بموسى البحر وأغرقت فرعون وجنوده أنا أرسيت الجبال الشامخات وفجرت العيون الجاريات أنا ذالك النور الذي اقتبس موسى منه الهدى

حی لا یموت میں ہی ہوں میں نے ہی موسیٰ کے لئے دریا میں راستے بنائے اور میں نے ہی فرعون کو اور اس کے لشکر کو غرق دریا کیا۔ اونچے پہاڑ اور بہتے چشمے میں نے ہی قائم و جاری کیئے، میں ہی وہ نور ہوں جس سے موسیٰ کو ہدایت کی روشنی ملی۔

ایک طعن یہ ہے کہ یمن، عراق اور عمان میں تو اپنے اعزہ واقارب کو حاکم مقرر فرمایا مگر کوفہ و بصرہ پر طلحہ و زبیر (رضی اللہ عنہما) کی حاکمیت گوارا نہ فرمائی حالانکہ امارت کی سپردگی میں یہ زیادہ حقدار اور زیادہ بہتر تھے،

ایک طعن یہ بھی ہے کہ قاتلان عثمان غنی (رضی اللہ عنہ) پر حد قصاص جاری کرنے میں تاخیر اور بے دلی دکھائی حالانکہ اسباب قتل حضرت عثمان پر ثابت نہ ہو سکے۔

ایک طعن یہ بھی ہے کہ حضرت ابو موسیٰ اشعری (رضی اللہ عنہ) کی اہانت کی ان کا مال لوٹا، اور ان کے گھر کو نذر آتش کیا اور جناب ابو مسعود انصاری (رضی اللہ عنہ) کی بھی توہین کی،

ایک طعن یہ ہے کہ واقعہ افک کو تسلیم کرنے والوں میں سے آپ بھی تھے چنانچہ بخاری کی یہ روایت وكان علي مسلما في شأنها (اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے معاملہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی تسلیم کرنے والوں میں سے تھے،

حالانکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ولولا إذ سمعتموه ظن المؤمنون - تو گویا ایمانی تقاضے کے خلاف کیا۔

ان میں سے ایک طعن یہ بھی ہے کہ اول تو حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے قتل سے پوری بریت ظاہر کی جب اس پر قاتلان عثمان رضی اللہ عنہ کبیدہ خاطر اور آزردہ دل ہوئے تو فرمایا - قتله الله وأنا معه (ان کو اللہ تعالیٰ نے قتل کیا اور میں اس کے ساتھ ہوں)۔

امامت کو باطل قرار دینے کے لئے ان بدبختوں کے شبہات و اعتراضات اتنے طویل الذیل ہیں کہ اس مختصر کتاب میں ان کا اور ان کے جوابات کا بیان خواہ مخواہ طوالت کا باعث ہوگا دیسے وہ اس کتاب کے موضوع سے بھی خارج ہیں، بحمد للہ اہل سنت کی بڑی کتابوں میں ان خرافات کی بڑی تفصیل سے خاطر خواہ تردید کی جاتی رہی ہے،

اصول اہل سنت کے مطابق ان مطاعن کا جواب اجمالی طور پر بالکل ظاہر ہے ملاحظہ فرمائیں۔

www.Ahlehaq.com

(۱) حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے اسلحہ جات اور اموال جو آپ اپنے تصرف میں لائے تو وہ اس لئے کہ وہ اموال وغیرہ ایسے ہوں گے جن کا تعلق بیت المال سے ہوگا جناب شہید رضی اللہ عنہ کی ذاتی ملکیت نہ ہونگے اور ایسا ہونا لوازم خلافت میں سے ہے کہ جو خلیفہ ہوتا ہے وہی ایسے اموال پر قابض و متصرف ہوتا ہے،

ہمارے دور میں بھی اس کی مثال شاہی تخت، چھتر، ہاتھی گھوڑے وغیرہ ہیں کہ وہ آنے والے بادشاہ کے قبضہ و تصرف میں آتے ہیں وارثان شاہ میں تقسیم نہیں ہوتے۔ اسی طرح اس قسم کے اموال خلیفہ اول کے بعد خلیفہ ثانی کے تصرف میں آئے خلیفہ اول کے وارثوں کو نہیں ملے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ورثاء اس نکتہ کو نہ سمجھ سکے اس لئے انہوں نے مطالبہ پیش کر دیا۔

(۲) اہل سنت کے اعتقاد کے مطابق جناب امیر رضی اللہ مجتہد بھی تھے، اور مجتہد کے لئے یہ جائز ہے کہ وہ ایک مذہب ترک کر کے دوسرا مذہب اختیار کر لے اور ایسا بھی ہوا ہے (یہاں مذہب سے مراد مجتہدانہ رائے ہے مذہب بمعنی دین نہیں) چنانچہ شیخین رضی اللہ عنہما سے بھی ایسے واقعات کا صدور ہوا ہے۔

(۳) عہد عمر فاروق رضی اللہ عنہ میں امہات الاولاد پر جو اجماع تھا وہ جناب امیر رضی اللہ عنہ کے نقطۂ خیال سے قطعی نہ ہوگا، بلکہ ظنی ہوگا اسی لئے آپ نے اس کی مخالفت کی اور نہ اجماع ظنی، اور اجماع سکوتی کی مخالفت ہو سکتی ہے پھر اصولیوں کے نزدیک اجماع کے حجت کے لئے یہ شرط ہے کہ اہل اجماع اپنے قول پر قائم و برقرار رہیں اور چونکہ جناب امیر بھی اہل اجماع میں سے تھے، جب آپ کا اجتہاد بدلا تو اس وقت وہ اجماع آپ کے لئے حجت نہیں رہا۔

(۴) جد کے بارے میں حضرت ابوبکر صدیق اور جناب زید بن ثابت رضی اللہ عنہما باہم مختلف الخیال تھے چنانچہ عہد فاروقی میں اس مسئلہ پر کافی بحث و مناظرہ ہوتا رہا۔ اگر مجتہدین کسی نقطہ نظر سے اختلاف کریں اور ایک مجتہد مختلف اوقات میں حکم کی مختلف جواب کو ترجیح دے تو کوئی مضائقہ نہیں،

آپ کے کلام من اراد ان یتقحم کا مطلب یہ ہے کہ مسئلہ جد مختلف فیہا ہے ترجیح کے لئے ہر جانب وجوہ قائم ہیں اور اس میں کوئی نص وارد نہیں لہذا ان حالات میں اگر کوئی اس میں حکم قطعی ہے تو وہ بے باک ہوگا اور بے احتیاط بھی محتاط علماء اور ماہرین فضلاء کی شان یہی ہے کہ مختلف فیہ اجتہادی مسائل میں کسی ایک طرف جزم و یقین نہیں رکھتے،

(۵) زندیق اور مرتکب اغلام کو جلانے کا جو واقعہ تھا وہ بھی اجتہادی تھا۔ جب آپ کو خبر صحیح معلوم ہوئی تو آپ نے اظہار ندامت فرمایا اور اجتہاد میں تمام اخبار پر تفصیلی نظر رکھنا شرط نہیں، اسی لئے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو ابتداءً میراث جد کا علم نہ تھا جب جناب مغیرہ بن شعبہ اور محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہما نے اس کی خبر دی تو آپ نے اس کو تسلیم فرما لیا حالانکہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ باجماع نواصب و خوارج مجتہد تھے۔

(۶) اسی طرح شرابی پر حد لگانے کے بعد دیت دینا بھی بطور احتیاط تھا۔ اجتہاد میں کسی شک کی بنا پر نہیں تھا، اور احتیاط کے پہلو پر عمل کرنا انتہائی تقویٰ اور پرہیزگاری کی علامت ہے جو جناب امیر رضی اللہ عنہ جیسی ہستیوں کے شایان شان ہے،

(۷) اور ولید بن عقبہ کو چالیس کوڑے اس لئے لگائے کہ اس سے متعلق شہادت میں شبہ پیدا ہو گیا تھا، ایک شخص نے شراب پینے پر شہادت دی تھی اور دوسرے نے شراب کی قے پر، گو جناب عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے حد میں اس شبہ کو کوئی اہمیت نہیں دی (جب کہ ان کے دور میں ایسا واقعہ ہوا) اور فرمایا وَمَا تَقَيَّاهَا إِلَّا وَقَدْ شَرِبَهَا اس نے اسی لئے

تو شراب کی قے کی کہ اس نے شراب پی) لیکن جناب امیر رضی اللہ عنہ نے احتیاط کے طور پر دو حدوں میں سے جو حد کم تھی اس پر اکتفا کیا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ قرابت عثمان کا حد کے اجراء میں لحاظ فرماتے جب کہ خود حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو آپ نے نہایت تاکید کے ساتھ یہ مشورہ دیا تھا کہ حدود پوری پوری نافذ کی جائیں، چنانچہ سیرت و تاریخ کی وہ کتابیں جن کی صحت پر اہل سنت و نواصب دونوں متفق ہیں اس پر واضح اور صاف دلالت کر رہی ہیں،

(۸) اور قصاص آپ نے معاف نہیں کیا تھا بلکہ مقتول کے ورثا کی جانب سے معافی ہوئی تھی، البتہ جناب امیر رضی اللہ عنہ کا مشورہ اس میں ضرور شامل تھا معتبر کتابوں میں یہ قصہ اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ ایک شخص نے دوسرے شخص کو عداوت کی بنا پر ایک ویرانے میں قتل کیا اور بھاگ گیا مقتول کے ورثا قاتل کی تلاش میں نکلے تو اس ویرانے سے متصل ایک اور ویرانہ تھا۔ وہاں انہوں نے ایک شخص کو پیشاب کرتے دیکھا، اس کے ہاتھ میں خون آلود چھری بھی تھی کپڑے بھی خون آلود تھے لوگوں نے اسے شبہ میں پکڑ کر جناب امیر کی خدمت میں پیش کر دیا۔ اس نے سارے حالات اپنے خلاف پا کر اقرار جرم کر لیا اور کہا کہ جو شرعی سزا ہو مجھے دے دی جائے کیونکہ آلہ قتل بھی میرے پاس ہے، گواہ بھی پیچھے ہیں، میں پایا بھی مقتول کے قریب ہوں اب میرے لئے بچنے کو کیا رہ گیا ہے اسی اثنا میں جب اصل قاتل کو یہ معلوم ہوا کہ ایک ناکردہ گناہ نے اس کا جرم اپنے سر لے لیا ہے، تو وہ بھاگا ہوا جناب امیر کی خدمت میں حاضر ہو گیا اور کہا کہ اصل قاتل میں ہوں اور یہ شخص بے گناہ ہے لہذا اسے رہا کیجئے اور قصاص مجھ سے لیجئے، امیر المومنین رضی اللہ عنہ نے پہلے آدمی سے پوچھا کہ تو بتا تیرے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا جو تو قتل کا اقراری ہو گیا۔ وہ کہنے لگا کہ میں نے اپنے گھر میں بکری ذبح کی تھی، چھری پر اسی کا خون تھا کپڑوں پر بھی اسی کا خون لگا تھا، ذبح کے بعد کھال اتارنا ہی چاہتا تھا کہ پیشاب نے زور کیا تو میں فراغت کے لئے ویرانہ میں جا گھسا وہاں ایک لاش کو دیکھ کر ڈر گیا اور اس کے برابر والے ویرانے میں جا کر پیشاب کر رہا تھا کہ مقتول کے وارثوں نے آ پکڑا اور آپ کے پاس لے آئے سارے حالات میرے خلاف تھے، کچھ کہتا بھی تو کوئی یقین نہ کرتا لہذا میں نے اقرار کر لیا، اس پر جناب امیر نے اللہ کا شکر ادا کیا اور اصل اقراری قاتل کو شاباش دی کہ گو تو نے ایک آدمی قتل کیا ہے مگر دوسرے کی جان بھی بچائی ہے اگر اقرار نہ کرتا تو ایک بے گناہ قصاص میں مارا جاتا تو اس قابل ہے کہ تیرا خون بہا معاف کیا جائے مقتول کے وارثوں نے جب آپ کی یہ بات سنی تو قصاص سے دستبردار ہو گئے اور قاتل کو معاف کر دیا۔ لہذا اس صورت میں طعن کی کہاں گنجائش ہے۔

(۹) رجم مولاۃ حاطب، اگر اس کی آزادی کے بعد ہوا تو جائز ہوا، اور ممکن ہے آپ کو اس کے کنیز ہونے کی اطلاع نہ ہو۔

(۱۰) آپ کے ساتھ جناب زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کا مناظرہ کرنا اور ایک مسئلہ میں آپ کو الزام دینا جناب امیر رضی اللہ عنہ کی حقارت کا باعث نہیں۔ حق کی پیروی تو اولیا کی شان ہے، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے بارے میں روایت ہے کہ آپ ایک عورت کی بات کے قائل ہو گئے اور برملا یہ الفاظ فرمائے، کُلُّ النَّاسِ اَفْقَهُ مِنْ عُمَرَ حَتَّی الْمُخَدَّرَاتُ فِی الْحِجَالِ۔ (عمر سے تو سبھی لوگ زیادہ سمجھدار ہیں حتیٰ کہ پردہ نشین خواتین بھی)۔

(۱۱) پنچایت کی خلاف ورزی تو اس وقت لازم آتی ہے جب کہ دونوں پنچوں نے غور و فکر کے بعد متفقہ طور پر فیصلہ دے دیا ہو۔ جناب معاویہ رضی اللہ عنہ کے پنچ نے مد مقابل کے پنچ کو گڑبڑا دیا اور اس کو سوچنے کا موقع ہی نہ دیا تو یہ

www.Ahlehaq.com

پنچایت کہاں ہوئی جو اس کی خلاف ورزی کا الزام دیا جائے۔

(۱۲) چور کا ہاتھ انگلیوں کی جڑوں تک کاٹنا یہ جلاد کی غلطی تھی، آپؓ کا حکم نہیں تھا جو آپ کی لاعلمی لازم آئے،

(۱۳) اور بچوں میں باہم ایک دوسرے کی گواہی قبول کرنا جب کہ وہ امور ہی ایسے ہوں جو بچوں میں چلتے رہتے ہیں اب بھی امام مالک رحمہ اللہ علیہ کے یہاں مقبول ہے، اور آیت فاستشھدوا میں بچے داخل نہیں کیونکہ بچوں کے باہم کھیل کود میں بالغوں کی موجودگی نہیں ہوا کرتی اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسا کہ کافروں میں بعض کی گواہی بعض کے لئے مان لی جاتی ہے، لہذا جب یہ مجتہدین کا مسلک ہوا تو طعن کا سوال نہ رہا۔

(۱۴) اور یک چشم کی آنکھ کی آدھی دیت لینا یہ فقیہ کی باریک بینی اور نکتہ رسی ہے کیونکہ کانے کی صرف ایک ہی آنکھ ہے جو دونوں آنکھوں کا کام دیتی ہے۔ لہذا اگر قصاص لینے والے نے اس کی اس آنکھ کو پھوڑا جو دونوں آنکھوں کا کام دیتی تھی تو گویا اس نے اپنے حق سے تجاوز کیا اور ایک زائد آنکھ پھوڑ دی۔ تو اس پر دیت لازم ہو گئی البتہ قرآنی نص العین بالعین کے پیش نظر اس سے قصاص لینا لازم ہو گا۔ لہذا اس جگہ حقیقت اور شبہ حقیقت دونوں پر عمل ہوا اگرچہ یہ کسی مجتہد کا عمل نہیں ہے لیکن قواعد شرعیہ سے اس کے نظائر پیش کئے جا سکتے ہیں، مثلاً زکوٰۃ میں بنت مخاض (ایک سال کی اونٹنی) کی جگہ بنت لبون (دو سال کی اونٹنی) لینا اور بقدر زائد کی قیمت دیدینا جائز ہے،

حاصل کلام یہ کہ اجتہادی مسائل میں کسی پر طعن فضول اور کار بے ثواب ہے!

(۱۵) اور نابالغ بچہ پر اگر پوری حد سرقہ لگانا ثابت بھی ہو تو وہ سیاست خلافت پر مبنی ہو گا حکم شرعی کی بنا پر نہیں بچوں پر گو قلم شرع اٹھا لیا گیا ہے، مگر خلفا کی سیاست اور تادیبی سزا ان پر لاگو ہو سکتی ہے حدیث صحیح موجود ہے کہ اِضْرِبُوْھُمْ عَلَیْھَا وَھُمْ اَبْنَاءُ عَشَرِ سِنِیْنَ۔ (وہ دس برس کے ہوں تو نماز نہ پڑھنے پر انہیں مار لگاؤ)

(۱۶) اور محمد بن بابویہ کی روایت کہ چوری کا اقرار کر لینے والے پر حد نہ لگائی، یا رمضان میں شراب خوری والے پر مقررہ حد سے بیس کوڑے زائد لگائے، ناقابل قبول ہے لہذا اس کے جواب کی چنداں ضرورت نہیں کہ اس کی یہی توجیہ کی جا سکتی ہے کہ یہ زیادتی بر بنائے سیاست تھی!۔

(۱۷) رہا فاحشہ عورتوں کی اجرت کا معاملہ، تو اہل سنت کی کتابوں میں تو اس کا وجود ہے نہیں اس لئے اس کا جواب یہی ہو سکتا ہے کہ یہ روایت جھوٹی ہے جب کہ اہل سنت کے ہاں تو اس کے خلاف ایک صحیح روایت استیعاب میں موجود ہے،

حَدَّثَنَا أَبُو سَلَمَةَ مُوسَى ابْنُ إِسْمَاعِيلَ عَنْ أَبِي عَوَانَةَ عَنْ مُغِيرَةَ عَنْ ثَابِتِ بْنِ هُرْمُزَ قَالَ حَمَلَ الْمُخْتَارُ مَالًا مِنَ الْمَدَائِنِ مِنْ عِنْدِ عَمِّهِ إِلَى عَلِيِّ ابْنِ أَبِي طَالِبٍ فَلَمَّا فَرَغَ أَخْرَجَ كِيسًا فِيهِ خَمْسَةَ عَشَرَ دِرْهَمًا فَقَالَ هَذَا مِنْ أُجُورِ الْمُومِسَاتِ فَقَالَ عَلِيٌّ وَيْلَكَ مَالِي وَلِأُجُورِ الْمُومِسَاتِ ثُمَّ قَامَ الْمُخْتَارُ وَعَلَيْهِ مُقَطَّعَةٌ لَهُ حَمْرَاءُ فَلَمَّا سَلَّمَ قَالَ

ابو سلمہ موسیٰ بن اسمٰعیل نے ابی عوانہ سے، اس نے مغیرہ سے اس نے ثابت بن ہرمز سے روایت کرتے ہوئے کہا کہ مختار (ثقفی) مدائن سے اپنے چچا کے پاس سے کچھ مال لا کر حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے پاس لایا۔ جب مال کی سپردگی سے فارغ ہو گیا تو ایک تھیلی نکالی جس میں پندرہ درہم تھے اور کہنے لگا کہ یہ فاحشہ عورت کی کمائی میں سے ہے جو جناب علیؓ نے فرمایا بیڑا ناس جائے میرا

عَلِيٌّ مَا لَهُ فَقَالَ لَعَنَهُ اللّٰهُ لَوْ شُقَّ عَنْ قَلْبِهِ الْآنَ لَوُجِدَ مَلْآنَ مِنْ حُبِّ اللَّاتِ وَالْعُزّٰى۔ اس کمال سے کیا واسطہ، مختار یہ سن کر اٹھ کھڑا ہوا اس وقت وہ سرخ کپڑا پیٹے ہوا تھا۔ اس نے جب حضرت علی کو رخصتی سلام کیا تو آپ نے فرمایا دیکھو اسے کیا ہو گیا ہے، اس پر اللہ کی پھٹکار ہو، اس وقت اگر اس کا دل چیر کر دیکھا جائے تو وہ لات وعزیٰ کی محبت سے لبریز نظر آئے گا،

لہٰذا معلوم ہوا کہ شیعوں نے جو روایت بیان کی ہے وہ مختار ثقفی کے افتراء اور بہتان پر مبنی ہے جس کو مختار نے ایسا مال ہضم کرنے اور شرمندگی مٹانے کی خاطر گھڑنت کر کے عام لشکریوں اور اپنے پیروکاروں تک پہنچائی اور بالآخر رفتہ رفتہ شہرت پا گئی،

(۱۸) دراہم کے سود کے متعلق صورت یہ ہے کہ وہ دراہم جن میں کھوٹ اتنی زیادہ ہو کہ ان کا چلن بند ہو جائے اور سکہ کی حیثیت ختم ہو جائے، ایسے دراہم (سکوں) کی کمی بیشی کے ساتھ خرید وفروخت شافعیہ کے نزدیک جائز ہے حرام نہیں ہو سکتا ہے کہ جن دراہم میں جناب امیر نے زیادہ کو جائز رکھا ہو، وہ اس قسم میں ہوں، اور حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے ارشاد میں درہم سے مراد وہ ہے جو خالص چاندی کا ہو یا اگر کھوٹ ہو بھی تو اتنی نہ ہو کہ اس کے چلن میں خارج ہو، اور اس کی قیمت کی حیثیت باقی ہو، ۔

(۱۹) اور خطبۃ البیان اور خطبۃ الافتخار کا اہل سنت کی کتابوں میں کوئی وجود نہیں، بلکہ ان کے ہاں یہ موضوعات میں شامل ہیں ان کے راوی امامیہ ہیں اور جھوٹے ہیں لہٰذا ایسی افتراء اور بہتان کی بات کو آڑ بنا کر طعن کرنا پرلے درجہ کی سفاہت اور بے وقوفی ہے اور بالفرض ان کو صحیح مان بھی لیں تو یہ غلبہ حال وسرمستی کی کیفیت ہو گی چنانچہ بعض اوقات اولیاء اللہ پر یہ حالت طاری ہو جاتے ہیں اور ان کے زیر اثر ان کی زبان سے ایسے کلمات کا صدور ہو جاتا ہے اور شرع میں حال کی ایسی مستی اور ایسے غلبہ پر معذور رکھا گیا ہے، توبہ کے سلسلہ میں صحیح حدیث میں اس کی مثال موجود ہے، کہ کوئی بندہ یوں کہہ بیٹھا۔ أَنْتَ عَبْدِيْ وَأَنَا رَبُّكَ - أَخْطَأَ مِنْ شِدَّةِ الْفَرَحِ (تو میرا بندہ میں تیرا رب، خوشی کی شدت میں وہ ایسی غلطی کر بیٹھا)۔

پھر یہ کلام زبان حال کی حکایت ہے جیسے کہتے ہیں، قَالَتِ الْأَرْضُ لِلْوَتَدِ لِمَ تَشُقُّنِيْ قَالَتْ لَا تَسْأَلْنِيْ وَاسْأَلْ مَنْ يَدُقُّنِيْ (زمین نے میخ سے کہا تو مجھے کیوں پھاڑ رہی ہے میخ بولی مجھ سے نہ پوچھ اس سے پوچھ جو مجھے ٹھونک رہا ہے۔

اسی طرح حدیث شریف میں ہے هَلْ تَدْرُوْنَ مَاذَا قَالَ رَبُّكُمْ (کیا تم جانتے ہو کہ تمہارے رب نے کیا کہا؟) یعنی زبان اشارہ سے ورنہ زبان عبادت کا امت کو پتہ ہونا غیر ممکن ہے، کہ وہ اس کو جان سکیں،

(۲۰) اور امارت، اور عہدوں کے لئے ایسے اقارب اور عزیز زیادہ بہتر ہیں جو واجبی اطاعت سے سرمو انحراف نہیں کرتے بہ نسبت ان اجنبیوں اور عزیزوں سے جنکا شعار ہی نافرمانی اور حکم عدولی بن گیا ہو، چنانچہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بھی یہ طرز اختیار فرمایا۔

(۲۱) اور قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ سے قصاص لینے میں دیر، اور پس وپیش اس لیے تھی کہ قاتل کی تعیین نہ ہو سکی تھی اور قاتل کی تفتیش اور سراغ رسانی خلیفہ کے ذمہ نہیں بلکہ وارثوں کے ذمہ ہے،

(۲۱) اور حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کی اہانت مالک اشتر اور اس کے غلاموں نے کی اور کوفہ میں ان کا گھر بغیر امیر رضی اللہ عنہ کے حکم کے جلا ڈالا اور آپ کو اس کی اطلاع تک نہ ہوئی، تاریخ طبری میں یہ واقعہ اسی طرح بیان ہوا ہے اور جناب ابومسعود انصاری رضی اللہ عنہ کی اہانت کا سبب ان کی باغیوں کی طرفداری اور جانبداری تھی۔

(۲۳) اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی شان میں واقعہ کی تسلیم آیت برأۃ نازل ہونے سے پہلے پہلے تھا اور اس میں بظاہر خرابی اس لیے نہیں کہ محض خبر سچ اور جھوٹ دونوں پہلو رکھتی ہے،

(۲۴) اور آپ کا یہ کہنا قَتَلَہُ اللّٰہ وَ اَنَا مَعَہٗ۔ بطور توریہ کے تھا، کہ ضرورت کے وقت آپ اس کو کام میں لائے جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زبان سے حضرت سارہ علیہا السلام کے حق میں ھٰذِہٖ اُختی نکلا۔ اور ضرورت یہ تھی کہ مبادا قاتلان عثمان ؓ لشکر میں بلوہ اور فتنہ و فساد برپا کریں۔ بلکہ خطرہ یہ بھی تھا، کہ خود جناب امیر رضی اللہ عنہ کے ہی قتل کے درپے نہ ہو جائیں،

خلاصہ کلام یہ کہ شیطان نے نواصب اور شیعہ ہر دو کی راہ ماری اور ان کو خدا کے دوستوں کی عیب جوئی کی راہ پہ ڈال دیا جو اس کی عین آرزو اور مقصود و مراد ہے اور یوں اس نے ان کو اپنا آلہ کار بنا لیا جنہیں رسوا کرنا چاہتا ہے اس کا میلان طبع نیک لوگوں پر طعنہ زنی کی طرف کر دیتا ہے،)

امامت کی بحث کا خاتمہ

شیعوں کے تمام فرقوں میں قدر مشترک وہ نکتہ خیال جس پر سب متفق ہیں۔ یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ خلیفہ و امام بلا فصل تھے اور تینوں خلفاء رضوان اللہ علیہم کی خلافت غلط اور بے بنیاد تھی اس قدر مشترک پر اہل سنت کے ساتھ ان کا جو نزاع اور بحث تھی وہ گذشتہ اوراق میں بڑی تفصیل اور واضح انداز میں گزر چکی اور اسی کے ساتھ شیعی فرقوں، ان کی شاخوں بلکہ ڈالیوں نے اس سلسلہ میں کتاب اللہ، عترت رسول اللہ سے جو مخالفت کی ہے وہ بھی وضاحت سے سامنے آچکی۔

لیکن اس قدر مشترک کے باوجود بھی ان کے فرقوں میں باہم بڑے سنگین اختلافات ہیں، حتیٰ کہ بعض نے بعض دوسروں کو کافر و گمراہ تک کہنے میں کوئی باک نہ کیا۔ ایک دوسرے کو طعن کرنا تو معمولی سی بات ہے،

اس کتاب میں اختلافات کا ذکر گو ضروری تو نہ تھا کیونکہ اس کا موضوع شیعہ و سنی کی آپس میں گفتگو و بحث ہے نیز ان کے باہمی اختلاف سے اہل سنت کا کچھ نقصان بھی نہیں لیکن اس نقطہ نظر سے کہ کسی چیز میں زیادہ اختلاف ہونا اس کے جھوٹے ہونے کی دلیل ہے، مسائل شروط امامت، معنی امامت اور تعیین ائمہ میں ان کے اقوال نقل کرنا موزوں و مناسب معلوم ہوتا ہے تاکہ اس مذہب کے جھوٹ ہونے کی علامت مختلف پہلوؤں سے واضح ہو جائیں اور ان کا یہ طعن کہ اہل سنت فقہ میں بہت اختلاف کرتے ہیں، انہیں پر لوٹ جائے کیونکہ ان کا اختلاف تو اصول میں ہے جس سے مذہب کی بیخ و بنیاد ہی منہدم ہو جاتی ہے اور اہل سنت کا اختلاف فروعات میں ہے جو رحمت ہے گزشتہ انبیاء کرام علیہم السلام کے ادیان بھی اصول میں متفق رہے ہیں، گو فروعات میں اختلاف رہا چنانچہ شرع لکم من الدین ما وصی بہ نوحا (الی آخر الآیت) اس پر گواہ ہے

لہٰذا وہ دین جو اپنے اندر اصولی اختلاف رکھتا ہو، ایک کرشمہ ہی ہے جس کی نظیر انبیاء سابق کے ادیان تک میں

نہیں ملتی چہ جائیکہ اسلام میں اس کی گنجائش ہو۔

شروط امامت میں اختلاف: غالی شیعوں کے نزدیک امامت محض اوامر نواہی کے احکام کے اجراء و نفاذ کا نام ہے، شیؤن الٰہیہ میں سے ایک شان۔ ان غلاۃ کے علاوہ باقی فرقے کہتے ہیں کہ امامت دین و دنیا کے امور میں پیغمبر کی نیابت ہے سارے زیدی امام میں عصمت کی شرط کے قائل نہیں، اور اسے بھی ضروری نہیں سمجھتے کہ اس کے لئے کوئی نص وارد ہو،

اور زیدی امام کے لئے افضلیت کو لازم سمجھتے ہیں، بلکہ امامت کی شرطوں میں سے بہترین شرط تلوار تھام کر نکل آنے کو مانتے ہیں اور اپنے سب دعووں کی دلیل پیش کرتے ہیں،

اسمعیلیہ:۔ سب کے سب علاوہ فرقہ نزاریہ کے عصمت کو امامت کے لئے شرط قرار دیتے ہیں نزاریہ اس معاملہ میں خاموش ہیں، نہ انکار کرتے نہ ہاں کہتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ امام کو فروع کے لئے مکلف ہی نہیں کیا گیا وہ جو بھی حرام کاری کرے اسکے لئے سب کی سب جائیز ہیں،

شیخ الطائفہ ابو جعفر طوسی۔ نے اپنے شیخ ابو عبداللہ محمد بن نعمان بغدادی جو شیخ مفید کے لقب سے مشہور ہیں کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ابوالحسن ہارونی، ابتداء میں شیعہ مذہب رکھتے اور امامت کے قائل تھے لیکن امامیہ کے شدید اختلاف کی وجہ سے انہیں راہ ہدایت کا ہی پتہ نہ چل سکا اور انہوں نے ان کی روایات کو آپس میں مختلف متناقض اور متعارض دیکھ کر شیعیت ہی پر تین حرف بھیجے اور توبہ کر کے شافعی مذہب اختیار کر لیا اور وہ لوگ جو آپ کے شاگرد یا صحبت یافتہ تھے۔ اور عمر بھر ان سے استفادہ کرتے رہے تھے، انہوں نے بھی اپنے شیخ کی پیروی میں اس مذہب سے اظہار بیزاری کیا۔

اور حقیقت بھی یہی ہے کہ جو شخص بھی گہرائی میں اتر کر اس مذہب پر نظر ڈالتا ہے اور ان کے اقوال و اخبار کے پریشان کن اختلاف سے آگاہ ہوتا ہے تو اسے یقین ہو جاتا ہے کہ اس مذہب میں راہ نجات ہی غائب ہے اور تعارض کی راہ تنگ اور راہ اخلاص معدوم و مفقود ہے تو مجبور ہو کر اس مذہب کو خیرباد کہتا اور دوسرا کوئی مذہب اختیار کر لیتا ہے،

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے اماموں سے متعارض روایات بیان کرتے ہیں اور ہر امام سے دوسرے کے خلاف بھی روایات لاتے ہیں، بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر ایسی روایات بھی نقل کرتے ہیں جو قرآن و حدیث کے بھی مخالف ہوتی ہیں،

اور اس تعارض و تناقض میں نسخ کا کوئی احتمال ہے ہی نہیں، کیونکہ ایک نبی کے کلام کو دوسرا نبی ہی منسوخ کر سکتا ہے، امام کو یہ حق ہی کہاں ہے وہ خدا اور رسول کے احکام کو منسوخ کر سکے ورنہ امام امام ہی نہ رہے گا کیونکہ وہ تو نبی کا نائب ہے نہ اس کا مخالف ہے نہ مستقل نبی اور بفرض محال نسخ کو مان لیں تو بعد میں آنے والا امام امام اول کے احکام کا ناسخ ہو گا اس صورت میں مدار عمل بعد والے امام کی روایات پر ہو گا حالانکہ اس فرقہ نے امام اول کی روایت پر اجماع کیا ہے،

پھر اس میں ایک بات یہ بھی ہے کہ احکام موبدہ میں جن میں ایک دوسرے سے تاکید ہو نسخ جائز نہیں ورنہ

www.Ahlehaq.com

معصوم کی تکذیب لازم آئے گی۔ حالانکہ ان کی روایات کا اختلاف احکام مویدہ میں بھی چلتا ہے لہذا نسخ کا احتمال سرے سے زائل ہوگیا۔

اور رہی یہ بات کہ رواۃ کے وثوق کے اعتبار سے ایک خبر کی دوسری خبر پر ترجیح کا معاملہ تو اس کا تو راستہ ہی بند ہے۔ کیونکہ انہوں نے چند کتابوں کو کتب سماوی سمجھ رکھا ہے اگر کوئی ان میں سے ایک روایت لاتا ہے تو دوسرے کے نزدیک اس کی حیثیت خاک کے برابر ہے،

لہذا اگر ان کے عوام کے نقطہ نظر سے سبھی کو قابل وثوق سمجھ لیں تو ایک کو دوسری پر ترجیح کس طرح دے سکیں گے اور اگر بعض راویوں کے اقوال کو بعض دوسروں کے مقابلہ میں قبول کر کے دوسروں پر طعن و تشنیع اور جرح شروع کر دیں تو سارے کے سارے مجروح ہو کر رہ جائیں گے اور اس صورت میں ترجیح کی کوئی شکل بھی متصور نہیں تو پھر ساری روایات ساقط اور ناقابل عمل ہو کر احکام معطل اور بیکار ہو کے رہ جاتے ہیں،

اس قسم کی روایات ان کے ایک فرقہ اثنا عشریہ کی ہیں کہ ان کا ہر عالم ایک ایسی روایت بیان کرتا ہے جو دوسرے کی روایت سے ٹکراتی ہے مثلاً ایک جماعت بطریق صحیح یہ روایت بیان کرتی ہے کہ اَلْمَذِیُّ لَا یَنْقُضُ الْوُضُوْءَ۔ مذی وضو نہیں توڑتی) تو دوسری جماعت صحیح سند سے یوں بیان کرتی ہے کہ (اَلْمَذِیُّ یَنْقُضُ الْوُضُوْءَ۔ مذی وضو توڑ دیتی ہے) ایک جماعت کہتی ہے کہ نماز میں سجدہ سہو واجب نہیں تو دوسری روایت کرتی ہے کہ سجدہ سہو واجب ہے اور ائمہ نے سجدہ سہو کیا ہے، بعض کہتے ہیں کہ شعر خوانی سے وضو ٹوٹ جاتا ہے، تو بعض کہتے ہیں کہ وضو نہیں ٹوٹتا،

ایک جماعت کہتی ہے کہ بحالت نماز ڈاڑھی یا دیگر اعضا بدن سے کھیلنا نماز میں خرابی پیدا نہیں کرتا تو دوسری جماعت یہ روایت کرتی ہے کہ عضو مخصوص اور اس کے معلقات سے کھیلنا بھی نماز میں جائز ہے، اور یہ حالت دو چار اخبار ہی میں نہیں تمام اخبار (روایات) میں ہے۔ چنانچہ ان کی کتاب مَنْ لَّا یَحْضُرُہُ الْفَقِیْہُ اس پر گواہ ہے،

اور اگر شیعوں کے تمام فرقوں کی روایات و اخبار پر نظر ڈالیں تو ان کے تمام اصول و فروع میں بے ربطی اور گڑبڑ کا ایسا طوفان امڈتا دکھائی دیتا ہے جس کی کوئی حد و انتہا نہیں ان کے بعض علماء نے ان سب روایات کو یکجا کرنے کی کوشش کی ہے تو انہوں نے درحقیقت عجیب جادوگری دکھائی ہے ان میں سب کا پیشوا اور سردار شیخ للسائفہ محمد بن الحسن الطوسی ہے جو تہذیب واستبصار کا مصنف ہے، اس کی کوشش کی یہی معراج ہے کہ وہ ان کو تقیہ پر محمول کر گیا ہے کہ وہ مخالفین میں سے کسی کا مذہب نہیں ہے یا اگر ہے تو ضعیف کہ ایک دو آدمیوں سے زائد کسی نے اسے اختیار نہیں کیا۔

ظاہر ہے کہ ائمہ عظام اس قدر بزدل اور خوفزدہ تو نہ تھے کہ صرف اس وہم و شبہ کی وجہ سے کہ شاید کوئی یہ مذہب رکھتا ہو اور اس وقت موجود بھی ہو اپنی عبادت کو باطل و خراب کر دیں ان ائمہ اور اولیاء کے متعلق ایسی بدعقیدگی کے تصور سے بھی خدا کی پناہ!

اور پھر بعض جگہ خبر روایت کے ایک جملہ کو تقیہ پر محمول کیا ہے اور دوسرے جملہ کو کہ وہ بھی اہل سنت کے مذہب کے خلاف ہے جوں کا توں چھوڑ دیا ہے اگر یہی تقیہ ہے تو پھر یہ کیسا تقیہ ہے کہ ایک جملہ میں تقیہ ہے اور دوسرا جملہ صاف صاف اور کھلم کھلا۔ کیا یہ اپنے ائمہ کو عقل سے کورا ہی سمجھتے ہیں اس کی مثال حضرت علی کی یہ روایت ہے،

www.Ahlehaq.com

اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَمَرَ بِغَسْلِ الْوَجْہِ مَرَّتَیْنِ وَبِتَخْلِیْلِ اَصَابِعِ الرِّجْلَیْنِ عِنْدَ غَسْلِہِمَا۔

نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے آپ کو منہ دو مرتبہ دھونے کا حکم دیا اور پاؤں دھوتے وقت ان میں انگلیوں سے خلال کرنے کا۔

حالانکہ منہ کا دو مرتبہ دھونا نہ شیعوں کا مذہب ہے نہ سنیوں کا۔ کیونکہ (بطور سنت) دونوں کا تین مرتبہ دھونے پر اجماع ہے اور پاؤں کا دھونا سنی مذہب کے موافق ہے، شیعوں کے نزدیک تو مسح کرنا ان کا مذہب ہے لہذا اس حدیث میں تقیہ و اظہار دونوں کا جمع کرنا لازم آیا۔

بعض جگہ ایسی رکیک اور پوچ تاویلات کرتے ہیں کہ امام کے کلام فصیح و بلیغ کو بازاریوں کے مہمل اور لغو کلام کی حد تک پہنچا دیتے ہیں۔

اسی قسم کی ایک وہ تاویل ہے جو یہ جناب سجاد رحمہ اللہ علیہ کے کلام میں کرتے ہیں، جب کہ آپ دعا فرما رہے ہیں اِلٰہِیْ عَصَیْتُ وَظَلَمْتُ وَتَوَانَیْتُ۔ (میرے اللہ میں نے نافرمانی کی ظلم کیا اور سستی کی) یہاں یہی دعا ان کی کتابوں میں دوسرے ائمہ سے بھی مروی ہے، اب یہ روایات خواہ سچ ہوں یا جھوٹ ہر صورت عصمت کے خلاف ہیں، پھر یہ تقیہ کا موقع بھی نہیں۔ کیونکہ یہ معاملہ تو اس ذات کے ساتھ مناجات کا ہے، جو ہر ظاہر و پوشیدہ بات کو جاننے والی ہے،

اب اس دعا میں ان کی تاویل دیکھئے یہ کہتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ۔

اِلٰہِیْ اِنَّ شِیْعَتَنَا عَصَوْا وَظَلَمُوْا وَتَوَانَوْا لٰکِنَّ رَضِیْنَا بِہِمْ شِیْعَۃً وَرَضُوْا بِنَا اَئِمَّۃً فَحَالُنَا حَالُہُمْ وَحَالُہُمْ حَالُنَا۔

اے میرے اللہ! ہمارے شیعوں نے نافرمانی کی اور ظلم کیا اور سستی کی لیکن ہم ان کے شیعہ ہونے پر راضی ہیں اور وہ ہمارے امام ہونے میں راضی ہیں، پس ہمارا حال ان کا حال ہے اور ان کا حال ہمارا حال ہے،

اس یگانگت و اتحاد کے کیا کہنے۔ اگر شیعوں اور ائمہ میں اس قسم کی یگانگت و اتحاد ثابت ہے تو شیعوں کی نافرمانی ظلم اور سستی تو ائمہ میں اثر کر گئی مگر ائمہ کا عدل، طاعت، عبادت و قنوت شیعوں پر مطلق اثر نہ کر سکی گویا شیعوں کے احکام تو ائمہ پر غالب آگئے مگر ائمہ کے احکام شیعوں پر بے اثر رہے، کوئی حد ہے اس بدعقیدگی کی۔ عرب و عجم کے محاورات میں اس قسم کی لغو تاویل کی کوئی نظیر ڈھونڈنے سے بھی نہ ملے گی،

پھر باعتبار فن نحو اس میں جو رکاکت ہے وہ بھی پوشیدہ نہیں کہ واحد متکلم کی تاء کو جمع پر محمول کیا اور متکلم کو غائب پر! اور متکلم کا غیر کے فعل کو اپنی طرف منسوب کرنا بھی لازم آیا بغیر کسی وجہ تعلق سببیت وغیرہ کے! اور ایسے لغو و فاسد کلام کو ایسے لوگوں کی طرف منسوب کیا جا رہا ہے جو بلاغت کی انتہا پر پہنچے ہوئے تھے،

اور پھر اس کی کیا ضرورت پیش آئی کہ اپنی ذات مقدس کو اس نسبت سے آلودہ کیا ظلم و عصیان کی نسبت براہ راست ان شیعوں ہی کی طرف کیوں نہ کی۔ اور جو ان کی عصمت کے منکر تھے ان کے لئے اپنے ہاتھوں یہ دستاویز کیوں مہیا کی اور خواہ مخواہ زائد ضرورت کلمات کہہ کر بہت بڑی جماعت کی گمراہی کا سبب کیوں بنے۔

اور پھر اسلام کے صدر اول اور ابتدائی صدیوں میں فروعی مسائل میں کافی سخت اختلافات رونما ہوئے خود اہل سنت میں بھی فروعی مسائل میں باہم یکدگر خاصے اختلافات تھے مگر فروعی مسائل کے اس اختلاف کو کسی نقصان کا سبب نہیں

Www.Ahlehaq.com

سمجھا۔ نہ اس کے باعث آپس میں طعن و عتاب اور سب و شتم سے کام لیا زبانی گفتگوؤں اور بحث و مناظرہ کا البتہ رواج رہا ہر شخص اپنا مذہب ظاہر کرتا اور اس پر دلائل قائم کرتا ۔ عہد صحابہ سے لے کر عباسی دور تک آپس کی یہ مناظرہ بازی اور باہم چوٹیں چلتی رہیں، ہر مسئلے پر بال کی کھال نکالتے اور دھڑلے سے اجتہاد کرتے مسائل استنباط کرتے اپنے اقوال کی ترجیح کے دلائل ثابت کرتے اور فریق ثانی کے قول کو ضعیف و کمزور بتاتے ۔ ایسے ماحول میں یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ ائمہ کرام کو تقیہ کرنے کی ضرورت کیوں پڑی ، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ احکام کو ظاہر کرنے سے کیوں پہلو تہی کی، حالانکہ خود حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خلیفہ دوم و سوم کے عہد میں امہات اولاد، حج تمتع اور دوسرے مسائل پر کافی زوردار بحث کی اور جانبین میں خاصی سختی و درشتی کی نوبت بھی آئی، مگر اس کے باوجود کسی نے بھی جدل و نزاع نہیں کیا خصوصاً خلیفہ دوم کہ ان کو تو شیعہ بھی اس معاملہ میں بہت نرم مزاج اور قبول حق میں فراخدل مانتے ہیں، ان کے سامنے قرآن و سنت سے جو بھی دلیل پیش کی جاتی بلا کسی پس و پیش کے قبول فرماتے خواہ کی بات تو رہی الگ عام مسلمانوں میں ایک عورت نے ایک مسئلہ میں جب معقول بات کہی تو آپ نے نہ صرف اسے تسلیم کیا بلکہ یہ الفاظ فرمائے کل الناس افقہ من عمر حتی المخدرات (ہر آدمی عمرؓ سے زیادہ دین کی سوجھ بوجھ رکھتا ہے حتیٰ کہ پردہ نشین مستورات بھی)

ایسے حالات میں جناب امیر رضی اللہ عنہ تقیہ کیوں فرماتے اور وہ بھی فروعی مسائل میں اور منزل من اللہ کے اظہار سے جو آپ پر واجب تھا کیوں باز رہتے ،

اسی طرح بعد میں آنے والے ائمہ مثلاً جناب سجاد، باقر، صادق، کاظم اور رضا رحمہم اللہ علیہم اجمعین جو علماء اہل سنت مثلاً زہری امام ابو حنیفہ، امام مالک رحمہم اللہ کے مقتدا و پیشوا رہ چکے ہیں ، اور ان ہی بزرگوں سے ان حضرات کو تلمذ و شاگردی کا اعزاز بھی حاصل رہا اور اس وقت کے صوفیائے کرام مثلاً معروف کرخی رحمہ اللہ وغیرہ نے آنجناب ہی کے فیض سے خوشہ چینی کی ہے ، اور مشائخ طریقت نے ان ہی کے سلسلہ کو سلسلۃ الذہب کہا ہے اور پھر محدثین اہل سنت نے انہیں بزرگوں سے ہر فن خصوصاً تفسیر، سلوک اور حدیث میں دفتر کے دفتر روایت کئے ہیں تو کیا ایسے حالات میں ان محترم ائمہ کرام کے لئے یہ احتمال باقی رہتا ہے کہ یہ اپنے معتقدین شاگردوں اور عقیدتمندوں سے ڈر گئے ہوں اور ان سے تقیہ کیا ہو،

اگر ایسے لوگوں سے تقیہ کیا جا سکتا ہے تو پھر رجال شیعہ سے تو بدرجہ اولیٰ تقیہ کرنے کا احتمال ہونا چاہیئے

دیکھئے زور بیان میں ہم کہاں سے کہاں نکل گئے، بات یہ چل رہی ہے کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ کے بعد امامیہ اور شیعوں کے دوسرے فرقوں میں اصل امامت کے سلسلہ میں اتنا شدید اختلاف ہے جس کی نہ کوئی حد ہے نہ انتہا۔ اور یہی اختلاف آگے چل کر روایات کے اختلاف کی صورت میں ظاہر ہوا خیر آمدم برسر مطلب۔

واضح رہے کہ اسمٰعیلیہ کے تینوں فرقوں کی طرح امامیہ بھی ائمہ کی تعداد کو خاص تعداد کے ساتھ محدود کرتے ہیں، مگر اس حد تعداد میں بھی باہم مختلف ہیں، بعض یہ تعداد پانچ کہتے ہیں اور بعض سات بتاتے ہیں، بعض دوسرے آٹھ اور بعض بارہ کے قائل ہیں، تو بعض تیرہ کے غلاۃ ائمہ کی اور ہی بیت مانتے ہیں ان میں پہلا نام حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا پھر حضرت علی، حسن، حسین رضی اللہ عنہم کا پھر ان کی اولاد میں جو نیک بخت ہوں جناب جعفر بن محمد رحمہ اللہ تک گویا یہ سب چھوٹے خدا ہیں اور دوسرے خداؤں کو ختم کرنے والے پھر ان کی اولاد میں جو نیک بخت ہو وہ ان کا جانشین و نائب ہے ،

غلاۃ ہی کا ایک فرقہ کہتا ہے کہ اس امت میں امام صرف دو ہیں ۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم اور حضرت علی رضی اللہ عنہ

پھر حضرت علی رضؓ کی اولاد میں جو نیابت کے لائق ہو وہ آپ کا نائب اور جانشین ہے،

حلولیہ :- کہتے ہیں کہ امام وہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ حلول کرے، ان کا اختلاف باب اول میں مذکور ہوا۔

کیسانیہ :- حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت علی رضؓ کو امام مانتے ہیں پھر محمد بن الحنفیہ رحؒ کو۔

کیسانیہ ہی کی شاخ مختاریہ، اس کے قائل ہیں کہ حضرت علی کے بعد حضرت حسن امام ہیں پھر حضرت حسین رضی اللہ عنہ، پھر ان کے بعد محمد بن الحنفیہ۔

ان میں سے ہر فرقہ اپنے تسلیم کردہ امام سے احکام شرعیہ میں احادیث و روایات نقل کرتا ہے، اور ان سب کے متواتر ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔

کیسانیہ کا پہلا فرقہ کہتا ہے کہ جناب محمد بن الحنفیہ نے اپنے والد کی وفات کے بعد امامت کا دعویٰ کیا اور ان کے والد ان کی امامت کا حکم دے گئے تھے۔

اسی کیسانیہ کا دوسرا فرقہ مختاریہ کہتا ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد محمد بن علیؒ نے امامت کا دعویٰ کیا۔ اور ان سے متعلق بہت سی خرق عادات بیان کرتے ہیں جو انہوں نے اپنے دعویٰ کی تائید میں پیش کیں۔

اور سارے امامیہ کہتے ہیں کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے بعد بے شک محمد بن علی رحؒ نے امامت کا دعویٰ کیا لیکن آخر میں اپنے دعویٰ سے رجوع فرما کر اپنے بھتیجے جناب زین العابدین کی امامت کے قائل ہو گئے،

راوندی نے جناب سجاد کے معجزات کے بارے میں حسین بن ابی العلاء اور ابی المعز حمید بن المثنیٰ ہر دو سے روایت کی ہے، یہ روایت انہوں نے ابی بصیر سے اور اس نے ابی عبد اللہ رحؒ سے بیان کی کہ وہ فرماتے ہیں،

جَاءَ مُحَمَّدُ بْنُ الْحَنَفِيَّةِ اِلٰى عَلِيِّ بْنِ حُسَيْنٍ
فَقَالَ يَا عَلِيُّ اَلَسْتَ تُقِرُّ اَنِّيْ اِمَامٌ عَلَيْكَ
فَقَالَ يَا عَمِّ لَوْ عَلِمْتُ ذٰلِكَ مَا خَالَفْتُكَ
وَاِنَّ طَاعَتِيْ عَلَيْكَ وَعَلَى الْخَلْقِ مَفْرُوضَةٌ يَا عَمِّ
اَمَا عَلِمْتَ اَنِّيْ وَصِيٌّ وَابْنُ وَصِيٍّ وَتَشَاجَرَا
سَاعَةً فَقَالَ عَلِيُّ بْنُ الْحُسَيْنِ بِمَنْ تَرْضٰى حَتّٰى يَكُوْنَ
بَيْنَنَا حَكَمًا فَقَالَ مُحَمَّدٌ بِمَنْ شِئْتَ فَقَالَ اَتَرْضٰى
اَنْ يَكُوْنَ بَيْنَنَا الْحَجَرُ الْاَسْوَدُ فَقَالَ سُبْحَانَ
اللّٰهِ اَدْعُوْكَ اِلَى النَّاسِ وَتَدْعُوْنِيْ اِلٰى حَجَرٍ لَا
يَتَكَلَّمُ فَقَالَ عَلِيٌّ بَلٰى يَتَكَلَّمُ اِنَّهُ يَاْتِيْ يَوْمَ
الْقِيٰمَةِ وَلَهُ عَيْنَانِ وَلِسَانٌ وَشَفَتَانِ يَشْهَدُ
عَلٰى مَنْ اَتَاهُ بِالْمُوَافَاةِ فَنَدْنُوْ اَنَا وَاَنْتَ
فَنَدْعُو اللّٰهَ عَزَّ وَجَلَّ اَنْ يُّنْطِقَهُ اللّٰهُ اَيُّنَا

ترجمہ :- محمد بن حنفیہ علی بن حسین کے پاس آئے اور کہا کہ اے علی کیا تم میری امامت کا اقرار نہیں کرتے۔ وہ بولے چچا جان میں اگر صحیح جانتا تو آپ کی مخالفت کیوں کرتا بلکہ (صورت یہ ہے کہ) آپ پر اور تمام مخلوق پر میری اطاعت فرض ہے چچا جان آپ کو پتہ نہیں کہ میں وصی بھی ہوں اور وصی کا بیٹا بھی غرض کچھ دیر کی بحثا بحثی کے بعد علی بن حسین نے کہا کہ تم کس ثالث کو پسند کرو گے وہ ہمارے درمیان ثالثی کرے محمد نے کہا جسے آپ پسند کریں علی نے کہا کہ کیا تم اس پر راضی ہو کہ حجر اسود ہمارا ثالث ہو محمد نے جواب دیا۔ سبحان اللہ میں آپ کو لوگوں کی طرف بلاتا ہوں اور آپ مجھے پتھر کی ثالثی پر بلاتے ہیں، جو بول نہیں سکتا علی نے کہا بے شک وہ بولے گا،

حُجَّةُ اللّٰهِ عَلٰی خَلْقِهٖ فَانْطَلَقَا وَصَلَّيَا عِنْدَ مَقَامِ اِبْرَاهِيْمَ وَدَنَوَا مِنَ الْحَجَرِ الْاَسْوَدِ وَقَدْ قَالَ مُحَمَّدُ ابْنُ الْحَنَفِيَّةِ لَئِنْ لَّمْ يُجِبْكَ اِلٰی مَا دَعَوْتَنِيْ اِلَيْهِ اِنَّكَ اِذًا لَمِنَ الظَّالِمِيْنَ فَقَالَ لِمُحَمَّدٍ يَا عَمِّ تَقَدَّمْ اِلَيْهِ فَاِنَّكَ اَسَنُّ مِنِّيْ فَقَالَ مُحَمَّدٌ لِلْحَجَرِ اَسْأَلُكَ بِحُرْمَةِ اللّٰهِ وَحُرْمَةِ رَسُوْلِهٖ وَحُرْمَةِ كُلِّ مُؤْمِنٍ اِنْ كُنْتَ تَعْلَمُ اَنِّيْ حُجَّةٌ عَلٰی عَلِيِّ بْنِ الْحُسَيْنِ فَانْطِقْ بِالْحَقِّ وَبَيِّنْ لَنَا فَلَمْ يُجِبْهُ ثُمَّ مُحَمَّدٌ قَالَ لِعَلِيٍّ تَقَدَّمْ فَاسْأَلْهُ فَتَقَدَّمَ عَلِيٌّ فَتَكَلَّمَ بِكَلَامٍ خَفِيٍّ ثُمَّ قَالَ اَسْأَلُكَ بِحُرْمَةِ اللّٰهِ وَحُرْمَةِ رَسُوْلِهٖ وَحُرْمَةِ اَمِيْرِ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلِيٍّ وَبِحُرْمَةِ الْحَسَنِ وَالْحُسَيْنِ وَفَاطِمَةَ بِنْتِ مُحَمَّدٍ اِنْ كُنْتَ تَعْلَمُ اَنِّيْ حُجَّةُ اللّٰهِ عَلٰی عَمِّيْ فَانْطِقْ بِذٰلِكَ وَبَيِّنْ لَهٗ حَتّٰی يَرْجِعَ عَنْ رَأْيِهٖ فَقَالَ الْحَجَرُ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ يَا مُحَمَّدُ بْنُ عَلِيٍّ اِسْمَعْ وَاَطِعْ لِعَلِيِّ بْنِ الْحُسَيْنِ اِنَّهٗ حُجَّةُ اللّٰهِ عَلَيْكَ وَعَلٰی جَمِيْعِ خَلْقِهٖ فَقَالَ ابْنُ الْحَنَفِيَّةِ عِنْدَ ذٰلِكَ سَمِعْتُ وَاَطَعْتُ وَسَلَّمْتُ۔

قیامت کے دن اسکی دو آنکھیں ہوں گی ایک زبان اور دو ہونٹ وہ اس کے متعلق گواہی دے گا جو اچھے خاتمہ کے ساتھ اسکے پاس آئے گا لہذا میں اور تم اسکے پاس چلتے ہیں وہاں اللہ تعالےٰ سے دعا کرینگے کہ وہ گویا ہو کر بتائے کہ ہم میں کون اللہ کی مخلوق پر اللہ کی حجت ہے، چنانچہ دونوں گئے دونوں نے مقام ابراہیم پر دوگانہ ادا کیا اور پھر حجر اسود کے قریب گئے محمد بن حنفیہ یہ کہہ چکے تھے کہ تم مجھے جسکے پاس لے جا رہے ہو وہ نہ بولا تو تم ظالم قرار پاؤ گے پھر علی نے کہا چچا جان پہلے آپ اسکی طرف بڑھیے کہ آپ باعتبار عمر مجھ سے بڑے ہیں چنانچہ محمد نے حجر اسود سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ میں اللہ و رسول اور ہر مومن کی حرمت کو واسطہ ٹھہرا کر تجھ سے پوچھتا ہوں کہ اگر تو جانتا ہے کہ میں علی بن حسین پر حجت ہوں تو حق بات کہہ اور ہمیں ثابت کر دکھا کہ کون اللہ کی حجت ہے، پھر محمد نے علی سے کہا کہ اب تم آگے بڑھو اور اس سے پوچھو چنانچہ علی نے آگے بڑھ کر پہلے تو کچھ آہستہ سے کہا پھر کہا کہ میں اللہ رسول اللہ امیر المومنین علی حسن حسین اور فاطمہ بنت محمد کی حرمت کا واسطہ دیکر تجھ سے پوچھتا ہوں کہ اگر تو جانتا ہے کہ میں اپنے چچا پر اللہ کی حجت ہوں تو ان کو بتا، اور ثابت کر دکھا تاکہ وہ اپنی رائے سے رجوع کریں پس اس وقت حجر اسود بزبان عربی صاف طور پر گویا ہوا کہ اے محمد بن علی سنو اور علی بن حسین کی اطاعت کرو کیونکہ وہ تم پر اور اللہ کی سب مخلوق پہ اللہ کی حجت ہیں تب محمد بن حنفیہ بول اٹھے میں نے سن لیا اور اور میں نے اطاعت کی اور میں نے یہ بات تسلیم کرلی،

کیسانیہ اس دعوے کی تو تصدیق کرتے ہیں مگر شہادت کا انکار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ شہادت اس کے الٹ تھی کہ کہ حجر اسود نے محمد بن حنفیہ کے حق میں ان کی دعا پر گواہی دی تھی، اور علی بن حسین نے محمد کی امامت مان لی تھی نیز کہتے ہیں کہ علی بن حسین کا طرز عمل اسپر سچا گواہ ہے، کہ اس کے بعد وہ امامت کا نام تک اپنی زبان پر نہ لائے اور مکمل خاموشی اختیار کرلی، اور اس سکوت کے امامیہ بھی قائل ہیں،

محمد بن حنفیہ نے مختار ثقفی اور کوفہ کے شیعوں سے جو اس وقت مرادانیوں سے نبرد آزما تھے خط وکتابت کا رابطہ قائم کیا چنانچہ انہوں نے بھی آپ سے تعلقات استوار کر لئے، علی سے رابطہ و میل ملاپ نہیں رکھا حالانکہ دونوں ایک جگہ ہی شہر مدینہ منورہ میں سکونت پذیر تھے،

اور پھر کوفہ میں شیعوں کے نذرانے بھی محمد کو ہی پہنچائے جاتے نہ کہ علی بن حسین رضی اللہ عنہ کو، اور نہ ہی شیعان کوفہ علی کو اپنے پاس بلاتے تھے!

قاضی نور اللہ شوشتری نے مجالس المومنین میں لکھا ہے کہ جب محمد بن الحنفیہ نے وفات پائی تو ان کے شیعوں نے ان کے صاحبزادے ابوہاشم کی امامت کو تسلیم کیا۔ جو بڑے مرتبہ والے تھے۔ اور شیعہ پہلے ہی سے ان کے معتقد تھے اور مطیع و فرمانبردار تھے۔ خود محمد بن الحنفیہ نے ان کی امامت کے لئے وصیت کی تھی۔

اس سے یہ حقیقت ظاہر ہوئی کہ محمد بن الحنفیہ اپنے دعوے سے آخر تک نہیں پھرے تھے، اسی لئے امامت اپنے خاندان کے سپرد کی۔

قاضی نور اللہ نے محمد بن الحنفیہ رحمۃ اللہ علیہ کا وہ خط بھی نقل کیا ہے جو انہوں نے مختار اور کوفہ کے شیعوں کو لکھا تھا، جسکی عبارت کچھ یوں تھی۔

"اے مختار! مکہ سے کوفہ جا۔ اور ہمارے شیعوں سے کہہ کہ امام حسین (رضی اللہ عنہ) کے خون کا بدلہ لینے کے لئے نکل کھڑے ہوں اور کوفیوں سے (ہماری) بیعت لے"۔

کہتے ہیں کہ جب مختار نے یہ خط کوفیوں کو دکھایا تو کوفہ کے اکثر لوگ سلیمان سے برگشتہ ہو کر منہ موڑ گئے۔ سلیمان نے اپنے شیعوں سے کہا ٹھیک ہے تم بے شک محمد بن الحنفیہ کی حمایت میں خروج کرو کوئی مضائقہ نہیں مگر ہمارے امام تو علی بن حسین رحمۃ اللہ علیہ ہی ہیں۔

لہٰذا کوفیوں کا سلیمان سے برگشتہ ہونا یہ ثابت کرتا ہے کہ محمد بن الحنفیہ رحمۃ اللہ علیہ اپنے دعویٰ سے دست بردار نہیں ہوئے تھے۔

اور قاضی نور اللہ، ابوالموید خوارزمی سے بھی جو زیدی فرقہ سے تعلق رکھتا تھا یہ روایت بیان کرتا ہے کہ مختار ثقفی نے امرائے شام کے سر فتح کی خوشخبری اور تیس ہزار دینار کے ساتھ محمد بن الحنفیہ ہی کے پاس بھیجے تھے نہ کہ جناب زین العابدین رحمۃ اللہ علیہ کے پاس۔ اور انہوں نے اس فتح کی نعمت کی شکر گذاری میں دوگانہ ادا فرمایا اور شامیوں کے سروں کو سرعام لٹکانے کا حکم دیا۔ مگر جناب ابن زبیر رضی اللہ عنہ نے ان کو اس سے منع کیا اور فرمایا ان کو دفن کرادو!

اس واقعہ سے یہ بات بالکل عیاں ہو گئی کہ مختار محمد بن علی رحمۃ اللہ علیہ کی امامت کا معتقد تھا۔ اس لئے اس کو اس وقت کوئی خوف و خطرہ نہ تھا، کہ وہ دل سے تو جناب سجاد رحمۃ اللہ علیہ کی امامت کا معتقد ہوتا اور کسی ضرورت کے تحت بطور تقیہ جناب محمد بن علی رحمۃ اللہ علیہ کو امام کہتا۔ اب ذرا قاضی نور اللہ کا ایک دوسرا بیان دیکھئے، اور غور فرمایئے کہ اس سے مدعا کیا برآمد ہوتا ہے، وہ مختار کا حال لکھتے ہوئے علامہ حلی کے حوالے سے کہتا ہے کہ شیعوں کو مختار کی حسن عقیدت میں تو کوئی کلام نہیں، البتہ اس کے بعض ناشائستہ اعمال ان کو قابل اعتراض لگے تو انہوں نے اس کو اعتراضات و مذمت اور سب و شتم کا ہدف بنایا۔ اس کی خبر جب جناب باقر رحمۃ اللہ علیہ کو ملی تو آپ نے مختار پر اعتراضات کرنے سے شیعوں کو منع کر دیا اور کہا کہ اس نے ہمارے قاتلوں کو موت کے گھاٹ اتارا، اور ہمیں روپیہ پیسہ بھی بھیجا"۔

یہاں عقلمندوں کو غور کرنے سے اس نتیجہ پر پہنچنے میں کوئی دقت نہیں! کہ اس کا واضح اور صاف مطلب یہی ہے کہ اگر کوئی امام وقت کا منکر ہو تو یہ مناسب نہیں کہ اس کی دیگر خدمات اور خاندان سے دلی محبت کو نظر انداز کر کے اس کو برا بھلا کہا جائے۔

اب رہیں اس کی ذاتی بداعمالیاں جو اس سے سرزد ہوتی رہی ہیں، تو ان کی پردہ پوشی ہی طریق احسن ہے۔ اس نتیجہ سے پیش نظر رکھنے والی بات یہ ہے کہ اہل سنت کا بھی تو یہی مذہب ہے وہ بھی حضرت معاویہ اور حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما کے متعلق یہی کہنا چاہتے ہیں کہ گو وہ امام وقت کی امامت کے منکر تھے مگر بایں ہمہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت رکھتے تھے۔ اللہ و رسول کے دشمنوں کے

قلع وقمع کی خاطر مصروف جہاد رہتے تھے ۔ اللہ کے نام کا بول بالا کرنا ان کی زندگی کا مقصد تھا۔ رسول اللہ کے اہل بیت کی روپیہ پیسہ سے اعانت کرتے تھے ۔ حضرات حسنین رضی اللہ عنہما کو داد دہش میں کبھی دریغ نہیں کیا ۔ تو ان پر زبان درازی کا کیا جواز رہا ۔

بات بہت دور نکل گئی ۔ اور بات سے بات نکل آئی ۔ تو ہم کہہ رہے تھے کہ کیسانیہ ان شواہد و دلائل کی بنا پر یہ ماننے کے لئے تیار نہیں کہ جناب محمد بن علی الحنیفہ رحمہ اللہ علیہ دعوائے امامت سے پھر گئے تھے ۔ واللہ اعلم بحقیقۃ الحال ۔

کیسانیوں نے جناب محمد بن علی کی کرامات کا اتنا طومار روایت کیا ہے کہ جو حدود و تصورات سے بھی ماورای ۔ اور قیاس و عقل سے بھی باہر ہیں ، اور پھر ان سب کو متواتر بھی خیال کرتے ہیں ۔ وہ یہ بات بھی کہتے ہیں کہ جناب محمد بن علی کے بعد آپ ہی کی ہدایت و حکم سے آپ کے بیٹے ابو ہاشم امام ہوئے ۔ البتہ ان کے بعد باہم اختلاف ہو گیا کہ کون امام ہے ، یہ سب تفصیلات باب اول میں بیان ہو چکیں ۔

زیدیہ فرقہ کہتا ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے بعد زید بن علی بن حسین (رضی اللہ عنہم) امام ہوئے ۔ وہ علی بن حسین رحمہا اللہ کی امامت کے قائل نہیں ۔ ان کے نزدیک تو " ملے سو میر " کے مصداق جو تلوار لے کر میدان میں آجائے وہی امام ہے ، یہی ان کے ہاں شرط امامت ہے ۔ سکوت اور تقیہ چونکہ اس کے خلاف ہے ، اسلئے وہ کسی گوشہ نشین ، اور تقیہ پر عامل کو امام تسلیم نہیں کرتے ۔

نیز وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ جناب زید اپنے باپ ، دادا ، اور جناب امیرالمومنین رضی اللہ عنہم سے اپنی امامت کے متعلق نصوص اور بشارات بھی نقل کیا کرتے تھے ۔ ان میں سے بعض روایات کو وہ متواتر بھی بتلاتے ہیں ۔

جناب زید بن علی رحمۃ اللہ علیہ امامیہ کے تمام معتقدات سے انکار اور ان کی تردید کیا کرتے تھے اور اس انکار کی روایات امامیہ اور خود زیدیہ بھی نقل کرتے ہیں ۔ ہشام کے قصہ میں بحوالہ کلینی اس کی نقل اوراق ماسبق میں بیان ہو چکی ہے ۔ باقریہ فرقہ کا یہ اعتقاد ہے کہ امام باقر کی جہدی موعود ہیں ۔ وہ حی لایموت ہیں اور نظروں سے اوجھل ہیں ۔

ناوسیہ فرقہ یہی اعتقاد جناب جعفر صادق رحمہ اللہ علیہ کی نسبت رکھتے ہیں ، اور آپ سے یہ متواتر روایت نقل کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا ۔

لَوْ رَأَيْتُمْ رَأْسِيْ تَدَهْدَهُ عَلَيْكُمْ مِنْ هٰذَا الْجَبَلِ فَلَا تُصَدِّقُوْهُ فَإِنَّ صَاحِبَكُمْ صَاحِبُ التِّنِيْنَ ۔

اگر تم میرے سر کو اس پہاڑ سے لڑھکتا ہوا اپنے پاس آتا دیکھو تو بھی اس کی موت کا یقین نہ کرو کیونکہ تمہارا صاحب (سردار ۔ امام) بہت طویل عمر والا ہے ۔

اسمعیلیہ ، جناب اسمٰعیل بن جعفر صادق رحمہ اللہ علیہ کے متعلق جناب جعفر صادق رحمہ اللہ علیہ کی یہ ہدایت بتواتر روایت کرتے ہیں کہ إِنَّ هٰذَا الْأَمْرَ فِي الْأَكْبَرِ مَا لَمْ يَكُنْ بِهِ عَاهَةٌ (یہ امر امامت بڑے بیٹے کو پہنچتا ہے جب تک اس میں کوئی خرابی رونما نہ ہو) اور جناب موسیٰ کاظم رحمہ اللہ علیہ کے دعوائے امامت کو جھٹلاتے ہیں ، اور انہیں بھائی سے یاد کرتے ہیں کہ انہوں نے نص متواتر کے خلاف کیا جس طرح حضرت ابوبکر (صدیق رضی اللہ عنہ) نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شان میں کیا ۔

قرامطہ جناب اسمٰعیل کے بعد ان کے بیٹے محمد کو امام مانتے ہیں مگر افطحیہ جناب صادق کے بعد عبداللہ بن جعفر کو امام بلافصل مانتے ہیں اور دلیل یہ دیتے ہیں کہ وہ اسمٰعیل کے حقیقی بھائی تھے ۔ اور یہ بھائی جب جناب صادق کی زندگی ہی میں فوت ہو گئے ۔ تو چونکہ نص اسمٰعیل کے حق میں تھی ، لامحالہ باپ کی وفات کے بعد بطریق میراث اس نص کا مصداق حقیقی بھائی ہوا نہ کہ سوتیلے بھائی ۔ اور اسمٰعیل و عبداللہ کی والدہ فاطمہ بنت حسین بن علی بن حسین بن علی بن ابی طالب (رضی اللہ عنہم) تھیں لہٰذا دونوں بھائی دونوں جانب سے حسینی سید تھے ،

موسویہ کہتے ہیں کہ جناب صادق رحمۃ اللہ علیہ کی نص و ہدایت کے مطابق آپ کے بعد جناب موسیٰ کاظم رحمۃ اللہ علیہ امام ہیں۔
ممطوریہ آپ کے متعلق کہتے ہیں کہ وہ حی لایموت ہیں اور قائم منتظر بھی وہی ہیں، اور ثبوت میں جناب امیرالمومنین رضی اللہ عنہ سے یہ نص متواتر نقل کرتے ہیں۔

سَابِعُهُمْ قَائِمُهُمْ سَمِيُّ صَاحِبِ التَّوْرَاةِ۔ (ان کا ساتواں ان میں قائم ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ہم نام ہے)

اثنا عشریہ نے جناب حسن عسکری رحمۃ اللہ علیہ کی امامت پر اتفاق کیا ہے ان کے بعد جعفریہ (فرقہ) نے جناب جعفر بن علی کو امام مانا ہے۔ یہ کہتے ہیں کہ جناب حسن عسکری لاولد تھے۔ دلیل یہ ہے کہ آپ کی میراث جعفر بن علی نے لی۔ یہ بالاجماع ثابت ہے اگر ان کے کوئی بیٹا ہوتا تو جعفر کو کیسے پہنچتی!

مگر بعض کہتے ہیں کہ جناب حسن عسکریؒ کے بیٹا تھا جو باپ کی زندگی میں کمسن فوت ہو گیا کلینی نے زرارہ بن اعین سے بحوالہ ابی عبداللہ روایت کی ہے۔

اِنَّهُ قَالَ لَابُدَّ لِلْغُلَامِ مِنْ غَيْبَةٍ	آپ نے کہا لڑکے کے لئے غائب رہنا ہی ضروری ہے
قُلْتُ وَلِمَ، قَالَ يَخَافُ قُلْتُ وَمَا يَخَافُ	میں نے کہا کیوں؟ آپ نے کہا خوف کھاتا ہے۔ میں نے کہا کس بات
فَاَوْمٰى بِيَدِهٖ اِلٰى بَطْنِهٖ۔	سے ڈرتا ہے؟ آپ نے جواب میں اپنے ہاتھ سے پیٹ کی طرف اشارہ کیا۔

اثنا عشریہ نے اس اشارہ کا مطلب سمجھا کہ لوگوں کو ان کی ولادت میں شک پڑ جائے گا، بعض کہیں گے کہ حمل ساقط ہو گیا۔ بعض کہیں گے سرے سے حمل تھا ہی نہیں۔

لیکن عقلمند سے یہ بات پوشیدہ نہیں کہ "مایخاف" کے جواب میں اپنے پیٹ کی طرف اشارہ کرنا ان کے سمجھے ہوئے معنی کو صاف طور پر غلط بتا رہا ہے اس لئے کہ پیٹ کے بچہ کو خوف نہیں ہوا کرتا۔ اور اگر ہو بھی تو اس سے لوگوں کا اختلاف دور نہیں ہوتا۔

حاصل کلام یہ ہے کہ یہ بیان کرنے کا مقصد "کہ ان کے فرقے آپس میں مختلف ہیں، اور ہر ایک اپنی من مانی بات پر تواتر کا مدعی ہے" یہ ہے کہ ان کے جھوٹ اور افترا پر دلیل و حجت قائم کی جائے! اگر ایک ہی فرقہ کی خبر متواتر ہوتی تو یہ اختلاف ہرگز رونما نہ ہوتا۔ خصوصاً جناب محمد بن حنفیہ نہ جناب زین العابدین سے جھگڑتے، نہ حجر اسود کی ثالثی تک نوبت پہنچتی۔ نہ جناب زید بن علی کو جناب باقر سے نہ جناب جعفر بن علی کو جناب محمد بن مہدی سے کوئی پرخاش ہوتی۔ کیونکہ اہل بیت ہی اپنے اندرونی معاملات کو زیادہ جانتے ہیں۔ یہیں سے عقلمند کو یہ اشارہ ملتا ہے کہ وہ ان تمام فرقوں کے جھوٹ کو سمجھے اور یہ جان لے کہ یہ سب کچھ اس فرقہ کی افترا پردازی ہے کہ ہر وقت کی مصلحت کے مطابق ایک امام اپنے خیالات کے مطابق مقرر کر لیا کرتے اور اس کی طرف لوگوں کو دعوت دیتے تھے کہ اپنے بنائے ہوئے امام کی آڑ میں اپنے پیروکاروں سے خمس، نذر و نیاز اور فتوح وصول کیا کریں اور عیش اڑائیں اور بعد والے اپنی اندھی تقلید کی وجہ سے گمراہی کے بھنور میں جا گرے۔ سچ ہے۔

اِنَّهُمْ اَلْفَوْا آبَاءَهُمْ ضَالِّيْنَ فَهُمْ	انہوں نے اپنے باپ دادا کو گمراہ پایا پس وہ ان ہی
عَلٰى آثَارِهِمْ يُهْرَعُوْنَ۔	کے قدموں پر دوڑے چلے جاتے ہیں۔

آٹھواں باب

متعلق، آخرت

امور معاد میں کتاب وعترت سے شیعی مخالفت

عقیدہ (۱) مرنے کے بعد اجسام وارواح کے لئے ایک اور عالم - عالم آخرت درپیش ہوگا، جہاں سب حساب وکتاب جزا وسزا، ثواب وعقاب کے لئے جمع کئے جائیں گے - اہل سنت کا یہی عقیدہ ہے - مگر شیعوں کے بہت سے فرقے مثلاً ذرامیہ، کاملیہ، منصوریہ، حمیریہ، باطنیہ، قرامطہ، جناحیہ، خطابیہ، معمریہ، میمونیہ، مقنعیہ، خلفیہ اور جنابیہ کہتے ہیں کہ حشر اجساد بالکل نہیں ہوگا - اور نہ ہی ارواح کے لئے موجودہ عالم کے سوا کوئی اور ٹھکانہ ہے بلکہ ان کا اسی عالم دنیا میں تناسخ الٹ پھیر اور لوٹ پلٹ ہوتی رہتی ہے - اور وہ ایک بدن سے دوسرے بدن میں منتقل ہوتی رہتی ہیں

ان کے اس عقیدہ کی تردید ومخالفت، کتاب اللہ، انبیاء کرام کی نصوص اور ائمہ کے کلام سے اتنی ظاہر وباہر ہے کہ محتاج بیان نہیں - کتاب اللہ کے چند ارشادات ملاحظہ ہوں -

(۱) فَإِذَا هُمْ مِنَ الْأَجْدَاثِ إِلَىٰ رَبِّهِمْ يَنْسِلُونَ -

پس وہ اچانک قبروں سے (اٹھ کر) اپنے رب کی طرف بڑھیں گے -

(۲) فَسَيَقُولُونَ مَنْ يُعِيدُنَا ۖ قُلِ الَّذِي فَطَرَكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ

جب یہ سوال اٹھائیں کہ ہم کو کون لوٹائے گا تو آپ کہدیجئے، وہی جس نے تمہیں پہلی دفعہ پیدا کیا -

(۳) وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَنَسِيَ خَلْقَهُ ۖ قَالَ مَنْ يُحْيِي الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيمٌ ۔ قُلْ يُحْيِيهَا الَّذِي أَنْشَأَهَا أَوَّلَ مَرَّةٍ -

ہم پر اعتراض کرتا ہے اور اپنی اوقات بھول گیا، کہتا ہے بوسیدہ ہڈیوں میں کون جان ڈالے گا - آپ کہدیجئے وہی ان کو زندہ کرے گا جس نے ان کو پہلی مرتبہ پیدا کیا تھا -

(۴) ثُمَّ إِلَىٰ رَبِّكُمْ تُحْشَرُونَ

پھر اپنے رب کی طرف اکٹھے کئے جاؤ گے !

(۵) وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ -

اور اسی کی طرف لوٹو گے -

(۶) رَبِّ ارْجِعُونِ لَعَلِّي أَعْمَلُ صَالِحًا فِيمَا تَرَكْتُ ۚ كَلَّا ۚ إِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَائِلُهَا ۖ - وَمِنْ وَرَائِهِمْ بَرْزَخٌ إِلَىٰ يَوْمِ يُبْعَثُونَ

اے میرے رب مجھے دوبارہ (دنیا میں) لوٹا دے تاکہ جو راہ حق کے کام) چھوڑ آیا ہوں ان کو تیری پسند کے مطابق انجام دے سکوں - ہرگز نہیں - یہ سب کہنے کی باتیں ہیں - اب تو قیامت تک اس عالم کے درمیان پردہ حائل ہو چکا -

اس غلط اور فاسد عقیدہ میں ان فرقوں کا استدلال وتمسک ان چیزوں سے ہے جو انہوں نے فلسفیوں سے سیکھی ہیں - حالانکہ شریعت کے نزدیک وہ قطعی غلط اور سراسر بے بنیاد ہیں، مثلاً آسمان کی کرویت (کرہ کی شکل) اور خلا کا محال ہونا - مزید یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر

اس موجودہ عالم کی طرح کا کوئی دوسرا عالم بھی ہوگا تو لامحالہ وہ بھی کروی شکل کا ہوگا ۔ اور ایک جیسے دو کُرے، باہم چسپاں نہیں ہو سکتے تاوقتیکہ ان کے درمیان فاصلہ نہ ہو، اور فاصلہ ہونے کی صورت میں خلا لازم ہے ۔ (جو فلاسفہ کے نزدیک محال ہے)

اس استدلال میں ان کو کئی جگہ غلطی لگی اور دھوکہ ہوا ہے ۔ پہلی بات تو یہ کہ کیا ضروری ہے کہ عالم پورے کا پورا کُرہ ہو ۔ اسلئے کہ وہ ہندسی دلائل جو کرویت پر قائم کئے گئے ہیں افلاک متحرکہ کی کرویت کے ساتھ مخصوص ہیں ، ہو سکتا ہے یہ افلاک متحرکہ پورے عالم کا ایک حصہ ہوں ، دوسری بات یہ ہے کہ خلا کے محال ہونے کا دعویٰ ناقابل تسلیم ہے کیونکہ اس پر جتنی بھی دلیلیں بیان کی گئی ہیں ۔ سب پر کوئی نہ کوئی اعتراض وارد ہوتا ہے ۔

تیسری بات یہ کہ اگر ہم دو کروں کو اوپر نیچے یا برابر رکھیں تو البتہ فاصلہ ضرور ہوگا لیکن اگر ایک کرہ دوسرے کرہ کی موٹائی میں دھنسا ہوا ، گڑا ہوا یا سمایا ہوا ہو ۔ جس کی موٹائی ایک دوسرے کے برابر ہو اور اس کا قطر ان کے قطر کے برابر ۔ یا اس کی موٹائی اور قطر ان کی موٹائی اور قطر سے زائد ہوں ۔ جیسا کہ فلاسفہ کے نزدیک تدویرین افلاک خوارج کی موٹائی میں گڑھی ہوئی ہیں تو فاصلہ ہرگز لازم نہیں آتا ۔ اس لئے کہ فاصلہ کی جگہ تو گھیرنے والے کرہ کی موٹائی سے بھری ہوتی ہے ۔

خود فلاسفہ کہتے ہیں کہ مریخ کی تدویر کا قطر مثلاً سورج کے قطر سے بڑا ہے ۔ لہٰذا ہو سکتا ہے کہ عالم کے یہ سب کُرات جو ہم کو معلوم ہیں اپنی جگہ خود ایک ہی کُرہ ہوں ۔ جو کسی دوسرے کرہ کی موٹائی میں سمائے ہوئے ہیں اور یہی حال دوسرے عالم کا بھی ہو ۔

چوتھی بات یہ کہ کیا ضروری ہے کہ معاد کا عالم ، اسی عالم جیسا دوسرا ہی ہو ، بلکہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اسی عالم میں تغیر و تبدل ہو جائے کل عناصر ناریت میں بدل جائیں اور افلاک سب کے سب باغ و بہشت کی شکل میں ۔ اسی عالم میں فلکی اور عنصری مادے دوسرا رنگ اور دوسری صورت میں ظاہر ہو جائیں کہ مرکبات ، کانیں ، نباتات ، حیوانات اور انسان افلاک میں پیدا ہوں ۔ گویا ہر آسمان باغ و بہشت بنے ۔ اور زمین دوزخ ۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ۔

يَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ۔	جس دن یہ زمین دوسری زمین و آسمانوں میں بدل دی جائیگی ۔ اور اللہ واحد و غالب کے حکم سے مردے نکل آئیں گے ۔

اور حشر نشر سے پہلے جنت و دوزخ کا وجود ، انبساط و امتداد کے منافی نہیں انکی کیفیات اس وقت بھی ایسی ہی ہوں گی جیسی اب ہیں ۔

عقیدہ (۲) —— قیامت کے دن اللہ تعالیٰ پر بندوں کو اٹھانا واجب نہیں کہ اس کے ترک پر کوئی عقلی قباحت لازم آئے ، ہاں اس نے چونکہ اس کا وعدہ کیا ہے اس لئے وعدہ کے مطابق ان کا اٹھانا اور جمع کرنا ایک ہونے والا ، اور وقوع میں آنے والا واقعہ ہے تاکہ وعدہ خلافی لازم نہ آئے یہی اہل سنت کا عقیدہ و مذہب ہے ۔

مگر امامیہ کہتے ہیں کہ بندوں کا اٹھانا از روئے عقل اللہ تعالیٰ پر واجب اور ضروری ہے ۔ حالانکہ بہت سی آیات صاف طور پر دلالت کرتی ہیں کہ بعث و معاد وعدہ الٰہی سے وابستہ ہیں اور بہت سی ایسی آیات کے آخر میں ۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ (کہ اللہ تعالیٰ اپنے وعدہ کے خلاف نہیں کرتا) یا اسی طرح کی اور عبارات کا آنا ان کے عقیدہ کی کھلی تکذیب کرتی ہیں ۔

اور الٰہیات کی بحث میں یہ گذر چکا ہے کہ خدا تعالیٰ پر کسی چیز کا واجب ہونا بے معنی سی بات ہے ۔ امامیہ اس مسئلہ میں بھی چند ناقص

عقل گدے اڑاتے ہیں، مثلاً کہتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے بندوں کو اوامر و نواہی کا مکلف کیا ہے تو اگر طاعت پہ ثواب نہ ملے اور نافرمانی پر عقاب میں نہ جکڑے، تو ظلم لازم آتا ہے اور ظلم ہر ایک ہی کے لئے قبیح اور بُرا ہے، اور اللہ تعالیٰ کے لئے تو قبیح تر ہوگا۔ اور ثواب و عقاب بعث کے بغیر متصور نہیں تو لا محالہ اللہ تعالیٰ پر بعث واجب ہوا۔

ان کا یہ استدلال بھی چند وجوہ ظاہر البطلان ہے۔

اوّل:- یہ کہ خالق و مالک کے متعلق ظلم کی نسبت کا تصور ہی غلط ہے اس لئے کہ وہ اپنی ملک میں جس طرح کا چاہے تصرف کرے۔ اسے حق ہے اور اسے ظلم نہیں کہہ سکتے!

دوسرے:- جن سے ظلم کا تصور ہو سکتا ہے مثلاً مالکان مجازی ان کے حق میں بھی فرمانبرداری پر انعام نہ دینا ظلم نہیں کہہ سکتے۔ مثلاً ایک آقا اپنے غلام کو معاشی ضروریات سے بے پرواہ کر دیتا ہے۔ اور اس سے کام بھی اس کی طاقت کے مطابق ہی لیتا ہے اب وہ غلام جو کام انجام دیتا ہے وہ اس کا فرض منصبی ہے اب اگر وہ اس کے وہ انعام مانگے تو دنیا کا کون عقلمند کہیگا کہ مالک پر انعام دینا واجب ہے۔ وہ انعام نہ دے تو کوئی اسے ملامت نہیں کر سکتا۔ اسی طرح معصیت اور گناہ پر بالکل ہی باز پرس نہ کرنا تو ظلم ہو ہی نہیں سکتا بلکہ وہ تو عفو و احسان یا اپنا حق معاف کر دینا کہلاتا ہے۔ اس کو ظلم خیال کرنے والا تو بیوقوف ترین بلکہ عقل سے پیدل ہی ہوگا۔

پھر الٰہیات کے بیان میں جناب امیر المومنین رضی اللہ عنہ اور جناب سجاد رحمہ اللہ علیہ سے بطریق تواتر یہ روایت نقل ہوئی ہے کہ "اگر اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سب سے زیادہ عبادت گذار بندہ کو سب سے سخت کا فرد الا ہمیشگی کا عذاب بھی دیدے تو وہ عدل ہے ظلم نہیں":

حاصل کلام یہ کہ شیعہ حضرات اس مسئلہ میں بھی حسب عادت و دستور افراط و تفریط میں پھنس گئے، کہ امامیہ افراط کے راستہ پر پڑ گئے کہ اللہ تعالیٰ پر بعث و معاد واجب کہنے لگے اور دوسرے فرقے جن کا ذکر باب اوّل میں ہوا۔

تفریط کی راہ میں بھٹک گئے۔ کہ سرے سے معاد کا ہی انکار کر دیا۔ اور استدلال دونوں ہی کا عقلی ناقصات پر مشتمل ہے۔ امامیہ کا حال تو آپ ابھی پڑھ چکے اب ان دوسروں کی بھی سنئے۔

یہ کہتے ہیں کہ بعث و معاد اگر واقع ہو تو مومن صالح کے بعض یا کل بدنی اجزاء کو عذاب دینا یا کافر کے بعض یا کل اجزائے بدنی کو نعمت سے نوازنا لازم آتا ہے حالانکہ یہ عقل و شرع دونوں کے خلاف ہے۔ اور اس لزوم کی صورت یوں بیان کرتے ہیں کہ ایک آدمی نے کسی آدمی کو بطور غذا کھالیا۔ حتیٰ کہ اس غذا سے نطفہ بنا، اور اس نطفہ سے بچہ پیدا ہوا۔ اب اس بچہ کے اجزائے بدنی کو یا عذاب دیا جائے گا۔ یا انعام سے نوازا جائے گا عذاب کی شکل میں اجزائے غذائی عذاب سے متاثر ہوں گے اور نعمت کی صورت میں نعمت سے، گو پہلی صورت میں عذاب کے مستحق نہ ہوں اور دوسری صورت میں نعمت کے۔

اس کے جواب میں ہم کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس بات پر قادر ہے کہ کھانے والے کے بدن کو اس مدت تک تحلیل ہونے سے محفوظ رکھے جب تک اجزائے غذا بالکل فضلہ ہو کر نہ نکل جائیں یا کھانے والے کو اتنی مدت تک نامرد کر دے کہ اس سے نطفہ پیدا ہی نہ ہو، اور اگر پیدا ہو تو احتلام یا کسی اور طرح نکل جائے اور اس بچہ سے متعلق ہی نہ ہو۔

پھر ایسے شخص کا وجود کہ اس نے مدت دراز تک انسان کا گوشت کھایا ہو اور اس سے لڑکا بھی پیدا ہو گیا کس دلیل سے معلوم، خالی خولی امکانی ہوائیوں سے کام تو نہیں چلتا کیونکہ یہ دلیل معارضہ کی شکل میں ہے (دوسرے کی دلیل کو کاٹنا معارضہ کہلاتا ہے) اور معارض کو دلیل چاہیئے احتمال اس کو کافی نہیں۔ اور وقوع ممنوع ہے۔ یہ طریق دلیل بازی (جدل) ہے۔ تحقیق کلام یہ ہے کہ بدن انسانی کے بعض

اجزاء غذا نہیں بن سکتے ، جیسے روح ہوائی کہ عرف عام میں اسی کے نکل جانے کا نام موت ہے یہ جزو بدن ہونے کے باوجود غذا نہیں بن سکتی اس میں کسی طرح کا تصرف نہیں ہو سکتا ۔ اور نہ یہ کسی دوسرے بدن کا جزبن سکتی ہے اور بہت سے غذائی اجزاء کھلنے سے پہلے ہی بطریق تحلیل جدا ہو کر چلے جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے علم میں وہ سارے اجزاء ایک دوسرے سے ممتاز ہیں ۔ بوقت حشر ان سب کو جمع کر کے روح ہوائی کا کنکشن ان سے جوڑ کر ان کو انسانی بدن کی شکل میں تبدیل فرمادے گا ۔

خلاصۂ بحث یہ ہے کہ دکھ ، سکھ کا اصل تعلق روح سے ہے اس لئے عذاب سے وہی دکھ پاتی ہے اور نعمت سے لطف اندوز ہوتی ہے ، بدن کا واسطہ البتہ ضرور ہوتا ہے اور بدن بغیر روح کے ایک پتھر ہے ، اسی لئے اس کا دکھ پانا یا لطف اندوز ہونا متصور نہیں ۔ اور دکھ دینے یا لذت پہنچانے میں ہمارا بدن کافی ہے ۔ لہٰذا اگر اس کا پہلا بدن باقی ہے اور اس کو ثواب وعقاب کا مورد بنانے میں کوئی قباحت نہیں تو اسی بدن پر اکتفا کیا جائے گا ورنہ دوسرا بدن پیدا کیا جائے گا ، اب وہ خواہ پہلا ہی بدن ہو یا وہ ہو جو کھانے والے کے کھانے سے پہلے خلل پذیر ہو چکا تھا ۔ پھر اس پر ثواب وعقاب ہوگا ۔

یہ شکل تناسخ کی نہیں ہے کیونکہ تناسخ کا تو یہ مطلب ہے کہ دنیاوی ابدان میں روحیں لطلب کمال منتقل ہوتی رہتی ہیں اور یہاں بحث اس بدن کی ہے جو آخرت میں جزا و سزا کے لئے پیش ہوگا ۔ اسی بعینہٖ بدن کی حفاظت جزا کے لئے ضروری نہیں کیونکہ ابدان میں زیادتی وکمی کے ساتھ گھٹنا بڑھنا ، احادیث متواترہ سے ثابت ہے بلکہ قرآن کی نصوص سے بھی ثابت ہے جیسا کہ ارشاد ہے ۔

كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُودُهُمْ بَدَّلْنَاهُمْ	جب ان کی کھالیں جل جایا کریں گی تو ہم ان کی کھالیں بدل
جُلُودًا غَيْرَهَا لِيَذُوقُوا الْعَذَابَ	دیں گے تاکہ عذاب کا مزہ چکھتے رہیں ۔

مشاہدات میں اس کی مثال یوں دی جاسکتی ہے کہ ایک شخص سے لباس پوشی کی حالت میں کوئی جرم سرزد ہوا اور وہ اسی حالت میں گرفتار ہوگیا تو وہ اسی حال میں سزا پائے گا لیکن اگر گرفتاری کے وقت وہ بے لباس عریاں تھا ۔ تو بقدر ستر عورت اس کے بدن پر لباس ڈال کر سزا دیں گے ۔ گویا روح سے بدن کی نسبت ایسی ہے جیسے کسی شخص کی لباس کی نسبت ہے

دمبدم گر شود لباس بدل شخص صاحب لباس راچہ خلل

(لباس اگر بار بار بھی بدلا جائے تو اس سے صاحب لباس کی شخصیت میں کیا فرق پڑے گا)

اسی لئے عرف میں بچپن سے لیکر بڑھاپے تک باوجود اجزائے بدن کے بدل جانے اور باوجود امراض ، یا شخصی محنت ومشقت کے سبب خلل پذیر ہونے کے وہ شخص باقی رہتا ہے اور کسی کے دل میں یہ وہم تک نہیں آتا کہ بوڑھا وہ نہیں ہے جو ستر سال پہلے بچہ تھا ۔ پھر باوصف ان تبدیلیوں کے ، انعام وعقاب کے احکام اس پر بلا کسی انکار کے بدستور جاری رہتے ہیں ۔

بعض امامیہ اپنے مذکورہ دعویٰ پر ان آیات سے دلیل لاتے ہیں جو یہ بتاتی ہیں کہ آخرت میں جزا اعمال سے وابستہ ہے مثلاً ۔

جَزَاءً بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ	یہ ان عملوں کا بدلہ ہے جو وہ کیا کرتے تھے ۔
يَوْمَ تُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ ۔	جس دن ہر نفس کو اس کے عمل کے سبب بدلہ دیا جائے گا
لَا ظُلْمَ الْيَوْمَ	اس دن ظلم بالکل نہیں ہوگا ۔
فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهٗ ۔	جو ذرہ برابر بھی نیکی کرے گا وہ بھی اس کی نظر کے سامنے ہوگی ۔

یہ آیات ثبوت میں پیش کر کے بعض امیہ کہتے ہیں کہ ان آیات سے پتہ چلتا ہے کہ جزاء کا سبب عمل ہے ۔ تو گویا مطیع و فرمانبردار کو ثواب اور

www.Ahlehaq.com

www.Ahlehaq.com

نافرمان کو گناہ کے بدلے عذاب دینا واجب ہوا۔ اس کے جواب میں ہم کہتے ہیں کہ گو آیات جزا کے وقوع پذیر ہونے اور اعمال پر ثواب وعقاب مرتب ہونے پر تو دلالت کرتی ہیں، مگر خدا تعالیٰ پر اس وجوب کو کسی طرح بھی نہیں بتاتیں۔ مثلاً کوئی شخص کسی کو نہ تو باقاعدہ نوکر رکھتا ہے اور نہ اس کی خدمت وتقصیر پر باقاعدہ کوئی قول وقرار کرتا ہے ایسی صورت میں اگر وہ خدمت پر انعام یا تقصیر پر سزا دے تو یہ تو کہا جائے گا کہ اسے انعام یا سزا اس کی خدمت یا تقصیر کے بدلہ میں ملے مگر یہ دونوں باتیں نوکر رکھنے والے پر کسی قاعدہ سے بھی واجب نہیں کہی جائیں گی۔

اور دوسری بات یہ کہ اگر گناہوں پر سزا دینا واجب ہوتا۔ تو گناہ کبیرہ کے سلسلے میں یہ وجوب ہو سکتا تھا۔ مگر نص قرآنی میں وقوع کے اعتبار سے اس کے واجب نہ ہونے کی خبر دی گئی ہے چہ جائیکہ اس کے عقلی وجوب کی بات کی جائے۔

إِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ۔ — اللہ کے ساتھ جو شرک کرے اللہ تعالیٰ اس کی مغفرت نہیں کریگا ہاں اس کے علاوہ جس کی چاہے گا مغفرت فرمائے گا۔

عقیدہ (۳) ہے کہ عذاب قبر حق ہے۔ اہل سنت کا یہی مسلک ہے۔ مگر شیعوں کے اکثر فرقے حتیٰ کہ زیدیہ بھی عذاب قبر سے انکاری ہیں حالانکہ قرآن مجید کی بہت سی آیات قبر کے عذاب اور اس کی راحتوں پر دلالت کرتی ہیں جیسے فرمایا گیا۔

مِمَّا خَطِيْٓئٰتِهِمْ اُغْرِقُوْا فَاُدْخِلُوْا نَارًا ۔ — اپنے گناہوں کی بدولت غرق کئے گئے اور پھر دوزخ میں ڈالے گئے

اور حرف "فا" ایک چیز کے بلا وقفہ بعد میں آنے کو بتاتا ہے اور صیغہ چونکہ ماضی کا ہے اسلئے معلوم ہوا کہ ڈوبتے ہی بلا وقفہ وفاصلے کے وہ زمانہ ماضی میں دوزخ میں ڈالے گئے۔ اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّعَشِيًّا۔ صبح وشام ان کا سامنا وسابقہ آگ سے پڑتا ہے۔

اس آیت میں عذاب قیامت کا عطف اس پیش ہونے والے عذاب پر مدعا کی صداقت پر صاف دال ہے۔ اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نیز آئمہ سے اخبار احادیث بطریق تواتر اس سلسلہ میں موجود ہیں۔

اسی طرح قبر کی نعمتوں اور راحتوں کا ذکر بھی بہت سی آیات میں آیا ہے مثلاً

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ۭ بَلْ اَحْيَاۗءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ — جو اللہ کے راستہ میں قتل کئے گئے ان کو مردہ مت کہو بلکہ وہ تو زندہ ہیں۔ ان کے رب کی طرف سے انہیں رزق ملتا رہتا ہے۔

یا ارشاد ہوا۔

يٰلَيْتَ قَوْمِيْ يَعْلَمُوْنَ ۝ بِمَا غَفَرَ لِيْ رَبِّيْ وَجَعَلَنِيْ مِنَ الْمُكْرَمِيْنَ ۔ — کاش مری قوم کو معلوم ہو جاتا کہ میرے خدا نے میری مغفرت فرمادی۔ اور مجھے عزت داروں میں سے بنا دیا۔

یہ واقعہ یقیناً قیامت سے پہلے کا ہے کیونکہ قیامت کے دن تو ہر ایک ہی کو اس کا حال اور اس کی مغفرت اور اعزاز واکرام معلوم ہو جائیگا

قبر کی جزا سزا کے منکر بطور دلیل سمعی وعقلی یہ آیت پیش کرتے ہیں۔

لَا يَذُوْقُوْنَ فِيْهَا الْمَوْتَ اِلَّا الْمَوْتَةَ الْاُوْلٰى ۔ — انہیں موت کا مزہ قبر میں پہلی موت ہی کے وقت چکھنا ہو گا۔

کہ اگر قبر میں زندگی ہوتی تو لازماً اس زندگی کی موت بھی ہوتی کیونکہ قیامت کے دن زندہ کئے جانے کا ثبوت تو بالاجماع ہے تو اس صورت میں دو موتوں کا مزہ چکھنا ظاہر ہوتا ہے حالانکہ قرآنی آیت میں ایک ہی موت کے مزہ کا ذکر ہے۔"

اس کا جواب یہ ہے کہ قبر کی زندگی وموت حقیقی طور پر متحقق نہیں، بلکہ روح وجسم کے ایک تعلق کا نام ہے کہ روح جب اس بدن پر اپنی شعاعیں ڈالتی ہے تو بدن سے ربط قائم ہو جاتا ہے اور قبر سے مناسب ماحول میں بدن کو تازگی ملنے لگتی ہے۔ ایسی زندگی نہیں جیسی دنیا میں تھی کہ وہاں بدن غذا کھاتا اور بڑھتا تھا۔ بلکہ وہ تعلق مثال کے طور پر ایسا ہوتا ہے جیسا محب ومحبوب کا یا آقا وغلام کا۔ یا گھر والے اور گھر کا۔

Www.Ahlehaq.Com

اور اتنا تعلق، رنج پہنچانے یا راحت دینے میں کافی ہوتا ہے اور یہ صورت بھی اسی وقت ہوتی ہے جب قبر میں بدن صحیح وسالم موجود ہو اور اسے دفن کیا گیا ہو۔ ورنہ عذاب وعیش سب روح کا ہوگا یعنی نفس مجرد کا کہ اس کا حقیقی بدن روح ہوائی ہے جس کا تعلق دوسرے کسی بدن سے جو عالم مثال کا ہو، یا اجزائے جمادیہ سے اسی ماہیت وشکل میں ترتیب دیا گیا ہو کہ دیکھنے والے کو اس بدن مثالی، یا جمادی میں اور دنیاوی بدن میں کوئی فرق وتمیز نہ معلوم ہو! اور یہ تناسخ کی شکل نہیں ہے کیونکہ تناسخ تو اسے کہتے ہیں کہ روح ایک بدن سے نکل کر دوسرے بدن کی تدبیر میں مصروف ہو اور غذا حاصل کرنا اور بدن کا بڑھنا بھی جاری رہے۔ اور یہ زیر بحث تعلق ایک احساسی تعلق ہے کہ جس کے سبب وہ دکھ یا راحت محسوس کرسکے!

چنانچہ طبرسی نے اپنی تفسیر میں بیان کیا ہے کہ شیخ الطائفہ ابو جعفر طوسی اپنی کتاب تہذیب الاحکام میں اپنی سند سے علی بن مہریار سے وہ قاسم بن محمد سے اور وہ حسین بن احمد سے اور وہ یونس بن ظبیان سے روایت کرتا ہے۔

قَالَ كُنْتُ عِنْدَ اَبِيْ عَبْدِ اللّٰهِ جَالِسًا فَقَالَ مَا يَقُوْلُ النَّاسُ فِيْ اَرْوَاحِ الْمُؤْمِنِيْنَ قُلْتُ يَقُوْلُوْنَ فِيْ حَوَاصِلِ طَيْرٍ خُضْرٍ فِيْ قَنَادِيْلَ تَحْتَ الْعَرْشِ فَقَالَ اَبُوْ عَبْدِ اللّٰهِ سُبْحَانَ اللّٰهِ الْمُؤْمِنُ اَكْرَمُ عَلَى اللّٰهِ مِنْ اَنْ يَّجْعَلَ رُوْحَهٗ فِيْ حَوْصَلَةِ طَائِرٍ غَيْرِ مَانُوْسٍ اَلْمُؤْمِنُ اِذَا قَبَضَهُ اللّٰهُ تَعَالٰى صَيَّرَ رُوْحَهٗ فِيْ قَالِبٍ كَقَالِبِهٖ فِي الدُّنْيَا فَيَاْكُلُوْنَ وَيَشْرَبُوْنَ فَاِذَا قَدِمَ عَلَيْهِمُ الْقَادِمُ عَرَفَهُمْ بِتِلْكَ الصُّوْرَةِ الَّتِيْ كَانَتْ فِي الدُّنْيَا وَعَنْهُ عَنْ اَبِيْ عُمَيْرٍ عَنْ حَمَّادٍ عَنْ اَبِيْ بَصِيْرٍ قَالَ سَاَلْتُ اَبَا عَبْدِ اللّٰهِ عَنْ اَرْوَاحِ الْمُؤْمِنِيْنَ فَقَالَ فِي الْجَنَّةِ عَلٰى صُوَرِ اَبْدَانِهِمْ لَوْ رَاَيْتَهٗ لَقُلْتَ فُلَانٌ ۔ انتہٰی۔

(ترجمہ) وہ کہتا ہے کہ میں ابی عبداللہ کے پاس بیٹھا ہوا تھا، انہوں نے مجھ سے پوچھا ارواح مومنین کے متعلق لوگ کیا کہتے ہیں۔ میں نے کہا وہ کہتے ہیں کہ روحیں سبز پرندوں کے پوٹوں میں رہتی ہیں اور وہ عرش کے نیچے قندیلوں میں! ابو عبداللہ نے کہا سبحان اللہ! اللہ کے نزدیک مومن پرندوں کے پوٹوں میں رکھے جانے سے زیادہ باعزت ہے جن سے وہ غیر مانوس ہے۔ درحقیقت جب اللہ تعالیٰ مومن کی روح قبض کرتا ہے تو اسے اسی قالب میں واپس اتارتا ہے جو دنیا میں اس کو حاصل تھا۔ پس وہ کھاتے ہیں اور پیتے ہیں جب کوئی آنے والا اُن کے پاس آتا ہے تو وہ ان کی دنیاوی صورت کی وجہ سے ان کو پہچان لیتا ہے۔ اسی طرح اس نے ابی عمیر سے اس نے حماد سے اس نے ابی نصیر سے روایت کی ہے وہ کہتا ہے کہ میں نے ابو عبداللہ سے مومنوں کی ارواح کے متعلق پوچھا تو انہوں نے فرمایا کہ وہ جنت میں اپنے دنیاوی شخص کی حالت میں ہیں کہ تو اگر اس کو دیکھے تو کہہ اٹھے یہ فلاں شخص ہے"

بہرحال بدن سے روح کا تعلق اس طرح کا ہو یا اس طرح کا عرف میں اسی تعلق کو حیات سے تعبیر کرتے ہیں اور دو صورتوں (اسکو) کی درمیانی مدت میں جب یہ تعلق ٹوٹ جاتا ہے تو اسے موت کے نام سے یاد کیا ہے۔ رَبَّنَا اَمَتَّنَا اثْنَتَيْنِ وَاَحْيَيْتَنَا اثْنَتَيْنِ الخ (اے ہمارے رب تو نے ہمیں دو مرتبہ مارا۔ دو مرتبہ زندہ کیا) یہ بھی اس صورت میں ہے کہ پہلی موت سے موت کا ایک فرد مراد ہو، اور ممکن یہ بھی ہے کہ مراد جنس موت ہو! جو زندگی بہشت سے پہلے ہے خواہ ایک بار ہو خواہ دو بار۔ اس صورت میں ان کا استدلال اصل سے باطل ہوا۔

الاصدر الشیرازی کی شواہد الربوبیت میں یوں بیان کیا گیا ہے۔

اِعْلَمْ اَنَّ الْاَرْوَاحَ مَادَامَتْ اَرْوَاحًا لَا تَخْلُوْ عَنْ تَدْبِيْرِ اَجْسَامٍ وَالْاَجْسَامُ قِسْمَانِ قِسْمٌ تَتَصَرَّفُ فِيْهِ النُّفُوْسُ تَصَرُّفًا اَوَّلِيًّا ذَاتِيًّا مِنْ غَيْرِ وَاسِطَةٍ وَقِسْمٌ تَتَصَرَّفُ فِيْهِ تَصَرُّفًا ثَانَوِيًّا بِالْعَرْضِ بِوَاسِطَةِ جِسْمٍ اٰخَرَ قَبْلَهٗ وَالْقِسْمُ الْاَوَّلُ لَيْسَ مَحْسُوْسًا بِهٰذِهِ الْحَوَاسِّ الظَّاهِرَةِ لِاَنَّهٗ غَائِبٌ عَنْهَا فَاِنَّهَا اِنَّمَا تُحِسُّ بِالْاَجْسَامِ الَّتِيْ مِنْ جِنْسِ مَا يُحِيْلُهَا مِنْ هٰذِهِ الْاَجْرَامِ كَالْقُشُوْرِ وَيُؤَثِّرُ فِيْهِمَا سَوَاءٌ كَانَتْ بَسِيْطَةً كَالْمَاءِ وَالْهَوَاءِ اَوْ مُرَكَّبَةً كَالْمَوَالِيْدِ وَسَوَاءٌ كَانَتْ لَطِيْفَةً كَالْاَرْوَاحِ الْبُخَارِيَّةِ اَوْ كَثِيْفَةً كَهٰذِهِ الْاَبْدَانِ اللَّحْمِيَّةِ الْحَيَوَانِيَّةِ وَالْاَجْسَادِ النَّبَاتِيَّةِ فَاِنَّ جَمِيْعَهَا مَا يَسْتَعْمِلُهَا النُّفُوْسُ وَيَتَصَرَّفُ فِيْهَا بِوَاسِطَةٍ وَاَمَّا الْقِسْمُ الْاَوَّلُ الْمُتَصَرِّفُ فِيْهَا النُّفُوْسُ فَهُوَ مِنَ الْاَجْسَامِ النُّوْرِيَّةِ الْاُخْرَوِيَّةِ بِحَيٰوةٍ ذَاتِيَّةٍ غَيْرِ قَابِلَةٍ لِلْمَوْتِ وَهِيَ اَجَلُّ رُتْبَةً مِنْ هٰذِهِ الْاَجْسَامِ الْمُشِفَّةِ الَّتِيْ تُوْجَدُ هٰهُنَا وَمِنَ الرُّوْحِ الَّتِيْ تُسَمّٰى بِالرُّوْحِ الْحَيَوَانِيِّ فَاِنَّهٗ مِنَ الدُّنْيَا وَاِنْ كَانَ شَرِيْفًا لَطِيْفًا بِالْاِضَافَةِ اِلَى الْغَيْرِ وَلِهٰذَا يَسْتَحِيْلُ وَيَضْمَحِلُّ سَرِيْعًا وَلَا يُمْكِنُ حَشْرُهٗ اِلَى الْاٰخِرَةِ وَالَّذِيْ كَلَامُنَا فِيْهِ مِنْ اَجْسَامِ الْاٰخِرَةِ وَهِيَ تُحْشَرُ مِنَ النُّفُوْسِ وَيَتَّحِدُ مَعَهَا وَيَبْقٰى بِبَقَائِهَا۔ اِنْتَهٰى۔

(ترجمہ) یہ سمجھ لو کہ روحیں جب تک روحیں ہیں اجسام کی دیکھ بھال میں لگی رہتی ہیں اور جسم دو قسم کے ہیں۔ ایک وہ جن میں نفوس ذاتی، اول اور بغیر کسی واسطے کے تصرف کرتے ہیں۔ دوسرے وہ جن میں وہ ثانوی، بالعرض اور دوسرے جسم کے واسطہ سے تصرف کرتے ہیں جو اس سے پہلے ہے۔ قسم اول ان حواس ظاہرہ سے محسوس نہیں ہوتے کیونکہ وہ اس ان حواس کی دسترس سے باہر ہیں۔ یہ حواس تو انہیں اجسام کو محسوس کر سکتے ہیں جو ان اجرام کی قسم سے ہوں۔ جیسے کھال۔ اور یہ اجسام ان اشیاء میں اثر و تصرف کرتے ہیں جو ہوا و پانی کی طرح بسیط ہوں خواہ مرکب جیسے موالید ثلاثہ۔ اور خواہ ارواح بخاریہ کی طرح لطیف ہوں خواہ کثیف جیسے گوشت پوست کے حیوانی بدن اور نباتاتی اجسام کیونکہ ان سب میں نفوس بالواسطہ تصرف کرتے ہیں۔ بلاواسطہ ان کو استعمال نہیں کرتے۔ اور اجسام کی قسم اول جن میں نفوس تصرف کرتے ہیں تو وہ اجسام نوری اخروی ہیں جن کو حیات ذاتی نصیب ہے جو موت کو قبول نہیں کرتی۔ یہ بلند رتبہ ہیں۔ ان شفاف اجسام سے جو یہیں پائے جاتے ہیں اور اس روح سے جسکو حیوانی روح کہتے ہیں کیونکہ وہ دنیا میں ہے اگرچہ وہ دوسرے کے لحاظ سے شریف تر و لطیف تر ہے اس لئے وہ جلد تغیر حاصل کر لیتی ہے اور نابود ہو جاتی ہے اور اس کا حشر بھی آخرت میں ممکن نہیں۔ اور ہمارا کلام جس میں ہے وہ آخرت کے اجسام ہیں اور ان کا نفوس کے ساتھ حشر ہوتا ہے اور ان کے ساتھ متحد رہتے ہیں اور ان کے باقی رہنے تک باقی رہتے ہیں۔" (بات ختم ہوئی)

اس سلسلہ میں ان کی عقلی دلیل یہ ہے کہ سوال و جواب، بات چیت، لذت و الم، اور ادراک یہ سب حیات پر موقوف ہیں اور حیات اس ڈھانچہ کی شکست و ریخت اور بدنی مزاج کے مختل و باطل ہونے کے بعد ممکن نہیں۔ لہذا ان امور کا میت کو لاحق ہونا امکان سے خارج ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اس معنی کے لحاظ سے بدن مردہ ہے روح نہیں، اور ٹوٹ پھوٹ اور مزاج کا ابطال اور اس کے تغیرات بدن پر واقع ہوتے ہیں روح پر نہیں۔ ہاں جسمانی لذت اور دکھ پانے کے لئے اور حواس کے اعمال کے لئے یا تو اس کے اپنے بدن سے تعلق کر دیا جاتا ہے، یا اس مثالی بدن سے جو تدبیر و تصرف اور غذا و نمو حاصل کرنے سے بالاتر ہے۔

www.Ahlehaq.com

حاصل یہ ہے کہ جب روح بدن سے جدا ہو ئی تو قوائے نباتی بھی اس کے ساتھ جدا ہوئے قوائے نفسانی اور جسمانی وحیوانی جدا نہیں نہیں ہوئے اگر قوائے نفسانی وحیوانی کا وجود بطور فیضان یا بطور بقا قوائے نباتی ومزاج کے ساتھ مشروط ہو تو یہ لازم آئے گا کہ فرشتے، شعور وادراک حسی حرکت غضب ودفع منافرے سے محروم ہوں۔ لہٰذا ارواح قبروں میں فرشتوں کی طرح ہیں کہ وہ شکل وبدن کے توسط سے کام کرتے ہیں اور حیوانی ونفسانی افعال کا ان سے صدور ہوتا ہے بغیر اس کے کہ ان میں نفس نباتی کار فرما ہو۔ فرق صرف اتنا ہے کہ فرشتوں کو بلحاظ اعمال، نعمت وعذاب سے کوئی واسطہ نہیں، اور روحوں کو ان کے اعمال کی بنا پر یا نعمت سے نوازا جائے گا یا عذاب سے دکھ دیا جائے گا۔

اور اس سلسلہ میں وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ مردہ جو زمین پر پڑا ہوا ہے یا سولی دیا ہوا کوئی انسان جو کسی درخت پر لٹکا ہوا مدت تک اسے یونہی چھوڑ دیا جائے یہاں تک کہ اس کے اعضا واجزا شکستہ وریختہ ہو کر ختم ہو جائیں، اب نہ اس میں زندگی ہے نہ قیام وقعود ہے۔ نہ حرکت نہ گفتگو، نہ سوال وجواب اور نہ ہی ان امور کے آثار ہی پائے جاتے ہیں۔ بلکہ ہم نے اس کے سینہ پر رائی کے دانے بھی ڈالے، مگر وہ اسی طرح پڑے رہے اسی طرح کافر مردہ کے بدن کو دیکھا بھالا، مگر اس میں جلنے کے کوئی آثار نظر نہ آئے۔

اس شبہ کا جواب گذشتہ تقریر سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ اس میت کی روح کو اس انداز کے موافق کہ وہ ادراک کر سکے اور دکھ سے متاثر ہو سکے یا تو انہی عنصری ابدان سے جوڑ دیتا ہے یا دوسرے ابدان مثالیہ مخترعہ سے۔ اور یہ کام انجام دیتا ہے۔

اب رہا ان حرکات کا محسوس نہ ہونا تو یہ ان کے سرے سے نہ ہونے اور واقع نہ ہونے پر دلالت نہیں کرتا۔ کیونکہ یہ حرکات تو حرکات ہم فرشتوں اور جنوں کی ذاتوں اور اشخاص کو بھی حواس سے ادراک نہیں کر سکتے حالانکہ سنی وشیعہ ہر دو مذاہب میں ان کا وجود تسلیم کیا گیا ہے۔ اسی طرح ایک سونے والا سوتے میں کسی عورت سے پورے طور پر لذت اندوز ہوتا ہے کہ خارج میں اس کا ثبوت بصورت احتلام ظاہر بھی ہوتا ہے لیکن کوئی پاس بیٹھنے والا اس کے بدن پر ان لذتوں کا کوئی اثر بھی محسوس نہیں کرتا۔

نیز حکما اور فلاسفہ ستاروں کی حرکات کے قائل ہیں اور ان کی روحانیات کی مدد کو بھی مانتے ہیں۔ حالانکہ ان میں سے کسی کو بھی کچھ محسوس نہیں ہوتا۔ چنانچہ ثابت بن قرہ کے حوالے سے یہ بات باب دوم میں نقل کی جا چکی ہے۔ اور خدا تعالیٰ اس پر قادر ہے کہ ادھر تو رائی کے دانوں کو اپنی اصلی حالت پر قائم رکھے اور اُدھر میت کی روح کو بدن سے پیدا کردہ تعلق کے ذریعہ نعمت سے لطف اندوز یا عذاب سے دکھی رکھے، زیادہ سے زیادہ یہی کہہ سکتے ہیں کہ یہ ایک بعید از وقوع بات ہے۔ مگر اس سے بات نہیں بنتی کیونکہ جب ایک چیز عقلاً ممکن ہو اور مخبر صادق صلی اللہ علیہ وسلم اس کی خبر بھی دیں تو وہ بات واجب القبول ہو خواہ وہ عادت وتجربہ کے موافق ہو یا نہ ہو۔ جیسے سرد ممالک کے حالات گرم ممالک کے باشندوں کے لئے اچنبھا اور انہونی لگتی ہے اور وہ اسے بعید الوقوع سمجھتے ہیں۔

حالانکہ ان کا وجود ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک روایت ہے کہ ایک مجوسی خلیفہ ثانی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں مردوں کی تین کھوپڑیاں لئے ہوئے آیا اور کہنے لگا کہ تمہارے رسول نے فرمایا ہے کہ جو دنیا سے بے ایمان جاتا ہے اس کو آگ سے جلاتے ہیں، آپ نے فرمایا بے شک ایسا ہی فرمایا ہے تو وہ کہنے لگا۔ یہ کھوپڑیاں میرے ماں، باپ اور بھائی کی ہیں، ان پر ذرا ہاتھ رکھ دیکھو کیا ان میں حرارت وگرمی ہے۔ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے لوہے کا ایک ٹکڑا اور پتھر مجوسی کے سامنے رکھ کر کہا ذرا ان پر ہاتھ تو پھیرو کوئی حرارت محسوس ہوتی ہے مجوسی نے ہاتھ پھیر کر کہا نہیں! پھر آپ نے لوہے کو پتھر پہ مارا تو چنگاری نکلی، تو اس سے پوچھا یہ آگ کہاں سے نکل پڑی؟ وہ کہنے لگا کہ لوہے پتھر کے اندر چھپی ہوئی ہے۔ رگڑنے سے ظاہر ہو گئی آپ نے فرمایا پھر تو کیسے انکار کرتا ہے؟ ہو سکتا ہے کہ ان کھوپڑیوں میں بھی آگ چھپی ہوئی ہو اور تیرے ہاتھ کو محسوس نہ ہوتی ہو۔ مجوسی بات کی تہ کو پہنچ گیا اور توبہ کر کے مسلمان ہو گیا۔

دونوں میں فرق اس قدر ہے کہ لوہے وپتھر میں چھپی ہوئی آگ تو ان کے رگڑنے سے ظاہر ہو جاتی ہے۔ مگر کافر کے بدن کی آگ کچھ ایسی چھپی

www.Ahlehaq.com

ہوئی ہے کہ بالکل ہی معلوم و محسوس نہیں ہوتی۔ اور ایسا یوں ہے کہ جن وانس پر غفلت کا پردہ پڑا رہے! اور ایمان بالغیب کی اہمیت کم نہ ہو۔

اور پھر اس مریض کے بارے میں کوئی کیا کہیگا جس کے دل یا دیگر اعضا میں گرم گرم بخارات یا بھڑنے والا مادہ حرارت پیدا کرتا رہتا ہے جیسا درد والے یا دوسرے مریضوں کو یہ کیفیت لاحق ہوتی ہے حالانکہ اوپر والے پر بدن پر گرمی کا کوئی اثر محسوس نہیں ہوتا۔ اور جب قبر جزا و سزا کی پہلی منزل ہے تو اس کے اسرار و بھید کو اس عالم دنیا میں آشکارا اور بے نقاب کرنا ایمان بالغیب کے منافی ہے اور اس دار التکلیف دنیا کے مخالف و ضد جس کی بنیاد سراسر عقل کے امتحان پہ ہے نہ ظاہر اور حس پہ!! اس کے باوجود مکلفین کو چونکانے اور تنبیہ کرنیکی غرض سے کبھی کبھی لوگوں پہ قبر کے حالات بھی منکشف ہوجاتے ہیں اور خواب میں کبھی جاگتے میں بھی بعض مردوں کے اچھے یا برے حالات ظاہر ہوجاتے ہیں۔ لہٰذا عقلاء کے اکثر و بیشتر فرقوں کے نزدیک بعد از موت عذاب و ثواب کی حقیقت قطعی اور یقینی ہے یہی وجہ ہے کہ کیا کافر کیا مسلمان ہر فرقہ اپنے مردوں کی امداد و اعانت کے لئے اپنے اپنے طور ایصال ثواب کے مختلف طریقے اختیار کرتے اور بڑے صدق قول سے ان میں مشغول و مصروف رہتے ہیں اگر اس عالم آخرت کے خوف و امید کی کوئی اصلیت و حقیقت نہ ہوتی تو یہ سب کچھ کس لئے ہوتا۔

عقیدہ ④ — قرآن و حدیث میں جو کچھ آتا ہے کہ قیامت کے دن سوال و جواب ہوگا۔ اعمال تولے جائیں گے اچھے برے اعمال نامے لوگوں کے ہاتھوں میں تھمائے جائیں گے صراط قائم ہوگی۔ حوض موجود ہوگا۔ شفاعت ہوگی وغیرہ وغیرہ یہ سب ظاہر معنی پر محمول ہیں۔ ان کے معنوں میں کسی تاویل کی گنجائش نہیں۔ اسی طرح جنت و دوزخ کا وجود برحق ہے اور جنت و دوزخ کے اندرون کی جو کچھ تفصیل آئی ہے مثلاً حور و قصور و غلمان، نہریں، درخت، فواکہ و اثمار، یا سانپ، بچھو، آگ، وادی اور کھائیاں۔ کھالوں کا پکنا اور ان کی جگہ دوسری کھالوں کا پیدا ہوجانا وغیرہ وغیرہ سب صحیح درست اور برحق ہیں۔ اہل سنت کا یہی مذہب و مسلک و اعتقاد ہے مگر رافضیوں کے اکثر فرقے مثلاً زیدیہ و اسماعلیہ وغیرہ ان چیزوں سے انکار کرتے اور ان میں تاویلات کے پیوند لگاتے ہیں۔

ان کی تردید و تکذیب جس انداز میں قرآنی آیات و احادیث رسول، جیسے دو گواہ عادل کررہے ہیں وہ کافی سے بھی بہت زیادہ ہے۔

عقیدہ ⑤ — کہ تناسخ غلط اور باطل ہے۔ مگر شیعوں کے اکثر فرقے مثلاً قرامطہ، کاملیہ، منصوریہ اور مفضلیہ وغیرہ کا یہ عقیدہ ہے کہ ارواح میں تناسخ ہوتا ہے وہ ایک بدن سے دوسرے بدن میں آتی جاتی رہتی ہیں اور روحوں کی اسی آمد و رفت کا نام معاد (آخرت) ہے۔

کامل الاعتقاد و الطاعات افراد کی روحیں ایسے اشخاص کے اجسام میں منتقل ہوتی ہے جو صاحب نعمت و ثروت ہوں، صاحب عافیت و صحت ہوں مثلاً سلاطین امراء حکام وغیرہ اور اس روح کی جنت یہی ہے اور گھٹیا اور گناہ آلود افراد کی روحیں ان اشخاص کے بدنوں میں گھستی ہیں جو بھوکے ننگے، بے نوا، گداگر ہوں، یا مریض اور صدموں کا مارا ہوا ہو۔ یا کبھی ان حیوانوں کی جون چلی جاتی ہیں جو باعتبار اوصاف ان کے ہم رنگ ہوں مثلاً حریص کے لئے، چیونٹی، بہادر متکبر کے لئے شیر، چیتا وغیرہ یا بزدل کے لئے خرگوش، عیار و مکار کے لئے لومڑی، مسخرے کے لئے بندر چور کے لئے ریچھ اور خود پسند کے لئے مور (طاؤس) کے ابدان باعتبار اوصاف، جائے قیام بنتے ہیں۔

ان لوگوں کا یہ عقیدہ دراصل ہندوؤں سے مانگا تانگا ہے اور کچھ ان کی قرآنی تحریف کا کارنامہ ہے کہ بعض آیات میں لفظی اور معنوی تحریف کرکے اپنے عقیدہ کی پیوندکاری کرتے ہیں۔ مثلاً۔

وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا طَائِرٍ
يَطِيرُ بِجَنَاحَيْهِ إِلَّا أُمَمٌ أَمْثَالُكُم ۔

حالانکہ اس آیت کے یہ معنی ہیں کہ جانور، چرند، پرند، بنی آدم ہی کی طرح جداگانہ انواع پر مشتمل ہیں کہ ان میں ہر ایک کو اس کی خلقت کے مناسب خاص خاص احکام و اوصاف عطا کئے گئے ہیں اگر یہ آیت تناسخ کی طرف اشارہ کرتی ہو تو یہ لازم تھا کہ جانوروں کی پہلی پیدائش نہ ہوتی۔

اور وہ سب کے سب افراد حیوانی ہوں، جو حقیقت میں تو آدمی تھا مگر تناسخ کی وجہ سے جانور بن گیا ہے حالانکہ جو تناسخ مانتے بھی ہیں ان کا بھی یہ مذہب نہیں۔ یا یہ آیت كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُودُهُمْ بَدَّلْنَاهُمْ جُلُودًا غَيْرَهَا۔ کہ یہ ان دوزخیوں کے حق میں ہے جو عذاب میں جکڑے ہوئے ہیں ان ارواح کے بارے میں نہیں ہے جو دنیا میں متشکل ہوتی رہتی ہیں۔ یا یہ آیت كُلَّمَا أَرَادُوا أَنْ يَخْرُجُوا مِنْهَا أُعِيدُوا فِيهَا۔ کہ اس میں ضمیر صاف طور پر آخرت کی آگ پر پھرتی ہے کہ جب وہ نار جہنم سے نکلنے کا ارادہ کریں گے تو واپس ہی دھکیل دئیے جائیں گے۔ اسی طرح کا معاملہ ان احادیث کا ہے جو قیامت کے دن صورتوں کی تبدیلی پر دلالت کرتی ہیں یا اس بات پر کہ حشر کے دن لوگوں کو مختلف صورتوں پر اٹھایا جائے گا۔ ان احادیث کا تناسخ سے دور پرے کا واسطہ بھی نہیں، کیونکہ تناسخ تو یہ ہے کہ عالم دنیا میں ایک روح ایک بدن سے دوسرے بدن میں منتقل ہو۔ عالم آخرت کی منتقل سے تناسخ بحث ہی نہیں کرتا۔ اور ان احادیث کی دلالت عالم آخرت پر ہے۔ عالم دنیا پر نہیں۔

اور پھر تناسخ کی تعریف میں یہ بات بھی شامل ہے کہ دوسرا بدن اپنے تمام اجزاء میں پہلے بدن کا مغائر ہو۔ یہ نہیں کہ بدن تو پہلا ہی ہو شکل و صورت بھی وہی ہو مگر اجزائے بدن میں انبساط، یا پھیلاؤ وغیرہ ہو جائے۔ تناسخ والے بھی اس کو نہیں مانتے اور اسی کے ساتھ قابل لحاظ ایک بات یہ بھی ہے کہ قطعی دلائل سے یہ بات بتا دی گئی ہے کہ اعمال کا بدلہ تناسخ کی شکل میں ناممکن و محال ہے کیونکہ بدلہ پانے کے وقت کسی عمل کی تکلیف محال ہے اور تکلیف سابق کے بغیر بدلہ کا تصور محال ہے اور تناسخ کے وقت یہ دونوں محالات لازم آتے ہیں اور اس کا ثبوت ہے کہ یہ محالات لازم آتے ہیں اور یہ ہے کہ اگر ایک شخص نے اچھے یا برے عمل کئے، اور مرنے کے بعد اس کی روح دوسرے انسانی بدن میں منتقل ہوئی یہ حالت ایسی ہوگی کہ وہ مکلف بھی ہے اور جزا یافتہ بھی۔ کیونکہ ہر فرد انسانی بغیر مکلف کئے ادھر میں نہیں لٹکایا جاتا۔ اس کی حیات کا ایک ایک سیکنڈ عالم تکلیف میں ہوتا ہے اور اگر اس روح کی منتقلی کسی ایسے بدن میں ہوئی جو غیر مکلف ہے جیسے بچہ، یا مجنون یا کوئی حیوان۔ اب اس بدن کی موت کے بعد روح لامحالہ یا تو کسی مکلف انسانی بدن میں منتقل ہوگی یا غیر مکلف اور حیوانی بدن میں، اور اس کو اس بدنی زندگی میں راحت بھی پیش آئے گی۔ اور تکلیف بھی تو یوں وہ جزا یافتہ ہوا۔ حالانکہ اس سے پہلے کی زندگی میں اس کو مکلف ہی نہیں کیا گیا تھا۔ اور یہ دکھ سکھ محض اتفاقی ہو کسی عمل کے سلسلہ میں نہ ہو تو پھر جزا، جزا ہی نہ رہی کیونکہ جزا تو عبرت و تنبیہ کے لئے ہوتی ہے جب گنہگاروں کی طرح بے گناہ بھی اس کے شریک ہوئے تو پھر یہ جزا عبرت کیسے ہوئی اور محل عمل خلط ملط ہو گیا۔ اور جو باتیں مطیع و فرمانبردار کو پیش آتی تھیں وہ غیر مطیع و نافرمان کو بھی پیش آئیں تو مطیع اعزاز و اکرام سے محروم ہو گیا۔

اور ایک نکتہ قابل غور یہ بھی ہے کہ اگر مومنین، صالحین بلکہ انبیاء و ائمہ کی ارواح عیش پرست، فاسق و فاجر سلاطین و امراء کے بدن میں منتقل ہوں تو یہ لازم آتا ہے کہ موت ثانی کے بعد بزرگوں کی روحیں عذاب پائیں گی۔ اور ان کی نیک بختی، بدبختی سے بدل جائے گی اور عزت و تکریم کے بجائے ذلت و اہانت سے دوچار ہوں گے۔ اور اگر اس کا الٹ ہو کر امراء و حکام۔ و سلاطین انبیاء و صلحاء کے اجسام میں نمودار ہو، تو یہ ضروری ہے کہ انبیاء و صلحاء زمانہ ماسبق کے انبیاء و صلحاء سے کمتر نہ ہوں، اوصاف میں زائد ہوں گے یا کم از کم برابر درجہ مرتبہ۔ اور وہ سب کے سب بشکل انبیاء و صلحاء۔ عیش پرست اور آسودہ حال ہوں گے۔ حالانکہ یہ خلاف واقعہ ہے۔ نیز روح کی بدن سے وابستگی کے بعد بدن کتنا بھی نعمت و آسودگی سے مالا مال ہو۔ وہ رنج والم سے بچا نہیں رہ سکتا۔ مثلاً بھوک، درد، بیماری یا اسی جیسی تکالیف اس کو کیسے معاف کر دیں گی۔ تو اس صورت میں فرمانبرداروں، انبیاء و ائمہ کو دکھ دینا لازم آیا جو صاف ظلم ہے اور اسی طرح روح کے بدن سے منسلک ہو جانے کے بعد اسے کتنے ہی رنج والم پیش آئیں۔ راحت و خوشی سے بھی وہ محروم نہ ہوگی گو وہ کسی قدر اور کسی وقت ہو سو ایسی صورت میں سرکشوں اور جابروں کا نعمت سے لطف اندوز ہونا لازم آیا۔

ایک اور بات یہ بھی قابل لحاظ ہے کہ اگر ابدان غیر متناہی ہیں تو نوع انسانی کا قدیم ہونا لازم آتا ہے۔ بلکہ ہر زمانہ میں انسانی ابدان کا

اگلے زمانہ سے کم ہونا محال ہوگا اور اگر وہ کسی حد پر ختم ہوا تو آخر کی طرف ختم ہونے سے تو یہ لازم آتا ہے کہ مکلف بدلہ پانے سے بچ جائے۔ اول (مشرق) کی طرف ختم ہونے سے لازم آتا ہے کہ بغیر تکلیف کا جزا پائے! اور اگر یہ کہیں کہ نوع انسانی کے خاتمہ پر جزا و سزا کا معاملہ آخرت پہ اٹھا رکھیں اور وہ وہیں جزا پائیں گے۔ تو ہم کہیں گے کہ اگلے اعمال کی جزا آخری بدن کے اعمال پر ختم ہوئی اور رک گئی ثواب آخری بدن کے اعمال کی جزا آخرت میں ابدی ہوگی اور ہمیشہ ہمیشہ باقی رہے گی۔ لہٰذا اگر پہلی جزا عدل پر مبنی تھی تو دوسری جزا سراسر ظلم ہوئی۔ اور اگر دوسری جزاء بمقتضائے انصاف تھی تو پہلی جزا ناقص و ادھوری ثابت ہوئی۔

اور اگر یہ کہیں کہ نوع کے ابتدائی درجہ میں عیش و الم محض اتفاقی تھا جزا کے طور پر نہیں تھا۔ تو ہم کہتے ہیں کہ پھر بعد میں آنے والے طبقات پر ظلم ہوا کہ وہ اتفاقی عیش و راحت سے محروم رہے۔ اسی طرح اگلے طبقوں کے حق میں بھی ظلم ہوا کہ قصور کے بغیر رنج و الم بھگتا۔

خلاصہ کلام یہ کہ تناسخ کو جزا کا ذریعہ کہنا عقلی و عرفی ہر دو کے قواعد کے صاف و صریح طور پہ مخالف و غلط ہے اور یہاں اس قسم کے تناسخ کا بطلان مقصود ہے۔

عقیدہ (۶) ۱۔ قیامت سے پہلے مردوں کی دنیا میں واپسی نہیں ہوگی۔ مگر امامیہ تو سب کے سب اور رافضیوں کے کچھ فرقے واپسی کے قائل ہیں وہ کہتے ہیں کہ "پیغمبر، وصی، سبطین، اور ان کے دشمن یعنی خلفائے ثلاثہ رضوان اللہ علیہم، اور جناب معاویہ رضی اللہ عنہ اور یزید مروان اور دوسرے ائمہ اور ان کے قاتلین، حضرت مہدی کے ظہور کے بعد زندہ ہوں گے اور حادثہ دجال سے پیشتر ان تمام قصور واروں کو عذاب دیا جائے گا اور ان سے قصاص لیا جائے گا پھر وہ مرجائیں گے اور قیامت میں پھر زندہ اٹھائے جائیں گے۔

ان کا یہ عقیدہ کتاب اللہ کے صریح خلاف ہے کہ بہت سی آیات واپسی کی تردید کرتی ہیں ان میں سے ایک آیت ہے۔

رَبِّ ارْجِعُوْنِ لَعَلِّیْٓ اَعْمَلُ صَالِحًا فِیْمَا تَرَكْتُ	اے میرے پروردگار تو مجھے دنیا میں لوٹا دے کہ وہ کام کرلوں، جو
كَلَّا اِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَآئِلُهَا وَمِنْ وَّرَآئِهِمْ بَرْزَخٌ	جنہیں ترک کر دیئے تھے ہرگز نہیں۔ یہ یونہی کہنے کی بات ہے جو کہنے والا
اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ	کہہ رہا ہے۔ اب تو (اس زندگی میں) قیامت تک ایک پردہ حائل رہے گا۔

اس آیت کے آخری جز وہم ورآئہم سے شیعہ اپنے دعویٰ کا اثبات کرتے ہیں مگر اس آیت کی موجودگی میں تو ان کو اتنا کہنے کی بھی گنجائش نہیں کہ چلو نیک اعمال کے لیے واپسی محال ہے، مگر اجرائے حدود و تعزیرات کے لئے واپسی محال نہیں۔ کیونکہ آیت کا آخری حصہ ہی تو مطلقاً واپسی کو روکتا ہے۔ شریف مرتضیٰ نے نامریہ (کتاب) میں کہا ہے کہ عہد مہدی میں، حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کو ایک درخت پر سولی دی جائے گی۔ پھر اس درخت کے متعلق بعض تو یہ کہتے ہیں کہ وہ سولی سے پہلے سرسبز ہوگا مگر سولی کے بعد خشک ہو جائے گا تو بہت سے لوگ بہک کر یہ کہنے لگیں گے کہ یہ بیچارے بے گناہ تھے کہ ان کو خواہ مخواہ سولی دی گئی۔ تب ہی تو یہ سرسبز درخت سوکھ گیا اور بعض دوسرے یہ کہتے ہیں کہ پہلے یہ درخت ٹنڈ منڈ سوکھا ہوگا سولی کے بعد ہرا بھرا ہو جائے گا اور اس سبب سے بہت سے لوگوں کو ہدایت ہو جائے گی اب اس ذہنیت پہ ماتم کیجئے یا تعجب کہ اس جھوٹ میں بھی تو باہم مختلف ہیں،

اور جابر جعفی جو اس فرقہ کے قدماء میں سے ہے کہ کہتا ہے کہ جناب امیر المومنین رضی اللہ عنہ اس دنیا میں واپس آئیں گے اور قرآن مجید میں قرب قیامت جس دابۃ الارض (زمینی چوپایہ) کے نکلنے کا ذکر ہے اس سے مراد آپ ہی ہیں۔ سبحان اللہ کیا حسن عقیدت ہے! ہوئے تم دوست جس کے اس کا دشمن آسمان کیوں ہو!

اور زیدیہ سب کے سب دنیا میں پھر واپسی کا سختی سے انکار کرتے ہیں اور انہوں نے اپنی کتابوں میں اس عقیدہ کو ائمہ کرام کے حوالے سے بڑے اچھے طریقے پہ رد کیا ہے لہٰذا اہل سنت کو ان خرافات کی تردید کی اب کیا ضرورت! وَكَفَى اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ الْقِتَالَ۔ (مومنوں کی طرف سے لڑنے کے لئے اللہ ہی بہت ہے) هُوَ الَّذِیْٓ اَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ——

(وہ ذات وہ ہے جس نے تمکو پیدا کیا پھر تمکو مارے گا پھر تمکو زندہ کرے گا پھر تم اسی کے پاس لوٹ کر جاؤ گے)

اصول امامیہ کے موافق اس عقیدہ کو باطل ثابت کرنے کی عقلی دلیل یہ ہے کہ اگر ان کو حد قصاص کی صورت میں دنیا کے ختم ہونے سے پہلے عذاب دیا جائے اور آخرت میں پھر دوبارہ ان کی پکڑ کی جائے تو یہ سراسر ظلم اور کھلی زیادتی ہے اسلئے لامحالہ آخرت میں عذاب سے وہ بری ہوں گے۔ اور اس صورت میں وہ آخرت کے بڑے اور دائمی عذاب سے چھٹکارا پالیں گے۔ اور وہاں کی ابدی راحت سے بہرہ ور ہوں گے اور یہ بات سخت خیانت اور بڑے جرم کے سراسر منافی ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے وَلَعَذَابُ الْآخِرَةِ أَشَدُّ وَأَبْقَىٰ ۔ (بے شک آخرت کا عذاب بڑا سخت اور باقی رہنے والا ہے) اور اگر دنیا کے عذاب سے مقصد دکھ دینا اور ایذا رسانی ہے تو یہ سب کچھ تو عالم قبر میں ہو ہی رہا ہے، اس کے لئے ان کو زندہ کرنا عبث و بیکار ہے اور عبث فعل کا صدور برا ہے اور اللہ تعالیٰ کو اس سے پاک ہونا چاہیئے اور اگر دنیا کے عذاب سے غرض لوگوں کو ان کی خیانت سے باخبر کرنا ہے تو اس کی ضرورت تو ان لوگوں کو تھی جو ان کے عہد میں موجود اور ان کی خلافت کے حق ہونے کا عقیدہ رکھنے والے تھے۔ اور ان کے معین و مددگار بنے ہوئے تھے۔ بلکہ ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ جناب امیر اور حضرات سبطین رضی اللہ عنہم کو اپنے اپنے عہد میں انتقام کی قدرت دی جاتی تاکہ بعد میں آنے والی امت گمراہی میں نہ پڑتی۔ اور ان کے کاموں اور کرداروں سے بروقت آگاہ ہوکر ان سے بیزار ہوتی، انتقام میں اتنی دیر لگانا کہ امت کا اکثر حصہ گذر چکا اور گزرنے والوں کو ان کی "بدکرداریوں" کی برائی کا پتہ تک نہ ہوسکا حکمت کے خلاف اور صلاح کے منافی ہے تو گویا اصلح کا ترک لازم آیا اور کاش یہ آخرت میں ہوتا کہ اگلے، پچھلے سارے جمع ہوتے اور سب کے سب اس جزا اور قصاص پر مطلع ہوتے تو وجہ جواز بھی ہوتی۔ امت کے بیشتر حصہ عمر میں یہ تعزیری واقعہ پیش نہیں آیا اور آخرت کے مجمع عظیم کے سامنے وہ پاک صاف اٹھائے جائیں گے۔ اب جب دنیا کا دم واپسیں ہے اس وقت کے چند حاضرین ان کی خیانت و گناہ پر مطلع بھی ہوئے تو اس سے حاصل کیا ہوا۔ وہ اس کو بھی دیگر انقلابات کی طرح کا ایک انقلاب جانیں گے اور کوئی عبرت نہ پکڑیں گے اور پھر ان کو اس وقت زندہ کریں گے تو یہ تمیز و فرق کون کرسکے گا کہ یہ ابوبکر ہیں۔ یہ عمر ہیں اور یہ معاویہ ہیں (رضی اللہ عنہم) سب کو یہی خیال ہوگا کہ چند لوگوں کے یہ نام رکھ لئے ہیں۔ جیسے اب بھی ایام عاشورہ میں کسی کا نام یزید، کسی کا نام شمر رکھ کر ان کی پٹائی کرتے ہیں اور یوں اپنا دل ٹھنڈا کرتے ہیں (کتنے شریر تھے یہ یزید و شمر کہ شیعوں کو خود اپنے بھائیوں کے ہاتھوں پٹوانے کا شوشہ چھوڑ گئے کیونکہ ان کا تو نام ہی استعمال ہوا ہے ہڈیاں تو درحقیقت ان کے اپنوں ہی کی ٹوٹتی ہیں۔ ان کو مار نہیں لگتی۔ ن)

اور اگر مہدی یا دیگر ائمہ کا یہ کہہ دینا کافی ہو کہ یہ عمر ہیں یہ ابوبکر ہیں (رضی اللہ عنہما) تو پھر ان کا یہ کہنا کیوں کافی نہ ہوا کہ ان کی خلافت ناحق و باطل تھی یا وہ ظلم و غصب کے مرتکب ہوئے ان کو زندہ کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ پھر اس صورت میں پیغمبر، وصی اور ائمہ کو عام لوگوں کے مقابلہ میں ایک زائد موت کا مزہ کیوں چکھایا جارہا ہے موت کے برابر تو کوئی دکھ اور الم نہیں اللہ تعالیٰ کو یہ کب گوارا ہوگا کہ ایک فعل عبث کی خاطر اپنے دوستوں کو الم شدید سے دوبارہ دوچار کرے۔

اور یہ صورت بھی تو پیش آسکتی ہے کہ جب ان کو زندہ کریں تو وہ قرائن سے یہ جان جائیں کہ ہمیں تعذیب اور قصاص کے لئے زندہ کیا گیا اور سابقہ زندگی میں ہم ناحق اور ائمہ برحق تھے۔ تو اس تنبیہ کے بعد ہوسکتا ہے کہ وہ صدق دل سے توبہ کرلیں (کیونکہ ظاہر ہے اس وقت تک توبہ کا دروازہ بند نہیں ہوا ہوگا) تو پھر ان پر عذاب کا کیا جواز باقی رہے گا (التائب من الذنب کمن لا ذنب لہ) اور پھر انہیں یہ بھی تو سوچنا چاہیئے کہ اس صورت میں جناب امیر اور سبطین رضی اللہ عنہم کی کتنی سبکی اور اہانت لازم آتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ اتنے ناقدرے تھے کہ ان کے لئے ان کے دشمنوں سے انتقام بھی نہ لیا۔ اور نہ انہیں کو ان پر حاوی کیا کہ یہ خود ہی اپنا انتقام لے لیتے اور جب سینکڑوں صدیاں گزر جانے پر مہدی پیدا ہوئے تو ان کی فریاد قبول ہوئی اور انتقام لیا۔

www.Ahlehaq.com

غرضیکہ اس عقیدہ کے مفاسد اتنے ہیں کہ آدمی لکھتا لکھتا تھک جائے مگر ان کا عدد شمار ختم نہ ہو! اس رجعت کا سب سے پہلا قائل عبداللہ بن سبا یہودی تھا۔ یہ شوشہ اسی کا چھوڑا ہوا ہے البتہ وہ صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رجعت کا قائل تھا۔ دوسری صدی کے شروع میں، جابر جعفی نے جناب امیر رضی اللہ عنہ کو بھی اس رجعت میں شریک کر دیا، مگر اس نے اس رجعت کا کوئی وقت و زمانہ متعین نہیں کیا۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ بحوالہ سفیان بن عُیَیْنَہ بیان کرتے ہیں کہ ایک روز ہم جابر جعفی کے گھر گئے تو ہم نے اس سے ایسی باتیں سنیں کہ ہمیں خوف پیدا ہوا کہ کہیں ہم پر چھت نہ آ پڑے، امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے جابر سے زیادہ جھوٹا، اور عطاء سے زیادہ سچا کوئی نہیں دیکھا۔ اور جب تیسری صدی کا آغاز ہوا تو اس زمانہ کے رافضیوں نے اپنے بغض کی آگ ٹھنڈی کرنے کے لئے تمام آئمہ اور ان کے دشمنوں کی رجعت کا عقیدہ گھڑ لیا۔

عقیدہ (۷) :۔ اللہ تعالیٰ اپنے گنہگار بندوں میں سے جس کو چاہے گا عذاب دے گا اسے کسی فرقہ کا پاس یا لحاظ نہ روک سکے گا۔ جیسا کہ فرمایا۔ يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَرْحَمُ مَنْ يَّشَآءُ (جس کو چاہتا ہے عذاب دیتا ہے جس پر چاہتا ہے رحم فرماتا ہے)۔

مگر امامیہ کا یہ عقیدہ ہے کہ کسی بھی امامی شیعہ کو نہ گناہ صغیرہ پر عذاب ہوگا نہ گناہ کبیرہ پر اور نہ آخرت میں عذاب ہوگا نہ عالم قبر میں۔ ان کا یہ عقیدہ ان کے ہاں مسلم اور اجماعی ہے۔ اسی لئے یہ ترک واجبات اور ارتکاب معاصی میں انتہائی بے باک ہوتے ہیں۔ اور اس عقیدہ کی دلیل یہ پیش کرتے ہیں کہ خلاصی اور نجات کے لئے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی محبت کافی ہے لیکن یہ نادان اتنا نہیں سمجھتے کہ صرف محبت تو (بلا عمل) خدا اور رسول کی بھی کافی نہیں تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی محبت کیسے کافی ہو سکتی ہے۔

اس سلسلہ میں ایک حکایت بیان کی جاتی ہے کہ اس فرقہ کا کوئی شخص کشمیر میں کسی حمام پر گیا۔ حمام والے نے پوچھا آغا تمہارا نام کیا ہے؟ اس نے کہا کلب علی (علی کا کتا) وہ بولا کہ ایسی کیا بات ہو گئی کہ غلام علی کی جگہ کلب علی نام رکھ لیا۔ وہ بولا کہ اس نیت سے کہ ممکن ہے علی کا کتا سمجھ کر بہشت میں جانے سے کوئی نہ روکے! وہ بولا کہ یہ ٹھیک تو ہے مگر جب خدا کا کتا بہشت میں نہیں پھٹک سکتا تو علی کے کتے کی کیا حیثیت کہ اسے جنت میں گھسنے دیا جائے۔

اگرچہ یہ عقیدہ خود ان کے اصول کے بھی خلاف ہے اور ان کی روایات کے بھی، لیکن چونکہ ہر نا جائز کو جائز کرنا، ترک طاعات اور تکالیف شرعیہ سے کنارہ کشی مد نظر ہے اس لئے بڑی ڈھٹائی سے اسے سینے لگا رکھا ہے۔ گویا اس معاملہ میں ان کا نفس امارہ ان کے علم و عقل پر غالب آ گیا ہے یہ عقیدہ ان کے اصول کے تو یوں خلاف ہے کہ اگر کسی امام نے کبیرہ کا ارتکاب کیا ہو اور اللہ تعالیٰ ان کو سزا نہ دے تو اللہ تعالیٰ پر ترک واجب کا الزام آتا ہے کیونکہ ان کے نزدیک گنہگار کو عذاب دینا اللہ تعالیٰ پر واجب ہے! بلکہ اس طرح عذاب دینے کو یہ عدل کہتے ہیں جیسا کہ اپنے موقعہ پر پہلے بیان ہوا۔ اور روایات کے یوں مخالف ہے کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ، جناب سجاد رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر ائمہ سے بذریعہ روایات صحیحہ ایسی دعائیں منسوب ہیں کہ وہ بارگاہ الٰہی میں رو، رو کر مانگتے تھے، تقصیرات پر عذر خواہ ہوتے اور اس کے عذاب سے پناہ چاہتے تھے، اور ان میں حرمت رسول، حرمت کعبہ و قرآن کے واسطے دیتے تھے۔ جب یہ بزرگان محترم خود اس قدر عالی مرتبہ رکھنے کے باوجود، پاداش عمل سے لرزتے، ڈرتے اور کانپتے تھے تو خالی محبت (وہ بھی دشمنی نما) کے مدعیوں کی یہ مجال و تاب کہاں کہ وہ اس پر غراتے پھریں، اور اس پر تکیہ کر کے دھڑلے سے ارتکاب مناہی و معاصی کیے جائیں۔

لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَاتٍ وَغَرَّهُمْ فِيْ دِيْنِهِمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ۔ فَكَيْفَ اِذَا جَمَعْنٰهُمْ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ۔

کہ ہمیں تو چند دنوں سے زیادہ آگ چھوئے گی بھی نہیں اور یہ دھوکہ ان کو ان باتوں کی وجہ سے تھا جو انہوں نے اپنے دین میں جھوٹ کے طور پر شامل کر لی تھیں۔ تو اس وقت ان کا کیا حال ہوگا۔ جب ہم ان کو ایک یقینی دن (قیامت) میں اکٹھا کر کے ہر ایک کے اعمال کا بلا کم و کاست پورا پورا بدلہ دیں گے۔ اور ان پر کوئی ظلم و زیادتی نہ ہوگی۔

www.Ahlehaq.com

اس سلسلہ میں ان کے پاس وہ چند دلچسپ روایات ہیں جو ان کے رو ساء نے احمقوں کو بہلانے کے لئے تراش لی ہیں۔ ان میں ایک روایت وہ ہے جو ابن بابویہ قمی نے بیان کی ہے، واضح رہے کہ قمی بدنامی کی حد تک جھوٹ بولنے اور روایات گھڑنے میں شہرت یافتہ ہے۔ یہ ایسے کھوٹے سکوں سے تھیلیاں بھری رکھتا ہے اور موقعہ بموقعہ ان سے بیوپار کرتا رہتا ہے۔

علل الشرائع میں مفضل بن عمر سے یوں روایت کرتا ہے۔

قَالَ قُلْتُ لِاَبِیْ عَبْدِ اللّٰہِ لِمَ صَارَ عَلِیٌّ قَسِیْمَ الْجَنَّۃِ وَالنَّارِ قَالَ لِاَنَّ حُبَّہٗ اِیْمَانٌ وَبُغْضَہٗ کُفْرٌ وَاِنَّمَا خُلِقَتِ الْجَنَّۃُ لِاَھْلِ الْاِیْمَانِ وَالنَّارُ لِاَھْلِ الْکُفْرِ فَھُوَ قَسِیْمُ الْجَنَّۃِ وَالنَّارِ لَا یَدْخُلُ النَّارَ اِلَّا مُبْغِضُوْہُ۔

میں نے ابی عبداللہ سے پوچھا کہ یہ علی (رضی اللہ عنہ) جنت دوزخ بانٹنے والے کیسے بن گئے؟ تو کہا کہ دراصل ان کی محبت ایمان ہے اور ان سے بغض کفر ہے اور جنت اہل ایمان کے لئے اور دوزخ اہل کفر کے لئے پیدا کی گئی اور چونکہ جنت میں وہی داخل ہوگا جو ان سے محبت کرتا ہوگا اور دوزخ میں وہی جائے گا جو ان سے بغض رکھتا ہوگا۔ اور اس طرح وہ جنت و دوزخ بانٹنے والے ہوئے۔

اس روایت کے جھوٹ ہونے کی یہ دلیل کافی ہے کہ حضرات ائمہ قرآن و شریعت کے خلاف ہرگز کچھ نہ فرماتے۔ کیونکہ اگر ایسا کرتے تو نہ صرف اپنی ہی تردید کرتے بلکہ اپنے باپ دادا کی تکذیب بھی کرتے۔ اور اس روایت میں بچند وجوہ شریعت کے مقرر کردہ قواعد کی مخالفت بھی لازم آتی ہے۔

اوّل: اگر کسی کی محبت ایمان اور اس سے بغض کفر بھی ہو تب بھی اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ جنت و دوزخ کا بانٹنے والا بھی ہو۔ دیکھو تمام انبیاء اور رسولوں، ائمہ اور حضرات سبطین کو بھی یہ مرتبہ حاصل ہے مگر وہ جنت و دوزخ کے بانٹنے والے نہیں ہیں۔

دوم: اگر حُبِّ علی ہی کامل ایمان ہو تو توحید، نبوت، آخرت، اور شیعوں کے دوسرے اہم اور ضروری عقائد سب باطل و بے کار ہو جائیں گے۔ اور دوسرے ائمہ کے متعلق بدگوئی و بدزبانی اور ایذا رسانی کا جواز پیدا ہو جائے گا اور اسے کوئی تسلیم نہیں کرے گا تو معلوم ہوا حب علی ایمان کامل نہیں۔ لامحالہ وہ جزو ایمان ہوگی۔ اور یہ بات بالکل واضح اور صاف ہے کہ جزو ایمان جنت کے داخلے کے لئے کافی نہیں۔

تیسرے اس جملہ کا لَا یَدْخُلُ النَّارَ اِلَّا مُبْغِضُوْہُ۔ بتاتا ہے کہ کوئی بڑے سے بڑا کافر جیسے فرعون، ہامان، نمرود، شداد عاد و ثمود۔ کوئی بھی دوزخ میں نہیں جائے گا کیونکہ علیؓ سے ان کو کوئی بغض نہیں تھا۔ اور یہ بات بالاجماع غلط اور باطل ہے۔

چوتھے: یہ کہ اگر یہ سب کچھ صحیح بھی مان لیں تو اس کا اصل مقصد و مدعا سے کوئی علاقہ و تعلق نہیں اسلئے کہ لَا یَدْخُلُ الْجَنَّۃَ اِلَّا مُحِبُّوْہُ کا مقصد و منشا صرف اتنا ہی ہے کہ محبین کے علاوہ کوئی جنت میں نہیں جائے گا یہ منشا نہیں ہے کہ ہر محب جنت میں جائے گا، ان دونوں باتوں میں جو فرق ہے اسے معمولی سمجھ والا بھی جانتا ہے۔

پانچویں: یہ کہ اگر ان سب سے قطع نظر کرلیں تو اس صورت میں رافضیوں کے تمام فرقے مثلاً غلاۃ، کیسانیہ، ناوسیہ، افطحیہ قرامطہ اور باطنیہ بھی جنت کے مستحق ہوں گے حالانکہ یہ امامیہ کے مذہب کے بھی خلاف ہے۔

جب اس روایت کا نشانہ بھی صحیح نہ بیٹھا اور مقصد برآری ہوتے نہ دیکھی تو زنبیل کذب سے یہ بابویہ ایک اور روایت نکال لایا

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ جَاءَنِیْ جِبْرَئِیْلُ وَھُوَ مُسْتَبْشِرٌ فَقَالَ یَا مُحَمَّدُ اِنَّ اللّٰہَ الْاَعْلٰی یُقْرِئُکَ السَّلَامَ وَقَالَ مُحَمَّدٌ نَبِیْ وَرَحْمَتِیْ وَعَلِیٌّ مُحَبَّتِیْ لَا اُعَذِّبُ مَنْ وَالَاہُ وَاِنْ عَصَانِیْ وَلَا اَرْحَمُ مَنْ عَادَاہُ وَاِنْ اَطَاعَنِیْ۔

ترجمہ:۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جبرئیل علیہ السلام میرے پاس خوش خوش آئے، اور کہا اے محمد اللہ جل شانہٗ نے آپ کو سلام کہا ہے، اور کہا ہے کہ محمد میرے نبی اور میری رحمت ہیں اور علی میری محبت! جس نے ان سے دوستی کی، میں اس کو عذاب نہیں دوں گا اگرچہ وہ میری نافرمانی کرے اور جس نے ان سے دشمنی رکھی میں اس پر رحم نہیں کروں گا اگرچہ

اس روایت کے جھوٹا ہونے کی دلیل یہ ہے کہ یہاں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں درحقیقت نبوت ثابت کی جا رہی ہے کیونکہ طاعت کا سوخت منکر انبیاء کا خاصہ ہے۔ نبی کے انکار کرنے والے کی طاعات حبط ہوتی ہیں۔ نیز اس روایت کی رو سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فضیلت بھی لازم آتی ہے کہ وہ تو اللہ کی محبت ہیں مگر حضور نہیں۔ کہ آپ کا نافرمان تو نافرمانوں میں کا ایک ہے اور مطیع، اطاعت گذاروں کے منجملہ ایک۔ مگر حضرت علیؓ کو دوست رکھنے والا حب علی کے اثر سے نافرمانی سے بے خوف ہے اور آپ سے بغض رکھنے والا بغض کے باعث طاعت کے اجر سے محروم نیز اس روایت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نماز، روزہ، طاعت و بندگی سب منسوخ اور بے کار محض ہیں اور گناہ خواہ صغیرہ ہوں یا کبیرہ انکی حرمت خاک بن کر ہوا میں اڑ گئی۔ اسلئے کہ جزائے نیک و بد کا معیار تو حب و بغض علیؓ ہے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ قرآن جو مخلوق کو گمراہی سے بچانے کے لئے اترا تھا اس میں ہدایت کی صفت ہی نہیں اسلئے کہ جو کام و نجات کی بات ہے یعنی حب علی و بغض علی وہ تو قرآن میں مذکور ہی نہیں۔ اور اگر مذکور ہوا بھی تو اس پیرایہ میں ہرگز نہیں جو ہر مکلف کے ذہن نشین ہو سکے۔ اور معمہ سمجھانے کی ہر ایک میں استعداد و طاقت نہیں۔ گویا قرآن مجید اسی چیز کی دعوت دیتا ہے جو آخرت کے لئے کسی کام کی نہیں۔ سوائے مشقت و رنج و کلفت و ملال اس سے کچھ حاصل نہیں۔ آخرت میں جو بات کام آتی قرآن اسی سے خالی ہے (نعوذ باللہ)

اور پھر ایسی باتیں نفس و شیطان کو مغرور و سرکش اور نافرمان بناتی ہیں اور ان جذبات کو قوی کرتی ہیں۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ انبیاء و اوصیاء جو نفس و شیطان کا راستہ روکنے کے لئے بھیجے گئے ہیں وہ اپنے منہ سے ایسی باتیں نکالیں۔ اب ان روایات کے تجزیہ کے آشکار ہونے کے بعد اسی سلسلہ میں ان کی معتبر کتابوں کی ایک اور روایت سنیئے تاکہ ان کا باہمی تعارض و تناقض سمجھنے میں مدد ملے۔

یہ روایت ان کے سردار اور پیشوا حسن بن کبش نے بحوالہ ابی ذر رضی اللہ عنہ بیان کی ہے

نَظَرَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِلٰى عَلِيِّ بْنِ اَبِيْ طَالِبٍ فَقَالَ هٰذَا خَيْرُ الْاَوَّلِيْنَ وَخَيْرُ الْاٰخِرِيْنَ مِنْ اَهْلِ السَّمٰوٰتِ وَاَهْلِ الْاَرْضِ هٰذَا سَيِّدُ الصِّدِّيْقِيْنَ وَسَيِّدُ الْوَصِيِّيْنَ وَاِمَامُ الْمُتَّقِيْنَ وَقَائِدُ الْغُرِّ الْمُحَجَّلِيْنَ اِذَا كَانَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ كَانَ عَلٰى نَاقَةٍ مِّنْ نُوْقِ الْجَنَّةِ قَدْ اَضَاءَتْ عَرْصَةُ الْقِيَامَةِ مِنْ ضَوْءِهَا عَلٰى رَاْسِهٖ تَاجٌ مُّرَصَّعٌ مِّنَ الزَّبَرْجَدِ وَالْيَاقُوْتِ فَتَقُوْلُ الْمَلٰئِكَةُ هٰذَا مَلَكٌ مُّقَرَّبٌ وَيَقُوْلُ النَّبِيُّوْنَ هٰذَا نَبِيٌّ مُّرْسَلٌ فَيُنَادِي الْمُنَادِيْ مِنْ تَحْتِ بُطْنَانِ الْعَرْشِ هٰذَا الصِّدِّيْقُ الْاَكْبَرُ هٰذَا وَصِيُّ حَبِيْبٍ عَلِيُّ بْنُ اَبِيْ طَالِبٍ فَيَقِفُ عَلٰى مَتْنِ جَهَنَّمَ فَيُخْرِجُ مِنْهَا مَنْ يُّحِبُّ وَيُدْخِلُ فِيْهَا مَنْ يُّبْغِضُ وَيَاْتِيْ اَبْوَابَ الْجَنَّةِ فَـ[1]

ترجمہ:- وہ کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے علی بن ابی طالب کی طرف دیکھ کر فرمایا کہ یہ آسمانوں اور زمین کے بسنے والے سب اگلوں پچھلوں سے بہتر ہے یہ صدیقوں کا سردار ہے اور وصیوں کا بھی۔ پرہیزگاروں کا پیشوا ہے اور محجلین (جن کے چہرے اور ہاتھ پاؤں سفید ہوں) کا رہبر! قیامت کے دن یہ جنت کی کسی اونٹنی پر سوار ہوگا جسکی روشنی سے میدان قیامت جگمگا اٹھے گا۔ اس کے سر پر زبرجد اور یاقوت سے جڑا ہوا تاج ہوگا پس ملائکہ کہیں گے یہ ایک مقرب فرشتہ ہے اور نبی کہیں گے یہ نبی مرسل ہے اس وقت بطنان عرش کے نیچے سے آواز آئیگی کہ یہ صدیق اکبر ہے یہ حبیب کا وصی ہے یعنی علی بن ابی طالب پھر یہ پشت جہنم پر جا کھڑا ہوگا اس میں سے اپنے دوستوں کو نکالے گا اور دشمنوں کو جھونکے گا پھر جنت کے دروازہ پر آئے گا اور اس میں جسے چاہے گا بے حساب داخل کریگا۔

اس روایت سے واضح ہو معلوم ہو گیا کہ محبان علی بھی اپنے گناہوں کی پاداش میں جہنم رسید ہوں گے اور عذاب بھگتنے کے بعد آپ ان کو اس سے نکالیں گے۔ تو یہ محبان علی وہاں کیوں اور کیسے چلے گئے۔ ان پر تو آتش دوزخ حرام تھی؟۔

۲۔ ابن بابویہ قمی کی بحوالہ جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ ایک اور روایت سنئے۔

قَالَ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ عَبْدًا مَّكَثَ فِي النَّارِ سَبْعِيْنَ خَرِيْفًا كُلُّ خَرِيْفٍ

کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک بندہ جہنم میں ستر خریف تک ہر خریف ستر سال کا ہوگا۔ داخل رہے گا فرمایا پھر وہ

---

[1] يُدْخِلُ فِيْهَا مَنْ يَّشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۔

www.Ahlehaq.com

مَبْعُوْنَ سَنَةً قَالَ ثُمَّ اِنَّهٗ سَاَلَ اللّٰهَ تَعَالٰى بِحَقِّ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ اَنْ يَّرْحَمَهٗ فَاَخْرَجَهٗ مِنَ النَّارِ وَغَفَرَ لَهٗ ۔

محمد اور ان کی آل کا واسطہ دے کر اللہ تعالیٰ سے کہے گا کہ وہ اس پہ رحم فرمائے۔ تو اللہ تعالیٰ جہنم سے اسے نکال دے گا اور اس کی مغفرت فرما دے گا۔

اب اگر یہ شخص محب علی تھا تو اتنی مدت تک یہ دوزخ میں کیا کرتا رہا۔ اور دشمن علی تھا تو اس کی معافی اور دخول جنت! یہ کیوں ؟

ان روایات کا آپ شیعوں کی طرف سے حسب دستور قدیم یہی جواب سمجھ لیں کہ دروغ گو را حافظہ نباشد! حقیقت اور بالکل ظاہر بات یہی ہے کہ جو شخص حضرت علی رضی اللہ عنہ کے عقیدہ کا مخالف ہوگا اس کو ان کی زبانی کلامی بلکہ دلی محبت بھی ہرگز ہرگز کوئی فائدہ نہ پہنچا سکیگی جب کہ وہ آپ کے طریقہ اور راستہ چھوڑ کر گمراہوں، شیطانوں، جھوٹوں اور روایات کا کاروبار کرنے والوں کے پیچھے چل پڑا ہو۔ اور صراط المستقیم گم کر بیٹھا ہو !۔

اس صورت میں یہ بھی لازم آتا ہے کہ خاتون جنت، جناب سبطین اور دیگر ائمہ کی ولایت کا انکاری مگر جناب امیر کی محبت کا دم بھرنے والا بھی جنتی ہو اور دوزخ کا عذاب اسے چھو بھی نہ سکے ! حالانکہ اسی معلم نے کہ جسکو یہ مفید کے لقب سے یاد کرتے ہیں اپنی کتاب المعراج میں یوں روایت کی ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى قَالَ يَا مُحَمَّدُ لَوْ اَنَّ عَبْدًا عَبَدَنِيْ حَتّٰى يَصِيْرَ كَالشَّنِّ الْبَالِيْ ثُمَّ اَتَانِيْ جَاحِدًا بِوِلَايَةِ مُحَمَّدٍ وَّعَلِيٍّ وَّفَاطِمَةَ وَالْحَسَنِ وَالْحُسَيْنِ مَا اَسْكَنْتُهٗ فِي الْجَنَّةِ ۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے محمد میرے کسی بندہ نے میری اتنی زیادہ عبادت بھی کی ہو کہ وہ پرانی مشک کی طرح ہو گیا ہو پھر اگر وہ میرے پاس اسی حالت میں آئے کہ محمد، علی، فاطمہ، حسن، حسین کی ولایت کا منکر ہو تو میں اسے جنت میں گھسنے بھی نہیں دوں گا۔

تو معلوم ہوا کہ کیسانیہ، سبطین رضی اللہ عنہما کی ولایت کے انکار کے باوجود، اور غلاۃ جناب امیر کے عقیدہ کے مخالف ہونیکے باوصف ناجی اور بہشتی ہوں گے (اس وقت امامیوں پر کیا گذریگی)

اگر امامیہ یہ کہیں کہ اس روایت میں پانچوں کا انکار ولایت مراد ہے اور ان میں جناب امیر بھی ہیں، تو شاید اس شخص کی عبادت انہیں کے سبب نامقبول ہوئی ہو کہ وہ جناب امیر کی ولایت سے انکار کرتا تھا۔ تو ہم کہتے ہیں کہ اس صورت میں ولایت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے انکار کرنا بھی جو بالاجماع کفر ہے۔ اعمال کے سوخت ہو جانے کے لیئے کافی ہوگا۔ اور انکار ولایت علی کا اس میں کوئی دخل نہ ہوگا۔

لامحالہ یہ ماننا پڑیگا کہ اس روایت میں ہر ایک کا علیحدہ علیحدہ انکار ولایت مقصود ہے۔ اور یہ ہمارے مدعا کے لیئے کافی ہے۔

ابتک ہمارا روئے سخن اثنا عشریوں کے علاوہ دیگر فرقوں کی طرف رہا ہے۔ اب ہم چاہتے ہیں کہ اثنا عشریوں کے متعلق بھی کچھ بیان کریں۔

معلوم ہونا چاہیئے کہ اثنا عشریوں کا یہ عقیدہ ہے کہ ان کے علاوہ شیعوں کے تمام فرقے دائمی طور پر جہنمی ہیں، ناجی صرف وہی ہیں۔ یہ ان کا مشہور خیال ہے۔ ابن مطہر حلی شرح تجرید میں لکھتا ہے کہ ان فرقوں کے بارے میں ہمارے علما کا اختلاف ہے۔

بعض کہتے ہیں کہ وہ ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے کیونکہ وہ جنت کا استحقاق نہیں رکھتے۔

بعض دوسرے کہتے ہیں کہ ان کو دوزخ سے نکال کر جنت میں لایا جائے گا۔

ابن نوبخت اور بعض دیگر علما کہتے ہیں کہ دوزخ سے تو نکلیں گے کہ بہرحال کافر نہیں ہیں لیکن جنت میں بھی نہ جاسکیں گے اس لئے کہ ایمان صحیح نہیں رکھتے جو استحقاق ثواب جنت کا سبب ہے، بلکہ اعراف میں پڑے رہیں گے۔

صاحب التقویم نے جو امامیہ کے بڑے علماء میں سے ہیں کہا ہے کہ صرف شیعوں میں بہتر فرقے ہیں جن میں نجات پانے والے صرف اثنا عشری ہیں۔ باقی شیعی فرقے کچھ مدت دوزخ کا عذاب بھگتیں گے پھر جنت میں چلے جائیں گے۔

حاصل کلام یہ کہ یہ ہمیشہ کا عذاب یا کچھ مدت کا۔ محبان جناب امیر کے لئے یقیناً ثابت کرتے ہیں۔ ہاں صاحب تقویم یہ بھی کہتا ہے کہ باقی کے تمام اسلامی فرقے وہ ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے۔ لہٰذا معلوم ہوگیا کہ ان کے نزدیک اہلسنت باوجود محبت جناب امیر کے ہمیشہ اور دائماً دوزخی ہیں۔ اس سے ان کا قاعدہ واصول جناب امیر کا اثباتی اور منفی پہلو سے ٹوٹ گیا۔

اب ان کے اس مذہب کو ذہن میں محفوظ رکھ کر توجہ سے ان کی روایات سنیئے۔

رویٰ ابن بابویہ عن ابن عباس عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم انہ قال والذی بعثنی لایعذب بالنار موحد ابداً

ابن بابویہ نے بحوالہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا کہ قسم ہے مجھے مبعوث کرنے والے کی کہ موحد کبھی دوزخ کا عذاب نہیں دیا جائے گا۔

اور طبرسی نے کتاب احتجاج میں حسن بن علی رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کی ہے۔

انہ قال من اخذ بما علیہ اھل القبلۃ الذی لیس فیہ اختلاف ورد علمہ ما اختلف فیہ الی اللہ سلم ونجی من النار ودخل الجنۃ۔

انہوں نے کہا کہ جس نے وہ راہ اختیار کی جس میں اہل قبلہ کا کوئی اختلاف نہیں اور اختلافی بات کو اللہ کے حوالہ کیا وہ محفوظ رہا اور دوزخ سے نجات پالی اور جنت میں جا پہنچا۔

اور کلینی نے بحوالہ زرارہ بسند صحیح یوں روایت کی۔

قال قلت لابی عبد اللہ اصلحک اللہ ارأیت من صلی وصام وحج واجتنب المحارم وحسن ورعہ ممن لایعرف ولا ینصب قال ان اللہ یدخلہ الجنۃ برحمتہ۔

اس نے کہا کہ میں نے ابی عبداللہ سے کہا اللہ آپ کو نیک بخت کرے اس شخص کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے جس نے روزہ رکھا نماز پڑھی حج کیا حرام سے بچا پرہیزگاری کا اچھا نمونہ پیش کیا، ائمہ کا نہ اقرار کرتا ہے نہ دشمنی رکھتا ہے آپ نے کہا اللہ تعالیٰ اسے اپنی رحمت سے جنت میں داخل کرے گا۔

یہ تینوں روایات اہلسنت کے ناجی ہونے پر صاف دلالت کرتی ہیں۔ اگر ائمہ کی معرفت نہ رکھتے ہوں۔ چہ جائیکہ ان کو مستحق امامت جانتے، ان کو اپنا پیشوا مانتے اور ان سے محبت ظاہر کرتے ہوں۔

اور ان کے مطالعہ سے ہر سمجھدار پر ظاہر ہوگیا ہے کہ یہ روایات جمہور شیعہ اور صاحب التقویم کے قول کی سختی کے ساتھ تردید کرتی ہیں۔ اور ابن نوبخت نجومی، مجوسی کا قول بالکل ہی باطل اور بے بنیاد ہے۔ یہ تو اب تک قواعد اسلام سے نابلد اور نا آشنا ہے۔ اسے یہ پتہ ہی نہیں کہ اعراف تو ایک عارضی قیامگاہ ہے، ہمیشہ رہنے کی جگہ وہ ہے ہی نہیں اصحاب اعراف تو آخر میں بہشت میں بھیج دیئے جائیں گے۔ مسلمانوں کے نزدیک یہی بات صحیح ہے۔

www.Ahlehaq.com

نواں باب ——— احکام فقہیہ

جن میں شیعوں نے ثقلین سے اختلاف کیا ہے

اس باب میں ان فقہی احکام سے بحث کی جائیگی جن میں شیعوں نے کتاب اللہ اور عترت سے مخالفت کی ہے ۔اس سلسلہ میں فرمان خداوندی ۔ اَمْ لَهُمْ شُرَكٰٓؤُا شَرَعُوْا لَهُمْ مِّنَ الدِّیْنِ مَا لَمْ یَاْذَنْ بِهِ اللّٰهُ (کیا ان کو کوئی شریک مل گیا ہے جو ان کے لئے دین کی ایسی راہ نکالتا ہے جس کی اللہ تعالیٰ نے اجازت نہیں دی) کا مضمون ان پر بالکل چسپاں ہوتا ہے ۔

شیعی فرقوں میں سے کیسانیہ اور غلاۃ کے فقہی مسائل و احکام بابوں، فصلوں میں مرتب اور تصنیف شدہ نہیں ملتے ۔اس لئے کہ اب ان کے اھل علم بھی نہیں ملتے اور انکی تصانیف بھی دستیاب نہیں لیکن یہ بات یقینی طور پر ثابت ہے کہ مختار ثقفی نے کافی کچھ احکامات نکالے اور ان کو شریعت قرار دیا تھا ۔وہ کہتا تھا کہ جبرئیل میرے پاس آتے اور وحی لاتے ہیں، اسی کی روشنی میں اندازہ لگا لیا جائے کہ اس کی فقہی احکام کی کیا حقیقت ہو سکتی ہے ۔

زیدیوں کے مجتہدین نے شریعت کے بہت سے احکام الگ طور پر ترتیب دے لئے ہیں ۔یمن کے اکثر شہروں میں ان کے علما بھی ملتے ہیں اور کتابیں بھی دستیاب ہیں ۔کتاب الاحکام انکی مشہور و معروف کتاب ہے ۔

عبیدیوں کے ظہور سے پہلے اسمعیلیہ اکثر مسائل میں امامیہ سے متفق تھے ان کے خروج کے بعد بہت سے دوسرے مسائل بھی گھڑے گئے چنانچہ ان کے کچھ مسائل اوراق ماسبق میں بیان بھی ہوئے ہیں ۔

قرامطہ اور باطنیہ ، نے تو شرائع و احکام کو سرے سے ختم ہی کرنا مقصد قرار دیا ہے اسی لیے ظاہر پر عمل نہ کرنا ہی اپنا شعار بنایا ہے ۔ لہٰذا فقہ اور شریعت کے درحقیقت اصلی دشمن یہی ہیں ۔ اسوقت ہمارے دیار و امصار میں اثنا عشری فرقہ کے علاوہ کوئی اور فرقہ ایسا نہیں جس کے احکام و مسائل مدون انداز میں تصانیف کی صورت میں ملتے ہوں ۔

یہ مناسب بھی ہے اور ضروری بھی کہ ان کی کتب فقہ کا بنظر غائر مطالعہ کیا جائے اور ان کا اسلوب شرعی اسلوب کے جسقدر مخالف یا ہٹا ہوا ہو اس کو واضح اور ظاہر کیا جائے ۔تاکہ اہل دانش و بینش انکی دروغگوئی افتراپردازی بناوٹ اور گھڑنت سے آگاہ ہو کر اس کا پورا پورا کھوج لگا سکیں ۔مسائل فقہیہ میں گو اہل سنت، کے ہاں بھی اختلاف ہے لیکن ہر ایک کا اعتماد و استدلال قرآن و حدیث و آثار پر ہی ہے ۔لیکن چونکہ ہر ایک کا طریق معانی فہمی جدا ہے اور علل شرائع بھی جدا اس لیئے اختلاف ناگزیر ہوا ۔بخلاف ان حضرات کے کہ ان کی خاص شرائع قرآن و حدیث کے اسلوب سے بالکل میل نہیں کھاتیں ۔ان کے متعلق آدمی یہی سوچتا ہے کہ یہ یہودی شریعت ہے یا نصاریٰ کی ۔یہ ہندوؤں کا دید اور شاستر ہے یا مایونیاں کی دساتیر ۔ یہ بحث چونکہ نہایت طویل الذیل ہے ۔اس لیئے مجبوراً بطور نمونہ مختصر سا بیان کرتے ہیں کہ عقلمند کو اشارہ ہی کافی ہوتا ہے ۔

ان کے احکام میں پہلا حکم صحابہ اور خلفائے ثلاثہ ۔نیز ان چند امہات المؤمنین کو جو بالاجماع حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو محبوب ترتھیں کافر ٹھہرانا ہے ۔اس حکم کا کتاب اللہ کے مخالف ہونا روز روشن کی طرح ظاہر ہے ۔

دوسرا حکم ۔حضرت عمر فاروق رضی اللہ پر لعنت ۔ اللہ کے ذکر سے بھی افضل ہونا ہے ۔حالانکہ کسی بھی دین و شریعت میں ابلیس تک پر جو گمراہی کا اصل الاصول ہے لعنت کرنے کو طاعت و عبادت شمار نہیں کیا گیا ۔چہ جائیکہ اسکو سب سے بڑی اور افضل الطاعت مانا جائے ۔ قرآن مجید میں صاف آتا ہے وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ (اللہ کا ذکر سب سے بڑی (عبادت) ہے)

تیسرا حکم۔ ہر نماز پنجگانہ کے بعد کبار صحابہ مہاجرین و انصار، خلفائے ثلاثہ، اور عشرہ مبشرہ رضوان اللہ علیہم کی اکثریت پر لعنت بھیجنا واجب اول قرار دینا ہے۔ یہ حکم بھی تمام ادیان و شرائع کے اسلوب کے خلاف ہے۔ اس لئے کہ تمام انبیاء و مرسلین علیہم السلام کے دشمن گذرے ہیں۔ مثال کے طور پر فرعون کو ہی لے لو کہ سالہاسال بنی اسرائیل اس کے مظالم کا تختۂ مشق بنے رہے۔ کون سی ایذا تھی جو انکو نہ دی گئی، قرآن مجید میں یہ آیت دیکھئے۔

وَاِذْ نَجَّيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ يُقَتِّلُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ۔ اور جب ہم نے تم کو آل فرعون سے نجات دلائی جو تم کو سخت عذاب سے ستاتے تھے، اور تمہارے لڑکوں کو قتل کرتے اور تمہاری لڑکیاں زندہ رہنے دیتے۔

یا فرمایا وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ۔ (اسی طرح ہم نے ہر نبی کے لئے شیطان آدمی بھی رکھے)

اس سب کے باوجود کسی بھی ملت و شریعت میں نبیوں اور رسولوں کے دشمنوں میں سے کسی پر بھی لعنت کو فرض و واجب قرار نہیں دیا گیا۔ نہ بعد نماز اسکو وظیفہ مقرر کیا، فرض و واجب تو ہے الگ مستحب بھی نہیں بنایا۔ اور نہ اس پر اجر و ثواب رکھا۔

چوتھے۔ عید غدیر کے نام سے ایک نئی عید اختراع کرلی۔ جو ۱۸ ذی الحجہ کو مناتے ہیں اسے عید الفطر و عید الاضحیٰ پر بھی فضیلت دیتے ہیں اور اسے عید اکبر کہتے ہیں۔ یہ حکم بھی شرع کے صریحاً مخالف ہے۔

پانچویں۔ ایک اور عید بنام بابا شجاع الدین۔ مقرر کرلی۔ یہ ان کے نزدیک حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے قاتل ابو لولوء کا لقب ہے جو آتش پرست مجوسی تھا۔ ان کے گمان کے مطابق اس عید کا دن ۹ ربیع الاول ہے۔ روایت ملاحظہ ہو۔

رَوٰى عَلِیُّ بْنُ مُظَاهِرِ الْوَاسِطِیُّ عَنْ اَحْمَدَ بْنِ اِسْحٰقَ اَنَّهٗ قَالَ هٰذَا الْيَوْمُ يَوْمُ الْعِيْدِ الْاَكْبَرِ وَيَوْمُ الْمُفَاخَرَةِ وَيَوْمُ التَّبْجِيْلِ وَيَوْمُ الزَّكٰوةِ الْعُظْمٰى وَيَوْمُ الْبَرَكَةِ وَيَوْمُ التَّسْلِيَةِ۔ علی بن مظاہر واسطی نے احمد بن اسحاق سے روایت کی اس نے کہا کہ یہ دن عید اکبر کا دن ہے۔ یہ دن بغلیں بجانے اور تعظیم کا دن ہے۔ یہ دن بڑی زکوٰۃ کا دن ہے یہ دن برکت اور تسلی و اطمنان کا دن ہے۔

احمد بن اسحاق ہی وہ پہلا شخص ہے جس نے شیعوں کے لئے یہ عید مقرر کی۔ بعد والوں نے یہ لکیر پیٹی۔ اور چند دنوں میں اس عید کے منانے کی نسبت کا رخ ائمہ کی طرف کر دیا۔ حالانکہ دراصل یہ عید مجوسیوں کی تھی کہ ان کے ایک فرد نے اسلام کا ایک ستون منہدم کر دیا تھا، اور جسکی خبر سنکر انہوں نے اظہار فرحت و شادمانی کا جشن منایا تھا۔ اور اس دن کو انتقام کا دن فخر کا دن اور تسلی کا دن کہا۔ اس لیئے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں ان پر ان کے دین پر اور ان کی سلطنت پر جو آفت ٹوٹی تھی وہ ظاہر ہی ہے۔ اس لئے وہ تو اس دن کو یوم العید بناتے ہی۔ رہا تاریخ کا معاملہ تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی شہادت بلا اختلاف ۸ ۲ ذی الحجہ کو واقع ہوئی اور یکم محرم کو آپ مدفون ہوئے! اگر ان کے بقول ائمہ یہ عید مناتے تھے۔ تو تاریخ کی تبدیلی کیوں کی؟ ویسے شیعہ خود بھی اس کے معترف ہیں کہ ائمہ کے زمانہ میں اس عید کا وجود نہ تھا۔ اس کا موجد اول احمد بن اسحاق ہی ہے۔

چھٹے نوروز کے دن کی تعظیم۔ کہ یہ بھی مجوسیوں کی عید ہے۔ ابن فہد نے مہذب نامی کتاب میں لکھا ہے کہ یہ سب دنوں میں بڑا دن ہے اور اس تعظیم کا مقصد اسلام میں محض جاہلیت کی رسوم رائج کرنا ہے۔

بطریق صحیح امیر المومنین رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ کوئی شخص نوروز کے دن حلوہ وفالودہ لایا۔ آپ نے دریافت فرمایا آج کیا خاص بات ہے جو یہ لائے ہو، اس نے کہا آج نیروز کا دن ہے اس پر آپ نے فرمایا نَيْرُوْزُنَا كُلَّ يَوْمٍ۔ وَمَهْرَجَانُنَا كُلَّ (ہمارا ہر دن نیروز ہے ہمارا سورج ہر دن طلوع ہوتا ہے)

یہ دراصل ایک دقیقہ کی طرف اشارہ ہے، کہ نوروز کی ایک ہی بات تو نئی ہے کہ آفتاب اپنی حرکت و رفتار خاص سے معدل النہار سے عرض شمالی میں رہنے والوں کی طرف رخ کرتا ہے، اور ان سے نزدیک تر ہوتا ہے۔ اسکی وجہ سے ابدان و اجسام میں گرمی و حرارت پیدا ہوتی ہے اور قوت نامیہ بھڑک اٹھتی ہے اور نفس نباتی تازگی حاصل کرتا ہے۔ مگر یہی بات روزانہ طلوع آفتاب کے وقت زیادہ پائی جاتی ہے کیونکہ آفتاب حرکت اولی

سے جو سب سے تیز اور سب سے ظاہر حرکت ہے دائرہ اُفق سے گذر کر اہالیان اُفق پر نورافشانی کرتا ہے۔ قوت بصر کو جلا بخشتا ہے۔ روح میں تازگی و بشاشت پیدا کرتا ہے۔ اور بہت سے انسانی منافع مثلاً زراعت تجارت، صنعت و حرفت میں بہتری کا باعث ہوتا ہے۔ گویا موت کے بعد آثار حیات نمودار ہوتے ہیں۔ جیسا کہ ارشاد فرمایا جَعَلَ لَكُمُ اللَّيْلَ لِبَاساً وَّ النَّوْمَ سُبَاتاً وَّ جَعَلَ لَكُمُ النَّهَارَ نُشُوراً۔ رات کو تمہارے لیے لباس، نیند کو آرام وسکون اور دن کو پھیلانے والا بنایا۔ یا فرمایا۔ وَجَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتاً وَّ جَعَلْنَا اللَّيْلَ لِبَاساً وَّ جَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشاً۔ ہم نے تمہاری نیند کو آرام رات کو لباس اور دن کو معاش بنایا۔

تو اگر اس میں عید بنانے کی کوئی بات ہے ہی تو اس وقت کو بناؤ۔ کیونکہ یہ منافع ہر روز، اسی وقت فیض عام کی طرح نوع بشر کو حاصل ہوتے ہیں اگر عقلمند اس معاملہ میں غور کرے تو اسے پتہ چلے گا کہ دن رات کے ایک چکر میں سال میں آنے والے چار موسموں کی کیفیات پائی جاتی ہیں، کہ صبح سے لے کر دوپہر تک فصل ربیع کی کیفیت ہے کہ سبزے تروتازہ اور پھول کھلے ہوتے ہیں حیوانی مزاج نشاط و فرحت میں ہوتے ہیں۔ جب آفتاب نصف النہار پر پہنچا تو گویا اپنی حرکت خاص سے رأس سرطان پر آیا۔ موسم گرما کی کیفیت کا آغاز ہوا۔ پژمردگی رونما ہوئی۔ پیاس، یبوست و خشکی جسموں میں غالب آنے لگی۔ اور جب غروب کی طرف جھکا تو گویا میزان میں آیا کہ فصل خریف کی کیفیات شروع ہوئیں اور جب آدمی رات ہوئی اور گھٹاؤ سے بڑھاؤ کی طرف رواں ہو تو گویا اب رأس جدی پر آیا اور موسم سرما کی کیفیات کا آغاز ہوا، شبنم برف کی طرح برسنا شروع ہوئی۔

ساتویں۔ جابر و ظالم بادشاہوں کیلئے سجدہ جائز قرار دینا آخوند باقر مجلسی اور ان کے دوسرے علماء نے اسے جائز رکھا ہے۔ حالانکہ قواعد کلیہ شرعیہ کے یہ بات صریحاً خلاف ہے جیسا کہ فرمایا۔ لَا تَسْجُدُوا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ وَاسْجُدُوا لِلّٰهِ الَّذِي خَلَقَهُنَّ إِن كُنتُمْ إِيَّاهُ تَعْبُدُونَ۔ چاند سورج کو سجدہ مت کرو، سجدہ اسی ذات اللہ کو کرو جس نے ان کو پیدا کیا۔ اگر تم اسی کی عبادت کرنا چاہو۔ یا ارشاد فرمایا۔ أَلَّا يَسْجُدُوا لِلّٰهِ الَّذِي يُخْرِجُ الْخَبْءَ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَيَعْلَمُ مَا تُخْفُونَ وَمَا تُعْلِنُونَ۔ اس اللہ کو سجدہ کیوں نہیں کرتے جو آسمانوں اور زمین میں پوشیدہ چیزوں کو نکالتا ہے۔ اور جو ان کو بھی جانتا ہے جو تم چھپا کر یا علانیہ کرتے ہو۔

غرض بہت سی آیات ہیں جو دلالت کرتی ہیں کہ سجدہ خاص طور پر شریعت مصطفوی میں اسی ذات برحق اللہ تعالیٰ کے لیے خاص ہے، جو طاقت والا ہے اور ہر پوشیدہ و ظاہر چیز کا جاننے والا ہے۔

اور یہاں حضرت آدم علیہ السلام کو فرشتوں کے سجدہ کرنے سے استدلال یکسر غلط اور بے اصل بات ہے۔ اس لیے کہ انسانوں کے احکام کو فرشتوں کے معاملہ پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ (اس کے علاوہ وہاں خاص طور پر اللہ تعالیٰ کا حکم صریح تھا کہ آدم کو سجدہ کرو۔ وہ تعمیل حکم الٰہی تھی۔ اور کسی دین و مذہب اور شریعت کا اسوقت نہ کوئی وجود تھا اور نہ یہ مکلفین کا سجدہ اصطلاحی تھا۔ ن) اسی طرح یوسف علیہ السلام کو ان کے بھائیوں کا سجدہ بھی نظیر نہیں بن سکتا کہ وہ اول تو اصطلاحی سجدہ نہ تھا۔ دوسرے سابقہ شریعتوں سے تمسک اسوقت درست ہو سکتا ہے کہ ہماری شریعت میں اسے منسوخ نہ کیا گیا ہو۔ اور یہ سجدہ ہماری شریعت میں منسوخ کر دیا گیا ہے۔ اگر یہ منسوخ قرار نہ دیا گیا ہوتا۔ تو پھر اس کے زیادہ حقدار حضور صلی اللہ علیہ وسلم، جناب امیر اور جناب سبطین و دیگر ائمہ ہو سکتے تھے۔ یہ جابر و ظالم شاہ عباس و طہماسپ کیوں حقدار ہوئے۔

اب احکام کے ذکر کے بعد ہم مسائل فقہیہ کو لیتے ہیں۔

(۱) ان کے نزدیک وہ پانی پاک ہے جس سے استنجا کیا گیا ہو۔ اور ابھی محل استنجا بھی پاک نہ ہوا ہو، اور اجزائے نجاست پانی میں تحلیل ہو گئے ہوں تا آنکہ پانی کا وزن بھی بڑھ گیا ہو۔،،

یہ مسئلہ قواعد شرع کے صریحاً خلاف ہے۔ کیونکہ شرعی حکم وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ۔ (یہ نبی تم پر گندی اور پلید چیزیں حرام کرتا ہے)، اور یہ مسئلہ ائمہ کی روایات کے بھی مخالف ہے۔ جیسا کہ قرب الاسناد نامی کتاب کے مرتب نے علی بن جعفر سے انہوں نے اپنے بھائی موسیٰ بن جعفر سے روایت

www.Ahlehaq.com

کی ہے۔ اور جیسا کہ ابو جعفر طوسی نے عبداللہ بن سنان اور ابی بصیر دونوں سے اور ان دونوں نے ابی عبداللہ سے روایت کی۔ اور جس طرح کتاب المسائل میں علی بن جعفر سے روایت کہ۔ انہ قال سألت اخی موسیٰ بن جعفر عن جرۃ فیہا الف رطل من ماءٍ وقع فیہ اوقیۃ بول ہل یصلح شربہ او الوضوء منہ قال لا یصلح لا یجوز استعمالہ۔ کہتے ہیں کہ میں اپنے بھائی موسیٰ بن جعفر سے اس مٹکے کے بارے میں پوچھا جس میں ایک ہزار رطل پانی ہو مگر اس میں ایک اوقیہ پیشاب پڑ گیا ہو کہ کیا ایسا پانی پینا جائز اور اس سے وضو صحیح ہو جائیگا آپ نے فرمایا نہیں۔ وہ نجس ہے اس کا استعمال جائز نہیں۔

اور اس میں لطف کی بات یہ ہے کہ اثناعشری مذہب اسی کے موافق بھی ہے۔ کہ جب پانی ایک گز سے کم ہو تو وہ نجاست پڑ جانے سے ناپاک ہو جاتا ہے، مگر اسکے باوجود معلوم نہیں استنجا کے پانی میں مقعد کے اس بار دیر رو ہو جانے کے بعد وہ کون سے اوصاف پیدا ہو جاتے ہیں کہ اسکی نجاست پڑ جانے کے بعد بھی پانی ناپاک نہیں ہوتا۔

اس مسئلہ نیز عنقریب آنے والے دوسرے مسائل سے صاف طور پر یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ان کے نزدیک انسانی براز ایسا ہی پاک ہے جیسا ہندوؤں کے ہاں گائے کا گوبر پاک ہے!

اگر کوئی اثناعشری اس مسئلہ سے انکار کرے تو ابن مطہر حلی کی کتاب منتہی ابھی دنیا سے نابود نہیں ہوئی۔ ان کے کتب خانوں میں یقیناً موجود ہوگی اسے کھول کر دیکھ لیں جس میں اس نے استنجے کے پانی کی پاکی بیان کرکے دوبارہ اس کے استعمال کے جواز پر پورے فرقہ کا بیان کیا ہے،

دوسرا مسئلہ شراب کی طہارت کا ہے جس کے متعلق ابن بابویہ جعفی اور ابن عقیل کی نصوص موجود ہیں کہ پاک ہے!

یہ مسئلہ بھی صریح قرآنی آیت کے خلاف ہے۔ اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنْصَابُ وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ۔ شراب، جوا، بت اور پانسے نجس اور کار شیطان ہیں۔

لغت میں رجس سخت نجاست کو کہتے ہیں۔ (ان اشیا و اعمال میں ظاہری اور معنوی دونوں قسم کی نجاستوں کا ذکر ہے) اسی لئے خنزیر کے بارے میں فرمایا فَاِنَّہٗ رِجْسٌ۔ (بلاشبہ وہ مجسمہ نجاست ہے)

اور پھر یہ ائمہ کی ان روایات کے بھی خلاف ہے جو خود شیعوں کی کتابوں میں موجود و مذکور ہیں۔ صاحب قرب الاسناد اور صاحب کتاب المسائل دونوں نے یہ روایات بیان کی ہیں۔ اور ابو جعفر طوسی نے ابو عبداللہ سے یوں روایت بیان کی ہے۔ اَنَّہٗ قَالَ لَا تُصَلِّ فِي الثَّوْبِ قَدْ اَصَابَہُ الْخَمْرُ (جس کپڑے پر شراب لگ گئی ہو اس سے نماز مت پڑھو)

تیسرا مسئلہ مذی کا ہے کہ یہ اسے پاک کہتے ہیں جو صحیح اور متفق علیہ حدیث کے خلاف ہے۔ راوندی نے موسیٰ بن جعفر سے انہوں نے اپنے باپ دادا سے انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کی کہ فرمایا میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مذی کے متعلق دریافت کیا تو آپ نے فرمایا جس کو یہ بات پیش آئے وہ حشفہ کو دھوئے۔

اور ابو جعفر طوسی اگرچہ مذی کی نجاست پر صریح روایت بیان کرتا ہے مگر نہ اس پر فتوی دیتا ہے نہ اس پر عمل رکھتا ہے۔

چوتھا مسئلہ یہ ہے کہ ان کے ہاں مذی کے نکلنے سے وضو نہیں ٹوٹتا۔ حالانکہ خود بھی ائمہ سے اس کے خلاف روایات بیان کرتے ہیں۔

طوسی نے یعقوب بن یقطین سے اس نے ابی الحسن سے روایت کی کہ اَلْمَذْیُ مِنْہُ الْوُضُوْءُ۔ (مذی نکلنے سے وضو کرنا چاہیئے۔

اور راوندی نے جناب علی رضی اللہ عنہ سے روایت کی کہ۔ قَالَ قُلْتُ لِاَبِیْ ذَرٍّ سَلِ النَّبِیَّ صلی اللہ علیہ وسلم عَنِ الْمَذْیِ فَسَئَلَ فَقَالَ یَتَوَضَّأُ وُضُوْءَہٗ لِلصَّلٰوۃِ۔ آپ نے کہا میں نے ابوذر سے کہا کہ نبی کریم صلی علیہ وسلم سے مذی کے متعلق پوچھنا، انہوں نے پوچھا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس کی وجہ سے وضو کرو ایسا وضو جو نماز کے لئے کرتے ہو۔

Www.Ahlehaq.com

www.Ahlehaq.com

پانچواں (۵) مسئلہ یہ ہے کہ یہ ودی کو بھی پاک کہتے ہیں جو گاڑھے پیشاب کو کہتے ہیں۔ اور پیشاب تینوں شریعتوں کے اجماع کے مطابق ناپاک ہے۔ بلکہ دوسرے باطل دینوں میں بھی ایسا ہی ہے۔

چھٹا مسئلہ یہ کہ ودی کے نکلنے سے بھی ان کے ہاں وضو نہیں ٹوٹتا حالانکہ یہ ائمہ کی روایات کے خلاف ہے۔ راوندی نے حضرت علی رضی اللہ سے حدیث مرفوع نقل کی ہے کہ اَلْوَدِیُّ فِیْہِ الْوُضُوْءُ (ودی کے نکلنے سے وضو کیا جائے) اس کے علاوہ بھی لوگوں نے ابی عبداللہ سے اسی قسم کی روایات بیان کی ہیں۔

ساتواں۔ یہ کہتے ہیں کہ پیشاب کرنے کے بعد عضو مخصوص کو تین مرتبہ جھٹک دو، اس کے بعد جو کچھ اس سے نکلے وہ پاک ہے اس سے وضو نہیں ٹوٹتا یہ مسئلہ بھی صریحاً خلاف شرع ہے۔ کیونکہ ہر دو راستوں سے نکلنے والی ہر چیز ناپاک بھی ہے اور وضو کو توڑنے والی ہے۔ اور اس سے پہلے عضو کے جھاڑنے کو بعد کی طہارت اور وضو نہ ٹوٹنے میں کیا دخل ہے۔ اور کیا واسطہ۔ یہ تو وہی بات ہوئی جو صابیوں کے رسائل میں پائی جاتی ہے کہ اگر کوئی شخص وضو کر کے تکبیر تحریمہ کہہ کر نماز کی نیت باندھ لے تو درمیان نماز وضو توڑنے والی کوئی بات پیش آجائے تو اس سے نماز میں کوئی خلل واقع نہیں ہوتا۔ اسکی مثال تو اس شخص سے ملتی جلتی ہے جس نے کسی کی ملاقات کی خاطر فرش فروش کا اہتمام کیا، لباس آرائش کا بھی خیال کیا، مگر جب وہ ملاقاتی آیا، تو فرش فروش بھی اٹھا دیا اور خود بھی ننگا ہو کر اس سے ملا۔ اور یہ توجیہ کرنے لگا کہ یہ سب اہتمام تو اس کے اعزاز میں تھا۔ اب دوران ملاقات میں ننگا ہو گیا تو کیا ہوا،

اور پھر یہ بات ائمہ کی روایات کے بھی مخالف ہے۔ کہ ابن عیسیٰ نے ابی جعفر سے روایت کی ہے۔ اَنَّہٗ کُتِبَ اِلَیْہِ هَلْ یَجِبُ الْوُضُوْءُ اِذَا خَرَجَ مِنَ الذَّکَرِ شَیْءٌ بَعْدَ الْاِسْتِبْرَاءِ فَقَالَ نَعَمْ۔ کہ ان سے تحریراً یہ پوچھا گیا کہ پاکی کے بعد اگر عضو مخصوص سے کوئی چیز نکلے تو کیا وضو واجب ہو جاتا ہے۔ آپ نے فرمایا۔ ہاں!

(۸) خانگی مرغا مرغی کی بیٹ کو بھی یہ پاک کہتے ہیں حالانکہ ائمہ کی نصوص سے اسکی نجاست و ناپاکی ثابت ہے۔ اور ان کی معتبر کتب میں یہ لکھا ہوا بھی ہے۔ مثلاً محمد بن حسن طوسی کی روایت بحوالہ فارس یوں ہے۔ اَنَّہٗ کَتَبَ رَجُلٌ اِلٰی صَاحِبِ الْعَسْکَرِ یَسْأَلُہٗ عَنْ ذَرْقِ الدَّجَاجِ یَجُوْزُ الصَّلٰوۃُ فِیْہِ فَکَتَبَ لَا۔ جناب حسن عسکری سے ایک شخص نے لکھ کر فتویٰ پوچھا کہ مرغ کی بیٹ کا کیا حکم ہے اس کے ملوث کپڑے سے نماز جائز ہے۔ آپ نے جواب لکھا۔ نہیں۔ اور ویسے بھی یہ بات خود ان کے قاعدہ کے بھی خلاف ہے۔ کہ حلال جانور کی بیٹ ناپاک ہے "۔ ابن مطہر نے منتہیٰ میں اس پر نص نقل کی ہے۔ ان سب کے باوجود مرغوں اور مرغیوں میں کیا خوبی پیدا ہو گئی کہ ان کی بیٹ پاک ہو گئی!

(۹) وضو میں ان کے نزدیک تمام چہرہ کا دھونا فرض نہیں۔ حالانکہ نص قرآنی فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَکُمْ۔ صراحتاً پورے چہرہ کو دھونے پر دلالت کرتی ہے۔ انہوں نے حد فرض اس فاصلہ سے مقرر کی ہے جو انگوٹھے اور بیچ کی انگلی میں ہے جبکہ ان کو پیشانی کے اوپر والے حصہ سے لے کر نیچے تک کھینچیں۔ اس اندازہ کی نہ شریعت میں کوئی اصل و بنیاد ہے نہ ائمہ سے اس قسم کی کوئی روایت منقول ہے۔ جناب امیر المومنین نے ایک مرتبہ جبکہ آپ مسجد کوفہ کے برآمدہ میں بیٹھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وضو کی نقل کر کے لوگوں کو دکھا رہے تھے، پورا چہرہ دھویا۔ اور حاضرین نے اسے دیکھا اور اس کی روایت کی۔ اس کے غلط اور باطل ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اگر انگوٹھے اور بیچ کی انگلی کو کشادہ کر کے اور پھیلا کر اوپر سے نیچے کی جانب کھینچیں گے تو ٹھوڑی کے متصل آکر وہ دونوں جانب سے گلے کا حصہ بھی گھیریں گی تو گویا گلے کے اتنے حصہ کا دھونا بھی فرض ہوگا۔ حالانکہ گلے کو چہرہ میں کوئی شامل نہیں کرتا۔ اور اگر ہر دو انگلیوں کو پیشانی کے مقابلہ میں پھیلائیں اور آہستہ آہستہ تنگ کرتے جائیں تو تنگ کرنے کی حد کیا ہے، یہ معلوم نہیں ہوئی۔ اور شرعی اندازے تو مکلفین کو بتانے کے لئے ہوتے ہیں نہ کہ چھپانے کے لئے!

www.Alhaq.com

(۱۰) کہتے ہیں کہ غسل جنابت کے ساتھ وضو حرام ہے۔ ان کا یہ مسئلہ بھی حدیث کے صریح خلاف ہے، اس لئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ اس غسل سے پہلے وضو فرماتے اور پھر تمام بدن پر پانی ڈالتے یہ سنت تواتر کے ساتھ ثابت ہے۔ اور ان کی یہ بات ائمہ کی روایت کے بھی خلاف ہے۔ چنانچہ کلینی نے محمد بن میسّر کے حوالہ سے ابی عبداللہ سے روایت کی، اور حسن بن سعد نے حضرمی سے اور اس نے ابی جعفر سے! دونوں نے کہا کہ پہلے وضو کرے پھر غسل کرے۔ جب آپ سے غسل جنابت کی کیفیت معلوم کی گئی!

(۱۱) یہ غسل نوروز کو بھی سنت کہتے ہیں۔ ابن فہد نے بھی یہی کہا ہے۔ یہ بھی دین میں ان کا گھڑا ہوا اور بناوٹی مسئلہ ہے، جس کو ان کی کتابوں میں کسی نے بھی جناب پیغمبر علیہ السلام یا جناب امیر رضی اللہ عنہ یا دوسرے ائمہ سے روایت نہیں کیا۔ کہ انہوں نے نوروز کے دن غسل کیا ہو! نہ عرب اس نوروز کو جانتے تھے، جانتے بھی کیسے یہ تو کافر مجوسیوں کی عید کا دن تھا۔ جب ان کے صحیح جانشین پیدا ہو گئے تو انہوں نے ڈھٹائی سے اپنے ہاں اسکو رواج دے لیا۔ مسلمانوں کو مجوسیوں کی عید سے کیا سروکار ؟

(۱۲) تیمم میں یہ دو ضربوں کے بجائے ایک ضرب بتاتے ہیں۔ حالانکہ ائمہ کی روایات اس کے خلاف بول رہی ہیں۔ علا نے محمد بن اسلم سے روایت کی کہ اس نے اپنے دادا سے تیمم کے بارے میں پوچھا تو کہا کہ ایک مرتبہ چہرہ کے لئے اور ایک مرتبہ دونوں ہاتھوں کے لئے ضرب لگائے لیث مرادی نے ابی عبداللہ، اور اسمٰعیل بن حزم نے جناب رضا سے بھی ایسی ہی روایت کی ہے۔ اس روایت میں پیشانی پر مسح کا اضافہ بھی کر دیا ہے حالانکہ شریعت میں اس کی کوئی اصل نہیں۔

(۱۳) ان کے ہاں ایک مسئلہ یہ ہے۔ موزہ، ٹوپی، ازار بند، پائتابہ، کمربند (پٹکا) اور عمامہ اور جو کچھ نمازی کے بدن پر ہو، جسکی چوڑائی پر نماز جائز نہ ہو، اگر اس پر نجاست لگ جائے چاہے وہ خفیفہ ہو یا غلیظہ، جیسے انسانی براز، تو نماز جائز ہے، نماز میں کوئی خلل نہیں ہوتا۔ یہ مسئلہ بھی حکم قرآنی کے بالکل خلاف ہے۔ وہاں تو حکم ہے وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ (اپنے کپڑے پاک کرو) اور ظاہر ہے کہ تمام چیزیں عرف و شرع میں لباس و کپڑوں کے زمرہ میں شمار ہوتی ہیں۔

(۱۴) ایک مسئلہ یہ ہے کہ نمازی کے بدن کے کپڑے مثلاً ازار، کرتہ، یا جامہ خون و پیپ میں بھر جائیں، تو بھی نماز جائز ہے۔ حالانکہ خون و پیپ اپنا ہو یا دوسرے کا۔ بلا شبہ نجاست اور ناپاک ہے۔

(۱۵) ایک مسئلہ یہ کہ نفل نماز میں نمازی خواہ کھڑا ہو، یا بیٹھا، اور ایسے ہی سجدہ تلاوت کہ ان میں قبلہ کی سمت کے خلاف رخ کرنا جائز ہے دین میں ان کی طرف سے یہ ایسا اضافہ ہے جسکی اجازت شریعت نے نہیں دی، سواری اور سفر کا استثنا تو شریعت میں ہے مگر اور کسی حالت میں قبلہ سے رخ ہٹانے کی اجازت نہیں۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور ائمہ کی روایات میں ان دو حالتوں کے سوا اس کا کوئی ثبوت نہیں۔ وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۔ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ ۔ تم جدھر سے نکلو اپنا منہ مسجد حرام کی طرف پھیرو۔ اور تم جہاں بھی ہو اپنا منہ اسی طرف رکھو۔ اب اس عموم میں سے پیغمبر علیہ السلام جس صورت کو مستثنٰی اور علیحدہ فرمادیں وہی قابل تسلیم ہوگی۔ آپ کے علاوہ کسی کی یہ تاب اور مجال نہیں کہ اپنی عقل سے کوئی استثنا کر سکے۔ اس مسئلہ میں ان کے شیخ مقداد نے کچھ انصاف سے کام لیا ہے اور اپنی تصنیف کنز العرفان فی احکام القرآن میں اعتراف کیا ہے کہ یہ مسئلہ قرآن کریم کے خلاف ہے۔

(۱۶) ایک مسئلہ یہ کہ اگر کوئی ایسی جگہ ہے جہاں خشک انسانی غلاظت بھی ہوگی ہے اگر وہ غلاظت نمازی کے کپڑوں یا بدن پر نہ چپکے تو اس پر کھڑے ہو کر نماز پڑھنا جائز ہے۔ حالانکہ نماز کی جگہ کا پاک ہونا شریعت کے تسلیم کردہ اور مقرر کردہ مسائل میں سے ہے!

(۱۷) مسئلہ اگر کوئی دونوں ہاتھ کہنیوں تک اور دونوں پاؤں گھٹنوں تک ایسے نالہ اور چوبچہ میں داخل کر دے جس میں بول و براز بھرا ہوا ہو، تو غلاظت صاف کر کے بغیر ہاتھ پاؤں دھوئے نماز پڑھنا جائز ہے۔ اسی طرح ایسے ہی غلاظت سے پُر حوض میں غوطہ لگا کر اور

www.Ahlehaq.com

غلاظت کو بدن سے اتار کر بغیر بدن دھوئے بھی نماز پڑھنا جائز ہے! ظاہر ہے ایسی صورت میں پانی سے دھوئے بغیر بدن پاک نہیں ہو سکتا جرم (دل) نجاست بدن سے اتار دینے سے پاکی حاصل نہیں ہوتی نہ ناپاکی کا اثر زائل ہوتا ہے۔ اس کام کے لیے ہی اللہ تعالیٰ نے پانی بنایا ہے۔ وَيُنَزِّلُ عَلَيْكُمْ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً لِيُطَهِّرَكُمْ بِهِ (اور آسمان سے پانی اتارتا ہے تاکہ اس کے ذریعہ تم کو پاک کرے) اور فرمایا وَأَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً طَهُورًا۔ (اور نازل کیا آسمان سے پاک کرنے والا پانی)

(۱۸) مسئلہ اگر کوئی نمازی نماز سے فارغ ہو کر یہ دیکھے کہ اس کے کپڑوں پر خشک پاخانہ، یا کتے بلی کی غلاظت، یا خون و منی لگی ہوئی ہے تو اس کی نماز درست ہو گئی۔ طوسی نے کتاب تہذیب میں یہ ... ہے، اور دوسروں نے بھی اسی طرح بیان کیا ہے۔ ظاہر ہے شرع میں کپڑوں کا پاک ہونا فرائض و شرائط نماز میں سے ہے،

(۱۹) مادر زاد برہنہ صرف عضو مخصوص اور اس کے معلقات پر گیلی مٹی لگا کر، بلا ضرورت و مجبوری۔ نماز پڑھ لے تو ان کے ہاں جائز ہے، یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ شرع میں عام حالات، خصوصاً، نماز، و عبادات اور مناجات میں ستر عورت کی کتنی تاکید ہے۔ اسی وجہ سے ان کے متاخرین میں سے ایک جماعت نے اس کی قباحت اور برائی محسوس کر کے جمہور کا قول تسلیم نہیں کیا۔ اور ائمہ و اہل بیت کے آثار سے دلیل لا کر اسکو غلط اور باطل ثابت کیا ہے۔

(۲۰) مسئلہ اگر کوئی شخص، داڑھی، مونچھ۔ بدن اور اپنے کپڑوں کو مرغ کی بیٹ سے لتھیڑے یا اس کی داڑھی، مونچھ یا رخسارہ پر اس کے پیشاب کے چھینٹے پڑ جائیں، یا عضو مخصوص کو پیشاب کرنے کے بعد تین مرتبہ جھٹک لے۔ یا مذکورہ جگہوں پر مذی مل لے۔ تو ایسی صورت میں دھوئے دھلائے بغیر نماز درست اور جائز ہوگی۔

(۲۱) نماز کی حالت میں چل کر ایسے خمیر کو جسے کتا بلی کھانا چاہتے ہوں اٹھا کر دسترس سے باہر جگہ پر رکھ دینا جائز ہے، اگرچہ چلنے کی مسافت شرعی دس گز کے برابر ہو، اس سے نماز میں کوئی خلل واقع نہیں ہوتا۔ حالانکہ فعل کثیر خصوصاً ایسا کام جس کا نماز سے کوئی تعلق نہ ہو باجماع روایات شرعیہ نماز کو باطل کر دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ وَقُومُوا لِلَّهِ قَانِتِينَ فَإِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا أَوْ رُكْبَانًا فَإِذَا أَمِنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللَّهَ كَمَا عَلَّمَكُمْ مَا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ۔ اللہ کی حاضری میں سکون سے کھڑے ہو اگر کوئی خوف کی حالت ہو تو پیدل یا سواری پر جیسا موقعہ ہو نماز پڑھ لو۔ اور جب امن کی حالت ہو تو جس طرح تم کو سکھایا گیا ہے اس کے مطابق نماز پڑھو۔

(۲۲) یہ کہتے ہیں کہ قرآن مجید کی بعض سورتوں کے پڑھنے سے نماز فاسد ہو جاتی ہے۔ مثلاً سورہ السجدہ۔ اور تین سورتیں اور۔ حالانکہ قرآن مجید میں آیت۔ فَاقْرَءُوا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْآنِ۔ (قرآن کا جو حصہ آسان ہو اسے پڑھو) عموم پر ناطق ہے۔ اور خود یہ فرقہ بھی اپنے ائمہ سے ایسی روایت بیان کرتا ہے کہ نماز ہر سورت سے جائز ہے۔ اور مزے کی بات یہ کہ یہ اس نماز کو بھی جائز بتاتے ہیں جس میں نمازی کوئی قرأت پڑھے اور دل میں یہ سمجھتا جائے کہ یہ قرآن منزل کا حصہ نہیں ہے بلکہ عثمان (رضی اللہ عنہ) اور ان کے دوستوں کے تحریف کردہ قرآن کا حصہ ہے

(۲۳) ان میں کے بعض عین حالت نماز میں کھانا پینا جائز بتاتے ہیں چنانچہ ان کے ایک معتبر فقیہ ابو القاسم نجم الدین نے شرائع الاحکام میں بصراحت اس کو بیان کیا ہے۔ حالانکہ متفق علیہ احادیث میں نماز کی حالت میں کھانے پینے کی ممانعت بیان کی گئی ہے۔ اور اس پر تو اس فرقہ کا اجماع ہے کہ اگر کسی رات کی صبح کو روزہ رکھنے کا ارادہ ہو تو اس رات کو عین وتر کی نماز میں تشنگی محسوس ہو تو پانی پینا جائز ہے۔

(۲۴) اگر کوئی کسی حسینہ سے بغلگیر ہو جائے اور اس حالت میں انتشار ہو، اور وہ عضو کو مقابل کے عضو کے مقابلہ میں رکھے اور اس کی وجہ سے مذی اس کی پنڈلی تک بہ آئے تو ایسی حالت میں بھی نماز جائز ہے۔ طوسی، ابو جعفر اور ان کے دوسرے مجتہدین کا یہی فتویٰ ہے! یہ ایسی حرکت ہے جو مقاصد شرع کی کھلم کھلا تردید کرتی ہے اور مناجات باری کی حالت کے صاف منافی ہے۔

(۲۵) اگر کوئی نمازی عین حالت نماز میں عضو مخصوص اور معلقات کے ساتھ مشغول رہے حتیٰ کہ تندی و انتشار کی نوبت بھی آجائے اور اس کی وجہ سے مذی بھی بہ نکلے تو نماز میں کوئی خلل پیدا نہیں ہوتا۔

(۲۶) ان میں کے بعض نے ائمہ کی قبور کی طرف ثواب و تقرب کی نیت سے رخ کر کے نماز پڑھنا جائز کہا ہے۔ حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ لَعَنَ اللّٰہُ الْیَھُوْدَ وَالنَّصَارٰی اِتَّخَذُوْا قُبُوْرَ اَنْبِیَاءِھِمْ مَسَاجِدَ۔ (اللہ تعالیٰ یہود و نصاریٰ پر لعنت کرے کہ انہوں نے اپنے انبیاء کی قبور کو سجدہ گاہ بنالیا)۔

(۲۷) انہوں نے ظہر و عصر اور مغرب عشاء کی نمازوں کو بغیر عذر اور بغیر سفر کے جمع کرنے کو جائز قرار دیا ہے۔ جو صراحتاً قرآنی فرمان کے خلاف ہے۔ حَافِظُوْا عَلَی الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوۃِ الْوُسْطٰی۔ (اپنی نمازوں کی حفاظت کرو خاص کر درمیانی نماز) اِنَّ الصَّلٰوۃَ کَانَتْ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ کِتَابًا مَّوْقُوْتًا۔ (مومنوں پر نماز اوقات کی تعیین کے ساتھ فرض کی گئی ہے۔

۲۸ امام غائب "کے خروج کے انتظار میں ظہر، عصر، مغرب اور عشاء چاروں نمازوں کو ملا کر پڑھنا ان کے نزدیک مستحب ہے۔

(۲۹) عام یا تجارتی سفر میں پوری نماز پڑھنے کا حکم لگاتے ہیں مگر روزہ چھوڑنے سے منع کرتے ہیں حالانکہ شریعت میں نماز روزہ کا ایک ہی حکم ہے۔ (یعنی رعایت دونوں عبادتوں میں ہے) ابن ادریس، ابن معلم اور طوسی وغیرہ نے اس فرق کی تصریح کی ہے، حالانکہ ان کی کتابوں میں ائمہ کی ایسی روایات موجود ہیں جن سے فرق نہ کرنے کا ثبوت ملتا ہے، چنانچہ معاویہ بن وھب نے ابی عبداللہ رحمۃ اللہ علیہ سے بیان کیا ہے۔ اَنَّہٗ قَالَ فَاِذَا قَصَرْتُ اَفْطَرْتُ وَاِذَا اَفْطَرْتُ قَصَرْتُ۔ (میں جس حالت میں نماز قصر کرتا ہوں تو روزہ نہیں رکھتا اور جب روزہ نہیں رکھتا تو نماز میں قصر کرتا ہوں)

۳۰ یہ کہتے ہیں کہ جن لوگوں کو قیام کم اور سفر زائد درپیش ہو جیسے سواری کو کرایہ پر چلانے والا کشتیوں کے ملاح وغیرہ یا وہ تجار جو پیشوں اور منڈیوں کی تلاش میں ہر وقت پا بر رکاب رہتے ہوں ان سب کے لئے جائز ہے کہ دن کی نمازیں قصر کریں اور رات کی پوری پڑھیں، اگرچہ دوران سفر پانچ ہی دن کے قیام کی نوبت آئے چنانچہ ابن زہرہ، ابن سراج اور ابو جعفر طوسی نے نہایہ اور مبسوط میں اس کے متعلق نص بیان کی ہے۔ حالانکہ اس صورت کے خلاف ائمہ کی روایات ان کے علم میں آچکی ہیں۔ کہ انہوں نے دن رات میں کوئی فرق نہیں کیا۔ محمد بن بابویہ نے اپنی صحیح میں ایک امام کی یہ روایت بیان کی ہے۔ قَالَ الْمُکَارِیْ وَالْمَلَّاحُ اِذَا جَدَّ بِھِمَا سَفَرٌ فَلْیَقْصُرْ۔ (کرایہ پر کام کرنے والا اور ملاح اگر ان کو سفر کی عجلت ہو تو وہ قصر کرلیں) عبدالملک نے بھی جناب صادق رحمۃ اللہ علیہ سے ایسی ہی روایت بیان کی ہے۔

(۳۱) نماز جن سفروں میں قصر کی جاتی ہے ان میں سفر مکہ، مدینہ، کوفہ اور کربلا کو شامل نہیں کرتے ان کے جمہور کا یہی مذہب ہے۔ (کہ ان چار مقامات کے سفر میں قصر نہ کریں) اور مختار مرتضیٰ اور بعض دوسرے کہتے ہیں کہ مشاہد ائمہ کے لئے سفر کا یہی حکم ہے۔ حالانکہ یہ مسئلہ آیت قرآنی فَاِذَا ضَرَبْتُمْ الخ کے خلاف ہے کہ اس میں سفر مطلق ہے اور جناب امیر المومنین رضی اللہ عنہ بھی تمام اسفار میں قصر کرتے تھے۔ اور اوپر محمد بن بابویہ کی جو روایت بیان ہوئی وہ بھی اطلاق پر دلالت کرتی ہے۔

۳۲ ان کے ہاں امام کی عدم موجودگی میں نماز جمعہ چھوڑ دینے کا حکم ہے۔ حالانکہ قرآن مجید میں ہے۔ یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوۃِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَۃِ فَاسْعَوْا اِلٰی ذِکْرِ اللّٰہِ۔ مسلمانوں جب نماز جمعہ کے لئے پکارا جائے تو اللہ کے ذکر کی طرف دوڑ پڑو۔ اس آیت میں امام کی موجوگی کی کوئی قید نہیں۔

(۳۳) اگر کسی کا بیٹا، باپ یا بھائی مر جائے تو اس کے لئے جزع و فزع کرنے اور کپڑے پھاڑنے کو جائز قرار دیا ہے۔ اور عورت کے لئے

تو ہر میت پر ایسا کرنا جائز ہے! حالانکہ تمام شرائع میں مصیبت کے وقت صبر کی تلقین کی گئی اور رونا پیٹنا، اور واویلا، حرام کہا گیا ہے اور صحیح احادیث میں تو یوں آیا ہے لَيْسَ مِنَّا مَنْ حَلَقَ وَسَلَقَ وَخَرَقَ (وہ ہم میں سے نہیں جو کسی کی موت پر) سر منڈائے، یا نوحہ کرے اور کپڑے پھاڑے اور ان الفاظ سے بیان کیا گیا ہے لَيْسَ مِنَّا مَنْ خَرَقَ الْجُيُوبَ وَلَطَمَ الْخُدُودَ. (وہ ہم میں سے نہیں جو گریبان پھاڑے یا گال پیٹے)

(۳۴) پانی میں غوطہ لگانے سے ان کے ہاں روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔ حالانکہ روزہ توڑنے والی چیزیں کھانا پینا اور جنسی فعل، بالاجماع ہیں۔ اسی لئے ان میں سے بہت سوں نے جب صحیح آثار اس مسئلہ کے خلاف پائے تو روزہ نہ ٹوٹنے کے قائل ہو گئے۔

(۳۵) ایک عجیب وغریب مسئلہ ان کے ہاں یہ بھی ہے جسکو ان کی اکثریت مانتی ہے کہ لڑکے کے ساتھ خلاف وضع فطری عمل کیا جائے تو اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔ حالانکہ ائمہ سے اس کے خلاف مروی ہے۔ اور اس بات پر تمام امت کا اجماع ہے کہ جو فعل حرکت انزال کا موجب ہو وہ مفسد صوم بھی ہے۔ چاہے کسی راستہ سے ہو!

(۳۶) ان میں سے بعض کے نزدیک جانور کی کھال کھانے سے روزہ نہیں ٹوٹتا اس کا کھانا بھی جائز ہے بعض کہتے ہیں پتے کھانے (مثلاً پان) سے روزہ میں خلل نہیں پڑتا۔ بعض دوسرے کہتے ہیں کہ جو چیزیں عادتاً نہیں کھائی جائیں ان کے کھانے سے بھی روزہ نہیں ٹوٹتا۔ اور اس کے باوجود غوطہ زن پر قضا اور کفارہ دونوں باتیں واجب قرار دیتے ہیں۔ اگرچہ غوطہ کے وقت اس کی ناک اور گلے میں ایک بوند پانی بھی نہ گیا ہو۔ اس افراط و تفریط کے کیا کہنے! یہ صورت تو شریعت کے مقاصد اور احکام کے اسباب وعلل سے دور جا پڑنے کی ہے۔

(۳۷) ان کے نزدیک عاشورہ کے دن کا روزہ عصر تک رکھنا مستحب ہے۔ حالانکہ کسی شریعت میں بھی روزہ کے معاملہ میں دن کے ٹکڑے نہیں کئے گئے، کہ بعض وقت میں روزہ ہو اور بعض میں نہ ہو۔ یہ تو مسلمانوں کا روزہ نہ ہوا ہندوؤں کا برت ہو گیا، کہ وہ دن میں بعض چیزیں کھانا جائز سمجھتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ سارے دن کا روزہ رکھیں۔

(۳۸) ۱۸ ذی الحجہ کو روزہ رکھنا ان کے نزدیک سنت موکدہ ہے، حالانکہ کسی پیغمبر، یا امام نے خصوصیت کے ساتھ نہ اس دن کا روزہ رکھا نہ اس دن کے روزہ کا کوئی ثواب بیان کیا۔

(۳۹) ان کے نزدیک اعتکاف صرف ان مساجد میں جائز ہے جن میں نبی، یا وصی نے جمعہ قائم کیا ہو ان کے علاوہ دیگر مساجد میں جائز نہیں۔ یہ مسئلہ بھی قرآن مجید کے صریحاً خلاف ہے کہ قرآن مجید میں وَاَنْتُمْ عَاكِفُوْنَ فِي الْمَسَاجِدِ۔ (اور تم مسجدوں میں اعتکاف کرتے ہو) آیا ہے کہ اس میں ہر مسجد شامل ہے۔ پھر اعتکاف کرنے والے کے لیے خوشبو سونگھنا، عطر لگانا بھی ان کے ہاں سخت ناجائز ہے! حالانکہ مساجد میں جانے کے لئے خوشبو لگانا بالاجماع سنت ہے! اور معتکف تو خوشبو لگانے کا زیادہ حقدار اور مستحق ہے۔ کہ وہ مسجد میں قیام کرتا ہے جو فرشتوں کی ہمنشینی کی جگہ ہے۔ اور فرشتوں کو خوشبو سے اُنس اور بدبو سے وحشت و نفرت ہے۔ اور یہ بات جملہ شرائع سے ثابت ہے۔

(۴۰) زکوٰۃ کے معاملہ میں ان کے ہاں یہ مسئلہ ہے کہ سونا چاندی اگر سکوں کی شکل میں نہ ہو تو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں۔ اور اگر سکوں کی شکل میں بھی ہو مگر وہ رائج نہ رہے ہوں، دوسرے ان کی جگہ رواج پا گئے ہوں تو ان سکوں پر بھی زکوٰۃ واجب نہیں۔ اس سلسلہ میں ان کے ہاں حیلہ کی یہ شکل بھی جائز ہے کہ اگر کسی شخص کے پاس چاندی سونے کا بہت سا سکہ ہو اور آخر سال تک وہ اسکی ملکیت میں بھی ہے، اگر سال ختم ہونے سے ایک دو دن پہلے بھی وہ ان سکوں کا زیور، کھلونے، برتن یا کوئی سامان آرائش بنوالے تو ان سے زکوٰۃ ساقط ہو جائے گی۔

ان مسائل میں اگر غور و تدبر سے دیکھا جائے گا تو معلوم ہوگا کہ مقاصد شرع سے یہ کتنے دور جا پڑے اور نص صریح کی مخالفت پر کتنے جری اور دلیر ہو گئے ہیں۔ قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے۔

www.AhleHaq.com

وَالَّذِیْنَ یَکْنِزُوْنَ الذَّھَبَ وَالْفِضَّۃَ وَلَا یُنْفِقُوْنَھَا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَبَشِّرْھُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ
جو لوگ سونے چاندی کو جوڑ جوڑ کر رکھتے ہیں اور اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے، انہیں دردناک اور سخت عذاب کی بشارت دیجئے

اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم یا ائمہ کے کلام میں جہاں کہیں زکوٰۃ کی فرضیت کا ذکر آتا ہے وہاں سونے چاندی ہی کا نام آتا ہے۔ دراہم و دنانیر کا نام نہیں آتا۔ (اس لیے جس چیز میں بھی چاندی سونا پایا جائے گا اس پر وہ فرضیت لاگو ہوگی۔)

(۴۱) اموال تجارت پر بھی ان کے ہاں زکوٰۃ واجب نہیں، جب تک، لین دین، رد و بدل اور الٹ پھیر میں ان کی نقدی (بصورت سکہ) نہ بچ جائے! اور ایسے مال میں بھی زکوٰۃ کو واجب نہیں کہتے جس کا کوئی عورت یا مرد مالک ہوا اور پھر اس نے اسے اپنا سرمایہ قرار دے لیا۔ اور نہ اس مال میں زکوٰۃ ہے جو کمائی کی خاطر خریدا مگر پھر اسے سرمایہ بنانے کی نیت کرلی۔ یا اس کے برعکس! حالانکہ شارع علیہ السلام کا حکم اَدُّوْا زَکٰوۃَ اَمْوَالِکُمْ۔ (اپنے مالوں کی زکوٰۃ دو) صاف ہے، اور ان مذکورہ چیزوں کے مال ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔

(۴۲) اگر کوئی نادار فقیر، مستحق زکوٰۃ۔ زکوٰۃ کے پیسہ پر، قابض، مالک اور متصرف ہونے کے بعد امیر ہوجائے تو ان کے نزدیک وہ زکوٰۃ واپس لے لینے کا حکم ہے۔ (چاہے وہ دینا نہ چاہتا ہو) حالانکہ کسی کا مال رضامندی کے بغیر لینا کسی بھی شریعت میں جائز نہیں۔ زکوٰۃ لیتے وقت اس کا مستحق ہونا شرط ہے۔ تمام عمر کے لیے یہ شرط نہیں!

(۴۳) ان کے ہاں ایک مسئلہ یہ ہے کہ اگر کسی کے پاس اتنی رقم ہے کہ سفر حج اور آمد و رفت کے تمام اخراجات نیز اہل خانہ کے نان و اپسی اخراجات بخوبی پورے ہوسکتے ہیں مگر اسکو یہ گمان ہے کہ واپس گھر آکر مزید ایک ماہ سے زائد یہ رقم پوری نہیں پڑے گی تو اس پر حج فرض نہیں۔ ابو القاسم نے شرائع میں اور دوسروں نے اس پر نص کی ہے۔ حالانکہ شارع نے حج کو استطاعت کی شرط سے مقید کرکے فرض فرمایا ہے اور استطاعت کی تفسیر یہ کی کہ اس کا پیسہ، سفر خرچ، سواری خرچ، اور آمد و رفت کی مدت میں اس کے اہل خانہ کے خرچ کو کافی ہوسکے۔ اگر واپسی پر پیسہ ختم ہو جائے تو اس سے استطاعت میں کوئی نقصان پیدا نہیں ہوتا کیونکہ ظاہر ہے واپس آکر ہر شخص اپنی سابقہ یا نئی معاش میں لگ جاتا ہے۔ بیکار نہیں بیٹھتا۔ (صرف استطاعت کا رخ بدلے گا پہلے خرچ کرنیکی استطاعت میں لگا ہوا تھا۔ اب کمانے کی استطاعت میں مشغول ہوسکیگا)

(۴۴) ان کے بعض کہتے ہیں کہ حج میں ستر عورت فرض نہیں ہے۔ ایام جاہلیت کی طرح برہنہ ہوکر طواف کرنے کو بھی جائز کہتے ہیں مگر یہ شرط لگاتے ہیں کہ اپنی شرمگاہ کو مٹی یا کسی چیز سے اتنا لتھیڑ لے کہ کھال نظر نہ آئے گو اسکی شکل دکھتی رہے اس میں کوئی حرج نہیں (کیا ننگے ہندو جوگیوں سے سرقہ تو نہیں؟) اس طرح تو انہوں نے رسم جاہلیت کو زندہ کیا ہے، ملت حنفیہ سے اس کا کیا ربط و تعلق۔ حالانکہ قرآن مجید میں خُذُوْا زِیْنَتَکُمْ عِنْدَ کُلِّ مَسْجِدٍ۔ (مسجد میں جاتے وقت اپنا لباس لے لو) کا صاف حکم ہے۔ اور روایات بھی اس مسئلہ کے خلاف موجود ہیں۔ اور خانہ خدا کے طواف کے وقت تو ادب کا انتہا سے زیادہ لحاظ رکھنا چاہیے وہاں ننگا ہوکر خانہ خدا کی بے حرمتی اور اپنی رسوائی نہ کرے۔ اور اہل جاہلیت کی مشابہت اختیار کرکے شیطان کی سواری نہ بنے!

اسی کے ساتھ طرفہ تماشا یہ بھی ہے کہ اگر احرام کی حالت میں زنا سرزد ہوجائے تو اثنا عشریہ کے نزدیک حج میں کوئی نقصان اور خلل نہیں ہوتا اور ننگوں میں یہی نہ ہوگا تو پھر کیا ہوگا۔ جب کوئی بے حیائی پر کمر باندھ لے تو جو چاہے کرے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان واضح اور صاف ہے کہ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِی الْحَجِّ۔ (حج میں نہ جماع ہے نہ بدکاری اور نہ دنگا فساد) اور زنا سے بڑھ کر رفث اور کیا ہوگا۔

(۴۵) احرام کی حالت میں اگر شکار عمداً کیا تو اس پر کفارہ واجب ہوگا، اور اگر دوبارہ پھر ایسا ہی کیا تو کفارہ نہیں۔ یہ ان کا مسئلہ ہے حالانکہ دوسری مرتبہ میں تو پہلے کی نسبت قصور زیادہ ہے کہ اس میں اصرار اور ڈھٹائی کا تاثر ملتا ہے۔

(۶ ہم) ان کے ہاں جہاد صرف پانچ اوقات کے ساتھ مخصوص ہے۔ (۱) سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں۔ (۲) جنابِ امیر رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت میں۔ (۳) حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی جناب معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ صلح سے پیشتر کے وقت۔ (۴) حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی ہمرکابی میں۔ (۵) امام مہدی کی سرکردگی میں۔ (حضرت علی اور جناب سبطین رضی اللہ عنہم کی ہمراہی میں انہوں نے جیسا جہاد کیا اس کا کچا چٹھا آپ اوراقِ گذشتہ میں ملاحظہ فرما چکے اب امام مہدی کے ساتھ یہ کیسا جہاد کرتے ہیں دیکھا چاہیئے)

ان مذکورہ پنج اوقات یا زمانوں کے علاوہ ان کے نزدیک جہاد عبادت تو کیا جائز بھی نہیں۔ حالانکہ جہاد سے متعلق یہ نص۔ اَلْجِهَادُ مَاضٍ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَةِ۔ (جہاد قیامت تک جاری ہے) بتواتر ثابت ہے! اس کے علاوہ قرآن مجید کی وہ آیات جو جہاد کی ترغیب و تاکید کے لیے وارد ہوئی ہیں ان میں کسی وقت اور زمانہ کی قید نہیں۔ بعض آیات تو ایسی ہیں جو صراحۃً اسباب پر دلالت کرتی ہیں کہ جہاد ان اوقات خمسہ کے علاوہ بھی عبادت اور اجرِ عظیم کا باعث ہے۔ مثلاً خلیفہ اول رضی اللہ عنہ کے رفقاء کے حق میں یہ آیت یُجَاهِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ۔ (کہ وہ اللہ کے راستہ میں جہاد کرتے ہیں) اور خلیفہ ثانی رضی اللہ عنہ کے لشکر کی شان میں یہ آیت سَتُدْعَوْنَ اِلٰی قَوْمٍ ...

اب یہ دیکھیے کہ جب ان کے نزدیک پنج اوقات کے علاوہ جہاد فاسد ہے تو فاسد جہاد کے مالِ غنیمت کی تقسیم بھی شرعی لحاظ سے درست نہ ہوگی۔ تو ایسی صورت میں جو لونڈیاں کسی کے قبضہ میں ہونگی وہ نہ انکی ملک ہوں گی اور نہ ان سے نفع اٹھانا جائز ہوگا۔ اس گتھی کو سلجھانے کے لیے انہوں نے ایک انوکھا فتویٰ گھڑا ہے۔ صاحب رقعہ مزورہ نے اس فتویٰ کی نسبت امام صاحب الزمان کی طرف کی ہے کہ یہ لونڈیاں سب امام کی ملک ہیں۔ اور ائمہ اپنی لونڈیوں کو اپنے شیعوں کے لیے حلال سمجھتے تھے۔ گویا اس حیلہ سے گرفتار شدہ باندیاں شیعوں کے لیے حلال ہوئیں! کتنے رکیک اور واہیات ہیں یہ حیلے کہ حیلہ گروں پر زمین و آسمان سے پھٹکار پڑنی چاہیے! اور بے حیائی اور بے باکی تو دیکھیے کہ جن فقہی کتابوں میں دین و ایمان کی باتیں مدوّن ہوتی ہیں ان میں ایسی شرمناک باتیں اپنا دین و مذہب بتا کر انہوں نے درج کی ہیں۔

اس سلسلہ میں جب اہل سنت ان کو کہتے ہیں کہ اگر ان اوقات کے علاوہ جہاد جائز ہی نہ تھا تو خلیفہ اول رضی اللہ عنہ کے زمانہ کے جہاد میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں اسیر ہونیوالی خولہ بنت جعفر یمامیہ پر جنکے لطن سے جناب محمد بن الحنفیہ رحمۃ اللہ علیہ ہیں جناب امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ کا تصرف کیسے درست تھا۔ کہ نہ تو بقول تمہارے وہ جہاد کا وقت درست تھا۔ اور نہ ہی خلیفہ وقت کی تقسیم درست تھی۔ اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ بروایت صحیح ثابت ہے کہ جناب امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ نے ان کو آزاد کر کے پھر عقد کیا تھا۔ لیکن یہ اتنا نہیں جانتے کہ مالک ہوئے بغیر آزاد کرنے کی تک ہی کیا ہے اس کا تو تصور بھی نہیں کیا جا سکتا لہٰذا پہلے آپ اس کے مالک ہوئے پھر آزاد کیا۔ اور آزاد کرنا خود ایک تصرف ہے۔ لہٰذا مدعا ثابت ہوا۔

(۷ ہم) ان کے نزدیک عقدِ نکاح یا معاملات خرید و فروخت صرف عربی زبان میں جائز ہیں کسی اور زبان میں جائز نہیں۔ حالانکہ کسی بھی شریعت میں دنیاوی معاملات میں لغات کا ہرگز اعتبار نہیں کیا اور نہ جناب امیر رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد میں خراسان اور فارس کے لوگوں کو اس کی تکلیف دی کہ وہ اپنے معاملات عربی زبان میں طے کیا کریں، بلکہ نکاح اور خرید و فروخت کے معاملات جو وہ اپنی زبانوں میں طے کر رہے تھے ان کو بدستور جاری اور نافذ و جائز رکھا۔ اور یہ بات عقل میں بھی نہیں آتی کہ ان معاملات نکاح و خرید و فروخت۔ طلاق کی صحت میں عربی زبان کا کسی قسم کا دخل ہو۔ کیونکہ ان معاملات میں اصل مقصد تو دلی منشا ظاہر کرنا ہوتا ہے۔ اور وہ عادتاً ہر قوم اپنی ہی زبان میں کرتی ہے،

(۸ ہم) ان کے ہاں باپ کی موجودگی میں چھوٹے بچے کے مال کا مختار دادا، ہوتا اور وہی ولایت کا حق رکھتا ہے حالانکہ شرع اور عرف دونوں

میں یہ طے شدہ بات ہے کہ ہر معاملہ میں ولی اقرب کے ہوتے ہوئے ولی ابعد کو کوئی عمل دخل حاصل نہیں ہوتا۔

(۴۹) ایک مسئلہ یہ ہے کہ تجارت میں مومن سے منافع لینا مکروہ ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ۔ (اللہ نے بیع حلال کی) اور اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ۔ (مگر یہ کہ وہ تجارت تمہاری باہمی رضامندی سے ہو) اس میں مومن و غیر مومن دونوں برابر ہیں کیونکہ تجارت کی بنیاد اور خرید و فروخت کا مقصد منافع ہی ہوتا ہے۔ اور پھر ہر عہد اور ہر شہر میں ساری امت کا عمل بھی سراسر اس کے خلاف ہے۔ اگر کوئی شخص دارالاسلام میں تجارت کا پیشہ اختیار کرنا چاہے تو یہ ممکن نہ ہوگا کہ وہ تجارت کر سکے۔ اور اس طرح ایران، خراسان، عراق، عرب اور یمن جیسے ملک تو تجارت کے فائدہ سے محروم ہوں گے۔ حالانکہ انبیاء و ائمہ نے مومنین کے درمیان تجارتی معاملات قائم کئے اور نفع لینے کی اجازت مرحمت فرمائی۔

(۵۰) کہتے ہیں کہ رہن شدہ چیز پر مرتہن کا قبضہ ہوئے بغیر ہی رہن جائز ہے حالانکہ شرع میں قبضہ کو رہن کی ضروریات اور لوازمات میں سے شمار کیا گیا ہے فَرِهٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ۔ ارشاد ربانی ہے۔ قبضہ کے بغیر وہ فائدہ مرتب نہیں ہوتا جو رہن سے مقصود ہے، اس لئے کہ رہن رکھنے والے کو رہن شدہ رقبہ میں دخل نہیں، وہ ملک تو راہن کی ہے، اس کی اجازت کے بغیر مرتہن کوئی فائدہ و نفع نہیں اٹھا سکتا۔ جو کچھ ہے یہی قبضہ تو ہے کہ جس کے ذریعہ بوقت ضرورت قرض وصول کر سکتا ہے۔ اگر یہ بھی نہ ہو تو رہن کا فائدہ کیا ہے اس کے علاوہ یہ مسئلہ ائمہ کی روایات صحیحہ کے بھی خلاف ہے۔ چنانچہ محمد بن قیس نے جناب باقر و صادق رحمۃ اللہ ہر دو سے یوں روایت بیان کی ہے۔

اِنَّهُمَا قَالَا: لَا رَهْنَ اِلَّا مَقْبُوْضًا۔ (ان دونوں نے فرمایا رہن قبضہ کی صورت ہی میں صحیح ہے)

(۵۱) اگر کسی شخص نے کسی کی لونڈی رہن رکھی تو ان کے نزدیک اس سے ہمبستری جائز ہے، حالانکہ یہ کھلا زنا ہے۔

(۵۲) ان کے ہاں اگر کوئی اپنی حرم یعنی مملوکہ لونڈی کو جس کے بطن سے بچہ پیدا ہو چکا ہو اور جسے فقہاء کے عرف میں ام ولد کہتے ہیں کسی کے پاس رہن رکھے تو یہ جائز ہے۔ بلکہ یہ تک جائز ہے کہ رہن رکھنے والے کو اجازت دیدے کہ وہ اس کے آگے پیچھے جس راہ سے چاہے جنسی فعل کر سکتا ہے۔ اب اس پر کیا تبصرہ کیا جائے، اس مسئلہ میں جو قباحت ہے یا یہ قواعد شرع کے جس قدر مخالف ہے وہ سب پر روشن ہے (حقیقت یہ ہے کہ اسے یہی فرقہ اپنے ماتھے کا جھومر بنا سکتا ہے۔

۵۳ مسئلہ ہے کہ اگر کوئی اپنا قرض کسی دوسرے پر اتار دے (کہ یہ ادا کرے گا) تو دوسرا اسے مانے یا نہ مانے ہر حال میں ادائیگی قرض اس پر واجب ہے! ابو جعفر طوسی اور اس کے استاد ابن النعمان نے اس پر نص کی ہے۔ اس حکم کا انوکھا پن یہی ہے کہ کسی شریعت میں یہ دھاندلی اور زبردستی یوں نہیں ہے کہ ایک کا قرض دوسرے کے قبول کئے بغیر اس کے سر تھوپ دیا جائے، اگر کہیں اس مسئلہ پر عملدرآمد شروع ہو جائے تو ایسی ہڑبونگ اور شورش برپا ہوگی کہ باید و شاید۔ ہر فقیر اپنے قرضداروں کو مارکیٹوں اور ساہوکاروں کے حوالہ کر جائے، اور صاحب ثروت تاجروں، ساہوکاروں کا مال کنگلے فقیروں کے قرضوں میں لٹ جائے تو کتنا عجیب تماشا ہوگا۔

(۵۴) ایک مسئلہ یہ ہے کہ کسی نے کسی کا مال چھین جھپٹ کر، یا دھوکہ فریب سے غصب کر کے کسی کے پاس امانت رکھ دیا۔ اور پھر امانت رکھوانے والا مر گیا، تو امین (امانت رکھنے والا) پر واجب ہے کہ وہ اس امانت سے انکاری ہو جائے۔ حالانکہ امانت سے انکار کی اللہ تعالیٰ نے بڑی سختی سے ممانعت فرمائی ہے۔ غصب کا گناہ تو غاصب کے سر ہے اس امانتدار کو امانت کا انکار کس طرح جائز ہوگا جھوٹ بول کر یا جھوٹی قسم کھا کر وہ آخرت کی جوابدہی اور پکڑ سے کس طرح بچے گا۔ اور دنیا میں اس کے لئے یہ جائز ہی کہاں ہوگا۔

(۵۵) یہ بھی ان کا مسئلہ ہے کہ اس غصب شدہ مال کا مالک ایک سال کی تلاش و جستجو کے باوجود مل سکے تو یہ مال فقیروں کو خیرات کر دیا جائے، حالانکہ غیر کے مال میں بغیر مالک کی اجازت خیرات کرنا شرع میں جائز نہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔

إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلٰى أَهْلِهَا۔ اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے مالکوں کو لوٹا دو۔

اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ أَدِّ الْأَمَانَةَ إِلٰى مَنِ ائْتَمَنَكَ وَلَا تَخُنْ مَنْ خَانَكَ۔ (جس نے تجھے امین بنایا اس کی امانت اسے لوٹا۔ اور جو تجھ سے خیانت کرے تو اس سے خیانت نہ کر) ابن مطہر حلی نے بھی اس حدیث کی صراحتاً تصحیح بیان کی ہے۔

(۵۶) مسئلہ یہ کہ ایک شخص نے کسی کا مال غصب کیا اور اپنے مال میں رلا ملا دیا کہ دونوں کی پہچان یا علیحدگی ممکن نہ رہی، مثلاً دودھ، دہی، گھی، گیہوں، شکر اور پانی وغیرہ تو حاکم کو چاہیئے کہ غاصب کا مال رلا ملا مال اس شخص کے حوالہ کردے جس کا مال غصب ہوا تھا سبحان اللہ! اس عدل وانصاف کے کیا کہنے! یہ تو غاصب پر کھلم کھلا ظلم ہے کیونکہ جس کو غاصب کا مال دیا جا رہا ہے، اس کا غاصب کے مال میں کیا حق پہنچتا ہے؟ کیونکہ اس سارے مال میں غاصب کا بھی تو مال شامل ہے۔ اور پھر ظلم کا علاج یا تدارک ظلم سے نہیں کیا جاسکتا۔

(۵۷) ایک مسئلہ ان کا یہ بھی ہے کہ اگر کسی شخص نے اپنی لونڈی کسی کے پاس رہن رکھی اور اسکو اجازت دی کہ جب چاہے اس سے لطف اندوز ہو تو یہ جائز ہے۔ امانتدار کو یہ حق ہوجاتا ہے کہ خوب آزادی سے گلچھرے اڑائے۔ اسی طرح اگر کوئی یوں کہدے کہ اس لونڈی کے تمام منافع تیرے لئے بحال کئے تو دوسرے شخص کے لئے اس لونڈی سے لطف اندوزی حلال طیب ہوجاتی ہے، اور ان کے ہاں شرمگاہ اس کے نام کی شرع یا تمام منافع کی آڑ میں عاریتاً دینا جائز ہے اور ام ولد کو ہمبستری کے لئے عاریتاً دینا بھی روا ہے۔ یہ تمام مسائل قرآن مجید کے احکامات کے بالکل مخالف ہیں اس لئے کہ قرآن مجید میں تو یہ فرمایا گیا ہے۔

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حَافِظُوْنَ إِلَّا عَلٰى أَزْوَاجِهِمْ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَإِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَاءَ ذٰلِكَ فَأُولٰئِكَ هُمُ الْعَادُوْنَ۔

اور وہ لوگ جو اپنی شرمگاہوں کی حرمات سے حفاظت کرتے ہیں ہاں مگر اپنی بیویوں اور مملوکہ لونڈیوں پر استعمال کرتے ہیں۔ تو ان پر ملامت نہیں ہے اور جو کوئی ان کے علاوہ کوئی اور صورت چاہے تو وہ حد سے گزرنے والے ہیں۔

(۵۸) یہ کہتے ہیں ہوشیار اور سمجھدار بچہ اپنے وارثوں سے بھٹک کر کسی کے پاس پہنچ جائے تو اسے اپنی نگرانی میں لینا اور اپنے گھر میں اس کی نگہداشت اپنے گھر میں کرنا جائز نہیں۔ (شاید اس لئے کہ ہوشیار بچہ ان کے نزدیک بھٹک نہیں سکتا ہوگا)۔ حالانکہ ہوشیار بچہ بھی گم ہوسکتا ہے۔ اور پھر اس کی نگرانی وحفاظت نہ کرنا اس کی ہلاکت کا باعث ہوسکتا ہے۔ وہ اپنی کم عمری کے سبب نہ نقصان رساں چیز کا دفاع کرسکتا ہے، اور نہ اپنی بقا کا منافع حاصل کرسکتا ہے، لہٰذا اسکو اپنی حفاظت ونگہداشت میں لینا جانوروں کی نگہداشت سے زیادہ اہم اور ضروری ہے۔

(۵۹) ان کے نزدیک اجارہ عربی زبان میں اس کا معاملہ کئے بغیر معتبر نہیں۔ (اجرت پر کوئی چیز لینا مثلاً سواری کے لئے کوئی گاڑی یا جانور وغیرہ۔ یا مثلاً رہنمائی کے لئے کوئی گائیڈ وغیرہ)

(۶۰) یہ مسئلہ بھی ان کے ہاں ہے کہ اگر کوئی شخص کافروں سے جہاد کرنے کے لئے لشکر میں بھرتی ہوجائے یا ڈاکوؤں کے قلع قمع ملی پولیس وسیکورٹی میں نوکر ہوجائے تو امام مہدی کی عدم موجودگی کے سبب وہ تنخواہ کا مستحق نہیں۔ کیونکہ امام کی غیر موجودگی کے سبب جہاد فاسد ہے صحیح نہیں ہے۔ لہٰذا تنخواہ کا معاہدہ بھی صحیح نہیں ہوگا۔

(۶۱) ایک مسئلہ یہ ہے کہ اگر ایک شیعہ نے اپنی ام ولد لونڈی کو کسی شخص کے پاس گھریلو کاموں وغیرہ کے لئے نوکر رکھا یا۔ اور اسکی شرمگاہ کو کسی دوسرے شخص کے لئے حلال کردیا۔ تو اس کی گھریلو خدمات ایک شخص کے لئے ہونگی اور جنسی خدمات دوسرے شخص کے لئے۔

(۶۲) ان کے نزدیک ہبہ عربی زبان کے بغیر درست نہیں۔ اب کوئی لاکھ بار کہے کہ میں نے تجھے یہ چیز بخشدی، یا دیدی وہ ہبہ معتبر نہیں ہوگا۔

www.Ahlehaq.com

(۴۳) ان کے نزدیک اپنی زرخرید (مملوکہ) لونڈی کو جنسی تلذذ کے لئے کسی کو بخشنا درست ہے اور شرمگاہ عاریتاً دینا بھی جائز ہے!

(۴۴) ان کے اکثر کے ہاں صدقہ واپس لے لینا جائز ہے۔ حالانکہ قرآن مجید میں لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ۔ (اپنے صدقے باطل مت کرو) کا حکم ہے۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے اَلْعَائِدُ فِيْ صَدَقَتِهٖ كَالْكَلْبِ يَعُوْدُ فِيْ قَيْئِهٖ (اپنا دیا ہوا صدقہ واپس لینے والا ایسا ہے جیسے کتا اپنی قے کو چاٹ لے)

(۴۵) ان کے ہاں بلی کو وقف کرنا جائز ہے۔ اب خدا جانے بلی میں وہ کونسا نفع نظر آیا یا فائدہ دیکھا کہ اس کا وقف جائز قرار دیا۔

(۴۶) ان کے ہاں کا ایک متفقہ مسئلہ یہ بھی ہے کہ لونڈی کی شرمگاہ کا وقف جائز ہے، اگر وہ لونڈی کرایہ پر چلے، یا کسی کے ساتھ متعہ میں جائے تو جس کے لئے وہ وقف کیگئی ہے اسکو وہ کمائی کھاتا جائز ہے۔ شیر مادر کی طرح ہضم کر سکتا ہے (یہ قحبہ گری شریعت کے نام پر اس لعنتی مذہب کے سوا کسی مذہب میں کاہے کو ملیگی)

(۴۷) ایک مسئلہ یہ بھی ان کے ہاں ملتا ہے کہ خواہش اور ضرورت ہونیکے باوجود نکاح نہ کرنا مستحب ہے۔ یہ مسئلہ انبیاء و اوصیاء کی سنت کے صریحاً خلاف ہے۔ ان حضرات نے خود بھی نکاح کیئے اور دوسروں کو بھی اس کا حکم دیا۔ انہوں نے چونکہ خواہشات کو پورا کرنے کا شیطانی طریقہ شرمگاہوں کو کرایہ پر چلا کر یا ہبہ کر کے یا عاریت دے کر اختراع کر لیا ہے۔ اس لئے یہ کیوں نکاح کا جھنجھٹ پالیں گے یا اس کی ذمہ داری کا بوجھ اٹھائیں گے۔

(۴۸) ان کا کہنا ہے جن ایام میں چاند برج عقرب میں ہو، یا تحت الشعاع، ان ایام میں نکاح مکروہ ہے۔ حالانکہ یہ امور مقاصد شرع کے خلاف ہیں جس کا مقصد نجوم پرستی کی بیخ کنی ہے! یہ بات ملت حنیفہ کے تو خلاف ہے البتہ صابئین کے موافق ہے۔

(۴۹) ان کے ہاں نو برس کی عمر تک لڑکی نہ پہنچ جائے خواہ وہ کتنی ہی تگڑی اور جسم و جان والی ہو اس سے صحبت حرام ہے۔ شرع میں اس کی کوئی اصل نہیں۔ اسے حرام کہہ کر مذہب کا رنگ دینا۔ انہیں کا کام ہے۔

(۵۰) یہ کہتے ہیں کہ حلال نکاح میں شرط کے طور پر زمانہ متعین میں جماع کی تعداد مقرر کرنا جائز ہے۔ مثلاً یہ کہ دن رات اتنی مرتبہ یا ایک ماہ میں اتنی مرتبہ یہ فعل کروں گا۔ اور پھر ہر دو پر شرط کے موافق مطالبہ و مواخذہ کا حق ہے۔ حالانکہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ وَلٰكِنْ لَّا تُوَاعِدُوْهُنَّ سِرًّا اِلَّآ اَنْ تَقُوْلُوْا قَوْلًا مَّعْرُوْفًا (ان سے کوئی خفیہ وعدہ نہ کرو جو کہو طور و طریق کے موافق کہو)۔ انہوں نے منکوحہ، مملوکہ، مانگی ہوئی، وقف کی ہوئی، اور امانت رکھی ہوئی، یا متوعہ لونڈی کے ساتھ خلاف وضع فطری فعل کو جائز قرار دیا ہے۔ حالانکہ قرآن میں حیض کی حالت میں صحبت کی ممانعت ہے، اور علت ممانعت نجاست و گندگی بتائی ہے۔ جب حیض کے راستہ کی حرمت کا باعث گندگی ہے تو پاخانہ کی گندگی و نجاست کے باعث اس کے راستہ کی حرمت کیوں نہ ہوگی۔ کہ اس کی ناپاکی تو اس راستہ کے آنتوں کے ہر وقت متصل رہنے اور ان میں اور ان میں نجاست کے بھرے رہنے سے زیادہ قابل حرمت ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صراحت کے ساتھ فرمایا ہے کہ جو شخص عورت سے غیر فطری راستہ کے ذریعہ یہ فعل کرے اس پر لعنت ملعون من اتی امراۃ فی دبرھا۔ اور یہ بھی فرمایا اِتَّقُوْا مَحَاشَّ النِّسَآءِ (عورت کے غیر فطری راستہ (میں عمل) سے بچو) یہ وہ حدیث ہے جس پر سب کا اتفاق ہے مقدادؓ نے بھی اس کی تصریح و تائید کی ہے۔ نیز اس حدیث میں وجہ حرمت کی طرف بھی اشارہ ہے محشہ کے لغوی معنی بیت الخلا کے ہیں، تو اس لفظ کا اشارہ یہ ہے کہ یہ جگہ بھی بیت الخلا کی طرح گندی، نجس، ناپاک اور قابل احتراز ہے! اسی طرح آپ کا یہ قول بھی ہے۔ اِنَّ الْحُشُوْشَ مُحْتَضَرَةٌ (بیت الخلا، حشوش بھتنے کی جگہیں ہیں) فن تشریح سے ناواقف بعض لوگوں کے دل میں یہ بات کھٹک سکتی ہے کہ پیشاب بھی تو ناپاک و نجس ہے۔ اس کے راستہ کو حلال کیوں کیا گیا۔ تو سطور ذیل سے انکی تشفی ہو سکتی ہے۔ فن تشریح میں یہ بات طے شدہ ہے کہ عورت

کی جائے مخصوص بناوٹ کے لحاظ سے تین سوراخوں پر مشتمل ہے۔ اوپر کا سوراخ وہ ہے جس کا سلسلہ مثانہ تک پہنچتا ہے اور اسی سوراخ سے پیشاب خارج ہوتا ہے۔ اسی کے ساتھ دوسرا باریک سوراخ اور ہے جو آنتوں سے ملا ہوا ہے جس سے کبھی کبھی ہوا خارج ہوتی ہے اور ان دونوں سے نیچے تیسرا کشادہ سوراخ ہے۔ جنسی فعل اسی میں ہوتا ہے۔ یہ رحم سے ملا ہوا ہوتا ہے۔ بچہ، اور حیض و نفاس کا خون اسی سے نکلتا ہے۔ اور یہ راستہ اسی وقت نجس و ناپاک ہوتا ہے جب حیض کا خون جاری رہتا ہے۔ اور اسی زمانہ میں جنسی فعل بھی حرام ہے، اس کے علاوہ یہ راستہ ایسا نجس نہیں رہتا کہ جنسی فعل جس وجہ سے نہ انجام دیا جا سکے۔ بخلاف پاخانہ کے مقام کے کہ اس کا راستہ ایسی آنتوں سے ملا ہوا ہے جو ہر وقت گندگی و بول و براز سے بھری رہتی ہیں، اس لئے یہ راستہ جنسی فعل کے لئے دائماً ممنوع ہے۔

(۲۶) یہ متعہ دَوریہ کو بھی جائز کہتے ہیں، ہمارے ملک اور زمانہ کے اثنا عشری گو اس کے جواز کا انکار کرتے ہیں مگر ان کے محققین اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ ان کی کتابوں میں اس کے جواز کا ثبوت موجود ہے۔ اس متعہ کی صورت یہ ہوتی ہے، کہ ایک پوری جماعت کسی ایک عورت سے متعہ کر لیتی ہے اور ان میں سے ایک شخص اپنی باری مقرر کر لیتا ہے۔ اور اپنی باری میں اس سے جنسی فعل کرتا ہے۔ حالانکہ کسی بھی مذہب میں ایک رحم میں دو نطفوں کا جمع کرنا درست قرار نہیں دیا گیا۔ بلکہ آدمی کو حیوانات سے جدا اور تمیز کرنے والی چیز در اصل نسب کی حفاظت ہی ہے۔ اسی لئے نسب کی حفاظت کو بھی، ان پانچ ضروری اور اہم تحقیقات میں شامل کیا گیا ہے جن کی حفاظت کا حکم ہر ملت و مذہب نے دیا ہے جو یہ ہیں، (۱) حفاظت نفس (جان)، (۲) حفاظت دین، (۳) حفاظت عقل۔ (۴) حفاظت نسب۔ (۵) حفاظت مال، یہی وجہ ہے کہ ہر شریعت میں، قصاص، جہاد، حدود قائم کرنے، نشہ آور اشیاء کو حرام ٹھیرانے۔ زنا کاری کا انسداد کرنے، متعہ، چوری اور غصب، ان کے متعلق بڑے سخت اور تاکیدی احکام ہیں۔ ان سب کا تعلق تحفظات خمسہ بالا سے ہے وہ بالکل کھلا اور صاف ہے۔ اور متعہ کی صورت میں تحفظ نسب کی اہمیت اور ضرورت کا صاف انکار ہوتا ہے۔ پھر حیا، عفت، غیرت، عزت، اور ناموس، جو تمام ملتوں اور مذہبوں میں پسندیدہ اوصاف مانے جاتے ہیں۔ سب کا جنازہ نکل جاتا ہے۔ اور بُری اور ناپسندیدہ باتوں کو پنپنے کا موقعہ مل جاتا ہے۔ اور اگر کوئی ہوشمند متعہ کی گہرائی میں جھانکے تو اسے وہ تمام مفاسد اور برائیاں نظر آ جائیں گی جو اس عقد فاسد کی تہ میں پوشیدہ ہیں اور جو سب کی سب شرع کے خلاف اور حکم الٰہی کی ضد ہیں۔ مثلاً

الف:۔ یہ فعل اولاد کو ضائع بلکہ ہلاک کرنے کا ذریعہ بنتا ہے۔ کیونکہ جب کوئی شخص، محلہ، محلہ، یا بستی، بستی اور ملک ملک متعہ کرتا پھرے گا۔ تو ظاہر ہے اول تو اسے پتہ نہ چلے گا کہ اس کے نطفہ کے گل بوٹے، کہاں کہاں کھلے، پتہ چل بھی جائے تو سب کو اپنے زیر تربیت رکھ کر ان کی حفاظت کیسے کریگا۔ اور ان کو یہ کیسے یقین ہوگا کہ وہ اس کی اولاد ہے، لامحالہ ایسے بچے آوارہ گردوں کی طرح پلے بڑھیں گے۔ اور اس کے لئے ان کی غور و پرداخت کے لئے ان تک پہنچنا ناممکن ہوگا۔ ایسے حالات میں، ان کے ضیاع اور ہلاکت میں کیا شبہ رہا۔ اور اگر وہ بچہ لڑکی ہوئی تو اور بھی رسوائی کا باعث ہوگا۔ ان کے لئے ہمقوم اور ہم نسل اور ہم کفو شوہر ملنا تصور میں بھی نہیں آ سکتا۔

ب:۔ متعہ کی صورت میں باپ یا بیٹے کی ممتوعہ سے ہمبستری کا واقعہ خارج از امکان نہیں۔ بلکہ خطرہ تو اس بات کا بھی ہے کہ بیٹی، پوتی، نواسی، بہن، بھانجی، اس راستہ میں ٹکرا جائیں۔ جو سب کی سب محرمات میں سے ہیں۔ اور ایسا ہونا ناممکنات میں سے نہیں۔ خصوصاً ایک طویل مدت گذرنے کے بعد، اس لئے کہ ایک آدھ ماہ تک تو حمل قرار پا جانے کا پتہ ہی نہیں چلتا۔ اور پھر اگر متعہ دوران سفر ہو، اور سفر بھی طویل ہو، ہر منزل پر ایک متعہ ہو، اور ہر متعہ میں نطفہ قرار پائے اور ان سے لڑکیاں پیدا ہوں۔ اور دس، پندرہ، بیس سال، بعد یہی شخص یا اس کا بیٹا یا بھائی انہیں منزلوں میں سفر پر نکلیں، تو ہو سکتا ہے ان محرمات میں سے کسی سے مڈبھیڑ ہو جائے، اور وہ متعہ یا نکاح کرے!

www.Ahlehaq.com

ج :۔ جس نے بہت سے متعہ کیے ہوں گے اس کی میراث کی تقسیم ناقابل عمل ہوگی، کیونکہ یہی پتہ نہ ہوگا کہ کون کون وارث ہیں اور وہ کہاں کہاں ہیں، اور جب تک یہ معلوم نہ ہوگا وارث کا معاملہ نفاذ سے رکا رہے گا۔

د :۔ اسی طرح متعہ سے پیدا ہونیوالی اولاد کی میراث بھی تقسیم نہیں ہو سکے گی کہ اس کو معلوم ہی نہیں کہ اس کے باپ، یا بھائی، کون کون، کہاں کہاں ہیں۔ اور جب تک تمام ورثا کی تعداد کا پتہ نہ لگے میراث کیسے تقسیم ہو سکتی ہے۔ اسی طرح ان ورثاء کی جنس کا حال ہے کہ کون عورت ہے۔ کون مرد، اور کون میراث کے سلسلہ میں ایک دوسرے کا حاجب ہے یا ایک دوسرے کو کون محروم کرتا ہے۔ یہ ساری تفصیلات جب تک معلوم نہ ہوگی وارثوں کے حصے مقرر نہیں ہو سکتے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ متعہ کے حلال ہونے کی صورت میں نظام شریعت خصوصاً نکاح اور میراث کے معاملات سارے کے سارے درہم برہم ہو جائیں اس کی پوری تفصیل جاننے کے خواہشمند حضرات فوائد القلوب مطالعہ فرمائیں جو اہل سنت کے ایک محقق عالم کی تصنیف ہے!

اور لونڈیوں یا امہات الاولاد کے حلال کر دینے میں متعہ سے بھی زیادہ خرابیاں لازم آتی ہیں اور یوں ان کے حلال کرنے سے پوری نوع انسانی میں عظیم فساد برپا ہو جاتا ہے، اور اسی فساد کی پیش بندی کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب محکم میں جماع حلال کے صرف دو طریقے مقرر فرمائے، ایک علی الاعلان، بموجودگی گواہان نکاح صحیح دوسرے ملک یمین کی شکل، یعنی شرعی طریقہ سے مملوکہ لونڈی۔ کہ ان دونوں طریقوں اور عقدوں سے عورت کا کسی مرد سے خصوصی تعلق و رشتہ قائم ہو جاتا ہے۔ اور اسکی نگرانی اور حفاظت میں ہوتی ہے، اولاد اور وارثوں کا مناسب دیکھ بھال، حفاظت و نگہداشت عمل میں آتی ہے چنانچہ اسی مضمون کو تاکید کے ساتھ دو سورتوں میں ذکر فرمایا ہے۔

یعنی سورہ مومنون اور سورہ معارج میں، ارشاد ہے۔ اِلَّا عَلٰٓی اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَیْمَانُهُمْ۔ اور دونوں جگہ ان آیات کے آخر میں یہ ٹکڑا بھی جوڑا ہے۔ فَمَنِ ابْتَغٰی وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعَادُوْنَ۔ اور ظاہر بات ہے کہ ممتوعہ عورت نہ تو بیوی ہے ورنہ اس کے لئے لوازم زوجیت، میراث، طلاق، عدت، نان و نفقہ، سب واجب ہوتے، اور نہ ہی ایسی عورت ملک یمین میں داخل ہے ورنہ خرید و فروخت، ہبہ، اور عتاق (آزاد کرنے) کے احکام اس پر لاگو ہوتے اور اس کا اقرار تو خود شیعہ کرتے ہیں کہ متعہ کی صورت میں مابین عورت و مرد زوجیت کے تعلقات و احکامات متحقق نہیں۔ ابن بابویہ کی کتاب اعتقادات میں واضح طور پر یہ لکھا موجود ہے کہ ہمارے نزدیک عورت کے حلال ہونے کے صرف چار اسباب ہیں۔ نکاح، ملک یمین، متعہ، تحلیل، اور اللہ تعالیٰ نے بھی یہ ارشاد فرمایا ہے کہ "اگر تم کو یہ ڈر ہو کہ تم بیویوں میں انصاف نہ کر سکو گے تو صرف ایک بیوی پر اکتفا کرو، یا اپنی خواہشات ان لونڈیوں سے پوری کرو جو تمہاری ملک ہیں" قاعدہ ہے کہ بیان صریح کے مقام پر سکوت ہو تو وہ حصر کے لئے ہوتا ہے۔ یہاں یہ مقام چاہتا تھا کہ ان تمام صورتوں کا ذکر ہو جاتا جنمیں عدل و انصاف واجب نہیں۔ مگر سکوت بتاتا ہے کہ حلال صورتیں بس دو ہی ہیں، اور عدل کا تعلق صرف نکاحی بیویوں سے ہے۔ اگر حصر مقصود نہ ہوتا تو متعہ اور تحلیل کا بیان سب سے پہلے ہوتا۔ کیونکہ نکاح اور ملک یمین میں تو کچھ نہ کچھ حقوق قائم و واجب ہوتے ہیں جن کے ترک سے ظلم متصور ہے، بخلاف متعہ کے کہ اس میں تو اجرت مقررہ کے کچھ اور واجب ہی نہیں ہوتا۔ رہا تحلیل تو وہ حلوہ بے دود ہے۔ اس میں زیادہ سے زیادہ حلال کرنے والے کا احسانمند ہونا پڑتا ہے، اس کے سوا واجب کچھ ہوتا ہی نہیں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

وَلْيَسْتَعْفِفِ الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ نِكَاحًا حَتّٰى يُغْنِيَهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ۔

اور جو نکاح کی استطاعت نہیں رکھتے انہیں چاہیئے کہ وہ پاکدامن رہیں تا آنکہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے انہیں صاحب استطاعت کر دے!

اگر متعہ اور تحلیل جائز ہوتے تو اللہ تعالیٰ عفت و پاکدامنی کا حکم کیوں دیتا۔ یہ حکم تو اسی لئے دیا کہ وہ حلال راستوں کی استطاعت نہیں رکھتے تھے، اور صرف وہی راستے بچے جن کا ذکر اوپر کی آیت میں ہوا۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا اَنْ يَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ــ الیٰ قولہ ــ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ الْعَنَتَ مِنْكُمْ وَاَنْ تَصْبِرُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ۔

اور جس میں یہ استطاعت نہ ہو کہ وہ پاکدامن مومن عورت سے شادی کر سکے تو اپنی مملوکہ لونڈی سے نکاح کرے اور یہ ایسے شخص کے لئے ہے کہ جو زنا میں مبتلا ہونے کا ڈر رکھتا ہو۔ اور اگر صبر کر سکو تو یہ تمہارے لئے بہتر ہے۔

اگر متعہ اور تحلیل جائز ہوتے تو لونڈیوں کے نکاح میں ڈر، خوف اور صبر کی ضرورت ہی کیا تھی اور یہ جو کہتے ہیں کہ آیت فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً۔ پس تم نے ان سے جو فائدہ اٹھایا ہے تو اب ان کو ان کا مہر بطور فرض کے ادا کرو۔
متعہ کے بارے میں نازل ہوئی، غلط ہے اسکی روایت بحوالہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ یا دوسرے صحابہ سے کرنا کھلم کھلا جھوٹ اور افترا ہے۔ گو کہ بعض غیر معتبر تفاسیر اہل سنت میں یہ روایت نقل کی گئی ہے مگر چونکہ یہ بات نظم قرآن کے خلاف ہے۔ اور جو تفسیر بھی نظم قرآنی کے خلاف ہو وہ اگرچہ صحابی سے مروی ہو سننے اور قبول کرنے کے لائق نہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اول محرمات کا بیان حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ اُمَّهٰتُكُمْ (تمہاری مائیں تم پر حرام کی گئیں) سے اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ تک کیا۔ پھر فرمایا اُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ (ان محرمات کے سوا تمہارے لئے حلال کی گئیں، مگر ان شرائط کے ساتھ کہ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ (مہر و نان و نفقہ میں اپنے مال خرچ کرو) اور ان شرطوں کی وجہ سے تحلیل فروج، یا مانگے میں دینا دونوں صورتیں غلط اور باطل ہو گئیں اس لئے کہ یہ تو مفت کا سودا ہے۔ نہ ہلدی لگے نہ پھٹکری!
پھر آگے فرمایا مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ۔ (ان کو اپنے لئے مخصوص کر لو، دوسرے سے ربط ضبط پیدا نہ کر لیں اسکی نگہداشت رکھو) یہ نہیں کہ شہوت رانی کا تقاضا پورا کرنا اور کرد و پانی نکالنا مقصود ہو! تو اس شرط سے متعہ بھی باطل ہوا کیونکہ متعہ میں احتیاط و اختصاص قطعاً منظور نہیں ہوتا کیونکہ متعہ والی عورت تو کسی ایک کی ہو کر رہتی ہی نہیں۔ آج اس کی بغل میں تو کل کسی دوسرے کی! پھر نکاح کے حلال ہونے پر بنا رکھتے ہوئے فرماتے ہیں فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ الخ یعنی جب تم نے نکاح میں مہر مقرر کیا، اور لطف صحبت بھی اٹھا لیا تو اب تم پر پورا مہر لازم آگیا۔ اگر صحبت نہ ہوتی تو نصف مہر لازم ہوتا۔

اب اس نظم قرآنی کے خلاف اس آیت کو پہلی عبارت سے کاٹ دینا اور ابتدائے کلام پر محمول کرنا باعتبار عربیت قطعاً و صریحاً غلط و باطل ہے۔ حرف فا، قطع اور ابتدائے کلام سے مانع ہوتی ہے۔ وہ تو پچھلے کلام اگلے کلام سے ربط قائم کرنے کے لئے لائی جاتی ہے، یہ ایک روایت کرتے ہیں کہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اس آیت میں مِنْهُنَّ کے بعد اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى کا اضافہ کر کے پڑھتے تھے، تو اس میں پہلی بات تو یہ کہ اس روایت کی صحت میں ہی کلام ہے۔ کسی معتبر کتاب میں اس کا سراغ نہیں ملتا۔ اگر روایت ثابت بھی ہو تو یہ قرأت منسوخہ ہو گی اور احکام کے ثبوت میں قرأت منسوخہ کام نہیں دیتی کیونکہ منسوخ ہونے کے بعد وہ قرآن رہی نہ حدیث! خاص کر اس صورت میں جبکہ اس کے صریح مخالف دوسری آیات موجود ہوں۔ اور اگر سب باتوں کو نظر انداز کر کے مان لیں تو بھی یہ روایت متعہ پر دلالت نہیں کرتی اس لئے کہ الی اجل مسمی، استمتاع سے متعلق ہے عقد سے نہیں! اور متعہ میں مدت کا تعین نفس عقد سے ہوتا ہے، استمتاع کے ساتھ نہیں۔ تو گویا پھر معنے یوں ہونگے کہ پس اگر اپنی منکوحہ عورتوں سے ایک مدت معین تک لطف اندوز ہو لیں تو تمام مہر ادا کریں۔،، اس قید کے بڑھانے کا اسوقت یہ مطلب ہو گا کہ کوئی یہ خیال نہ کر بیٹھے کہ جب نکاح کی تمام مدت گذر جائے گی جب مہر واجب ہو گا۔ جب کہ رواج اور عرف میں یہ مشہور ہے کہ ایک تہائی مہر معجل (بروقت ادائیگی کے قابل) رکھتے ہیں اور دو تہائی کو موجل تا بقائے نکاح، یہ تاخیر عورت کی تصرف و اختیار سے حاصل ہوتی ہے ورنہ شریعت کے لحاظ سے تو ایک مرتبہ کی صحبت کے بعد عورت کو مہر کا مطالبہ کرنے کا حق ہے، اگر الی اجل مسمی کی قید کو عقد سے متعلق مانیں گے تو اس کا تقاضا تو یہ ہے کہ شیعوں کے

www.Ahlehaq.com

نزدیک متعہ مدت العمر تک درست نہ ہو، حالانکہ یہ شیعوں کے اجماع سے درست ہے! اور آیت وَمَن لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنكُمْ طَوْلًا کا سیاق بھی نکاح ہی ہے۔ یعنی اگر اتنی مالی استطاعت نہ رکھتے ہوں کہ آزاد عورتوں کا مہر اور نان ونفقہ برداشت کرسکیں تو اپنی ہم مذہب لونڈی سے نکاح کرلیں، اب مسلسل ومربوط کلام کو بیچ سے کاٹ کر درمیانی عبارت کو متعہ پر محمول کرنا تو کلام اللہ کی کھلی تحریف ہے، اور اگر آیت کے سیاق پر غور کیا جائے تو اس سے متعہ کی حرمت صاف معلوم ہوجائیگی۔ اس لیئے کہ آیت میں لونڈی کے نکاح میں اکتفا کی ہے اگر اگلے کلام میں متعہ کو حلال کرنا ہوتا تو پھر وَمَن لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنكُمْ طَوْلًا کیوں فرمایا جاتا کیونکہ آزاد عورتوں کے نکاح پر قدرت نہ رکھنے کی صورت میں، متعہ کی وجہ سے جنسی خواہش پورا کرلینے میں روکاوٹ ہی کیا تھی، بلکہ وہ تو ہرنئی چیز نئی لذت دیتی ہے کے مصداق یہ صورت تو بہتر اور خوب تر تھی۔ پھر لونڈیوں سے نکاح کو اس قید وپابندی کے ساتھ حلال کرنے کی کیا ضرورت تھی!

خلاصہ کلام یہ ہے کہ پانچ مذکورہ بالا آیات قرآنی متعہ کی حرمت پر صاف اور واضح دلالت کرتی ہیں، اور ایک آیت جسے شیعہ اپنے خیال وگمان کے مطابق متعہ کے حلال ہونیکی دلیل بناتے ہیں سطور بالا میں اسکی حالت بھی واضح ہوگئی۔ کہ درحقیقت معاملہ الٹا ہے۔

پھر ایک بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ اس معاملہ میں شیعوں کا رخ استدلال ہے جبکہ مخالف کا انکار! اور منکر کے لئے احتمال وشک ہی کافی ہے۔ اس کے لئے ضروری نہیں کہ اس کا خیال ظاہر اور سمجھ میں آنے والا بھی ہو۔

رہا استدلال تو اگر اسے احتمال وشک کی ہوا بھی لگ جائے تو اسے نا معتبر اور باطل کردیتی ہے چہ جائیکہ وہ قوی اور غالب سمجھا جائے۔

(۲) رضاع کے معاملہ میں ان کے ہاں یہ مسئلہ ہے کہ بچہ پندرہ مرتبہ پے در پے بلافاصلہ دودھ پیئے تو حرمت رضاعت ثابت ہوتی ہے۔ پے در پے نہ ہو تو حرمت ثابت نہیں۔ حالانکہ شریعت میں ابتداءً دس مرتبہ کا جو حکم تھا وہ بھی اجماع امت سے منسوخ ہوگیا، پانچ کی مزید تعداد اور پے در پے کی قید تو سرے سے تھی ہی نہیں، یہ اسی فرقہ کا گھڑا ہوا اضافہ ہے اور منسوخ شدہ حکم کو باقی رکھنا اپنی طرف سے شریعت بنانا ہے۔ اور حکم الٰہی کی مخالفت ہے، حالانکہ یہ خود ہی اپنے ائمہ سے یہ روایت کرتے ہیں کہ "مدت رضاع میں مطلقاً دودھ پینا حرمت کا سبب ہے خواہ دس مرتبہ ہو خواہ اس سے کم" جبکہ یہ احتیاط کا مقام ہے، اس لیئے اس کا تقاضا یہ ہے کہ احتیاطاً زیادہ والی صورت پر عمل کرنا چاہیئے۔ حرمت نکاح کا معاملہ ہے بہ آت ذرہ یقینی طور پر ثابت ہونی چاہیئے چنانچہ ان کے شیخ مقداد نے کنز العرفان میں کفارہ کی بحث کے تحت اس بات کی تصریح کی ہے کہ اس صورت میں زیادہ احتیاط والی جانب پر عمل کرنا واجب ہے۔

(۳) ایک مسئلہ ان کے ہاں یہ ہے کہ طلاق عربی زبان کے علاوہ کسی اور زبان میں دینے سے واقع نہیں ہوتی۔ یہ ایسا ظاہر البطلان مسئلہ ہے کہ محتاج بحث ہی نہیں! لیکن عجیب تر بات یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی بیوی سے اَنْتِ مُطَلَّقَةٌ (تجھ کو طلاق دی گئی ہے) یا اَنْتِ طَالِقٌ (تجھے طلاق ہے)، تو بھی ان کے نزدیک طلاق نہیں ہوتی جبتک طَلَّقْتُكِ (میں نے تجھ کو طلاق دی)، نہ کہے۔ حالانکہ شریعت نے ان دونوں صیغوں کو بھی طلاق شمار کیا ہے، اس میں شاید یہ شبہ نکالیں کہ یہ دونوں صیغے وضع اصلی کے لحاظ سے اخبار (خبر دینے) کے لئے ہیں، "تو طلقتک" بھی ایسا ہی ہے۔ بلکہ ان معاملات میں انشائی صیغے کسی ترکیب میں وضع ہی نہیں ہوتے۔ ہر جگہ یہی اخباری الفاظ کام میں آتے ہیں۔ مثلاً اَنْتِ حُرَّةٌ، یا اَنْتِ عَتِيْقَةٌ (تو آزاد ہے)، اور پھر یہ خود بھی اسکو تسلیم کرتے ہیں کہ اگر ایک شخص دوسرے سے پوچھے هل طلقت فلانة (کیا تونے فلاں کو طلاق دی)، اور وہ جواب میں نعم (ہاں) کہے تو ایسی صورت میں طلاق واقع ہوجاتی ہے حالانکہ یہاں تو صاف طور پر اخبار ہی مراد ہے۔ انشاء نہیں۔ ورنہ استفہام کے جواب میں یہ کیسے استعمال ہوتا۔ کیونکہ انشاء سے استفہام کا جواب نہیں ہوتا۔

(۴) یہ کہتے ہیں کہ گواہوں کی موجودگی کے بغیر طلاق واقع نہیں ہوتی جس طرح نکاح نہیں ہوتا۔ حالانکہ شریعت نے بوقت طلاق گواہوں کی موجوگی کو لازم اور ضروری قرار نہیں دیا۔ چنانچہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک سے لیکر ائمہ کے زمانہ تک پوری امت کا اسی پر عمل

رہا کہ بروقت طلاق کبھی گواہوں کی تلاش نہ کی گئی ، اور ان کی موجودگی کو ضروری نہیں سمجھا گیا ، البتہ طلاق رجعی اور مطلق طلاق کے وقت دو گواہوں کی موجودگی کو مستحب سمجھا گیا اور وہ بھی رفع نزاع کی خاطر کہ اس کا موقع نہ آسکے ! اس لئے نہیں کہ نکاح کی طرح دو گواہوں کے بغیر طلاق اور رجعت صحیح نہ ہو۔ اور نکاح و طلاق میں جو فرق ہے وہ بالکل ظاہر ہے۔ نکاح میں اعلان اس لئے ضروری ہے کہ زنا سے امتیاز پیدا ہو اور کسی کو شک کی گنجائش نہ رہے۔ اور اعلان کی کم سے کم حد دو گواہ مقرر کی گئی۔ بخلاف طلاق کے کہ اس میں نہ کسی چیز سے تمیز دینے کی ضرورت ہے نہ اس میں کسی قسم کی تہمت کا خدشہ ! اس لئے اعلان کی بھی ضرورت نہیں۔ ترک صحبت و جماع ہی کو تو طلاق کہتے ہیں اس میں تہمت کی کون سی بات ہے۔ پس طلاق کا معاملہ بھی خرید و فروخت ، اجارہ ، اور دوسرے معاملات کا سا ہے ، اگر بنظر احتیاط کہ کوئی فریق معاملہ سے مکر نہ جائے گواہ کر لیں تو کوئی حرج بھی نہیں کہ کل کلاں مقدمہ وغیرہ کی نوبت آجائے تو گواہ گواہی دے سکیں۔ اور عدالت میں عقد و معاملہ کا اثبات ہو سکے۔ ورنہ بطور شرط ضروری نہیں !

(۵) اگر شوہر موجود ہو تو ان کے ہاں کنایات سے طلاق واقع نہیں ہوتی۔ شوہر کی حاضری و عدم حاضری کی قید سراسر خلاف شرع ہے کیونکہ شرع میں شوہر کی حاضری و عدم حاضری کا تعلق طلاق نہ ہونے میں ہرگز نہیں کیا گیا۔ یہ فرق پیدا کر کے اپنی طرف سے انہوں نے نئی شرع بنائی ہے،

(۶) مقطوع الذکر ، مسلوب الخصیتین شخص نے اگر کسی عورت سے شادی کر لی اور خلوت صحیحہ کے بعد اسکو طلاق دے دی تو ان کے ہاں ایسی مطلقہ کی عدت نہیں ہے۔ حالانکہ یہ خود اس شخص سے ثبوت نسب کے قائل ہیں۔ کہ اگر اس عورت کے کوئی بچہ ہو جائے تو ان کے نزدیک وہ مقطوع الذکر کا ہوگا جبکہ نطفہ قرار پانے کا احتمال ثابت ہوگیا۔ تو اس صورت میں عدت کیوں واجب نہیں ہوگی ؟ کیونکہ عدت تو ہے ہی نطفہ قرار پانے کی معلومات کے لئے۔ تاکہ نسب مخلوط نہ ہو۔

اور طبی قواعد سے ایسے شخص سے نطفہ قرار پانے کا امکان ثابت اور صحیح ہے ، اس وجہ سے کہ محل منی تو خصیتین ہیں اور وہ صحیح و سالم ہیں۔ اس لئے باہمی رگڑ سے اخراج منی کا احتمال ہے۔ اور ہو سکتا ہے کہ رگڑ کے وقت منی مرد کے سوراخ سے نکل کر عورت کے رحم کے منہ میں پہنچ جائے اور وہ اسے جذب کرے اور اسی سے بچہ پیدا ہو جائے ! بخلاف اس صورت کے کہ اگر خصیتین کٹے ہوئے ہوں تو تولید منی کا امکان ہی نہیں ، گو عضو مخصوص صحیح و سالم ہو۔

(۷) اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو اذیت دینے اور ضرر پہنچانے کی غرض سے جنسی فعل ترک کر دے تو ظہار ان کے نزدیک واقع نہیں ہوتا۔ حالانکہ شارع کا مقصد تو ظہار کا کفارہ واجب کرنے سے یہی ہے کہ ایذا و ضرر رسانی کا دروازہ بند کیا جائے۔ لہذا ضرر پہنچانے کے وقت ہی کچھ واجب نہ ہو تو شارع کے مقصود کے خلاف لازم آتا ہے۔ اور پھر ایسا سمجھنا ، نص کتاب اللہ احادیث رسول اللہ اور آثار ائمہ سے بھی ٹکراتا ہے۔ کیونکہ ان میں ایسی کوئی قید نہیں۔ اور یہ ساری روایات ان کی اپنی کتابوں میں موجود ہیں۔

(۸) یہ کہتے ہیں کہ ظہار کرنے والا اگر کفارہ کی ادائیگی سے قاصر ہو اور اٹھارہ روزے رکھ لے تو اس کے لئے کافی ہے۔ اس مسئلہ کا کوئی تعلق نہ اللہ کی کتاب سے ہے اور نہ ہی شرع میں اس کی کوئی اصل و بنیاد ہے بلکہ نص قرآنی تو اس کے خلاف ہے۔ اس لئے ظاہر ہے یہ تو خود دین گھڑتا ہے !

(۹) یہ لعان (زنا کی تہمت لگانا) میں یہ شرط لگاتے ہیں کہ بیوی "مدخول بہا ہو" حالانکہ زنا کی تہمت میں جو عار و شرمندگی مدخول بہا کو ہوتی ہے ، غیر مدخول بہا ، کو اتنی نہیں ہوتی۔ اور لعان ہوتا ہی اس تہمت کی شرمندگی دور کرنے کے لئے۔ علاوہ ازیں یہ بات قرآنی نص کے بھی خلاف ہے قرآن مجید میں ہے۔ وَالَّذِیْنَ یَرْمُوْنَ اَزْوَاجَهُمْ وَلَمْ یَكُنْ لَّهُمْ شُهَدَآءُ اِلَّاۤ اَنْفُسُهُمْ

(جو لوگ، اپنی بیویوں پر تہمت لگاتے ہیں اور سوائے اپنے آپ کے اور کوئی گواہ نہیں) تو اس میں تو مدخول بہا کی کوئی قید نہیں۔ اس فرقہ کے ایسے ہی الٹے پلٹے اور بداھی بتاھی مسائل واحکام سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ جب اور جہاں مقاصد شریعت کو سمجھنے اور اس کی گہرائی تک پہنچنے سے قاصر رہے، تو از خود اپنی عقل ناقص و نارسا سے غلط سلط مسائل تراش لیے۔

(۸۰) کہتے ہیں کہ لفظ عتق سے بھی عتق واقع نہیں ہوتا۔ (عتق بمعنی غلام کا آزاد کرنا) اس حکم کو مضحکہ خیز کے علاوہ کیا کہا جائے۔

اسی طرح یہ بھی کہتے ہیں کہ فک رقبہ سے بھی غلام آزاد نہیں ہوتا، حالانکہ قرآن مجید میں چند جگہ فک رقبہ سے عتق کو تعبیر کیا گیا ہے گویا اس کی حقیقت شرعی بھی یہی قرار پائی ہے۔ ارشاد ربانی ہے فَكُّ رَقَبَةٍ أَوْ إِطْعَامٌ فِي يَوْمٍ ذِي مَسْغَبَةٍ غلام آزاد کرنا، یا دن میں کھانا کھلانا)

(۸۱) کہتے ہیں لونڈی غلام اگر اثنا عشری نہ ہوں تو ان کا عتق صحیح نہیں! کتاب وسنت میں تو اسکی کوئی اصل نہیں۔ اور آئمہ کی روایات ماسبق کی رو سے بھی یہ غلط ہے کیونکہ ان کی رو سے اہل سنت کا ایمان بھی صحیح ہے۔ اور نجات کی بشارت دینے والا بھی، اب کوئی وجہ اگر ہو سکتی ہے تو ان کا تعصب اور بغض ہی ہو سکتا ہے۔

(۸۲) ایک مسئلہ یہ ہے کہ غلام اگر جذام کی بیماری میں مبتلا ہو جائے، یا اندھا، یا اپاہج ہو جائے تو وہ خود بخود آزاد ہو جاتا ہے، مالک کے آزاد کرنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ حالانکہ یہ قاعدہ شرعیہ کے خلاف ہے۔ شریعت میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی کہ ناقص یا عیب دار مال مالک کی اجازت وارادہ کے بغیر اس کی ملک سے نکل جائے۔ پھر یہ مقاصد شرعیہ کے بھی خلاف ہے کیونکہ اعتاق غلام کے نفع کی خاطر ہوتا ہے، اور صورت بالا میں تو اس کی آزادی اس کی بربادی اور ہلاکت کے مترادف ہوگی، اس لیے کہ ان جسمانی عوارض کی وجہ سے تو وہ کسب معاش اور تلاش روزگار کے قابل نہیں رہا۔ اور کھانا کپڑا جو مالک کے ذمہ تھا، اب اس کے ذمہ آپڑا۔ اب ایسی حالت میں وہ بیچارہ کہاں جائے اور کیا کریگا۔ اگر یہ کہا جائے کہ اس کا نفع یہ ہے کہ وہ خدمت سے چھوٹ گیا، تو اس کا جواب یہ ہے کہ ایسی معذوری اور لاچاری کی حالت میں مالک کو خدمت لینے کا حق ہی کہاں پہنچتا ہے۔ روٹی کپڑا تو اس کی ملک کا معاوضہ ہے۔ یہ خدمت کا بدلہ نہیں ہے۔ بہت سے لونڈی غلام دائمی امراض یا کسی اور عارضہ کی بنا پر خدمت سے تھک بھی تو جاتے ہیں ہاں یہ حکم نوکر و مزدور پر تو لاگو ہو سکتا ہے کہ جب تک وہ خدمت انجام نہ دے اسکو مزدوری اور تنخواہ نہیں دیتے جب کام سے رہ جاتا ہے موقوف کر دیتے ہیں تو یہ حکم غلام پر چسپاں نہیں ہوتا۔

۸۳ کہتے ہیں کہ لونڈی کے پیٹ سے آقا کا نطفہ گر جائے تو وہ ام ولد ہو جاتی ہے، یہ عجیب مسئلہ ہے کیونکہ اس صورت میں تو ہر لونڈی جس کے ساتھ ہمبستری کی گئی ہو ام ولد بن جائے گی۔ کیونکہ جو عورتیں حمل اور بچہ کی تولید نہ چاہیں وہ صحبت کے بعد نطفہ گرا دیتی ہیں اور یہ بات تجربہ کی ہے کہ رحم میں تو بقدر تولید ہی نطفہ ٹکتا ہے باقی گر جاتا ہے۔ یہ اتنا نہیں جانتے کہ نطفہ کا نکلنا اگر دلیل بن سکتا ہے تو اس بات کی کہ نطفہ نے رحم میں قرار نہیں پکڑا۔ اور جب نطفہ ہی رحم میں نہیں ٹھہرا تو وہ لونڈی ام ولد کیسے ہو گئی۔ اس کا ام ولد ہونا تو رحم میں نطفہ کے قرار پکڑنے پر ہے۔ ورنہ صرف قرار پکڑنے پر بلکہ اس کی پوری خلقت پر اگر کسی کے پاس کسی چیز کا کوئی جز ہے تو یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس کے پاس پوری چیز ہے۔

(۸۴) یہ مسئلہ بھی ان کے ہاں ملتا ہے کہ اگر کسی نے کسی کے پاس اپنی لونڈی گروی رکھدی اور اس نے اس کے ساتھ جنسی فعل کیا اور اس کے ہاں لڑکا پیدا ہو گیا تو وہ لونڈی مرتہن کی ام ولد ہو گئی۔ حالانکہ مرتہن کا فعل تو صاف زنا تھا۔ کہ اسے نہ حق ملکیت حاصل تھا، نہ حق تحلیل۔ اور تحلیل کا حق ہو تب بھی یہ حق اسے ام ولد نہیں بناتا۔ جیسے یہ فرقہ بھی تسلیم کرتا ہے،

(۸۵) یہ کہتے ہیں کہ ایسے فعل پر جو نہ واجب ہو اور نہ اس سے کوئی فعل قبیح ترک کرنا منظور ہو بیٹے کی قسم باپ کی اجازت کے بغیر اور

بیوی کی شوہر کی اجازت کے بغیر منعقد نہیں ہوتی۔ یہ مسئلہ بھی قرآنی احکام کے صریحاً خلاف ہے، کہ ان آیات یمین میں اس قید کا کوئی ذکر نہیں۔ مثلاً — وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ۔ لیکن وہ تمہاری پکی قسموں پر مواخذہ کریگا ہاں تورات میں یہ ذکر ہے کہ "بیوی کی نذر خاوند کی اجازت کے بغیر اور چھوٹے بچے کی نذر بغیر باپ کی اجازت کے منعقد نہیں ہوتی"۔

اس حکم کے متعلق یہ بھی پتہ نہیں کہ تحریف شدہ ہے یا غیر تحریف شدہ! اگر اصلی بھی ہو تو بالغ و نابالغ کے یمین، نذر و نماز میں بہت بڑا فرق ہے۔ لیکن جب قرآن مجید پہلی آسمانی کتابوں کا ناسخ ہے تو قرآن کے خلاف توریت سے دلیل لانا یہودیت کے سوا اور کیا ہے!

اس فرقہ کے نزدیک تو عورت کی نفل نذر بھی شوہر کی اجازت کے ساتھ مشروط ہے جو اطلاق قرآن کے مخالف ہے۔ قرآن مجید میں وَلْيُوْفُوْا نُذُوْرَهُمْ۔ (اپنی نذریں پوری کرو) اور يُوْفُوْنَ بِالنَّذْرِ (اپنی نذریں پوری کرتے ہیں) فرمایا ہے۔ اور اس میں کوئی کہیں قید و شرط نہیں۔

(۸۶) ایک مسئلہ یہ ہے کہ پا پیادہ حج کی نذر مانی تو یہ نذر ساقط ہو جاتی ہے۔ حالانکہ ان کی یہ بات بھی نص قرآنی کے خلاف ہے۔

(۸۷) نذر کے متعلق ان کا کہنا ہے کہ وہ دل کے ارادے سے لازم ہو جاتی ہے، چاہے نذر کے الفاظ ظاہر و پوشیدہ زبان سے ادا نہ کیے جائیں اس کا نام انہوں نے نذر ضمیر رکھا ہے، حالانکہ شریعت میں وہ امور جو اقوال سے رکھتے ہوں دلی ارادہ سے لازم نہیں ہوتے، مثلاً یمین، نکاح، طلاق، عتق، رجعت، بیع، اجارہ، ہبہ، اور صدقہ وغیرہ وغیرہ۔ اس سلسلہ میں متفق علیہ صحیح حدیث بھی موجود ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ تَجَاوَزَ عَنْ اُمَّتِيْ مَا وَسْوَسَتْ بِهٖ صُدُوْرُهَا مَا لَمْ تَعْمَلْ بِهٖ اَوْ تَتَكَلَّمْ۔ بے شک اللہ تعالیٰ نے میری امت کے ان وسوسوں سے درگذر فرمائی جو ان کے سینوں میں کھٹکتے رہتے ہیں تا آنکہ وہ ان پر عمل نہ کرلیں یا زبان پر نہ لے آئیں۔

(۸۸) یہ مسئلہ بھی ان کے ہاں ہے کہ حدود میں قاضی کا حکم نافذ نہیں ہوتا، اس کے نفاذ کے لیے "امام معصوم" ہونا چاہیئے، لہٰذا امام کی غیر موجودگی میں، یا امام کا تسلط نہ ہونے کی صورت میں۔ جیسا کہ اکثر اوقات یا پورا زمانہ ایسا ہی گذرا کسی امام کا تسلط قائم نہ ہو سکا۔ حدود کا ناقابل نفاذ رہ جانا لازم آیا۔ اور اگر امام معصوم ہو بھی تو وہ سرمن رائے، کربلائے معلی اور نجف اشرف میں ہوگا۔ فیض آباد۔ اور بنگالہ میں کون حدود قائم کرے گا۔ اور اگر کوئی ان کا نائب ہو جو ان کی تقرری اور اجازت سے حدود جاری کر سکے۔ تو پھر اللہ تعالیٰ کی بلا واسطہ اجازت میں آخر کون سی بات ہے یا کون سی کمی رہ گئی ہے کہ حدود کا نفاذ نہ ہو سکے۔ ارشاد ہے۔ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمَانِيْنَ جَلْدَةً۔ (ان کو اسّی کوڑے مارو) یا اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ (زانی مرد و عورت میں سے ہر ایک کو سو کوڑے لگاؤ) یا فرمایا اَلسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا (چور مرد ہو یا عورت ہر ایک کے ہاتھ کاٹ ڈالو) اور شریعت کے دیگر تمام عبادات، معاملات، اور کفارات میں جب امام کی موجودگی ضروری نہیں تو حدود ہی کے نفاذ میں ان کی حضوری کیوں لازمی قرار دی جاتی ہے کیونکہ یہ حدود بھی مکان شہر و ملک کے حق میں عبادات ہی ہیں۔ اور حد زدہ شخص کے حق میں کفارات۔ انہیں امام کی موجودگی سے وابستہ کیوں کیا جائے! اور عبادت و کفارہ سے کیوں محروم رکھا جائے۔

(۸۹) یہ قاضی کے لیے پڑھا لکھا ہونے کی شرط بھی لگاتے ہیں۔ حالانکہ قرآن و سنت میں انکی یہ زائد کردہ شرط پر کوئی دلیل نہیں۔ بلکہ اس کے خلاف پر دلیل ہے۔ کیونکہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بلا شبہ فیصلہ صادر فرمانے اور اسے نافذ کرنے کا منصب بھی رکھتے تھے۔ اور اس سلسلہ میں کوئی خامی، کوئی کمی آپ صلی اللہ علیہ وسلم میں نہ تھی اس دلیل سے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

إِنَّا أَنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا أَرَاكَ اللَّهُ۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کی طرف کتاب حق اس لیے نازل فرمائی کہ آپ لوگوں کے درمیان اللہ تعالیٰ کی دکھائی ہوئی روشنی میں فیصلہ فرمائیں۔ حالانکہ آپ امی تھے علم کتابت نہیں سیکھا تھا جیسا کہ قرآن مجید خود شاہد ہے! وَمَا كُنتَ تَتْلُو مِن قَبْلِهِ مِن كِتَابٍ وَلَا تَخُطُّهُ بِيَمِينِكَ (آپ نے اس کتاب قرآن مجید) سے پہلے نہ کوئی کتاب پڑھی تھی اور آپ کے دائیں ہاتھ نے کبھی قلم پکڑا تھا۔ پھر ضمانی نامے، قاضی کے مہری خطوط، وغیرہ لکھنا پڑھنا دارالقضاء کے منشیوں کا کام ہے اگر قاضی خود یہ کام نہ کر سکے تو اس کی قضا میں کونسا فرق آتا ہے۔ علاوہ ازیں ان کے محدثین نے خود اپنے ائمہ سے ایسی روایات بیان کی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ علم کتابت قضا میں ضروری نہیں ہے،

(۹۰) ان کی کتاب الدعویٰ میں بڑے انوکھے اور عجیب مسائل ملتے ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ عورت جس کی لڑکی مر چکی ہو عدالت میں یہ دعویٰ دائر کرے کہ میں نے اپنی لڑکی کے پاس فلاں فلاں سامان، خادم وغیرہ بطور امانت سپرد کئے تھے تو ان کے نزدیک یہ دعویٰ بلا گواہ و ثبوت قابل قبول ہے۔ ابن بابویہ نے تو اس پر نص کی ہے۔ حالانکہ یہ بات قواعد شرع کے صاف خلاف ہے۔ اس لیے کہ بلا گواہ کوئی دعویٰ قابل سماعت نہیں۔ لَوْلَا جَاءُوا عَلَيْهِ بِأَرْبَعَةِ شُهَدَاءَ فَإِذْ لَمْ يَأْتُوا بِالشُّهَدَاءِ فَأُولَٰئِكَ عِندَ اللَّهِ هُمُ الْكَاذِبُونَ (یہ اپنے دعویٰ پر چار گواہ کیوں نہیں لائے۔ پس جب یہ گواہ نہیں لائے تو اللہ کے نزدیک یہی جھوٹے ہیں)

شریعت کا مقصد گواہوں سے اقوال و حقوق کا تحفظ ہے۔ اور اس صورت میں یہ مقصد ہاتھ سے جاتا ہے۔ دوسرا یہ کہ اگر کسی دشمن نے کسی پر زنا کی تہمت لگائی، اور گواہ پیش نہ کر سکا تو کہتے ہیں کہ اسے قسم لے کر چھوڑ دینا چاہیئے، اس پر قذف کی حد نہ لگانی چاہیئے ان کے شیخ مقتول نے اپنی کتاب مبسوط میں نص بیان کی ہے۔ حالانکہ شرع نے حدود میں قسم کا کوئی اعتبار نہیں کیا۔ اور مدعی حد زنا پر گواہ پیش نہ کر سکنے کی صورت میں حد قذف لگانا واجب قرار دیا ہے۔ قرآن میں اس پر حکم موجود ہے اور اس صورت میں تو دشمنی، تہمت اور دروغگوئی پر وزنی دلیل ہے۔ تو اس سے چشم پوشی کیسے کی جا سکتی ہے اور اس سے حسن ظن کس طرح قائم ہو سکتا ہے،

(۹۱) کتاب الشہادات میں بھی اسی طرح کے "عجائب" "غرائب" جمع کیے ہوئے ہیں، مثلاً کہتے ہیں کہ دس سالہ نابالغ لڑکے کی شہادت قصاص سے متعلق معتبر ہے۔ حالانکہ نابالغ بچہ کسی مقدمہ میں بھی شہادت کا اہل نہیں۔ چہ جائیکہ قصاص کا معاملہ جس میں ایک جان کے ضائع ہو جانے کا خدشہ ہوتا ہے کسی بچہ کی شہادت کیسے قبول ہو سکتی ہے قرآن مجید کہتا ہے۔ وَاسْتَشْهِدُوا شَهِيدَيْنِ مِن رِّجَالِكُمْ (اپنے مردوں میں سے دو کی گواہی طلب کرو)

(۹۲) کتاب الصید والذبائح میں قرآنی حکم کی مخالفت کرتے ہوئے اہل کتاب کے شکار کو حرام کہتے ہیں۔ اور اہل سنت کے ذبیحہ کو بھی مردار کہتے ہیں۔ اور ذبح کے وقت اگر قبلہ رو نہ ہوں تو اس ذبیحہ کو بھی حرام کہتے ہیں۔ ان امور پر ان کے پاس کوئی شرعی دلیل نہیں نصوص کا عموم ان کی اس زائد شرط کی تردید کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ فَكُلُوا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللَّهِ عَلَيْهِ إِن كُنتُم بِآيَاتِهِ مُؤْمِنِينَ۔ جو اللہ کا نام لے کر ذبح کیا گیا ہو، اسکو کھاؤ اگر اس کی آیات پر تمہارا ایمان ہو،

(۹۳) کہتے ہیں کہ اگر غیر رواجی آلات سے کوئی شکار کرے تو وہ شکار اسکی ملکیت میں نہیں آتا، حالانکہ اس میں رواجی اور غیر رواجی ہونے کا کوئی فرق نہیں ہے۔

(۹۴) کتاب الاطعمہ بھی عجائب کا مجموعہ ہے۔ مردار جانور کے دودھ اور بچہ دانی کو حلال کہتے ہیں۔ اس گیہوں کی روٹی کو حلال جانتے ہیں جس کا آٹا نجس پانی سے گوندھا گیا ہو۔ اور وہ نجس پانی اس آٹے میں اتنا مل گیا ہو کہ آٹا پتلا ہو گیا ہو اور آٹے کے تمام اجزاء میں پانی کے سب اجزاء سرایت کر گئے ہوں۔ چنانچہ حلی نے کتاب تذکرہ میں اسی طرح لکھا ہے!! اسی طرح وہ کھانا جس میں مرغی کی بیٹ گر کر

گھل مل گئی ہو، یا وہ شوربہ، فالودہ شربت، جس کو عورت یا مرد کے استنجے کے پانی سے تیار کیا گیا ہو، یا ان میں مرغی کی کچھ بیٹ پڑگئی ہو، یہ سب چیزیں ان کے نزدیک پاک وطیب اور کھانے کے قابل ہیں، اسی طرح اس کرّہ میں (یہ ایک بڑا پیمانہ ہے جس میں بارہ دستی وزن آجاتا ہے) جس میں بے شمار آدمیوں نے استنجا کیا ہو، حیض ونفاس کا خون بھی اس میں پڑا ہوا ہو، مذی و ودی، مرغی کی بیٹ بھی اس میں پڑی ہو اور سب گھل مل کر یک جان ہوچکے ہوں کتے کا پیشاب بھی اس میں پڑ گیا ہو، اگر ایسے پانی سے جوس، فالودہ، تیار کریں اور اس سے روزہ افطار کریں تو یہ حلال وطیب ہے۔ اور اگر اسکو صرف افطار کے وقت پیئیں یا اس کا شربت بنائیں تو بھی جائز وحلال ہے۔ اگر تین پاؤ کے قریب آش (پتلا حریرہ وغیرہ) پکائیں اور پاؤ بھر دم مسفوح (بہنے والا خون) ڈالدیں۔ یا اس میں گھوڑے گدھے کا پیشاب پڑ جائے تو بھی حلال ہے، حالانکہ قرآنی احکام میں یہ سب چیزیں حرام ٹھہرائی گئی ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہے وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ۔ اور حرام کرتا ہے ان پر گندی ونجس چیزیں۔

(۹۵) ایک شخص بھوکا ہے۔ دوسرے آدمی کے پاس کھانا ہے، مگر وہ معمول کی قیمت سے زیادہ قیمت طلب کرتا ہے، اور بھوکے پاس بوجہ امیر ومال دار ہونیکے اتنی دولت ہے کہ وہ یہ مہنگا کھانا بآسانی خرید سکتا ہے، پھر بھی اگر وہ زبردستی اس سے چھین کر وہ کھانا کھائے تو اس کے لئے جائز ہے۔ اور حلال بھی!

(۹۶) مسائل فرائض (میراث) میں ان کے ہاں یہ مسئلہ ہے پوتے کی موجودگی میں یا دوسری اولاد ہونے کی صورت میں دادا کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ یہ مسئلہ ان اخبار وروایات کے خلاف ہے جو انکی اپنی کتابوں میں موجود ہیں چنانچہ سعد بن خلف نے اپنی صحیح میں جناب ابی الحسن کاظم رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کی ہے وہ کہتا ہے۔ سَأَلْتُهُ عَنْ بَنَاتِ الْاِبْنِ وَالْجَدِّ قَالَ لِلْجَدِّ الثُّلُثُ وَالْبَاقِي لِبَنَاتِ الْاِبْنِ۔ میں نے آپؒ سے دادا اور پوتیوں کے بارہ میں پوچھا تو آپ نے کہا ایک تہائی حصہ دادا کا ہے اور باقی پوتیوں کو ملے گا۔

(۹۷) یہ مقتول کی دیت میں سے ماں کی طرف سے جو بھائی بہن ہوں ان کو حصہ نہیں دیتے، اور بیوی کو زمین یا زمین کی قیمت میں سے بھی حقدار نہیں سمجھتے۔ لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ قاتل کو مقتول کے ترکہ اور اسکی دیت سے وراثت کا حصہ دیتے ہیں، خواہ اس نے غلطی اور شبہ میں پڑ کر اسے قتل کیا ہو حالانکہ اَلْقَاتِلُ لَا يَرِثُ (قاتل کو ورثہ نہیں ملتا) حکم عام ہے۔ اسی طرح آیات قرآنیہ سے بیوی) اور بھائی بہنوں کو ورثہ ملنے کا بھی حکم عام ہے زمین، اور دیت کی تخصیص اس میں کہاں سے ثابت ہے؟ میت کے ترکہ میں قرآن، تلوار، انگوٹھی اور اسکی پوشاک، بغیر کسی حق اور معاوضہ کے بڑے بیٹے کے لئے مخصوص کرتے ہیں۔ (اس میں کسی دوسرے کا حصہ نہیں سمجھتے) حالانکہ یہ بھی قرآنی حکم کے خلاف ہے۔ اور اس بیٹے کی میراث سے باپ کو محروم کرتے ہیں جس نے ایک میراث یا قصور سے بادشاہ قاضی یا کوتوال کے روبرو فارغ خطی دیدی ہو، یا درحقیقت یہ شرع کا حکم نہیں بلکہ قانون تورہ چنگیز خانی ہے۔ اور بعض چچاؤں، چچازادوں اور دادیوں کو مطلقاً میراث سے محروم رکھتے ہیں۔

(۹۸) وصایا کے مسائل میں مظروف کو ظرف کے تابع کرتے ہیں مثلاً ایک شخص نے وصیت کی میرا فلاں صندوق فلاں شخص کو دیا جائے۔ تو اگر اس صندوق میں کچھ مال واسباب نقد وزیورات وغیرہ رکھے ہوئے ہیں۔ تو ان کے نزدیک وہ سب اشیاء وصیت میں داخل ہوں گی۔

(۹۹) لونڈی کی شرمگاہ کی تحلیل سال دو سال کے لئے جائز بتاتے ہیں۔

(۱۰۰) مجنون اور پاگل پر حدود کا اجراء ان کے واجب ہے جبکہ اس نے عاقل عورت سے زنا کیا ہو۔ حالانکہ اس کے خلاف متفق علیہ صحیح حدیث موجود ہے۔ رُفِعَ الْقَلَمُ عَلٰى ثَلَاثَةٍ عَنِ الْمَجْنُوْنِ حَتّٰى يُفِيْقَ۔ تین افراد سے قلم اٹھالیا گیا (وہ غیر مکلف ہیں) مجنون وپاگل سے جب تک

وہ ایماندار ہو جاتے۔

(۱۰۱) اس عورت پر بھی رجم واجب کہتے ہیں جو اپنے شوہر سے ہمبستری کے بعد کسی باکرہ عورت سے رگڑ رگڑ کرے جس سے وہ حاملہ ہو جائے۔ اور اس باکرہ (کنواری) عورت کو سو کوڑے لگائے جائیں۔ حالانکہ رگڑ رگڑ کو کسی نے بھی زنا میں شمار نہیں کیا اور نہ شرعاً وہ زنا سمجھا گیا ہے۔

(۱۰۲) اگر کوئی مسلمان کسی دوسرے کو ابن زانیہ کہہ کر پکارے۔ گو اس کی ماں کافرہ ہو، تو اس پر حد قذف کو واجب کہتے ہیں۔ حالانکہ قرآنی حکم میں حد قذف محصنات کے معاملہ کے ساتھ مخصوص ہے، اور کافر عورت محصنہ نہیں ہوتی، اس کے مسلمان بیٹے کی حرمت تعزیر کا سبب تو ہوگی مگر حد جاری کرنے کا سبب نہیں بنے گی۔

(۱۰۳) اگر کوئی نابینا مسلمان کسی کو بے خطا بے تصور، قتل کر دے تو ان کے نزدیک اس نابینا سے قصاص نہیں لیا جائے گا۔ حالانکہ قصاص کی آیت بینا و نابینا سب کو شامل ہے۔

(۱۰۴) ایک آدمی بھوکا ہے۔ دوسرے مسلمان کے پاس کھانا ہے۔ مگر وہ اس بھوکے کو نہیں دیتا۔ تو ان کے نزدیک اس بھوکے کو حق ہے کہ کھانا رکھنے والے مسلمان کو قتل کر کے اس سے کھانا لے اور کھا جائے! اس فعل کی وجہ سے نہ اس پر قصاص واجب ہے نہ دیت! حالانکہ دنیا کی کسی شریعت میں بھی کھانا نہ دینا قتل کے جواز کی وجہ نہیں ہے!

(۱۰۵) اگر کوئی ذمی کسی مسلمان کو قتل کر دے تو ان کے نزدیک اس ذمی کا تمام مال و اسباب مسلمان مقتول کے وارثوں کو دے دیا جائے! رہی ذمی کی ذات، تو مقتول کے وارثوں کو یہ اختیار ہے کہ چاہے اسے غلام بنائیں چاہے قتل کریں۔ ان کا یہ مسئلہ بھی شرع کے خلاف ہے۔ کیونکہ شریعت میں صرف قصاص کا حکم ہے۔ نہ اس کا مال لینا جائز ہے نہ اسکو غلام بنانا۔ اسی سلسلہ میں وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اسی ذمی کی چھوٹی اولاد کو مقتول کے ورثاء اپنا لونڈی غلام بنا لیں گے حالانکہ یہ قرآنی آیت وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی۔ (کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھاتا) کے سراسر خلاف ہے۔ حاصل تحریر یہ کہ دینی احکام و مسائل میں بہت سے مسئلے ان کے دماغی اختراع اور من گھڑت ہیں۔ نمونہ کے طور پر صفحات گذشتہ میں جو تحریر کیا گیا وہ اس مدعا کے ثبوت کے لئے کافی ہے! صاحب فہم و شعور، اور اہل عقل و دانش پر ان کے دین و ایمان، اور اصول و فروع کی حقیقت پوری منکشف ہو جائے گی۔ اور یہ بھی بخوبی ذہن نشین ہو جائے گا کہ ان اصول کو جو سراسر دروغ اور فروع بے فروغ کی نسبت آئمہ کرام کی طرف کرنا۔ اور ان جلیل القدر بانیان شرع و دین کا مذہب بتانا، چوٹی کے جھوٹ اور اعلیٰ درجہ کے بہتان و افتراء کے سوا کچھ نہیں۔ اور لطف یہ کہ ان کا یہ خود ساختہ مذہب اور روایات کے بھی مخالف ہے جو خود ان کے نزدیک ان کے راویوں کے حوالہ سے انہیں کی کتابوں میں منقول و مروی ہیں!

باب ۱۰ خلفائے ثلاثہ و کبار صحابہؓ پر مطاعن

کا بیان ـــــ اور ـــــ جوابات

تلاش بسیار، اور جستجوئے بسیار کا حاصل یہ معلوم ہوا کہ اس عالم دنیا میں کوئی ایسا نہیں جس کے حق میں بد زبانوں اور بدگویوں اور عیب جینوں نے زبان طعن و قدح دراز نہ کی ہو!

دہریوں نے ذات الٰہی جل شانہ تک میں کلام کیا۔ انبیاء کرام علیہم السلام کی عصمت کے انکار میں معتزلہ نے حضرت آدم السلام سے لے کر

حتیٰ مرتبت نبی آخر صلی اللہ علیہ وسلم تک کو موضوع کلام بنایا۔ اور چھوٹے سے لے کر بڑے گناہ تک ان سے منسوب کیے! اور مزہ کی بات یہ کہ ثبوت میں قرآن و احادیث کے حوالے دیئے! یہودی فرقہ عصمت ملائکہ کے معاملہ میں اسی غلط روش پر چلا! نواصب و خوارج نے جناب امیر المومنین علی کرم اللہ وجہہ اور اہل بیت کی شان میں یہی وطیرہ رکھا، اور آخر میں ابن سبا یہودی اور اس کے پیروؤں نے جو مختلف فرقوں اور ناموں سے موسوم ہوتے رہے، خلفائے ثلاثہ، کبار صحابہ اور ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہم اجمعین کی اعلیٰ و ارفع شان میں مطاعن کا دروازہ کھولا ہے۔ اور اپنی ناقص و ناکارہ عقل اور گمان فاسد میں حوالوں کے لئے اہل سنت کی کتابوں کو سامنے لائے! لیکن دانشوروں اور عقلمندوں سے یہ بات پوشیدہ نہیں کہ یہ سب کچھ ایسا ہے جیسے چاندنی پر کتے بھونک رہے ہوں جس سے ان عالی قدر و منزلت اور عالم و عالمیان کے نزدیک مقدس و بزرگ اور محترم شخصیات کی عزت و قدر اور احترام میں ذرہ بھر بھی کمی نہیں آتی۔ کسی شاعر نے کہا ہے،

اِذَا اَتَتْکَ مَذَمَّتِیْ مِنْ نَاقِصٍ ۔ فَهِیَ الشَّهَادَةُ لِیْ بِاَنِّیْ کَامِلٌ ۔ (جب کسی کمینے سے تو میری برائی سنے تو سمجھ لے کہ وہ میرے لئے اس بات کی گواہی ہے کہ میں کامل ہوں) ان خلفائے کرام صحابہ عظام اور امہات المومنین رضوان اللہ علیہم کی عظمت، بزرگی اور بڑائی کی سب سے پہلی وجہ تو یہی ہے کہ باوجود انتہائی عناد اور پرلے درجہ کا کینہ رکھنے کے باوجود یہ دریدہ دہن اب تک صرف یہی چند شبہات سامنے لا سکے، جو غور و فکر کے ابتدائی مرحلہ میں ہی غبار بن کر ہوا میں اڑ جاتے ہیں۔ اور ان کا نام و نشان بھی باقی نہیں رہا حالانکہ ان بزرگوں کی عیب جوئی کے مواقع کی تلاش میں انہوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔ اور مقدور سے بڑھ کر سعی و کوشش کر ڈالی۔ اور پھر ایسا شخص جو گوشہ نشین نہیں تھا ریاست عامہ کا بار اس کے کندھوں پر تھا، مخلوق خدا کے ساتھ طرح طرح اور نوع بنوع معاملات سے اس کا ربط و ضبط تھا۔ اور وہ لاکھوں کی تعداد رکھنے والی ایک امت کا والی و نگران تھا۔ اس کا سابقہ دوستوں کے ساتھ دشمنوں سے بھی تھا۔ وہ امن و جنگ دونوں حالتوں سے گذرا اس نے اپنی زندگی میں صرف دس بارہ کام ایسے کئے ہوں جن پر دشمنوں اور بدزبانوں نے انگشت نمائی کی ہو، اور گرفت پائی ہو۔ جبکہ دوران بحث وہ قابل گرفت باتیں بھی محل طعن نہ بن سکی ہوں۔ تو کیا دنیا کے لئے اسکی عظمت کے اعتراف کے لئے اتنا کافی نہیں ہے۔ دنیا تو اس کے گن گاتی اور اسے سراہتی ہے جو ایک گھر بستی کا مالک ہوا اور زندگی بھر وہ روزانہ دو چار غلطیوں کے علاوہ اپنے سارے کام اور انتظام ٹھیک چلاتا رہا تو کیا ستم کی بات نہیں کہ اسکو قابل ستائش سمجھنے کے بجائے نشانہ طعن بنایا جائے جو اتنی بڑی ملت کی سیاست کاری اور انتظام امور میں مشغولیت کے باوجود دس پانچ غلطیوں اور وہ بھی موہوم سے زیادہ نہ کر سکا جن پر دشمنوں نے انگلی دھری۔

مطاعن ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ یہ کل پندرہ ہیں

اعتراض کہتے ہیں کہ ایک روز آپ خطبہ دینے ممبر پر چڑھے تو جناب حسنین رضی اللہ عنہما نے کہا اے ابوبکر (رضی اللہ عنہ) ہمارے نانا (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ممبر سے اتر جاؤ" ان کے قول سے معلوم ہوا کہ آپ اس کے اہل نہ تھے!۔

جواب۔ جناب حسن رضی اللہ عنہ کی پیدائش رمضان ۳ھ اور جناب حسین رضی اللہ عنہ کی شعبان ۴ھ کی اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ۱۱ھ کے ابتدا میں ہوا۔ اسی لئے عہد ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ میں یہ حضرات بالاجماع کمسن تھے یہی چھ سات سال کے! اب یہاں دو صورتیں ہیں، یا تو شیعہ ان حضرات کے اقوال و افعال کو اس کم عمری کے باوجود معتبر تسلیم کریں گے، اور ان پر اپنے احکام کی بنا رکھیں گے، یا صغر سنی کے سبب ان کو اہمیت نہ دیں گے، اور نہ ان سے احکام نکالیں گے۔

پہلی صورت میں ترک تقیہ لازم آتا ہے جو ان کے نزدیک واجب ہے (کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ خاموش کیوں نہ رہے جھگڑا کیوں پڑے)۔ اور پھر

Www.Ahlehaq.Com

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت بھی لازم آتی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چہار شنبہ سے لیکر دو شنبہ تک جناب صدیق رضی اللہ کو پنجوقتہ نمازوں میں اپنا خلیفہ بنایا اور اس اثنا میں آپ جمعہ و خطبہ کے فرائض بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نیابت میں انجام دیتے رہے!

اسی طرح جناب امیر المومنین علی کرم اللہ وجہہ کی مخالفت بھی لازم آئے گی کہ آپ بھی جناب صدیق رضی اللہ عنہ کے پیچھے نماز ادا فرماتے رہے اور آپ کی جمعہ و خطبہ کی نیابت کو بھی تسلیم کیا! اور دوسری صورت میں نہ کوئی نقص لازم آتا ہے، اور نہ کوئی قباحت کی بات ہی ہے۔ بچوں کا یہ قاعدہ ہے، کہ وہ اپنوں کی جگہ، کسی دوسرے کو دیکھتے ہیں، تو نا سمجھی میں ایسی ہی بات کہتے اور کرتے ہیں۔ تو ان کے قول و فعل سے استدلال نہیں کیا جاتا۔

اور یہ ہر چند انبیاء کرام اور ائمہ، کمالات نفسانیہ اور مراتب ایمانیہ میں عام مخلوق سے ممتاز ہوتے ہیں۔ مگر احکام بشری، خواص صغر سنی اور خصائص طفولیت ان میں بھی کار فرما رہتے ہیں۔ اسی لئے مقتدا بننے کے لئے کمال عقلی کی حد تک پہنچنا ضروری قرار دیا گیا ہے، چالیس سال سے قبل شاذ و نادر مثالوں کو چھوڑ کر۔ منصب رسالت کسی کو عطا نہیں ہوا۔ عربی میں ایک مثل ہے۔ اَلصَّبِیُّ صَبِیٌّ وَلَوْ کَانَ نَبِیًّا۔ (بچہ بچہ ہی ہے اگرچہ وہ نبی ہو)

اعتراض (۲) دوسرا اعتراض ان کا یہ ہے کہ مالک بن نویرہ، کی خوبصورت بیوی سے نکاح کے لالچ میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے جو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے امیر الامراء تھے مالک بن نویرہ کو جو مسلمان تھے نہ صرف قتل کیا بلکہ قتل ہی کی رات کو اس عورت سے نکاح کر کے تعلق زوجیت بھی کیا۔ اور اس کی عدت پوری ہونے کا بھی انتظار نہ کیا، کیونکہ عدت میں نکاح جائز نہیں اور یوں گویا زنا کے مرتکب ہوئے۔ اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے نہ ان پر حد لگائی نہ قتل کا قصاص لیا جبکہ دونوں سزائیں کالفاظ ان پر واجب تھا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اس پر ناراض بھی ہوئے اور فرمایا اگر میں امیر ہوتا تو تم سے قصاص لیتا

جواب:- دراصل جو واقعہ پیش آیا اسکی تعبیر ان لوگوں نے صحیح بیان نہیں کی! اور جب تک صحیح حالات معلوم نہ ہوں اس وقت تک اعتراض کی بے وقعتی ظاہر ہے۔ سیرت و تاریخ کی معتبر کتابوں میں اس واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ مدعی نبوت طلیحہ بن خویلد اسدی کی مہم سے حضرت خالد رضی اللہ عنہ جب فارغ ہو کر نواح بطاح (ایک مقام کا نام) کی طرف متوجہ ہوئے تو اطراف و جوانب کی طرف فوجی دستے روانہ کئے۔ اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد اور طریقے کے مطابق ان کو ہدایت کی کہ جس قوم، قبیلہ، گروہ پر چڑھائی کرو، وہاں سے اگر تمہیں اذان سنائی دے تو وہاں قتل و غارتگری سے باز رہو۔ اور اگر اذان کی آواز نہ سنائی دے تو اسے دار الحرب قرار دے کر پوری فوجی کاروائی کرو! اتفاقاً اس دستہ میں جناب ابو قتادہ انصاری رضی اللہ عنہ بھی تھے جو مالک بن نویرہ کو پکڑ کر حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے پاس لائے۔ جس کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے بطاح کی سرداری ملی ہوئی تھی۔ اور اس کے گرد و نواح کے صدقات کی وصولی بھی اسی کے سپرد تھی جناب ابو قتادہ رضی اللہ عنہ نے اذان سننے کی گواہی دی۔ مگر اسی دستہ کی ایک جماعت نے کہا کہ ہم نے اذان کی آواز نہیں سنی۔ مگر اس سے پیشتر گرد و نواح کے معتبرین کے ذریعہ یہ بات حتمی اور ثبوتی طور پر معلوم ہو چکی تھی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کی خبر سن کر مالک بن نویرہ کے اہل خانہ نے خوب جشن منایا، عورتوں نے ہاتھوں میں مہندی رچائی ڈھول بجائے، اور خوب فرحت و شادمانی کا اظہار کیا۔ اور مسلمانوں کی اس مصیبت پر خوش ہوتے۔ پھر مزید ایک بات یہ ہوئی کہ مالک بن نویرہ سے سوال و جواب کے دوران حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے اس کے منہ سے ایسے الفاظ نکلے جس کے کفار و مرتدین اپنی گفتگو میں عادی تھے، اور استعمال کرتے تھے یعنی قَالَ صَاحِبُکُمْ اَوْ صَاحِبُکُمْ (تمہارے آدمی یا تمہارے ساتھی نے ایسا

کہا علاوہ ازیں یہ بات بھی منکشف ہو چکی تھی کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کی خبر سن کر مالک بن نویرہ نے وصول شدہ صدقات بھی اپنی قوم کو یہ کہہ کر واپس کر دیئے تھے کہ اچھا ہوا "اس شخص ؐ کی موت سے تم نے مصیبت سے چھٹکارا پالیا۔ ان حالات اور اپنے سامنے اس کی گفتگو کے انداز سے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو اس کے ارتداد کا یقین ہوگیا اور آپ نے اس کے قتل کا حکم دے دیا! اُدھر جب مدینہ میں اس واقعہ کی اطلاع پہنچی۔ پھر جناب ابوقتادہ رضی اللہ عنہ بھی آپ سے ناراض ہو کر دارالخلافہ پہنچے۔ اور قصور وار حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو ہی ٹھہرایا تو ابتداً حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا یہی خیال تھا کہ خون ناحق ہوا اور قصاص واجب ہے۔ مگر جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو طلب فرما کر تفتیش حال کی، ان سے پورا واقعہ پوچھا اور حالات و واقعات کا سارا راز آپ پر منکشف ہوا تو آپ نے ان کو بے قصور قرار دیکر ان سے کچھ تعرض نہیں کیا اور ان اسی سابقہ عہدہ پر بحال رکھا۔ اب اسی واقعہ کو سامنے رکھ کر اور فقہی مسئلہ میں غور کرکے دیکھ لیا جائے کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ پر زنا و قتل کی حد کیسے واجب ہو سکتی ہے! اب رہی یہ بات کہ حربی عورت کو بھی ایک حیض بقدر عدت گذارنی ضروری ہے۔ اور اتنا انتظار بھی نہیں ہوا۔ تو اس میں پہلی بات تو یہ ہے کہ اگر واقعہ صحیح بھی ہے تو یہ اعتراض حضرت خالدؓ پر ہوتا ہے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ پر کیوں؟ پھر حضرت خالدؓ نہ معصوم تھے، نہ امام عام! لیکن بات یہ نہیں۔ دراصل یہ قصہ ہی من گھڑت ہے۔ اسی لیے کسی مستند و معتبر کتاب میں اس کی کوئی روایت نہیں ملتی۔ بعض غیر معتبر کتابوں میں یہ روایت ملتی بھی ہے تو اس کا جواب بھی ساتھ ساتھ اسی روایت میں موجود ہے، کہ مالک بن نویرہ نے اس عورت کو ایک عرصہ سے طلاق دے رکھی تھی اور رسم جاہلیت کی پابندی میں ایسے یوں ہی گھر میں ڈال رکھا تھا۔ اسی رسم جاہلیت کے توڑنے پر قرآن مجید کی یہ آیت نازل ہوئی تھی۔ وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوهُنَّ۔ جب تم عورتوں کو طلاق دے دو اور ان کی عدت پوری ہو جائے تو انہیں روکے نہ رکھو! لہٰذا اس عورت کی عدت تو کب کی پوری ہو چکی تھی۔ اور نکاح حلال ہو چکا تھا۔ تو اگر حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے فوری نکاح کر لیا تو اعتراض کی کیا بات ہے! فقہا اہل سنت کا یہی مذہب ہے۔

اسباب میں چونکہ اعتراضات اہل سنت پر کیے جا رہے ہیں، اور انہیں کے مذہب اور روایات سے اعتراضات کو ثابت کرنا بھی مقصود ہے۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ اہل سنت ہی کی روایات اور مسائل کا لحاظ رکھا جائے۔ ورنہ تو مقصد حاصل نہیں ہو گا۔ (کوئی شیعہ اپنی روایات، اپنے مسائل پیش کرکے اہل سنت پر اعتراض کا کیا حق رکھتا ہے جبکہ وہ ان کو صحیح و حق تسلیم ہی نہ کرتا ہو) استیعاب کا ایک حوالہ ملاحظہ کیجئے،

وَأَمَّرَهُ أَيْ خَالِدًا أَبُوبَكْرِ الصِّدِّيقُ عَلَى الْجُيُوشِ فَفَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْيَمَامَةَ وَغَيْرَهَا وَقُتِلَ عَلَى يَدَيْهِ أَكْثَرُ أَهْلِ الرِّدَّةِ مِنْهُمْ مُسَيْلِمَةُ الْكَذَّابُ وَمَالِكُ بْنُ نُوَيْرَةَ الخ

حضرت ابوبکر صدیقؓ نے ان کو یعنی خالدؓ کو امیر لشکر بنایا۔ پس اللہ تعالیٰ نے ان کے ذریعہ یمامہ اور دوسرے مقامات فتح کرائے اور ان کے ہاتھوں بہت سے مرتدین قتل کرائے ان میں سے مسیلمہ کذاب اور مالک بن نویرہ بھی تھے۔

دوسرا جواب:۔ چلو مان لیا کہ مالک بن نویرہ مرتد نہ تھا۔ مگر حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو اس کے ارتداد کا شبہ تو پیدا ہو گیا تھا۔ اور وَالْقِصَاصُ تَنْدَرِئُ بِالشُّبُهَاتِ (اور شبہ کی صورت میں قصاص ختم ہو جاتا ہے)

تیسرا جواب:۔ جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ خلیفہ رسول اللہ تھے۔ سنیوں یا شیعوں کے خلیفہ تو نہیں تھے کہ ان کی فرمائش اور خواہش کے مطابق کام انجام دیتے، وہ جس ذات اقدس کے خلیفہ تھے ان کا اسوہ ان کے سامنے تھا، انہیں اسی کی پیروی کرنی

www.Ahlehaq.com

اور انہیں کی سنت پر عمل کرتا تھا۔ اور اسی زمانہ محترم و مقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں انہیں خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے سینکڑوں اسی قسم کے مشتبہ افراد کو قتل کیا، مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی تعرض نہ فرمایا۔ چنانچہ اہل سیرت و تاریخ کا اس قصہ کی صحت پر اجماع ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ جناب خالد رضی اللہ عنہ کو ایک لشکر کا امیر بنا کر بھیجا۔ تو آپ نے ایک قوم پر چڑھائی کی۔ وہ لوگ اسلام تو لے آئے تھے لیکن قواعد و تعلیمات اسلام سے ابھی روشناس نہیں ہوئے تھے جب ان پر حملہ ہوا تو اپنے اسلام کے اظہار کے لیے، یہ الفاظ ان کے منہ سے نکلے صَبَأْنَا صَبَأْنَا (ہم صابی ہیں ہم صابی ہیں۔ صابی بمعنی بے دین) ان کا مطلب تو یہ تھا کہ اپنے سابق دین سے پھر گئے اور اسلام لے آئے

جناب خالد رضی اللہ عنہ نے ان کے قتل کا حکم دے دیا۔ اسی لشکر میں حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی جانب سے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بھی ایک دستہ کے سردار تھے، انہوں نے اپنے ماتحتوں کو حکم دیا کہ ان کو قتل نہ کرو قید میں رکھو!

جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس واقعہ کی خبر ہوئی، تو آپ بہت ملول اور رنجیدہ ہوئے۔ بہت افسوس ظاہر فرما کر یہ الفاظ فرمائے اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَبْرَأُ اِلَیْکَ مِمَّا صَنَعَ خَالِدٌ (اے اللہ میں تیری جناب میں خالد نے جو کچھ کیا اس سے بری ہوں) لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ پر حد جاری کی، نہ کوئی قصاص و دیت دلائی۔ اس لئے اس نظیر کی موجودگی میں اسی قسم کے شبہ یا اس سے زیادہ شبہ کی صورت میں جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے جناب خالد بن ولید سے کوئی تعرض نہیں کیا تو کونسا قصور کیا خصوصاً اس صورت میں کہ آپ نے بیت المال سے اس کی دیت دلا بھی دی ہو! آپ پر طعن و اعتراض وہی کر سکتا ہے جس کا دل بغض و کینہ کی آلائش سے آلودہ ہو!

چوتھا جواب:۔ کیوں جناب مالک بن نویرہ کا قصاص نہ لینا اگر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے لئے باعث طعن ہے۔ تو ذی النورین الشہید حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قصاص نہ لینے پر حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی خلافت کے متعلق آپ کا کیا فیصلہ ہے؟ اس لئے کہ ان کا قتل تو بلا وجہ بلا سبب تھا۔ نہ واقعہ میں کوئی سبب تھا نہ وہم گمان میں کوئی بات!

پانچواں جواب:۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ پر حضرت خالد رضی اللہ عنہ سے قصاص لینا اسوقت واجب ہوتا جب مالک بن نویرہ کے ورثاء اس کا مطالبہ کرتے اور اس قسم کے مطالبہ کا بالکل کوئی ثبوت نہیں۔ بلکہ اس کے بھائی متمم بن نویرہ نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے سامنے اپنے بھائی کے مرتد ہو جانے کا اعتراف کیا۔ حالانکہ یہ بھائی وہ تھا جو اپنے بھائی مالک سے عشق کی حد تک محبت کرتا تھا، عمر بھر اسکی جدائی میں تڑپتا پھڑکتا رہا۔ ہمیشہ اس کے فراق میں چاک گریبان آہ و فغاں کرتا رہا۔ چنانچہ اس کے مرثیے عرب بھر میں ضرب المثل مانے گئے اس کے دو شعر ملاحظہ ہوں،

(۱) وَکُنَّا کَنَدْمَانَیْ جُذَیْمَۃَ حِقْبَۃً ۔ مِنَ الدَّھْرِ حَتّٰی قِیْلَ لَنْ یَّتَصَدَّعَا (۲) فَلَمَّا تَفَرَّقْنَا کَاَنِّیْ وَمَالِکًا ۔ لِطُوْلِ اجْتِمَاعٍ لَمْ نَبِتْ لَیْلَۃً مَعًا

(۱) عمر کے ایک حصہ تک ہم دونوں بھائی جذیمہ کے دو مصاحبوں کی مانند تھے، کہ لوگ یہ کہنے لگے کہ یہ ہرگز بھی باہم جدا نہ ہوں گے،

(۲) لیکن جب ہم جدا ہوگئے تو میں اور مالک کی اتنے عرصہ کی یکجائی کے بعد یہ معلوم ہوا کہ ہم نے ایک رات بھی ساتھ نہ گذاری ہو!

چنانچہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اپنی سابقہ رائے پر جو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں ان کی تھی متاسف اور نادم ہوئے آپ نے اس کا برملا اعتراف کیا کہ جناب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اس سلسلہ میں جو فیصلہ کیا وہ عین حق اور بالکل درست تھا اور عین برانصاف! اور اسکی سب سے بڑی اور واضح دلیل یہ ہے کہ آپ نے اپنے عہد میں جناب خالد رضی اللہ عنہ سے کوئی تعرض نہیں فرمایا، نہ ان پر حد جاری کی، نہ قصاص لیا۔ حالانکہ حدود کے معاملہ میں آپ بہت سخت اور متشدد تھے، اور کسی رو رعایت سے

کام نہ لیتے تھے۔

اعتراض (۳) - تیسرا طعن اور اعتراض یہ کرتے ہیں کہ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کے لشکر کے سلسلہ میں آپ نے تاخیری صورت اختیار کی۔ حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اس لشکر کو رخصت فرمایا تھا۔ لوگوں کا نام بنام تقرر فرمایا اور آخر وقت تک اس پر بہت زور دیتا اور تاکید فرماتے رہے۔ بلکہ اس کی تیاری کے سلسلہ میں یوں ارشاد فرماتے: جَهِّزُوْا جَيْشَ اُسَامَةَ لَعَنَ اللّٰهُ مَنْ تَخَلَّفَ۔ (اسامہؓ کے لشکر کو سامان مہیا کرو۔ جو اس سے پیچھے ہٹے اس پر اللہ کی لعنت ہے)

جواب :- سب سے پہلے تو یہ بات متعین ہونا ضروری ہے کہ ان لوگوں کا یہ اعتراض حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ پر کس حیثیت اور پہلو سے ہے، کیا اس وجہ سے کہ آپ نے اس کے لئے تیاری نہیں کی؟ یا یہ صورت تھی کہ آپ اس میں شریک نہیں ہوئے۔ اگر مدنظر پہلی صورت ہے تو یہ سفید جھوٹ ہے۔ وہاں تو صورت یہ تھی کہ آپؓ نے دیگر صحابہ کی آزار کے علی الرغم جیش اسامہؓ کی ہر پہلو سے تیاری کی، اس سلسلہ کی تفصیل اور صحیح صورت حال یوں تھی کہ ۲۶ صفر بروز دوشنبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم فرمایا کہ (حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کا انتقام لینے اور رومیوں سے جہاد کی غرض سے لشکر ترتیب دیا جائے سہ شنبہ کے دن آپؐ نے جناب اسامہ رضی اللہ عنہ کو اس لشکر کا امیر مقرر فرمایا۔ (۲۸) صفر چہارشنبہ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مرض آخری لاحق ہوا۔ پر دوسرے روز علالت کے باوجود دست مبارک سے نشان (علم) تیار فرمایا، اور ارشاد فرمایا۔ اُغْزُ بِسْمِ اللّٰهِ وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَقَاتِلْ مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ۔ (اللہ کے نام سے اللہ کے راستہ میں غزوہ کرو۔ اور اللہ کے منکروں سے جنگ کرو) پھر حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ اس علم کو لئے باہر نکلے اور جناب بریدہ الحصیب رضی اللہ عنہ کو دیا کہ انہیں لشکر کا علمبردار مقرر کیا گیا تھا۔ اور مدینہ سے چل کر بمقام جرف میں آ ٹھہرے کہ سارے لشکر کی اجتماع گاہ یہی پہلی منزل تھی، کہ جو آئے لشکر میں ملتا جائے۔ ادھر کبار صحابہ مہاجرین و انصار۔ حضرت ابو بکر صدیق، حضرت عمر فاروق، عثمان غنی، سعد بن وقاص، ابوعبیدہ بن جراح، سعید بن زید، قتادہ بن نعمان، اور سلمہ بن اسلم رضی اللہ عنہم اجمعین، اس لشکر کے شایان شان تیاریوں میں مصروف تھے، خیمے اور دیگر سامان روانہ کر چکے تھے۔ اور خود بھی روانگی کے لئے پابرکاب تھے کہ چہارشنبہ کے غروب اور پنجشنبہ کی ابتدائی ساعتوں میں آپؐ کے مرض نے شدت اختیار کرلی، اور مدینہ میں بے چینی، جان نثاروں میں ہل چل مچ گئی شب پنجشنبہ عشاء کی نماز کے لئے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جانشین مقرر فرمایا اور اس خدمت کیلئے آپ کو نامزد فرمادیا۔ (اور جانشینی کا یہ سلسلہ کئی دن تک جاری رہا) تا آنکہ ۱۰ ربیع الاول کی تاریخ اور دوشنبہ کا دن آیا کہ اس دوران آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مرض میں کچھ تخفیف معلوم ہوئی تھی! حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کو کنار محبت و رحمت میں لے کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے حق میں دعا فرمائی۔ اور فی امان اللہ کہا۔ مگر یک شنبہ کو مرض میں اچانک اضافہ ہو گیا۔ اُدھر حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ دوشنبہ کی صبح روانگی کا ارادہ کر چکے تھے اور روانہ ہونے ہی کو تھی کہ ان کی والدہ ام ایمن رضی اللہ عنہا کا قاصد یہ پیغام لایا کہ حضور صلی اللہ پر عالم نزع طاری ہے، حضرت اسامہ اور دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم، گرتے پڑتے واپس مدینۃ النبیؐ آگئے۔

بریدہ الحصیب نے وہ علم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حجرہ مبارک کے دروازہ پر گاڑ دیا۔ جب آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم منزل آخرین میں جاگزیں ہو چکے۔ اور جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ مسند خلافت کے لئے منتخب کر لئے گئے تو آپ نے حکم دیا کہ علم اسامہؓ کے گھر کے دروازہ پر نصب کیا جائے۔ بریدہ کو حکم ہوا کہ اسامہ رضی اللہ عنہ کے گھر کے دروازہ پر کھڑے ہو کر لشکر کو از سر نو ترتیب دیں۔ اور جناب اسامہ رضی اللہ عنہ کو کوچ کا حکم ملا۔ چنانچہ وہ مدینۃ النبی سے روانہ ہوئے اور پہلا پڑاؤ جرف میں کیا۔

اسی دوران بعض قبائل عرب کے مرتد ہونے اور ان کے مدینہ منورہ پر چڑھائی کی تشویشناک خبر ملی۔ تو سارے صحابہ جناب صدیق

www.Ahlehaq.com

اکبر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں آئے اور کہنے لگے، وقت بڑا نازک ہے، حالات دگرگوں نظر آتے ہیں، ایسے وقت اتنا بھاری لشکر دور و دراز کی مسافت پر بھیجنا خلاف مصلحت ہے۔ ایسا نہ ہو کہ عرب مدینہ خالی دیکھ کر شورش برپا کر دیں۔ اور فتنہ اٹھ کھڑا ہو، اور اہل مدینہ کسی آفت و مصیبت میں گھر جائیں۔ مگر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے یہ مشورہ قبول نہیں فرمایا۔ اور یہ فرمایا کہ اگر مجھے یہ معلوم بھی ہو جائے کہ اسامہؓ کے لشکر کی روانگی کے سبب میں مدینہ میں درندوں کا لقمہ بن جاؤں گا تب بھی مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کی خلاف ورزی کے مقابلہ میں یہ صورت منظور ہوگی! البتہ اسامہ رضی اللہ عنہ سے بصورت درخواست اتنا کہا کہ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو مدینہ ٹھہرنے کی اجازت دے دو کہ مدینۃ النبی کی حفاظت و انتظام میں مجھے ان کے مشورہ کی ضرورت ہوگی چنانچہ جناب فاروق رضی اللہ عنہ جناب اسامہ رضی اللہ عنہ کی اجازت سے مدینۃ النبی واپس آگئے۔ اور باقی لشکر جوں کا توں یکم ربیع الثانی کو حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کی قیادت میں، روانہ ہوا، اور جہاں حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ نے جام شہادت نوش فرمایا تھا۔ اس رخ چل پڑا تھا اس مقام کا نام اُبنیٰ تھا۔

یہ ہے اصل قصہ اور واقعہ جو روضۃ الصفا، روضۃ الاحباب، حبیب السیر اور شیعوں و سنیوں کی دیگر معتبر کتابوں میں بیان کیا گیا ہے۔

اور اگر مقصود اعتراض دوسری صورت ہے، کہ آپؓ رفاقت اسامہؓ سے بچھڑ گئے اور ان کا ساتھ نہ دیا۔ تو واقعہ اور صورت بالا کو مد نظر رکھا جائے تو اس اعتراض کا کوئی جواز نظر نہیں آتا۔ اور نہ اس کے جواب کی ضرورت باقی رہتی ہے تاہم اس کے چند جوابات ملاحظہ ہوں۔

(۱) رئیس وقت کو یہ اختیار ہے کہ اگر ایک آدمی کا تقرر اس نے کسی جگہ کیا ہے تو ضرورت کے وقت وہ کسی دوسرے منصب پر بھی اس کا تبادلہ و تقرر کر سکتا ہے۔ اور اس وقت اس کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ پہلی خدمت سے اس کو بری الذمہ کر دیا۔ یہاں بھی صورت یہی تھی کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اول یہ حکم فرمایا کہ ابو بکر رضی اللہ عنہ جیش اُسامہؓ میں شریک ہو کر جہاد کے لیے جائیں۔ وہ اس کی تیاری میں مصروف تھے کہ آپؐ صلی اللہ علیہ وسلم کی مرضی ہوئی کہ وہ میرے نائب نماز کی خدمت انجام دیں، تو وہ خدمت سپرد فرما دی۔ اس مطلب ہوا کہ لشکری خدمات سے آپ کو چھٹی مل گئی! اس صورت حال پر اعتراض وہی کر سکتا ہے جو یا تو عقل سے پیدل ہو یا اپنا بغض و کینہ نکالنے کے لیے اعتراض برائے اعتراض کا قائل ہو! شرعی نقطۂ نظر سے بھی یہ ثابت ہے کہ جہاد سے پہلے کی ابتدائی صورت فرض کفایہ ہے۔ اور لشکر اسامہ رضی اللہ عنہ کی تیاری بھی اسی نوعیت کی تھی، اس لیے آپؓ کا لشکر اسامہؓ کے ساتھ نہ جانا کوئی قابل اعتراض نہیں اور نہ آپؓ پر کوئی الزام آتا ہے۔ دوسری طرف صورت حال یکسر بدل گئی تھی۔ آپ ولی الامر، خلیفۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم تھے پوری ملت کی فلاح و بہبود کی ذمہ داری آپ پر تھی۔ کفار و مرتدین کا جو فتنہ سر اٹھا رہا تھا اسکو فرو کرنا فرض عین تھا اس کو آپ کیسے نظر انداز فرما سکتے تھے۔ لہٰذا یہ کہنا درست ہوگا کہ آپ نے فرض عین کی آدائیگی کی خاطر فرض کفایہ کو ترک فرمایا یہی حکم شرعی بھی ہے۔ اور پھر اب تو پوزیشن بھی بدل گئی تھی: اب تو لشکر کی تیاری، ساز و سامان کی فراہمی لوگوں کو اس کی ترغیب دلانا۔ اور ہر قسم مدد و ضروریات کا خیال رکھنا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نائب ہونے کی حیثیت سے آپؓ ہی کو سرانجام دینے تھے، اور ان سب کاموں کا سہرا اب تو آپ ہی کے سر تھا۔ اور ان کا اجر و ثواب آپ ہی کے نام لکھا جاتا تھا۔

(۲) دشمن کی سرکوبی کے لیے کسی امیر کی سرکردگی میں چند اشخاص کی نامزدگی سیاست تمدنی، دینی کی ذمہ داریوں میں سے ایک ذمہ داری ہے جو حاکم وقت کی صوابدید سے متعلق ہوتا ہے۔ وہ حکم منزل من اللہ نہیں ہوتا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد اس انتظام اور سیاست ملی کا بوجھ جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے کاندھوں پر آیا۔ اب یہ امور آپ کی صوابدید سے وابستہ ہوئے کہ جس کو چاہیں جناب اسامہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ متعین کر دیں اور جس کو مناسب سمجھیں اپنے ساتھ رکھیں خود

www.Ahlehaq.com

شرکت کرنا چاہیں شریک ہو جائیں۔ نہ چاہیں تو نہ جائیں۔ ان کے اتنے ردو بدل سے فرمان اور حکم رسول کی مخالفت لازم نہیں آتی۔ مخالفت تو تب ہوتی کہ آپ رضی اللہ عنہ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کی جگہ کسی اور کو امیر لشکر مقرر فرماتے۔ یا یہ مہم اور لشکر کی روانگی کے ارادہ کو ترک کر دیتے یا دشمنوں سے صلح کر لیتے۔ حاصل کلام یہ ہے کہ ملک و ملت اور دینی مصالح اور جزئی امور میں وقتی طور پر ردو بدل رئیس وقت، خلیفہ بادشاہ کی صوابدید سے متعلق و وابستہ ہوتے ہیں ان میں وہ اپنی عقل و رائے کو پورا دخل دینے کا پورا پورا مجاز ہے، اور اس سلسلہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام نہ شرعی حیثیت سے تھے اور نہ ان سے متعلق کوئی وحی نازل ہوئی تھی۔ رہا لعنت والا جملہ، تو اہل سنت کی کتابوں میں یہ موجود نہیں ہے۔ بالفرض اس کو صحیح مان لیں تو اس کے یہ معنے ہوں گے کہ اس مہم میں اسامہؓ کو تنہا چھوڑ دینا اور جناب زید بن حارثہؓ کے انتقام کے لئے رومیوں کے خلاف اس جہاد سے پہلو تہی کرنا اور شریک نہ ہونا حرام ہے اور جناب ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ جب خدمت امامت سے گراں بار ہوتے تو بلاشبہ ان تمام امور سے آپ مستثنیٰ قرار پائے جس طرح اس لشکر کی روانگی کے سلسلہ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی شرکت کے علاوہ دیگر تمام امور کا انتظام فرمایا، ان کی انجام دہی کے لئے بتاکید اصرار فرمایا۔ اسی طرح عدم موجودگی کے سبب آپؓ کے نائب نے سوائے اپنی شرکت کے، یا حضرت اسامہؓ کی اجازت سے فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے رُک جانے کے تمام امور عین نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی منشا اور ان کے انتظامات کے مطابق یہ مہم روانہ فرمائی، اور ہر طرح کے ساز و سامان جہاد کا ان کے لئے انتظام فرمایا۔ (ن) چنانچہ شہرستانی نے اپنی کتاب "الملل والنحل" میں لکھا ہے کہ یہ لعنتی جملہ من گھڑت اور افترا محض ہے، کسی فارسی میں نوشت و خواند کی صلاحیت رکھنے والے شخص نے محدثین اہل سنت کا لبادہ اوڑھ رکھا ہو اور وہ اپنی کتاب میں یہ جملہ نقل کرے تو اس سے اہل سنت کو الزام دینا خوش فہمی کے سوا کچھ نہیں۔ اس لئے کہ اہل سنت کے نزدیک وہی حدیث معتبر ہے جو محدثین کی معتبر کتب میں مدون ہو اور جس کی صحت کا حکم بھی اس کے ساتھ مذکور ہو بے سند حدیث ان کے لئے نہ قابل توجہ ہے، اور نہ لائق اعتماد۔

(۴۳) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے منصب میں انقلاب آگیا پہلے ان کا شمار عام مومنین میں تھا، (خصوصیت یہ تھی کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صدیق اور یار غار تھے۔ وزیر و مشیر تھے۔ ن) لیکن اب امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفہ اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے نائب و جانشین ہیں۔ جب کسی شخص کے منصب میں انقلاب آجائے اور وہ ایک منصب سے دوسرے منصب پر فائز ہو جائے تو حکم شرع کے بموجب موجودہ منصب کے احکام جاری ہوتے ہیں۔ پہلی حیثیت و منصب والے نہیں۔ مثلاً جب پیٹ کا بچہ پیدا ہو جائے، پھر وہ جوان و بالغ ہو جائے، یا پاگل اچھا ہو جائے، مقیم مسافر ہو جائے، مسافر اقامت اختیار کر لے، غلام آزاد ہو جائے، رعیت حاکم بن جائے، عام آدمی قاضی و جج بن جائے، فقیر مالدار، مالدار فقیر ہو جائے، زندہ موت کی راہ لگ جائے، میراث و ولایت میں قریب تر رشتہ دار فوت ہو جائے۔ اور اسی قسم کے بے شمار ایسی نظیریں ہیں، کہ پہلی حالت گزرنے کے بعد اس پر دوسری حیثیت و حالت کے احکام نافذ ہوں گے۔ بچہ نابالغ ہے تب تک معصوم ہے۔ بالغ ہونے پر یہ مکلف ہوگا اب اس پر معصومیت کی حالت والے احکام نافذ نہیں ہوں گے۔ مکلف والے احکام جاری ہوں گے،

اب جب جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ جانشین رسول، ہوئے، تو اب اسامہؓ کی ماتحتی والا حکم باقی نہیں رہا۔ اب اس لشکر کے ساتھ ان کا وہی رویہ ہونا چاہیئے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنی حیات کے وقت تھا۔ اور اس معاملہ میں جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قدم بقدم رہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس لشکر کے ساتھ خود تشریف نہیں لے جا رہے تھے، کہ ایک امر مسمی کا مرحلہ سامنے تھا۔ اور اب ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ بھی (گو دلی خواہش رہی ہو) اس لشکر کے ساتھ نہیں جا سکتے تھے اس لئے کہ موجودہ منصب کا اب یہ تقاضا تھا کہ وہ مرکز کی حفاظت بنفس نفیس فرمائیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پوری تیاری اور اہتمام کے

ساتھ بہر صورت اس لشکر کی روانگی چاہتے تھے، اور جناب اسامہ رضی اللہ عنہ کی سرگردگی میں چاہتے تھے۔

جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے بھی کیا۔ اور لشکر کو پوری تیاری اور بڑے اہتمام کے ساتھ بہر صورت بھیجا۔ اور اسامہ ہی امیر لشکر رہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اعتراضات و مشوروں کے باوجود جناب اسامہؓ کو امیر لشکر رکھا۔ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے بھی رفقاء کے مشوروں، اور مصالح ملکی اور قوانین جنگ کے علی الرغم انکی امارت کو باقی رکھا۔ اور مشوروں کے جوابات میں یہ جواب مرحمت فرمایا کہ "ابو بکرؓ کی کیا مجال کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مقرر کردہ امیر کو ہٹادے (معنًا)۔ اس معاملہ میں کوئی ہوشمند آدمی یہ نہیں کہہ سکتا کہ حضرت اسامہؓ رضی اللہ عنہ والے معاملہ میں جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے کوئی قابل اعتراض طرز عمل اختیار کیا ہو

(۴) بالفرض یہ مان ہی لیا جائے۔ کہ جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے لئے نہ نیابت نماز بھی باعث استثناء نہیں۔ نہ مہمات خلافت کی مشغولی یا مدینہ اور ناموس رسول کی حفاظت کا عذر کام آسکتا ہے آپ اس پر مامور تھے کہ رومیوں کی لڑائی کے لئے جناب اسامہ کے ساتھ نکلیں۔ تاکہ تخلف کا الزام نہ آئے! اور جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے ایسا نہیں کیا۔ وہ اسامہ کے لشکر کے ساتھ نہیں گئے؟ اس صورت میں زیادہ سے زیادہ یہی کہا جائے گا کہ آپ کی عصمت میں فرق آگیا، لیکن امامت میں عصمت شرط ہے کہاں عدالت البتہ ضروری ہے۔ تو چھوٹے موٹے ایک آدھ گناہ کے ارتکاب سے عدالت بھی مجروح نہیں ہوتی۔ اور اسباب پرستی تو اعتقاد رکھتے ہی ہیں شیعہ بھی اس کے قائل ہیں کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نہ فاسق تھے اور نہ ان سے کبھی کوئی کبیرہ گناہ سرزد ہوا۔

(۵) پانچواں جواب یہ ہے کہ حضرات شیعہ جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ یا ان جیسے بعض دوسرے بزرگوں پر اہل سنت کے کیسۂ علم سے منقول غلط کردہ چار روایات کے ذریعہ جو طعن و اعتراض کرتے وہ انہیں اول تو ثابت نہیں کر پاتے۔ اور بالفرض ان کے دو چار طعن ثابت بھی ہوں۔ تو ان کو یہ چاہیئے کہ پہلے تو جناب ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے فضائل و مناقب، اور جنت کے درجات عالیہ کی بشارت کی روایات کو جو اہل سنت بحوالہ آیات قرآن، احادیث رسول۔ اخبار ائمہ و دیگر اہل بیت سے ثابت کرتے ہیں جن میں سے بعض خود شیعوں کے نزدیک ان کی کتابوں میں بطریق صحیح منقول بھی ہیں۔ ایک پلڑے میں رکھیں، اور اس کے مقابلہ میں اپنے مزعومہ، من گھڑت اور افتراء پر مبنی مطاعن کی گٹھڑی رکھ دیں۔ پھر پلڑوں کا رخ دیکھ کر ہم سے جواب کا مطالبہ کریں۔

(۶) شیعوں کے نزدیک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم وجوب کے لئے متعین نہیں ہے، جیسا کہ مرتضیٰ نے کتاب ذرر اور غرر میں اس کی دلیل لکھی ہے۔ لہٰذا اگر خاص جناب ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے متعلق یہ ثابت بھی ہو جائے کہ وہ اسامہؓ کے ساتھ جائیں۔ اور وہ نہ جائیں تو انہیں کے قواعد کے مطابق کوئی خرابی لازم نہیں آتی ممکن ہے یہ حکم مندوب (مستحب) ہو، جس کا ترک موجب گناہ نہیں۔ اب رہا لعنت والا جملہ، تو اس کا ایک جواب تو "یہ جملہ ہماری کتابوں میں نہیں" اوپر گذر چکا۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ اگر موجود بھی ہو تو لفظ من تخلف۔ عام ہے۔ شیعی کتب اصول میں اسکی تصریح موجود ہے۔ لہٰذا اس وعید میں اکیلے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ہی نہیں جناب امیر المومنین اور دوسرے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم بھی داخل ہوں گے۔ تو ان کے متعلق جو تمہارا جواب ہوگا وہی جواب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی طرف سے ہمارا بھی ہوگا۔ پھر اگر وہ کہیں، کہ یہ وعید تو ان لوگوں کے لئے ہے جو جیش اسامہؓ کے لئے نام بنام، نامزد کئے گئے تھے تو ہم کہیں گے کہ "جہزوا جیش اسامہ" کا خطاب ان متعین اور نامزد حضرات کی طرف نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ جیش اسامہؓ ہی کو یہ کہا جائے کہ جیش اسامہؓ کے لئے سامان اکٹھا کرو، کیا بات ہوئی۔ لامحالہ ماننا پڑیگا کہ یہ خطاب عام تھا۔ اور سب مسلمان اسی کے مخاطب تھے۔ اور لعنت کا جملہ اسی کے ساتھ چسپاں ہے۔ لہٰذا اس سے نامزد حضرات کی تخصیص

ثابت نہیں ہوتی!

(۷) جیسا کہ باب نبوت میں گزرا کہ شیعوں کے ہاں یہ ثابت ہے کہ حضرت آدم و حضرت یونس علیہما السلام نے اللہ تعالیٰ کے بلاواسطہ براہ راست حکم کی خلاف ورزی کی (نعوذ باللہ) تو اگر امام و خلیفہ سے رسول کے ایک حکم کی خلاف ورزی ہو گئی تو وہ وجہ طعن کیوں ہے، کہ نائب بہرحال نائب ہے وہ اصل سے بہرحال کمتر ہوتا ہے!

اعتراض (۴):— چوتھا اعتراض یہ ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے کبھی کوئی ایسا کام ذمہ نہیں کیا جو اقامت دین و شرع سے تعلق رکھتا ہو، اور جس شخص میں ایک بھی دینی امر کی ولایت کی قابلیت نہ ہو وہ ولایت عامہ کی قابلیت کیسے رکھ سکتا ہے۔

جواب:— اس اعتراض کا جوب کئی پہلوؤں سے دیا جا سکتا ہے۔

(۱) ان کا یہ دعویٰ سراسر جھوٹ، بہتان اور محض فریب ہے دونوں فرقوں کی سیر و تاریخ کی کتابوں سے بالاتفاق یہ ثابت ہے، اور صحیح بھی ہے کہ احد کی شکست کے بعد جب یہ خبر ملی کہ ابو سفیان شکست و پسپائی پر بہت نادم ہے اور مدینۃ النبی پر حملہ آور ہونے کا ارادہ رکھتا ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے مقابلہ کے لیئے جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو متعین کر کے آپ کو رخصت کیا۔ چوتھے سال (ہجرت) غزوہ بنی نضیر، میں صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو امیر لشکر مقرر فرما کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم دولت خانہ تشریف لے گئے۔ چھٹے سال جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم غزوہ بنی لحیان کے لیئے تشریف لے گئے تو آپ کی آمد کی خبر سنکر یہ قبیلہ پہاڑ کی چوٹیوں پر قلعہ بند ہو گیا۔ آپؐ نے دو ایک روز وہاں قیام فرما کر مختلف اطراف میں فوجی دستے روانہ فرمائے، ان میں سب سے اچھا دستہ جناب صدیق رضی اللہ عنہ کے زیر کمان تھا، جو کراع الغمیم کی سمت روانہ ہوا۔ غزوہ تبوک کے وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم، نے اعلان فرمایا کہ لشکری مدینۃ النبی سے نکل کر ثنیۃ الوداع۔ مقام پر جمع ہوں اور ان کے امیر جناب ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ ہوں، چنانچہ آپ ہی کی صوابدید پر سارے کام انجام پائے! غزوہ خیبر کے موقعہ پر جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو درد شقیقہ لاحق ہوا، تو قلعہ کا محاصرہ کا معاملہ درپیش تھا۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جناب حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو اپنا نائب بنا کر قلعہ پر حملہ کا حکم دیا۔ اور اس دن جناب صدیق رضی اللہ عنہ نے بڑی سخت لڑائی لڑی۔ ساتواں سال، آپؓ ہی کو بنی کلاب کی سرکوبی کے لیئے روانہ فرمایا۔ اور سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ کو مع، سالہ آپؓ ہی ہمرکابی میں رکھا پھر آپؓ نے بنو کلاب سے جنگ کی، ایک جماعت کو تہ تیغ کیا، ایک جماعت کو قیدی بنالیا۔ اور بنو فزارہ پر بھی ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ ہی امیر لشکر تھے۔ چنانچہ حاکم رح نے سلمہ بن اکوع ؓ سے یہ روایت بیان کی کہ

اَمَّرَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ علیہ وسلم اَبَا بَکْرٍ فَغَذَوْنَا نَاسًا مِّنْ بَنِیْ فَزَارَۃَ فَلَمَّا دَنَوْنَا مِنَ الْمَآءِ اَمَرَنَا اَبُوْبَکْرٍ فَعَرَّسْنَا فَلَمَّا صَلَّیْنَا الصُّبْحَ اَمَرَنَا اَبُوْبَکْرٍ فَشَنَنَّا الْغَارَۃَ اِلٰی آخِرِ الْحَدِیْثِ، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جناب ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو امیر لشکر بنایا چنانچہ ہم نے بنو فزارہ سے جنگ کی جب ہم پانی کے قریب پہنچے تو ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ہمیں وہاں شب بسری کا حکم دیا چنانچہ ہم نے وہاں رات گذاری۔ صبح کی نماز کے بعد جناب صدیق رضی اللہ عنہ کے حکم سے ہم نے حملہ کیا۔

معارج اور حبیب السیر میں مسطور ہے کہ غزوہ تبوک کے بعد ایک اعرابی (دیہاتی) نے حضور صلی اللہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا، دعریوں کی ٹکڑی وادی الرمل میں مقیم ہے جو شبخون مارنے کا ارادہ رکھتی ہے، تو حضور صلی اللہ وسلم نے جناب ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو امیر لشکر بنایا ان کو اپنا نشان دیکر اس ٹولی کی سرکوبی کے لیئے روانہ فرمایا۔

www.ahlehaq.com

اسی طرح جب بنی عمرو بنی عوف کی خانہ جنگی ہوئی تو حضور صلی اللہ کو اس کی اطلاع ظہر کے بعد ملی آپ فوراً ہی اصلاح احوال اور صلح و صفائی کی غرض سے وہاں تشریف لے گئے اور جاتے وقت حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے ارشاد فرما گئے، کہ نماز کے وقت میں نہ آسکوں تو ابوبکر رضی اللہ عنہ سے کہنا کہ وہ نماز پڑھائیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور عصر کی نماز جناب ابوبکر رضی اللہ عنہ نے پڑھائی۔

نواں سال جب حج فرض ہوا تو اسی سال بعض وجوہ کی بنا پر حضورؐ کا تشریف لے جانا ملتوی رہا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جناب صدیق رضی اللہ عنہ کو امیر حج بنا کر صحابہ کی ایک بہت بڑی جماعت کے ساتھ مکہ مکرمہ روانہ فرمایا۔ تاکہ وہاں جا کر خود بھی ادائیگی مناسک حج میں مشغول ہوں اور دیگر موجودہ افراد کو اس عظیم الشان عبادت کے قواعد سے آگاہ کریں، اور سنہ وفات کے ربیع الاول کے عشرہ اول کی، شب پنجشنبہ سے دوشنبہ کی صبح تک کی نمازوں کے لئے نائب مقرر فرمانا۔ تو اتنا مشہور واقعہ ہے کہ محتاج بیان نہیں۔

اب آپ غور کریں کہ وہ دینی امور جن کا تعلق رئیس امام، خلیفہ سے ہوسکتا ہے وہ جہاد، نماز اور حج یہ تینوں ہی تو ہیں۔ اور ان تینوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی موجودگی میں خلیفہ اول جناب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو اپنا نائب بنایا۔ اب وہ اور کونسا دینی امر رہ گیا ہے جس میں جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نیابت، ولایت، یا امامت کی لیاقت و قابلیت نہیں رکھتے تھے،

(۲) ہم اسے تسلیم کر لیتے ہیں کہ جیسے یہ کہتے ہیں ایسا ہی ہوگا۔ لیکن اس کا سبب وہ نہیں جو یہ بیان کرتے ہیں۔ بلکہ وجہ یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر مبارک میں ان کا منصب و درجہ وزیر و مشیر کا تھا۔ کہ اہم دینی امور کے فیصلہ کے وقت آپؐ ان کی موجودگی کو ضروری خیال فرماتے۔ اور ان کی موجودگی ہی میں اس قسم کے امور طے فرماتے اور رسم ریاست اور معمول سلطنت ہی یہی ہوتا ہے کہ بڑے پایہ کے امراء و وزراء کی حاضری دربار میں اہم اور ضروری خیال کی جاتی ہے ان کو عملداری اور فوجداری کے لئے نہیں بھیجتے۔ اور فوجی دستوں پر امیر نہیں کیا کرتے، اسی لئے کہ اہم اور بلند مرتبہ امور ان کی غیر موجودگی کے سبب ابتری کا شکار ہوتے ہیں اور یہ وجہ خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ظاہر فرمائی۔ چنانچہ حاکم نے حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے یہ سنا کہ میں چاہتا ہوں کہ دور دراز کی جگہوں پر لوگوں کو دین کی تعلیم و ترویج کے لئے بھیجوں، جیسا کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام نے اپنے حواریوں کو بھیجا تھا۔ حاضرین نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ کے پاس تو ان کے پایہ کے افراد موجود ہیں مثلاً ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما) اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ اِنَّہٗ لَا غِنٰی لِیْ عَنْھُمَا اِنَّھُمَا مِنَ الدِّیْنِ کَالسَّمْعِ وَ الْبَصَرِ۔ بات یہ ہے کہ میں ان دونوں سے بے نیاز نہیں ہونا چاہتا کیونکہ دین کے لئے یہ دونوں آنکھ، کان کی طرح ہیں۔

علاوہ ازیں حضور صلی اللہ وسلم نے یہ بھی ارشاد فرمایا، کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے چار وزیر مرحمت فرمائے دو اہل زمین سے یعنی ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما، اور دو آسمان سے یعنی جبرئیل و میکائیل علیہما السلام،

(۳) اگر کسی کی نااہلی کی دلیل ہی یہ ہے کہ اس کو کسی اہم کام کے لئے بھیجا نہ گیا ہو، تو یہ حضرت جناب حسنین رضی اللہ عنہما کے متعلق کیا کہیں گے؟ کہ ان کو بھی جناب امیر علی المرتضیٰ رضی اللہ نے کسی ذمہ داری کے کام سے باہر نہیں بھیجا۔ تو کیا آن کو بھی امامت کا نااہل سمجھتے ہیں؟ جبکہ ان کے علاتی بھائی جناب محمد بن الحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو بہت سے کاموں پر مامور فرمایا کرتے تھے۔ حتیٰ کہ لوگوں نے آپ سے پوچھا کہ آپ کے والد محترم، آپ ہی کو لڑائیوں اور خطرناک کاموں کے لئے کیوں بھیجتے ہیں اور حسنین رضی اللہ عنہما کو اپنے پاس سے جدا نہیں کرتے، آخر اس میں کیا راز ہے؟ اس کا جواب انصاف پسند امام زادے نے اپنی شان شایاں دیا اور فرمایا کہ ہمارے باپ کی اولاد میں جناب حسنین رضی اللہ عنہما ان کے لئے ایسے ہیں جیسے انسان کے لئے دو آنکھیں۔ اور دوسری اولاد ان کے لئے ہاتھ پاؤں ہیں، تو جب تک ہاتھ پاؤں سے کام نکل سکے آنکھوں کو تکلیف دینے کی کیا ضرورت! اور انسانی فطرت بھی یہی ہے کہ آنکھ پر کوئی

www.Ahlehaq.com

آفت آئے تو بلا اختیار ہاتھ اس کی ڈھال بن جاتا ہے۔

اعتراض (۵)۔ پانچواں اعتراض یہ ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو مسلمانوں کے امور کا متولی بنایا، اور پوری امت کا ان کو خلیفہ بنا دیا، حالانکہ حضور صلی اللہ کے عہد مبارک میں وہ صرف ایک سال کے لئے صدقات کی وصولی پر مامور ہوئے تھے۔ پھر اس خدمت سے معزول ہوئے، اور پیغمبر علیہ السلام کے معزول کردہ کو بحال کرنا اور خدمت سپرد کرنا پیغمبر علیہ السلام کی کھلم کھلا مخالفت ہے!

جواب:۔ یہ اوندھی منطق کسی انتہائی بے وقوف ہی کی طرف سے پیش کی جاسکتی ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی معزول کئے گئے! یہ خود کہتے ہیں کہ ان کو وصول صدقات کی خدمت ایک سال کے لئے سپرد کی گئی تھی۔ جب انہوں نے یہ خدمت ایک سال تک انجام دے کر وہ کام سرانجام دے دیا، اور اپنی ذمہ داری پوری کر دی تو یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ وہ معزول کر دیئے گئے۔ اگر معزول اسی طرح ہوتا ہے تو کیا یہ لوگ بعد موت انبیاء و ائمہ کو بھی معزول سمجھتے ہیں؟

(۲) اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو معزول ہی مانا جائے تو ان کی معزولی حضرت ہارون علیہ السلام جیسی ہوگی۔ کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کوہ طور سے واپس تشریف لائے، تو یہ نیابت و خلافت سے سبکدوش ہوگئے۔ لیکن پھر جب مستقل نبی ہوئے تو اس سبکدوشی نے آپکی قابلیت و لیاقت امامت و نیابت میں کوئی نقص پیدا نہیں کیا۔ تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے معاملہ میں ایسا کیوں نہ سمجھا جائے جن کے بارے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا لَوْ كَانَ بَعْدِيْ نَبِيٌّ لَكَانَ عُمَرُ (میرے بعد اگر کوئی نبی ہوتا تو وہ عمر ہوتے) معلوم ہوا کہ ان کی سبکدوشی ان کی لیاقت امامت و خلافت پر بالکل اثر انداز نہیں ہوئی۔

(۳) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت تو اس وقت لازم آتی کہ آپ اس کی ممانعت فرما دیتے اور پھر ابوبکر رضی اللہ عنہ ان کو برسرکار کرتے، اور معاملہ ایسا ہے ہی نہیں۔ اس لئے مخالفت لازم ہی نہیں آتی۔ یہاں تو صورت یہ ہے کہ ایک کام حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سپرد نہیں فرمایا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے وہ ان کے سپرد کیا۔ اگر مخالفت رسول کے یہ معنی ہوں کہ جو کام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ کیا ہو، وہ دوسرے نے کر دیا تو نعوذ باللہ پھر حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے نبرد آزما ہونا بھی مخالفت ہوگی،

اعتراض (۶) یہ اعتراض ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جناب شیخین رضی اللہ عنہما پر جناب عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو امیر مقرر فرمایا۔ اسی طرح حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کی ماتحتی میں دونوں حضرات کو دیا۔ اگر یہ حضرات سرداری و ریاست کی قابلیت رکھتے یا ان میں افضلیت اور اولیت ہوتی تو ان کو سردار بناتے اور دوسروں کو ان کا ماتحت کرتے۔

جواب:۔ اس طعن اور اعتراض کے رد میں کئی پہلوؤں سے گفتگو ہوسکتی اور جواب دیا جاسکتا ہے۔

اول:۔ ان حضرات کو امیر نہ بنانا ان کی عدم لیاقت اور عدم افضلیت کو ثابت کرتا ہے۔ تو لامحالہ ان کو امیر بنانا، ان کی قابلیت اور افضلیت کو ثابت کریگا۔ مگر پہلے تو ایک سوال درپیش ہے کہ کیا شیعہ حضرات عمرو بن عاص اور حضرت اسامہ رضی اللہ عنہما کی لیاقت امامت اور افضلیت کا اعتقاد رکھتے ہیں؟ اور اسے ماننے کو تیار ہیں؟ اگر ان کا جواب اثبات میں موجود ہو تو اہل سنت کو اس کے جواب کی ضرورت پڑیگی ورنہ نہیں۔

دوم:۔ مفضول کو افضل پر امیر بنانا نہ افضل میں کسی کوتاہی اور برائی کو ثابت کرتا ہے اور نہ مفضول میں افضلیت اور امامت کبریٰ کی لیاقت ہی پیدا کرتا ہے۔ کیونکہ اکثر و بیشتر کسی خاص کام میں کسی کو سربراہ بنا دینا کسی خاص جزئی مصلحت پر مبنی ہوتا ہے۔

یعنی وہ خاص کام بعضوں ہی کے ہاتھوں انجام پا سکتا ہے، انہیں کے وہ شایان شان ہوتا ہے جیسا کہ حضرت عمرو بن عاص کی سربراہی میں ہوا۔ کیونکہ وہ جوڑ توڑ اور حیلہ و تدبیر اور چکر دے کر کام نکالنے میں مشاق تھے۔ اور مقصد بھی یہی تھا کہ جنگی چالوں اور حیلہ و تدبیر سے دشمن کو مات دی جائے اور اس کا قلع قمع کر دیا جائے ایک دوسری بات یہ بھی کہ وہ دشمنوں کی عیاریوں، چالوں اور گھاتوں کو خوب سمجھتے اور ان کے پوشیدہ راستوں سے بخوبی واقف تھے۔ جبکہ افضل حضرات اتنے واقف نہ تھے۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ چور پکڑنے یا راستہ کو خطرات سے پاک کرنے کے لیے، محافظوں اور فوجداروں ہی کا انتخاب ہوتا ہے، امیر الامراء وغیرہ کے سپرد ایسی خدمات نہیں ہوتیں۔ یا کسی خاص کام کی سربراہی میں سربراہ کیلئے تسلی و تشفی مقصود ہوتی ہے جیسے حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کے واقعہ میں، کہ شامی اور رومی افواج کے ہاتھوں ان کے والد حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ شہید ہو چکے تھے، اس لیے ان کو اس مہم کا سربراہ بنایا گیا تاکہ اپنے ہاتھوں ان کا انتقام لیں، اور یوں ان کے دل کو صبر اور قرار آئے،

سوم :- حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک مقصد یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آگے چل کر جن کو ملت اسلام کی سربراہی کی مسند آراستہ کرنی ہے، اور ہزاروں لاکھوں ماتحتوں سے سابقہ پیش آنا ہے، ان کو اس کی بھی تربیت ہو جائے کہ ماتحتی کے زمانہ میں کیا عالم ہوتا ہے، کیا جذبات ہوتے ہیں، کیا مراحل درپیش ہوتے ہیں، اور اپنے سربراہوں کے ساتھ کیا معاملات پیش آتے ہیں، زیردستوں اور ماتحتوں کی کس طرح دیکھ بھال، غور و پرداخت ہوتی ہے۔ یہ ساری باتیں اسی وقت معلوم ہوتی ہیں، جب آدمی خود بھی اس عالم سے گذرا ہو، اور خود بھی کسی کا ماتحت رہ چکا ہو! تو گویا یہ تابعداری اور ماتحتی ایک مرحلہ تربیت و تعلیم ریاضت و سلیقہ امارت تھی! تاکہ ایسے لوگوں کے جذبات و خیالات اور حالات سے واقفیت کی بنا پر آگے چل کر ان سے کام لینے، یا ان کے حقوق کی ادائیگی میں کوئی کمی و کوتاہی باقی نہ رہے، چنانچہ ان حضرات نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے جو تربیت پائی تھی اسی کا طفیل تھا کہ ہر دو حضرات رضی اللہ عنہما اپنے امراء اور اپنے لشکریوں کو ایسی خوش اسلوبی اور حسن انتظام کے ساتھ رکھتے تھے کہ جس سے بہتر سے بہتر انتظام کی اور اچھے ثمرات حاصل ہوتے تھے۔ پیادہ سے لے کر کمانڈر تک اپنے امیر کا وفادار اور ان کے حکم کی بجا آوری میں ہمہ دم مستعد اور تیار رہتا۔ نہ امراء کے دماغ میں بغاوت و خود مختاری کے جذبات بھڑکتے نہ لشکریوں میں اپنے فرائض سے غفلت و کاہلی و سستی راہ پاتی۔ یا بے رغبتی ظاہر ہوتی۔ نہ امیر اپنے لشکریوں پر ظلم و تعدی کرتے نہ لشکری حکم عدولی کا تصور تک کرتے یا بغاوت کی سوچتے۔ رعایا امن چین سے تھی، اور مطمئن زندگی گذارتی تھی۔ غنائم و فتوحات میں روز بروز اضافہ اور زیادتی تھی یہ حالات و واقعات واقفان فن سیرت پر روز روشن کی طرح عیاں ہیں۔ اور اتنے ہی یقینی جیسے گذرا ہوا کل! ایسے امور واقعیہ میں شیعوں کی کوئی دھاندلی اور ایچ پیچ نہیں چلتے، ان کا زور تو دبی باتوں یا شیخ چلی کی گھاتوں میں ہی چلتا ہے، کہ اگر یوں ہوتا خوب ہوتا اور وُں ہوتا تو بہتر ہوتا!

اعتراض (۷) :- اعتراض ہے کہ انتخاب خلیفہ میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے طرز کے خلاف کیا کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو اپنا خلیفہ بنایا۔ جبکہ باوجود اس کے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم قطعی طور سے یہ جانتے تھے کہ کیا بات مصلحت ہے اور کیا فساد ہے، اور پھر آپ کو اپنی امت سے جس قدر شفقت و مہربانی اور رافت تھی وہ بھی ظاہر ہے، مگر اس سب کے باوجود آپ نے اپنی امت پر کسی کو خلیفہ نہیں بنایا۔

جواب :- اول۔ تو یہ بات سفید جھوٹ ہے اور بہتان! کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے امت پر کسی کو خلیفہ نہیں بنایا۔ کیا شیعہ یہ نہیں کہتے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جناب علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو خلیفہ مقرر فرمایا۔ (یہ بغض ابوبکرؓ میں اتنے بڑھے ہوئے کہ اپنے پاؤں آپ کلہاڑی مار لی۔ اور بالواسطہ یہ مان گئے کہ جناب امیرؓ کو بھی حضور سے سند امامت حاصل نہیں۔ کیونکہ "کسی

میں جناب امیرؓ یقیناً شامل ہیں۔ (۱) لہٰذا اگر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی متابعت میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ مقرر کر دیا تو ان شیعوں کو تو یہ کہتے ہوئے شرمانا چاہیئے کہ آپ رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کی۔ یہ جواب تو شیعہ متعقدات کی بنیاد پر ہے، اور اگر گفتگو کی بنا معتقدات اہل سنت پر ہو تو محققین اہل سنت نماز و حج میں جناب ابو بکر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنانے کے قائل ہیں۔ صحابہ اکرام رضی اللہ عنہم جو اپنے محبوب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے رمز شناس آپ کے کاموں کے دقیقہ سنج اور آپ کے اشاروں کے رازدان تھے، ان کے لئے یہ اشارات کافی تھے۔ اور جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اپنے فیصلہ کو تحریری شکل صرف اس لیے دی کہ آپ کے پیش نظر یہ بات تھی کہ عرب و عجم کے نو مسلم تصریح و تنصیص کے اور بدون وفاق عہد نامے کے اس سے واقف نہ ہو سکیں گے۔

دوسرے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا صراحت کے ساتھ خلیفہ مقرر نہ کرنا اس بنا پر تھا کہ آپ وحی ربانی، اور الہام سبحانی سے بالیقین یہ جانتے تھے کہ آپ کے بعد جناب ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ ہی خلیفہ ہوں گے۔ برگزیدہ اصحاب اس پر اتفاق کریں گے اور کسی دوسرے کو اس میں دخل اندازی کی تاب و مجال نہ ہوگی۔ چنانچہ اہل سنت کی کتب صحیحہ میں ایسی احادیث موجود ہیں جو اس پر دلالت کرتی ہیں، مثلاً۔ فَاَبٰی عَلَیَّ اِلَّا تَقْدِیْمَ اَبِیْ بَکْرٍ (آپؐ نے ابو بکرؓ کی تقدیم کے سوا کوئی صورت قبول نہ کی) یا حدیث یَاْبَی اللّٰہُ وَالْمُؤْمِنُوْنَ اِلَّا اَبَا بَکْرٍ (اللہ اور مسلمان ابو بکرؓ کے علاوہ کسی کو قبول نہ کریں گے)، یا حدیث فَاِنَّہٗ الْخَلِیْفَۃُ مِنْ بَعْدِیْ۔ (میرے بعد وہی خلیفہ ہیں)۔ جب یقین تھا تو پھر خلیفہ بنانے اور عہد نامہ لکھنے کی کیا ضرورت رہ گئی تھی۔ چنانچہ صحیح مسلم میں مذکور ہے کہ مرض آخری میں آپ نے جناب ابو بکرؓ اور ان کے صاحبزادے کو بلایا بھی تھا کہ اس سلسلہ میں ایک تحریر لکھوا دیں۔ مگر پھر فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ اور مسلمان خود بخود سوائے (ابو بکر رضی اللہ عنہ) کے کسی اور کو خلیفہ نہیں بنائیں گے اب لکھنے کی حاجت کیا ہے اس لیے آپ نے ارادہ ترک فرما دیا۔

بخلاف جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے کہ نہ آپ پر وحی اترتی تھی اور نہ آپ کو اس کا قطعی علم تھا۔ اور نہ ہی قرائن سے اس کا پتہ چلا سکتے تھے کہ لوگ بلا شک و شبہ میرے بعد جناب عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنا لیں گے۔ ہاں آپ اپنی سوجھ بوجھ سے یہ ضرور یقین رکھتے تھے کہ دین و ملت کے لئے عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی خلافت اصلح اور مفید ہوگی۔ اس لئے یہ بات ان کے لئے بمنزلہ فرض ضروری تھی کہ جس بات میں امت کی بہتری اور صلاح ہے اسکو روبعمل لائیں۔ بحمد اللہ آپ کی عقل سلیم نے صحیح کام کیا کہ شوکت دین، انتظام امور سلطنت اور کافروں کی خواری حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں جسقدر ہوئی تاریخ عالم اسکی مثال و نظیر پیش کرنے سے عاجز و قاصر ہے،

تیسرے یہ کہ خلیفہ نہ بنانا ایک الگ بات ہے، اور اس سے منع کرنا الگ بات مخالفت اس وقت تو ہوتی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم خلیفہ بنانے سے منع فرما دیتے اور جناب صدیق رضی اللہ اس کے باوجود خلیفہ مقرر فرماتے، یہ صورت مخالفت کی نہیں ہے کہ جو کام حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ فرمایا وہ کام صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے کر لیا۔ اس تسلیم نہ کرنے کی صورت میں یہ لازم آتا ہے کہ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے جناب حسن رضی اللہ عنہ کو خلافت کے لئے منتخب فرما کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت فرمائی ہو۔

اعتراض (۸) :- اعتراض کرتے ہیں کہ ابو بکر (رضی اللہ عنہ) کہتے تھے اِنَّ لِیْ شَیْطَانًا یَعْتَرِیْنِیْ فَاِنِ اسْتَقَمْتُ فَاَعِیْنُوْنِیْ وَاِنْ زِغْتُ فَقَوِّمُوْنِیْ۔ (میرے ساتھ ایک شیطان لگا ہوا ہے۔ اگر میں سیدھا چلوں تو میرا ہاتھ بٹاؤ، اور اگر ٹیڑھے راستہ پر چلوں تو مجھے سیدھا کر دو) اور جس کے پیچھے شیطان لگا ہوا ہو اور اسے راہ بھٹکا دے وہ امامت کے قابل نہیں۔

جواب :- اول یہ ہے کہ یہ روایت اہل سنت کی معتبر کتابوں کی رو سے صحیح نہیں! اس لئے ایسی روایت سے ان کو الزام نہیں دیا

جا سکتا۔ بلکہ جو صحیح روایت ثابت شدہ ہے وہ اس کے خلاف ہے۔ وہ یہ کہ اپنی وفات کے وقت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو بلا کر جو وصیت فرمائی وہ یہ تھی وَاللهِ مَا نِمْتُ فَحَلَمْتُ وَمَا شُبِّهْتُ فَتَوَهَّمْتُ وَإِنِّي لَعَلَى السَّبِيلِ مَا زِغْتُ وَلَمْ آلُ جُهْدًا وَإِنِّي أُوصِيكَ بِتَقْوَى اللهِ۔ بخدا میں نہیں سویا کہ خواب پریشان دیکھتا۔ نہ شبہ میں پڑا کہ توہمات میں الجھتا۔ میں یقیناً سیدھے راستہ پر ہوں، بہکا نہیں۔ میں نے کوشش میں کوئی کسر نہیں چھوڑی اور میں تم کو بھی اللہ سے ڈرتے رہنے کی وصیت کرتا ہوں۔

البتہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد اور مسئلہ خلافت طے ہونے پر آپ نے پہلا خطبہ جو دیا وہ یہ تھا۔

"اے رسول کے ساتھیو میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا خلیفہ تو ہوں لیکن دو باتوں کی مجھ سے ہرگز امید نہ رکھنا۔ ایک وحی کی، دوسرے شیطان سے عصمت کی"، آپ کا یہ خطبہ مسند امام احمد، اور اہل سنت کی دوسری کتب میں موجود ہے، اس خطبہ کے آخر میں یہ بھی ہے کہ "میں معصوم نہیں ہوں۔ پس تم پر میری اطاعت انہیں امور میں فرض ہے جو خدا کی شریعت اور پیغمبر کی سنت کے موافق ہوں۔ ان کے خلاف اگر میں کچھ کہوں تو اسے نہ مانو بلکہ مجھے ٹوکو" اور یہ وہ عقیدہ ہے جس پر سارے مسلمانوں کا اتفاق ہے جو سراسر انصاف پرستی ہے۔ چونکہ لوگ ریاست پیغمبر کے عادی تھے، اور اپنی ہر مشکل وحی الہی کی طرف رجوع کر کے حل کرتے تھے، اور پیغمبر کی معصومیت کے سبب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر بات بے چون وچرا قبول کیا کرتے تھے، اس لئے اب بدلے ہوئے حالات میں خلفائے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے یہ ضروری تھا کہ لوگوں کو یہ بتائیں کہ یہ دونوں خصلتیں پیغمبر کے ساتھ مخصوص ہوتی ہیں۔ انہیں میں پائی جاتی ہیں، ان کے علاوہ کسی میں نہیں۔ چاہے وہ ان کا نائب ہی ہو۔ اور نائب چاہے خود رسول اللہ علیہ وسلم نے مقرر فرمایا ہو یا امت نے انہیں اپنا امیر اور نائب رسول منتخب کیا ہو!

دوسری بات یہ کہ کلینی میں جناب صادق رحمۃ اللہ علیہ کے طریق صحیح روایات صحیحہ موجود ہیں، "کہ ہر مومن کے ساتھ ایک شیطان ہوتا ہے جو اسکو بہکانے کی کوشش میں لگا رہتا ہے" حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک صحیح حدیث میں یہ ارشاد بھی ملتا ہے۔ مَا مِنْكُمْ مِنْ أَحَدٍ إِلَّا وَقَدْ وُكِّلَ بِهِ قَرِينُهُ مِنَ الْجِنِّ۔ (تم میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جس کے ساتھ ایک جن مصاحب مقرر نہ کیا ہو) صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا آپ کا بھی کوئی شیطان ساتھی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہاں ہے تو پر اللہ تعالی نے اس پر مجھے غلبہ دیدیا ہے اس لئے میں اس کے شر سے بچا رہتا ہوں، اب قابل غور بات یہ ہے کہ جب انبیاء کرام علیہم السلام کے ساتھ یہ معاملہ ہے اور اس کی وجہ سے کار و منصب نبوت میں کوئی فرق نہیں پڑتا تو جناب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت و امامت میں کیوں فرق پڑیگا۔ کیونکہ خلیفہ و امام کا متقی ہونا ضروری ہے اور شیطانی خطرہ متقی کو بھی دامنگیر رہتا ہے۔ لیکن تقویٰ کی برکت سے وہ شیطان کی چالوں کو بھانپ جاتا ہے اور اس کے دام میں آنے سے بچ جاتا ہے اللہ تعالی کا ارشاد ہے

إِنَّ الَّذِينَ اتَّقَوْا إِذَا مَسَّهُمْ طَائِفٌ مِّنَ الشَّيْطَانِ تَذَكَّرُوا فَإِذَا هُم مُّبْصِرُونَ۔	بے شک وہ لوگ جو متقی ہیں جب انہیں شیطان کی طرف سے وسوسے پیش آتے ہیں تو وہ فوراً متنبہ ہو جاتے ہیں اور ان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں

ہاں اس شخص کی خلافت و امامت کو ضرور نقصان پہنچتا ہے جو شیطان سے مات کھا جائے اور اس کے پیچھے لگ جائے! اپنی لگام اس کے ہاتھ میں دیدے۔ اور جو وہ کہے کرے۔ اور پھر توبہ تلا کر کے تلافی بھی نہ کرے ارشاد ربانی ہے وَإِخْوَانُهُمْ يَمُدُّونَهُمْ فِي الْغَيِّ ثُمَّ لَا يُقْصِرُونَ۔ اور شیطان کے چیلے (قابو یافتہ کو) گمراہی میں گھسیٹے لئے جاتے ہیں۔ پھر وہ کوئی کمی نہیں چھوڑتے۔ اور یہ مرتبہ ہے فسق و فجور کا جو لیاقت امارت و خلافت میں بالاجماع یقیناً خلل انداز ہوتا ہے!

تیسرے۔ اگر جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے ایسا فرمایا بھی ہو تو اس کے باوجود آپ کے منصب خلافت و امامت میں کوئی فرق نہ

www.Ahlehaq.com

آئے تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے، کیونکہ جناب علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ تو بلا شبہ خلیفہ برحق ہیں اپنے ساتھیوں سے برملا اسی قسم کا کلام فرمایا کرتے تھے۔ آپ کے یہ اقوال خود شیعوں کی اصح الکتب نہج البلاغہ میں موجود ہیں، ایک قول آپ کا اسی کتاب کے اوراق سابق میں ملاحظہ کر چکے ہیں یعنی

لَا تَكُفُّوا عَنْ مَقَالَةٍ بِحَقٍّ أَوْ مَشُورَةٍ بِعَدْلٍ فَإِنِّي لَسْتُ بِفَوْقِ أَنْ أُخْطِيَ وَلَا آمَنُ ذَٰلِكَ مِنْ فِعْلِي

حق بات کہنے اور صحیح مشورہ دینے سے باز نہ رہو کیونکہ میں خطا کے صدور سے بالاتر نہیں ہوں اور نہ اپنے کاموں میں اس کے سرزد ہونے پر مطمئن ہوں

اور پھر اس سے کس کو انکار کی مجال ہے کہ شیطان نے حضرت آدم علیہ السلام کو بہکایا تھا۔ اور ان کے ذریعہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوا تھا۔ ان کے بہکاوے میں آنے کے سبب سے ہی تو آپ جنت سے اس خاکدان تیرہ و تار میں بھیج دیئے گئے تھے۔ حالانکہ وہ خلیفہ تھے اور خلیفہ رسول بھی نہیں بلکہ خلیفۃ اللہ تھے۔ ان کے پاس تو اِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً کی خدائی سند بھی تھی۔

اور کون حضرت داؤد علیہ السلام کے خلیفۃ فی الارض ہونے سے منکر ہوگا کہ وہ خلافت پر يَا دَاوُدُ إِنَّا جَعَلْنَاكَ خَلِيفَةً فِي الْأَرْضِ کی دلیل قاہر رکھتے تھے۔ پھر وہ بھی شیطان کی رہ سے اوریا کی بیوی کے معاملہ میں کتنے پریشان ہوئے۔ بالآخر تنبیہ الٰہی کا نشانہ بنے اور توبہ استغفار کی نوبت آئی۔ اور کیا کہیں گے اور رادخوان شیعہ جنہوں نے جناب سجاد رحمۃ اللہ علیہ کا صحیفہ کاملہ دیکھا ہوگا آپ کی دعا گوش ہوش سے سنی ہوگی کہ آپ اپنے لیئے کیا ارشاد فرمارہے ہیں،

قَدْ مَلَكَ الشَّيْطَانُ عِنَانِي فِي سُوءِ الظَّنِّ وَضَعْفِ الْيَقِينِ وَإِنِّي أَشْكُو سُوءَ مُجَاوَرَتِهِ وَطَاعَةَ نَفْسِي لَهُ

بدگمانی، اور یقین کی کمزوری کے معاملہ میں شیطان میری باگ پر قابض ہوگیا۔ اور میں اس کے برے پڑوس اور اپنے نفس کے اس کے پیچھے لگ لینے کی شکایت کرتا ہوں

اور اب دونوں حضرات کی عبارات کو میزان عدل میں تول لیجئے، ایک پلڑے میں جناب صدیق رضی اللہ عنہ کے الفاظ يَعْتَرِينِي اور اِنْ زُغْتُ کو رکھئے اور دوسرے میں جناب سجاد رحمۃ اللہ کے مَلَكَ عِنَانِي وَطَاعَةَ نَفْسِي رکھئے! اور اسی کے ساتھ اس قضیہ حملیہ کو بھی پیش نظر رکھئے جو آپ کے کلام میں واقع ہے جو نسبت بالجزم بین الطرفین سے وقوع طرفین پر دلالت کرتا ہے۔ (یعنی آپ کے کلام سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ان کی باگ شیطان نے قبضہ میں لے لی تھی، اور آپ کا نفس اس کی پیروی کرنے لگا تھا۔)

دوسری طرف جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا قضیہ شرطیہ بھی قابل لحاظ ہے۔ اِنْ زُغْتُ جو وقوع طرفین کا ہرگز متقاضی نہیں۔ (یعنی آپ بطور شرط فرمارہے ہیں کہ اگر میں کج رو ہو جاؤں۔ اور "کج رو ہو جاؤں"، اور "کج رو ہوگیا" میں جو زمین و آسمان کا فرق ہے وہ معمولی فہم شعور رکھنے والے سے بھی پوشیدہ نہیں۔) اور یہاں یہ بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ صرف شیطان کے گھات میں لگنے سے کیا نقص و نقصان ہے جبکہ وہ مقصد میں ناکام رہے۔ (اگر آپ کی جیب محفوظ ہے تو کسی جیب تراش کے پیچھے لگنے سے آپ کا کیا نقصان ہے؟) بلکہ یہ تو فضیلت و تعریف کی بات ہے۔ (کہ آپ اتنے بیدار اور چوکنے اور اس کے حربوں سے اتنے واقف تھے کہ وہ عمر بھر سر ٹپکتا رہا مگر آپ کو انگلی تک نہ لگا سکا۔ آپ پر قابو پانا تو دور کی بات ہے۔) اور آخر میں سورہ یوسف میں ۱۳ پارہ کی پہلی آیت کا یہ حصہ اور دیکھ لیجئے وَمَا أُبَرِّئُ نَفْسِي۔ إِنَّ النَّفْسَ لَأَمَّارَةٌ بِالسُّوءِ إِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّي۔ میں اپنے نفس کو بری الذمہ نہیں کرتا وہ تو بے شک بری باتوں ہی کا حکم دینے والا ہے ہاں یہ کہ میرا رب رحم فرمائے۔ تقاضائے دین و دیانت تو یہی ہے کہ اس آیت کی موجودگی میں جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے صرف اس کلمہ کے باعث آپ کو منصب خلافت سے نہیں گرانا، اور اس کو موجب طعن و اعتراض نہ بنانا چاہیئے۔ دگر اسم کو ان سے وفا کی ہے امید۔ جو نہیں جانتے وفا کیا ہے!

www.Ahlehaq.com

اعتراض ۹: نواں اعتراض یہ ہے کہ جناب عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا۔ اَلَا اِنَّ بَیْعَۃَ اَبِیْ بَکْرٍ کَانَتْ فَلْتَۃً وَّقَی اللّٰہُ الْمُؤْمِنِیْنَ شَرَّھَا فَمَنْ عَادَ اِلٰی مِثْلِھَا فَاقْتُلُوْہُ۔ (بے شک ابو بکر رضی اللہ عنہ کی بیعت اچانک تھی، اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اس کے ضرر سے بچا لیا۔ اب اگر دوبارہ کوئی ایسا کرے تو اسے قتل کر دو) صحیح بخاری کی روایت کے گو الفاظ مختلف ہیں مگر مطلب ان کا بھی یہی ہے۔ لہٰذا یہ روایت صریح طور پر یہ ثابت کرتی ہے کہ جناب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بیعت اچانک، بے مشورہ اور بے تامل عمل میں آئی اور بغیر اس کے کہ ان کی بیعت کے اسباب پر روشنی ڈالی جاتی کوئی دلیل دی جاتی ان کو خلیفہ بنا دیا گیا۔ گویا آپ کی خلافت کی کوئی بنیاد نہیں تھی اور یوں آپ خلیفہ برحق نہ ہوئے۔

جواب ا: — حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہد میں ایک صاحب یہ کہتے تھے کہ عمرؓ اگر مر گئے تو میں فلاں شخص سے بیعت کر کے اس کو خلیفہ بناؤں گا، جناب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے بھی تو شروع میں ایک دو حضرات نے بیعت کی تھی اور خلیفہ ہو گئے تھے اور پھر سارے مہاجرین و انصار ان کے پیچھے ہو گئے! صحیح بخاری میں بھی یہ بات مذکور ہے۔ تو دراصل جناب فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا مذکورہ بالا کلام اس شخص کے جواب میں تھا۔ اور اس سے آپ یہ بتانا چاہتے تھے کہ ایک دو آدمیوں کی اچانک بیعت بغیر غور و فکر اور ارباب حل و عقد سے مشورہ کے درست اور صحیح نہیں۔ اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے معاملہ میں جو ہوا وہ اگرچہ اچانک اور بلا رائے و مشورہ ہوا تھا۔ مگر نتیجہ وہ متمکن و برقرار رہے اور لوگوں نے اسے قبول کر لیا گویا حق بحق دار رسید کا معاملہ ہوا اور کوئی ناحق بات نہیں ہوئی،

رہا آپؓ کے معاملہ میں دلائل کا سوال وہ تو پہلے سے موجود تھیں، مثلاً نماز کی امامت سپرد کرنا، اور دوسرے حالی مقالی قرائن جو ان معاملات میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ساتھ برتتے تھے۔ اور جن سے تمام صحابہؓ پر آپکی افضلیت ثابت ہوتی تھی، ان امور کی وجہ سے کسی دوسرے آدمی کو آپؓ پر قیاس نہیں کیا جا سکتا، اگر کوئی دوسرا ایسا کرے تو اسے قتل کر دینا چاہیئے! کہ اس نے معروف طریقہ انتخاب کو جو واجب ضروری ہے نظر انداز کیا اور مسلمانوں میں فتنہ و فساد کا سبب بنا۔

جناب فاروق رضی اللہ عنہ کے مذکورہ بالا کلام سے شیعوں نے دانستہ ایک جملہ نقل نہیں کیا کہ کہیں ان کے اعتراض کی کمزوری ظاہر نہ ہو جائے۔ آپؓ نے آخر میں وَاَیُّکُمْ مِثْلُ اَبِیْ بَکْرٍ۔ (تم میں سے کون ابوبکرؓ کا ہمسر ہے۔) کہ ان سے افضلیت و نیکی و بھلائی میں بڑھا ہوا ہو، اور وہ یہ سمجھتا ہو کہ اس کے حق میں بھی مشورہ، غور و فکر کی حاجت نہیں! پس معلوم ہوا کہ آپ کے الفاظ وَقَی اللّٰہُ شَرَّھَا، کے یہی معنی ہیں کہ سقیفہ بنی ساعدہ میں گو آپ کی خلافت میں عجلت کی گئی، مگر اللہ تعالیٰ نے اس عجلت کے ضرر سے مسلمانوں کو بچا لیا۔ اور یہ عجلت ہی رفع فساد کا سبب بن گئی۔ اور جو خطرہ درپیش تھا وہ وقوع میں نہ آسکا۔ یہ معلوم ہی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد نیابت کے سلسلہ میں انصار مدینہ رضوان اللہ علیہم چاہتے تھے کہ یہ منصب انصار کے پاس رہے۔ اس وقت اگر گفتگو بحث و تحیص، اور مشاورت کی راہ اختیار کی جاتی تو حالات بے قابو ہو جاتے،

یہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی بیدار مغزی، روشن ضمیری اور دانائی تھی کہ آپ نے فتنہ کے سد باب کے لئے وہ راہ اختیار کی کہ بعد میں موافق و مخالف سب نے اسے محسوس کیا، اسی کو راہ صواب مانا اور رضا و رغبت سے اس بیعت کو قبول کیا اور برقرار رکھا۔ کسی نے اسے ناحق نہیں کہا اور نہ کسی کے خیال و وہم میں یہ بات آئی کہ اس منصب پر کوئی نا اہل مقرر کر دیا گیا ہے۔

اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی اس قول بالا سے یہ مراد تو ہرگز نہ تھی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت صحیح نہ تھی کسی ناگزیر صورت سے بچنے کے لئے اس کو قبول کیا گیا) یا ان کی خلافت درست نہیں تھی۔ کیونکہ سب سے پہلے بیعت کرنے والے حضرت عمرؓ

اور جناب ابو عبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہما دونوں ہی تھے۔ دوسروں نے پھر اس کے بعد بیعت کی۔ بیعت کے وقت ان دونوں حضرات نے کہا تھا اَنْتَ خَیْرُنَا وَ اَفْضَلُنَا (آپ ہم میں سے بہترین اور افضل ترین ہیں)، اور کسی بھی مہاجر یا انصاری نے اس جملہ کو نہیں جھٹلایا بلکہ تسلیم کیا۔ اس کا صرف ایک ہی مطلب ہے کہ تمام صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم میں جناب صدیق رضی اللہ عنہ کی افضلیت، نیکی و بھلائی مسلم اور قطعی الثبوت تھی! اور انصار رضوان اللہ علیہم کا اختلاف بھی صرف اسی بات پر تھا کہ خلیفہ انصار میں سے بھی ہونا چاہیے۔ اس پر ان کو اعتراض تھا نہ خلاف کہ "ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ خلافت کے لائق نہیں"۔ چنانچہ اہل سنت کی صحیح روایات سے یہ ثابت ہے کہ جناب سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے اس مجلس کے بعد آپ سے بیعت کر لی تھی اور خود جناب علی مرتضیٰ، اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہما نے بھی نہ صرف بیعت فرمائی بلکہ ابتدا میں عدم بیعت کا عذر بھی بیان فرمایا اور شکایت بھی کی کہ ہم سے مشورہ کیوں نہ لیا گیا۔ اور جب جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے صورت حال کا تجزیہ کر کے بتایا کہ انصار کی پرخاش اور حالات کو دگرگوں ہونے سے بچانے کی خاطر یہ عجلت کی گئی تو ان دونوں حضرات نے اس کی تدبیر کی تحسین فرمائی اور اسے مان بھی لیا۔ اہل سنت کے تمام صحاح میں یہ قصہ بطور تواتر اسی طرح منقول و مشہور ہے اور اگر ان شیعوں کو جناب ابوبکر رضی اللہ عنہ کے متعلق حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا یہ قول دلیل کے طور پر بہت پسند ہے تو تقاضائے شرافت و انصاف ہے کہ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے وہ تمام اقوال جو جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی ذات یا خلافت کے بارے میں آپ نے فرمائے ہیں وہ بھی قبول کریں۔ انہیں سامنے رکھ کر موازنہ کریں کہ اس قول کو باقی اقوال سے کیا نسبت ہے! ایسی عجیب بات یہ اعجوبہ فرقہ ہی کہہ سکتا ہے کہ جناب فاروق رضی اللہ عنہ جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے معتقد نہ تھے اور اسے درست نہ سمجھتے تھے۔

اعتراض (۱۰) دسواں اعتراض یہ ہے کہ جناب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کہتے تھے کہ لَسْتُ بِخَیْرِکُمْ وَ عَلِیٌّ فِیْکُمْ۔ علی کی موجودگی میں میں تم میں کا اچھا نہیں ہوں اگر وہ اس قول میں سچے تھے تو قابل امامت نہ ہوئے کہ افضل کے ہوتے مفضول لائق امامت نہیں۔ اور اگر ان کا قول یہ جھوٹ تھا تو ویسے قابل امامت نہ رہے کہ جھوٹ فسق ہے اور فاسق امام ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔

جواب:— پہلی بات تو یہ کہ یہ روایت اہل سنت کی کسی کتاب میں بھی موجود نہیں۔ نہ بطریق صحیح نہ بطریق ضعیف۔ اب پہلے تو وہ اہل سنت کی کسی کتاب سے یہ روایت کھوج کھاج کے لائیں اور پھر جواب مانگیں۔ شیعوں کی من گھڑت غلط سلط روایات کا سہارا لے کر اہل سنت پر الزام لگانا نہ صرف انتہائی نادانی ہے بلکہ ایک قسم کا سفلہ پن بھی ہے۔

دوسری بات یہ کہ چلو شیعوں کی دلداری میں ہم اسے مان لیتے ہیں اور پھر کہتے ہیں کہ جناب سجاد رحمۃ اللہ نے اپنے صحیفہ کاملہ میں جو شیعوں کے نزدیک متعدد صحیح و معتبر طریقوں سے مروی ہے یوں فرماتے ہیں۔ اَنَا الَّذِیْ اَفْنَتِ الذُّنُوْبُ عُمُرَہٗ۔ میں وہ شخص ہوں جس کی تمام عمر گناہوں میں گذری۔ اب اگر آپ کا قول سچا ہے تو امامت کے قابل نہ رہے کیونکہ مرتکب گناہ فاسق امامت کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ اور اگر اس قول میں جھوٹے ہیں تو بھی امامت کے لائق نہ رہے کہ جھوٹ فسق ہے اور فاسق میں امامت کی صلاحیت نہیں۔ اب شیعہ حضرات اس کا جواب دیں اہل سنت کی طرف سے وہی جواب اپنے اعتراض کا سمجھ لیں۔ جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے متعلق روایت بالا میں بعض شیعہ علماء نے یہ الفاظ اضافہ کیے ہیں کہ آپ رضی اللہ عنہ نے اَقِیْلُوْنِیْ اَقِیْلُوْنِیْ بھی فرمایا جس کے معنے ہیں کہ اپنی بیعت مجھ سے واپس لے لو، گویا آپ خلافت سے استعفیٰ دے رہے ہیں اور جو امامت سے استعفیٰ دے وہ امامت کے قابل نہیں ہوگا۔

اور مزے کی بات یہ ہے کہ اس قول بالا کے ساتھ ساتھ شیعوں کا یہ اعتقاد بھی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی رسالت و نبوت سے استعفیٰ دیا اور یہ نبوت حضرت ہارون علیہ السلام کو سنبھلوا دی تھی۔ ایسی صورت میں اگر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا خلافت سے

استعفیٰ مان بھی لیا جائے تو وہ موسیٰ علیہ السلام کے استعفیٰ کی طرح ہوگا۔ بلکہ اس سے ہلکا ہی ہوگا کیونکہ نبوت و رسالت پر تو براہ راست اللہ تعالیٰ کے حکم سے فائز ہوئے تھے اس لئے اس سے استعفیٰ زیادہ قبیح اور بُرا ہے، اس کے مقابلہ میں خلافت سے استعفیٰ میں کیا برائی رہ جائے گی جبکہ خود شیعوں کے بقول یہ خلافت لوگوں نے مصلحت وقت کے تحت آپ کو دیدی تھی۔ اور یہ حق بھی نہ تھی۔ خدا نے تو ان کو مامور نہیں فرمایا تھا۔ اور جو ریاست لوگوں کی سپرد کردہ ہو اسکو قبول کرنا اور ہمیشہ ہمیش اس پر فائز رہنا ضروری بھی تو نہیں۔ اور جن مسائل یعنی انصار مدینہ کی پرخاش کا دفیعہ مرتدین کا قلع قمع اور مدینۃ النبی کو اعراب کی شورش سے بچانا۔ کی وجہ سے یہ خدمت امامت سپرد ہوئی تھی جب خاطر خواہ ان میں کامیابی ہو چکی اس وقت استعفیٰ میں قباحت کا کوئی سوال ہی نہیں رہتا۔

پھر ایک بات یہ بھی تھی کہ امامت وخلافت کی ذمہ داریوں کے بوجھ و مشقت کو بلحاظ دنیا و آخرت برداشت کر لینا کوئی ہنسی کھیل بھی نہیں جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے مصالح امت کے پیش نظر یہ گرانباری برداشت کر لی تھی۔ فتنوں کے فرو ہو جائے اور امن چین کے بعد اگر انہوں نے چاہا کہ اپنا بوجھ ہلکا کریں اور کسی دوسرے کے کاندھے پر یہ بوجھ ڈالیں اور خود آزادی کی زندگی بسر کریں۔ تو یہ موجب طعن کیوں ہو۔ شیعہ روایات کے مطابق تو صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی بے طمعی ظاہر ہوتی ہے کہ آپ کو خلافت و امامت کا کوئی لالچ نہیں تھا آپ تو اسے اپنے سر سے ٹالنا چاہتے تھے مگر لوگ ہی اس پر راضی نہ تھے۔ عام و خاص سب ہی اس منصب کو آپؓ سے متعلق رکھنے پر مصر تھے۔ یہ بات نہ ہوتی تو آپؓ کی زبان پر یہ الفاظ کیوں آتے ورنہ اقتدار و ریاست تو وہ چیز ہے کہ چھوٹوں بھی کسی کو مل جائے تو مرکر بھی اسے چھوڑنے کے لئے کوئی تیار نہیں ہو۔ اس کے لئے تو لوگ قریبی تعلق اور رشتوں تک کو قربان کر دیتے ہیں، بڑی سلطنت و ریاست کی بات رہی الگ ایک گاؤں کی جاگیر بھی ہو تو بھی کوئی اپنی مرضی سے اسے چھوڑ دینے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ چہ جائیکہ ایسی ریاست جو آپ کو حاصل تھی اور دنیا و آخرت کے اعزاز کی حامل تھی، اس کو چھوڑنے اور دوسروں کو دیدینے پر آمادہ ہونا تو آپ کی انتہائی بے طمعی اور زہد کا نتیجہ تھا۔

اور حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے متعلق تو خود شیعوں کی معتبر کتابوں اور صحیح روایات سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ شہادت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے بعد آپ خلافت کا منصب سنبھالنے پر تیار نہ تھے لوگوں کی انتہائی اصرار اور مہاجرین و انصار رضی اللہ عنہم کے بہت زور دینے پر آپؓ نے اسے قبول فرمایا۔ تو اگر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے بھی لوگوں کی محبت، جانچنے اور اپنی خدمات پر لوگوں کے تاثرات و پسندیدگی معلوم کرنے کے لئے ایسا کیا ہو تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے اور اس سے آپ کے منصب خلافت میں کونسا نقص و کھوٹ آگیا۔

اعتراض (۱۱) گیارہواں طعن یہ ہے کہ سورۃ برآت، جب نازل ہوئی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ مکہ جاؤ، اور حج کے اجتماع میں لوگوں کو یہ سورت سناؤ۔ پھر حضرت جبرئیل علیہ السلام آئے اور کہا کہ سورۃ برآت سنانے کی خدمت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے لے کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سپرد کیجئے کہ یہ جا کر سنائیں، چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پیچھے روانہ کیا اور فرمایا کہ ان سے برآت تم لے لو اور جا کر اہل مکہ کو سناؤ۔

پس جو شخص ایک حکم قرآنی کی آدائیگی کی قابلیت نہ رکھتا ہو اسکو تمام مخلوق کے حقوق کی آدائیگی یعنی پوری شریعت اور قرآن کی احکام رسانی پر کس طرح امین ٹھہرایا جاسکتا ہے اور اسکو امام مانا جاسکتا ہے“

جواب :۔ اس روایت میں عجیب خلط ملط، یا گڑبڑ ہے اس کی بڑی اچھی مثال یہ شعر ہے

چہ خوش گفتہ است سعدی در زلیخا۔ اَلَا یَا اَیُّهَا السَّاقِیْ اَدِرْ کَاْسًا وَّنَاوِلْهَا۔ (مطلب شعر یہ ہے کہ زلیخا نامی کتاب میں الا یہا الخ والا مضمون شیخ سعدی نے بہت خوب کہا ہے مگر نہ زلیخا سعدی کی کتاب ہے اور نہ دوسرا مصرعہ اس میں ہے یہ حافظ شیرازی کا

مصرعہ ہے جو دیوان حافظ میں ایک غزل کا مصرعہ اولی ہے ۔ ن) یا اس کی مثال اس فتوی کی طرح ہے جو مشہور ہے ۔ کہ خشتین معاویہ رضی اللہ عنہ کی بیتی لڑکیوں کا کیا حکم ہے ۔ اس اشارہ وکنایہ سے قطع نظر اس معاملہ کی تفصیل ملاحظہ ہو ! کہ اہل سنت کی روایات اس بارہ میں مختلف ہیں ۔ اکثر روایات اس مضمون کی ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی نیابت کے طور پر امیر حج مقرر فرما کر روانہ کیا تھا ۔ اسوقت سورہ برأت نازل نہیں ہوئی تھی ۔ آپ کی روانگی کے بعد یہ سورۃ نازل ہوئی ، جس میں مشرکین کے نقض عہد کا ذکر ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو یہ سورۃ دے کر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پیچھے پیچھے روانہ فرمایا کہ ان تازہ احکامات کو بھی لوگوں تک پہنچا دیں ، اب بھلا اس سے کہاں معلوم ہوا کہ جناب صدیق رضی اللہ عنہ کو معزول کیا گیا ۔ بلکہ یوں کہنا صحیح ہوگا کہ دو کاموں کے لیئے دو حضرات کو نامزد فرمایا ۔ ان روایات سے شیعوں کے تمسک کی گنجائش کہاں رہی کیونکہ تمسک کا دارومدار تو جناب صدیق رضی اللہ عنہ کے معزول ہونے پر ہے اور جب اس کام کے لیئے ان کا تقرر ہوا ہی نہیں تو عزل کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔ اور بیضاوی ، مدارک ، زاہدی ، تفسیر نیشاپوری ، جذب القلوب اور مشکوٰۃ کی شروح میں اسی روایت کو اختیار کیا ہے اور اہل حدیث کے نزدیک بھی یہی قابل ترجیح ہے ۔ اور تفسیر معالم ، تفسیر حسینی ، معارج ، روضۃ الاحباب حبیب السیر ، اور مدراج میں یوں مذکور ہے کہ

اول حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جناب ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اس سورت کی تبلیغ وتلاوت کا حکم فرمایا تھا پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اس کے لیئے نامزد فرمایا اس میں دو احتمال ہیں ، اول یہ کہ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کو معزول فرما کر ان کی جگہ جناب علی رضی اللہ عنہ کو مقرر فرمایا ! دوم ۔ یہ کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ان کا شریک کار بنایا کہ دونوں مل کر اسے انجام دیں ۔ چنانچہ روضۃ الاحباب بخاری ومسلم اور دوسرے تمام محدثین کی روایات اسی دوسری صورت کی روایات کو قوی بتاتی ہیں ۔ کیونکہ ان سب نے اتنی بات متفقہ طور پر روایت کی ہے کہ یوم النحر کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی متعین کردہ جماعت کے ساتھ جا کر ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کو یہ اعلان و منادی کا حکم دیا تھا کہ لَا یَحُجُّ بَعْدَ الْعَامِ مُشْرِكٌ وَلَا يَطُوفُ بِالْبَيْتِ عُرْيَانٌ ۔ اس سال کے بعد کوئی مشرک حج کے لئے نہیں آئے گا اور نہ کوئی ننگا ہو کر خانہ کعبہ کا طواف کریگا ۔ یہ روایت بتا رہی ہے کہ جناب صدیق رضی اللہ عنہ معزول نہیں ہوئے تھے ورنہ دوسرے کے فرائض میں مداخلت نہ کرتے اور نہ اعلان کنندہ کا تقرر کرتے ۔ لہٰذا اس شق میں عزل ثابت نہ ہوں گے سب شیعوں کو اس کا حوالہ دینے کا حق نہیں پہنچتا ۔ اب رہا احتمال اول کہ آپ کا فرمان لَا يُؤَدِّي عَنِّي إِلَّا رَجُلٌ مِنِّي ۔ (میرے ذمہ کی چیز کو وہی شخص ادا کریگا جو مجھ سے ہوگا) بظاہر اس احتمال کو تقویت دیتا ہے ۔ نیز نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کہ سورہ برأت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے لے کر تم پڑھو "

تو اس کے جواب میں ہم کہتے ہیں کہ جناب ابوبکر رضی اللہ عنہ کا معزول کرنا بے لیاقتی یا عدم قابلیت پر مبنی صحیح نہیں تھا ۔ اس لئے کہ بالاجماع یہ بات ثابت ہے کہ آپ امیر الحج بدستور تھے اس منصب سے آپ معزول نہیں ہوئے تھے ۔ تو آپ رضی اللہ عنہ میں جب حج کی سرداری کی لیاقت تھی جس میں ہزاروں مسلمانوں کی اصلاح مدنظر ہوتی ہے اور جس میں بہت سے احکام و فرائض کی ادائیگی سے سابقہ پڑتا ہے ، خطبات دیئے جاتے ہیں بے شمار مسائل لکھائے جاتے ہیں ، اور گوناگون ، نوع بنوع معاملات پیش آنے پر بر وقت فتوی صادر کرنے پڑتے ہیں جس کے لئے بہت ہی زیرکی اور سوجھ بوجھ اور وافر علم درکار ہوتا ہے ایسے اوصاف کے حامل میں چند آیات قرآنیہ کو باآواز بلند پڑھ کر سنانے کی قابلیت کیوں نہ ہوگی ایسی خدمت تو ہر قاری اور حافظ بآسانی انجام دے سکتا ہے جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے اسوقت کے خطبات اور اقامت فریضہ کا اسلوب جو آپ سے ظہور میں آیا صحیح نسائی اور حدیث کی دوسری کتابوں میں متعدد اسناد طرق سے منقول ہے ۔

اور اہل سیر کا اس پر اجماع ہے۔ کہ اس سفر میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی اقتدا فرمائی۔ نمازیں آپ کی امامت میں پڑھیں، اور ادائیگی مناسک حج میں آپ کی پیروی کرتے رہے۔

سیرت و احادیث کی کتابوں میں صحت کے ساتھ یہ بات بھی ثابت ہے۔ کہ جب حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ مدینۃ النبی سے بعجلت روانہ ہوئے اور منازل سفر تیز رفتاری سے قطع کرتے ہوئے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے جاملے، تو آپؓ رسول اللہ علیہ وسلم کی ناقہ کی آواز سن کر بے چین ہوئے اور یہ سمجھ کر کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بذات خود تشریف لے آئے ہوں گے لشکر کو ٹھہرالیا اور انتظار کرتے رہے۔ لیکن جب حضرت علی رضی اللہ عنہ پہنچے تو بعد ملاقات دریافت فرمایا اَنْتَ اَمِیْرٌ اَوْ مَامُوْرٌ۔ (آپ بطور امیر آئے ہیں یا بحیثیت مامور قدم رنجہ فرمایا ہے) آپؓ نے فرمایا بطور مامور آیا ہوں۔ پس آپ روانہ ہوئے، اور ترویہ سے ایک روز پہلے (۷ر ذی الحجہ) آپ نے خطبہ دیا۔ اور دین و شریعت کے مطابق مناسک حج کی لوگوں کو تعلیم دی۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ آیات کی قرأت کا کام ان سے کسی اور وجہ سے واپس لیا ہوگا۔ عدم لیاقت و قصور قابلیت اس کا سبب نہیں ہوسکتا، کیونکہ آسان کام سے معزول کرنا اور اہم و جلیل القدر امور کی انجام دہی کے لئے امارت کا باقی رکھنا ایسی بات ہے کہ معمولی سوجھ بوجھ والا بھی ایسا نہیں کرتا چہ جائیکہ ایسی ذات گرامی سے جو اعقل الناس تھی یہ وقوع پذیر ہوتی۔ یا حکم الٰہی بھی خلاف حکمت نازل ہوتا (معاذ اللہ)

اور وہ وجہ تھی! کہ عہد توڑنے یا معاہدہ کرنے، اور صلح و جنگ کی بنیاد رکھنے میں اہل عرب کی یہ عادت تھی کہ ان چیزوں پر سردار قوم یا اسی کا ہم رتبہ، بیٹا داماد وغیرہ کی عدم موجودگی میں عمل نہیں کرتے تھے۔ اور اسے نامعتبر جانتے۔ ان کے علاوہ کوئی بلند مرتبہ شخصیت بھی ہوتی تو اس کو کوئی اہمیت نہ دیتے، اور یہ طریقہ کسی نہ کسی صورت میں اب تک جاری ہے۔ کہ دو گروہوں میں باہم کوئی مناقشہ کھڑا ہوجائے، اور لڑائی جھگڑے اسے نمٹانا ہو تو حامی موالی، دوست احباب، نوکر چاکر سب ہی شامل ہوجاتے ہیں۔ اور اگر معاملہ صلح و صفائی اور عہد معاہدہ کا ہو تو وہ گروہ کے سردار کی ذاتی شرکت کے علاوہ نہ کوئی طے کرتا ہے اور نہ اس کا کوئی اعتبار و اعتماد ہوتا ہے۔ اور اگر غور کرکے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ منیٰ کی وسیع و عریض وادی میں جہاں لاکھوں کا اجتماع ہے، اور اور ہر شخص کے کانوں تک سورۃ برأت کے احکام پہنچانے ہیں کتنا سخت محنت اور جفا کشی کا کام تھا! اور یہ کام امیر حج سے کیسے انجام پا سکتا تھا۔ جبکہ ان کے ذمہ اعمال حج کی دیکھ بھال، لڑائی جھگڑے اور فتنہ و فساد سے لوگوں کو بچائے رکھنے، اور احرام کے ٹوٹ جانے اور دیگر جنایات حج کے وقوع پذیری کی روک تھام جیسے اہم امور بھی ہوں اور پھر وقت بھی محدود ہو اور اسی محدود وقت میں قرآنی احکامات لوگوں کے کانوں میں پڑ بھی جاتے ہوں تو لامحالہ دوسرے آدمی کا ہونا لازمی و لابدی ہے۔ اور چونکہ یہ کام بھی اپنی جگہ مہتم بالشان ہے تو وہ دوسرا آدمی عظیم المرتبہ ہی ہونا چاہیئے، لہٰذا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے لئے حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو اس کام کا امیر مقرر فرمایا۔ تاکہ دونوں مہمات بحسن و خوبی انجام پا جائیں۔ اور لوگوں کی نظروں میں یہ کام مقصود بالذات کی حیثیت رکھے۔ اگر برأت خوانی کا کام بھی جناب صدیق رضی اللہ عنہ کے منادوں سے لینے پر اکتفا کیا جاتا تو لوگوں کو خاص کر مشرک اعراب کو یہ گمان ہو سکتا تھا کہ عہد و پیمان کا مسئلہ پیغمبر علیہ السلام کے نزدیک زیادہ اہم اور ضروری نہ تھا کہ اس کے لئے آپ نے کوئی مستقل آدمی مقرر نہ فرمایا۔

یہاں باریک بین علماء اہل سنت نے ایک لطیف نکتہ بیان فرمایا ہے، کہ یہ موقعہ رحمت الٰہی، اور قہر الٰہی دونوں صفات کے ورود و ظہور کا تھا۔ حج کہ ورود رحمت الٰہی کا منبع و مورد تھا تو کفار کا نقض عہد قہر الٰہی کا مرجع،

اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ بفرمان نبی صلی اللہ علیہ وسلم اَرْحَمُ اُمَّتِیْ بِاُمَّتِیْ اَبُوْ بَکْرٍ۔ آپ امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں

www.Ahlehaq.com

سے امت پر سب سے زیادہ مہربان ہونے کے سبب مظہر صفت رحمت الٰہی تھے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ اسد اللہ ہونے کے باعث مظہر صفت قہر الٰہی تھے۔ اس لیے حج کی امارت جناب صدیق رضی اللہ عنہ کے حوالہ ہوئی، تو کفار کے نقض عہد کے انجام بد سے آگاہ کرنے کی ذمہ داری جناب علی رضی اللہ عنہ کے سپرد ہوئی تاکہ مجمع پر کہ جس میں مسلمان بھی تھے کفار بھی دونوں صفتوں جمال و جلال الٰہی کا فیضان ہو، مسلمان انوار جمال سے شرابور ہوں۔ تو کفار جلال الٰہی سے ہیبت زدہ، اور پھر بڑے کی بات یہ کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ جناب علی رضی اللہ عنہ کے بھی معاون و مددگار رہے جیسا کہ بخاری کی روایت بحوالہ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ میں ہے کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ نے ابو ہریرہؓ کو تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی متعین کردہ جماعت کے ساتھ کیا ہی تھا مگر خود بھی گاہ بگاہ عملا اس خدمت دین میں حصہ لیتے رہے۔ چنانچہ ترمذی و حاکم میں بحوالہ ابن عباسؓ ثابت ہے کہ

كَانَ عَلِيٌّ يُنَادِيْ فَإِذَا أَعْيٰى قَامَ أَبُوْ بَكْرٍ فَنَادٰى بِهَا حضرت علی رضی اللہ عنہ سورہ برأت کا اعلان فرماتے جب آپ تھک جاتے تو ابو بکر رضی اللہ عنہ کھڑے ہو کر اعلان کرنے لگتے۔ اور ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں۔ فَإِذَا بَحَّ قَامَ أَبُوْ هُرَيْرَةَ جب آپ بیٹھ تو ابو ہریرہؓ کھڑے ہو جاتے۔ حاصل کلام یہ کہ جناب ابو بکر رضی اللہ سے سورۃ برأت سنانے کی ذمہ داری لے لینے کی وجہ یہی ہو سکتی تھی کہ مسئلہ نقض عہد کو عرب کے قاعدہ کے مطابق ہی انجام دیا جائے تاکہ ان کے لیے یہ کہنے کی گنجائش نہ رہے کہ ہم کو ہمارے آئین و رسم کے بموجب نقض عہد سے آگاہی نہ ہوئی کہ ہم اپنی راہ اختیار کرتے اور اپنا خیال آپ کرتے۔ چنانچہ معالم زاہدی، بیضاوی، شرح تجرید، مواقف، صواعق، شرح مشکوٰۃ اور دوسری کتابوں میں یہی وجہ لکھی ہے۔

اسی لیے صلح حدیبیہ کے موقعہ پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کتابت کے لیے ایک ماہر انصاری کو معاہدہ لکھنے کیلئے طلب فرمایا تو سہیل بن عمرو نے جو مشرکین مکہ کا نمائندہ مصالحت تھا۔ بولا اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) ہم کسی اور کے لکھے ہوئے معاہدہ کو قبول نہیں کرتے، یہ معاہدہ تمہارے چچا زاد علی (رضی اللہ عنہ) کو لکھنا چاہیئے اس کا حوالہ مدارج و معارج اور سیرت کی دوسری کتابوں میں اسی طرح مذکور ہے۔

اس اعتراض کا ایک اور جواب یہ ہے کہ ہم مانے لیتے ہیں کہ جناب ابو بکر رضی اللہ عنہ کو سورہ برأت کی تبلیغ سے معزول فرما دیا۔ مگر ایسے صاحب عدالت کا معزول کرنا جس کی عدالت کی گواہی بیسیوں جگہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اور قرآنی آیات نے دی ہو، کسی خاص مصلحت ہی کی بنا پر ہو سکتا ہے۔ یہ عزل ریاست و امامت کی عدم صلاحیت کی بنا پر ہرگز نہ تھا خصوصاً جبکہ اسے نہ وہ خدمت انجام دینے کا موقعہ ملا ہو اور نہ اس سے کوئی قصور یا خیانت سرزد ہوئی ہو، اور اس کی دلیل حضرت علی رضی اللہ عنہ کا اپنا ایک فیصلہ ہے، کہ آپ نے عمرو بن سلمہ رضی اللہ عنہ کو بحرین کی ولایت سے معزول کر دیا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ربیب خاص تھے، اور جناب امیر رضی اللہ عنہ کے مخلص ساتھی اور حمایتی تھے ذاتی طور پر وہ بڑے عابد و زاہد، امین و عالم، فقیہ و متقی بھی تھے۔ اور جناب امیر رضی اللہ عنہ نے بطور عذر ایک تحریر بھی دی جو ان شیعوں کی اصح الکتب نہج البلاغہ اور دوسری صحیح کتب میں موجود بھی ہے۔ کہ

أَمَّا بَعْدُ فَإِنِّيْ قَدْ وَلَّيْتُ النُّعْمَانَ بْنَ عَجْلَانَ الدُّرَقِيَّ عَلَى الْبَحْرَيْنِ وَنَزَعْتُ يَدَكَ بِلَا ذَمٍّ لَكَ وَلَا تَثْرِيْبٍ عَلَيْكَ فَقَدْ أَحْسَنْتَ الْوِلَايَةَ وَأَدَّيْتَ الْأَمَانَةَ فَأَقْبِلْ غَيْرَ ظَنِيْنٍ وَلَا مَلُوْمٍ وَلَا مُتَّهَمٍ وَلَا مَأْثُوْمٍ۔

حمد و صلوٰۃ کے بعد واضح ہو کہ میں نے نعمان بن عجلان درقی کو بحرین کا والی بنا دیا ہے اور تم سے یہ عہدہ لیا ہے لیکن (اس کا سبب) نہ تمہاری کوئی برائی ہے اور نہ تم پر کوئی الزام ہے تم نے حکومت بڑی اچھی طرح اور امانت داری سے چلائی پس تم آجاؤ نہ تم پر کوئی بدگمانی ہے نہ ملامت نہ تم ملزم ہو اور نہ مجرم ہو

اور یہ بات یقینی طور پر ثابت ہے کہ عمرو بن سلمہ باعتبار دین و حسب و نسب نعمان بن عجلان زرقی سے افضل تھے، کاروبار حکومت بھی انہوں نے بڑے اچھے طریقے اور نہایت دیانت کے ساتھ انجام دیا تھا۔ نہ ان کی کوئی غلطی تھی نہ قصور، نہ عدم قابلیت، ظاہر ہے کہ ان کا عزل میں سے جب کوئی بات نہیں تھی اور جملہ عیوب و قصور و نقص سے وہ بری تھے تو کوئی خاص مصلحت ہی موجب عزل ہوگی، ادھر اگر جناب ابوبکر رضی اللہ عنہ ایک قرآنی حکم کی ادائیگی کی صلاحیت بھی نہیں رکھتے تھے تو ایسی صورت میں ان کو امیر حج بنایا کیا معنے رکھتا ہے جبکہ بلحاظ عہدہ و مرتبہ یہ اہم اور عظیم تر منصب ہے۔ اور پھر ایسا کام پیغمبر معصوم صلے اللہ علیہ وسلم سے سرزد ہو۔ ناقابل تسلیم ہے۔ اگر آپ کا عزل واقع بھی ہوا ہے تو اس کی وجہ کوئی مصلحت خاص ہی ہو سکتی ہے، قابلیت و لیاقت کا قصور ہرگز ہرگز نہیں۔

اعتراض (۱۲) بارہواں اعتراض یہ ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت بی بی فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ترکہ میں سے ورثہ نہیں دیا۔ اس پر بی بی بتول الزہرا رضی اللہ عنہا نے ان سے کہا کہ اے ابوقحافہ کے بیٹے تم تو اپنے باپ سے ورثہ پاؤ، اور میں اپنے بابا جان کا ورثہ نہ پاؤں یہ کہاں کا انصاف ہے۔ اور آپ کو محروم کرنے کے لئے صرف ایک شخص کی (یعنی اپنی) روایت کو دلیل کے طور پر پیش کیا کہ میں نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ آپ فرماتے تھے کہ "ہم انبیاء نہ کسی سے میراث لیتے ہیں اور نہ کوئی ہم سے میراث پاتا ہے" حالانکہ یہ حدیث نص قرآنی یُوصِیکُمُ اللّٰہُ فِیٓ اَوۡلَادِکُمۡ لِلذَّکَرِ مِثۡلُ حَظِّ الۡاُنۡثَیَیۡنِ. (اللہ تعالیٰ تمکو تمہاری اولاد کے بارے میں وصیت کرتا ہے کہ مرد کا حصہ عورت سے دوگنا ہے) کے خلاف ہے اس لیے کہ حکم قرآنی عام ہے کہ نبی و غیر نبی دونوں کو شامل ہے۔ اسی طرح دوسری نص یعنی کہ وَوَرِثَ سُلَیۡمٰنُ دَاوٗدَ (یعنی سلیمان داؤد کے وارث ہوئے) بھی اس کے خلاف ہے۔ یا ایک اور آیت وَهَبۡ لِیۡ مِنۡ لَّدُنۡکَ وَلِیًّا یَّرِثُنِیۡ وَیَرِثُ مِنۡ اٰلِ یَعۡقُوۡبَ۔ (اپنی عنایت سے مجھے ایک ولی (بیٹا) بخشئے جو میرا بھی وارث بنے اور آل یعقوب کا بھی) ان سب سے معلوم ہو کہ انبیاء خود بھی وارث ہوتے ہیں اور ان کے وارث بھی ان سے میراث پاتے ہیں،،

جواب:۔ اس اعتراض کے دو رخ ہیں ایک ظاہر ایک پوشیدہ، ظاہر تو یہ کہ صرف اپنی روایت پر انحصار کرکے ان کو محروم کر دیا۔ اور پوشیدہ یہ کہ آپ نے بغض و عداوت کی وجہ سے خاتون جنت رضی اللہ عنہا کو ترکہ نہیں دیا یہ بات اعتراض میں کھلے الفاظ میں گو نہیں کہی گئی مگر اعتراض کی اصل بنیاد ان کے نزدیک یہی ہے تو جواب یہ ہے) یہ بات صحیح نہیں کہ آپ نے محض اپنی سنی ہوئی بات کو حجت بنا کر آپ کو میراث نہیں دی۔ یا آپ ان سے بغض و عداوت رکھتے تھے اس لئے ایسا کیا۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ترکہ تقسیم ہوتا تو ازواج مطہرات کو بھی حصہ ملتا جس میں خود آپ کی لخت جگر عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور اپنے رفیق و دوست حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا بھی شامل تھیں، تو آپ کو دیگر امہات المومنین رضی اللہ عنہن، یا اپنی اور اپنے دوست کی بیٹیوں، یا ان کے باپ بھائیوں سے عداوت تھی کہ ان کو بھی محروم رکھا۔ اور پھر نصف ترکہ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے حصہ میں آتا تھا۔ اور وہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت کی ابتداء ہی سے آپ کے رفیق و مشیر تھے۔ ان سے کیا عداوت تھی کہ ان کو بھی ترکہ نہ دیا۔ تو معلوم ہوا کہ بغض و عداوت کا الزام غلط، لغو اور ان کا من گھڑت ہے! اب رہ گئی یہ بات کہ صرف اپنی روایت کی بنیاد پر حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا کو ورثہ نہیں دیا ہے۔ بالکل جھوٹ اور صریح دروغگوئی ہے۔ اس لیے کہ اہل سنت کی کتابوں میں اس روایت کے راویوں میں ان حضرات کے اسمائے گرامی موجود ہیں! جناب حذیفہ بن الیمان۔ جناب زبیر بن العوام، جناب ابوہریرہ جناب عباس، جناب علی مرتضیٰ، جناب عثمان غنی، جناب عبدالرحمٰن بن عوف، اور جناب سعد بن وقاص رضی اللہ عنہم

www.Alhaqforum.com

اجمعین۔ ان حضرات کی جلالت قدر اور عظیم المرتبی سے کون واقف نہیں، پھر ان میں سے بعض وہ بھی ہیں جنکا شمار عشرہ مبشرہ میں ہوتا ہے، انہیں حین حیات ہی جنتی ہونے کی بشارت مل چکی تھی! اور حذیفہ رضی اللہ عنہ کے متعلق تو خود ان کے ملا عبد اللہ مشہدی نے اپنی کتاب اظہار الحق میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث ان الفاظ میں نقل کی ہے کہ مَا حَدَّثَكُمْ بِهِ حُذَيْفَةُ فَصَدِّقُوْهُ۔ (حذیفہ تم سے جو حدیث بیان کرے اس کی تصدیق کرو۔ یعنی سچ سمجھو) اور ایک راوی ان میں حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ بھی ہیں، جو شیعہ اور سنی دونوں کے بالاجماع عقیدہ کے مطابق صادق ہیں! اگر عائشہ صدیقہ، حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہم کی روایات اس معاملہ میں ان کے نزدیک معتبر نہیں۔ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت کو یہ کیا کہیں گے؟

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے مالک بن اوس بن حدثان النضری سے یوں روایت کی ہے

اَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ قَالَ بِمَحْضَرٍ مِّنَ الصَّحَابَةِ فِيْهِمْ عَلِيٌّ وَالْعَبَّاسُ وَعُثْمَانُ وَعَبْدُ الرَّحْمٰنِ بْنُ عَوْفٍ وَالزُّبَيْرُ بْنُ الْعَوَّامِ وَسَعْدُ بْنُ وَقَّاصٍ اُنْشِدُكُمْ بِالَّذِيْ بِاِذْنِهٖ تَقُوْمُ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ اَتَعْلَمُوْنَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا نُوْرَثُ مَا تَرَكْنَاهُ صَدَقَةٌ قَالُوْا اَللّٰهُمَّ نَعَمْ ثُمَّ اَقْبَلَ عَلٰى عَلِيٍّ وَالْعَبَّاسِ فَقَالَ اُنْشِدُكُمَا بِاللّٰهِ هَلْ تَعْلَمَانِ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَدْ قَالَ ذٰلِكَ قَالَا اَللّٰهُمَّ نَعَمْ۔

جناب عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے صحابہ کے ایک مجمع کو مخاطب کرکے جس میں حضرت علی، عباس، عثمان غنی، عبد الرحمٰن بن عوف، زبیر بن عوام، اور سعد بن وقاص موجود تھے، کہا کہ میں تم کو اس خدا کی قسم دے کر پوچھتا ہوں جس کے حکم سے زمین و آسمان برقرار ہیں۔ کیا تم جانتے ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہم میراث نہیں چھوڑتے ہم جو کچھ چھوڑتے ہیں وہ صدقہ ہے۔ سب نے فرمایا، بخدا ہاں! پھر آپ نے خصوصیت سے حضرت علیؓ و عباسؓ کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا میں تم کو اللہ کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کیا تم جانتے ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا فرمایا، دونوں حضرات نے جواباً فرمایا بخدا بے شک ایسا فرمایا۔"

پس معلوم ہوا کہ ان کی حدیث باعتبار قطعیت آیت قرآنی کے برابر ہے، کیونکہ مذکورۃ الذکر اصحاب بالا کی فرداً فرداً روایت موجب یقین ہے چہ جائیکہ اس پوری جماعت کی متفقہ حدیث خصوصاً حضرت علی رضی اللہ عنہ جو کہ شیعوں کے نزدیک معصوم ہیں۔ اور ان کے نزدیک معصوم کی حدیث یقین کرنے میں قرآن کے برابر ہے۔ اور اس سے بھی قطع نظر خود شیعوں کی کتابوں میں ان کے تسلیم کردہ امام معصوم سے اسی قسم کی روایت موجود ہے۔ چنانچہ محمد بن یعقوب رازی نے کافی میں ابی البختری کے حوالہ سے جناب صادق رحمۃ اللہ علیہ کی یہ روایت نقل کی ہے کہ آپ نے فرمایا۔

اِنَّ الْعُلَمَاءَ وَرَثَةُ الْاَنْبِيَآءِ وَذَالِكَ اَنَّ الْاَنْبِيَاءَ لَمْ يُوَرِّثُوْا وَفِيْ نُسْخَةٍ لَمْ يَرِثُوْا دِرْهَمًا وَّلَا دِيْنَارًا وَاِنَّمَا اَوْرَثُوْا اَحَادِيْثَ مِنْ اَحَادِيْثِهِمْ فَمَنْ اَخَذَ بِشَيْءٍ مِّنْهَا فَقَدْ اَخَذَ بِحَظٍّ وَّافِرٍ۔

بے شک علماء انبیاء کے وارث ہیں کیونکہ پیغمبروں کی کوئی میراث نہیں۔ اور ایک نسخہ میں ہے کہ وہ میراث میں درہم و دینار نہیں چھوڑتے ان کی میراث تو ان کے فرامین و اقوال ہیں جس نے ان میں سے اگر کچھ لے لیا تو گویا بہت بڑا حصہ پالیا۔

اور کلمہ اِنَّمَا کے متعلق شیعہ یہ اعتراف کرتے ہیں کہ وہ قطعاً حصر کے لئے ہوتا ہے جیسا اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ کی بحث میں بیان ہو چکا۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ علم و احادیث کے سوا میراث میں کوئی اور چیز قطعاً نہیں چھوڑی۔ تو انہیں کے امام معصوم کے حوالہ سے ہی مدعا ثابت ہو گیا اور جواب ہی کے سلسلہ کی ایک بات یہ بھی ہے کہ جس شخص نے براہ راست بلا واسطہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے جو حدیث سنی وہ اس کے لئے علم یقینی کی موجب ہے اور اس کے لئے اپنے سنے ہوئے پر عمل کرنا لازم و ضروری ہے خواہ وہ حدیث کسی اور سے بھی سنے یا نہ

سنے۔ چنانچہ سنی و شیعہ اصولی ہر دو کا اس پر اجماع ہے کہ حدیث کی تقسیم متواتر و غیر متواتر اس شخص کے لئے ہے جس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ دیکھا ہو اور آپ کی احادیث دوسروں کے واسطے سے سنی ہوں۔ اور جس نے آپؐ کی زیارت کی آپ کی زبان مبارک سے حادیث سنی اس کے لئے یہ تقسیم متواتر و غیر متواتر نہیں ہے اس کے لئے تو وہ فرمان متواتر سے بھی بہت اونچا ہے۔ تو اس معاملہ میں جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ زبان نبوت سے براہ راست سن چکے تو اب تفتیش و تحقیق کی انہیں ضرورت ہی کیا رہی!

اب رہا یہ سوال کہ یہ حدیث آیت کے خلاف ہے۔ تو یہ بھی غلط اور خبط ہے، اور معترض کی ناسمجھی کی دلیل۔ کیونکہ کمؐ میں مخاطب امت ہے، پیغمبر نہیں۔ لہٰذا یہ حدیث تعین خطاب واضح کرنے والی ہوگی آیت کی مخصص نہیں! اور اگر مخصص بھی مانیں تو آیت کی تخصیص تو لازم آئیگی مگر مخالفت نہیں۔ پھر اس آیت سے پہلے ہی بہت سی چیزوں کی تخصیص ہو چکی مثلاً کافر اولاد وارث نہیں۔ رقیق وارث نہیں۔ اور قاتل وارث نہیں۔ اور یہ خود شیعہ بھی اپنے آئمہ سے ایسی روایت بیان کرتے ہیں جس سے بعض وارثوں کو باپ کے ترکہ کی بعض چیزوں سے محروم کر کے ان کو خود دے لیتے ہیں۔ مثلاً تلوار، مصحف، انگوٹھی، بدن کا لباس، کہ بڑا بیٹا ان کو بغیر تقسیم خود لے لیتا ہے۔ دوسرے وارثوں کا جو حصہ ان اشیاء میں بنتا ہے اس سے ان کو محروم کر دیتا ہے!

حالانکہ وہ اس روایت میں تنہا ہیں، اور اہل سنت کے نزدیک ان کی عصمت بھی ثابت نہیں۔ اور جناب امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ سے لے کر سلسلہ کے آخری امام تک تمام اہل بیت کے نزدیک یہ حدیث صحیح ہے اور ان کا عمل اس کی صحت پر مہر ہے! دلیل یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ترکہ جب ان حضرات کے ہاتھ میں آیا تو کسی بھی وارث کو اس کا حصہ نہیں دیا۔ حضرت عباسؓ اور ان کی اولاد محروم رہی! ازواج مطہرات بھی اپنا حصہ نہ پا سکیں۔ پس اگر پیغمبری ترکہ میں تقسیم میراث جاری ہوتی تو یہ محترم و گرامی قدر حضرات جو شیعوں کے نزدیک معصوم بھی ہیں، ایسی کھلم کھلا حق تلفی کیسے روا رکھتے! کیونکہ علماء حدیث، اور اہل سیر و تاریخ کے اجماع سے یہ بات ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا متروکہ مثلاً خیبر و فدک یا اور، عہد فاروق اعظم رضی اللہ عنہ میں حضرت عباس و حضرت علی رضی اللہ عنہما کے دست تصرف میں رہے۔ پھر جناب عباس سے حضرت علیؓ کے قبضہ میں آئے۔ پھر جناب حسنؓ بن علیؓ کے پاس پھر جناب حسینؓ بن علیؓ کے پاس، پھر علیؒ بن حسین اور حسن بن حسن کے پاس اور دونوں اس پر متصرف رہے! پھر زیدؒ بن علی برادر حسن بن حسن کے پاس۔

پھر مروان کے امیر ہونے کے بعد اس کے قبضہ میں آئے، اور مروانیوں کے ہاتھوں منتقل ہوتے ہوتے، حضرت عمر بن عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ کے قبضہ میں پہنچے، آپ غایت درجہ منصف مزاج تھے آپ نے صاف کہدیا کہ جس ترکہ کو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی پیاری لخت جگر جناب سیدہ فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا کو نہیں دیا میں اس کا مالک کس طرح ہو سکتا ہوں۔ میرا اس میں کوئی حق نہیں۔ پس آپ نے یہ ترکہ اولاد فاطمہ رضی اللہ عنہا کی طرف منتقل فرما دیا! پس "ائمہ معصومین" اور اہل بیت کرام کے عمل سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ ترکہ نبی صلی اللہ علیہ میں میراث کی کوئی گنجائش نہیں۔ اور آیت میراث نے حدیث مذکور سے تخصیص پائی۔

اب ہم آیت وَوَرِثَ سُلَيْمٰنُ کی بحث کی طرف آتے ہیں، کہ بقول شیعہ یہ آیت اسبات پر دلالت کرتی ہے کہ انبیاء خود بھی وارث ہوں۔ اور ان کی میراث تقسیم بھی ہو، مگر یہ مضمون اس حدیث قطعی کے خلاف ہے جو "آئمہ معصومین" سے ثابت ہے۔

اس مشکل گتھی کو حل کرنے کے لئے بھی ہم "قول معصوم" کی طرف رجوع ہوتے اور کتب شیعہ سے اس کا سراغ و جواب تلاش کرتے ہیں کلینی نے جناب ابی عبد اللہ رحمۃ اللہ علیہ سے ایک روایت بایں الفاظ نقل کی ہے۔ اِنَّ سُلَيْمٰنَ وَرِثَ دَاوٗدَ وَاِنَّ مُحَمَّدًا وَّرِثَ سُلَيْمٰنَ۔ سلیمان (علیہ السلام) داؤد (علیہ السلام) کے وارث ہوئے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم سلیمانؑ کے وارث ہوئے۔

www.Ahlehaq.com

گویا معلوم ہوا کہ یہ وراثت کمالات نفسانی اور علم و نبوت کی وراثت ہے مال و اسباب متروکہ کی وراثت نہیں ہے۔ قرینہ عقلیہ بھی قول معصوم کی تائید کرتے ہوئے اسی وراثت کا پتہ دیتا ہے۔ کیونکہ باتفاق مورخین حضرت داؤد علیہ السلام کے انیس ۱۹ لڑکے تھے۔ قاعدہ میں تو سارے ہی آپ کے وارث ہوتے، حالانکہ آیت میں اللہ تعالیٰ نے خصوصیت و امتیاز کے ساتھ حضرت سلیمان علیہ السلام کے حق میں حکم فرمایا، تو پتہ چلا کہ وراثت جس سے حضرت سلیمان علیہ السلام کو امتیاز حاصل تھا اور دوسرے بھائی اس سے محروم تھے وہ وراثت علم نبوت کی تھی۔ یہ دوسرے بھائیوں کو کہاں نصیب تھی!

پھر ایک بات یہ کہ سب ہی کو معلوم تھا کہ ہر لڑکا اپنے باپ کی میراث پاتا ہے اور اس کے مال کا مالک بنتا ہے تو اس کی خبر دینا تو لغو ہے اور کلام الٰہی لغو پر مشتمل نہیں ہو سکتا وہ اس سے پاک ہے۔ اور پھر حضرت سلیمان علیہ السلام کے لئے ایسی عام بات بیان کرنا جو تمام عالم میں مشترک ہے ان کے لئے باعث اعزاز کب ہو سکتی ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ اس کو ان کے فضائل و مناقب کے طور پر بیان فرمائے۔ اور اسی آیت کا اگلا حصہ خود بتا رہا ہے کہ اس وراثت سے مراد وراثت علم ہے۔ وَقَالَ يَا أَيُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنطِقَ الطَّيْرِ۔ لوگو سنو! ہمکو پرندوں کی بولی سکھائی گئی ہے! اگر کوئی یہ اعتراض کرے کہ علم کے لئے وراثت کا لفظ استعمال کرنا مجاز ہے اور مال کے لئے اصل و حقیقت تو بلا ضرورت ہم حقیقی معنی کو چھوڑ کر مجازی معنی کیوں مراد لیں۔

تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس ضرورت سے کہ "معصوم" کا قول جھوٹا نہ پڑے، اس کے علاوہ ہم اسے بھی تسلیم نہیں کرتے کہ وراثت مال کے حق میں حقیقت ہے، یہ تو فقہا کے ہاں کثرت استعمال کی وجہ سے اس معنے کے لئے مخصوص ہو گئی جیسے منقولات عرفیہ! ورنہ درحقیقت وراثت کا اطلاق علم و منصب پر بھی صحیح ہے اور مجاز بھی مان لیں تو یہ مجاز اتنا متعارف اور مشہور ہے خصوصاً قرآنی استعمال میں کہ وہ حقیقت کی حد تک پہنچ گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

ثُمَّ أَوْرَثْنَا الْكِتَابَ الَّذِينَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا۔ — جن کو ہم نے اپنے بندوں میں سے چنا تھا ان کو کتاب کا وارث بنایا!

فَخَلَفَ مِن بَعْدِهِمْ خَلْفٌ وَرِثُوا الْكِتَابَ۔ — پس ان کے بعد والے ان کے جانشین ہوئے جو کتاب کے وارث بنے!

اب آیئے آیت يَرِثُنِي وَيَرِثُ مِنْ آلِ يَعْقُوبَ، کی طرف تو بداہت عقلیہ بتاتی ہے کہ یہاں وراثت سے قطعی طور پر وراثت منصب مراد ہے۔ کیونکہ لفظ آل سے مجازاً خود حضرت یعقوب علیہ السلام کی ذات مراد ہو تو یہ لازم آتا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کا متروکہ مال و اسباب ان کے زمانہ سے لے کر حضرت ذکریا علیہ السلام کے زمانہ تک جو تقریباً دو ہزار سال کا عرصہ ہے بغیر تقسیم شدہ باقی و برقرار ہو، اور اب حضرت ذکریا علیہ السلام کی وفات پر حضرت یحییٰ علیہ السلام کا حصہ ان کو پہنچے۔ اور یہ بڑا مغالطہ ہے۔ اس لئے کہ اگر وہ مال حضرت ذکریا علیہ السلام کی وفات سے پہلے تقسیم شدہ ہو تو وہ مال تو حضرت زکریا علیہ السلام کا ہوا اور یرثنی میں داخل ہوا، اب آل یعقوب کا مال کہاں گیا جس کے یحییٰ علیہ السلام وارث ہوں گے! اور اگر آل یعقوب سے مراد اولاد یعقوب ہو تو پھر یہ لازم آتا ہے کہ تمام بنی اسرائیل خواہ زندہ ہوں یا مر چکے ہوں، سب کے وارث حضرت زکریا علیہ السلام ہوں۔ یہ مغالطہ پہلے سے بھی زیادہ سخت ہے۔ لہٰذا اس آیت کا حوالہ اس جگہ لانا اسی فرقہ کی جولانی طبع، یا حماقت کی نشانی ہے۔ پھر یہ بات بھی قابل غور ہے کہ حضرت زکریا علیہ السلام نے اپنے سوال میں دو لفظ فرمائے ہیں۔ وَلِيًّا يَرِثُنِي۔ گویا اللہ تعالیٰ سے ایسا ولی طلب فرمایا جو صفت وراثت سے متصف ہو (یعنی اس میں وارث بننے کی قابلیت و صلاحیت بھی ہو) لہٰذا اگر یہاں خاص علمی وراثت مراد نہ ہوگی تو یہ صفت محض لغو و بے کار ثابت ہوگی۔ اور اس کے ذکر کا کوئی فائدہ مرتب نہ ہوگا۔ کیونکہ بیٹا تمام شریعتوں میں باپ کا وارث ہوتا ہی ہے۔ اور لفظ ولی سے وارث مال بلا تکلف سمجھی جاتی ہے۔ ایک اور بات یہ بھی ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام کے نفوس قدسیہ کی تمام تر توجہات

www.AhleHaq.com

اور مساعی اللہ تعالیٰ کی طرف مبذول اور منعطف ہوتی ہیں، اس عالم فانی سے ان کے دل کا رشتہ کٹا ہوا ہوتا ہے اسی لیے متاع دنیا کی طرف نام کو بھی راغب نہیں ہوتے۔ خاص طور پر حضرت زکریا علیہ السلام کہ دنیا و متاع دنیا سے ان کی بے تعلقی اور بے اعتنائی تو مشہور و معروف ہے! ان کے لیے عادتاً یہ محال تھا کہ وہ مال و متاع کی وراثت سے جسکی قدر ان کے نزدیک ذرہ خاک کے برابر بھی نہیں تھی، خائف ہوں۔ اور اس کے صدمہ، ملال و اندوہ کا اظہار اللہ تعالیٰ کی جانب میں کریں۔ (کہ اے اللہ مجھے ایسا بیٹا دے جو میرے مال کا وارث بنے ورنہ یہ مال بے وارث رہ گیا تو غیر مستحقوں کے ہتھے چڑھ جائے گا۔ وغیرہ وغیرہ ن) کیونکہ یہ عمل تو مال کی محبت اور اس سے انتہائی دلی شغف کا پتہ دیتا ہے! (جس کا حضرت زکریا علیہ السلام کے متعلق کوئی بھول کر بھی تصور نہیں کر سکتا ن) اور پھر یہ بھی ہے کہ حضرت زکریا علیہ السلام کو یہ ڈر اور خطرہ تھا کہ کہیں چچازاد بھائی مال و دولت کو بے جا خرچ نہ کر ڈالیں یا واہیات اور فضول میں ضائع نہ کر ڈالیں تو اس ڈر اور خطرہ کا یہ موقع و مقام ہی نہیں کیونکہ جب آدمی کی آنکھ بند ہوئی مال وارثوں کا ہوا۔ اب وہ اس مال کے مالک ہیں جا خرچ کریں یا بیجا۔ ساری ذمہ داری ان کے سر ہے۔ مرنے والے سے اس سے کوئی باز پرس نہیں ہوگی نہ اسے کوئی سزا ملیگی، دوسرے اگر ان کے دل میں ڈر تھا تو جناب الٰہی میں اس کا عرض کرنا کیا ضروری تھا، اس کا مداوا اور دفعیہ تو خود ان کے ہاتھ میں تھا۔ کہ وفات سے پہلے بہت مال و دولت راہ خدا میں لٹا جائے۔ (اور صدقہ و خیرات کر دیتے) اور بدکار وارثوں کو محروم کر جاتے۔ اور انبیا علیہم کو موت سے آگاہی دی جاتی ہے اور اختیار بھی ملتا ہے تو گویا اچانک موت کا خطرہ بھی نہ تھا۔ لہٰذا معلوم ہوا یہاں وراثت سے حضرت زکریا علیہ السلام کی مراد مال کی وراثت تھی ہی نہیں یہاں تو وہ منصب کی میراث کے لئے وراثت ملنے کی التجا کر رہے ہیں۔ اور اس خطرہ کے پیش نظر کر رہے ہیں کہ کہیں میرے بعد بنی اسرائیل کے شریر بدقماش لوگوں کو (وارث نہ ہونے کی وجہ سے) ایسا موقعہ اور غلبہ حاصل نہ ہو جائے کہ وہ احکام الٰہی کی تحریف کر ڈالیں ربانی شریعت میں ترمیم و تنسیخ کرنے لگیں اور میرے علم کی حفاظت نہ کر کے اس پر عمل پیرا نہ ہوں۔ اور یوں دنیا میں عظیم فتنہ و فساد کا دروازہ کھولدیں۔ اس لیے بیٹے کی دعا کی، کہ وہ میرا وارث بن کر میرے علوم نبوت کی پیروی و اشاعت کا سبب ہوگا احکام الٰہی اس کے ذریعہ فروغ پائیں گے، خاندان میں یہ سلسلہ ایک نسل کم از کم اور باقی رہے گا۔ اور یوں انعامات و احسانات الٰہیہ سے مزید بہرہ یاب ہونے کی سعادت حاصل رہے گی! اجر بھی بڑھے گا۔ اور خاندان میں نبوت کی مدت بھی کچھ طویل ہوگی۔ جو یقیناً ایک اعزاز ہے۔ "(معترض اپنی سوچ اور جذبات پر نبی کی سوچ بوجھ کو قیاس کر کے اعتراض کرتا اور اپنی عاقبت تباہ کرتا ہے مال دولت، جاہ و اقتدار کسی دنیادار کا مطمع نظر تو ہو سکتے ہیں لیکن نبی کے نزدیک پرکاہ کے برابر بھی ان کی قدر و منزلت نہیں ہوتی۔ نہ وہ مال و دولت کے جھگڑوں میں الجھتا ہے۔ نہ ان کا طالب ہوتا ہے۔ نہ اسکو باقی رکھنے یا بڑھانے کی خاطر کسی کو جانشین بناتا ہے۔ اور نہ اس ذلیل و گھٹیا کام کے لیے اللہ سے کوئی وارث طلب کرتا ہے۔ ت)

بعض سمجھ بوجھ سے عاری "علماء" یہ بحث بھی اس موقعہ پر چھیڑ دیتے ہیں کہ اگر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی کو میراث نہ ملتی تھی تو امہات المومنین رضی اللہ عنہن کو میراث میں مکان کیوں دے دیئے۔ مگر وہ اتنا بھی نہیں جانتے محترمات کو یہ مکان میراث میں نہیں ملے یہ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی میں نام بنام بنوا کر ان کو مرحمت فرمائے تھے ان کی حیثیت تو ہبہ بالقبض کی تھی۔ اور یہ آپؐ کی زندگی میں ان مکانات پر حق ملکیت کے طور پر قابض تھیں۔ آپؐ کی وفات کے بعد کسی نے ان کو میراث کے حصہ کے طور پر نہیں دیا تھا، انہیں محترمات رضی اللہ عنہن کی طرح جناب سیدہ بتول الزہراء کا بھی ایک مکان تھا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بنوا کر دیا تھا۔ ان ہی کی طرح حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کو بھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک گھر بنوا کر دیا تھا۔ اور ان گھروں کے یہ سب حضرات نبی

کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عین وحیات مالک متصرف تھے۔

اس دعوے کی دلیل یہ ہے۔ اور اس پر سنی و شیعہ دونوں کا اجماع ہے کہ جناب حسن رضی اللہ عنہ کی وفات کا وقت قریب آیا تو آپ نے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے اجازت طلب کی کہ مجھے نانا جان صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب دفن ہونے کی اجازت دے دیں۔ تو اگر وہ حجرہ جناب صدیقہ رضی اللہ عنہا کی ملکیت نہ ہوتا تو اجازت کی کیا ضرورت تھی۔ اس کے علاوہ آیت قرآنی سے بھی ازواج مطہرات کی اپنے مکانوں کی ملکیت و قبضہ کا اشارہ بھی ملتا ہے۔ وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ۔ (اپنے گھروں میں ٹھہری رہو) اگر وہ گھر ان کے لیئے نہ ہوتے تو خطاب یوں ہوتا وَقَرْنَ فِي بيت الرَّسُولِ۔ (رسول کے گھر میں ٹھہری رہو)

(دراصل بغض و عناد ایسی بیماری ہے کہ وہ آدمی کے سوچنے سمجھنے اور غور و فکر پر مہر لگا دیتی ہے۔ اس معاملہ یہ اتنا بھی نہ سوچ سکے کہ جس ذات رفیع و اعلیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ملک میں کبھی ایک درہم رکھنا بھی گوارا نہ فرمایا وہ ہزاروں کی جائیداد بصورت مکانات اپنی ملکیت میں کیسے رکھ سکتے تھے یا بعد وصال ان کو میراث بنانے کے لیئے کیسے چھوڑ کر جا سکتے تھے! ن) اس پر بات سے بات نکالنے کی عیاشی کرنے مگر بات کو نہ سمجھنے کا تہیہ کیئے ہوئے علمائے شیعہ یہ کہتے ہیں کہ یہ بات تھی تو تلوار و زرہ اور دُلدل یا اسی طرح کی کچھ اور چیزیں جناب علی رضی اللہ عنہ کو کیوں دی گئیں۔ لیکن اس پر غور نہیں کرتے کہ یہ عمل ہی یہ بات صاف کر رہا ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ کے ترکہ میں میراث نہیں ہے! اگر میراث ہوتی تو جناب علی رضی اللہ عنہ کس بنا پر حصہ پا سکتے تھے حصہ پاتیں تو سیدۃ الزہراء رضی اللہ عنہا پاتیں یا حضرت عباس رضی اللہ عنہ پاتے۔ یا امہات المومنین پاتیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ تو حصہ و ترکہ پانے والوں میں تھے ہی نہیں۔ اور آپؓ کو یہ سامان دیا وہ مال وقف کی حیثیت کا دیا۔ کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر چیز وقف یعنی تمام مسلمانوں کا حق تھی۔ جس کے لیے خلیفۂ وقت کو یہ اختیار ہے کہ اس میں سے جس چیز کا کسی کو اہل یا حاجتمند دیکھے دے سکتا ہے، لہٰذا جناب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جناب علی رضی اللہ عنہ کو ان اشیاء کا اہل سمجھ کر ان کو عنایت فرما دیں۔ اسی طرح بعض چیزیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پھوپھی زاد بھائی جناب زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ کو ملیں اور کچھ اور جناب محمد بن مسلمہ انصاری رضی اللہ عنہ کو عنایت ہوئیں۔ یہ عمل بتاتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ترکہ وارثوں میں تقسیم نہیں ہوا۔ اور ان کی کم فہمی ہے کہ اعتراض و شبہ میں ایسی بات کہہ رہے ہیں جس سے اہل سنت کی دلیل اور مضبوط ہوتی ہے۔

اب ان کا ڈھیٹ پن دیکھئے کہ پہلے تو طعن کرتے رہے کہ ابوبکر رضی اللہ عنہم نے میراث کا حق بنتے ہوئے بھی میراث نہیں دی اور جب ان کے ائمہ معصومین کے طرز عمل اور ان کی روایات سے یہ بات ثابت کر دی گئی کہ متروکہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم میں میراث جاری نہیں ہوتی تو اب پینترا بدل کر ایک اور دعویٰ تراشا اور ایک طعن کر ڈالا۔ ملاحظہ ہو۔

اعتراض (۳) کہ باغ فدک جناب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جناب سیدہ فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کو نہیں دیا حالانکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو ہبہ کر دیا تھا۔ ان کے دعوی کو ناقابل سماعت قرار دے کر انہیں گواہ پیش کرنے کے لیئے کہا۔ اور جب جناب سیدہ رضی اللہ عنہا نے گواہی میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور ام ایمن رضی اللہ عنہا کو پیش کیا تو آپ رضی اللہ عنہ نے اس گواہی کو رد کر دیا اور فرمایا ایک مرد کے ساتھ دو عورتیں ہونی چاہئیں۔ اس پر جناب سیدہ رضی اللہ عنہا ناراض ہو گئیں اور آپؓ سے بول چال بند کر دی حالانکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جناب سیدہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں فرمایا تھا مَنْ اَغْضَبَهَا اَغْضَبَنِيْ (جس نے ان کو غصہ دلایا۔ اس نے مجھے ناراض کیا)

جواب:۔ اس اعتراض کا یہ ہے کہ حضرت زہراء رضی اللہ عنہا کا دعوائے ہبہ اور گواہی میں جناب علی و ام ایمن، یا بروایت دیگر جناب حسنین رضی اللہ عنہم کو پیش کرنے کی روایات افتراء اور جھوٹ ہے۔ کیونکہ اہل سنت کی کتابوں میں اس معاملہ کی کسی

www.Ahlehaq.com

عنوان کوئی روایت موجود نہیں۔ لہٰذا اس کا سہارا لے کر اہل سنت پر الزام لگانا اور ان سے جواب طلب کرنا نادانی اور دھاندلی ہے۔ اہل سنت کی کتابوں میں جو روایت ملتی ہے وہ اس کے برعکس، اور مخالف ہے، چنانچہ مشکوٰۃ میں بحوالہ ابو داؤد جناب مغیرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب جناب عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ خلیفہ ہوئے تو تمام بنو مروان کو جمع کیا اور فرمایا۔

إِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَتْ لَهٗ فَدَكٌ فَكَانَ يُنْفِقُ مِنْهَا وَيَعُوْدُ مِنْهَا عَلٰى صَغِيْرِ بَنِيْ هَاشِمٍ وَيُزَوِّجُ مِنْهَا أَيِّمَهُمْ وَإِنَّ فَاطِمَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا سَأَلَتْهُ أَنْ يَجْعَلَهَا لَهَا فَأَبٰى فَكَانَتْ كَذٰلِكَ فِيْ حَيٰوةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَتّٰى مَضٰى بِسَبِيْلِهٖ فَلَمَّا أَنْ وَلِيَ أَبُوْ بَكْرٍ عَمِلَ فِيْهَا بِمَا عَمِلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ حَيٰوتِهٖ حَتّٰى مَضٰى بِسَبِيْلِهٖ فَلَمَّا أَنْ وَلِيَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ عَمِلَ فِيْهَا بِمَا عَمِلَا حَتّٰى مَضٰى بِسَبِيْلِهٖ ثُمَّ أَقْطَعَهَا مَرْوَانُ ثُمَّ صَارَتْ لِعُمَرَ بْنِ عَبْدِ الْعَزِيْزِ فَرَأَيْتُ أَمْرًا مَنَعَهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاطِمَةَ لَيْسَ لِيْ بِحَقٍّ وَإِنِّيْ أُشْهِدُكُمْ أَنِّيْ رَدَدْتُهَا عَلٰى مَا كَانَتْ يَعْنِيْ عَلٰى عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَأَبِيْ بَكْرٍ وَعُمَرَ

بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس فدک تھا۔ آپ اسکی آمدنی خرچ فرماتے ہاشمی بچوں کی غور و پرداخت اور بیواؤں کے عقد وغیرہ میں صرف فرماتے۔ آپ کی بیٹی جناب فاطمہؓ نے آپ سے سوال کیا کہ آپ فدک (کی آمدنی) میرے لیے مقرر فرمادیں۔ مگر آپؐ نے اس سے انکار فرمادیا۔ اور آپ کی حیات تک فدک کا معاملہ بدستور رہا۔ اور جب جناب ابو بکرؓ والی ہوئے تو انہوں نے بھی اس معاملہ کو اسی طرح رکھا جسطرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے رکھا تھا۔ یہاں تک کہ ان کا بھی وصال ہوگیا۔ پھر جناب عمرؓ خطاب والی ہوئے تو آپ نے وہی راہ عمل اختیار کیا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور جناب ابو بکرؓ نے اختیار کی تھی۔ آپ رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد مروان نے اسے جاگیر بنالیا، اور اب اسی صورت میں یہ میری تحویل میں آیا۔ تو میں نے سوچا کہ جس چیز کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی لخت جگر کو نہیں دیا میرے لیے اس میں حصہ نہیں نہ میں اس کا مستحق ہوں لہٰذا میں تم کو گواہ بناتا ہوں کہ میں نے اسکی پہلی حیثیت بحال کردی ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم و جناب ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کے عہد میں تھی۔

توجب ہبہ کی حقیقت ہی فی الواقع ثابت نہیں ہے تو دعویٰ کا پیش کرنا اور ایسے حضرات کی گواہی دلانا جو شیعوں کے نزدیک معصوم ہیں اور ہمارے نزدیک بھی صادق و معتبر، ممکن ہی نہ رہا۔ اور اس کی کوئی گنجائش باقی رہی!

اس کا ایک جواب دوسرے پہلو سے یہ ہے کہ شیعہ و سنی دونوں کا اس مسئلہ میں اتفاق ہے کہ، ہبہ کی ہوئی چیز، جس کو ہبہ کی گئی ہو، وہ اس وقت تک اس کی ملکیت میں نہیں آتی جب تک اس کے قبضہ و تصرف میں نہ آجائے۔ اور یہ بات ہر گروہ کے اجماع سے ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں فدک سیدہ زہرا رضی اللہ عنہا کے قبضہ و تصرف میں نہیں آیا تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قبضہ و تصرف میں تھا اور آپؐ اس پر مالکانہ تصرف فرمایا کرتے تھے۔ پس جناب سیدہؓ نے دعویٰ کیا، تو جناب صدیقؓ نے اس کی تکذیب نہیں کی، بلکہ ایک مسئلہ فقہیہ بیان فرمایا کہ صرف ہبہ سے ملک ثابت نہیں ہوتی تاوقتیکہ قبضہ ثابت نہ ہو، قبضہ ثابت ہونے کی صورت میں کسی گواہ و شاہد کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ اور بالفرض جناب امیر المؤمنین و ام ایمن رضی اللہ عنہا نے بطریق اخبار اس ہبہ کا اظہار کیا ہوگا۔ تو اس کو شہادت کی تردید کہنا جہالت کی بدترین صورت ہے۔ یہ ایک مرد اور ایک عورت کی گواہی پر فیصلہ نہ کرنا ہے۔ ان کی شہادت رد کرنا نہیں ہے۔ رد شہادت تو یہ ہے کہ گواہ پر تہمت لگائیں اور اسے جھوٹا قرار دیں۔ شاہد کی تصدیق کرنا اور چیز ہے اور شہادت کے موافق حکم لگانا اور چیز ہے، یہاں جناب صدیقؓ نے شہادت کی تصدیق تو کی لیکن چونکہ شہادت نامکمل تھی اس

www.Ahlehaq.com

www.Ahlehaq.com

لیے فیصلہ شہادت کی صورت حال پر دیا۔ اور جو اتنا کودن اور بیوقوف ہو کہ ان دونوں باتوں میں فرق نہ کر سکے اور حکم نہ کرنے کو گواہ یا مدعی کی تکذیب سمجھے، علماء کے نزدیک وہ قابل خطاب ہی کب ہے۔ قرآنی نص و حکم کے مطابق حسب شرعی مسئلہ ہی یہ ہے کہ گواہوں میں دو مرد یا ایک مرد دو عورتیں نہ ہوں تو کوئی حکم نہیں لگایا جا سکتا۔ تو ایسی صورت میں۔ حکم شرع کی وجہ سے جناب صدیق رضی اللہ عنہ مجبور تھے! حکم و فیصلہ کیسے دے سکتے تھے!

اب رہا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان جناب سیدہ رضی اللہ عنہا کے حق میں کہ مَنْ اَغْضَبَهَا اَغْضَبَنِیْ۔ اس موقعہ پر لانا لغت عرب سے ناواقفیت اور نادانی کی دلیل ہے۔ اس لیے کہ اغضاب (غصہ دلانا) یہ ہے کہ کوئی شخص کسی کو اپنے قول یا فعل سے بالارادہ غصہ دلائے۔ اور یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ جناب صدیق رضی اللہ عنہ جناب سیدہ رضی اللہ عنہا کی ایذا رسانی کا قصد تو کیا تصور تک نہیں کر سکتے تھے، وہ تو بار بار ان الفاظ معذرت سے تعلق خاطر کا اظہار فرماتے رہتے تھے۔ وَاللّٰہِ یَا ابْنَةَ رَسُوْلِ اللّٰہِ اِنَّ قَرَابَةَ رَسُوْلِ اللّٰہِ اَحَبُّ اِلَیَّ مِنْ اَنْ اَصِلَ قَرَابَتِیْ۔ (اللہ کی قسم ہے رسول اللہ کی لخت جگر صلہ رحمی کے لیے مجھے رسول اللہ کی قرابت اپنی قرابت سے زیادہ محبوب ہے) جب غصہ دلانے کا آپؓ سے فعل سرزد ہی نہیں ہوا تو آپ اس وعید کے مستحق کیسے ہو سکتے ہیں! ہاں ہو سکتا ہے کہ بتقاضائے بشریت سیدہ زہراء رضی اللہ عنہا، کو غصہ آیا ہو، مگر وعید اغضاب پر مبنی ہے غضب پر نہیں، اس لیے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو اس سے کیا خوف خطر! اگر وعید کے یہ الفاظ ہوتے مَنْ غَضِبَ عَلَیْهِ غَضِبْتُ عَلَیْهِ (آپ جس پر غصہ ہوئیں میں بھی اس پر غصہ ہوا) تو البتہ جناب صدیق رضی اللہ عنہ کے لیے خوف کا مقام تھا۔

اس کے علاوہ سیدہ فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہا خانگی معاملات میں کئی بار جناب علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ پر غصہ ہوئیں۔ ان میں سے ایک موقعہ وہ تھا جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ابو جہل کی بیٹی کو اپنے لیے نکاح کا پیغام دیا، تو سیدہ رضی اللہ عنہا افسردہ و گریاں بابا جان صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں شاکی ہوئیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی معاملہ میں خطبہ دیا جس میں فرمایا اَلَا اِنَّ فَاطِمَةَ بِضْعَةٌ مِّنِّیْ یُؤْذِیْنِیْ مَا اٰذَاهَا وَیُرِیْبُنِیْ مَا رَابَهَا فَمَنْ اَغْضَبَهَا اَغْضَبَنِیْ۔ سنو! فاطمہؓ میرے بدن کا ٹکڑا ہیں جس نے اس کو ایذا پہنچائی اس نے مجھ کو ایذا پہنچائی جس نے ان کو فکر و تردد میں ڈالا مجھے فکر و تردد میں ڈالا جس نے ان کو غصہ دلایا اس نے مجھے غصہ دلایا۔ ایک دوسرا موقعہ وہ تھا کہ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ جناب سیدہؓ سے ناراض ہو کر گھر سے نکل کر مسجد میں جا کر بغیر کچھ بچھائے ننگی زمین پر سو گئے! حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جب اسکی اطلاع ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سیدہ زہراءؓ کے پاس تشریف لائے اور دریافت فرمایا اَیْنَ ابْنُ عَمِّكِ (میرے چچا کے بیٹے کہاں ہیں) جناب سیدہؓ رضی اللہ عنہا نے کہا غَاضَبَنِیْ فَخَرَجَ وَلَمْ یَقِلْ عِنْدِیْ (مجھ سے رنجش کی اور نکل گئے، گھر میں قیلولہ بھی نہیں کیا)۔ یہ دونوں صحیح القبوب اور متفق علیہ روایات ہیں۔ اور یہ بات تو بہت مشہور و واضح ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بتقاضائے بشریت اتنا غضبناک ہوئے کہ بڑے بھائی اور رسول ہونے کے باوجود جناب ہارون علیہ السلام کے سر و ڈاڑھی کے بال پکڑ کر انکو جھنجھوڑ ڈالا۔ حالانکہ یہ یقینی بات ہے کہ انہوں نے موسیٰ علیہ السلام کو غصہ دلانے کا کوئی قصد و ارادہ نہیں کیا تھا۔ کیونکہ نبی کو غضبناک کرنا کفر ہے۔ اور یہ بات بلاشک درست ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام غضبناک ہوئے۔ لہٰذا اگر یہ معاملہ غضبناک کرنے کا ہوتا تو معاذ اللہ حضرت ہارون علیہ السلام منصب رسالت کہاں رہتے!

ایک اور جواب ہماری طرف سے یہ ہے کہ ہم مانے لیتے ہیں کہ جناب سیدہ زہراء رضی اللہ عنہا میراث نہ ملنے یا دعویٰ ہبہ تسلیم نہ کیے جانے کے سبب ناراض ہوئیں اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے بات چیت بند کر دی۔ لیکن اسی کے ساتھ شیعوں اور سنیوں کی صحیح روایات میں یہ بات بھی تو ثابت ہے کہ جناب صدیق رضی اللہ عنہ کو یہ بات شاق گذری اور جناب سیدہ رضی اللہ عنہا کے در دولت پر تشریف

لے جاکر جناب علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو اپنا سفارشی بنایا تا آنکہ سیدہ رضی اللہ عنہا آپ سے خوش دل ہوئیں۔

اہل سنت کی روایات تو مدارج النبوت، کتاب الوفاء بیہقی، اور شروح مشکوٰۃ میں موجود ہیں بلکہ شیخ عبد الحق محدث دہلوی کی شرح مشکوٰۃ میں یہ مذکور ہے کہ قضیہ کے بعد حضرت صدیق رضی اللہ عنہ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے مکان پر تشریف لے گئے (گرمی کا موسم) تھا دروازہ پر دھوپ میں کھڑے ہوئے اور معذرت پیش کی، اور سیدہ آپ سے راضی اور خوش ہوگئیں۔ ریاض النضرہ میں بھی یہ قصہ تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ اور فصل الخطاب بیہقی میں بروایت شعبی رح یہ قصہ منقول ہے۔ اور ابن السمان نے کتاب الموافقہ میں اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ سے روایت بیان کی ہے کہ گرمی کے ایک دن جناب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ حضرت سیدہ بتول الزہرا رضی اللہ عنہا کے دروازہ پر تشریف لائے۔ اور فرمایا اے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی نور نظر، لخت جگر میں دروازہ سے اسوقت تک نہیں ٹلوں گا جب تک آپ مجھ سے راضی نہ ہونگی۔ اسوقت حضرت علی رضی اللہ عنہ جناب سیدہ رضی اللہ عنہا کے پاس گئے اور آپ کو قسم دے کر کہا کہ ناراضگی ختم کردیں چنانچہ آپ نے اظہار خوشنودی فرمایا اور راضی ہوگئیں۔

اب رہے شیعہ تو ان میں سے زیدیہ بعینہٖ اہل سنت کی روایات کے مطابق روایت کرتے ہیں۔ اور امامیہ میں سے مجاج السالکین کے مصنف اور دیگر علمائے شیعہ یوں روایت کرتے ہیں۔

إِنَّ أَبَا بَكْرٍ لَمَّا رَأَى أَنَّ فَاطِمَةَ انْقَبَضَتْ عَنْهُ وَهَجَرَتْهُ وَلَمْ تَتَكَلَّمْ بَعْدَ ذٰلِكَ فِي أَمْرِ فَدَكٍ كَبُرَ ذٰلِكَ عِنْدَهُ فَأَرَادَ اسْتِرْضَاءَهَا فَأَتَاهَا فَقَالَ لَهَا صَدَقْتِ يَا ابْنَةَ رَسُولِ اللّٰهِ فِيمَا ادَّعَيْتِ وَلٰكِنِّي رَأَيْتُ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقْسِمُهَا فَيُعْطِي الْفُقَرَاءَ وَالْمَسَاكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ بَعْدَ أَنْ يُؤْتِيَ مِنْهَا قُوتَكُمْ وَالصَّانِعِينَ بِهَا فَقَالَتْ افْعَلْ فِيهَا كَمَا كَانَ أَبِي رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَفْعَلُ فِيهَا فَقَالَ ذٰلِكَ اللّٰهُ عَلَيَّ أَنْ أَفْعَلَ فِيهَا مَا كَانَ يَفْعَلُ أَبُوكِ فَقَالَتْ وَاللّٰهِ لَتَفْعَلَنَّ فَقَالَ وَاللّٰهِ لَأَفْعَلَنَّ فَقَالَتْ اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ فَرَضِيَتْ بِذٰلِكَ وَأَخَذَتِ الْعَهْدَ عَلَيْهِ وَكَانَ أَبُو بَكْرٍ يُعْطِيهِمْ مِنْهَا قُوتَهُمْ وَيَقْسِمُ الْبَاقِيَ فَيُعْطِي الْفُقَرَاءَ وَالْمَسَاكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ۔

(یہ مجاج السالکین اور معتبر کتابوں کی عبارت ہے)

جب ابوبکرؓ نے دیکھا کہ فاطمۃ الزہرا نے مجھ سے کبیدہ خاطر ہو کر تعلقات توڑ لیے ہیں اور فدک کے معاملہ میں کوئی بات نہیں اٹھائی تو آپ پر یہ بہت شاق گذرا۔ آپ نے ان کو راضی کرنا چاہا، آپ ان کے پاس آئے اور کہا اے رسول اللہ کی صاحبزادی، آپ اپنے دعوے میں سچی تھیں۔ لیکن میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ دیکھا ہے کہ اس کی آمدنی میں سے تم کو اور اس میں کام کرنے والوں کو دینے کے بعد باقی فقیروں مسکینوں اور مسافروں میں تقسیم فرمادیا کرتے تھے اس پر جناب فاطمہ نے فرمایا کہ آپ بھی اسی طرح کریں جیسے میرے والد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا کرتے تھے۔ ابوبکرؓ نے کہا خدا کی قسم میں تمہارے لیئے وہ کام کروں گا جو کچھ تمہارے والد صلی اللہ علیہ وسلم کیا کرتے تھے تو آپ بولیں بخدا تم ایسا ہی کروگے۔ ابوبکرؓ نے پھر فرمایا بخدا ایسا ضرور کروں گا اس پر سیدہ فاطمہؓ نے فرمایا اے اللہ تو گواہ رہ! پس آپ ان سے راضی ہوئیں۔ اور اس پر عہد لیا۔ پھر ابوبکرؓ اس کی آمدنی سے آپ کو دیا کرتے اور باقی کو فقیروں مسکینو اور مسافروں پر تقسیم کرتے۔

ان کی اسی عبارت سے صاف معلوم ہوا کہ جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے جناب سیدہ زہراء رضی اللہ عنہا کے دعوے کی تصدیق فرمائی لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اس میں تاحین حیات تصرف کرنا اور اس پر قبضہ نہ کرنا انہوں نے ملک کے مخالف سمجھا جیسا کہ پوری امت کے نزدیک طے شدہ بات ہے۔ اب جب انہیں لوگوں کے حوالہ کے مطابق جناب صدیق رضی اللہ عنہ نے سیدہ زہراء رضی اللہ عنہا کے دعویٰ

www.Ahlehaq.com

کی تصدیق فرمادی تو پھر ام ایمن اور جناب امیر رضی اللہ عنہا کے گواہ بنانے کی کیا ضرورت رہ گئی تھی۔ (جس کو اپنے طعن میں بیان کیا) بفضلہ تعالیٰ امامیہ ہی کی روایات سے حق ظاہر ہوگیا، اور یہ لوگ جو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ پر شہادت کے رد اور دعویٰ کے خارج کرنے کی تہمت لگاتے تھے سراسر جھوٹ ثابت ہوئی۔ وَاللّٰهُ يُحِقُّ الْحَقَّ وَيُبْطِلُ الْبَاطِلَ (اور اللہ تعالیٰ حق کو حق ثابت کرتا ہے اور باطل کو باطل) جب علمائے شیعہ نے یہ دیکھا کہ ہبہ والا شوشہ تو ناکام ہوگیا کہ قبضہ کے بغیر ہبہ ملکیت نہیں ہوئی۔ تو اس شرعی مسئلہ پر جناب سیدہ رضی اللہ عنہا کو کیوں غصہ آ(آ)، اور اس میں جناب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا کیا قصور، تو ہمارے زمانہ کے شیعی علماء اس دعوے سے بھی منحرف ہوگئے اور ایک دوسرا دعویٰ گھڑ لیا۔ اور ایک اور اعتراض جڑ دیا جو یہ ہے۔

اعتراض (۴) کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تو سیدہ زہرا رضی اللہ عنہا کے لئے فدک کی وصیت فرمائی تھی مگر جناب صدیق رضی اللہ عنہ نے ان کو فدک پر قبضہ نہیں دیا۔ اور یوں انہوں نے پیغمبر صلی اللہ وسلم کی وصیت کی خلاف ورزی کی "

جواب :— اس کا کئی طرح سے دیا جا سکتا ہے۔ اول تو معترض جناب سیدہ رضی اللہ عنہا کی طرف سے وصیت کا دعویٰ، اس کے ثبوت میں اہل سنت یا شیعہ حضرات کی معتبر کتابوں سے بطور شہادت حوالہ سامنے لائیں پھر اس کے جواب کا مطالبہ کریں۔ دوسرے شیعوں اور سنیوں کا اس پر اجماع ہے کہ وصیت اور میراث دونوں ایک ہی چیز ہیں۔ لہٰذا جس مال میں میراث جاری نہیں ہوگی اس میں وصیت کیسے چلے گی۔ اس لئے کہ وصیت اور میراث دونوں میں موت کے بعد ملکیت منتقل ہوتی ہے اور انبیاء علیہم السلام بعد وصال کسی چیز کے مالک نہیں رہتے وہ ملکیت خدا کی طرف منتقل ہوجاتی ہے۔ اور بیت المال اس کا نگران ہوتا ہے اور اس کا راز یہ ہے کہ۔ اَلْاَنْبِيَاءُ لَا يَشْهَدُوْنَ مِلْكًا مَعَ اللّٰهِ۔ (پیغمبر اللہ کے ہوتے کسی چیز کو اپنی ملک نہیں سمجھتے) ان کے قبضہ و تصرف میں جو اشیاء ہوتی ہیں، اسے وہ عاریت سمجھتے ہیں اور اسے استعمال فرماتے ہیں، اسی لئے ان پر زکوٰۃ بھی فرض نہیں ہوتی نہ ان کے ترکہ سے قرضہ چکایا جا سکتا ہے۔ اور مال عاریت میں نہ وصیت نافذ ہوتی ہے نہ میراث۔ اور جب ائمہ معصومین "کی روایت سے انبیاء کرام علیہم السلام کے اموال میں میراث کا جاری نہ ہونا قطعی طور سے ثابت ہوگیا، تو وصیت کا جاری نہ ہونا بطریق اولیٰ ثابت ہوا کیونکہ توریث تو وصیت سے بمراتب قوی تر ہے! اور وصیت اس سے ضعیف تر۔ تیسرے! کسی مخصوص فرد کیلئے وصیت اس وقت درست ہوتی ہے، جب وصیت کرنے والے سے اس سے قبل کوئی بات خلاف وصیت صادر نہ ہوئی ہو۔ اور اس معاملہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم پہلے ہی یہ فرما چکے تھے مَا تَرَكْنَاهُ صَدَقَةٌ۔ (ہم جو بھی چھوڑیں وہ صدقہ ہے) اس لئے جو آپ کا مال تھا وہ فی سبیل اللہ وقف ہوا۔ اب اس میں وصیت کی گنجائش کہاں رہی۔ چوتھے! ہم وصیت کی بات کو درست بھی مان لیں تو جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو ذاتی طور پر یہ معلوم نہ ہوگی اور شاہدوں کے ذریعہ اس کا ثبوت نہ ہوا! تو آپ تو اس میں معذور سمجھے جائیں گے، لیکن جناب امیر رضی اللہ عنہ کو اپنی خلافت کے وقت کیا عذر ہو سکتا تھا، کہ آپ نے بھی اس وصیت پر عملدرآمد نہیں فرمایا اور بدستور اس کی آمدنی سابقہ مصارف پر ہی صرف فرماتے رہے! اگر آپؓ نے اپنا حصہ راہ خدا میں دے ڈالا تو جناب حسنین رضی اللہ عنہما اور آپ کی بہنوں کو اپنی والدہ کی میراث سے کیوں محروم فرمایا

شیعوں نے اس کے چار جواب دیئے ہیں مگر چاروں میں سُقم اور خامیاں ہیں ہم یہاں سے ان کو بیان کرتے ہیں۔

(۱) اہل بیت غصب کی ہوئی چیز کو واپس نہیں لیتے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا ذاتی مکان فتح مکہ کے بعد غاصب سے واپس نہیں لیا! مگر ان کا یہ جواب غلط اور مغالطہ آمیز ہے اس لئے کہ عہد عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ میں خود انہوں نے جناب باقر رحمۃ اللہ کے قبضہ میں فدک دیا۔ اور وہ انہی کے زیر تصرف رہا تاآنکہ خلفائے عباسیہ کا دور آیا اور وہ اس پر قابض و متصرف

ہوئے۔ پھر سنہ ۲۱۰ھ میں مامون عباسی نے اپنے عامل قثم بن جعفر کو لکھا کہ فدک اولاد فاطمہ (رضی اللہ عنہا) کے قبضہ میں دیدے۔ اس وقت امام علیؓ اس پر قابض و متصرف ہوئے، پھر متوکل عباسی نے اس پر قبضہ جمایا۔ تو پھر معتضد نے اپنے عہد میں واپس کر دیا جب مکتفی نے دوبارہ قبضہ کر لیا تو معتضد نے دوبارہ اسکو لوٹا دیا۔ چنانچہ قاضی نور اللہ نے مجالس المؤمنین میں اس کا تفصیلی ذکر کیا ہے لہٰذا اگر ان شیعوں کا مذکورہ بالا جواب درست ہے تو اہل بیت کے ان قابل احترام بزرگوں نے اسے کیسے قبول کر لیا۔ اور ان کے پاس اس کا کیا جواب و جواز ہے کہ ان کے نزدیک فدک کی طرح خلافت بھی تو غصب کر لی گئی تھی، تو حضرت عثمان غنی شہید رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے اسے کیوں قبول فرما لیا اور جناب سیدنا حسین رضی اللہ عنہ نے اس مغصوبہ شے کو چھین لینے کی ایسی کوشش و سعی کیوں فرمائی کہ جس کے نتیجہ میں آپ کی شہادت تک کی نوبت پہنچی۔

(۲) دوسرا جواب ان کا یہ ہے کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ نے جناب سیدہ رضی اللہ عنہا کے طریق عمل کی اقتدا فرمائی کہ فدک سے فائدہ نہیں اٹھایا۔ یہ جواب بھی سراپا مختل ہے۔ کیونکہ دیگر ائمہ اہل بیت نے جناب امیر اور سیدہ زہرا رضی اللہ عنہا کے طریق عمل کی اقتدا کیوں نہیں کی اور فدک کو اپنے زیر تصرف لا کر اس سے کیوں نفع اندوز ہوئے۔ پھر یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جناب سیدہ کی یہ اقتداء فرض تھی یا نفل۔ اگر فرض تھی تو دوسرے ائمہ نے یہ فرض کیوں ترک کیا۔ اور اگر نفل تھی تو جناب امیر رضی اللہ عنہ نے نفل کی خاطر فرض کیوں چھوڑا۔ یعنی حقدار کو حق پہنچانا۔ اور پھر اقتدا تو کسی شخص کے اختیاری افعال میں کی جاتی ہے نہ کہ اضطراری افعال میں، اگر سیدہ زہرا رضی اللہ عنہا "ظلم و ستم" کے سبب فدک سے فائدہ نہ اٹھا سکیں تو وہ تو سراسر مجبور تھیں۔ اور مظلومیت و بے بسی میں کسی کی پیروی و اقتداء کے کیا معنی! اور اگر اقتدا بھی کرتے تو خود اس سے فائدہ نہ اٹھاتے، بچوں کو ان کی میراث اور حق سے تو محروم نہ فرماتے۔

(۳) تیسرا جواب، تاکہ لوگوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ آپؓ نے جو اس سلسلہ میں گواہی دی تھی وہ اپنے مفاد کی خاطر نہیں دی تھی بلکہ اللہ کی خوشنودی کے لئے دی تھی، یہ جواب بھی قباحتوں سے پُر ہے! اول تو یہ کہ جو لوگ جناب امیرؓ کے متعلق اپنے دل میں بدگمانی رکھتے ہوں گے وہ وہی تو ہوں گے جنہوں نے ہبہ و وصیت میں آپ کی شہادت کو رد کیا ہوگا اور ایسے حضرات اب جناب امیرؓ کے عہد میں زندہ ہی کیا تھے! وہ کیسے جان سکتے تھے کہ آپؓ کا فائدہ نہ اُٹھانا اس نقطۂ خیال پر مبنی تھا۔ دوسرے یہ کہ جب جناب امیر رضی اللہ عنہ کی اولاد اس سے منتفع اور مستفید ہو گئی، تو نواصب و خوارج کو تو یہ بدگمانی کرنے کا تو موقعہ مل جائے گا کہ آپ رضی اللہ عنہ نے یہ سب کچھ اپنی اولاد کی خاطر اور ان کو نفع پہنچانے کے لئے کیا۔ خاص کر زمین، ملک اور باغ میں تو انسان اپنے ذاتی نفع سے زیادہ اولاد کا مفاد پیش نظر رکھتا ہے۔ ایسی صورت میں تقاضائے دور اندیشی یہ تھا کہ اولاد کرام کو وصیت فرما جائے کہ تم اس سے ہرگز ہرگز فائدہ نہ اٹھانا کہ کہیں میری شہادت و گواہی مجروح نہ ہو جائے! اسوقت اولاد کے سامنے بھی دو نظریں ہوتیں اور اسے قبول نہ کرنے کا داعیہ قوی ہوتا۔

(۴) چوتھا جواب یہ ہے کہ یہ سب کچھ تقیہ پر عمل کے طریق پر مبنی ہے" مگر اس جواب میں سقم اور خرابی یہ ہے کہ سارے ہی امامیوں کا یہ مذہب ہے کہ جب امام حالت جنگ و قتال میں ہو، یا خروج کے وقت میں ہو تو اس وقت قطعاً تقیہ حرام ہو جاتا ہے اسی لئے جناب حسین رضی اللہ عنہ نے کوئی تقیہ نہیں کیا یہاں تک کہ راہ خدا میں جان ہار دی! لہٰذا اگر جناب امیر رضی اللہ عنہ نے اپنے دور خلافت میں تقیہ فرمایا تو وہ امامیوں کے نزدیک معاذاللہ فعل حرام کے مرتکب ہوئے! اور پھر اگر ان تمام باتوں سے قطع نظر بھی کر لی جائے تو شیخ ابن مطہر حلی نے اپنی کتاب منہاج الکرامہ میں ایک ایسی بات لکھدی ہے جو اس اشکال کی جڑ ہی اکھاڑ سکتی ہے،

اور پھر جناب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ پر طعن واعتراض کی گنجائش ہی نہیں رہتی۔ اور وہ یہ ہے اَنَّهٗ لَمَّا وَعَظَتْ فَاطِمَةُ اَبَا بَكْرٍ فِیْ فِدَكَ كَتَبَ لَهَا كِتَابًا وَرَدَّهَا عَلَيْهَا۔ (جب حضرت فاطمہؓ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو فدک کے سلسلہ میں نصیحت فرمائی تو آپؓ نے ایک تحریر لکھ کر جناب سیدہ کو بھیجی اور فدک انہیں کو لوٹا دیا۔ اب اس روایت کو صحیح مان لینے کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ذمہ جو بھی دعویٰ ہو ہبہ کا ہو یا میراث و وصیت کا۔ ساقط ہو جاتا ہے اور شیعوں کا یہ منہ نہیں رہتا کہ اب وہ جناب صدیق رضی اللہ عنہ پر کوئی طعن یا اعتراض کریں۔

البتہ دو شبہے اب بھی شیعہ وسنی دونوں کے دلوں میں کھٹکتے ہیں، اول تو یہ کہ مان لیا جناب سیدہؓ کا دعویٰ جناب صدیقؓ کے نزدیک پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچا۔ لیکن جناب سیدہؓ کی اگر مرضی اس کو لے لینے میں تھی تو جناب صدیقؓ نے اتنا توقف کیوں کیا، اول ہی مرحلہ پر کیوں نہ دیدیا کہ بات اتنی نہ بڑھتی اور نوبت رنجش تک نہ پہنچتی۔ اور نہ صلح وصفائی کی ضرورت رہتی اس شبہ کو یوں دفع کیا جاسکتا ہے کہ اس مقدمہ میں جناب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بڑے خلجان میں پڑ گئے تھے، اگر جناب سیدہؓ کی دلجوئی مقدم رکھتے ہیں تو دین میں دو بڑے رخنے پیدا ہو جاتے ہیں۔ اول یہ کہ اس کے بعد لوگ یہ یقین کر لیں گے کہ امور مؤمنین میں خلیفہ فرق مراتب کرتے اور رعایت سے کام لیتے ہیں۔ کہ لحاظ والوں کو بغیر ثبوت دعوے ہی ان کا حق دیدیتے ہیں جبکہ عام لوگوں سے ثبوت دعویٰ کی خاطر گواہ طلب فرماتے ہیں، اور یہ بدگمانی دین میں اتنے بڑے فساد کا سبب بنتی کہ قیامت تک اس کا تدارک نہ ہو پاتا۔ بعد میں آنے والے حکام و قاضی اپنے دستور العمل میں اسی کو نظیر بنا کر من مانے فیصلے کیا کرتے اور جگہ جگہ ناحق، نرمی وسختی رعایت و جانبداری اس دستاویز کے پیش نظر عمل میں لاتے، دوسرے یہ کہ اگر سیدہ الزہرار رضی اللہ عنہ کو فدک دیدیتے تو لامحالہ آپ کو اس کا مالک بنا دیتے اور وارث کی ملکیت درحقیقت مُورث کے ملک ہے۔ کیونکہ یہ اسی کا تو نائب ہے۔ تو اس صورت میں اس زمین کا خاندان نبوت میں واپس لے آنا ہوگا۔ حالانکہ بفرمان رسول امین صلی اللہ علیہ وسلم مَا تَرَكْنَاهُ صَدَقَةٌ۔ یہ صدقہ رسول تھی۔ اور صدقہ کی واپسی کو آپ نے ایسا بُرا فرمایا ہے گویا کُتے کا قے کر کے چاٹ لینا ہوگا۔ تو آپؓ سے ایسی سنگین چوک کیسے ہو سکتی تھی!

یہ دو دینی وجوہات آپ کے پیش نظر تھیں۔ اس کے علاوہ ایک دنیاوی وجہ بھی سامنے تھی کہ سیدۃ الزہرار کا مطالبہ پورا کر دینے کی صورت میں ایسی قسم کے مطالبات حضرت عباس و امہات المؤمنین رضی اللہ عنہم کی طرف سے بھی اگر پیش ہو جاتے تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ایسی الجھن میں پڑ جاتے کہ کچھ بنائے نہ بنتا۔ ان ہی باتوں کے پیش نظر مجبوراً آپ نے بحکم حدیث نبوی۔ اَلْمُؤْمِنُ اِذَا ابْتُلِیَ بِبَلِيَّتَيْنِ اَخْتَارَ اَهْوَنَهُمَا۔ جب مؤمن دو بلاؤں میں گھر جاتا ہے تو وہ ان دونوں میں سے جو ہلکی ہو اسے اختیار کر لیتا ہے۔ یہی صورت اختیار فرمائی کہ گو وقتی طور پر ناگوار ہوگا مگر اس کا تدارک ہو سکتا ہے، جیسا کہ ہو گیا، مگر دوسری صورت کا کوئی تدارک ممکن نہ تھا۔ اور پھر دین میں جو فساد پیدا ہوتا اسکی قیامت تک ذمہ داری آپ کی گردن پر رہتی۔ اس صورت میں یہ شرعی مسئلہ بھی طے ہو گیا کہ بغیر گواہوں کے دعویٰ قابل تسلیم نہیں، اور یہ بھی کہ پیغمبر کے مال میں میراث و وصیت نافذ وجاری نہیں ہو سکتی! اور اپنے اختیار شرعی سے بیت المال کی ملکیت بطور گزارہ بصورت فدک جناب سیدہؓ کو دے کر رنجش و ناراضگی کا ازالہ بھی فرمالیا۔

دوسرا شُبہ یہ ہے کہ جب جناب ابوبکر صدیق وجناب سیدہ رضی اللہ عنہما میں باہمی صلح وصفائی ہو چکی تھی اور دونوں جانب سے کدورت مٹ چکی تھی جیسا کہ شیعہ وسنی دونوں کی روایات سے ثابت ہوا۔ تو پھر اس کی کیا وجہ تھی کہ جناب سیدہؓ نے اپنے جنازہ پر جناب صدیق رضی اللہ عنہ کا آنا گوارا نہ کیا اور جناب امیر رضی اللہ عنہ نے آپ کو راتوں رات خاموشی سے دفن کر دیا۔

اس شُبہ کا ازالہ یہ ہے کہ جناب سیدہؓ کی یہ وصیت خصوصی نہیں تھی عمومی تھی، اور اس کا مبنیٰ غایت جذبہ سترپوشی وحیا تھا۔ جیسا کہ صحیح

روایت سے اسکی وضاحت ہوتی ہے کہ آپ نے مرض وفات میں ارشاد فرمایا کہ مجھے اس سے حیا آتی ہے کہ مرنے کے بعد میرا جنازہ (مردوں کی طرح) کھلا سب لوگوں کے سامنے لایا جائے چنانچہ اس وقت جنازوں کا ایک سا معمول تھا۔ مرد و عورت کے جنازے ایک ہی طرح اٹھائے جاتے تھے۔ آپؓ کی یہ بات سنکر اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا نے کہا میں نے حبشہ میں دیکھا ہے کہ وہاں جنازہ کو کھجور کی شاخوں سے کجاوہ کی طرح بناتے ہیں جناب سیدہؓ نے فرمایا مجھے بنا کر دکھاؤ۔ جب اسماءؓ نے بنا کر دکھایا تو آپ بہت مسرور ہوئیں، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد سے کسی نے آپ کو اتنا مسرور اور اسطرح مسکراتا نہیں دیکھا تھا۔

آپؓ نے اسماءؓ کو وصیت کی کہ تم اور جناب علی رضی اللہ عنہ مجھ کو غسل دینا اور کسی کو میرے پاس نہیں آنے دینا۔ اسی وجہ سے جناب امیر رضی اللہ عنہ نے جنازہ پر کسی کو نہ بلایا۔ ایک قول یہ ہے کہ جناب عباس رضی اللہ عنہ نے چند اہل بیت کے ساتھ نماز جنازہ پڑھکر رات ہی دفن کر دیا۔ بعض روایات میں یہ ہے کہ دوسرے دن جناب شیخین اور دیگر صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاں تعزیت کے لیئے گئے تو سب ہی نے شکایت کی کہ ہم کو آپ نے خبر کیوں نہ کی کہ ہم جنازہ کی شرکت کا ثواب حاصل کرتے، تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جواباً فرمایا کہ فاطمہ (رضی اللہ عنہا) وصیت کر چکی تھیں کہ جب میں دنیا سے جاؤں تو مجھے رات میں دفن کرنا تاکہ میرے جنازہ پہ کسی نا محرم کی نظر نہ پڑے۔ لہٰذا میں نے ان کی وصیت پر عمل کیا (اور کسی کو اطلاع نہیں کی) مشہور روایت یہی ہے۔

فصل الخطاب میں یوں روایت ہے کہ جناب ابوبکر، عثمان غنی، عبدالرحمٰن بن عوف اور زبیر بن عوام رضی اللہ عنہم نماز عشاء کے وقت تشریف لائے اس سے قبل جناب سیدہؓ مغرب و عشاء کے مابین وفات پا چکی تھیں۔ یہ ۳ رمضان سہ شنبہ کی رات تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کو پورے چھ ماہ گذرے تھے۔ آپ کی عمر مبارک ۲۸ سال تھی! حضرت علی رضی اللہ عنہ کے کہنے پر آپؓ (جناب صدیق) پیش امام ہوئے اور چار تکبیروں کے ساتھ آپ نے یہ نماز ادا فرمائی۔

(اختلاف روایات آپ نے ملاحظہ فرمایا، آخری روایت کو اگر فریق ثانی بھی قبول کرے تو طعن و اعتراض ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن اعتراض برائے اعتراض کی روش رکھنے والے حضرات سے ایسی توقع کہ قبول حق کا کھلے دل مظاہرہ کریں۔ خیال خام ہوگا۔ (ن))

اور اس امر پر کہ جناب صدیق رضی اللہ عنہ کی جنازہ پر عدم حاضری محض وصیت ہی کی بنا پر تھی، کسی کدورت و رنجش کو اس میں کوئی دخل نہیں تھا۔ ایک دلیل عقلی بھی شاہد ہے، کہ کدورت و ناراضگی اس کا سبب ہوتا تو یہی بات مدنظر ہو سکتی تھی کہ جناب صدیق رضی اللہ عنہ آپ کا جنازہ نہ پڑھائیں۔ حالانکہ یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ باجماع مورخین ہر دو فرقہ شیعہ۔ وسنی۔ جناب حسن رضی اللہ عنہ کا جنازہ جب باہر لایا گیا تو حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے جناب سعید بن العاص رضی اللہ عنہ کو جو امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف سے مدینہ کے عامل تھے اشارہ کر کے فرمایا کہ اگر میرے نانا (صلی اللہ علیہ وسلم) کی یہ سنت ہوتی کہ امام جنازہ امیر وقت ہو تو تم کو کبھی آگے نہ کرتا۔ اسی سے معلوم ہو گیا کہ جناب سیدہؓ نے آپؓ کو نماز کی خاطر وصیت کر کے آنے سے نہیں روکا تھا۔ جناب حسین رضی اللہ عنہ خلاف سنت کیسے کرتے! اور جناب صدیق رضی اللہ عنہ اور جناب سعید رضی اللہ عنہ میں جو فرق مراتب ہے وہ ظاہر ہی ہے! اور پھر ابھی چند مہینہ ہی کی تو بات تھی کہ سیدہ زہراء رضی اللہ عنہا کے پدر بزرگوار صلے اللہ علیہ وسلم نے جناب ابوبکر رضی اللہ عنہ کو تمام انصار و مہاجرین کا پیش امام بنایا تھا۔ اور اس معاملہ میں بڑا اہتمام و تاکید فرمائی تھی! تو اس بات کا احتمال ہی کہاں پیدا ہو سکتا ہے کہ آپ نے اس واقعہ کو فراموش فرما دیا ہو، اور بابا جان صلی اللہ علیہ وسلم کے مقرر فرمودہ امام المسلمین کو اپنے جنازہ کی نماز پڑھانے سے منع فرمایا ہو۔ (یہ سوچ چار پانچ صدی بعد کے کسی امامی کی تو ہو سکتی ہے۔ خیر القرون کے بیت نبوت کے افراد تو کیا ایک عام مسلمان کی بھی نہیں ہو سکتی۔ کہ وہ سوچے کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے جنکو امام نماز بنایا ان سے نماز جنازہ نہ پڑھوائی جائے۔ ن)

اعتراض ۱۵ پندرھواں اور آخری طعن الخ کا یہ ہے کہ جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو شرعی مسائل بھی معلوم نہ تھے۔ اور جس کو شرعی مسائل معلوم نہ ہوں وہ سنی اور شیعہ دونوں کے نزدیک قابل امامت نہیں کیونکہ ان دونوں کے ہاں احکام شرعیہ کا جاننا شرط امامت ہے۔ اور دعویٰ کے لیے وہ تین دلیلیں پیش کرتے ہیں۔

(۱) کہ آپ نے چور کے بائیں ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا اور اتنا نہ سمجھ سکے کہ شرع میں حد کے طور پر دائیں ہاتھ کا کاٹنا متعین ہے۔

جواب:- اس دلیل کا یہ ہے کہ جناب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے حکم سے بائیں ہاتھ کے کاٹنے کا موقعہ دو بار آیا۔ ایک بار جبکہ چور تیسری بار چوری کا مرتکب ہوا تھا۔ چنانچہ نسائی نے حارث بن حاطب کی ہے، اور طبرانی و حاکم نے روایت کی ہے، اور حاکم نے کہا ہے کہ یہ صحیح الاسناد ہے۔ اور اکثر علماء کے نزدیک حکم شرعی بھی یہی ہے، اور مشکوٰۃ میں بحوالہ ابوداؤد اور نسائی میں جابر رضی اللہ عنہ سے بایں الفاظ روایت کی گئی ہے۔

جِيئَ بِسَارِقٍ إِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اقْطَعُوهُ فَقُطِعَ ثُمَّ جِيئَ بِهِ الثَّانِيَةَ فَقَالَ اقْطَعُوهُ فَقُطِعَ ثُمَّ جِيئَ بِهِ الثَّالِثَةَ فَقَالَ اقْطَعُوهُ فَقُطِعَ ثُمَّ جِيئَ بِهِ الرَّابِعَةَ فَقَالَ اقْطَعُوهُ فَقُطِعَ۔

ایک چور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا گیا آپ نے کاٹنے کا حکم فرمایا پس کاٹا گیا۔ پھر دوبارہ لایا گیا آپ نے حکم دیا کاٹو چنانچہ کاٹا گیا، پھر تیسری مرتبہ لایا گیا اور آپ نے حکم دیا کہ کاٹو پس کاٹا گیا، پھر چوتھی مرتبہ لایا گیا تو آپ نے پھر کاٹنے کا حکم فرمایا چنانچہ کاٹا گیا۔

اور امام محی السنہ بغوی نے شرح السنہ میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ سے ایک روایت بیان کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے چور کے بارے میں فرمایا

إِنْ سَرَقَ فَاقْطَعُوا يَدَهُ ثُمَّ إِنْ سَرَقَ فَاقْطَعُوا رِجْلَهُ ثُمَّ إِنْ سَرَقَ فَاقْطَعُوا يَدَهُ ثُمَّ إِنْ سَرَقَ فَاقْطَعُوا رِجْلَهُ

کہ اگر کوئی چوری کرے تو اس کا ہاتھ کاٹ دو، پھر بھی چوری کرے تو اس کا پاؤں کاٹو، پھر چوری کرے تو اس کا (دوسرا) ہاتھ کاٹو، پھر (بھی) چوری کرے تو (دوسرا) پاؤں کاٹو۔

اور محی السنہ نے یہ بھی کہا ہے کہ!

اِتَّفَقَ أَهْلُ الْعِلْمِ عَلَى أَنَّ السَّارِقَ أَوَّلَ مَرَّةٍ تُقْطَعُ مِنْهُ الْيَدُ الْيُمْنَى ثُمَّ إِذَا سَرَقَ ثَانِيًا تُقْطَعُ رِجْلُهُ الْيُسْرَى. وَاخْتَلَفُوا فِيمَا إِذَا سَرَقَ ثَالِثًا بَعْدَ قَطْعِ يَدِهِ وَرِجْلِهِ فَذَهَبَ أَكْثَرُهُمْ إِلَى أَنَّهُ تُقْطَعُ يَدُهُ الْيُسْرَى ثُمَّ إِذَا سَرَقَ رَابِعًا تُقْطَعُ رِجْلُهُ الْيُمْنَى ثُمَّ إِذَا سَرَقَ بَعْدَهُ يُعَزَّرُ وَيُحْبَسُ. وَهُوَ الْمَرْوِيُّ عَنْ أَبِي بَكْرٍ وَهُوَ قَوْلُ قَتَادَةَ وَإِلَيْهِ ذَهَبَ مَالِكٌ وَالشَّافِعِيُّ وَإِسْحٰقُ بْنُ رَاهَوَيْهِ۔

اس بات پر اہل علم کا اتفاق ہے کہ پہلی مرتبہ چور کا سیدھا ہاتھ کاٹا جاتا ہے، پھر جب دوسری بار چوری کرے تو اس کا بایاں پاؤں کاٹا جاتا ہے، اور اس کا ایک ہاتھ و پاؤں کاٹنے کے بعد پھر تیسری مرتبہ چوری کرے تو اس بارے میں علماء کی آراء میں اختلاف ہے مگر اکثر کے نزدیک اس کا بایاں ہاتھ کاٹا جائے۔ اور جب چوتھی مرتبہ چوری کرے تو اس کا دایاں پاؤں کاٹا جائے۔ پھر اگر اس کے بعد بھی چوری کرے تو اسے حد کے بجائے سزا دی جائیگی اور قید کیا جائے گا ابوبکرؓ سے اسی طرح مروی ہے قتادہ کا یہی قول اور امام مالکؒ و شافعیؒ اور اسحاق بن راہویہ کا یہی مذہب ہے۔

پس جب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا حکم، فرمان نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے عین مطابق ہے تو طعن و اعتراض کی گنجائش کہاں رہی۔ جناب صدیق رضی اللہ عنہ پر فقہ حنفی کی آڑ میں الزام دینا حماقت کے سوا کیا ہے! اور دوسری مرتبہ آپ نے بایاں ہاتھ اسوقت کاٹنے کا حکم دیا جب آپ کے سامنے ایسا چور پیش ہوا جس کا دایاں ہاتھ اور بایاں پاؤں چوری کی حد میں پہلے سے کٹا ہوا تھا اس واقعہ میں بھی اکثر علماء کا یہی مذہب ہے کہ اسوقت اس کا بایاں ہاتھ کاٹنا چاہیئے! جناب امام مالک رحمہ اللہ علیہ نے اپنی کتاب موطا میں بروایت

www.Ahlehaq.com

عبد الرحمٰن بن قاسم رحمہ نے یہ قصہ نقل کیا ہے، جنہوں نے اسے اپنے باپ سے سُنا۔ کہ یمن کا ایک شخص جس کا ایک ہاتھ، بایاں پاؤں کٹا ہوا تھا جناب ابو بکر رضی اللہ عنہ کے پاس بطور مہمان آیا اور آپؓ کے گھر پر ٹھہرا۔ یمن کے عامل کی شکایت کی کہ اس نے بلا قصور مجھ پر ظلم کیا اور میرا ہاتھ پاؤں کاٹ ڈالا۔ وہ رات کا اکثر حصہ نوافل و تہجد میں گذارتا۔ جسے دیکھ کر جناب صدیق رضی اللہ عنہ بھی کہہ اٹھے کہ تیری رات تو چوروں کی سی رات نہیں لگتی۔ انہیں دنوں آپؓ کی زوجہ محترمہ اسماء بنت عمیسؓ کا ایک زیور گم ہوگیا۔ معلوم ہونے پر سب اہل خانہ اسکو تلاش کرنے لگے چراغ جلا کر کونے کھدرے دیکھے گئے کہ کہیں ادھر اُدھر نہ گر پڑا ہو، اور وہ لنجا، لنگڑا مہمان بھی تلاش کرنے والوں کے درمیان گھومتا پھرتا رہا۔ اور یہ بھی کہتا جاتا کہ خدا اس ظالم کو سزا دے جس نے چوری کر کے بھلے اور نیک لوگوں کے گھر کو غم و فکر سے بھر دیا۔ بالآخر تھک ہار کر اور مایوس ہو کر لوگوں نے تلاش ختم کر دی۔ چند روز بعد وہی زیور ایک سنار کے ہاں پکڑا گیا۔ تفتیش پر اس نے بتایا کہ ایک لنگڑا لنجا شخص مجھے فروخت کر گیا ہے۔ آخر اس چور نے بھی اپنے جرم کا اقرار کر لیا۔ تب جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اس کا بایاں ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا اور فرمایا کہ اس کا اپنے آپ بددعا دینا مجھے اسکی چوری سے زیادہ ناگوار لگتا تھا! ان دو واقعات و روایات کے علاوہ کسی روایت سے یہ ثابت نہیں کہ آپ نے بایاں ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا ہو۔ اور ان کے بارے میں بھی معلوم ہوگیا کہ آپ نے کوئی غلط حکم نہیں دیا تھا۔ اس لئے آپؓ پر طعن و اعتراض کا کوئی جواز نہیں۔ یہ سراسر تعصب و عناد پر مبنی ہے!

(۲) دوسری دلیل (طعن ۱۵ کے سلسلہ کی) یہ ہے، کہ آپ نے لواطت کے مجرم کو زندہ آگ میں جلا دیا۔ حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بطور سزا زندہ جاندار کو آگ میں جلانے سے منع فرمایا ہے۔

جواب :- اس کا جواب مختلف عنوانات سے دیا جا سکتا ہے۔ اوّل یہ کہ لوطی کو جلا دینے کا قصہ جو حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے وہ روایت ضعیف ہے جس کو اہل سنت کو الزام دینے میں حجت قرار نہیں دیا جا سکتا۔ صحیح روایت وہ ہے جو سوید بن غفلہ نے جناب ابوذر رضی اللہ عنہ سے یوں روایت کی ہے۔ اِنَّہٗ اَمَرَبِہٖ فَضُرِبَ عُنُقُہٗ ثُمَّ اَمَرَبِہٖ فَاُحْرِقَ۔ آپ کے حکم سے اس کی گردن ماری گئی۔ پھر آپ نے حکم دیا تو اس کو جلا دیا گیا۔ اور مردہ کو عبرت کی خاطر جلا دینا درست ہے۔ جس طرح مردہ کو عبرت کی خاطر سولی پر کچھ عرصہ کے لیے لٹکا رہنے دینا۔ کیونکہ مردہ کو تو اس عذاب کا کچھ احساس نہیں ہوتا، دکھ درد کا مدار تو حیات پر ہے۔

اور مرتضیٰ کو جو شیعہ علماء میں چوٹی کا شمار ہوتا ہے اور علم الہدیٰ کے لقب سے مشہور ہے، اس روایت کے صحیح ہونے اور پہلی روایت کے غلط ہونے کا معترف ہے۔ تو جو روایت نہ اہل سنت کے نزدیک صحیح ہے نہ شیعوں کے نزدیک، ایسی روایت کو طعن کا مدار ٹھہرانا نہ دلیل اقناعی ہے (یعنی نہ دل کو تسکین دیتا ہے) نہ دلیل الزامی ہے،

دوم یہ کہ ہم نے مان لیا کہ ایک خاص شخص کو جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے جلوا دیا۔ لیکن جناب امیر رضی اللہ عنہ کے ساتھ تو ایسا واقعہ کئی مرتبہ پیش آیا، ایک واقعہ میں تو ایک پوری کی پوری جماعت کو آپؓ نے حوالہ آتش کرنے کا حکم فرمایا۔ دوسری مرتبہ زندیقوں کی ایک بڑی جماعت کو جلا دینے کا حکم دیا جن کے بارے میں بعض کہتے ہیں کہ وہ مرتد ہوگئے تھے اور بعض کہتے ہیں کہ وہ عبداللہ بن سبا کے ساتھیوں میں سے تھے چنانچہ اہل سنت کی اصح الکتب بعد کتاب اللہ، یعنی بخاری میں جناب عکرمہ رضی اللہ عنہ سے یوں روایت ہے۔ اُتِیَ عَلِیٌّ بِزَنَادِقَۃٍ فَاَحْرَقَھُمْ فَبَلَغَ ذٰلِکَ ابْنَ عَبَّاسٍ فَقَالَ لَوْکُنْتُ اَنَا لَمْ اُحْرِقْھُمْ لِاَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا تُعَذِّبُوْا بِعَذَابِ اللّٰہِ۔ علی (رضی اللہ عنہ) کے پاس زندیق لائے گئے، آپ نے ان کو نذر آتش کر دیا۔ جب یہ خبر (حضرت) ابن عباس (رضی اللہ عنہ) کو پہنچی تو آپ نے فرمایا، میں اگر ہوتا تو ان کو نہ جلاتا کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اللہ کے عذاب کی طرح عذاب نہ دو! پھر ایک اور مرتبہ بھی ایسے دو آدمیوں کو زندہ جلوا دیا جو باہم لواطت کے جرم میں پکڑے گئے تھے۔

www.Ahlehaq.com

چنانچہ مشکوٰۃ میں بحوالہ رزین، جناب ابن عباس و جناب ابوہریرہ رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ مَلْعُوْنٌ مَنْ عَمِلَ عَمَلَ قَوْمِ لُوْطٍ ۔ وہ لعنت زدہ ہے جس نے قوم لوط جیسا فعل کیا۔ اور ایک روایت میں جناب ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا اِنَّ عَلِیًّا اَحْرَقَهُمَا۔ جناب علی رضی اللہ عنہ نے دونوں کو جلوا دیا۔

اور اس فرقہ کے بغض و عناد اور تعصب کو دیکھتے ہوئے یہ کچھ بعید بھی نہیں لگتا کہ جناب علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے متعلق اہل سنت کی ان روایات سے انکار ہی نہ کر بیٹھیں۔ حالانکہ خود ان کا طرز عمل یہ ہے کہ جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی شان میں ضعیف و مردود روایات کو بھی مدار طعن بنا ڈالا ہے۔ اس لیے مناسب معلوم ہوا کہ خود شیعوں ہی کی معتبر کتابوں سے اس مضمون کی روایات سامنے لائی جائیں۔ شریف مرتضیٰ نے جو ان کا علم الھدیٰ ہے کتاب تنزیہہ الانبیاء والائمہ میں ایک روایت بیان کی ہے۔ اِنَّ عَلِیًّا اَحْرَقَ رَجُلًا اَتٰی غُلَامًا فِیْ دُبُرِهٖ ۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس شخص کو جلوا دیا جس نے ایک لڑکے کے ساتھ اغلام کیا تھا۔ اس روایت کے پیش نظر اب شیعوں کا کیا منہ ہے کہ وہ جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ پر زبان طعن دراز کریں۔ کیونکہ اب تو ان کے فعل کی ایک "معصوم" کے عمل سے تصدیق ہو گئی ۔

سوم :۔ روایات اہل سنت سے ثابت ہے کہ جناب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جناب علی رضی اللہ عنہ کے مشورہ اور کہنے سے لوطی کو جلایا تھا۔ چنانچہ بیہقی نے شعب الایمان میں اسکی تخریج کی۔ اور ابن ابی الدنیا سے صحیح اسناد سے محمد بن المنکدر سے اسکی روایت کی اور واقدی نے اپنی کتاب الردۃ کے آخری ردہ بنی سلیم میں اس کو نقل کیا ملاحظہ ہو۔

اِنَّ اَبَا بَکْرٍ لَمَّا اسْتَشَارَ الصَّحَابَةَ فِیْ عَذَابِ اللُّوْطِیِّ قَالَ عَلِیٌّ اَرٰی تُحَرِّقُ بِالنَّارِ فَاجْتَمَعَ رَاْیُ الصَّحَابَةِ عَلٰی ذٰلِكَ فَاَمَرَ بِهٖ اَبُوْبَکْرٍ فَاُحْرِقَ بِالنَّارِ۔

جناب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جو لوطی کی سزا کے بارے میں صحابہ کرام سے مشورہ فرمایا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میری رائے تو یہ ہے کہ اسکو آگ میں جلا دیا جائے۔ چنانچہ تمام صحابہ اس رائے پر متفق ہو گئے۔ پس جناب صدیق رضی اللہ عنہ نے حکم صادر فرمایا اور وہ جلا دیا گیا۔

بعض شیعہ راویوں نے مغالطہ دینے کے لیے جو یہ کہا ہے کہ فجاۃ سلمی کو جو راہزن تھا جناب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے آگ میں جلوا دیا اور وہ جل گیا۔ سراسر غلط ہے، صحیح یہ ہے کہ شجاع بن زبرقان کو جو لوطی تھا جناب امیر رضی اللہ عنہ کی رائے سے جلا دینے کا حکم فرمایا تھا۔ اور اگر بالفرض بطور نظام مملکت راہزن کو جلا دینے کا حکم فرمایا تو یہ طعن کا سبب نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ ان کا فعل معصوم کے فعل کے مطابق تھا۔

(۱۴) تیسری دلیل انہوں نے یہ دی کہ جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو جدہ (دادی) اور کلالہ کا مسئلہ معلوم نہ تھا کیونکہ دوسروں سے معلوم کرتے۔

جواب :۔ یہ ہے کہ اعتراض و طعن اہل سنت پر موجب الزام نہیں اس لیے کہ ان کے نزدیک بالفعل تمام احکام کا جاننا امامت و خلافت کے لیے شرط نہیں ہے۔ البتہ اجتہاد اور ملکہ استنباط ضرور شرط ہے۔ اور مجتہد کا یہی کام ہے کہ اول وہ نصوص تلاش کرتا ہے احادیث کی چھان بین کرتا ہے، اگر نص موجود ہو تو اس کے مطابق فتویٰ صادر کرتا ہے۔ اگر نص موجود نہیں پاتا تو ملکہ استنباط سے کام لے کر مسائل مستنبط کرتا ہے، جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے عہد میں نصوص تدوینی شکل میں موجود نہیں تھیں اور احادیث کی روایات نے بھی شہرت نہیں پائی تھی اس لیے بوقت ضرورت مجبوراً صحابہ کی سنی ہوئی روایات کی جستجو فرماتے۔

قَالَ فِیْ شَرْحِ التَّجْرِیْدِ اَمَّا مَسْئَلَةُ الْجَدَّةِ وَالْکَلٰلَةِ فَلَیْسَتْ بِدْعًا مِّنَ الْمُجْتَهِدِیْنَ اِذْ یَبْحَثُوْنَ عَنْ مَدَارِكَ

شرح تجرید میں بیان کیا ہے کہ جدہ اور کلالہ کا مسئلہ مجتہدین کے لئے کوئی انوکھا مسئلہ نہیں ہے۔ کیونکہ یہ دلائل احکام پر بحث کرتے

www.Ahlehaq.com

الْاَحْكَامِ وَيَسْاَلُوْنَ مَنْ اَحَاطَ بِهٖ عِلْمًا وَلِهٰذَا رَجَعَ عَلِیٌّ فِیْ بَیْعِ اُمَّهَاتِ الْاَوْلَادِ اِلٰی قَوْلِ عُمَرَ وَذٰلِكَ لَا یَدُلُّ عَلٰی عَدَمِ عِلْمِهٖ۔

رہتے ہیں اور جس کو کوئی بات معلوم ہو اس سے دریافت کرتے رہتے ہیں۔ اسی لیے حضرت علیؓ نے امہات الاولاد کی بیع کے معاملہ میں حضرت عمر فاروقؓ کے قول کی طرف رجوع کیا۔ اور یہ آپ کی علمی کوتاہی پہ دلالت نہیں کرتا،،

جناب صدیق رضی اللہ عنہ کی تحقیق و تفتیش تو یہ صاف بات بتاتی ہے کہ احکام دین میں آپ کو کتنی احتیاط ملحوظ تھی۔ اور یہ کہ آپ قواعد شریعت میں شرائط کا پورا پورا لحاظ فرماتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جب جناب مغیرہ رضی اللہ عنہ نے جدہ کا مسئلہ ظاہر کیا تو آپؓ نے دریافت فرمایا کہ تمہارے علاوہ کوئی اور بھی روایت ہے۔ یہ آپ کی احتیاط تھی ورنہ روایت میں تعدد شرط نہیں ہے۔ حقیقت میں تو یہ طرز عمل قابل ستائش تھا مگر برا ہو تعصب و عناد کا کہ ان کو تعریف و توصیف بھی قابل طعن نظر آتی ہے کسی شاعر نے کہا ہے۔

چشم اندیشی برکندہ باد؛ عیب نماید ہنرش در نظر! (بداندیش کی آنکھ پھوٹ جائے کہ اس کی نظر میں ہنر بھی عیب دکھائی دیتا ہے)

اگر اس سلسلہ میں کوئی شیعہ یہ کہے کہ امام کے لیے صرف اجتہاد کو کافی سمجھنا تو اہل سنت کا مذہب ہے ہمارے نزدیک تو تمام مسائل شرعیہ کا بالفعل جاننا امام کے لیے شرط ہے، تو ہم انہیں یاد دلائیں گے کہ جب تم نے مطاعن کی بنیاد اہل سنت کے مذہب پر رکھی ہے تو لا محالہ اس سلسلہ میں ان کی قرارداد بھی تسلیم کرنی چاہیے، ورنہ پھر اہل سنت کے نزدیک جناب ابو بکر رضی اللہ عنہ کی خلافت کی نفی جو اس باب کا موضوع ہے ثابت ہی نہ ہو سکے گی! اور اس کی ساری تگ و دو لاحاصل رہیگی۔ اور اگر بہ زبردستی اور بعنادیل پر ہی اڑا رہے تو ہم انہیں کے اصول پر بھی ان کو جواب دے سکتے ہیں، لیجئے ملاحظہ کیجیے!

جواب دوم:— اگر جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو مسئلہ جدہ و کلالہ معلوم نہیں تب بھی ان کی خلافت میں کوئی نقص لازم نہیں آتا کیونکہ شیعی روایت کے مطابق جناب امیر رضی اللہ عنہ کو بھی بعض مسائل معلوم نہ تھے حالانکہ آپ بالاجماع امام برحق تھے۔

چنانچہ عبداللہ بن بشر نے یہ روایت بیان کی ہے کہ اِنَّ عَلِیًّا سُئِلَ عَنْ مَسْئَلَةٍ فَقَالَ لَا عِلْمَ لِیْ بِهَا ثُمَّ قَالَ وَاَبْرَدُهَا عَلٰی كَبِدِیْ سُئِلْتُ عَمَّا لَا اَعْلَمُ۔ جناب امیر رضی اللہ عنہ سے کوئی مسئلہ پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا مجھے معلوم نہیں۔ اور پھر فرمایا میں اپنے دل کو مطمئن پاتا ہوں کہ مجھ سے وہ بات پوچھی گئی جسے میں نہیں جانتا (یعنی مجھے اس سے کوئی گھبراہٹ نہیں ہوتی کہ جو مسئلہ مجھ سے پوچھا گیا اس کا مجھے علم نہ تھا) سعد ابن بن نصر نے بھی ایسی ہی روایت کی ہے! اسی طرح جناب امام ناطق بحق "جعفر صادق رحمہ اللہ علیہ کو بھی بعض مسائل معلوم نہ تھے! جیسا کہ امامیہ میں کے صاحب قرب الاسناد نے اسمٰعیل بن جابر سے روایت کی ہے وہ کہتا ہے۔

قُلْتُ لِاَبِیْ عَبْدِ اللّٰهِ فِیْ طَعَامِ اَهْلِ الْكِتٰبِ فَقَالَ لَا تَاْكُلْهُ ثُمَّ سَكَتَ هُنَيْهَةً ثُمَّ قَالَ لَا تَاْكُلْهُ ثُمَّ سَكَتَ هُنَيْهَةً ثُمَّ قَالَ لَا تَاْكُلْهُ وَلَا تَتْرُكْهُ اِلَّا تَنَزُّهًا اِنَّ فِیْ اٰنِیَتِهِمُ الْخَمْرَ وَلَحْمَ الْخِنْزِیْرِ

میں نے ابی عبداللہؒ سے اہل کتاب کے کھانے سے متعلق بات کی تو آپ نے کہا مت کھاؤ، پھر تھوڑی دیر سوچا اور کہا مت کھاؤ، پھر کچھ دیر سکوت کے بعد فرمایا مت کھاؤ۔ اور یہ ترک طعام بطور احتیاط ہے، اس لیے کہ ان کے برتنوں میں شراب اور سور کا گوشت ہوتا ہے۔

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل کتاب کے طعام کے متعلق آپ کو حتمی جواب معلوم نہ تھا اسی لیے بہت غور و خوض کے بعد بھی حکم صریح معلوم نہ ہو سکا لہٰذا ناچار احتیاط پر عمل کرنے کو فرمایا!

مطاعن عمرؓ سیدنا فاروق اعظم حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ پر شیعوں نے گیارہ طعن توڑے ہیں۔ ان میں سے ان کے خیال میں قصہ قرطاس والا طعن بڑا وزنی ہے۔ آپ بھی دیکھئے!

اعتراض (۱) بروایت بخاری ومسلم (رحمہما اللہ) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آخری مرض میں بروز جمعرات وصال سے چار روز پیشتر مکان میں موجود صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ قلم دوات اور کاغذ میرے پاس لاؤ تاکہ میں تمہارے لئے ایک تحریر لکھ دوں جس سے تم میرے وصال کے بعد نہ بہکو! حاضرین اسکی تعمیل میں مختلف الرائے ہوئے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ (حاضرین سے مخاطب ہو کر) بولے ہمارے پاس تو اللہ کی کتاب قرآن موجود ہے اور وہ ہم کو کافی ہے، اسوقت حضور صلے اللہ علیہ پر مرض کی شدت تھی۔ بعض حضرات نے جناب فاروق رضی اللہ عنہ کی تائید کی، اور بعض نے یہ کہا کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم طلب فرما رہے ہیں تو لے آؤ۔ اس پر باہم جو گفتگو ہوئی اس میں بلند آواز کی وجہ سے شور و شغب کی صورت پیدا ہوئی۔ اسی گفتگو کے دوران بعض نے یہ بھی کہا، کہ مرض کی شدت کی وجہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا فرمادیا، شاید کچھ اور فرمانا چاہتے ہوں گے، اس لئے بات کو واضح طور پر سمجھ لینے کی خاطر کسی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ اس فرمان سے آپ کا کیا ارادہ ہے، اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس وقت تم میرے پاس سے اٹھ جاؤ، کیونکہ رسول اللہ کے روبرو شور شغب (بحثا بحثی) مناسب نہیں۔ غرض اسی بحثا بحثی اور تنازع کے سبب اس تحریر کا معاملہ آیا گیا ہوگیا۔ (اور بعد میں مرض کی کیفیت دگرگوں ہونیکے سبب اس کا موقعہ نہ آیا) تو یہ ہے اہل سنت کی صحیح روایات کے مطابق قصہ قرطاس جس میں اپنی عادت اور خواہش کے مطابق شیعوں نے رنگ آمیزی کر کے کیا سے کیا بنا دیا۔ اس قصہ میں انہوں نے چند پہلو نکال کر حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ پر طعن واعتراض کئے ہیں۔

(۱) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کو رد کیا جو بحکم آیت وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ۔ (وہ اپنی خواہش سے کچھ نہیں فرماتے، وہ وہی فرماتے ہیں جنکی وحی کی جاتی ہے) سراسر وحی تھی، اور وحی کو ٹھکرانا سراسر کفر ہے جیسا کہ فرمان الٰہی ہے وَمَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ (جو خدا کے نازل کردہ کلام کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی کافر ہیں)

(۲) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہ بھی کہا کہ آپ کو ہذیان اور اختلاط کلام کا عارضہ ہوگیا ہے! حالانکہ انبیاء کرام ان امور سے معصوم ہیں۔ جنون انبیاء کرام علیہم السلام کے لئے بالاجماع جائز نہیں ورنہ ان حضرات علیہم السلام کے قول وفعل سے اعتماد اٹھ جائیگا۔ حالانکہ ان کا قول وفعل تمام حالات میں قابل اعتماد اور لائق اتباع ہے۔

(۳) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے روبرو جھگڑا اور شور و شغب کیا۔ حالانکہ آپ صلے اللہ علیہ وسلم کے حضور بلند آوازی گناہ کبیرہ ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں فرمایا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَرْفَعُوا أَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوا لَهُ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ أَنْ تَحْبَطَ أَعْمَالُكُمْ وَأَنْتُمْ لَا تَشْعُرُونَ۔

اے مومنو، نبی کی آواز پر اپنی آواز بلند نہ کرو اور نہ ان سے چلا کر بولو جس طرح ایک دوسرے سے باہم چلا کر بولتے ہو۔ ایسا نہ ہو کہ تمہارے اعمال ضائع ہو جائیں اور تمہیں پتہ تک نہ چلے۔

(۴) امت کی حق تلفی کی، اگر تحریر لکھ لی جاتی تو بعد میں امت گمراہی سے بچ جاتی۔ مگر اب ہر وادی میں لوگ سراسیمہ اور پریشان ہیں۔ اصول وفروع میں بے شمار اختلافات کا شکار ہیں! لہٰذا اس سارے اختلاف کا سارا وبال عمر (فاروق رضی اللہ عنہ) کی گردن پر ہے۔ یہ ہے اس طعن کی تقریر، جس کا ان کے ہاں زور و شور تو بہت ہے، مگر اس سلیقہ اور نظم وترتیب کے ساتھ ان کی کسی کتاب میں

www.Ahlehaq.com

نہیں ملتا۔ (اور جس انداز اور بے سلیقہ و بے نظم ملتا ہے، اس سے کوئی صحیح طور سے ان کے مقصد دینی پر خاطر خواہ مطلع نہیں ہو سکتا بہرحال اب اس طعن کے سلسلہ کی ان باتوں کا جواب ملاحظہ فرمایئے!

جواب:۔ ان چاروں باتوں کا اجمالی جواب تو یہ ہے، کہ یہ سارے کام اکیلے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے سرزد نہیں ہوئے موجودین حجرۂ مبارک سب کے سب اس معاملہ میں دو گروہ ہو گئے تھے، جن میں حضرت عباس اور حضرت علی رضی اللہ عنہما بھی شامل تھے۔ اب اگر یہ دونوں حضرات منع کرنے والوں میں تھے، تو گویا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی رائے سے متفق اور ان کے شریک تھے۔ ایسی صورت میں یہ حضرات بھی ان مطاعن کا نشانہ ہیں! اور اگر یہ اجازت دینے والوں میں تھے، تو پھر بھی بعض مطاعن سے یہ بھی نہیں بچتے۔ ان کا الزام ان پر بھی آئے گا۔ مثلاً ایسے نازک وقت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے روبرو اونچی آواز سے بولنا۔ یا امت کی حق تلفی کا معاملہ! کہ ساتھیوں کے منع کرنے سے رُک گئے، نہ اس وقت لائے نہ بعد میں لائے، جبکہ موقعہ بھی تھا اور پوری فرصت بھی ملی تھی! اس وقت دوات قلم لاکر لکھوا لیتے۔ اس "وحی الٰہی" کے "رد" میں ایک طرح سے یہ بھی شریک ہو گئے! لہٰذا یہ طعن اکیلے عمر فاروق رضی اللہ عنہ پر نہیں لگتا دوسرے سب شرکاء بھی شامل طعن ہیں! جن میں سے بعض، بالاتفاق شیعہ و سنی مطعون نہیں ہو سکتے۔ تو جب طعن، مطعون اور غیر مطعون سب کو شامل ہو تو وہ غیر معتبر ہو جاتا ہے۔ اور جب وہ طعن ہی غیر معتبر ہوا تو اس کے جواب کی ضرورت ہی کیا رہی۔ اور اگر ذرا غور سے کام لیا جائے تو طعن کی وجہ اول بھی سب میں مشترک ہے۔ اس لیے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خطاب مبارک ایتونی بقرطاس سارے ہی حاضرین سے تھا۔ خاص حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے نہیں تھا۔ لہٰذا آپؐ کا یہ حکم وجوب و فرضیت کی حیثیت سے تھا تو سارے کے سارے عدم تعمیل میں گناہ گار ہوئے اور شریعت کے فرمان کے مخالف قرار پائے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس نافرمانی کا سبب حضرت عمر فاروقؓ بنے اور دوسروں نے آپؓ کی بات مان کر حکم رسول کی بجا آوری سے منہ موڑا۔ مگر وَمَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰہُ کی وعید میں بہرحال سب ہی داخل ہوئے۔ گویا نعوذ باللہ عمرؓ کی مثال تو شیطان کی سی ہوئی کہ کافروں کو کفر پر اکساتا ہے اور دوسرے حضرات (رضوان اللہ علیہم) کی مثال کافروں کی مانند ہوئی یہ بات بالکل صاف ہے کہ طعن اکیلے شیطان پر نہیں کیا جاتا ورنہ تو سارے کافر معذور سمجھے جائیں گے کہ وہ بے قصور ہیں۔ بلکہ ماجور! حالانکہ یہ قرآن ہی کے خلاف نہیں، تمام شرائع سابقہ کے بھی خلاف ہے،

اور اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ حکم وجوب و فرضیت کے لیے نہیں بلکہ ارشاد و ہدایت کے طور پر تھا۔ تو جناب عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور دیگر موجودین رضی اللہ عنہم اس کے ترک کی بنا پر مورد طعن نہیں رہتے۔ اور نہ ہی کسی وجہ سے ان کو قابل ملامت کہا جا سکتا ہے۔ کیونکہ محض صلاح و ارشاد پر مبنی احکام کی عدم تعمیل بالاجماع قابل گرفت نہیں ہوتی۔ جیسا آگے ان شاء اللہ بیان کیا جائے گا۔ (اب طعن کی چاروں وجوہ کے جوابات علیحدہ ملاحظہ ہوں)

جواب وجہ (ا)۔ اس وجہ کا مدار اس مفروضہ پر ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے وحی کو رد کر دیا کیونکہ قول پیغمبر وحی ہوتے ہیں، جن پر آیت قرآنی دلیل ہے! مگر اس صورت کے دونوں مقدمے غلط ہیں۔ پہلی بات یہ کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کو رد نہیں کیا بلکہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو آرام و راحت پہنچانا چاہا۔ ان کو یہ گوارہ نہ تھا کہ اس شدت مرض میں آپ کو کسی قسم کی مشقت و رنج پہنچایا جائے۔ (جس کی آنکھوں پر تعصب، بغض و عناد کی پٹی چڑھی ہو وہ معاملہ کا یہ دلآویز پہلو نہیں دیکھ سکتا۔ن) ہر محبت اپنے محبوب کو ہر عالم میں راحت و آرام ہی میں دیکھنا چاہتا ہے۔ اگر وہ محبوب اپنوں کے ساتھ فطری دلبستگی انس و محبت کے سبب بحالت شدت مرض و تکلیف ان کے فائدے اور مصلحت کی خاطر خود پر مشقت برداشت کرکے

کچھ کرنا چاہے تو ہر محب چاہتا ہے کہ اسوقت ان کا دھیان ہٹا کر یا ٹال مٹول کر کے اس مشقت کے الم سے اس کو بچائے۔ اسوقت یہ کہنا کہ آپ کو اس مشقت کے اٹھانے کی ضرورت نہیں۔ آپ نے ہمیں جو کچھ بھی دیدیا ہے یا ہمارے لئے جو کچھ کر دیا ہے، ہمیں بہت ہے، کافی ہے۔ تو اسے عدم تعمیل کوئی شقی القلب اور خود غرض ہی کر سکتا ہے۔ انسانی معاشرہ میں اپنے عزیزوں اور بزرگوں کے ساتھ یہی رویہ اکثر و بیشتر رائج اور معمول یہ رہا ہے۔ پس یہاں بھی حضرت فاروق رضی اللہ عنہ نے جب یہ دیکھا کہ آپ اصحاب اور امت کے فائدہ کی خاطر چاہتے ہیں کہ شدید مرض کی تکلیف کے وقت بھی اپنے اوپر تعب و مشقت برداشت کر کے کوئی تحریر لکھوائیں یا بنفس نفیس خود لکھیں، تو آپؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر مزید مشقت کے بار ڈالنے کو گوارا نہیں فرمایا۔ اور کمال ادب ملحوظ رکھتے ہوئے راہ راست حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب نہیں کیا۔ بلکہ دوسرے رفقاء و احباب سے کہا کہ اسوقت آپؐ کو اس مشقت میں ڈالنے اور مزید تکلیف پہنچانے کی کیا ضرورت ہے! مقصد یہ بھی تھا کہ حضور صلی اللہ کے گوش مبارک تک بھی یہ رائے اور مشورہ پہنچے تاکہ آپ صلے اللہ علیہ وسلم بھی یہ جان جائیں کہ ایسی حالت میں مزید مشقت لاحاصل ہوگی!

حسبنا کتاب اللہ۔ کہہ کر آپؓ نے تکمیل دین و اتمام نعمت رب العلمین والی آیت کی طرف بلیغ اشارہ کر دیا تھا اہل عقل کے نزدیک تو آپ رضی اللہ عنہ کی یہ دقت نظری قابل تحسین و صد آفرین ہونی چاہئے تھی: نہ کہ موجب طعن! یہ آیت اس واقعہ سے تین ماہ پیشتر نازل ہو چکی تھی، اس میں فرمایا گیا ہے۔ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا۔

آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لئے مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت تمام کر دی۔ اور تمہارے لئے بطور دین اسلام کو پسند کیا۔

گویا دین میں نسخ و تبدیلی، نقص و زیادتی کا دروازہ بالکل بند کر دیا اور اس پر اتمام و تکمیل کی مہر لگا دی۔ جناب فاروق رضی اللہ عنہ کا اشارہ اسی آیت کی طرف تھا، اب ظاہر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کوئی ایسی نئی چیز تو لکھنا یا لکھوانا نہ چاہتے ہوں گے جو کتاب و شریعت میں نہ آچکی ہو۔ کیونکہ یہ بات تکمیل دین کے وعدہ الٰہی کے مناسب نہ ہوتی۔ پس معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد یہی ہو سکتا ہے کہ جو احکام سابق میں قرار پا چکے ہیں ان پر مزید تاکید فرمائیں۔ اگر ہم احکام خدا اور رسول پر عامل رہنا چاہیں تو جو تاکیدات فرمان الٰہی میں موجود ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم جو تاکیدات وقتاً فوقتاً فرماتے رہے وہ ہمارے لئے کافی ہیں۔ اس لئے بہتر ہے کہ آپ مزید مشقت نہ فرمائیں اسوقت مناسب اور بہتر یہی ہے کہ آپ زیادہ سے زیادہ سکون اور راحت میں رہیں۔ اور آپؓ کے یہ الفاظ۔

اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَدْ غَلَبَهُ الْوَجَعُ — رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اسوقت مرض کی شدت غالب ہے

وَعِنْدَنَا كِتَابُ اللّٰهِ حَسْبُنَا۔ — ہمارے پاس اللہ کی کتاب ہے جو ہمیں کافی ہے!

اسی ارادہ کی گواہی ہے! لہٰذا معلوم ہوا اس واقعہ میں حکم رد کر دینے کی نسبت حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی طرف کرنا انتہائی کم فہمی، نادانی یا انتہائی عداوت و بغض و عناد پر مبنی ہے،

اور اسی طرح آپس میں ایک دوسرے کے امور میں مصلحت کو مدنظر رکھنا یا مشورہ سے مدد کرنا صحابہ کرام اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مابین ہمیشہ سے ایک معمول بہ طریق رہا ہے! اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ تو اس بارہ میں خاص خصوصیت اور جرأت کے مالک تھے۔ کہ بہت سے معاملات میں مثلاً منافق پر نماز جنازہ پڑھنی ازواج مطہرات (رضی اللہ عنہن) کو پردہ نشین کرنے، غزوہ بدر کے قیدیوں کو قتل کرنے اور مقام ابراہیم کو مصلیٰ بنانے اور اسی قسم کے دیگر امور میں آپ کے مشورہ کے مطابق وحی الٰہی نازل ہو چکی تھی، اور بیشتر مقدمات میں آپ کی صوابدید کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور اللہ تعالیٰ بنظر استحسان دیکھتے۔ اگر اس قسم کے امر مصلحت کو پیش کرنے کے کام کو یہ شیعہ رد وحی، یا قول پیغمبر کا رد کہیں گے تو بات جناب فاروق رضی اللہ عنہ تک ہی نہیں رہیگی بلکہ بعض جگہ جناب

علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ بھی آپؓ کے شانہ بشانہ اس الزام میں شریک نظر آئیں۔ چند مقامات دیکھیے تو۔

الف :۔ بخاری شریف میں بطریق متعدد مروی ہے کہ ایک مرتبہ رات کے وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم جناب امیر اور سیدۃ زہرا رضی اللہ عنہا کے مکان پر تشریف لے گئے۔ اور ان کو نیند سے بیدار کر کے ادائیگی تہجد کے لیے سخت تاکید فرمائی، قُوْمَا فَصَلِّيَا (دونوں اٹھو اور نماز تہجد پڑھو) جواب میں جناب امیر رضی اللہ نے فرمایا وَاللّٰهِ لَا نُصَلِّيْ إِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا (اللہ کی قسم ہم نماز نہیں پڑھیں گے مگر وہی جو اللہ تعالیٰ نے ہم پر فرض کی ہیں) وَإِنَّمَا أَنْفُسُنَا بِيَدِ اللّٰهِ (اور ہمارے دل اللہ کے ہاتھ میں ہیں) وہ توفیق دیتا تو ہم تہجد بھی پڑھتے) یہ جواب سن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کے مکان سے واپس چلے آئے اس وقت آپ اپنی رانوں پر ہاتھ مارتے اور یہ فرماتے جاتے تھے وَكَانَ الْإِنْسَانُ أَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا۔ انسان بہت ہی جھگڑالو ہے) لہٰذا اس قصہ میں جناب امیر رضی اللہ عنہ کی جانب سے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شرعی معاملہ میں جھگڑنا ثابت ہوا ہے مگر چونکہ قرینہ صدق و راستی اور نیک نیتی پر گواہ تھا اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ملامت نہ فرمائی۔

ب :۔ صحیح بخاری میں موجود ہے کہ غزوہ حدیبیہ میں جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور کفار کے مابین صلح نامہ لکھا جا رہا تھا تو جناب امیر رضی اللہ عنہ نے لفظ رسول اللہؐ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے القاب کے بطور لکھ دیا۔ روٴسا کفار نے اس لقب کے لکھنے پر اعتراض کیا، کہ اگر ہم ان کو رسول اللہ، مانتے تو پھر ہمارا جھگڑا ہی کیا تھا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر چند جناب علی رضی اللہ عنہ سے کہا کہ یہ لقب کاٹ دو۔ مگر آپؓ اپنے جزو ایمان، لقب کو کیسے کاٹ دیتے، اس لیے نہیں کاٹا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کو رد کر دیا۔ بالآخر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صلحنامہ آپ کے ہاتھ سے لیکر خود مٹایا۔

لیکن اہل سنت اس قسم کے رویہ کو نہ مخالف رسول جانتے ہیں نہ کہتے ہیں، اور جناب امیر رضی اللہ عنہ کے اس مخالفانہ طرز عمل پر ان پر طعن بھی نہیں کرتے! اس لیے جناب فاروق اعظم رضی اللہ عنہ پر وہ کیوں طعن کریں گے! اور اگر شیعہ اس قسم کے امور کو قول رسول کی تردید کہنے پر ہی اصرار کرتے رہے تو پھر وہ اپنے پاؤں پر گویا خود ہی کلہاڑی ماریں گے۔ اور قیل و قال کی راہ اپنے اوپر تنگ کریں گے کیونکہ اس فرقہ کی اپنی کتابوں میں جناب امیر رضی اللہ عنہ سے متعلق اس قسم کی مخالفت اور مصلحت اور مشورے پیش کرنے کے واقعات موجود مرقوم ہیں۔ چنانچہ شریف مرتضیٰ نے جو ان کے ہاں علم الھدیٰ کے لقب سے مشہور ہے! اپنی کتاب الغرر والدرر میں جناب محمد بن الحنفیہ رحمہ اللہ علیہ کے حوالہ سے جناب امیر رضی اللہ عنہ سے روایت درج کی ہے کہ وہ فرماتے ہیں۔

قَدْ أَكْثَرَ النَّاسُ عَلَى مَارِيَةَ الْقِبْطِيَّةِ أُمِّ إِبْرَاهِيمَ بْنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي ابْنِ عَمٍّ لَهَا قِبْطِيٍّ كَانَ يَزُوْرُهَا وَيَخْتَلِفُ إِلَيْهَا فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خُذْ هٰذَا السَّيْفَ وَانْطَلِقْ فَإِنْ وَجَدْتَهُ عِنْدَهَا فَاقْتُلْهُ فَلَمَّا أَقْبَلْتُ نَحْوَهُ عَلِمَ أَنِّيْ أُرِيْدُهُ فَأَتَى نَخْلَةً فَرَقِيَ إِلَيْهَا ثُمَّ رَمَى بِنَفْسِهِ عَلَى قَفَاهُ وَشَغَرَ بِرِجْلَيْهِ فَإِذَا بِهِ أَجَبُّ وَأَمْسَحُ لَيْسَ لَهُ مَا لِلرِّجَالِ لَا قَلِيْلٌ وَلَا كَثِيْرٌ قَالَ فَغَمَدْتُ السَّيْفَ وَرَجَعْتُ إِلَى

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادے ابراہیم (علیہ السلام) کی والدہ جنابہ ماریہ قبطیہؓ اور ان کے چچازاد بھائی قبطی کے متعلق جس کی آپؓ کے ہاں آمد و رفت تھی لوگوں نے اتہام کے طور پر بہت باتیں بنائیں تو حضور صلی اللہ علیہ نے مجھ سے فرمایا یہ تلوار لو اور جاؤ۔ اگر وہ ان کے پاس ہو تو قتل کر ڈالو، میں وہاں گیا، وہ مجھے دیکھ کر اور میرا ارادہ بھانپ کر وہاں سے بھاگ کر کھجور کے درخت پر جا چڑھا۔ پھر وہاں سے گدی کے بل زمین پر اپنے آپ کو گرا کر دونوں ٹانگیں اوپر اٹھا دیں۔ تو میں نے دیکھا کہ اس کے تو مردانہ عضو ہے ہی نہیں۔ یہ دیکھ کر میں نے تلوار میان میں ڈالی

النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَاَخْبَرَتْہُ فَقَالَ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ یُصْرِفُ عَنَّا الرِّجْسَ اَھْلَ الْبَیْتِ۔

اور رسول اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں واپس آکر ساری صورت واقعہ عرض کی، تب آپ نے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کرتے ہوئے فرمایا سب اللہ کے لئے ہے جو ہم اہل بیت سے ہر گندگی و بُرائی کو ٹالتا ہے۔

یہ روایت واضح کرتی ہے کہ جناب ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہ اہل بیت سے تھیں اور آیت تطہیر میں داخل۔ اور خدا کا شکر ہے کہ رحمت سب کو شامل ہوئی اور نعمت سب پر عام۔ (اب یہ شیعہ بتائیں کہ جب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر نطق وحی واجب الاتباع ہے تو یہاں جناب امیر رضی اللہ عنہ نے اس پر عمل کیوں نہیں فرمایا۔ ہمارے نزدیک تو آپ کا یہ فعل عین حق تھا اور آپؓ پر کوئی طعن یا اعتراض نہیں۔ البتہ شیعوں کے لئے لمحۂ فکریہ ضرور ہے۔ (ن) محمد بن بابویہ نے آمالی میں اور دیلمی نے ارشاد القلوب میں یہ روایت بیان کی ہے!

اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَعْطٰی فَاطِمَۃَ سَبْعَۃَ دَرَاھِمَ وَقَالَ اَعْطِیْھَا عَلِیًّا وَمُرِیْہِ اَنْ یَشْتَرِیَ لِاَھْلِ بَیْتِہٖ طَعَامًا فَقَدْ غَلَبَھُمُ الْجُوْعُ فَاَعْطَتْھَا عَلِیًّا وَقَالَتْ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَمَرَکَ اَنْ تَبْتَاعَ لَنَا طَعَامًا فَاَخَذَھَا عَلِیٌّ وَخَرَجَ مِنْ بَیْتِہٖ لِیَبْتَاعَ طَعَامًا لِاَھْلِ بَیْتِہٖ فَسَمِعَ رَجُلًا یَقُوْلُ مَنْ یُقْرِضُ الْمَلِیَّ الْوَفِیَّ فَاَعْطَاہُ الدَّرَاھِمَ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جناب سیدہ زہراء رضی اللہ عنہا کو سات درہم عنایت فرما کر فرمایا کہ یہ علی رضی اللہ عنہ کو دے دینا اور کہنا کہ اس رقم سے اپنے اہل و عیال کے لئے کھانا لے آنا کیونکہ وہ بھوک سے بہت پریشان۔ پس وہ رقم سیدہؓ نے جناب علی کو دی اور کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ان سے ہمارے لئے کھانا خرید لائیں۔ آپ وہ رقم لے کر گھر سے نکلے کہ اہل خانہ کیلئے کھانا لے آئیں کہ ایک آدمی کو یہ کہتے سنا کہ سچے وعدہ پر کون قرض دیتا ہے آپؓ نے وہ درہم اسے دے ڈالے"۔

اس قصہ سے تین باتیں معلوم ہوئیں (۱) رسول اللہ کی مخالفت (۲) دوسرے کے مال میں بلا اجازت تصرف (۳) اہل و عیال کی حق تلفی اور بہت ہی قریب، عزیز دں۔ یعنی بیوی بچوں کے ساتھ قطع رحمی نیز یہ بات بھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد و جگر کے ٹکڑوں کو بھوکا رکھ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دکھ پہنچایا۔ لیکن یہ سب کچھ اللہ کے لئے اللہ کی طاعت میں تھا اور نیت بخیر تھی اس لئے مقبول اور قابل تحسین و تعریف ہوا۔ اس پر کوئی عتاب یا ناراضگی کا اظہار نہیں ہوا۔

اور قرائن سے جناب امیر رضی اللہ عنہ کو یہ بات معلوم تھی کہ اصحاب حقوق یعنی بیوی بچے اس ایثار اور نیک کام پر رضامند اور خوش ہوں گے اور جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم بھی اسے جائز قرار دیں گے۔

اب رہی بات دوسرے مقدمہ کی! کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام اقوال وحی ہیں۔ یہ دلیل عقلی اور نقلی دونوں لحاظ سے درست نہیں۔ عقلی دلیل سے تو اس طور کہ ہر سمجھ دار بخوبی جانتا ہے کہ رسول کے معنی پیغام پہنچانے والے کے ہیں۔ اور جب اسکی اضافت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو مطلب ہوتا ہے "اللہ کا پیغام پہنچانے والا" اب رسالت کے معنے صرف یہ ہوئے۔ کہ ان کے پاس اللہ کا پیغام آئے اور ان کے ذریعہ وہ پیغام ہم تک پہنچے۔ یہ معنے نہیں کہ ان کا ہر فرمان، اللہ کا پیغام! آیت وَمَا یَنْطِقُ الخ قرآن کے ساتھ خاص ہے۔ عَلَّمَہٗ شَدِیْدُ الْقُوٰی۔ اس کی دلیل ہے۔ یہ آیت پیغمبر کے تمام اقوال کو شامل نہیں۔ اس کی مثال دنیاوی امور میں ہمارے سامنے روزمرہ رہتی ہے، کہ کسی حاکم، عامل، یا بادشاہ کے ایلچی کی، ہر بات اور ہر قول بادشاہ کی طرف سے نہیں سمجھا جاتا، (یہاں ایک بات عزد ذہن نشین کرلی جائے، کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیغمبرانہ حیثیت کے علاوہ ایک اور حیثیت "منشائے الٰہی سمجھنے والے" کی بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کے بارے میں فرمایا ہے کہ "رسول تمکو جو کچھ دے پس اسے لے لو، اور جس بات سے روکے اس سے رک جاؤ" یہ آیت میرے خیال میں اس طرف اشارہ کر رہی ہے کہ آپ رسول اللہ ہونے کے ساتھ مقتدا و پیشوا، اور مصلح امت بھی ہیں۔ اور امت پر

www.Ahlehaq.com

تحقیق اور اس کے خیر خواہ بھی! اس کے پیش نظر یہ کہا جائے گا کہ آپ کا ہر حکم خواہ اس کے ساتھ وحی کا حوالہ ہو یا نہ ہو، قابل اتباع ہوگا۔
البتہ اس کی حیثیت متعین کرنے کے لیے کہ وہ حکم الٰہی ہے۔ یا آپ کی رائے بطور مشورہ، یا وہ واجب الاتباع ہے، یا حکم استحسان اور مندوب، آپ سے استفسار کیا جانا معیوب یا موجب طعن نہیں ہوگا۔ اور ایسے حکم کی عدم تعمیل کو جو مندوب ہو، یا قرائن سے معلوم ہو کہ یہ پہلو ملحوظ ہے یا امر ادرسول سے گنجائش معلوم ہوتی ہو، اسے رد وحی نہیں کہیں گے۔ نعمانی)
اور نقلی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام اقوال وحی منزل من اللہ کے درجے کے ہوتے تو آپ کے بعض اقوال پر قرآن مجید میں گرفت اور سرزنش نہ ہوتی حالانکہ بعض مقامات پر تو سرزنش کا لہجہ خاصا سخت بھی ہے۔ ایک جگہ ارشاد ہے۔
عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ۔ اللہ تعالیٰ آپ کو معاف کر لے۔ آپ نے ان کو کیوں اجازت دی۔ دوسری جگہ فرمایا۔
وَلَا تَكُنْ لِّلْخَآئِنِيْنَ خَصِيْمًا وَّ اسْتَغْفِرِ اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا وَلَا تُجَادِلْ عَنِ الَّذِيْنَ يَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَهُمْ
آپ خیانت کرنے والوں کے طرفدار نہ بنیے اللہ سے مغفرت طلب کیجیے، بے شک اللہ تعالیٰ غفور بھی ہے رحیم بھی۔ اور جو لوگ اپنا ہی نقصان کرتے ہیں آپ ان کی جوابدہی نہ کیجیے! ایک اور جگہ۔ لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيْمَآ اَخَذْتُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ۔
اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے پہلے سے فیصلہ نہ کر دیا گیا ہوتا تو آپ نے ان سے جو کچھ لیا ہے پاداش میں دردناک عذاب کی صورت پکڑ ہوتی۔
دوسرے یہ کہ اگر ایسا ہوتا تو قبطی کے قتل کا حکم، طعام کی خرید، فقط رسول اللہ کے مٹانے اور تہجد کا حکم سارے منزل من اللہ ہوتے اور جناب امیر رضی اللہ عنہ رد وحی کے مرتکب قرار پاتے اور اگر ایسا ہوتا تو پھر وشاورھم فی الامر۔ سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مشورہ کرنے کا حکم دینا بے معنی بات ہوئی، اور پھر بعض امور میں بعض صحابہ کی اطاعت کس معنی پر محمول کی جائے گی جس کی طرف آیت لَوْ يُطِيْعُكُمْ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنَ الْاَمْرِ لَعَنِتُّمْ۔ اگر وہ بہت سے کاموں میں تمہاری اطاعت کریں تو تم دشواری میں پڑ جاؤ گا اشارہ کرتی ہے! اور پھر یہ بھی ہے کہ غزوہ تبوک کے موقعہ پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مدینہ میں اہل وعیال کی حفاظت و نگہداشت پر مقرر فرمایا تو آپ نے معترضانہ لہجہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا۔
اَتُخَلِّفُنِيْ فِي النِّسَآءِ وَالصِّبْيَانِ۔ کیا آپ مجھے عورتوں اور بچوں میں چھوڑے جا رہے ہیں! (یعنی کیا میری حیثیت آپ کی نظر میں ایسی رہ گئی ہے کہ میدان جہاد میں شرکت کے بجائے عورتوں بچوں کے ساتھ رہوں) تو یہاں وحی الٰہی کے مقابلہ میں اعتراض کرنا کب جائز ہوتا! اور اصول امامیہ کو دیکھا جائے تو ان کے ہاں تو تمام اقوال رسول نہ وحی ہیں اور نہ ان کے نزدیک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام افعال واجب الاتباع ہیں۔
لہٰذا جناب فاروق اعظم رضی اللہ عنہ پر طعن کے اس فاسد، باطل اور غلط مقدمہ کو جو نہ تو واقعہ کے مطابق ہے، اور نہ خود ان کے مذہب کے موافق اور نہ ہی مد مقابل کے مذہب کے موافق۔ اس طعن کی تکمیل و ترویج کی خاطر ذکر کرنا تعصب وعناد، بغض و حسد کا بدترین مظاہرہ ہے،
اب ہم اس معاملہ کو اقوال پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے اونچی سطح پر رکھ کر تجزیہ کرتے اور کہتے ہیں کہ شیعہ وسنی ہر دو کے نزدیک مصلحت پیش کرنا۔ مشقت سے بچنے کی صورت نکالنا۔ اور حکم الٰہی بلا واسطہ کو جو قطعی طور پر وحی منزل من اللہ ہے، کے خلاف اصرار اور بار بار اس میں ترمیم کی درخواست رد وحی شمار نہیں ہوتا۔
چنانچہ شب معراج بسلسلہ نماز کی فرضیت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بمشورہ پیغمبر اولوالعزم حضرت موسیٰ علیہ السلام نو مرتبہ مراجعت فرمائی اور بارگاہ الٰہی میں عرض پرداز ہوئے، کہ اس حکم کو میری امت برداشت نہ کر سکیگی اس میں تخفیف فرما دیجیے،

WWW.Ahlehaq.com

یہ بات خود ابن بابویہ نے کتاب المعراج میں لکھی ہے۔ اگر یہ امر رد وحی ہوتا تو پیغمبران عظام علیہما الصلوٰۃ والسلام سے اس کا صدور کیسے ہوتا! لہٰذا ایسے امور کو رد وحی کہنا کسی مومن سے تو متوقع نہیں ایسا تو کوئی ملحد و زندیق ہی کہہ سکتا ہے۔ اس کے علاوہ بلا واسطہ حکم الٰہی میں سوال و جواب اور لوٹ پلٹ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سلسلہ میں خود قرآن مجید میں موجود ہے۔

وَاِذْ نَادٰی رَبُّكَ مُوْسٰی اَنِ ائْتِ الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ قَوْمَ فِرْعَوْنَ اَلَا یَتَّقُوْنَ. قَالَ رَبِّ اِنِّیْٓ اَخَافُ اَنْ یُّكَذِّبُوْنِ وَیَضِیْقُ صَدْرِیْ وَلَا یَنْطَلِقُ لِسَانِیْ فَاَرْسِلْ اِلٰی هٰرُوْنَ. وَلَهُمْ عَلَیَّ ذَنْبٌ فَاَخَافُ اَنْ یَّقْتُلُوْنِ. قَالَ كَلَّا فَاذْهَبَا بِاٰیٰتِنَآ اِنَّا مَعَكُمْ مُّسْتَمِعُوْنَ.

جب موسیٰ (علیہ السلام) سے تمہارے رب نے واضح طور پر کہا کہ فرعون کی ظالم قوم کے پاس جاؤ وہ نڈر اور بے خوف ہو گئی ہے۔ تو موسیٰ نے کہا کہ اے میرے رب مجھے خطرہ ہے وہ مجھے جھٹلا دینگے۔ میرے سینہ کے اندر گھٹن بھی ہوتی ہے اور زبان بھی (بوجہ لکنت) نہیں چلتی، آپ ہارونؑ کے پاس بھی وحی بھیجیے اور ان کا ایک گناہ بھی مجھ پر ہے سو ڈرتا ہوں وہ مجھے قتل نہ کر دیں۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ ان کی مجال نہیں! تم دونوں ہماری نشانیاں لے کر جاؤ ہم تمہارے ساتھ ہی ہیں۔ اور سنتے ہیں۔

اور پھر یہ بات شیعوں کے ہاں اصولی طور پر طے شدہ ہے کہ رسول ہی نہیں بلکہ خدا کے بھی بلا واسطہ حکم کا تقاضا یقینی وجوب نہیں ہوتا اس میں مندوب و مستحب کا احتمال بھی ہوتا ہے۔ لہٰذا دونوں شقوں میں سے ایک شق کی وضاحت و تعین کے لیے استفسار اور لوٹ پلٹ ہو سکتی ہے۔ چنانچہ مرتضیٰ شریف کی الغرر والدرر میں اس کا ذکر موجود ہے! جب یہ بات ہے تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا اس حکم کے بارے میں استفسار اور اس کو لوٹانے میں کیا قصور اور کون سا گناہ تھا۔ ان کی نیت و ارادہ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تکلیف و مشقت میں تخفیف تھا، اور ثبوت میں آیت قرآنی بھی پیش کر رہے تھے جس سے بھی بظاہر اس حکم کے مندوب ہونے کا پتہ چل رہا تھا

جواب وجہ (۲)۔ کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اختلاط کلام (بہکی بہکی باتیں کرنا) کی نسبت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کی" اور یہ بات بھی درست نہیں۔ اس لیے کہ ان کے پاس اس کا کیا ثبوت ہے، اور یقین کے وہ کونسے ذرائع ہیں جو یہ بتائیں کہ اَهَجَرَ اِسْتَفْهِمُوْهُ (کیا یہ بات عجیب ہے پھر اسکو پوچھ لو) کے الفاظ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی زبان سے نکلے۔ اکثر روایات میں "قالوا" کا لفظ ہے جو کسی قائل کی تصریح نہیں کرتا۔ ممکن ہے یہ حامیان تحریر کے منہ سے نکلا ہو، اور استفہام انکاری کے طور پر اپنے قول کی تائید میں بولا ہو۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ یہ تو طے شدہ ہے کہ ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے کوئی بہکی بات نہیں نکلتی، لہٰذا تعمیل حکم کے لیے یہ پوچھ لیں کہ آپ کیا لکھوانا چاہتے ہیں، اسی کے ساتھ احتمال دوسرے پہلو کا بھی ہے کہ مخالفین تحریر نے یہ بات بطور استفہام انکاری کہی ہو، یعنی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم بہکی بات کیوں کہنے لگے مگر آپ کے اس فرمان کا مطلب سمجھ میں نہیں آیا پھر پوچھ کر دیکھ لو کہ واقعی کچھ لکھنا لکھانا ہی مراد ہے یا کچھ اور مقصد ہے! اور بظاہر حالات بھی اس کلمہ کا نہ سمجھا جانا ہی محتمل تھا۔ کیونکہ نبی رحمت صلے اللہ علیہ وسلم کی عادت مبارکہ یہ تھی کہ احکام الٰہی کو خدا کی طرف منسوب کر کے ذکر فرماتے اور یہاں آپ نے یہ نسبت ذکر کر کے یہ نہیں فرمایا۔ اِنَّ اللّٰهَ اَمَرَنِیْ اَنْ اَكْتُبَ لَكُمْ كِتَابًا لَنْ تَضِلُّوْا بَعْدِیْ۔ کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم فرمایا ہے کہ میں تمہارے لیے ایک تحریر لکھ جاؤں کہ میرے بعد تم بہک نہ سکو! مانعین تحریر اس شبہ میں پڑ گئے کہ ممکن ہے آپ نے اپنی عادت شریفہ کے مطابق ہی فرمایا ہو مگر ہماری سمجھ میں نہیں آیا لہٰذا تحقیق کر لینی چاہیئے! اور پھر یہ بات قطعی طور پر سب کے علم میں تھی، کہ آپ نے عمر بھر، نہ کوئی تحریر لکھی، نہ اسکی آپ کو مشق تھی۔ اور نہ ہی (بطور معجزہ سہی) یہ ہنر آپ سے کبھی ظہور میں آیا۔ آپؐ کے اُمّی ہونے کی تصدیق قرآن مجید نے بھی کی ہوئی تھی۔

پھر جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کتابت کی نسبت اپنی طرف فرما کر یہ فرمایا کہ اُکتُب لکم کتابا. (کہ میں تمہارے لئے تحریر لکھوں) یہ اچھنبے کی بات تھی، کہ آخر اس کے کیا معنی ہیں. اسکو پوچھنا چاہیئے. کیونکہ کلام پیغمبر کو ہذیان تو کہہ نہیں سکتے!

علاوہ ازیں یہ بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت مبارکہ تھی کہ قرآن مجید کے علاوہ کوئی اور چیز نہیں لکھوایا کرتے تھے. بلکہ کسی اور تحریر کا پڑھنا پسند بھی نہیں تھا ایک مرتبہ جناب فاروق رضی اللہ عنہ توریت کا نسخہ کہیں سے لائے اور اسے پڑھنے لگے تو آپ نے منع فرمادیا! اور اس وقت آپ نے قرآن کے علاوہ کچھ اور بدست خود لکھنے کو فرمایا تو حاضرین کو بہت تعجب ہوا. اور اسے سلجھانے سے عاجز رہے. اس لئے ہو سکتا ہے کہ بطور استفہام انکاری یا تعجبی، کسی کی زبان پہ یہ لفظ آگیا ہو. اگر ان کو ہذیان کا یقین ہوتا یا آپ کے کلام پہ ہذیان لاحق ہونا ان کے وہم و گمان میں بھی ہوتا تو یہ کبھی نہ کہتے کہ پھر پوچھو! بلکہ یہ کہتے اس کے پیچھے مت پڑو یہ تو ہذیان ہے اس کا کیا اعتبار!

اب یہاں اس جملہ ا ھجر الخ کی تفصیل ملاحظہ ہو، لغت عرب میں ھجر کے معنے اختلاط کلام کے ہیں کہ بات سمجھی نہ جائے. اور یہ اختلاط دو قسم کا ہوتا ہے. گرفتگی آواز کی وجہ سے (گلا بیٹھ جانا) زبان پر خشکی کے غالب آجانے کے باعث، اعضائے تکلم وگفتگو کے کمزور پڑ جانے کے سبب، ایسا ہو جاتا ہے کہ الفاظ صحیح مخارج سے خاطر خواہ طور پہ نہ نکل سکیں، الفاظ بھی مرز... نہ ... یا ٹوٹ ٹوٹ کر ادا ہوں یہ اختلاط کلام کی پہلی قسم ہے، یہ عارضہ پیغمبران کرام علیہم السلام کو بھی لاحق ہو سکتا ہے اور اس سے کسی کو انکار نہیں. مگر اس عارضہ کے لاحق ہونے سے کسی وصف پیغمبری میں کوئی نقص یا عیب ہرگز پیدا نہیں ہوتا کیونکہ یہ مرض و بیماری کے اعراض و توابع ہیں. باتفاق اہل سیر، مرض الوصال میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو گرفتگی آواز کا عارضہ لاحق ہو گیا تھا. احادیث کتب صحیحہ میں یہ بات ملتی ہے.

اختلاط کی دوسری قسم یہ کہ غشی (بیہوشی) کے سبب اور تپ ہائے محرقہ میں دماغ کی طرف بخارات کے صعود کے باعث اکثر اوقات ایسا ہوتا ہے کہ بے ربط یا خلاف مقصود کلام زبان پر جاری ہو جائے. یہ کیفیت گو امور بدنیہ کے سبب پیدا ہوتی ہے. لیکن چونکہ یہ روح اور قوت مدرکہ پہ اثر انداز ہو جاتی ہے اس لئے انبیاء کرام علیہم السلام کو یہ کیفیت لاحق ہونے اور نہ ہونے میں علماء کی آراء میں اختلاف ہے، جو حضرات، اسے جنون پر قیاس کرتے ہیں وہ اسے انبیاء کے لئے ممتنع قرار دیتے ہیں. اور جو حضرات اسے نیند پر قیاس کرتے ہیں وہ اسے جائز سمجھتے ہیں، اور اس میں تو کوئی شک نہیں کہ اس اختلاط کا دوسرا سبب یعنی بے ہوشی انبیاء علیہم السلام کو بھی لاحق ہوتی ہے. فَخَرَّ مُوسٰی صَعِقًا. (موسیٰ بیہوش ہو کر گر پڑے) تو قرآن مجید میں بھی آیا ہے) اسی طرح صور قیامت پھونکے جانے کے وقت سوائے موسیٰ علیہ السلام کے سب کا بیہوش ہو جانا صحیح بھی ہے اور ثابت بھی. وَنُفِخَ فِی الصُّوْرِ فَصَعِقَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِی الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰہُ. اور جب صور پھونکا جائے گا تو جو آسمانوں اور زمین میں ہیں سب بیہوش ہو جائیں گے، مگر جسے اللہ چاہے. (وہ بیہوش نہیں ہوگا) اور حدیث صحیح میں یوں آیا ہے کہ فَاَکُوْنُ اَوَّلَ مَنْ یُّفِیْقُ فَاِذَا مُوْسٰی اٰخِذٌ بِقَائِمَۃٍ مِّنْ قَوَائِمِ الْعَرْشِ فَلَا اَدْرِیْ اَصَعِقَ فَاَفَاقَ قَبْلِیْ اَمْ جُوْزِیَ بِصَعْقَۃِ الطُّوْرِ. سب سے پہلے ہوش میں آنے والا میں ہوں گا. تو موسیٰ علیہ السلام نظر آئیں گے جو عرش کے پایوں میں سے ایک پایہ پکڑے کھڑے ہوں گے. اب یہ پتہ نہیں کہ وہ بیہوش ہوئے اور مجھ سے پہلے ہوش میں آگئے. یا ان کی طور کی بیہوشی آجکی بیہوشی کا بدل ہو گئی.

ہاں یہ بات ضرور ہے کہ اپنی کرامت اور بزرگی کے ساتھ غشی و بیہوشی کے وقت بھی اللہ تعالیٰ انبیاء علیہ السلام کو اپنی مرضی کے خلاف قول و فعل کے صدور سے بچائے رکھتا ہے (انکی عصمت اس حال میں بھی قائم و باقی اور فعال رہتی ہے)، بہر حال میں ان سے رضائے الٰہی ہی کی بات صادر ہوتی ہے! اور یہ بالکل ظاہر ہے ایسی حالت کو جنون پہ بالکل قیاس نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ جنون میں اول ...

www.Ahlehaq.com

کے قوائے مدرکہ میں اختلال پیدا ہو کر جم جاتا ہے، اور یہ اختلال جاری رہتا ہے زائل نہیں ہوتا۔ اسی لئے جنون کی حالت رہتی ہے بخلاف اس حالت کے کہ یہاں روح ہر اختلال سے بالکل محفوظ رہتی ہے البتہ اعضائے جسمانی مخالف اثر کے علبہ پانے کی وجہ سے اور اس کے دفعیہ کے لیے روح کا مصروف بکار ہونے کے سبب روح کے زیر فرمان نہیں رہتے اسی لئے یہ حالت نہ جمتی ہے اور نہ دیرپا ہوتی ہے۔ یہ بالکل نیند کے مانند ہے جو انبیاء کو لاحق ہوتی ہے۔ اور جاگنے میں اور اس میں بہت فرق ہے۔ ہاں اتنا ہے کہ نیند میں ان حضرات کا قلب بیدار و آگاہ اور خبردار رہتا ہے، مگر بیہوشی میں بھی نیند کے وہ تمام آثار جو اعضائے جسمانی، آنکھ کان سے متعلق ہیں مرتب ہوتے ہیں اور نماز کا قضا ہو جانا یا وقت کے گذر جانے کی خبر نہ ہونا یہ حالت ان حضرات کرام کو بھی پیش آتے ہیں جیسا کہ کافی کلینی میں حدیث لیلۃ التعریس کے ضمن میں مذکور ہے۔ اسی طرح انبیاء کرام علیہم السلام کو اپنی نمازوں میں سہو و نسیان لاحق ہوتا ہے چنانچہ امامیہ کی کتب صحاح میں انبیاء و ائمہ سے سہو و نسیان کی روایات بیان کی گئی ہیں۔

اس واقعہ میں بھی جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دجوہ کثیر خلاف عادت شریفہ باتیں ظہور میں آئیں، جسکی تفصیل ابھی مذکور ہوئی، ایسی حالت میں حاضرین میں سے کسی کو یہ وہم ہو گیا ہو کہ کہیں یہ کلام بھی اختلاط کلام کی قسم سے نہ ہو جو اس جیسی بیماری میں رونما ہو جاتا ہے تو اس میں بعید از عقل کیا بات ہے، اور نہ یہ محل طعن و تشنیع ہو سکتا ہے۔ خصوصاً ایسی حالت میں جبکہ آپ شدید درد سر اور دہکتے بخار میں مبتلا بھی ہوں۔ اور دوسری روایت سے تو یہ معنی اور تعجب صاف سمجھا جا سکتا ہے جس کے الفاظ یہ ہیں۔ **مَاشَانُہٗ اَھَجَرَ اِسْتَفْھِمُوْہُ** (آپ کا کیا حال ہے کیا اختلاط کلام ہے، ذرا پوچھو تو۔) اس پر کہنے والا ادب کی رعایت کرتے ہوئے اظہار یقین نہیں کرتا بلکہ بطور شک کہہ رہا ہے، ممکن ہے، ایسا نہ ہو اور ہم ہی آپ کا مفہوم نہ سمجھ پا رہے ہوں، دوبارہ دریافت کر کے بات کو واضح کرا لینا چاہیئے! اور یہ گفتگو تو اس تقدیر پر ہے کہ اختلاط کی دوسری قسم بیہوشی مراد لیں، اور اگر قسم اول مراد لیں (اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حاضرین کے مشورہ کی وجہ سے اپنے پاس سے اٹھ جانے کے متعلق جو ارشاد فرمایا اس سے بھی یہی معلوم ہوا کہ آپ پر بیہوشی طاری نہیں تھی بلکہ مرض کی شدت والی صورت تھی۔ ن) تو اس جملہ کا مطلب یہ ہوگا کہ شدت مرض کی وجہ سے آپ کے فرمان کے الفاظ ممکن ہے ہم پورے طور پر نہ سمجھ سکے ہوں، آپ سے استصواب کر کے مراد متعین کرا لیں تاکہ آپ کے ارشاد کی تعمیل پورے اور صحیح طور پر انجام دے سکیں اس صورت میں کوئی اشکال نہ رہا۔

جواب وجہ (۳۳)۔ یہ وجہ سراسر غلط فہمی اور حق سے چشم پوشی پر مبنی ہے، اس لئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز پر اپنی آواز بلند کرنا بے شک ممنوع اور ناجائز ہے مگر اس قصہ میں تو کسی سے بھی یہ حرکت سرزد نہیں ہوئی، نہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے نہ کسی اور سے! اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں تو حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی باہمی گفتگو کی آواز بلند ہو ہی جاتی رہی ہے، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے کبھی منع نہیں فرمایا، بلکہ آیت قرآن مجید سے تو اس کا جواز معلوم ہوتا ہے۔ آیت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز پر اپنی آواز اونچی کرنے کی ممانعت ہے۔ اگر آپ کی مجلس میں باہمی گفتگو میں بلندی آواز ممنوع ہوتی تو آیت کے الفاظ اس طرح ہوتے **لَاتَرْفَعُوْا اَصْوَاتَکُمْ بَیْنَکُمْ عِنْدَ النَّبِیِّ**۔ (نبی کے پاس بیٹھ کر باہم بلند آواز سے نہ بولا کرو)

دراصل آیت کا مفہوم صحیح طور پر متعین کر لیا جائے تو یہ اعتراض کرنے کی گنجائش ہی نہ رہے۔ میرے خیال میں آیت کا مفہوم یہ ہے۔ کہ (۱) جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم گفتگو فرما رہے ہوں تو آواز پر اپنی آواز بلند کر کے آپ کی گفتگو میں خلل نہ ڈالو، کہ اس سے دوسرے لوگوں تک آپ کی آواز پہنچنے میں رکاوٹ ہوگی۔ اور پورے مجمع تک آپ کی آواز صحیح طور پر نہ پہنچنے کے سبب احکام کی صحیح تبلیغ میں

نقص واقع ہوگا۔ اسی لیئے آپ کی آواز پر آواز کا بلند کرنا گناہ کبیرہ اور حرام قرار پایا۔

(۴) حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے گفتگو میں اس کا خیال رکھو کہ جس میانہ روی سے آپ گفتگو فرما رہے ہوں حاضرین کو بھی آپ سے گفتگو اسی لہجہ اور انداز میں کرنی چاہیئے۔ آپ نے کوئی بات مدھم لہجہ میں فرمائی تو آیت کہتی ہے تم جواب بھی مدھم لہجہ میں دو، یہ نہیں کہ ایسے لہجہ میں بولو جو حضور کے لہجہ سے بلند ہو کَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ سے ایک طرف تو مفہوم بالا کی تائید ہوتی ہے تو دوسری طرف باہم بلند آوازی کا جواز بھی نکلتا ہے۔ توضیح بالا اگر مد نظر رہے تو طعن کے لیئے اس وجہ کا کوئی جواز نہیں رہتا، اس لیئے کہ واقعہ بالا میں نہ تو کسی نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی گفتگو کے دوران بول کر آپ کی آواز دبا کر اپنی آواز بلند کی۔ اور نہ کوئی آپس کی طرح حضور سے بولا،

رہا شور و شغب تو مختصر سی جگہ جب کئی آدمی اکٹھے ہو کر معمول کی آواز میں بھی بحث مباحثہ کریں گے، تو وہ بھی شور و شغب ہی لگے گا۔ اور پھر اس وقت آپ بیماری اور درد والم کی جس حالت سے دوچار تھے، اس میں تو دس بارہ آدمیوں کی سرگوشی بھی شور شغب ہی کی طرح باعث تکلیف ہوتی ہے! رہی یہ بات کہ اول حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے آواز بلند کی یا جھگڑا شروع کیا، تو یہ بات کیسے معلوم ہوئی، ان کو یہ بات پہلے دلیل سے ثابت کرنی چاہیئے، پھر زبان طعن دراز کریں!۔ اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمانا لَا يَنْبَغِي عِنْدِي تَنَازُعٌ (میرے پاس بیٹھ کر جھگڑنا مناسب نہیں) بھی اسی مدعا کو ظاہر کرتا ہے کہ یہ بلند آوازی ترک اولیٰ کے ضمن میں آتی ہے کیونکہ لا ینبغی کا لفظ حرام یا گناہ کبیرہ کے لیئے استعمال نہیں کیا جاتا، کوئی یہ نہیں کہتا کہ زنا کرنا مناسب نہیں! شرع میں اس سے زیادہ مضحکہ خیز بات کیا ہوگی۔ اور قُومُوا عَنِّي (میرے پاس سے اٹھ کھڑے ہو) وہ مرض کی کیفیت کے پیش نظر تھا۔ بیمار آدمی عموماً گفتگو سے دل تنگ ہوتا ہے، گفتگو کی نوبت بھی آئے تو وہ چاہتا ہے کہ اہم ضروری کام کی بات ہو کر جلد یہ سلسلہ ختم ہو، اگر ایسی حالت میں کوئی بات سرزد ہو تو کسی دوسرے کے حق میں وہ طعن ہرگز نہیں ہو سکتی خصوصاً جبکہ خطاب عام ہو جس میں رائے کے موافق و مخالف سب شریک ہوں! (شیعوں کو تم یا عمرؓ اس میں کون سی خوردبین سے نظر آگیا۔ اور تم یا علیؓ کو وہ خوردبین کیوں نہ دکھا سکی۔ کہیں تعصب کی عینک تو آنکھوں پر چڑھی ہوئی نہ تھی ن) بروایت صحیح مروی ہے کہ اس بیماری کے دوران آپ کو لَدُود دوا کھلائی گئی تھی، افاقہ کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لَا يَبْقَى أَحَدٌ فِي الْبَيْتِ إِلَّا لُدَّ إِلَّا الْعَبَّاسَ (گھر میں سب کو لدود کھلایا جائے۔ مگر عباس رضؓ کو چھوڑ کر) فَإِنَّهُ لَمْ يَشْهَدْكُمْ (کیونکہ وہ تم میں موجود نہیں تھے) (غالباً صورت حال یہ تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پسند خاطر نہ ہونے کے باوجود اہل خانہ نے بطور علاج لدود کھلایا تھا۔ ان میں ایسے افراد بھی ہوں گے جو اس کے کھلانے کے خلاف ہوں گے۔ بعد افاقہ حضور نے گھر میں اسوقت موجود سب ہی افراد کو لدود کھلوایا، چاہے اس نے کھلانے کی رائے دی ہو، خواہ نہ کھلانے کی۔ حضرت عباسؓ اس لیے مستثنیٰ ٹھہرے کہ وہ اس وقت گھر میں موجود نہ تھے نہ شریک رائے تھے۔ ن) بیماری سے دل تنگی، ایسی بات نہیں ہو پیغمبروں میں کسی قسم کے نقص کا سبب بنے اس لیئے اس کی ضرورت نہیں کہ اس معاملہ میں انبیاء کرام کے متاثر نہ ہونے کا عقیدہ رکھا جائے، امراض جن سے بدنی ضعف بھی تو ہو جاتا ہے اس سے ان کی شخصیت میں کیا نقص ہوتا ہے۔ البتہ جسم و روح اس سے محفوظ و مصئون رہتے ہیں کہ ان کے فرائض و وظائف شرعی و دینی میں بیماری کے سبب کوئی خلل واقع ہو۔

جواب وجہ دوم: یہ وجہ بھی خیال باطل پر مبنی ہے، حق تلفی اس وقت تو ہو سکتی تھی جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی نئی بات آئی ہوئی ہوتی اور وہ امت کے حق میں نافع ہوتی اور پھر اسکو روک دیا جاتا۔ اور الیوم اکملت الخ کے نزول کے بعد یہ قطعی طور

یہ معلوم تھا کہ اب کوئی دینی و شرعی کی نئی بات نہیں ہوگی، محض مشورہ اور مصلحت ملکی پر کوئی بات تھی اور یہ وقت بھی وصیت کا تھا۔ اور یہ کون عقلمند باور کرے گا، کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا جو زمانہ تھا جس میں تئیس سال تک آپ قرآن مجید اور بے شمار احادیث کی تبلیغ فرماتے رہے۔ اور پھر عام خلق اللہ اور خصوصاً اپنی امت پر جو شفقت و رافت اور ہمدردی آپ فرماتے رہے۔ اس وقت جو بات آپ نے نہ فرمائی وہ ایسے تنگ و نازک وقت میں آپ فرمانا یا لکھوانا چاہتے ہوں۔ اور وہ بھی ایسی بات جو دفع اختلاف کے لیے بمنزلہ تریاق ہو اور اس کو محض حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے منع کرنے پر باز رہے ہوں۔ اس کے بعد بھی تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پانچ روز حیات رہے، تب حضرت عمر رضی اللہ عنہ تو موجود نہ تھے۔ اہل بیت ہی کی آمد و رفت رہی وہی زیادہ تر آپ کی خدمت میں حاضر رہے۔ اس وقت ان حضرات ہی کو وہ بات آپ صلی اللہ علیہ وسلم تحریر فرما کر عنایت فرما دیتے یا ان کو لکھوا دیتے۔ کیا ان کا یہ عقیدہ تو نہیں ہے کہ اسوقت بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے غائبانہ ناراضگی کے خیال سے آپ نے ایسا نہیں فرمایا؟

اس خیال کے باطل اور لغو ہونے کی عقلی دلیل یہ ہے کہ اگر حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس تحریر کے لکھنے یا لکھوانے پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے حتمی اور یقینی طور پر مامور ہوتے اور وقت و فرصت پانے کے باوجود کہ پنجشنبہ کا کچھ حصہ، جمعہ تا یکشنبہ، مزاج مبارک بعافیت رہا اس کے باوجود آپ نے اس طرف توجہ نہ فرمائی کیا اس سے آپ کے فرض تبلیغ میں تساہل کا الزام نہیں آتا۔ اور کون ایسا بدبخت ہے جو ایسی بات آپ کی طرف منسوب کرنے کا خیال تک اپنے دل میں لائے۔ اسے تو اپنے ایمان کی خیر منانی چاہیے! یہ بات تو آپکی عصمت کے سراسر خلاف ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے،

يَاأَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ وَإِنْ لَمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ وَاللَّهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ.

اے رسول آپ کے رب کی طرف آپ پر جو نازل کیا گیا اس کی تبلیغ فرمایئے، اگر آپ نے ایسا نہ فرمایا تو آپ نے رسالت رب کا ابلاغ نہ فرمایا۔ اور اللہ تعالیٰ لوگوں سے آپ کی حفاظت فرمائے گا۔

پھر ایسے وقت کہ وقت وصال سامنے تھا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے خیال سے وعدہ الٰہی پر جو عصمت و محافظت کے لیے وارد ہوا عدم اطمینان کا اظہار نہیں۔ ہم اس کے تصور سے بھی خدا کی پناہ چاہتے ہیں! اور اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے طور پر کوئی تحریر لکھنا یا لکھوانا چاہتے تھے، تو اب یہ سوال ہے کہ آپ نے اپنے اس خیال سے رجوع فرمایا، یا نہیں۔ اگر پہلی صورت ہے تو اب جناب فاروق رضی اللہ عنہ پر طعن کا سرے سے سوال ہی نہ رہا۔ بلکہ دیگر موافقات عمری کے ساتھ ایک یہ صورت بھی شامل ہوگی جو آپؓ کی عزت میں اضافہ کے ساتھ آپ کی منقبت قرار پائیگی۔ اور آپ پر طعن کرنے والوں کے لیے موجب ذلت و بدبختی ہوگی۔ دوسری صورت میں لازم آئیگا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک نافع اور مفید شے ترک فرما دی، آپؐ تو امت پر شفیق، مہربان اور غایت درجہ ہمدرد تھے۔ ایسا کیسے فرما سکتے تھے۔ آپ کے متعلق تو اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِنْ أَنْفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَحِيمٌ۔ بے شک تمہارے پاس تم میں سے ایک رسول آئے ان پر تمہاری تکلیف شاق گذرتی ہے اور تمہارے نفع کے لیے وہ بہت حریص ہیں مومنوں کے حق میں مہربان رحم دل ہیں!

دوسری دلیل یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جو تحریر لکھوانا چاہتے تھے وہ (۱) سابق تبلیغ پر اضافہ اور کوئی نئی بات تھی! (۲) اسکی ناسخ یا مخالف تھی یا (۳) اسکی تائید کرنے والی تھی! پہلی اور دوسری صورت میں تو آیت الیوم اکملت الخ کی تکذیب لازم آتی ہے، اور تیسری صورت میں امت کی کوئی حق تلفی لازم نہیں آتی۔ خدا کی تاکید اس سے بالاتر تھی! تو جب یہ امت

www.Ahlehaq.com

اللہ تعالیٰ کی تاکید کو خاطر میں نہیں لاتی وہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی تاکید کی کیا قدر کرتی۔ اور اس خیال کے غلط و باطل ہونے کی عقلی دلیل یہ ہے کہ اسی حدیث قرطاس میں حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ کی ایک روایت بحوالہ ابن عباس رضی اللہ عنہما صحیحین میں موجود ہے،

اِشْتَدَّ بِرَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَجْعُہٗ فَقَالَ ائْتُوْنِیْ بِکَتِفٍ اَکْتُبُ لَکُمْ کِتَابًا لَنْ تَضِلُّوْا بَعْدَہٗ فَتَنَازَعُوْا فَقَالُوْا مَا شَانُہٗ اَھَجَرَ اِسْتَفْھِمُوْہُ فَذَھَبُوْا یَرُدُّوْنَ عَلَیْہِ فَقَالَ دَعُوْنِیْ فَالَّذِیْ اَنَا فِیْہِ خَیْرٌ مِّمَّا تَدْعُوْنَنِیْ اِلَیْہِ وَاَوْصَاھُمْ بِثَلَاثٍ قَالَ اَخْرِجُوا الْمُشْرِکِیْنَ مِنْ جَزِیْرَۃِ الْعَرَبِ وَاَجِیْزُوا الْوَفْدَ بِنَحْوِ مَا کُنْتُ اُجِیْزُھُمْ وَسَکَتَ عَنِ الثَّالِثَۃِ اَوْ قَالَ نَسِیْتُھَا وَفِیْ رِوَایَۃٍ وَفِی الْبَیْتِ رِجَالٌ مِّنْھُمْ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ قَالَ قَدْ غَلَبَہُ الْوَجْعُ وَعِنْدَکُمُ الْقُرْاٰنُ حَسْبُکُمْ کِتَابُ اللّٰہِ ۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا درد (سر) شدید تھا آپ نے فرمایا کہ شانہ کی ہڈی، میرے پاس لاؤ تاکہ اس پر کچھ لکھوں تاکہ میرے بعد تم نہ بھکو۔ پس وہ (حاضرین جن سے خطاب فرمایا تھا) باہم بحث پڑے، اور کہنے لگے، یہ آپ کی کیا کیفیت ہے؟ کیا (درد کی وجہ سے) اختلاط کلام تو نہیں، (فرمان کی وضاحت کے لیے) آپ سے پوچھو تو، پس وہ آپ سے سوال و جواب کرنے لگے، جس پر آپ نے فرمایا" میرے حال کی فکر چھوڑو، تم جس حالت کو میری طرف منسوب کر رہے ہو میں اس سے بہتر حال میں ہوں (تم کو جو کہتا ہوں سنو) پھر آپ نے تین باتیں بطور وصیت فرمائیں۔ (۱) مشرکین کو جزیرۃ العرب سے نکال باہر کرو (۲) ایلچیوں کو میری طرح انعام دینا جاری رکھو۔ (راوی کہتے ہیں کہ) تیسری بات پر آپ خاموش ہوگئے۔ یا یہ کہا کہ میں بھول گیا۔ ایک روایت میں ہے کہ گھر میں اسوقت جو لوگ تھے ان میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ انہوں نے فرمایا آپ درد کی شدید تکلیف میں ہیں۔ (اپنی بحث سے آپ کو تنگ نہ کرو) تمہارے پاس اللہ کی کتاب موجود ہے۔ (گمراہی اور بہکنے سے بچانے کیلئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد) وہ کافی ہے"

اس روایت سے معلوم ہوا کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے بولنے سے پہلے ہی لوگ بحث میں الجھ گئے تھے اور اپنے سوال و جواب سے حضورؐ کی تکلیف میں زیادتی کا موجب ہو رہے تھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قصہ مختصر کرنے کے لیے ان کو تنبیہ فرماکر جو بات فرمانا چاہتے تھے فرمادی۔ دوبارہ ان سے یہ نہیں فرمایا کہ دوات قلم کاغذ لاؤ۔ اگر وہ کوئی وحی یا قطعی بات ہوتی اور آپ اس سے سکوت فرماتے تو یہ خلاف عصمت ہوتا، شیعہ خود اس کے اقراری ہیں کہ اس قصہ کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم مزید پانچ روز بقید حیات رہے۔ اور رفیق اعلیٰ سے دوشنبہ کو واصل ہوئے، تبلیغ وحی کے لیے اس مدت میں آپ کو کافی وقت اور فرصت ملی۔ نیز یہ بات بھی اس روایت سے معلوم ہوگئی، کہ آپ جو تحریر فرمانا چاہتے تھے وہ دینی امور میں سے کوئی بات نہ تھی بلکہ سیاست مدنیہ، اصلاح مملکت اور دنیوی تدابیر کی قسم کی چیز تھی۔ (یہ محسوس فرماکر کہ یہ حضرات کچھ کا کچھ سمجھ کر نئی الجھنوں کی طرف چل پڑے ہیں آپ نے تحریر کے قصہ کو برطرف کرکے اپنا مقصد) بطور وصیت زبانی ہی ارشاد فرمادیا۔ اور تیسری جس کا اس روایت میں ذکر رہ گیا۔ یا راوی اسے بھول گئے جیش اسامہ کی تیاری کے متعلق تھی جس کی صراحت دوسری روایت میں موجود ہے۔

اس دعویٰ کی پہلی دلیل تو یہ ہے کہ موجود صحابہ کرام نے جب دوسری بار دوات وہڈی کے لیے پوچھا تو آپ نے فرمایا تم مجھے جس کام میں مشغول کرنا چاہتے ہو میں اس وقت اس سے بہتر اور بالاتر کام میں مشغول ہوں۔ یعنی مشاہدۂ حق، اور قرب و مناجات الٰہی

ہیں! اگر وہ تحریر دینی امور سے متعلق ہوتی، یا کسی وحی کی تبلیغ کا معاملہ ہوتا تو وہ تو آپ کی نظر میں سب سے بہتر اور خیر و بھلائی، نیز فرض منصبی تھا۔ اس کو ثانوی درجہ میں کیسے رکھ سکتے تھے! علماء امت کا اس پر اجماع ہے، کہ انبیاء کے حق میں تبلیغ وحی اور دینی احکام کی ترویج سے بڑھ کر کوئی عبادت بہتر نہیں۔ اس روایت سے یہ بھی عیاں ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسری بار صحابہ کرام کے سامنے اس عالم سے بے تعلقی اور وارستگی کا اظہار فرمایا تو حاضرین پر تاسف و حسرت اور مایوسی غالب آنے لگی، ان کی تسلی خاطر کے لیے، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے یہ الفاظ فرمائے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ عتاب آمیز خطاب کسی غصہ و ناراضگی کی بنا پر نہیں بلکہ شدت تکلیف کے سبب ہے۔ تم دل تھوڑا نہ کرو، حضور صلی اللہ علیہ وسلم ذریعہ دین و احکام الٰہی کا جو ذخیرہ بشکل کتاب اللہ تمہارے پاس ہے، تمہاری تربیت ہدایت اور تمہارے دین و ایمان کی حفاظت و پاسبانی کے لئے کافی ہے! تو دراصل جناب فاروق رضی اللہ عنہ کا یہ کلام اس گفت و شنید کے بعد حاضرین کی تسلی و تشفی کے لئے ہے اور ان کے اس گمان کے ازالہ کے لئے ہے کہ کہیں ہماری گفتگو سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہم سے ناراض نہ ہوگئے ہوں۔ اور اس گمان کا قرینہ وہی ہے کہ آپ نے تحریر کے لئے دوبارہ قلم دوات طلب نہیں فرمائی۔ جناب عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے، کتابت سے روکنے کی غرض سے یہ کلام نہیں فرمایا تھا۔

بطور تتمۂ کلام یہ بات قابل غور ہے کہ دونوں فرقوں کے اہل سیر کا اجماع ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اس قصہ کے وقت وہاں موجود تھے آپ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر نہ ان حضرات پر جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس شدت تکلیف میں مزید مشقت اور تکلیف سے بچانے کی خاطر کسی تحریر کے حق میں نہ تھے، نہ اس وقت نہ آئندہ ان کی زندگی میں نہ بعد وفات جب آپ مسند خلافت پر متمکن تھے کوئی اعتراض و تکیر نہیں فرمائی۔ اور نہ اس قسم کی کوئی روایت کسی سنی یا شیعی سے آپ کی جانب منسوب ہو کر بیان کی گئی۔ لہٰذا اگر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اس معاملہ میں غلطی پر تھے، تو آپ بھی ان کے ہمنوا تھے! آپ نے بھی اسے درست و جائز قرار دیا۔ سوائے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے۔ جو ہنوز کم سن تھے، کسی سے افسوس اور حسرت کا اظہار منقول نہیں۔ اگر اس معاملہ میں کسی مہتم بالشان معاملہ سے محرومی کی بات ہوتی تو اصحاب کبار خصوصاً جناب امیر رضی اللہ عنہ خود اس کا ذکر فرماتے بطور اعتراض نہ سہی بطور تاسف ہی حرف شکایت زبان پر لاتے اگر یہاں کسی کے دل میں یہ شبہ سر ابھارے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد کسی اہم دینی بات کے تحریر کرانے کا نہ تھا تو آپ نے لن تضلوا بعدی کے الفاظ کیوں فرمائے اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ آپ اس تحریر کے ذریعہ امت کو گمراہی میں پڑنے سے بچانا چاہتے تھے اور گمراہی کے معنے یہی ہیں کہ دین میں کوئی خلل رونما نہ ہو۔

تو اس کا جواب یہ ہے۔ کہ لغت عرب میں ضلال عام ہے جس طرح دینی گمراہی کے لئے اسے استعمال کرتے ہیں دنیوی معاملات میں بدتدبیری کے لئے بھی مستعمل ہوتا ہے، کلام الٰہی میں اس کی مثال حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کا وہ قول ہے جو انہوں نے اپنے والد محترم حضرت یعقوب علیہ السلام کی نسبت کہا ان ابانا لفی ضلال مبین اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم جو مضبوط جتھہ ہیں ان کو نظر انداز کر کے ایک اکیلی جان یوسف (علیہ السلام) کو اتنی اہمیت دیتے ہیں تو ان کا یہ رویہ معاملات دنیوی کے لحاظ سے درست نہیں۔ دوسری جگہ سند در سند کہا انک لفی ضلالک القدیم۔ (آپ اپنی پرانی) اور ان کے خیال میں دنیاوی لحاظ سے یہ روش یوں غلط تھی کہ دنیا میں بڑے اور طاقتور جتھہ دار بیٹے ہی باپ کا دست و بازو ہوتے ہیں، دشمنوں سے وہی نمٹتے ہیں اور آڑے وقت وہی باپ کا سہارا بنتے ہیں۔ ظاہر ہے برادران یوسف (علیہ السلام) کافر تو تھے نہیں کہ اس لحاظ سے ایسے عالی مرتبت پیغمبر باپ کو دین سے گمراہ بتاتے یا ایسا اعتقاد رکھتے، ان کی مراد دنیاوی بے تدبیری ہی ہو سکتی ہے، کہ کام کاج کے لائق لڑکوں کو جو ہر وقت خدمت کے لئے کمربستہ ہیں پیار نہیں کرتے، دوست نہیں رکھتے، اور کم عمر محنت و خدمت سے قاصر بیٹے کو محبت سے زیادہ عشق

کی حد تک چاہتے ہیں۔ لہذا یہاں بھی (قصدلوا) سے تدابیر ملکی ہیں خطا کاری ہے نہ دینی گمراہی۔ (چنانچہ بطور وصیت جو تین باتیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائیں وہ مدنی، وملکی معاملات سے ہی تعلق رکھتی ہیں۔ مشرکین عرب کو جزیرہ سے نکالنا، ایلچیوں اور سفراء کو انعامات سے نوازنا اور جیش اسامہ کی تیاری، یہ سب باتیں مصالح ملکی و مدنی تھے۔ اور ایسی تدابیر تھیں جن کا براہ راست فائدہ ملک و مملکت کو پہنچتا ہے۔ چنانچہ پھر مشرکین عرب کی نال کہیں اور کہاں گڑی تھی کہ وہاں سے نکل کر شاد و آباد رہتے! نہ کہیں ان کی ننھیال و ددھیال تھی نہ سسرال کہ وہاں جاکر سر چھپا لیتے۔ یا وہاں کے لوگ ان کو سرآنکھوں پر جگہ دیتے، لامحالہ انہیں عرب ہی میں رہنا تھا لہذا فی دین اللہ افواجا" فوج در فوج مسلمان ہوتے۔ سفراء کی آؤ بھگت، انعام اکرام سراسر مملکت کے فائدہ کی تدبیر تھی کہ ان پر اچھا تاثر قائم ہوگا تو منہ سے تعریف ہی نکلے گی اپنی اپنی مملکتوں میں جاکر وہ مسلمانوں کے لطف و عنایت، خاطر تواضع اور جود و سخاوت کی تعریف کریں گے جس کے ذریعہ غیروں کے دلوں میں نفرت و عداوت کے بجائے انس و محبت کی راہ کشادہ ہوگی، کم از کم ان کی ریشہ دوانیوں سے تو مملکت بچی رہیگی۔ جیش اسامہ والی تدبیر تو استحکام ملکی کے لئے اتنی موثر تھی کہ عرب و غیر عرب سب پر دھاک بیٹھ گئی، اور بدخواہ و بداندیش جو منصوبے رکھتے تھے سب خاک میں مل گئے۔ اگر جیش اسامہ بروقت روانہ نہ ہوتا تو خلافت راشدہ کے استحکام کا تو کیا سوال مکہ و مدینہ میں مسلمانوں کا ٹکنا محال ہوجاتا۔ نعمانی)

اور اس پر دلیل قطعی یہ ہے کہ جب تیئس سال تک وحی کا نزول قرآن و حدیث کی تبلیغ ان کی ہدایت کے اور ان کی گمراہی دور کرنے کے لئے کافی نہ ہوئے، تو یہ چند سطور کی تحریر ان کی گمراہی اور بہکنے سے کیسے کافی ہوجاتی! پھر یہاں بکار خویش ہوشیار قسم کے لوگوں کے دل میں یہ بات بھی آسکتی ہے کہ ممکن ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خلافت کے متعلق کوئی تحریر لکھوانا چاہتے ہوں اور جناب عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی مداخلت سے یہ اہم کام کھٹائی میں پڑگیا۔ تو ان کی غلط فہمی دور کرنے کے لئے ہم کہتے ہیں کہ اگر کسی شخص کے لئے خلافت ہی کی بات منظور خاطر مبارک ہوتی تو اسکی دو ہی صورتیں ہوتیں یا تو صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی خلافت کا معاملہ ہوتا، یا جناب علی مرتضی رضی اللہ عنہ کا!

پہلی صورت کے متعلق اسی مرض کے دوران ایک اور مرتبہ آپ کے قلب مبارک میں اس کا داعیہ پیدا ہوا۔ اور آپ نے ارادہ بھی فرمایا مگر پھر خود ہی اسکو ترک فرماکر معاملہ اللہ تعالیٰ اور مسلمانوں کے اجتماعی شعور کے حوالہ فرمایا۔ اس ارادہ کے التوا میں نہ جناب فاروق رضی اللہ عنہ کا دخل ہوا نہ کسی اور کا۔ آپ کے علم میں یہ ایک ہونے والی بات تھی، اس لئے اس کے لکھنے کی ضرورت بھی نہ رہی۔ حدیث کی معروف و مشہور کتاب صحیح مسلم میں ہے کہ اسی بیماری کے دوران حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا،

ادْعِي لِي أَبَاكِ وَأَخَاكِ أَكْتُبُ كِتَابًا فَإِنِّي أَخَافُ أَنْ يَتَمَنَّى مُتَمَنٍّ وَيَقُولُ قَائِلٌ وَلَا وَيَأْبَى اللّٰهُ وَالْمُؤْمِنُونَ إِلَّا أَبَا بَكْرٍ

تم اپنے والد اور بھائی کو میرے پاس بلاؤ کہ ان کے لئے ایک تحریر لکھوا دوں، مجھے اندیشہ ہے کہ کوئی آرزو مند، اسکی آرزو کر رکھے اور کہے کہ میں اسکا حقدار ہوں کوئی دوسرا نہیں۔ اور اللہ تعالیٰ اور مسلمان ابوبکر کے علاوہ قبول نہیں کریں گے۔

یہاں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کہاں تھے کہ انہوں نے اس وصیت کی تحریر سے روک دیا ہو۔

دوسری صورت ہوتی تو اس کے لئے کسی تحریر کی حاجت نہ تھی، کیونکہ اس واقعہ سے پہلے میدان غدیر خم میں ہزاروں افراد کے مجمع میں امیر المومنین رضی اللہ عنہ کی ولایت پر خطبہ دے چکے تھے، اور جناب امیر رضی اللہ عنہ کو ہر مومن مرد و عورت کا مولیٰ قرار فرما چکے تھے

www.Ahlehaq.com

اور یہ قصہ مشہور عوام اور زبان زد خلق تھا۔ اگر اتنی پابندی، تاکید، شہرت اور تواتر کے باوجود بھی عمل نہ کریں تو چند حضرات کے سامنے لکھی ہوئی بھی تحریر ان پر کیا اثر ڈالتی۔

حاصل کلام یہ کہ کسی بھی صورت میں اس تحریر سے روک دینے سے امت کی حق تلفی نہیں ہوتی، نہ مہمات دینی پردۂ خفا میں رہتے ہیں۔ ان کا یہ خیال باطل بھی امام مہدی کی غیبت کے لغو خیال کا چربہ ہے۔ کہ اسکی حقیقت بھی وسوسہ، اور وہم کے سوا کچھ نہیں، اور وہم کی بیماری کا علاج کسی کے پاس بھی نہیں، حتی کہ لقمان حکیم کے پاس بھی نہیں۔

اعتراض (۲) دوسرا طعن واعتراض یہ ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے جناب سیدۃ الزہرا رضی اللہ عنہا کا مکان جلا دیا۔ اور آپ کے پہلوئے مبارک میں تلوار کا چھوکا دیا کہ اس کے صدمہ سے آپ کا حمل ساقط ہو گیا، " یہ قصہ سراسر بہتان اور بدترین افترا اور جھوٹ ہے اسکی کوئی اصلیت نہیں۔ اس لئے امامیہ حضرات کی اکثریت اس قصہ کی قائل ہی نہیں۔ اتنا کہتے ہیں کہ گھر جلانے کا ارادہ کیا تھا مگر وہ ارادہ عمل میں نہیں آسکا۔ حالانکہ قصد وارادہ دل کی کیفیت ہے جس پر خدا کے سوا کوئی مطلع نہیں ہو سکتا۔

اگر ان کی مراد یہ ہو کہ آپ نے زبانی طور پر ڈرایا دھمکایا اور کہا کہ میں اسکو جلا دوں گا تو یہ ڈراوا اور دھمکی بھی ان لوگوں کے لئے تھی جو جناب سیدہ کے مکان کو اپنے مذموم مقاصد کے لئے استعمال کرتے ہیں، جو ہر خائن کا ملجا اور جائے پناہ تھا اور جسے انہوں نے حرم مکہ کا درجہ دے رکھا تھا، اور خلیفہ اول کی خلافت کے خلاف فساد انگیز مشورے کرتے اور منصوبے بناتے اور فتنہ وفساد بپا کرنے کی تدبیریں سوچتے۔ خود جناب سیدہ زہرا ان کی نشست اور فساد انگیز حرکات سے شاکی اور نالاں تھیں۔ مگر حسن خلق کے سبب کھلم کھلا ان کو اپنے یہاں آنے سے منع نہ کر سکتی تھیں۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ان حالات کا علم ہوا اور حقیقت واقعہ سے آگاہی ہوئی تو آپ نے ان جمع ہونے والے فسادیوں سے کہا کہ اگر تم اپنی فساد انگیز حرکات سے باز نہ آئے تو گھر سمیت تم کو جلا دوں گا۔ جلانے کی دھمکی کی تخصیص ایک لطیف و باریک استنباط پر مبنی ہے جو آپ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد مبارک سے فرمایا جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں کو جو نماز کی جماعت میں شریک نہیں ہوتے اور امام کی اقتدا نہیں کرتے تھے اسی قسم کی دھمکی دی تھی کہ اگر یہ لوگ ترک جماعت کرتے رہے اور اس سے باز نہ آئے تو میں ان کو مع ان کے گھروں کے جلا دوں گا۔

اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ آپ کے مقرر فرمودہ پیش امام تھے، اور یہ سازشی لوگ امام حق کی اقتدا چھوڑنے کے منصوبے بنا رہے تھے اور مسلمانوں کی جماعت سے رشتہ رفاقت توڑنے پر کام کر رہے تھے اس لئے وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس تہدید کے مستحق قرار پائے۔ لہذا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا قول حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فعل سے ملتا ہے جو فتح مکہ کے وقت ظہور میں آیا تھا جب فتح مکہ کے دن آپ کی خدمت میں عرض کیا گیا کہ ابن خطل (جو کفار کا شاعر تھا جس نے بارہا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہجو میں اشعار کہے اور روسیاہ ہوا) حرم کعبہ میں جا چھپا ہے اور اس کے پردوں میں لپٹا ہوا ہے اس کے بارے میں آپ کا کیا حکم ہے؟ آپ نے فرمایا وہ جہاں چھپا ہے وہیں اسکو قتل کر دو اور کسی بات کا لحاظ نہ کرو۔ تو ایسے لعنتی اور پھٹکار مارے راندۂ درگاہ الٰہی لوگوں کو خانۂ خدا میں بھی پناہ نہیں تو خانۂ زہرا رضی اللہ عنہا میں ان کو امان کیسے مل سکتی ہے۔ اور جناب زہرا رضی اللہ عنہا کو ایسے فسادیوں کی سزا پر تکدر کیوں ہونے لگا۔ علاوہ ازیں خود ان سے بھی ایسی صحیح روایات منقول ہیں کہ جناب زہرا رضی اللہ عنہا خود بھی ان لوگوں کو اس طرح جمع ہونے سے منع فرماتی تھیں! اور اس سلسلہ میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ جناب فاروق رضی اللہ عنہ کا یہ قول جناب علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے فعل سے بدرجہا کم ہے، کہ شہادت ذوالنورین جناب عثمان رضی اللہ عنہ کے بعد جب آپ مسند آرائے خلافت ہوئے تو وہ لوگ جو آپ کی خلافت کا تختہ الٹنے کے

www.Ahlehaq.com

منصوبے اپنے ذہنوں میں رکھتے تھے، مدینہ منورہ سے بھاگ کر حرم مکہ میں جا پہنچے۔ قاتلین عثمان سے قصاص کا مطالبہ کرنے والوں کے ہمنوا ہو گئے اور حرم محترم جناب صدیقہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ ہو گئے تو ایسے لوگوں کو آپ نے قتل کیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حرم محترم اور اپنی ماں، بلکہ ام المؤمنین کی حرمت وعزت کا کوئی پاس نہ کیا۔ اس سلسلہ میں حرم رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو جو کچھ تکلیف پہنچی، اور جو اہانت وذلت۔ اظہائی واظہر من الشمس ہے! لیکن حقیقت یہ ہے کہ جناب علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے اس عمل کو صواب و درست ہی کہیں گے۔ کیونکہ اس قسم کے اہم امور میں جو عام فتنہ وفساد کا سبب بن سکتے ہوں انفرادی مصلحتوں کو ملحوظ رکھنا اور فتنہ کے مبادی ومقدمات کو نظر انداز کر دینا ان کے دفعیہ کی کوشش نہ کرنا دین ودنیا کے معاملات میں بے تدبیری سمجھی جائے گی۔ تو جس طرح سیدہ زہراء رضی اللہ عنہا کی جائے قیام وسکونت لائق عزت تھی، اسی طرح ام المومنین جو حرم محترم رسول، آپکی محبوب زوجہ، اور محبوبۂ الٰہی بھی تھیں۔ آپ بھی واجب الاحترام اور لائق تعظیم تھیں بلکہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے تو ڈرانے کی غرض سے اور تہدید وترہیب کی بنا پر محض قول ہی صادر ہوا تھا۔ اور جناب امیر رضی اللہ عنہ نے تو اس کو عمل کی بھی آخری حد تک پہنچا دیا۔ لہٰذا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق زبان طعن دراز کرنا تعصب وعناد پر مبنی ہے! حالانکہ جناب فاروق رضی اللہ عنہ کا قول جناب امیر رضی اللہ عنہ کے فعل سے باعتبار درجہ بہت ہی کم اور ہلکا تھا۔

اب اگر اہل سنت پر الزام دینے کی خاطر فرق پیدا کر کے یہ کہا جائے کہ چونکہ علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی خلافت برحق تھی لہٰذا انتظام مملکت کی حفاظت ضروری اور اولیت رکھتی ہے، اس کے مقابلہ میں ام المؤمنین رضی اللہ عنہا کا پاس اور حرم رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا لحاظ وہاں ساقط ہو گا۔ اور خلافت جناب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ چونکہ ناحق تھی اس لئے خلافت فاسدہ، کے انتظام کے تحفظ کے لئے جناب سیدہ رضی اللہ عنہا کے مکان کے احترام کا لحاظ نہ کرنا وبال اور قابل اعتراض بات ہوگی۔ تو یہ فرق ہمارے نزدیک انتہائی حماقت، نادانی اور بے عقلی کی بات ہے، اس لئے کہ اہل سنت تو دونوں خلافتوں کو برابر سمجھتے اور برحق مانتے اور جانتے ہیں خصوصاً ایسے وقت کہ اعتراض حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ پر کیا جا رہا ہے کیونکہ ان کے نزدیک تو جناب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی حقیقت خلافت متعین ہو چکی تھی اور اس وقت جناب صدیق رضی اللہ عنہ کا کوئی ایسا مخالف اور ہمسر بھی میدان میں دعوائے خلافت کے ساتھ موجود نہ تھا جس کی مخالفت کچھ بھی اہمیت رکھتی ہو تو منظم اور برحق خلافت کے خلاف سازشیں کرنا اور منصوبے بنانا خصوصاً جبکہ جوش اسلام کی نشو ونما ہو رہی تھی اور دین وایمان کے پودے نے جڑ ہی پکڑی تھی سوائے قتل کو واجب کرتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایسے سازشیوں کو اسوقت قتل بھی کر دیتے تو یہ جائز اور حق تھا۔ انہوں نے تو صرف ڈرا دھمکا کر ہی جان بخشی کر دی! اور تعجب تو ان شیعہ فضلاء پر ہوتا ہے جنہوں نے اس واقعہ کو نمک مرچ لگا کر اور بڑھا چڑھا کر اپنا خبث وبغض سب پر عیاں کر دیا ہے کہ جن جوانوں کو حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے ڈرا دھمکایا تھا ان میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پھوپھی زاد بھائی جناب زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ اور اس کے بعد جناب سیدہ زہراء رضی اللہ عنہا نے بنی ہاشم کے نوجوانوں اور زبیر رضی اللہ عنہ کو اپنے گھر پر مجلس برپا کرنے اور اکٹھے ہونے سے منع فرمایا!

سبحان اللہ! کیا انوکھی منطق ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت کے خلاف جناب زبیر رضی اللہ عنہ فساد کے منصوبے بنائیں تو وہ معصوم، بے خطا اور واجب التعظیم ہوں۔ اور جب یہی زبیر رضی اللہ عنہ قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ کے قصاص طلب کرنے میں لہجہ تند ودرشت رکھیں تو واجب القتل قرار پائیں! جناب سیدہ زہراء رضی اللہ عنہا کے مکان میں جب لوگ فتنہ وفساد برپا کرنے کے منصوبے بنائیں۔ سازشیں کریں تو وہ مقبول وپسندیدہ ہوں۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبوب زوجہ

جو بلا شبہ ام المومنین تھیں۔ کی قیادت و رہبری میں قصاص کا دعویٰ یا قاتلین عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی شکایت میں زبان کھولیں تو نامقبول اور مردود القول قرار دیئے جائیں! ایسا لچر اور واہیات فرق اصول شیعہ ہی پر مبنی ہو سکتا ہے۔ اگر وہ اہل سنت پر اپنے ہی اصولوں سے الزام تھوپنا چاہیں، تو سیدھا سیدھا کہیں، اس ایچ پیچ کی کیا ضرورت ہے! جب رسول اللہ علیہ وسلم نے ترک جماعت پر جو سنت مؤکدہ تھی، اور اس کا فائدہ صرف مکلفین تک محدود تھا۔ اس کے ترک سے عامہ مسلمین کو کوئی خطرہ یا نقصان نہیں پہنچتا تھا۔ اس سبب کے باوجود ان تارکین جماعت کے گھروں کو جلانے کی تہدید فرمائی۔ تو ایسے فتنہ و فساد پر جس سے پوری ملت اسلامیہ کے متاثر اور خونچکاں ہونے کا خطرہ ہو، اور دین کو ملیا میٹ کرنے کا سامان ہو، تو ایسی سازشی گاہ کو جلانے کی دھمکی کیوں جائز نہ ہو!

اور جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم جناب سیدہ زہرا رضی اللہ عنہا کے مکان میں اس وقت تک داخل نہ ہوں جب تک دروازہ پر کے منقش و با تصویر پردہ نہ اتار لیا جائے۔ یا خانۂ خدا حرم کعبہ میں اس وقت تک تشریف نہ لے جائیں جب تک وہاں موجود حضرت ابراہیم و حضرت اسمٰعیل علیہما السلام کے مجسمے نہ نکلوا دیں۔ تو اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کسی متبرک اور مکرم مقام کو جہاں فتنہ انگیز تدابیر سوچی جا رہی ہوں، حاضرین سمیت جلا دینے کی دھمکی دیں تو اس میں گناہ کی کیا بات ہے۔ زیادہ سے زیادہ جو بات کہی جا سکتی ہے وہ ادب کی رعایت نہ کرنے کی ہو سکتی ہے تو یہ معلوم ہو گیا ایسے اہم اور مہتم بالشان امور میں ادب کی رعایت اور لحاظ نہیں کیا جا سکتا، جناب امیر رضی اللہ عنہ کا اپنا رد یہ اس کا ثبوت اور دلیل ہے۔ کیا یہ شیعہ لوگ دنیا کو یہ باور کرانا اور جناب امیرؓ پر یہ الزام رکھنا چاہتے ہیں کہ آپ محبوبۂ رسول ام المومنین جناب عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا ادب نہیں فرماتے تھے اور آپ کی نظر میں آپ کے لئے کوئی اعزاز کوئی احترام نہیں تھا! دنیا جانتی ہے کہ ایسا نہیں تھا۔ اور جناب امیر رضی اللہ عنہ کے کبھی خواب و خیال میں بھی یہ بات نہیں آئی تھی۔ اس کے باوجود آپ کا رویہ جناب صدیقہ رضی اللہ عنہا اور آپ کے ہمراہیوں کے ساتھ جو درشت ہوا تو وہ نظم مملکت کی حفاظت کا تقاضا تھا۔ اس کو اہانت و بے قدری صدیقہؓ محمول شیعہ ذہن ہی کر سکتا ہے! لہٰذا جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ایسا فعل سرزد ہو جو فعل معصوم سے ملتا ہو تو وہ کس منطق سے محل طعن و تشنیع ہو سکتا ہے!

اعتراض (۳) بطور طعن یہ کہتے ہیں کہ جناب فاروق رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کا انکار کیا، اور قسم کھائی کہ آپؐ کا وصال نہیں ہوا، یہاں تک کہ جناب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ان کے سامنے یہ آیت پڑھی اِنَّکَ مَیِّتٌ وَّاِنَّھُمْ مَّیِّتُوْنَ (تم بھی مروگے اور وہ بھی مریں گے)۔

یہاں بھی بات سمجھ کے پھیر کی یا بغض و عناد کی ہے۔ یا پھر اعتراض برائے اعتراض کا معاملہ ہے! ورنہ کیا ایسے شخص پر ایسی حالت میں طعن کیا جا سکتا ہے جو محبت رسول میں سرتاپا غرق ہو، اور جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مرض کی شدت کے مشاہدہ اور اچانک رحلت کی اندوہناک خبر اور آپؐ کے فراق کے صدمہ سے اپنے ہوش و حواس عقل و فہم سے اتنا بیگانہ ہو گیا ہو کہ اسے اپنی سُدھ بُدھ بھی نہ رہی ہو حتیٰ کہ اسے اپنا اور اپنے باپ کا نام بھی یاد نہ آ رہا ہو نہ وہ یہ سمجھ پا رہا ہو کہ وہ زندہ ہے یا مر گیا ہے۔ اگر ایسی مدہوشی و بے خبری میں انتہائے محبت کے باعث محبوب کی موت سے انکار کر بیٹھا ہو تو یہ طعن کا موقعہ نہیں تعریف کا مقام ہے!

(ایسی آنکھ پھوڑ دینے کے لائق ہے جو ہنر کو عیب دکھائے) اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایسی حالت میں آیت بالا ذہن میں حاضر نہ کر پائے ہوں تو یہ کونسے تعجب کی بات ہے بہت سے لوگوں کو غم و اندوہ اور جزع فزع کے عالم میں آیات قرآنی یاد نہیں رہتیں لیکن بحکم بشریت یہ مستحق طعن اور لائق ملامت نہیں ہوتے! خود انہیں شیعوں کی صحیح روایات سے جو سابقاً بیان ہوئی ہیں

یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کوہ طور پر اللہ تعالیٰ سے ہمکلامی کے وقت یہ بھی بھول گئے کہ وہ قریب ہے اور مکانیت سے پاک اور بری ہے! حالانکہ آپ اسوقت حیرت و مدہوشی کی کیفیت سے دوچار بھی نہ تھے!

اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ایسی حالت میں جو ان کے نزدیک قیامت سے کم نہ تھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے جواز سے بے خبری ہو گئی تو اس میں کونسا گناہ ہو گیا! نسیان و ذہول لوازم بشریت سے ہیں، یادداشت ایک صدمۂ عظیم کے سبب سُن اور غیر مؤثر ہو گئی تھی، ذہول و نسیان تو ہوش و حواس اور پوری بیداری ذہن کی حالت میں بھی محترم و مقدس حضرات سے وقوع پذیر ہوا ہے۔

حضرت یوشع علیہ السلام بالاجماع نبی معصوم تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تاکید کے باوجود مچھلی کے دریا میں چلے جانے کے واقعہ کو بھول گئے! اور خود حضرت موسیٰ علیہ السلام باوجود جناب خضر علیہ السلام سے پختہ وعدہ کرلینے کے پیش آمدہ واقعہ کی مذمت کے سبب اپنا قول یاد نہ رکھ سکے! اور ایک دفعہ نہیں تین مرتبہ ایسا ہوا۔ اور ابو البشر اور اصل انبیاء علیہم السلام حضرت آدم کے نسیان پر خود قرآن مجید میں شہادت موجود ہے، اور نماز میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو نسیان لاحق ہونے کا بیان و ثبوت تو خود ان کی کتاب کافی کلینی میں موجود ہے۔ اور ابو جعفر طوسی اور دیگر امامیہ نے اسکو صحیح درست بتایا ہے! اس کے علاوہ ابو جعفر طوسی نے عبداللہ حلبی سے ایک روایت بیان کی ہے کہ۔

اِنَّ الامام عَبْدَ اللّٰہِ کَانَ یَسْھُوْ فِیْ صَلَاتِہٖ وَیَقُوْلُ فِیْ سَجْدَتَیِ السَّھْوِ. بِسْمِ اللّٰہِ وَبِاللّٰہِ وَصَلَّی اللّٰہُ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہٖ وَسَلَّمَ

امام عبداللہ اپنی نماز میں بھول جاتے تھے اور سجدہ سہو میں بجائے تسبیح، بسم اللہ و باللہ و صلی اللہ علیہ والہٖ وسلم کہنے لگتے!

پس اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس سانحۂ قیامت خیز و ہوش ربا میں ایک آیت بھول گئے تو طعن کی کیا بات ہے۔

اعتراض (۴) اعتراض یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بعض ایسے شرعی مسائل سے ناواقف تھے، جن کا جاننا خلافت و امامت کے اہم امور میں سے ہے! ان میں ایک مسئلہ یہ ہے کہ آپؓ نے ایک حاملہ عورت کو حالت حمل میں رجم کرنے کا حکم دیا۔ اس پر جناب علی رضی اللہ عنہ نے آپ کو منع کیا اور فرمایا۔ اِنْ کَانَ لَکَ عَلَیْھَا سَبِیْلٌ فَلَیْسَ لَکَ عَلٰی مَا فِیْ بَطْنِھَا سَبِیْلٌ۔ اگر آپ کو اس عورت پر قابو ہے تو جو اس کے پیٹ میں ہے اس پر تو قابو نہیں! یہ سنکر آپ نادم ہوئے اور فرمایا لَوْ لَا عَلِیٌّ لَھَلَکَ عُمَرُ۔ (اگر علی نہ ہوتے تو عمر ہلاک ہو گیا تھا) دوسرا مسئلہ یہ تھا کہ آپ ایک پاگل عورت کو رجم کرنا چاہتے تھے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کو روکا۔ اور یہ حدیث پڑھی۔

سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ رُفِعَ الْقَلَمُ عَنْ ثَلَاثَۃٍ عَنِ النَّائِمِ حَتّٰی یَسْتَیْقِظَ وَعَنِ الصَّبِیِّ حَتّٰی یَبْلُغَ وَعَنِ الْمَجْنُوْنِ حَتّٰی یُفِیْقَ۔

میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ تین شخصوں سے قلم اٹھا لیا گیا ہے۔ سونے والے سے جب تک وہ بیدار نہ ہو جائے، بچے سے جب تک وہ بالغ نہ ہو جائے، پاگل سے جبتک وہ اچھا نہ ہو جائے،

تیسرا مسئلہ یہ ہے کہ آپؓ نے اپنے صاحبزادہ ابو شحمہ رضی اللہ عنہ پر جو دوران حد فوت ہو گئے تھے بحالت مردگی بھی بقیہ کوڑے لگوائے حالانکہ مردہ کو حد لگوانا خلاف عقل بھی ہے اور خلاف شرع بھی!۔

چوتھا مسئلہ یہ کہ آپؓ کو شراب پینے کی حد کا بھی علم نہ تھا، وہ آپ نے لوگوں کے صلاح مشورہ سے مقرر کی! ان باتوں سے پتہ چلا کہ آپ کو تو شریعت کی ظاہری باتوں کا بھی علم نہ تھا تو خلافت کی کیا لیاقت رکھتے ہوں گے!

www.Ahlehaq.com

جواب :- ان اعتراضات کا یہ ہے کہ یہاں بھی یہ خیانت کی عادت بد سے باز نہیں آئے قصہ کا ایک ٹکڑا اٹھالیا، اور باقی کو ہضم کر گئے محض اس لئے کہ طعن کرکے خبث باطن ظاہر کرنے کا موقعہ ہاتھ سے نہ نکل جائے اور یہ رویہ متعصب معاند ہی کا ہو سکتا ہے جیسا کہ یہود کہتے تھے۔ اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَّنَحْنُ اَغْنِيَآءُ (اللہ تو فقیر ہے ہم مالدار ہیں)

حاملہ کے رجم کا قصہ دراصل یہ ہے کہ آپ کو اس کے حاملہ ہونے کا علم نہ تھا۔ اور ظاہر ہے حمل کا اظہار پورے دنوں، ولادت کے قریب ہی ہوتا ہے۔ اُدھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اس کا علم تھا۔ تو آپؓ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس کیفیت سے مطلع فرمایا تو آپ نے بطور تشکر یہ کلمات فرمائے۔ کہ اگر میں اسباب سے ناواقف رہتا اور عورت و بچہ اس حد کے اجراء سے ہلاک ہو جاتے تو پیٹ کے اس بچہ کی ہلاکت پر مجھے اتنا افسوس اور صدمہ ہوتا جو میری ہلاکت کے برابر ہوتا۔ اگر علی رضی اللہ عنہ بروقت مجھے اطلاع نہ دیتے تو میں اندوہ وغم سے ہلاک ہو جاتا! اب یہ بات باتفاق شیعہ و سنی امام پہ لازم نہیں کہ زانیہ کے خود اقرار یا گواہوں کی شہادت کے بعد زانیہ سے یہ پوچھے تو حاملہ ہے یا نہیں۔ بلکہ یہ عورت کو خود چاہیئے کہ وہ حاملہ ہو تو اس کو ظاہر کردے، تو ایسا حکم جو حقیقت حال سے ناواقفیت کی بنا پر صادر ہو، اور اصل حقیقت کچھ اور ہو جس کا تقاضا اس کے خلاف ہو تو اسے زیادہ سے زیادہ حقیقت حال سے لاعلمی تو کہہ سکتے ہیں جو نہ امامت و خلافت میں نقص کا باعث ہے نہ نبوت میں۔ اسے جہل و نادانی سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا!

دیکھیے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بے خبری ہی کی بنا پر اپنے بھائی کی داڑھی پکڑی، سر کے بال کھینچے۔ اور ان پر غصہ ہوئے۔ اور ان کی اہانت کی۔ حالانکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بڑے بھائی کی عزت و تکریم کے حکم سے جاہل نہ تھے! اور خود سرور عالم و عالمیان صلی اللہ علیہ وسلم بار بار فرماتے تھے۔

اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ وَّ اِنَّكُمْ تَخْتَصِمُوْنَ اِلَيَّ وَاِنَّ بَعْضَكُمْ اَلْحَنُ بِحُجَّتِهٖ مِنْ بَعْضٍ فَمَنْ قَضَيْتُ لَهٗ بِحَقِّ اَخِيْهِ فَاِنَّمَا اَقْطَعُ لَهٗ قِطْعَةً مِّنَ النَّارِ۔

بے شک میں بشر ہوں۔ تم اپنے جھگڑے میرے پاس لاتے ہو تم میں سے بعض دوسرے کے مقابلہ میں زیادہ چرب زبان ہوتا ہے اگر میں اس سے متاثر ہو کر اسکو اسکے بھائی کا حق دیدوں تو یہ سمجھنا کہ میں نے اسے آگ کا ایک ٹکڑا کاٹ کر دیا ہے۔

اور سنن ابی داؤد میں روایت ہے کہ جب ابیض بن حمال رضی اللہ عنہ نے آپؐ سے کانِ نمک عطا فرمانے کی درخواست کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بے اطلاعی کے سبب اسے مرحمت فرمادی بعد میں معلوم ہوا کہ وہ کان تو تیار ہے بغیر کسی عمل و کاریگری کے اس سے تو نمک بنا بنایا، نکل رہا ہے تو آپؐ نے اسے یہ خیال فرما کر واپس لے لیا کہ یہ تو تمام مسلمانوں کا حق ہے اور سب کا مفاد اس سے وابستہ ہے کسی ایک شخص کی ذاتی ملکیت میں آنا مناسب نہیں! اسی طرح جامع ترمذی میں بروایت صحیح وائل بن حجر کندی سے منقول ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں ایک مسماۃ نماز میں شرکت کے لیے گھر سے نکلیں، گلی میں کسی نے اس کو پکڑ کر بالجبر زنا کیا۔ اس کے شور مچانے پر زانی تو بھاگ گیا۔ مگر کسی دوسرے راہگیر کی طرف عورت نے اشارہ کر دیا کہ اسی نے زبردستی مجھے بے آبرو کیا ہے، لوگ ان کو پکڑ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے آئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سنگسار کا حکم جاری فرمایا۔ رجم شروع ہی ہونے والا تھا کہ اصل مجرم اقراری ہو گیا۔ اور کہنے لگا یا رسول اللہ، یہ شخص بے گناہ ہے زنا میں نے کیا تھا۔ تب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بے قصور سے معذرت فرمائی اور اصل مجرم کو رجم کا حکم فرمایا۔ پھر ایک اور حدیث متفق علیہ جو دونوں فرقوں کی کتابوں میں مذکور ہے یوں مروی ہے،

www.ahlehaq.com

اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَمَرَ عَلِیًّا بِاِقَامَۃِ الْحَدِّ عَلٰی اِمْرَأَۃٍ حَدِیْثَۃٍ بِنِفَاسٍ فَلَمْ یُقِمْ عَلَیْھَا الْحَدَّ خَشْیَۃَ اَنْ تَمُوْتَ فَذَکَرَ ذٰلِکَ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اَحْسَنْتَ دَعْھَا حَتّٰی یَنْقَطِعَ دَمُھَا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حکم فرمایا اس عورت پر حد جاری کرنے کا جو نفاس کی حالت میں تھی۔ مگر آپ نے اس ڈر سے کہ کہیں وہ مر نہ جائے اس پر حد نہیں لگائی۔ اور اس کا اظہار حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کر دیا۔ آپؐ نے فرمایا تم نے اچھا کیا۔ اسے خون کی مدت گذر جانے اور خون بند ہو جانے تک ملتوی رکھو!

ان سب کے علاوہ نواصب نے حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ پر بھی اسی قسم کے طعن و اعتراض ثابت کئے ہیں مثلاً آپؓ نے شراحہ ہمدانیہ پر دونوں حدود (رجم اور درّے) بیک وقت جاری کیں۔ حالانکہ وہ شادی شدہ تھیں۔ اور آپ کا یہ فعل شریعت کے دونوں خلاف ہے۔ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ماعز اور غامدیہ کو رجم کیا۔ اور عقل کے بھی خلاف ہے، اس لئے کہ جب رجم کی سزا جو سخت ترین ہے اس پر جاری ہونی واجب ہے تو اس سے ہلکی سزا درّے کیوں لگائے جائیں۔ اہل سنت تو اس معاند فرقہ کو یہ جواب دیتے ہیں کہ ابتداءً اس کے شادی شدہ ہونے کا علم نہیں تھا اس لئے کوڑے لگوائے، مگر جب معلوم ہوا کہ وہ شادی شدہ ہے تو سنگسار کرا دیا۔ (مگر شیعوں کے مذکورہ بالا طعن کی موجودگی میں ان کا کیا منہ ہے کہ وہ معاند کو کوئی مسکت جواب دے سکیں۔) تو اسے دو حدود کا جمع کرنا نہیں کہہ سکتے!

حاصل کلام یہ ہے کہ حقیقت حال سے لاعلمی اور چیز ہے اور شرعی مسئلہ کا نہ جاننا اور چیز، اور جو شخص اتنا جاہل ہو کہ وہ ان دونوں میں فرق کرنے کی بھی تمیز نہ رکھے وہ قابل خطاب ہی کب ہے! اور یہی صورت پاگل عورت کو رجم کرنے میں درپیش تھی کہ حضرت فاروق رضی اللہ عنہ کو اس کے پاگل ہونے کا علم نہ تھا۔ چنانچہ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ علیہ بحوالہ عطاء بن سائب رحمہ اللہ علیہ ابو ظبیان جنبی رحمہ اللہ علیہ سے روایت بیان فرماتے ہیں کہ لوگ ایک عورت کو بجرم زنا پکڑ کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں لائے ثبوت جرم کے بعد آپؓ نے اسے رجم کی سزا دی، لوگ اسے پکڑ کر سزا کے لئے لے جا رہے تھے کہ اتفاقاً حضرت علی رضی اللہ عنہ مل گئے، آپ نے پوچھا کہ اسے کہاں لے جا رہے ہو؟ لوگوں نے بتایا کہ رجم کے لئے! آپؓ نے ان سے عورت کا ہاتھ چھڑایا اور خود اس کا ہاتھ پکڑ کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس لائے اور فرمایا میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں، یہ پاگل ہے اور فلاں قبیلہ سے تعلق رکھتی ہے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ مجنون پر احکام تکلیف جاری نہیں ہوتے۔ یہ حال معلوم ہونے پر جناب فاروق رضی اللہ عنہ نے رجم کا حکم موقوف فرما دیا! معلوم ہوا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ مسئلہ تو جانتے تھے، مگر اس کے پاگل پن سے واقف نہ تھے اس لئے اسکی حالت کا علم ہوتے ہی آپ نے اسکی سزا موقوف کر دی! بہت سے پاگل ایسے ہوتے ہیں کہ جب تک وہ پاگل پنے کی کوئی حرکت نہ کریں بظاہر نارمل اور سمجھ دار نظر آتے ہیں اس لئے کہ صورت تو پاگل و عاقل کی ایک سی ہی ہوتی ہے، جس اور عقل سے کسی کا جنون معلوم نہیں ہوتا۔ یہ عورت پکڑ دھکڑ سے لے کر اثبات جرم کے مرحلے اور سزا کا حکم جاری ہونے تک کی مراحل سے گذری اور اس کی کسی بات اور کسی حرکت سے اس کا جنون ظاہر نہیں ہوا، تو پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کیوں مطعون ہوتے، اور یہ مسئلہ اپنی جگہ طے ہے کہ امور عقلیہ و حسیہ سے عدم واقفیت نبوت کے لئے بھی نقص نہیں تو خلافت امامت میں کیسے نقص ہوگا،

اور اوراق ماسبق میں شریف مرتضیٰ شیعی کی کتاب الغرر والدرر سے یہ روایت نقل کی جا چکی ہے کہ قبطی کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا علم نہیں تھا کہ وہ سالم العضو ہے، یا مقطوع العضو! جو جناب ماریہ رضی اللہ عنہا کے ہاں آتا تھا۔ (اور ان کا چچا زاد بھائی تھا) اسی طرح اس عورت کے متعلق بھی یہ علم نہ تھا کہ وہ تازہ زچہ ہے اور ایام نفاس میں ہے۔

تو اگر حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو کسی عورت کے حاملہ یا پاگل ہونے کا علم نہ ہو سکا تو خلافت و امامت کی کونسی شرط

میں فرق آگیا۔ خلافت کی شرط احکام شرعی کا جاننا ہے حسیات اور عقلیات جزئیہ کا جاننا شرط نہیں! اور بالفعل احکام شرعیہ کا جاننا نہ نبوت میں شرط ہے نہ خلافت و امامت میں، ہاں نبی کو احکام شرعیہ بذریعہ وحی معلوم ہوتے ہیں۔ اور امام کو اجتہاد سے اور اجتہاد میں کبھی غلطی بھی واقع ہو سکتی ہے۔ جیسا کہ ترمذی کے حوالہ سے حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ کی ایک روایت گزر چکی جس کا ماحصل یہ تھا۔ کہ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے مرتدوں کو جلوا دیا تھا، اسکی خبر حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کو ہوئی تو آپ نے اس پر نکیر فرمائی کہ ان کو قتل کرنا چاہیئے تھا جلانا نہیں چاہیئے تھا کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مرتد کو قتل کرنے کا حکم فرمایا ہے اور آگ کے عذاب سے منع فرمایا ہے۔ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اس کہنے کی اطلاع ہوئی تو آپ نے فرمایا! ابن عباس نے سچ فرمایا، معلوم ہوا کہ اس قسم کی اجتہادی غلطی بھی موجب طعن و اعتراض نہیں نہ اس پر ملامت کی گنجائش ہے۔ چہ جائیکہ بے خبری، عدم علم وہ بھی ایسے موقعہ پر جہاں اس سے واقف و باخبر ہونا ضروری نہیں۔ کیسے ملامت و طعن کا محل بن سکتے ہیں!

یہاں ایک بڑی پیچیدہ اور مشکل صورت حال کا سامنا ہے! خاص کر شیعوں کے لیے کیونکہ نواصب کو بہانہ ہاتھ آگیا ہے وہ کہتے ہیں کہ تین مرفوع القلم لوگوں کے لیے حضرت علی کرم اللہ وجہہ خود روایت بیان فرماتے ہیں مگر دوسری طرف کتب شیعہ میں یہ روایت ہے کہ اِنَّ عَلِیًّا کَانَ یَأْمُرُ بِاِقَامَةِ حَدِّ السَّرِقَةِ عَلَی الصَّبِیِّ قَبْلَ اَنْ یَحْتَلِمَ۔ (جناب علی رضی اللہ عنہ) نابالغ لڑکے پر چوری کی حد جاری کرنے کا حکم فرماتے تھے! محمد بن بابویہ قمی نے اپنی کتاب "من لا یحضرہ الفقیہ" میں یہ روایت بیان کی ہے! آپؓ کا یہ عمل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے صریح خلاف ہے۔ اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا فیصلہ نافذ ہو بھی جاتا تو ایک مخصوص پاگل عورت ہی اس کی زد میں آتی، لیکن جناب امیر رضی اللہ عنہ کے فرمان سے تو ہر بچہ کا ہاتھ چوری کی سزا میں کاٹا جائے گا اور یوں ہزاروں بچے لنجے ہو جائیں گے۔ اب اس کا وبال شیعوں پر ہے۔ وہ کیا جواب دیتے ہیں وہ جانیں، اتنا ضرور ہے کہ یہاں وہ تقیہ کی آڑ بھی نہیں لے سکتے کیونکہ بچوں پر حد عمر و عثمان رضی اللہ عنہما کا مذہب نہیں تھا۔ ہاں اگر پاگل عورت کو سزا دیتے تو تقیہ کا عذر چل سکتا تھا۔ مگر وہاں تو خود آپؓ ہی نے حق ظاہر فرما کر ان کو رجم سے روک دیا! ہاں اہل سنت کے مذہب کے مطابق یہاں کوئی اشکال نہیں اس لیے جناب امیر رضی اللہ عنہ کے حق میں اس شیعی روایت کو تسلیم ہی نہیں کرتے، بلکہ اسے افتراء اور بہتان قرار دیتے ہیں، اور ان کے نزدیک ابن بابویہ کا اس روایت کو بیان کرنا ہی اس کے کذب اور غلط ہونیکی واضح دلیل ہے۔ اور اتنا نواصب بھی جانتے ہیں۔ (نہ جانتے ہوں تو جان لیں) کہ شیعی روایات کے حوالہ سے وہ اہل سنت کو الزام نہیں دے سکتے!

رہا مردہ پر حد لگانے کا معاملہ تو وہ تو سرتا پا جھوٹ اور افتراء کی پوٹ ہے! اہل سنت کے ہاں اس کے متعلق کوئی روایت نہیں ملتی اس لیے اس کے جواب کی بھی کوئی ضرورت نہیں۔ بلکہ صحیح روایات یہ ہیں کہ ابو شحمہ رضی اللہ عنہ حد لگائے جانے کے بعد بھی زندہ رہے۔ البتہ دوران حد اُن پر بیہوشی طاری ہو گئی تھی۔ ممکن ہے اسی کو کسی نے مرنا سمجھ لیا ہو۔

اور ان کا یہ اعتراض کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو شراب نوشی کی حد کا علم نہیں تھا آپ نے دوسروں سے پوچھ پاچھ کر اس کی حد مقرر کی۔ یہ ایک عجیب قسم کا طعن ہے کیونکہ جو چیز پہلے سے موجود نہ ہو اس کا نہ جاننا کوئی عیب یا نقص کی بات نہیں جبکہ شرع میں اس کی حد بندی بھی نہ کی گئی ہو۔ اس لیے کہ علم تو معلوم کے تابع ہوتا ہے۔ (جب ایک چیز موجود ہی نہیں تو اس کا علم کیسے ہوگا)، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں شراب کی حد معین نہیں ہوئی تھی۔ یوں ہی بلا تعین، چابک، بٹی ہوئی چادر جوتیوں یا ہاتھ کی چھڑی سے چند ضربات لگاتے تھے۔ جناب صدیق اکبر کے عہد میں جب چند اصحاب کرام رضی اللہ عنہم نے اس کا تخمینہ لگایا تو گنتی چالیس تک پہنچی

www.Ahlehaq.com

اور جب خلافت عمر رضی اللہ عنہ میں ایسے واقعات نسبتاً زیادہ ہونے لگے تو تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مشورہ کے لئے جمع کئے گئے اور ان سے مشورہ طلب کیا گیا حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ اور بعض روایات کے مطابق جناب عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کہ آپ بھی جناب امیر کے ہم رائے تھے۔ دونوں حضرات نے تجویز فرمایا کہ شراب نوشی کی حد کو حد قذف کے برابر یعنی اسی کوڑے رکھی جائے، اس لئے کہ شراب پی کر آدمی مست ہو جاتا ہے، اسی مستی میں وہ عقل سے بیگانہ ہو کر واہی تباہی بکتا ہے گالی بھی دیتا ہے اور تہمت بھی لگاتا ہے۔

تمام صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم نے اس لطیف استنباط کو پسند کیا اور اسی حد پر سب کا اجماع ہو گیا۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ شراب نوشی کی حد کے بانی مبانی تو خود جناب فاروق اعظم رضی اللہ عنہ ہی ہیں۔ اس لئے یہ کہنا کہ آپ کو حد خمر کا پتہ ہی نہ تھا انتہا درجہ کی بے عقلی کی دلیل ہے، خود امامیہ کے نزدیک بھی یہ قصہ اسی طرح ثابت ہے چنانچہ شیخ ابن مطہر حلی نے منہج الکرامہ میں اس کو نقل کیا ہے۔ یہیں سے ان کے دوسرے اعتراض کا بھی جواب معلوم ہو گیا کہ یہ کہتے ہیں کہ شراب نوشی کی حد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی عقل و رائے سے حد خمر میں اضافہ کیا کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک عہد میں تو صرف چالیس کوڑے تھے۔ تو اگر یہ اضافہ اور زیادتی ہی ہے تو جناب علی رضی اللہ عنہ کے اجتہاد اور مشورہ اور تمام صحابہ کے اتفاق سے ہے۔ تو اکیلے عمر رضی اللہ عنہ ہی ہدف طعن کیوں؟ (انہوں نے تو ایک "معصوم" کی رائے سے یہ حد مقرر فرمائی تھی۔ کیا یہ اس طرح بالواسطہ سہی جناب امیر رضی اللہ عنہ پر طعن کے مرتکب نہیں ہوئے۔ مل) بعض کتب شیعہ میں اس طعن کو دوسرے انداز میں بیان کیا گیا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حد خمر میں اسی سے زیادہ کوڑے لگوائے،" اول تو یہ روایت صحیح نہیں۔ بالفرض صحیح بھی ہو تو ہم کہتے ہیں کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ نے بھی حد خمر میں سو کوڑے لگوائے۔ یعنی اسّی پر بیس کا اضافہ فرما کر، چنانچہ محمد بن بابویہ قمی نے کتاب "لا یحضرہ الفقیہ" میں ایک روایت بیان کی ہے کہ جب نجاشی حارثی شاعر کو عین رمضان المبارک کے ایام میں شراب نوشی کرنے پر پکڑ کر لایا گیا۔ تو جناب امیر رضی اللہ عنہ نے اس کو سو کوڑے لگوائے بیس کوڑے رمضان المبارک کی حرمت کے سبب اضافہ کئے،

اہل سنت بہرطور ان دونوں واقعات کا صرف یہی جواب دیتے ہیں کہ امیر المومنین کو یہ حق پہنچتا ہے کہ انتظاماً یا قدر واجب شرعی میں خیانت و بے حرمتی کے سبب اضافہ کر سکتا ہے! جس پہ جناب امیر رضی اللہ عنہ کا فعل واضح اور کھلی دلیل ہے! لہٰذا اب صرف حضرت عمر رضی اللہ عنہ پہ نہ طعن کی گنجائش ہے اور نہ کوئی وجہ جواز!

اعتراض (۵) یہ ہے کہ امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حد میں سو کوڑے مارنے کے لئے درخت کی ایسی ٹہنی جس میں سو شاخیں تھیں مارنے کا حکم دیا جو سراسر شریعت کے مخالف ہے۔ کیونکہ از روئے حکم قرآن مجید سو کوڑے مارنے کی ہدایت ہے، فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ - دونوں میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو،

جواب یہ ہے کہ (اس اعتراض کا مقصد عناد و تعصب اگر نہیں ہے تو جہالت تو یقینی ہے اس لئے) کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ عمل تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک فعل کے موافق ہے۔ چنانچہ مشکوٰۃ میں نیز شرح السنہ میں جناب سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ سے ایک روایت ہے کہ وہ ایک ناقص الخلقت بیمار شخص کو اس جرم میں کہ وہ محلہ کی ایک لونڈی سے زنا کر رہا تھا پکڑ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لائے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس کے لئے درخت کی ایک لمبی چھڑ لاؤ جس میں سو شاخیں ہوں اور اس سے ایک بار مارو! ابن ماجہ نے بھی اسی جیسی ایک روایت بیان کی ہے۔ اور ایسے مریض کے متعلق جسکی صحت کی امید نہ رہی ہو اہل سنت کا یہی مذہب ہے۔ فتاویٰ عالمگیری میں ہے۔

اَلْمَرِيْضُ إِذَا وَجَبَ عَلَيْهِ الْحَدُّ إِنْ كَانَ الْحَدُّ رَجْمًا — مریض پہ اگر حد واجب ہو اور وہ رجم کی شکل میں ہو تو فی الوقت

يُقَامُ عَلَيْهِ لِلْحَالِ فَإِنْ كَانَ جَلْدًا لَا يُقَامُ عَلَيْهِ حَتّٰى يَبْرَأَ أَوْ يَصِحَّ إِلَّا إِذَا كَانَ مَرِيضًا وَقَعَ الْيَأْسُ عَنْ بُرْئِهٖ فَحِينَئِذٍ يُقَامُ عَلَيْهِ كَذَا فِي الظَّهِيرِيَّةِ وَلَوْ كَانَ الْمَرَضُ لَا يُرْجٰى زَوَالُهٗ كَالسِّلِّ أَوْ كَانَ مُخْدَجًا ضَعِيفَ الْخِلْقَةِ فَعِنْدَنَا يُضْرَبُ بِعِثْكَالٍ فِيهِ مِائَةُ شِمْرَاخٍ فَيُضْرَبُ دَفْعَةً وَلَا بُدَّ مِنْ وُصُولِ كُلِّ شِمْرَاخٍ إِلٰى بَدَنِهٖ كَذَا فِي فَتْحِ الْقَدِيرِ۔

جاری کردی جائے۔ اور اگر کوڑوں کی شکل میں ہو تو فوراً نافذ نہ کی جائے تاوقتیکہ وہ بیماری سے نجات نہ پالے اور تندرست نہ ہو جائے۔ اگر بیماری ایسی ہو کہ اس کے ازالہ اور صحت کی طرف سے ناامیدی ہو تو حد اسی وقت جاری کی جائے جیسے دق وسل کا مریض۔ یا اگر وہ ناقص الخلقت اور ضعیف البدن ہو تو ہمارے نزدیک سو شاخوں والی چھڑی کی ایک ہی ضرب اسطرح ماری جائے کہ ہر شاخ اس کے بدن سے چھوئے ضرور۔ (فتح القدیر میں ایسا ہی مذکور ہے)

اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایسی حد جسکو لگائی وہ ضعیف الخلقت (پیدائشی کمزور) ہی تھا! قرآن مجید میں بھی ایسے حیلہ کی طرف اشارہ ملتا ہے۔ (حضرت ایوب علیہ السلام جب اپنی قسم توڑنے نہ توڑنے کی فکر میں تھے۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ ترکیب بتائی) خُذْ بِيَدِكَ ضِغْثًا فَاضْرِبْ بِهٖ وَلَا تَحْنَثْ۔ ایک مٹھا سینکوں کا لو اور اس کو مارو، اور اپنی قسم نہ توڑو۔

اعتراض (۶) حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر یہ بھی اعتراض ہے کہ آپ نے جناب مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ پر چار گواہوں کی گواہی کے باوجود زنا کی حد لگانے سے درگذر کیا۔ اور ایک گواہ کو ایسا کلمہ سکھا دیا کہ اس کے بعد حد جاری و ثابت نہ ہو سکی۔ یعنی جب چوتھا گواہ گواہی کے لئے آیا تو اس سے کہا اَرٰی وَجْهَ رَجُلٍ لَا يَفْضَحُ اللّٰهُ بِهٖ رَجُلًا مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ۔ (میں ایک، ایسے شخص کا چہرہ دیکھ رہا ہوں کہ اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں میں کے ایک شخص کو رسوا نہ کریگا)

جواب:۔ اس طعن کا جواب یہ ہے کہ حد سے درگذر یا اسے ٹالنا اس وقت کہسکتے ہیں جب ثبوت مکمل ہو گیا ہو، چونکہ چوتھے گواہ کی گواہی صحیح نہیں تھی اس لئے حد ثابت ہی نہیں ہوئی، تو اسے ٹالنے کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے رہا گواہ کو سکھانے پڑھانے کا الزام تو یہ کھلا افترا اور محض بہتان ہے۔ ابن جریر طبری، امام محمد بن اسمٰعیل بخاریؒ اپنی تاریخ میں اور حافظ عماد الدین بن اثیر، حافظ جمال الدین ابو الفرج بن جوزی اور شیخ شمس الدین مظفر سبط بن جوزی اور دوسرے ثقہ مورخین بیان کرتے ہیں کہ جناب مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ بصرہ کے امیر تھے۔ بصرہ کے لوگ شرارت پر تلے ہوئے تھے وہ چاہتے تھے کہ ان کو معزول کرائیں، انہوں نے ایک سازش کے تحت ان پر زنا کی تہمت لگائی۔ اور چند جھوٹے گواہ اٹھے کہ یہ کہ امیر المؤمنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے ان سے گواہی دلائیں۔ اسی سازش کے تحت بصرہ میں اس الزام کی شہرت دی گئی یہانتک کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ تک بھی یہ خبر پہنچی۔ آپ نے ان سب کو بلوایا چنانچہ جناب مغیرہؓ مع چار گواہوں کے مجلس عدالت صحابہ کے روبرو جس میں جناب امیر المؤمنین خود بھی تشریف فرما تھے پیش کئے گئے۔ اہل بصرہ نے بحیثیت مدعی دعویٰ دائر کیا کہ جناب مغیرہؓ نے ام جمیل نامی ایک عورت کے ساتھ زنا کیا۔ گواہ گواہی کے لئے آئے تو ایک نے کہا کہ میں نے ان کو اسکی دونوں رانوں کے بیچ میں دیکھا۔ اس پر امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ نے فرمایا

لَا وَاللّٰهِ حَتّٰى يَشْهَدَ أَنَّهٗ يَلِجُ فِيهَا وُلُوْجَ الْمِرْوَدِ فِي الْمُكْحُلَةِ۔ (نہیں خدا کی قسم (اسوقت تک اسکی گواہی معتبر نہیں) جبتک یہ گواہی نہ دے کہ (اس نے عضو مخصوص کو) اسطرح اندر جاتے دیکھا جس طرح سرمہ دانی میں سلائی جاتی ہے)

اس پر گواہ نے کہا نَعَمْ اَشْهَدُ عَلٰى ذٰلِكَ (ہاں میں اسی کیفیت کی گواہی دیتا ہوں) اس کے بعد دوسرے اور تیسرے گواہ نے بھی اسی طرح گواہی دی۔ جب چوتھا گواہ جو زیاد بن ابیہ تھا گواہی کے لئے آیا تو اس سے پوچھا گیا کہ تم بھی اپنے ساتھیوں کی طرح گواہی دیتے ہو۔

www.Ahlehaq.com

تو اس نے کہا میں اتنا جانتا ہوں کہ
رَأَيْتُ مَجْلِساً وَنَفَساً حَثِيْثاً وَانْتِهَاراً وَرَأَيْتُهُ مُسْتَبْطِناً وَرِجْلَيْنِ كَأَنَّهُمَا أُذُنَا حِمَارٍ ۔ میں نے ایک نشستگاہ، پھولا ہوا سانس، اور ایستادگی دیکھی۔ اور ان کو اس کے پیٹ پر دیکھا، دونوں پاؤں ایسے لگتے تھے جیسے گدھے کے دو کان۔
اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس سے پوچھا کہ کیا تو نے ایسا دیکھا جس طرح سلائی سرمہ دانی میں جاتی ہے۔ اس نے کہا نہیں اس طرح نہیں دیکھا۔ اب اس صورت حال کی موجودگی میں کون کہہ سکتا ہے کہ شرعاً حد ثابت ہوگئی؟ اور یہ مقدمہ بند کرے کا تو تھا نہیں۔ صحابہ کی کھلی مجلس میں سب پیش تھے، سب کے سامنے سوال و جواب ہو رہے تھے۔ اس گواہ کو سکھانے پڑھانے کا مرحلہ کہاں پیش آیا اگر بر سر مجلس جناب عمر رضی اللہ عنہ ایسا کرتے تو کیا صحابہ کرام جن میں جناب علی رضی اللہ عنہم بھی موجود تھے اس کو گوارا فرمالیتے یہ حضرات تو اتنا منصف مزاج عادل اور جری تھے کہ بر سر منبر امیر المومنینؓ کو ٹوکتے اور جواب طلبی سے بھی دریغ نہ کرتے تھے۔ اور پھر یہ معاملہ تو حدود اللہ کا تھا امور شرع اور حدود کے اثبات میں کوئی خامی، سستی اور رواداری برتی جاتی تو صادقوں اور عادلوں اور سچے مسلمانوں کی یہ جماعت کثیر، جو اسی مقصد اور فیصلہ کے لئے جمع ہوئی تھی کب اسے برداشت کر سکتی تھی۔ ان اصحاب کرام رضی اللہ عنہم کی عادت تو امر ناحق و منکر کو چھپانے کی نہیں آشکارا کرنے کی تھی۔ وہ دین کے معاملہ میں نہ بے جا لحاظ کرتے تھے نہ بے جا رواداری برتتے تھے، یہ سب کے سب ایسی غلط روش پر کیسے خاموش رہ سکتے تھے اور جس پر حد ثابت ہو چکی ہو اس کو یوں ہی اچھوتا کیسے جانے دیتے! اگر امیر المومنین رضی اللہ عنہ نے شاہد کو سکھایا ہوتا تو یہ حضرات فوراً ہی آپ کی گرفت کرتے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ وصف خود شیعی روایات سے ثابت ہو چکا ہے کہ آپ قبول حق میں اتنے مستعد تھے کہ دینی امور میں ایک عورت کی بات سے قائل ہو گئے! اور پھر ان کا یہ وصف تو ایک تاریخی حقیقت ہے کہ دین و شریعت کا کوئی اہم کام بغیر صحابہؓ کے مشورہ اور ان کی سوجھ بوجھ کے انجام نہیں دیتے تھے۔ اور شروع طعن میں جس کلمہ کی ادائیگی شیعوں نے آپ کی طرف منسوب کی ہے وہ سراسر غلط ہے۔ اور آپ پر بہت بڑا بہتان ہے۔ البتہ جناب مغیرہ رضی اللہ عنہ کی زبان سے یہ کلمہ نکلا تھا اور جس کی عزت و آبرو، اور جان پر بنی ہو اور بجیاں خویش جھوٹ و سازش کا شکار ہو وہ ایسی باتیں کہتا ہی ہے۔ بات تو گواہ کی ہے کہ اگر وہ صرف اللہ کی رضا کی خاطر گواہی دینے آیا تھا تو وہ جناب مغیرہ رضی اللہ عنہ کی باتوں سے متاثر کیوں ہوا۔ اور اس کا لحاظ کیوں کیا۔ اور اگر گواہ مدعیٰ علیہ کا لحاظ کرکے۔ اور مدعیٰ علیہ کے نقصان کی گواہی دلوائے۔ یہ بات کسی بھی مذہب و شریعت میں نہیں۔
اور اگر یہ مقولہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہی کا مان لیں، تو یہ آپ کی فراست مومنانہ کا ایک نمونہ ہے کہ آپ جو صورت آئندہ سامنے آنے والی ہے اس کو بیان فرما رہے ہیں اور آپؓ کے ساتھ بارہا ایسا ہوا کہ آپ نے قرائن اور مومنانہ بصیرت سے پتہ چلا کر کسی چیز یا واقعہ کے متعلق فرما دیا کہ یہ ایسا ہے۔ اور وہ واقعتاً ویسا ہی ہوا! محض شیعوں کے کہنے سے تو یہ نہیں مانا جا سکتا۔ ان کے پاس اس کا کیا ثبوت ہے کہ حضرت امیر المومنین رضی اللہ عنہ نے گواہ سے یہ کہا کسکے سامنے کہا؟ کون گواہ ہے؟ اسکی دلیل کیا ہے؟ اور یہ شیعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس دلی ارادہ سے کیسے واقف ہو گئے کہ آپ کے دل میں یہ بات تھی کہ گواہ گواہی سے منحرف ہو جائے؟ دل کا حال تو صرف خدا جانتا ہے! اور اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے حد ٹالنے والی بات سرزد ہونا مان لیا جائے تو آپ کا یہ فعل تو امام معصوم'' کے عمل کے مطابق ہو گیا۔ ان پر اگر طعن روا ہے تو امام معصوم'' اس سے کہاں بچیں گے! ان کی مدافعت میں اگر ان کے پاس کوئی جواب ہے تو اسکو یہاں بھی منطبق کر لیں، محمد بن بابویہ قمی نے کتاب من لایحضرہ الفقیہ میں یہ روایت بیان کی ہے کہ اَنَّ رَجُلاً جَاءَ اِلٰى اَمِيْرِ الْمُؤْمِنِيْنَ وَاَقَرَّ بِالسَّرِقَةِ اِقْرَاراً تُقْطَعُ بِهِ الْيَدُ فَلَمْ يَقْطَعْ يَدَهٗ۔ ایک شخص نے امیر المومنین

(علی) رضی اللہ عنہ کی خدمت میں آکر اس انداز میں چوری کا اقرار کیا کہ اس کا ہاتھ کاٹا جانا چاہیئے تھا مگر آپ نے اس کا ہاتھ نہیں کاٹا جب اس کے اقرار سے قطع ید کی حد واجب ہو گئی تھی تو جناب امیرؓ نے اس پر حد کیوں جاری نہیں کی، اور یہ حد کیوں ٹلادی گئی؟

اعتراض (۷) ایک روز حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے خطاب علیہ بڑے بڑے مہر باندھنے کی ممانعت فرمائی اور فرمایا کہ اگر زیادہ مہر کو عزت و خوبی کی بات ہوتی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کے زیادہ حقدار تھے۔ حالانکہ میں نے دیکھا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ازواج مطہرات اور صاجزادیوں (رضی اللہ عنہن) کے مہر پانچسو سے زیادہ کے نہیں باندھے لہٰذا تمہیں چاہیئے کہ سنت رسول پر سختی سے عمل کرو اور زیادہ مہر نہ باندھو۔ آئندہ اگر کسی نے زیادہ مہر باندھا۔ تو میں مقدار سنت سے زیادہ رقم بحق بیت المال ضبط کر لوں گا۔ اس پر ایک خاتون اٹھی اور کہنے لگی۔ عمر سنو! اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَآتَيْتُمْ إِحْدَاهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَأْخُذُوا مِنْهُ شَيْئًا۔ اگر عورتوں کو مال کا ڈھیر دے ڈالو تو اس ڈھیر سے کچھ بھی واپس نہ لو۔

ایسی صورت میں تمہیں کیا حق ہے کہ مہر کی زائد از سنت رقم واپس لو۔ اگرچہ ان کی مقدار کتنی ہی کیوں نہ ہو۔ اس پر جناب نے فرمایا كُلُّ النَّاسِ أَفْقَهُ مِنْ عُمَرَ حَتَّى الْمُخَدَّرَاتِ فِي الْحِجَالِ۔ (دین کی سمجھ میں سب ہی عمر سے بڑھے ہوئے ہیں حتیٰ کہ چھپر کھٹوں کی پردہ نشین عورتیں بھی) اس واقعہ میں شیعوں کے بقول نظر قابل اعتراض بات یہ ہے کہ آپ ایک عورت کے مقابل لاجواب ہو گئے۔ کوئی جواب نہ بن پڑا اور جو ایک عورت کو جواب دینے سے عاجز ہو وہ امامت کے قابل کب ہو سکتا ہے۔ جواب اس کا یہ ہے کہ حقیقت وہ نہیں ہے جس پر شیعہ بغلیں بجائیں، آپ کی خاموشی اس لئے نہیں تھی کہ آپ اس کا جواب باصواب دینے سے عاجز ہو گئے تھے بلکہ آپ کتاب اللہ کے ادب و احترام کی بنا پر خاموش ہو گئے تھے۔ کہ وہ اپنے کو کتاب اللہ کے مقابل رکھ کر اس کے جواب سے گریز کر رہے تھے۔ (نیز آپ یہ بھی سمجھ گئے ہوں گے کہ محترمہ کا مبلغ علم کتنا ہے۔ قرآنی آیت کا مفہوم احادیث کی روشنی میں ان کو سمجھانے اور بتانے کا یہ موقعہ بھی نہ تھا کہ وہ کوئی محفل مناظرہ تو تھی نہیں۔ جب آپ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کا حوالہ دے چکے تھے۔ اس کے باوجود محترمہ یہ نہ سمجھ سکیں کہ آپ کا یہی مفہوم ہوتا جو وہ سمجھ رہی ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم زیادتی مہر کو ناپسند نہ فرماتے، ایسے وقت آپؓ کا سکوت ہی صحیح اور مناسب تھا۔ ن)

کیونکہ کتاب اللہ کے مقابلہ میں چون وچرا، یا توجیہات و تاویلات بلند مرتبہ اہل ایمان کے شایاں شان نہیں۔ ان کے نزدیک اسلم راستہ یہی ہے کہ وہ قرآن کے ظاہری الفاظ کو تسلیم کر لیں۔ اور اسی لئے آپؓ نے سکوت اختیار فرمایا۔ (دراصل ان محترمہ کو اعتراض زائد از سنت مقدار کی واپسی پر تھا۔ اور اسی کے ثبوت میں یہ قرآنی آیت پڑھی) اگر ان کی غرض حوالہ یہ ہوتی کہ اللہ تعالیٰ بھاری بھاری مہر باندھنے سے راضی ہوتا ہے تو یہ بات تو جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کی فہم مبارک کے صریحاً خلاف ہے کیونکہ احادیث صحیحہ میں کثرت و زیادتی مہر کی نفی منقول ہے! خطابی نے غریب الحدیث میں یوں روایت کی ہے کہ

عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَيَاسَرُوا الصَّدَاقَ فَإِنَّ الرَّجُلَ يُعْطِي الْمَرْأَةَ حَتَّى يَبْقَى فِي نَفْسِهِ حَسِيكَةٌ

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مہر میں آسانی کرو۔ آدمی اگرچہ (بھاری مہر بھی) عورت کو دیتا ہے مگر دل میں پھانس سی چبھی رہ جاتی ہے!

ابن حبانؒ نے اپنی صحیح میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی ہے کہ

قَالَ قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّ مِنْ خَيْرِ النِّسَاءِ أَيْسَرَهُنَّ صِدَاقًا۔

کہتے ہیں فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ عورتوں میں وہ عورت بہتر ہے جس کا مہر بہت ہلکا ہو۔

www.Ahlehaq.com

عَنْ عَائِشَةَ عَنْهُ صلی اللہ عَلَيْهِ وسلم قَالَ يُمْنُ الْمَرْأَةِ تَسْهِيلُ أَمْرِهَا فِي صِدَاقِهَا۔

ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت فرماتی ہیں کہ عورت کا مبارک ہونا اس کے مہر کا آسان و ہلکا ہونا ہے۔

احمد و بیہقی کی مرفوع روایت ہے کہ۔

أَعْظَمُ النِّسَاءِ بَرَكَةً أَيْسَرُهُنَّ صِدَاقاً۔

(سب سے زیادہ بابرکت وہ عورت ہے جس کا مہر سب سے زیادہ ہلکا ہو)

اس آیت سے زیادہ سے زیادہ مہر کی زیادتی کا جواز نکل سکتا ہے اگرچہ بکراہت ہوگا۔ لیکن وہ نص کہاں ہے جو یہ متعین کرے کہ آیت میں لفظ قنطار سے مہر مراد ہے، کیونکہ اس میں یہ احتمال بھی ہے کہ وہ قنطار زیور روپیہ، پیسہ، اور رسانہ و سامان ہو جو مرد اپنی بیوی کو دیتے ہیں۔ مہر نہ ہو! اس لئے کہ اس قسم کے عطایا و ہدایا جوان عورتوں کو ہبہ کر دئے جاتے ہیں۔ ان کو واپس لینا زیبا نہیں۔ خاصکر ایسی صورت میں جبکہ اسے طلاق دے کر بے آسرا اور تکالیف معاش وغیرہ کے حوالہ کر رہے ہو، ایسی حالت میں تو اس ہبہ کی واپسی اور بھی زیادہ تکلیف دہ ہوگی جو خلاف شرع بھی اور خلاف مروت بھی! اور امر جائز میں ممانعت مصالح ملی و ملکی پر بھی مبنی ہو سکتی ہے۔ وہ مسلمانوں کے لئے خیر خواہانہ نصیحت بھی ہو سکتی ہے۔ کہ وہ اپنے اموال بے جا نمود و نمائش، غلط فخر و مباہات، زمانہ سازی اور اسراف بے جا میں نہ ضائع کریں۔ کہ یہ دوسرے حقداروں کی حق تلفی کا سبب بھی ہو سکتا ہے، جس کا نتیجہ باہم تنازعات، مقدمہ بازی، لڑائی جھگڑے اور کسی بڑے فتنہ کی صورت میں نکل سکتا ہے۔

اور مصالح ملکی و ملی کی نگہداشت اور جائز اخراجات پر قدغن، یا انہیں محدود کرنا خلیفہ وقت کا کام ہے۔ ہر زمانہ میں اس کے نظائر ہر جگہ دیکھے جا سکتے ہیں۔

اب دیکھیے کہ طلاق ایک امر جائز ہے مگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جناب زید رضی اللہ عنہ کو اس سے منع فرماتے تھے۔ کہ وہ جناب زینب رضی اللہ عنہا کو طلاق نہ دیں علی ہذا نکاح سنت نبوی ہے مگر حضرت علی کرم اللہ وجہہ اہل کوفہ سے فرماتے تھے کہ

یا اَهْلَ كُوفَةَ لَا تُزَوِّجُوا الْحَسَنَ لِأَنَّهُ مِطْلَاقٌ لِلنِّسَاءِ (اے اہل کوفہ حسن (رضی اللہ عنہ) کی شادی نہ کراؤ کیونکہ وہ عورتوں کو طلاق بہت دیتے ہیں، حالانکہ انؓ کا فعل جائز تھا۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے جس کلام پر اعتراض ہے اس سے واضح طور پر یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ مہر کی زیادتی کے جواز کے تو قائل تھے مگر انجام بد پہ نظر فرما کر روکتے تھے۔

اگر ان محترمہ کا آیت سے مقصد مال کی واپسی حرام ہوتا ہو۔ تو وہ حرمت خاوندوں اور شوہروں کے ثابت ہوگی۔ نہ کہ ان خلفاء یا احکام کے لئے جو ڈانٹ ڈپٹ کر اس سے روکیں۔ اور اسکی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ وَإِنْ أَرَدْتُمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَكَانَ زَوْجٍ وَآتَيْتُمْ إِحْدَاهُنَّ قِنْطَاراً۔ اور اگر تمہارا ارادہ ایک بیوی کو چھوڑ کر دوسری کو لانا ہو اور ان میں سے ایک کو ڈھیروں مال دیدیا ہو! (تو اس میں سے کچھ بھی واپس نہ لو) اور یہ حق بیت المال کی ڈانٹ بطور تنبیہ تھی۔ ویسے جمہور اہل سنت کے نزدیک خلیفہ کو یہ حق ہے کہ اگر کسی فی الحال یا فی المآل فتنہ کا اندیشہ ہو تو جائز بات پر بھی قدغن لگا سکتا اور سزا دے سکتا ہے۔ اور مال کی قرقی بھی ایک قسم کی سزا ہے۔ اور اعتراض میں یہ کہنا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی غلطی کا اقرار کیا، ایک معاندانہ اور بے سر و پا جھوٹ ہے۔ کسی بھی روایت میں اس اقرار کی تصریح نہیں۔ البتہ وہ جملہ آپنے ضرور فرمایا جو ایک طرف تو آپ کی تواضع، کسر نفسی اور حسن اخلاق کی نشاندھی کرتا ہے کہ آپ نے سوچا کہ ایک ناواقف علوم قرآن اپنی سوچ سمجھ کے مطابق اپنی بات کی سند قرآن مجید سے لائی ہے اب اس کے استنباط کو دلائل صحیحہ سے غلط بتاؤں تو دل شکستہ ہو جائیگی، اور پھر استنباط قرآن کی شاید جرأت نہ کرے۔ اس لئے مناسب ہے کہ اس کی دل جوئی کی خاطر اپنے کو اس معاملہ میں معترف اور قائل کروں تاکہ اسکو بھی اور دوسروں کو بھی معانی قرآن

میں غور خوض اور اس کے دقائق اخذ کرنے کی امنگ پیدا ہو اور یک گونہ قرآن سے وابستگی رہے۔ تو دوسری طرف اسکے قول کی تردید بھرے مجمع میں اس کو شرمندگی سے بچانے کا مقصد بھی ظاہر کرتا ہے، اس قصہ کے علاوہ دوسرے واقعات سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ آپ میں یہ وصف خاص طور پر تھا کہ آپ چاہتے تھے کہ لوگ کتاب اللہ سے وابستگی حاصل کریں اور قرآن پر غور و فکر اور مسائل کے اخذ و استنباط میں مشغول رہیں۔ ورنہ کون رئیس وقت اور حاکم زمانہ ایسا بے نفس ہوتا ہے کہ اعیان حکومت یا مجمع احباب و معتقدین میں ایک ناسمجھ عورت کی سمجھ بوجھ کی تعریف و توصیف کے ساتھ اپنے کو قائل اور ملزم کے روپ میں پیش کرے۔ اور اس کے سوال پر چپ ہو جائیے! اگر بالفرض آپؓ سے کوئی جواب نہیں بن پڑا تھا تو ان محترمہ کی گرفت کرنے اور ڈانٹ ڈپٹ کے لئے ایک جواز تو موجود ہی تھا اور آپ اسکو اس معاملہ میں سزا بھی دے سکتے تھے کیونکہ آپ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک سنت کا ذکر رہے تھے اور وہ اس کے مقابلہ میں قرآنی آیت لاکر نعوذ باللہ گویا یہ ظاہر کر رہی تھیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس آیت سے بے خبر تھے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کا وہ مطلب نہ سمجھے جو میں سمجھی ہوں۔ لیکن مقتدایان دین و شریعت کی شان کا تقاضہ یہی ہوتا ہے کہ ان کے نفوس پاک میں نفسانیت اور سخن پروری کی بو تک نہ آئے۔ انہیں تو صرف حق کی تلاش اور اس کا اتباع منظور ہوتا ہے اور وہ حق خود ان کے اپنے پاس ہو یا دوسرے سے حاصل ہو۔ اسی لئے تمام اکابرین و ارباب یقین اس منقبت عظیم میں باہم شریک و سہم ہیں جناب علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے متعلق بھی اسی قسم کا ایک قصہ منقول ہے چنانچہ ابن جریر اور ابن عبد البر نے محمد بن کعب سے روایت کی ہے کہ

قَالَ سَأَلَ الرَّجُلُ عَلِيًّا عَنْ مَسْئَلَةٍ فَقَالَ فِيْهَا فَقَالَ الرَّجُلُ لَيْسَ هٰكَذَا وَلٰكِنْ كَذَا وَكَذَا قَالَ عَلِيٌّ اَصَبْتَ وَاَخْطَاْنَا وَفَوْقَ كُلِّ ذِيْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ

راوی کہتا ہے کہ حضرت علی (رضی اللہ عنہ) سے ایک شخص نے کوئی مسئلہ پوچھا آپ نے اس کے جواب میں کچھ فرمایا تو اس نے پلٹ کر کہا کہ نہیں ایسا نہیں ہے بلکہ ایسا ایسا ہے جناب علیؓ نے فرمایا تو نے ٹھیک کہا ہم سے خطا ہو گئی۔ اور ہر جاننے والے سے اونچا جاننے والا ہے!

آپؓ کے اس قابل تعریف طرز عمل کو نواصب نے اسی طرح مورد طعن بنایا جس طرح بدخو بدفطرت شیعوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے معاملہ میں کہا! یہاں ایک بات ذہن نشین رہنی چاہیئے کہ اگر کسی ایک مسئلہ میں امام سے زیادہ کسی کو معلومات ہوں۔ یا اس مسئلہ کے نکات کا غیر امام کو علم ہو اور امام کی معلومات اور ذہن وہاں تک نہ پہنچا ہو تو یہ بات خلافت و امامت کی لیاقت کو ناقص نہیں بناتی، اور ان کی لیاقت میں کوئی فرق نہیں آتا کیونکہ حضرت داؤد علیہ السلام نبی ہونے کے ساتھ بحکم الٰہی انا جعلناک خلیفة فی الارض خلیفہ وقت بھی تھے۔ مگر کسی دوسرے کا کھیت چر جانے والی بکریوں کا جو مقدمہ آپ کے سامنے آیا، اس کے حکم کے سمجھنے میں حضرت سلیمان علیہ السلام کا ذہن تیز نکلا اور وہ معاملہ کو سمجھ گئے۔ حالانکہ وہ اسوقت نہ نبی تھے نہ خلیفہ و امام! بلکہ نو عمر ہی تھے اس کے باوجود معاملہ فہمی میں حضرت داؤد علیہ السلام سے سبقت لے گئے! ابن بابویہ قمی نے من لا یحضرہ الفقیہ، میں بروایت احمد بن عمر حلبی لکھا ہے کہ

قَالَ سَأَلْتُ اَبَا الْحَسَنِ عَنْ قَوْلِهٖ تَعَالٰى وَدَاوٗدَ وَسُلَيْمَانَ اِذْ يَحْكُمٰنِ فِي الْحَرْثِ قَالَ حَكَمَ دَاوٗدُ بِرِقَابِ الْغَنَمِ وَفَهَّمَ اللّٰهُ سُلَيْمَانَ اَنَّ الْحُكْمَ لِصَاحِبِ الْحَرْثِ فِي اللَّبَنِ وَالصُّوْفِ۔

میں نے ابی الحسن (رحمہ اللہ علیہ) سے اللہ کے فرمان وداؤد وسلیمان کے بارے میں پوچھا تو آپ نے کہا کہ داؤد علیہ السلام نے بکریاں دلانے کا فیصلہ کیا تھا اور اللہ تعالیٰ نے سلیمان کو معاملہ سمجھا دیا کہ کھیت والے کا حق دودھ اور اون میں ہے،

لہٰذا اگر ایک مسئلہ اللہ تعالیٰ کسی نادان عورت کو سمجھا دیں اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو نہ سجھائیں۔ تو ان کی خلافت و امامت میں اس سے کیا نقصان لازم آتا ہے۔ وہاں حضرت داؤد علیہ السلام کی نبوت میں بھی تو اس واقعہ سے کوئی نقص واقع نہیں ہوا۔ اور ظاہر ہے خلافت و امامت تو نبوت کی نیابت ہے۔ اور دنیا میں وہ کون ایسا ہے جس کو اپنے بارے میں یہ تجربہ نہ ہوا ہو کہ بعض اوقات بدیہی اور سامنے کی بات تک بھی ذہن نہیں پہنچا۔ اور عقل و فہم میں اس سے کم تر لوگ فوراً بات کی تہ کو پہنچ گئے اور انہوں نے اس نتیجہ پر اسے تنبیہ کیا۔ مگر بغض و عناد نے جس کے دل پر قبضہ کر رکھا ہو اس کا کیا علاج۔

اعتراض ۲ یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خمس میں سے اہل بیت کا حصہ ان کو نہیں دیا اور یوں قرآن کے حکم کے خلاف کیا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے، وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰكِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ۔ معلوم رہے کہ مال غنیمت میں سے جو کچھ تم پاؤ اس میں سے پانچواں حصہ اللہ، اس کے رسول، رسول کے قرابتدار، اور یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہے۔

جواب: اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ امامیہ مذہب کی رو سے یہ اعتراض صحیح نہیں اس لئے کہ ان کے نزدیک یہ آیت، مصارف خمس کے بارے میں ہے استحقاق کے بیان کے لئے نہیں ہے۔ لہٰذا اگر امام وقت کی صوابدید کا تقاضا یہ ہو کہ ان بیان کردہ چار مصارف میں سے کسی ایک کے لئے وہ مخصوص کر دے تو اس کے لئے یہ جائز اور درست ہے! امامیہ کی ایک جماعت کثیر کا یہی مذہب ہے۔ چنانچہ ابوالقاسم مصنف شرائع الاحکام نے جس کو امامیہ محقق کے لقب سے یاد کرتے ہیں، اور دوسرے علماء نے اس کی تصریح کی ہے اور اس کے ثبوت میں اپنے ائمہ سے روایات بیان کی ہیں۔ لہٰذا اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک، دو سال اس خیال سے ان کو خمس نہ دیں کہ ان کو ضرورت نہ رہی ہو۔ یا ان کے مقابلہ میں دوسرے فریق زیادہ حاجتمند ہوں تو اس میں اعتراض کی کیا بات ہے۔ اور آیت کا مفہوم بھی یہی ہے کہ خمس ان چار طبقوں ہی کو دیا جائے ان سے باہر کسی کو نہ دیا جائے اور پھر ان میں سے خواہ ہر ایک کو دیا جائے خواہ ایک دو کو! اور اسکی دلیل یہ ہے کہ آیت زکوٰۃ انما الصدقات الخ میں بھی مصارف زکوٰۃ کا ہی بیان مقصود ہے اور صحیح مذہب بھی یہی ہے اسی لئے اگر کوئی ان آٹھ طبقوں میں سے کسی ایک ہی طبقہ کو زکوٰۃ دے تو جائز ہے۔ یہی حکم یہاں بھی ہے! اور خود جناب علی رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانہ میں ذوالقربیٰ کا حصہ خود نہیں لیا بلکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے طریقہ کے مطابق بنی ہاشم کے فقراء اور مساکین کو دے دیا کرتے ان سے جو کچھ بچ رہتا وہ دوسرے مسلمان فقراء و مساکین میں بانٹ دیتے! طحاویؒ اور دار قطنیؒ نے بحوالہ محمد اسحاق روایت بیان کی ہے کہ

اَنَّهٗ قَالَ سَاَلْتُ اَبَا جَعْفَرٍ مُحَمَّدَ بْنَ عَلِیِّ بْنِ الْحُسَیْنِ اَنَّ اَمِیْرَ الْمُؤْمِنِیْنَ عَلِیَّ بْنَ اَبِیْ طَالِبٍ لَمَّا وَلِیَ الْاَمْرَ النَّاسِ كَیْفَ صَنَعَ فِیْ سَهْمِ ذَوِی الْقُرْبٰی فَقَالَ سَلَكَ بِهٖ وَاللّٰهِ مَسْلَكَ اَبِیْ بَكْرٍ وَعُمَرَ۔

میں نے جناب ابو جعفر رحمہ اللہ سے پوچھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ جب خلیفہ ہوئے تو آپ نے ذوی القربیٰ کے حصہ کے متعلق کیا طریقہ اختیار فرمایا۔ تو آپ نے جواب دیا کہ خدا کی قسم وہ اسی مسلک پر عمل پیرا رہے جو حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کا تھا۔

وَزَادَ الطَّحَاوِیُّ فَقُلْتُ كَیْفَ اَنْتُمْ تَقُوْلُوْنَ قَالَ وَاللّٰهِ مَا كَانَ اَهْلُهٗ یَصْدُرُوْنَ اِلَّا عَنْ رَاْیِهٖ۔

طحاوی نے یہ ٹکڑا مزید بیان کیا۔ میں نے کہا اب آپ کا اس بارے میں کیا خیال ہے تو فرمایا خدا کی قسم آپؓ کے اہل آپ کی رائے کے خلاف نہیں چل رہے۔

اور تقسیم خمس میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا طریق عمل یہ تھا کہ اول اہل بیت کے نادار و مساکین کو عنایت فرماتے۔ پھر جو بچ رہتا اسے

www.Ahlehaq.com

بیت المال میں داخل کر کے بیت المال کے مصارف میں لگاتے رہتے۔ اسی لئے اہل بیت کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے خمس دینے کی روایات تعداد میں زیادہ بھی ہیں اور مشہور و متواتر بھی بہت ہیں! ابو داؤد نے عبد الرحمن بن ابی لیلی سے بحوالہ حضرت علی رضی اللہ عنہ یوں نقل کی ہے کہ اَنَّ اَبَا بَكْرٍ وَعُمَرَ قَسَمَا سَهْمَ ذَوِي الْقُرْبٰى لَهُمْ۔ حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما۔ دونوں نے ذو القربی کا حصہ ان کو تقسیم کیا۔ نیز ابو داؤد نے حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ سے یہ بھی روایت کی ہے۔ اَنَّ عُمَرَ كَانَ يُعْطِي ذَوِي الْقُرْبٰى مِنْ خُمُسِهِمْ۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ذوی القربی کو خمس دیا کرتے تھے۔ یہ حدیث صحیح ہے اور حافظ عبد العظیم منذری نے اسکی صحت کی تصریح کی ہے۔ روایات کی روشنی میں اس مسئلہ کی تحقیق یہ معلوم ہوتی ہے کہ حضرت ابو بکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما خمس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قرابتداروں کا حصہ نکالا کرتے تھے اور اسکو ان کے نادار اور مسکینوں میں تقسیم فرماتے تھے اس کے علاوہ بھی ان کی دیگر ضروریات اسی سے حل اور پوری فرمایا کرتے تھے اس کو میراث کے طور پر ہر غنی و فقیر، محتاج و غیر محتاج کو نہیں دیتے تھے خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا طرز تقسیم بھی یہی تھا۔ اور احناف نیز امامیہ کی ایک بڑی جماعت کا اب بھی یہی مذہب و مسلک ہے جیسا کہ احکام الشرائع کے حوالہ سے اوپر مذکور ہوا۔ ہدایہ میں بیان کیا گیا ہے۔

اَمَّا الْخُمُسُ فَيُقْسَمُ عَلٰى ثَلٰثَةِ اَسْهُمٍ سَهْمٌ لِلْيَتَامٰى وَ سَهْمٌ لِلْمَسَاكِيْنِ وَسَهْمٌ لِاَبْنَاءِ السَّبِيْلِ يَدْخُلُ فُقَرَاءُ ذَوِي الْقُرْبٰى فِيْهِمْ وَيُقَدَّمُوْنَ وَلَا يُدْفَعُ اِلٰى اَغْنِيَائِهِمْ۔

خمس تین حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے ایک یتیموں کے لئے ایک مساکین کے لئے اور ایک مسافروں کے لئے جن میں فقراء ذوی القربی داخل ہیں۔ اور مقدم! ان کے غنی اور مالداروں کو نہیں دیا جاتا۔

وَقَالَ الشَّافِعِيُّ لَهُمْ خُمُسُ الْخُمُسِ يَسْتَوُوْنَ فِيْهِ غَنِيُّهُمْ وَفَقِيْرُهُمْ وَيُقْسَمُ بَيْنَهُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ وَيَكُوْنُ بَيْنَ بَنِي هَاشِمٍ وَبَنِي الْمُطَّلِبِ دُوْنَ غَيْرِهِمْ لِقَوْلِهٖ تَعَالٰى وَ لِذِي الْقُرْبٰى مِنْ غَيْرِ فَصْلٍ بَيْنَ الْغَنِيِّ وَ الْفَقِيْرِ۔

امام شافعی رحمہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس خمس کا ایک خمس نکالا جائے گا اور اس میں غریب اور مالدار سب برابر ہوں گے اس میں سے عورت کو اکہرا حصہ ملے گا مرد کو اس کا دوگنا۔ یہ تقسیم محدود ہو گی بنی ہاشم اور مطلب میں غیروں کو اس میں سے نہیں دیا جائے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ کے قول ذوی القربی میں فقیر و غنی کی کوئی تمیز نہیں ‘‘

اب سوچنے (اور شرمانے) کی بات یہ ہے کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا فعل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کے موافق تھا اور بعد میں وہ "معصوم" کے فعل کے مطابق بھی ثابت ہوا۔ اور امامیہ کی ایک بڑی جماعت کا مذہب بھی یہی قرار پایا تو فاروق اعظم رضی اللہ عنہ پر طعن کا کیا جواز اور کیا گنجائش رہ جاتی ہے،

رہی بات شافعی مسلک کے خلاف ہونیکی۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ امام شافعی رحمہ اللہ علیہ کے مقلد تو تھے نہیں کہ اس بہانے ان کو ہدف طعن بنایا جائے! اور پھر جب احناف و امامیہ آپ کے طرز عمل کے مؤید ہیں تو شافعیہ کی مخالفت سے کیا ڈرنا۔

اب غور طلب یہ مسئلہ رہ گیا کہ جب دینے اور نہ دینے کی دونوں روایات صحیح ہیں تو ہر دو قسم روایات میں تطبیق کی صورت کیا ہو۔ تو ان میں تطبیق کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔

(۱) چونکہ محتاجوں کو دیتے تھے، اغنیاء کو نہیں دیتے تھے۔ جن کو ملا انہوں نے کہا دیتے ہیں۔ جنکو نہ ملا وہ کہتے ہیں نہیں دیتے تھے!

(۲) نفی و اثبات دینے کی وجوہ اور طریقہ سے متعلق ہے جس نے دینے کے متعلق کہا اس نے یہ مطلب لیا کہ مصرف کے مطابق دیا۔ اور

جس نے نہ دینے کے متعلق کہا اس کا مطلب یہ تھا کہ وراثت کے طور پر نہیں دیا۔ اس صورت میں ہر دو قسم کی روایات اپنی اپنی جگہ صحیح درست ہیں! اور اس تطبیق کی دلیل یہ ہے کہ مفصل روایات میں یوں بیان کیا گیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ خمس میں سے قرابت داروں کا حصہ نکال کر اپنے پاس رکھ لیتے تھے نام بنام خانہ بخانہ تقسیم نہیں کرتے تھے۔ بلکہ یکمشت حضرت علی و حضرت عباس رضی اللہ عنہما کے سپرد فرماتے اور یہ ہدایت دیتے کہ اس میں سے فقراء کو دیں، بیواؤں کا نکاح کرائیں۔ کنواروں کی شادی کرائیں جن کے پاس خادم نہیں ان کے لئے لونڈی غلام خریدیں۔ بے گھروں کے گھر بنوادیں شکستہ گھر والوں کے گھروں کی مرمت کرادیں۔ بے سواری والوں کو سواری دلوادیں چنانچہ آپ کی خلافت کے آخر تک یہی معمول رہا۔ آپ کی حیات مبارک کا آخری سال تھا تو بدستور سابق دونوں حضرات کو بلوا کر فرمایا کہ خمس میں سے ذوی القربیٰ کا حصہ لیں جس پر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ امسال بنی ہاشم میں کوئی محتاج و حاجتمند باقی نہیں رہا۔ البتہ عام مسلمانوں میں فقراء کی تعداد بڑھ گئی ہے اس لئے بہتر یہی ہے کہ امسال یہ حصہ بھی ان مسلمانوں ناداروں میں تقسیم فرمادیں۔ اس وجہ سے آپ کی خلافت کے آخری سال یہ حصہ ذوی القربیٰ میں تقسیم نہیں ہوا۔ اگرچہ اس مجلس سے اٹھنے کے بعد حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ٹوکا کہ تم نے ایک غلطی کی۔ تمکو وہ مال حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے اپنے قبضہ میں لیکر فقراء مسلمین میں اپنے ہاتھ سے تقسیم کرنا چاہیئے تھا۔ ہوسکتا ہے بعد کے خلفاء تمہارے اس فعل کو سند بنالیں اور یہ کہکر تمکو اس کے دینے سے انکار کردیں کہ تم تو خود ہی اسکو موقوف کرچکے اور لینے سے انکار کرچکے ہو!

اب ہر سہ مذاہب (حنفی، شافعی، امامی) کی روشنی میں مسئلہ خمس کی تفصیلی حیثیت ملاحظہ فرمائیے!

شیعوں کے نزدیک جو شخص امام ہو وہ آدھا خمس خود لے لے، اور آدھا یتیموں مسکینوں اور مسافروں کو بقدر حاجت و ضرورت بانٹ دے ان کے نزدیک سات چیزوں میں خمس واجب ہوتا ہے۔

(۱) وہ مال غنیمت جو حربی کافروں سے ہاتھ لگے خواہ کتنا ہی ہو (۲) کوئی کان ہو مثلاً فیروزہ، تانبہ، سونا، چاندی، گل ارمنی، یا کسی بھی قسم کی ہو۔ البتہ اس کے ضروری اخراجات مثلاً کھدائی صفائی وغیرہ کر کے باقی ماندہ کی قیمت بیس مثقال شرعی سونے جتنی ہو (۳) دریا و سمندر سے غوطہ زنی سے جو کچھ حاصل ہو (۴) حلال و حرام مال جو آپس میں رل مل جائیں (۵) وہ زمین جو ذمی نے مسلمان سے خریدی ہو۔ (۶) جو دفینہ زمین سے نکلے اور (۷) وہ نفع و فائدہ جو تجارت، زراعت، حرفت یا ان جیسے کسی پیشہ سے حاصل ہو جب یہ فائدہ اس شخص کے کل سالانہ اخراجات سے بڑھ جائے تو اس کا خمس دیا جائے!

حنفیہ کے نزدیک پورے خمس کے تین حصے کئے جائیں گے۔ ان تین میں سے دو حصے یتیموں، مسکینوں اور مسافروں میں تقسیم کئے جائیں گے، البتہ یہ لحاظ رکھا جائے کہ پہلے ہاشمی، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کو دیا جائے۔ ان سے بچ جائے تو پھر عام مسلمانوں کے یتیموں، مسکینوں اور مسافروں میں تقسیم ہو۔ اور احناف کے نزدیک خمس تین چیزوں میں واجب ہوتا ہے، (۱) مال غنیمت (۲) کان منطبع۔ (وہ کان جس سے نقش و نگار آرائش و زیبائش وغیرہ کی اشیاء نکلتی ہوں) جیسے سونا چاندی، تانبا، رانگ پارہ وغیرہ (۳) زمین سے نکلنے والا دفینہ خزانہ!

اور شوافع کے نزدیک خمس کے پانچ حصے کئے جائیں ایک حصہ بنام رسول خلیفہ وقت کو دیا جائے۔ دوسرا بنی ہاشم و بنی مطلب کے امیر وغریب میں بطریق میراث کہ مرد کو دو حصے اور عورت کو ایک حصہ، برابر تقسیم کیا جائے (یعنی امیر وغریب میں کوئی فرق نہ کیا جائے) باقیماندہ تین حصے عام مسلمانوں کے یتیموں، مسکینوں اور مسافروں میں تقسیم کئے جائیں۔ ان کے نزدیک خمس دو چیزوں میں واجب ہوتا ہے۔ (۱) مال غنیمت۔ (۲) زمین سے برآمد ہونے والا خزانہ! اب اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی تقسیم کو ان ہر سہ مذاہب مابعد پر

www.AhleHaq.com

جانچیں تو بظاہر حنفیہ اور اکثر امامیہ کے مذاہب سے بہت ملتی جلتی صورت نظر آئیگی۔ کہ یکمشت حضرت عباس و حضرت علی رضی اللہ عنہما کے سپرد کرتے۔ بنی ہاشم کے ہر شخص کو تقسیم نہیں کرتے تھے۔

اعتراض ۹) یہ ہے کہ دین میں آپ نے ایسی نئی باتیں نکالیں جن کا پہلے وجود نہ تھا۔ مثلاً باجماعت تراویح۔ کہ جو خود ان کے اعتراف سے بدعت ہے! اور متفق حدیث یہ ہے کہ مَنْ اَحْدَثَ فِیْ اَمْرِنَا هٰذَا مَا لَیْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ وَكُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ۔ جس نے ہمارے اس دین میں کوئی ایسی بات نکالی جو اس میں نہیں ہے وہ مردود ہے، اور ہر نئی نکالی ہوئی بات گمراہی ہے،

(ان مسکینوں کا وہ حال ہے کہ آنکھیں بند کرکے منہ کھول دیا۔ اب انہیں پتہ نہیں کہ ہم غلط سلط کیا کہہ رہے ہیں کس کو کہہ رہے ہیں بات میں وزن بھی ہے یا نہیں یہی کیفیت اس طعن میں ہے اگر آنکھیں کھول کر انہوں نے اپنی ہی کتابیں پڑھی ہوتیں تو معلوم ہوجاتا کہ) اس طعن سے اہل سنت کو الزام نہیں دیا جاسکتا اس لئے کہ خود انہیں کی کتب حدیث سے بطریق شہرت و تواتر یہ ثابت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان المبارک میں تین رات تراویح باجماعت ادا فرمائیں، دیگر نوافل کی طرح ان کو تنہا ادا نہیں فرمایا اور ترک جماعت پر بطور عذر یہ فرمایا۔ اِنِّیْ خَشِیْتُ اَنْ یُفْرَضَ عَلَیْكُمْ۔ مداومت کی وجہ سے مجھے یہ اندیشہ ہے کہ یہ تم پر فرض نہ کردی جائے۔ اور جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد فرضیت کا خدشہ نہ رہا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ثابتہ کا اجراء واحیاء فرما دیا! سنیوں اور شیعوں دونوں کے ہاں یہ اصولی قاعدہ مقرر و موجود ہے کہ جو حکم نص شارع کے مطابق کسی عذر و علت اور سبب سے مقید ہو۔ تو جب وہ عذر و علت باقی نہ رہے تو وہ حکم بھی ختم ہوجاتا ہے۔ اور ان کا یہ کہنا کہ خود حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسکو بدعت کہا تو گویا بدعت کا اعتراف کرلیا۔ تو دراصل یہ بھی ان کی سمجھ کا پھیر اور رعنا دکا مظہر ہے۔ کیونکہ آپ نے یہ فرمایا تھا نِعْمَتِ الْبِدْعَةُ هٰذِهٖ۔ کیا ہی اچھی نئی بات ہے! تو اس کا مطلب یہ تھا کہ جماعت ادائگی پر ہمیشگی نئی بات ہے۔ اور چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا منشا مبارک پہلے سے معلوم تھا کہ عذر نہ ہوتا تو آپؐ کے نزدیک اس پر مداومت پسندیدہ و مرغوب تھی اس لئے موانع اور عذر اٹھ جانے پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پسند فرمودہ طریقہ کا اجراء آپ کے ذریعہ ہورہا ہے تو آپؓ کے لحاظ سے تو نئی بات ہے مگر منشاء نبوت کے مطابق ہونیکی وجہ سے یہ نئی بات" اچھی ہے اسے برا اور گمراہی کی بات کہنے کی کون مسلمان جرأت کرسکتا ہے! یہ حفظ مراتب کی بات ہے۔ اسے معاند و حاسد اور بدگو کب سمجھ سکتا ہے۔ یہی ایک بات نہیں اور بھی بہت سی ایسی باتیں ہیں جو جناب رسول رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں نہ تھیں مگر خلفاء و ائمہ کے وقت میں اجماع امت سے ان کو وجود ملا۔ ان کو بدعت نہیں کہیں گے اور اگر کسی کو بدعت کا لفظ بہت ہی محبوب ہو تو اسے اجازت ہے کہ حَسَنَة" کے لاحقہ کے ساتھ اسے بدعت "حَسَنَة" کہہ لے، مگر "بدعت سیئہ" کہنے کا اصول شرع کی روشنی میں اسے نہ حق ہے نہ اس کے پاس جواز! اس لئے کہ حدیث (نئی بات) اس چیز کے ساتھ مخصوص ہے جسکی نہ شریعت میں کوئی اصل و بنیاد ہو نہ خلفاء و ائمہ اور اجماع امت سے اس کا ثبوت ملتا ہو! اور اگر اس بات کو یہ شیعہ نہ مانیں۔ تو ان کی عید غدیریہ، جشن و تعظیم نوروز، قتل عمر کے دن نماز و مسرت (شکرانہ۔ لونڈیوں کی شرمگاہوں کی حلت۔ بعض اولاد کو ترکہ سے محروم کرنے کا فعل وغیرہ کا کیا بنے گا۔ (یہ تو صورت و حقیقت دونوں لحاظ سے بدعات سیئات ہیں۔ کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں تو کسی ذہن میں ان کا تصور تک بھی نہ تھا۔ ان کا گمان (فاسد) ہے کہ یہ تمام امور ائمہ نے نکالے اور اختراع کئے ہیں۔ اگر یہ بات ہے تو اہل سنت کے نزدیک۔ خلفائے راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین بھی ائمہ کا درجہ اور حکم رکھتے ہیں۔ (اور ان کا یہ دعویٰ تمہارے دعوں کی طرح بے اصل و بے دلیل نہیں بلکہ) اس پر ایک مشہور حدیث کی دلالت بھی موجود ہے۔

مَنْ يَعِشْ مِنْكُمْ بَعْدِيْ فَسَيَرَىٰ اِخْتِلَافًا كَثِيْرًا فَعَلَيْكُمْ بِسُنَّتِيْ وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِيْنَ مِنْ بَعْدِيْ عَضُّوْا عَلَيْهَا بِالنَّوَاجِذِ۔

تم میں سے جو میرے بعد زندہ رہے گا اسے بہت اختلاف نظر آئیں گے۔ اسوقت تم پر میری سنت اور میرے بعد کے خلفائے راشدین کی سنت پر عمل لازم ہے، اس کو دانت گڑو کر پکڑ لو۔

لہٰذا معلوم ہوگیا کہ خلفائے راشدین کی نکالی ہوئی بات بدعت کہہ کر رد کرنے کی چیز نہیں بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی مانند مضبوطی سے تھامنے والی لائق عمل سنت ہے۔

اعتراض (۱۰) شیعہ اپنی کتابوں میں لکھ گئے ہیں کہ اِنَّ عُمَرَ قَضٰى فِي الْجَدِّ مِائَةَ قَضِيَّةٍ۔ عمرؓ نے دادا کی میراث کے بارے میں سو فیصلے نافذ کئے! لطیفہ ملاحظہ ہو کہ یہی عبارت نواصب نے جناب علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے بارے میں لکھی ہے اب پتہ نہیں اس جھوٹ گھڑنے میں پہل کس نے کی۔ اور سرنامہ اپنے من پسند نام ٹانگ دیئے۔ ممکن ہے جس استاد کے دونوں شاگرد ہیں اسی نے گھڑ کر ہر ایک کے حوالہ کردی ہو۔ البتہ اہل سنت کے ہاں یہ روایت قطعی موجود نہیں! اس لئے انہیں اسکی طرف نہ توجہ کی ضرورت ہے نہ جواب کی فکر! امامیہ چونکہ روایات میں اختلاف اور ردوبدل کے عادی مشہور ہیں اس لئے اس کی جھلک یہاں بھی موجود ہے کسی نے یہ روایت جؔ (جد) سے کی ہے تو کسی اور نے حؔ (حد) سے، اور بعض روایات میں "حد الخمر" کے الفاظ ہیں۔ (بہرحال یہ ان کا معاملہ ہے اگر یہ "خدا" کو "جدا" کر دیں تو آپ کیا کریں گے۔ ن)

قاعدہ کے مطابق تو اس اعتراض کے جواب دینے کے ہم پابند نہیں۔ تاہم اپنے ان "مہربانوں" کی خاطر فرضی طور پر اسے مان لیں تو "حد خمر" والی روایت پر تو ہمیں اعتراض کی کوئی بات نظر نہیں آتی اس لئے کہ اسوقت تک کتاب وسنت میں اسکی کوئی حد مقرر نہ تھی۔ اس لئے صحابہ کرام کے دلوں میں اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق مختلف خیالات وتجاویز ہوتی تھیں، اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی کسی آخری نتیجہ پر پہنچنے کے لئے ہر ایک کی رائے اور خیال جانچتے اور پرکھتے رہتے ہوں گے! اور جب صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی مجلس میں حضرت علی مرتضیٰ وجناب عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہما کی رائے باصواب پر اجماع منعقد ہوگیا۔ تو اختلاف قضیہ کا سوال ہی نہ رہا۔

اور اگر یہ جیم سے جد ہے تو یہ ان کا کھلا جھوٹ ہے اس لئے کہ جد کی میراث کے بارے میں تو اختلاف حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت کے عہد میں بھی تھا۔ اس بارے میں صحابہ کرام مختلف الخیال تھے۔ بالآخر معاملہ دو اقوال پر ٹھہرا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ کا قول تھا کہ اسے باپ کی جگہ تصور کریں۔ اور دوسرا قول حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کا کہ اس کو بھی ایک بھائی سمجھ کر شریک میراث کریں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان دونوں اقوال کی ترجیح میں متردد تھے۔ آپ کا رجحان قول صدیق رضی اللہ عنہ کی ترجیح کی جانب تھا۔ اس سلسلہ میں آپ بارہا حضرت ابی بن کعب اور حضرت زید بن ثابت نیز دوسرے کبار صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے گھروں پر گئے دونوں جانب گفت وشنید ہوئی بحث ومباحثہ ہوا دلیلیں دی گئیں، اور یہ بات کسی طرح بھی عیب شمار نہیں کی جاسکتی۔

یہ تو مفاد ملت کے لئے مسئلہ کی تعیین کا قابل تعریف عمل تھا۔ ایسی صورت میں سینکڑوں دلیلیں دی جاتی ہیں، ہر دلیل کا مدعا اور قضیہ جدا ہوتا ہے، اس پر طعن کرنا انتہائی نادانی اور کور ذوقی کے سوا کچھ نہیں۔ اس بحث ومباحثہ کے نتیجہ میں حضرت زید بن ثابتؓ کا قول آپ کے نزدیک قابل ترجیح قرار پایا۔ صورت مسئلہ کی تشریح وتفہیم کے لئے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ آپ کو اپنے گھر لے گئے، وہاں آپ نے ایک نہر کھودی، اس میں سے شاخیں، شاخوں میں سے نالیاں نکالیں اور اس نہر میں اس انداز سے پانی چھوڑا کہ تمام شاخوں اور نالیوں میں پہنچنے لگا۔ پھر ایک ذیلی نالی کا منہ بند کر دیا تو اس کا پانی پلٹ کر بیچ کی نالی میں آگیا اور اسکی مساوی سطح والی نیز اس سے نیچے والی نالیوں میں بہنے لگا مگر اوپر والی نالی میں نہیں چڑھا! اس تصویر وتمثیل سے یہ ثابت ہوگیا کہ دادا سے بیٹے کو اور

www.Ahlehaq.com

بیٹے سے بیٹوں کو جو کچھ پہنچا۔ وہ اس سلسلہ کے رک جانے سے دوبارہ سارے کا سارا تنہا دادا کو واپس نہیں پہنچے گا دادا کی قرابت اپنی جگہ پر ایک الگ قرابت ہے اور بھائیوں کی قرابت الگ۔ ایک دوسرے کی قرابت باہم کسی دوسرے قرابت کو باطل نہیں کرتی۔ اس تمثیل سے جناب فاروق اعظم رضی اللہ عنہ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے قول کی ترجیح پر مطمئن ہو گئے!

اعتراض ۱۱ آپ نے عورتوں سے متعہ کرنے اور حج تمتع کرنے سے منع کیا حالانکہ یہ دونوں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مبارک میں جاری تھے، اس طرح آپ نے گویا خدا کے حکم کو منسوخ اور اللہ کی حلال کردہ چیز کو حرام قرار دیا۔ اور کتب اہل سنت میں آپ کا یہ اعتراف بایں الفاظ موجود ہے۔ مُتْعَتَانِ کَانَتَا عَلٰی عَھْدِ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَاَنَا اَنْھٰی عَنْھُمَا دو طرح کے جو متعے عہد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم میں رائج تھے میں ان دونوں سے منع کرتا ہوں!

جواب:۔ اہل سنت کے نزدیک حدیث کی صحیح تر کتاب مسلم میں بروایت سلمہ بن اکوع سبرہ بن معبد جہنی نیز دیگر صحاح میں بروایت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ یوں مروی ہے کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے متعہ کو حرام قرار دیدیا تھا۔ صرف تین یوم کے لئے اجازت دی تھی پھر یہ حرمت تا قیام قیامت قرار دیدی گئی تین دن کی اجازت بھی جنگ اوطاس کے موقعہ پر دی گئی تھی۔ پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی متعہ کے حرام ہونے والی روایت تو اتنی متواتر اور مشہور ہوئی کہ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کی تمام اولاد اور محمد بن الحنفیہ کی ساری اولاد اس روایت کو بیان کرتے چلے گئے اور موطا، بخاری و مسلم اور دوسری متداول اور مستعمل کتابوں میں بہت سی سندوں کے ساتھ یہ روایات منقول ہیں۔

شیعوں نے ان روایات میں یہ شبہ ڈالا ہے کہ یہ حرمت غزوہ خیبر کے وقت تھی پھر جنگ اوطاس کے وقت دوبارہ حلال کر دیا گیا۔ مگر ان کی شرارت نہیں تو بے خبری پر ضرور محمول ہے۔ ورنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت کو دراصل غزوہ خیبر کو خانگی گدھوں کے گوشت کی حرمت کی تاریخ ٹھہرایا گیا ہے۔ حرمت متعہ سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ البتہ عبارت ایسی ہے جس سے یہ وہم پیدا ہوتا ہے کہ دونوں کی حرمت کی تاریخ خیبر ہی ہے۔ اسی وہم کو بعض محققین نے نقل کرتے ہوئے کہدیا ہے۔ نَھٰی عَنْ مُتْعَۃِ النِّسَآءِ یَوْمَ خَیْبَرَ۔

لیکن اگر حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ اس روایت میں تحریم متعہ کو خیبر کی تاریخ سے متعین فرماتے تو آپؓ کا ابن عباس رضی اللہ عنہما پر رد و الزام درست کیسے ہوتا۔ حالانکہ جب آپ نے ان کو الزام دیا تو یہی روایت پیش کی اور ابن عباس رضی اللہ عنہما کو متعہ جائز سمجھنے پر ان الفاظ سے ڈانٹا جھڑکا! اِنَّکَ رَجُلٌ تَائِہٌ (تم ایک پاگل آدمی ہو) لہٰذا جو شخص تحریم متعہ کی تاریخ غزوہ خیبر بتاتا ہے وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت سے غلط استدلال کا مدعی ہے۔ اور یہی دعویٰ اسکی جہالت و حماقت پر گواہی کیلئے کافی ہے اہل سنت کی ایک جماعت نے جناب عبد اللہ اور حسن محمد ابن الحنفیہ رحمہما اللہ کے دونوں صاحبزادوں سے روایت کی ہے جو انہوں نے اپنے والد سے اور انہوں جناب امیر المومنین رضی اللہ عنہ سے بیان کی کہ آپ نے فرمایا۔ اَمَرَنِیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَنْ اُنَادِیَ بِتَحْرِیْمِ الْمُتْعَۃِ۔ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے متعہ کے حرام ہونیکی منادی کرنے کا حکم فرمایا! پس معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مبارک میں ایک یا دوبار متعہ حرام قرار پاگیا جس کو اس کی اطلاع ہو گئی وہ اس سے رک گیا۔ اور جسے خبر نہ ہو سکی وہ نہ رکا۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا عہد آیا اور یہ معلوم ہوا کہ بعض جگہ یہ فعل ضرورت کی حد سے نکل کر رواج اور فیشن کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ تو آپؓ نے اس کی حرمت بیان فرمائی اور احکامات ریاست کی طرح اسکو شہرت دی۔ اور لوگوں کو ڈرایا دھمکایا۔ یہاں تک کہ بالآخر اس کی حرمت ہر خاص و عام کے علم میں بھی آگئی اور ذہن نشین بھی ہو گئی، کہ واقعی حضور صلی اللہ علیہ وسلم اسکی حرمت بیان فرما چکے ہیں! حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے کلام سے بھی تو معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں یہ عمل ہوا۔

www.Ahlehaq.com

اس سے یہ لازم تو نہیں آتا کہ وہ حلال ہو کیکی شکل میں راجح بھی ہو یا اس کے حلال ہونے کا حکم باقی بھی ہو! پھر اگر احادیث و روایات سے قطع نظر بھی کرلی جائے تو قرآنی آیات سے صراحتاً اسکی حرمت کا پتہ چلتا ہے۔ ان آیات میں شیعی تاویلات سے اگر کام لیا جائے، جیسا کہ سابق اوراق میں بیان کیا گیا ہے۔ تو ان سے آیات کی تحریف لازم آتی ہے! متعہ والی عورت کو یہ بیوی کیسے ثابت کر سکتے اور یہ درجہ اس کو کیسے دے سکتے ہیں، جبکہ بیوی کے احکام مثلاً عدت، طلاق، ایلا، ظہار، اس سے صحبت سے درجہ حصان کا حصول۔ امکان لعان اور وراثت، خود شیعوں کے نزدیک بھی اس پر لاگو اور منطبق نہیں ہوتے، اور یہ ایک عام ظاہر قاعدہ ہے کہ جب خبر پائی جاتی ہے تو وہ اپنے تمام لوازم کے ساتھ پائی جاتی ہے! اور ابو بصیر نے اپنی صحیح میں جناب ابی عبد اللہ صادق رحمہ اللہ علیہ سے یوں روایت کی ہے کہ اَنَّہٗ سُئِلَ عَنِ الْمُتْعَۃِ اَھِیَ مِنَ الْاَرْبَعِ قَالَ لَا وَلَا مِنَ السَّبْعِیْنَ۔ آپ سے متعہ کے متعلق پوچھا کہ کیا وہ چار میں داخل ہے؟ آپ نے فرمایا نہیں نہ چار میں نہ ستر میں۔

اس روایت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ممتوعہ بیوی شمار نہیں ہوتی ورنہ چار میں ضرور شامل ہوتی! اور قرآن مجید میں جہاں کہیں عورتوں سے نفع اٹھانے کو جائز و حلال قرار دیا ہے وہیں احصان اور سفاح کی قید لگائی گئی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

وَاُحِلَّ لَکُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِکُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِکُمْ مُّحْصِنِیْنَ غَیْرَ مُسَافِحِیْنَ۔ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنَاتِ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ مِنْ قَبْلِکُمْ اِذَا اٰتَیْتُمُوْھُنَّ اُجُوْرَھُنَّ مُحْصِنِیْنَ غَیْرَ مُسَافِحِیْنَ۔

اور ان عورتوں کے علاوہ دوسری عورتیں بھی تمہارے لئے حلال کی گئی ہیں اگر مال کے بدلہ تم ان کو حاصل کرنا چاہو تو بیوی بنالو مستی نکالنے کے لئے نہ اپناؤ۔ آج تمہارے لئے حلال کی گئیں مسلمان پاکدامن عورتیں بھی، اور ان قوموں کی پارسا عورتیں بھی جن کو تم سے پہلے کتاب دی گئی جبکہ تم ان کو ان کا معاوضہ (مہر) دے دو اور مقصد بھی بیوی بنانا ہو نہ کہ شہوت رانی۔

اور ظاہر ہے ممتوعہ میں احصان (بیوی پن) نہیں ہے۔ اور خود شیعہ بھی اس کو احصان کا سبب نہیں سمجھتے! نہ غیر شادی شدہ متعہ کرنے والے پر حد رجم لگاتے ہیں۔ دوسری طرف یہ بھی ظاہر ہے کہ متعہ کرنے والا مسافح (صرف مستی نکالنے والا) ہے کہ اسکی غرض ماء دافق۔ (اچھلتا پانی) نکالنا۔ اور اس پانی کے مقامات کو خالی کرنا ہے۔ نہ اس سے مقصد گھر بسانا ہوتا ہے۔ نہ حصول اولاد، اور عزت و ناموس کی حفاظت، وغیرہ! اہل سنت کے مقابلہ میں حجت و دلیل کے طور پر شیعوں کے پاس لے دے کر صرف یہ آیت ہے۔

فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِہٖ مِنْھُنَّ فَاٰتُوْھُنَّ اُجُوْرَھُنَّ فَرِیْضَۃً پھر جس طرح تم ان سے منتفع ہوتے ہو تو ان کا جو مہر مقرر ہوا ہے وہ ادا کرو!

اور اسکی بابت ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ یہ متعہ کے حلال ہونے پر ہرگز دلالت نہیں کرتی، اور استمتاع سے مراد فعل زوجیت ہے جس پر لفظ فا دلالت کرتی ہے اور ایک کلام کے دوسرے کلام کے بعد آنے یا اس کے کلام سابق پر موقوف ہونے کو بتاتی ہے۔ اور اس سے پہلے کی آیت میں نکاح اور مہر کا ذکر ہے! اور یہ لوگ حضرت عبد اللہ بن مسعود اور حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہم کی طرف منسوب کرکے یہ بات کہتے ہیں کہ یہ حضرات اس آیت کو "فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِہٖ مِنْھُنَّ اِلٰی اَجَلٍ مُّسَمًّی" پڑھتے تھے جس سے صاف متعہ کا پتہ چلتا ہے۔ تو ان کا یہ قول ہفوات کے ذیل میں آتا ہے۔ اس لئے کہ ان کا منقول لفظ (الی اجل مسمی) بالاجماع قرآن میں موجود نہیں۔ اور قرآن کے متواتر ہونے پر ہر دو فرقے شیعہ و سنی متفق ہیں۔ نہ یہ حدیث پیغمبر ہے۔ تو اب حجت و دلیل میں یہ کیا پیش کرتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ جو بات یہ کہہ سکتے ہیں یہ ہو سکتی ہے کہ یہ روایت شاذہ منسوخہ کہہ دیں۔ اور منسوخ شدہ شاذ روایت کو جسکی صحیح سند مفقود ہو قرآن محکم یقینی کے مقابلہ پر لانا۔ اور قرآن محکم یقینی کو اس کی وجہ سے ترک کرنا اور نظر انداز کرنا کس عقلی توجیہہ کی بنا پر قابل توجہ ہے۔

اور پھر شیعہ وسنی دونوں میں یہ اصولی قاعدہ مقرر وطے شدہ ہے کہ حلت وحرمت کی دو دلیلیں جو قوت ویقین میں مساوی ہوں باہم متضاد ومتعارض ہوں تو حرمت کے حکم کو مقدم رکھنا چاہیئے! لیکن یہاں تو یہ دلیل متعارض نہیں بلکہ ایک صریح کذب، اور جھوٹ ہے، اس لئے کہ اس قرأت کو نہ تو اب تک کسی نے سنا ہے نہ عرب وعجم میں پھیلے ہوئے لاکھوں کروڑوں قرآنی نسخوں میں سے کسی میں یہ عبارت دیکھی گئی۔ تو پھر اباحت کو کیسے مقدم رکھ سکتے ہیں! اور یہ لوگ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی نسبت سے جو یہ کہتے ہیں کہ آپ متعہ کو جائز سمجھتے تھے۔ تو اے کاش! یہ جناب ابن عباس رضی اللہ عنہما ہی کے تمام مسائل پر کاربند ہوتے تو کم از کم صراط مستقیم پر تو قائم ہوتے۔ لیکن یہ تو یہ بھی نہیں جانتے کہ جناب ابن عباس رضی اللہ عنہما اس مسئلہ پر فرماتے کیا تھے۔ قصہ تو دجناب المحترم رضی اللہ عنہ کی تصریح کے مطابق یوں ہے کہ آپ فرماتے تھے متعہ ابتدائے عہد اسلام میں مطلقاً مباح تھا اور اب صرف مجبور کے لئے ایسا مباح ہے جس طرح کسی کیلئے خون، خنزیر اور مردار! چنانچہ بطریق خطابی حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ سے یوں روایت بیان کرتا ہے کہ۔ قُلْتُ لِابْنِ عَبَّاسٍ لَقَدْ سَارَتْ بِفُتْيَاكَ الرُّكْبَانُ وَقَالُوْا فِيْهَا شِعْرًا قَالَ وَمَا قَالُوْا قُلْتُ قَالُوْا۔

فَقُلْتُ لِلشَّيْخِ لَمَّا طَالَ مَجْلِسُهُ، يَا شَيْخُ هَلْ لَكَ فِي فُتْيَا ابْنِ عَبَّاسٍ۔ فِي بَضَّةٍ رُخْصَةِ الْأَطْرَافِ انِسَةٍ۔ تَكُوْنُ مَثْوَاكَ حَتّٰى مَصْدَرِ النَّاسِ۔

فَقَالَ سُبْحَانَ اللّٰهِ مَا بِهٰذَا أَفْتَيْتُ اِنَّمَا هِيَ كَالْمَيْتَةِ وَالدَّمِ وَلَحْمِ الْخِنْزِيْرِ۔ میں نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے کہا سواروں نے آپ کا فتوی مشہور کر رکھا تھا۔ اور اس پر اشعار بھی کہے ہیں، آپ نے پوچھا وہ شعر کیا ہیں میں نے کہا وہ کہتے ہیں کہ جب شیخ کی مجلس طویل ہوئی تو میں نے ان سے کہا کہ کیا آپ کو ابن عباس کے فتوے کے مطابق ایک نازک اندام لطیف ونرم بدن اور خود سپرد عورت میں کوئی رغبت ہے جو لوگوں کی واپسی تک آپ کا ٹھکانا ہو آپ نے فرمایا بہت خوب، میں نے تو یہ فتوی نہیں دیا وہ (متعہ) مردار، خون، اور خنزیر کی طرح ہے۔

جامع ترمذی میں امام ترمذی رحمہ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یوں روایت کی ہے۔

قَالَ اِنَّمَا كَانَتِ الْمُتْعَةُ فِي أَوَّلِ الْإِسْلَامِ كَانَ الرَّجُلُ يَقْدَمُ الْبَلْدَةَ لَيْسَ لَهُ بِهَا مَعْرِفَةٌ فَيَتَزَوَّجُ الْمَرْأَةَ بِقَدْرِ مَا يَرٰى أَنَّهُ يُقِيْمُ بِهَا فَتَحْفَظُ لَهُ مَتَاعَهُ وَتُصْلِحُ لَهُ شَيْئَهُ حَتّٰى اِذَا نَزَلَتِ الْاٰيَةُ اِلَّا عَلٰى أَزْوَاجِهِمْ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ كُلُّ فَرْجٍ سِوَاهُمَا حَرَامٌ۔

آپ نے فرمایا ابتدائے عہد اسلام میں متعہ تھا (ہوتا یہ تھا کہ) کوئی شخص شہر وقصبہ میں اپنے کام سے آتا تھا وہاں کسی سے اس کی جان پہچان نہ ہوتی تو وہ کسی عورت سے اپنی مدت قیام کا یقین کرکے شادی کر لیتا تھا جو اس کے سامان کی حفاظت کرتی اور اس کی ہر چیز درست رکھتی تا آنکہ یہ آیت نازل ہوئی تب حضرت نے فرمایا صحبت کی ان دو صورتوں کے علاوہ ہر طریقہ حرام ہے!

یہ تو عورتوں کے متعہ کا حال تھا، اب رہا متعۃ الحج" یعنی اشہر حج میں ایک ہی سفر میں یا ایک ہی احرام میں حج وعمرہ کرنا، جو حج تمتع یا حج قران کی صورتیں ہیں اس سے آپ نے ہرگز منع نہیں فرمایا۔ یہ آپ پر افتراء یا بہتان ہے۔ البتہ آپ اسکو اولیٰ سمجھتے تھے کہ آدمی آئے عمرہ کرے اور گھر لوٹ جائے۔ اور پھر آئے اور حج کرے۔ دوسرے معنوں میں حج کی تینوں قسموں میں سے آپ حج افراد کو اولیٰ سمجھتے تھے! اب بھی امام شافعی سفیان ثوری اور اسحاق بن راہویہ رحمہم اللہ کے نزدیک حج افراد ہی افضل ہے۔ بعض اور فقہا کا بھی یہی مذہب ہے۔ اور اس افضلیت کی دلیل آیت۔ وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ (حج وعمرہ کو اللہ کے لئے پورا کرو) ہے اور اتمام کے معنے تفسیر آیت میں یوں مذکور ہیں اِتْمَامُهُمَا أَنْ تُحْرِمَ بِهِمَا مِنْ دُوَيْرَةِ أَهْلِكَ۔ (ان دونوں کے اتمام کا مطلب یہ ہے کہ اپنے اہل (بیوی بچے) کی قیام گاہ سے دونوں کا احرام باندھے۔) (یعنی عمرہ کرکے گھر آئے پھر گھر سے احرام باندھ کر حج کو جائے!) پھر آگے ارشاد ہے۔

www.Ahlehaq.com

فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ (پس اگر کوئی عمرہ کا فائدہ حج کے ساتھ اُٹھائے تو اسے چاہیئے کہ مطابق گنجائش ہدی واجب ساتھ لے جائے)، ہدی، یا قربانی متمتع پر فرض ہے جبکہ مفرد پر فرض نہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ تمتع میں کوئی ایسی کمی ہے جسے پورا کرنے کے لئے ہدی کو واجب قرار دیا۔ اور تمام شرعی فرائض پر نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ حج میں ہدی۔ قصور کی بنا پر ہی واجب ہوتی ہے۔ ہدی کے ساتھ تمتع و قران بھی جائز ہے۔ اور حدیث مبارک سے یہ معلوم ہو جاتا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حج افراد کو تمتع و قران دونوں سے زیادہ پسند فرمایا اس کی افضلیت کی واضح دلیل ہے، اس لئے کہ آپ نے حجۃ الوداع کے موقعہ پر حج افراد ہی ادا فرمایا۔ اور عمرۃ القضاء اور عمرہ جعرانہ کے وقت صرف عمرہ ہی فرمایا۔ حالانکہ عمرہ جعرانہ کے موقعہ پر آپؐ نے فرصت بھی پائی مگر آپؐ نے حج نہیں فرمایا اور مدینہ منورہ واپس تشریف لے گئے۔ اور عقلاً بھی حج و عمرہ دونوں کی افرادی ادائیگی ہی افضل معلوم ہوتی ہے کہ ہر ایک کے لئے احرام اور ادائیگی کے لئے جدا جدا سفر نیکیوں کے دوچند ہونے کا سبب ہو گا۔ جیسے ہر نماز کے لئے تازہ وضو کا مستحب ہونا۔ یا ہر نماز کے لئے جائے سکونت سے مسجد میں جانا۔

اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جس متعۃ الحج کو منع فرمایا اور اسے جاری نہ رکھا وہ متعۃ الحج دوسرے معنوں میں ہے یعنی حج کو فسخ کر کے عمرہ ادا کرنا اور بلا عذر عمرہ کے لئے حج کے احرام سے نکلنا۔ اور اسی پر امت کا اجماع ہے کہ اس قسم کا متعۃ الحج بلا عذر حرام ہے ہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے مصلحتاً یہ فسخ کرایا تھا، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد اس عمل سے جاہلیت کی ایک ناروا اور غلط رسم کو توڑنا تھا۔ ایام جاہلیت میں وہ لوگ اشہر حج میں عمرہ کو بدترین گناہ سمجھتے تھے۔ وہ کہتے تھے اِذَا عَفَى الْاَثَرُ وَبَرَأَ الدُّبُرُ وَانْسَلَخَ الصَّفَرُ حَلَّتِ الْعُمْرَةُ لِمَنِ اعْتَمَرَ۔ جب نشانات قدم مٹ جائیں سواری کی پیٹھ کے زخم اچھے ہو جائیں اور صفر کا مہینہ گذر جائے تو عمرہ کرنے والوں کے لئے عمرہ حلال ہو جاتا ہے۔

چونکہ یہ عمل مصلحتاً تھا اس لئے اسی وقت و زمانہ کے لئے مخصوص تھا، دوسروں کے لئے یہ جائز نہیں کہ بلا عذر یہ فسخ کریں۔ حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ نیز دیگر صحابہ کی روایت سے یہ تخصیص ثابت ہے چنانچہ مسلمؒ نے ابوذر رضی اللہ عنہ کی روایت یوں بیان کی ہے کہ انہوں نے فرمایا کَانَتِ الْمُتْعَةُ فِی الْحَجِّ لِاَصْحَابِ مُحَمَّدٍ خَاصَّةً (متعۃ الحج اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے مخصوص تھا۔) اور نسائیؒ نے حارث بن بلال رضی اللہ عنہ سے بایں الفاظ روایت کی ہے کہ قَالَ قُلْتُ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ فَسْخُ الْحَجِّ لَنَا خَاصَّةً اَمْ لِلنَّاسِ عَامَّةً فَقَالَ بَلْ لَنَا خَاصَّةً۔ (میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ یہ فسخ حج ہمارے لئے خاص ہے یا عام امت کے لئے بھی ہے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ ہمارے لئے ہی مخصوص ہے)، نووی رحمۃ اللہ علیہ نے مسلم کی شرح میں لکھا ہے،

قَالَ الْمَازِرِیُّ اُخْتُلِفَ فِی الْمُتْعَةِ الَّتِیْ نَهٰی عَنْهَا عُمَرُ فِی الْحَجِّ فَقِیْلَ فَسْخُ الْحَجِّ اِلَى الْعُمْرَةِ وَقَالَ الْقَاضِیْ عِیَاضٌ ظَاهِرُ حَدِیْثِ جَابِرٍ وَعِمْرَانَ بْنِ حُصَیْنٍ وَاَبِیْ مُوْسٰی اَنَّ الْمُتْعَةَ الَّتِیْ اخْتَلَفُوْا فِیْهَا اِنَّمَا هِیَ فَسْخُ الْحَجِّ اِلَى الْعُمْرَةِ قَالَ وَلِهٰذَا كَانَ عُمَرُ یَضْرِبُ النَّاسَ عَلَیْهَا وَلَا یَضْرِبُهُمْ عَلٰی مُجَرَّدِ التَّمَتُّعِ اَیِ الْعُمْرَةِ فِیْ اَشْهُرِ الْحَجِّ۔

مازریؒ کہتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جس متعہ سے حج کے زمانہ میں روکا ہے اس میں اختلاف ہے بعض نے کہا ہے کہ وہ عمرہ کے لئے حج فسخ کرنے کی صورت ہے۔ قاضی عیاض رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ حضرت جابرؓ، عمرانؓ بن حصین اور ابو موسیٰ رضی اللہ عنہم کی حدیث سے بظاہر یہ سمجھ میں آتا ہے کہ وہ متعہ جس میں اختلاف ہے وہ عمرہ کے لئے حج فسخ کرنا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ایسا کرنے پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ لوگوں کی گوشمالی بھی کر دیتے تھے۔ صرف تمتع پر نہیں مارتے تھے، یعنی اشہر حج میں عمرہ کرنے پر!

www.Ahlehaq.com

اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ فرمانا "انا انھی عنھما" اس کا مطلب یہ ہے میں جو تمہارا والی وحاکم ہوں منع کرتا ہوں کہ تمہارے دلوں پر خاطر خواہ اثر ہو، کیونکہ میں دینی معاملات میں جو سختی برتتا ہوں تم کو بخوبی اندازہ ہے، اس لئے اس معاملہ میں تساہل نہ برتنا۔ رہا معاملہ اصل نہی اور ممانعت کا سو قرآن مجید اور حدیث مبارک دونوں سے وہ پہلے ہی ثابت ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے،
فَمَنِ ابْتَغَىٰ وَرَاءَ ذَٰلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْعَادُونَ ۔ (ان مذکورہ صورتوں کے علاوہ اگر کوئی اور صورت اختیار کرنا چاہے پس وہ حد سے تجاوز کرنے والے ہیں۔) یا وَأَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلَّهِ ۔ حج وعمرہ دونوں اللہ کے لئے پورے کرو۔ مگر بعض لوگ اپنی لاپرواہی سے اور بعض دوسرے اپنی سرکشی اور فسق کی بنا پر قرآن وحدیث کا حکم کم ہی خاطر میں لاتے ہیں۔ ان کو حدود میں رکھنے اور سنی وکہی ہوئی بات پر کان دھرنے کے لئے صاحب اقتدار کا جبر اور سختی درکار ہوتا ہے۔ اسی لئے یہ مقولہ مشہور ہوگیا ہے کہ بادشاہ قرآن کی نسبت زیادہ بندوبست کرتا اور احکامات پر عمل کراتا ہے۔"
فاروق اعظم نے نہی کو اپنی طرف منسوب کرنا بھی اسی نکتہ پر مبنی ہے۔ کہ ممانعت تو قرآن وحدیث کرچکے، اب ان پر عمل میں کراؤں گا اس لئے میں ان دونوں باتوں سے منع کرتا ہوں۔

حضرت عثمان غنیؓ پر اعتراضات

اور ان مطاعن واعتراضات کی کل تعداد دس ہے۔

اعتراض (۱) پہلا اعتراض یہ ہے کہ آپ نے مسلمانوں پر ایسے والی وحاکم مقرر فرمائے جن سے ظلم وزیادتی اور خیانت سرزد ہوئی اور ناشائستہ امور کے وہ مرتکب ہوئے مثلاً ولید بن عقبہ جس نے شراب پی اور مستی ہی کی حالت میں صبح کی نماز کی امامت بھی کی۔ اور دو رکعت کے بجائے چار رکعت پڑھائیں اور کہا کہ دو رکعات میں تمہارے لئے بڑھا رہا ہوں اور جناب معاویہ (رضی اللہ عنہ) کو چاروں صوبوں کا مختار بنا دیا یا لآخر وہ اتنے طاقتور ہوگئے کہ جناب امیر (رضی اللہ عنہ) کے عہد میں نہ ہونے والی باتیں ہوئیں۔ اور عبداللہ بن سعد بن ابی سرح کو مصر کا والی بنایا۔ اور اس نے لوگوں پر اتنے مظالم کئے کہ لوگ تنگ آکر مدینہ منورہ پر چڑھ آئے اور بلوہ کیا۔ مروان کو اپنا وزیر اور منشی مقرر کیا، جس نے جناب محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہ سے دھوکہ کیا کہ خط میں اقبلوہ (انکی اطاعت کرو) کے بجائے اقتلوہ (ان کو قتل کر ڈالو) لکھدیا۔ اور پھر اپنے عاملوں کی شکایات پر سکوت فرمایا اور ان کو معزول کرنے میں تامل سے کام لیا۔ اور نوبت یہ آگئی کہ لوگ ان کے ہاتھوں تنگ آگئے اور آپ کے خلاف ان عاملوں کے طرز عمل کے ساتھ نفرت پھیل گئی۔ اور اس وقت ان کے معزول کرنے کا بھی کوئی نتیجہ نہ نکلا یا لآخر قتل وغارت گری ہوئی جس کا کوئی تدارک نہ ہوسکا۔ اب جو شخص ایسا بدتدبیر ہو، جو امین وخائن اور عادل وظالم میں تمیز نہ کرسکے نہ مردم شناس ہو وہ امامت کے قابل نہیں ہوسکتا۔"

جواب :- اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ امام کو یہ چاہیئے کہ جس کو جس کام کا اہل سمجھے اس کے وہی کام سپرد کرے۔ امام کے لئے علم غیب رکھنے کی شرط سوائے شیعوں (اہل سنت کے ہاں سے اور نہ ہی کوئی اور طبقہ) طائفہ اس کا قائل ہے۔ اور ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان سے حسن ظن رکھنا بھی اسلامی شعار ہے، اور جناب عثمان شہید رضی اللہ عنہ نے بھی کیا، انہوں نے جس کو کام کا آدمی سمجھا اس کے سپرد وہی کام کیا۔ جس کو اپنے حسن ظن سے امین وعادل مطیع واطاعت شعار دیکھا اسی کو امور سلطنت وریاست سپرد کئے۔ معاند ومخالف فرقہ کی غوغا آرائی سے ہٹ کر تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ کے عمال وحکام خلیفہ سے محبت رکھنے کے علاوہ ان کے احکام کے تابعدار تھے۔ فوج کشی، اور دور دراز کے دیار وامصار کے فتح کرنے میں معرکہ آرائی میں چاق وچوبند، اور بیدار مغزی میں نادرۂ روزگار تھے۔ ان کے فتوحات اوراق تاریخ پر ثبت ہیں۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مغرب میں اسلامی فتوحات کا سلسلہ اندلس تک جا پہنچا تو مشرق میں کابل، بلخ اور روم میں اسلام کا پرچم لہرایا۔ رومیوں سے خشکی پر بھی نبرد آزما ہوئے تو بحری لڑائیاں لڑکر

بھی ان کو مفتوح کیا۔ خلیفۂ ثانی رضی اللہ عنہ کے عہد میں عراق وعجم اور خراسان فتنہ وفساد کا گہوارہ رہ چکے تھے، ان کی اتنی مؤثر گوشمالی کی گئی کہ فتنہ وفساد کا نشان تک لوگوں کے دلوں سے مٹا ڈالا، اسلام کی اتنی شان وشوکت اور فتوحات کا یہ عظیم الشان سلسلہ تاریخ کے اوراق پر ثبت کرنے والا کیا اتنا ہی بودا تھا کہ وہ معمولی عمال حکومت سے عاجز آجاتا۔ اور ان کی گوشمالی نہ کر پاتا۔

بات دراصل یہ تھی کہ وہ معاملہ چھوٹا ہو یا بڑا حسن تدبیر سے حل فرماتے تھے، آپ کو امور جہانبانی سے بے خبری نہیں تھی، نہ وہ عوام کی نفسیات سے ناواقف تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ امراء وحکام کے بہت سے لوگ یوں ہی خواہ مخواہ بھی دشمن اور درپے آزار ہوتے ہیں، اور جھوٹی سچی شکایتیں ان کا وطیرہ ہوتی ہیں۔ وہ اپنے لیئے تو عدل وانصاف کا شور وغوغا بلند کیئے رکھتے ہیں، مگر جن کے وہ خلاف ہوتے ہیں اسکو وہ فوراً پھانسی چڑھوانا چاہتے ہیں، اس کے لئے عدل وانصاف کے معروف طریقے برتنے کے بھی روادار نہیں ہوتے، اہل سنت کے نزدیک نہ جناب خلیفۂ شہید رضی اللہ عنہ معصوم تھے۔ نہ ان کے عمال وحکام بے خطا۔ وہ بھی ان سازشیوں اور غوغائیوں کی طرح انسان تھے۔ اگر کوئی عامل وحاکم خائن یا بددیانت نکلا۔ یا اس نے ظلم وستم روا رکھا۔ تو اس میں جناب عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا کیا قصور جبکہ ان سے متعلق شکایات آپ نے کبھی نظر انداز بھی نہ کیں، جب کسی شکایت کی تحقیق کے بعد ثابت ہوا کہ شکایت درست ہے تو آپ نے متعلقہ فرد سے بازپرس بھی کی اور اسے معزول بھی فرمایا مثلاً ولید! اور جو عمال حکومت اسلامی ریاست کے رکن رکین تھے جنکی مدبرانہ مساعی سے اور جن کی جنگی مہارت سے، اور بیدار مغزی سے اسلام اور مسلمانوں کو شوکت مل رہی تھی، جو اسلام وریاست کے وفادار تھے۔ نہ ان کی طرف سے کوئی فتنہ اٹھا، نہ سازش ہوئی اور جنہوں نے روم کی کامیاب لڑائی لڑی اور نمایاں فتوحات حاصل کیں۔ جیسے کہ جناب معاویہ رضی اللہ عنہ تو ان کو آخر کیوں معزول کرتے؟ اور عبداللہ بن سعد بن ابی سرح رضی اللہ عنہ نے تو حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے بعد گوشہ نشینی ہی اختیار کرلی تھی۔ بعد کے جھگڑوں ٹنٹوں میں انہوں نے مطلق دخل نہ دیا۔ اسی سے ان کی اچھائی اور سلامتی فکر کا اندازہ ہوجاتا ہے۔

بات دراصل یہ ہے، کہ شکایات جہاں کی بھی ہوں ان میں ہاتھ عبداللہ بن سبا یہودی اور اس کے سازشی ٹولے کا تھا۔ اوراق سابق میں آپ تفصیل پڑھ چکے ہیں۔ مصر میں وہ بیٹھا ہوا آگ لگاتا اور بھڑکاتا رہا تھا۔ وہ زیرک تھا، پڑھا لکھا، تیز وطرار، اور چرب زبان تھا۔ وہ یہودی سیاست کا ماہر اور منجھا ہوا تھا۔ سیادت وقیادت کی ہوس نے کم اسلام دشمنی نے زیادہ اسے آتش زیر پا کر رکھا تھا جناب عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے اس کی خواہش اعزاز کو مسترد کرکے اسے دھتکار دیا تھا! ایسے عالم میں ایسا دشمن جو نہ کرتا تھوڑا تھا! بہر حال حضرت شہید رضی اللہ عنہ نے اپنی صوابدید اور مومنانہ ذمہ داریوں کا پورا پورا حق ادا کیا۔ اور عزت وعظمت اسلام، ملت مسلمہ کی نیکنامی کے لیئے جو کچھ آپ کر گئے آپ کے بعد اس میں کوئی اضافہ نہ کرسکا۔ کاتب تقدیر نے جب مقدر میں شہادت تحریر کردی تھی تو اس کے اسباب بھی تو مہیا ہونے تھے! لہذا تدبیر مساعد تقدیر نہ ہوئی فتنہ وفساد کا دروازہ بند نہ ہو سکا! آپ انہیں حالات سے گذرے جن سے جناب امیر رضی اللہ عنہ کو اپنے زمانہ خلافت کے پہلے دن سے لے کر آخری لمحات تک گذرتے رہے۔ حضرت امیر رضی اللہ عنہ بھی ہر چند بہترین تدابیر اور چیدہ مشورے خلافت وریاست کے امور کے انتظام کے سلسلہ میں عمل میں لاتے رہے، مگر تقدیر نے ساتھ نہ دیا۔ اور خاطر خواہ طریقہ پر مسند خلافت پر تمکن حاصل نہ ہوا۔ یہی حال ہر دو اصحاب گرامی قدر رضی اللہ عنہما کا اپنے عمال وحکام کے سلسلہ میں رہا۔ وہ بھی باہم یکدگر ملتے جلتے تھی۔ اتنا فرق البتہ تھا کہ حضرت عثمان شہید رضی اللہ عنہ کے عمال، امراء حکام آپ کے ساتھ تسلیم وانقیاد محبت ووفا سے پیش آتے رہے، سرکشی اور بغاوت اور نافرمانی سے دور رہے۔ غنائم اور خمس وغیرہ مسلسل اور باقاعدہ دارالخلافہ بھیجتے رہے جس کے سبب اہل اسلام دولت وثروت کی زندگی کے دور میں داخل ہوگئے! اور عیش وعشرت

www.Ahlehaq.com

کی زندگی کے عادی ہوتے گئے اور یہی حد سے گزری ہوئی پُرعشرت زندگی فتنہ و فساد کا سبب بن گئی۔

اِدھر جناب امیر رضی اللہ عنہ کے عامل اور حکام دین و ملت کے وفادار تو کیا ذاتی طور پر بھی آپؓ کے مطیع و فرمانبردار نہ تھے۔ ہر کام کو بگاڑتے چاروں طرف سے شکست کھا کر اور ذلیل ہو کر لوٹتے، خیانتیں کر کے ظلم و ستم ڈھا کر دنیا و آخرت کی روسیاہی حاصل کرتے اور بھاگ نکلتے۔ غیروں کا تو کیا ذکر خود آپؓ کے اقارب اور چچا زاد بھائیوں کا بھی یہی حال تھا۔ اگر کسی کو اس بات میں شبہ ہو تو وہ جناب امیر رضی اللہ عنہ کا وہ خط پڑھ لے جسے نہج البلاغہ نے درج کیا ہے۔ واضح رہے نہج البلاغہ ان کے ہاں کی اصح ترین کتاب ہے اس خط میں آپ اپنے چچا زاد بھائی کو خطاب فرما رہے ہیں۔ آپ کا یہ خط آپؓ کے مشہور خطوط میں سے ہے اور اکثر کتب امامیہ میں ملتا ہے۔ خط کا ابتدائیہ قابل توجہ ہے جناب امیر رضی اللہ عنہ کو اس روسیاہ سے جو حسن ظن تھا وہ بھی ملحوظ خاطر رہے۔

أَمَّا بَعْدُ فَإِنِّي أَشْرَكْتُكَ فِي أَمَانَتِي وَجَعَلْتُكَ شِعَارِي
وَبِطَانَتِي وَلَمْ يَكُنْ فِي أَهْلِي رَجُلٌ أَوْثَقَ مِنْكَ
فِي نَفْسِي لِمُوَاسَاتِي وَمُوَازَرَتِي وَأَدَاءِ الْأَمَانَةِ
إِلَيَّ فَلَمَّا رَأَيْتَ الزَّمَانَ عَلَى ابْنِ عَمِّكَ قَدْ كَلِبَ
وَالْعَدُوَّ قَدْ حَرِبَ وَأَمَانَةَ النَّاسِ قَدْ خَرِبَتْ
وَهٰذِهِ الْأُمَّةَ قَدْ فَتَكَتْ شَغَرَتْ وَقَلَبْتَ لِابْنِ
عَمِّكَ ظَهْرَ الْمِجَنِّ فَفَارَقْتَهُ مَعَ الْمُفَارِقِينَ وَ
خَذَلْتَهُ مَعَ الْخَاذِلِينَ وَخُنْتَهُ مَعَ الْخَائِنِينَ
فَلَا ابْنَ عَمِّكَ آسَيْتَ وَلَا الْأَمَانَةَ أَدَّيْتَ
وَكَأَنَّكَ لَمْ تَكُنِ اللّٰهَ تُرِيدُ بِجِهَادِكَ وَكَأَنَّكَ لَمْ تَكُنْ
عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِنْ رَبِّكَ وَكَأَنَّكَ تَكِيدُ هٰذِهِ الْأُمَّةَ
عَنْ دُنْيَاهُمْ وَتَنْوِي غِرَّتَهُمْ عَنْ فَيْئِهِمْ فَلَمَّا
أَمْكَنَتْكَ الشِّدَّةُ فِي خِيَانَةِ الْأُمَّةِ أَسْرَعْتَ
الْكَرَّةَ وَعَاجَلْتَ الْوَثْبَةَ وَاخْتَطَفْتَ مَا قَدَرْتَ
عَلَيْهِ مِنْ أَمْوَالِهِمُ الْمَصُونَةِ لِأَرَامِلِهِمْ وَ
أَيْتَامِهِمُ اخْتِطَافَ الذِّئْبِ الْأَزَلِّ دَامِيَةَ
الْمِعْزَى الْكَسِيرَةَ فَحَمَلْتَهُ إِلَى الْحِجَازِ رَحِيبَ
الصَّدْرِ بِحَمْلِهِ غَيْرَ مُتَأَثِّمٍ مِنْ أَخْذِهِ كَأَنَّكَ
لَا أَبَا لِغَيْرِكَ حَدَرْتَ إِلَىٰ أَهْلِكَ تُرَاثَكَ مِنْ أَبِيكَ
وَأُمِّكَ فَسُبْحَانَ اللّٰهِ أَوَمَا تُؤْمِنُ بِالْمَعَادِ أَوَمَا
تَخَافُ مِنْ نِقَاشِ الْحِسَابِ أَيُّهَا الْمَعْدُودُ مِمَّنْ
كَانَ عِنْدَنَا مِنْ ذَوِي الْأَلْبَابِ كَيْفَ تُسِيغُ طَعَامًا

حمد و ثنا کے بعد واضح ہو کہ میں نے تمکو اپنی امانت کا شریک کار کیا، تمکو اپنا اوڑھنا بچھونا (یار غار) بنایا۔ تم میرے اہل خانہ میں میرے نزدیک غمخواری، رفاقت اور امانت داری میں سب سے زیادہ قابل اعتماد اور لائق بھروسہ تھے۔ لیکن جب تم نے اپنے ابن عم کا برا وقت دیکھا اور دشمن کو آمادہ پیکار پایا۔ اور لوگوں کی امانت داری خیانت کی شکل اختیار کر گئی اور یہ امت خونریزی میں ڈوب گئی تو تو منہ پھاڑ کر رہ گیا اور علیؓ غم و اندوہ کے عالم میں اس کو دغا دے گیا۔ اوروں کی طرح تو بھی اس سے بچھڑ گیا۔ دوسروں کی طرح تو بھی اس کا ساتھ چھوڑ گیا۔ اوروں کی طرح تو بھی خیانت کرنے والوں کا خیانت میں ساتھی بن گیا۔ تو نے اپنے ابن عم کی نہ ہمدردی کی نہ اس کی امانت ادا کی۔ گویا تو اپنے جہاد میں مخلص نہیں تھا تجھے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی مدنظر نہ تھی۔ نہ اپنے رب کی طرف سے کسی کھلی دلیل پر قائم تھا۔ گویا تو مکر و فریب سے دنیا کمانا چاہتا اور دھوکے سے امت کے خزانے اڑا لینے کی نیت رکھتا تھا۔ جب حالات کی ستم گری نے تجھے خیانت کا موقع دیا تو تو جھپٹ پڑا۔ اور بے صبر ہو کر ان کا جتنا مال سمیٹ سکتا تھا لے بھاگا۔ یہ وہ مال تھا جو امت کے بیواؤں اور یتیموں کے لئے محفوظ رکھا گیا تھا۔ جس طرح بدحال بھیڑیا خون آلود، ہڈی ٹوٹی بکری کو لے بھاگتا ہے۔ اب تو وہ مال سمیٹ کر حجاز لے گیا ہے اور یوں اٹھائے ہوئے ہے گویا اس کے لینے میں تو نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ تیرا باپ مرے (تیرا ناس ہو) گویا وہ تیرا جوڑا ہوا مال تھا یا تجھے اپنے ماں باپ کا ورثہ ملا تھا۔ کیا کہنے! یا تو آخرت کے عذاب سے نڈر ہو گیا ہے؟

Www.Alhaqq.com

وشرابا وانت تعلم انک تاکل حراما وتشرب حراما وتبتاع الاماء وتنکح النساء من اموال الیتامی والمساکین والمجاهدین الذین افاء الله علیهم هذه الاموال واحرز بهم هذه البلاد فاتق الله واردد الی هؤلاء القوم اموالهم فانک ان لم تفعل ثم امکننی الله منک لاعذرن الی الله فیک ولاضربنک بسیفی الذی ما ضربت به احدا الا دخل النار۔

اور حساب لکھنے والوں کا تجھے کوئی خوف نہیں رہا۔ تو تو ہمارے نزدیک عقلمندوں کا انتخاب تھا۔ تیرے حلق سے لقمہ کس طرح اترتا ہے جبکہ تو جانتا ہے کہ حرام کھا رہا ہے اور حرام پی رہا ہے۔ یتیموں مسکینوں اور مجاہدوں کو اللہ تعالیٰ نے جو مال دیا تھا اور جنکی خاطر اس نے ان شہروں کو سرسبز و شاداب بنا رکھا ہے۔ اس مال سے تو لونڈیاں خرید رہا ہے۔ عورتوں سے نکاح کرتا ہے (اور اڑا رہا ہے)، اللہ تعالیٰ سے ڈر، حقداروں کا مال واپس کر! اگر تو نے ایسا نہ کیا اور میں تجھ پر قابو پا گیا۔ تو اللہ تعالیٰ کے نزدیک تیرے معاملہ میں بری الذمہ ہو جاؤں گا، اور تجھے اسی تلوار سے قتل کروں گا کہ اس سے میں نے جس کو مارا وہ جہنم رسید ہوا۔"

اس خط کے پورے مضمون اور اس میں پوشیدہ کرب پر غور کیجئے اور اس عامل کی خیانت و خباثت کا اندازہ لگائیے، اور پھر جناب شہید رضی اللہ عنہ کے پورے دور خلافت پر نظر ڈال جائیے کیا وہاں بھی کسی عامل سے ایسی خیانت و خباثت کا ثبوت ملتا ہے! کیا وہاں بھی کوئی مال کھا کر اسطرح بھاگتا ملتا ہے۔ (اور گالیاں کھا رہا ہے)

جناب امیر رضی اللہ عنہ کا ایک اور عامل منذر بن جارود تھا، وہ بھی سخت خائن اور چور نکلا۔ جب اس کی خیانت ظاہر ہوئی تو جناب امیر رضی اللہ عنہ نے اس کو بھی دھمکی آمیز خط لکھا۔ آپؓ کا یہ خط بھی مشہور خطوط میں شمار ہوتا ہے، جو نہج البلاغہ کے علاوہ امامیہ کی دوسری کتابوں میں بھی موجود ہے! ملاحظہ ہو۔

اما بعد فان صلاح ابیک غرنی منک وظننت انک تتبع هدیه وتسلک سبیله فاذا انت فیما رقی الی عنک لا تدع لهواک انقیادا ولا تبقی لآخرتک عتادا تعمر دنیاک بخراب آخرتک وتصل عشیرتک بقطیعة دینک الی آخر الکتاب المکرم۔

حمد و ثنا کے بعد! میں تیرے باپ کی نیک بختی کے سبب تیرے بارے میں دھوکہ کھا گیا اور میں یہ سمجھ بیٹھا کہ تو اپنے باپ کے نقش قدم پر ہوگا اور اسی کے راستہ پر چلتا ہوگا۔ مگر ان خبروں سے جو تیرے متعلق مجھ تک پہنچی اچانک ہی یہ معلوم ہوا کہ تو تو اپنی خواہشوں کا اسیر ہے۔ اپنی آخرت کے لئے تیرے پاس کوئی ذخیرہ نہیں۔ کیا تو اپنی آخرت برباد کر کے دنیا آباد کرنا چاہتا ہے؟ اور اپنے دین کا رشتہ کاٹ کر اپنے عزیز و اقارب سے رشتہ جوڑنا چاہتا ہے۔ الی آخر المکتوب۔"

حاصل کلام یہ کہ اہل سنت کے نزدیک حضرت عثمان غنی اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کے مابین اس معاملہ میں کوئی فرق نہیں کیونکہ ہر دو حضرات نے اپنی بہترین صوابدید کے مطابق جو کچھ حق سمجھا اور جو کام اپنے ذمہ لازم جانا اس کو عمل میں لائے۔ اس میں ذرہ بھر کوتاہی نہیں فرمائی۔ اپنے خیال اور حسن ظن کے مطابق عمال و حکام مقرر فرمائے! نہ وہ کسی کے دل کا حال جانتے تھے، اور نہ یہ جانتے تھے کہ آج جو اچھا ہے کل برا ہو جائے گا۔ غیب کی خبر صرف خدا کو ہے۔ ایسا بھی ہوا ہے کہ ظاہری اور دکھاوے کے اخلاق سے پیغمبر بھی متاثر ہوتے رہے! وہ تو چونکہ ان پر وحی کا نزول ہوتا رہتا تھا اس لئے اللہ تعالیٰ بذریعہ وحی ان کا اندرون اپنے انبیاء پر ظاہر فرما دیتے۔ اور ان کی کوئی سازش، کوئی برا ارادہ اور منصوبہ کامیاب نہ ہو پاتا۔

www.Ahlehaq.com

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ وَلِيُمَحِّصَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا تاکہ اللہ تعالیٰ اہل ایمان کو خالص کرے۔ اور یہ فرمایا مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلٰى مَا اَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتّٰى يَمِيْزَ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ۔ اللہ تعالیٰ مومنین کو ایسی (رلی ملی) حالت میں جو تم کو درپیش ہے، چھوڑے نہیں رکھے گا۔ جب تک خبیث کو طیب سے چھانٹ کر الگ نہ کر دے۔

امام کے لیے ضروری نہیں کہ وہ غیب دان ہو، اور اس کا حسن ظن پھر غلط نہ نکلے اور اس کو پہلے معلوم ہو جائے کہ اس سے کیا کچھ سرزد ہونے والا ہے!

البتہ اس سلسلہ میں شیعوں کے بڑی دشواری اور مشکل ہے کیونکہ ان کے عقیدہ میں امام "غیب دان" ہوتا ہے اس بنا پر حضرت علی رضی اللہ عنہ خیانت ظاہر ہونے سے پہلے اور کام سپرد کرنے سے پیشتر ہی جان جایا کرتے تھے، کہ فلاں خائن ہے وہ خیانت سے باز نہیں آئے گا۔ اس لئے کہ ان کے عقیدہ کے مطابق آپ کے لیے گزشتہ و آئندہ کا علم حاصل ہونا ضروری ہے۔ اور یہ کسی ایک دو کا خیال نہیں ان کے ہاں کا اجماعی مسئلہ ہے۔ محمد بن یعقوب کلینی اور دوسرے علماء نے مختلف روایتوں اور متعدد طرق سے ثابت کر رکھا ہے۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ جناب علی رضی اللہ عنہ ان کے نزدیک دیدہ و دانستہ خائنوں اور فسادیوں کو مسلمانوں کا والی مقرر فرماتے تھے: اور بالآخر وہ خائن لوگ مال و دولت سمیٹ کر بھاگ جاتے اور یوں مسلمانوں کے حقوق تلف کرنے کا باعث ہوتے تھے۔ اور پھر سوائے نصیحت ناموں، عتاب ناموں اور وعظ و نصیحت کے کوئی چارہ کار یا تدارک کی صورت نہ رہتی تھی!

اُدھر بیچارے عثمان غنی رضی اللہ عنہ محض اپنے حسن ظن پر (کیونکہ علم غیب تو ان کو تھا نہیں) عامل مقرر کر دیتے اور ان کی غلطیوں کا خمیازہ بھگتتے۔ اور پشیمان و پریشان ہوتے!

اب حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ایک اور عامل کی داستان سنئے جس نے آپ کے محترم و مقدس خاندان کے ساتھ کیا سلوک کیا، اور کن کن اذیتوں سے انہیں دوچار کیا، یہ مردود زمانہ جس کی اصل بھی قابل اعتراض رہی، زیاد بن سُمَیَّة (معروف زیاد بن سفیان) تھا! جو ملک فارس و شیراز کا آپکی طرف سے صوبہ دار تھا۔ وہ اتنا بے حیا تھا کہ اپنی بے نسبی پر فخر کرتا اور علی الاعلان۔ اپنی والدہ پر جو ایک لونڈی تھی زنا کی گواہی دیتا تھا۔ وہ تصریوں ہے کہ جناب ابو سفیان (رضی اللہ عنہ) نے اسلام لانے سے پیشتر حارث ثقفی مشہور طبیب کی لونڈی سُمَیَّة نامی سے ناجائز تعلق قائم کیا۔ جس کے نتیجہ میں اس نے ایک بچہ جنا چونکہ وہ حارث کی لونڈی تھی اور حارث ہی کے ایک غلام کی منکوحہ تھی اس لئے بچپن میں یہ لڑکا عبد الحارث کے لقب سے مشہور ہوا۔ جب وہ بڑا ہوا تو شرافت و بلاغت، خوش تقریری اور حسن بیانی کا بہت چرچا ہوا، اس کی سوجھ بوجھ زیرکی و دانائی، دور دور شہرت پا گئی! ایک روز قریش کے ایک سنجیدہ بزرگ عمرو بن عاص نے کہا کہ "اگر یہ لڑکا قریش میں ہوتا تو عرب کو اپنی لاٹھی سے ہانکتا"، ابو سفیان رضی اللہ عنہ نے یہ سنکر کہا۔

وَاللّٰهِ اِنِّيْ لَاَعْرِفُ مَنْ وَضَعَهٗ فِيْ بَطْنِ اُمِّهٖ۔ بخدا میں اس کو خوب جانتا ہوں جس کا یہ نطفہ ہے۔ اس مجلس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی موجود تھے آپ نے پوچھا ابو سفیان وہ کون تھا، ابو سفیان نے کہا "وہ میں ہوں" تو آپ نے فرمایا بس رہنے دے ابو سفیان رضی اللہ عنہ! اس پر ابو سفیان نے یہ اشعار پڑھے

اَمَا وَاللّٰهِ لَوْلَا خَوْفُ شَخْصٍ ... يَرَانِيْ يَا عَلِيُّ مِنَ الْاَعَادِيْ
لَاَظْهَرَ سِرَّهٗ صَخْرُ بْنُ حَرْبٍ ... وَلَمْ تَكُنِ الْمَقَالَةُ عَنْ زِيَادِ
وَقَدْ طَالَتْ مُجَامَلَتِيْ ثَقِيْفًا ... وَتَرْكِيْ فِيْهِمْ ثَمَرَ الْفُؤَادِ

ترجمہ۔ بخدا اگر مجھے اس شخص کا ڈر نہ ہوتا جو مجھے دشمنوں میں شمار کرتا ہے، تو اے علی، صخر بن حرب (یعنی میں) اس لڑکے کے بھید کو ظاہر

کر دیتا تو پھر یہ خوش گفتاری زیاد کی شمار نہ ہوتی۔ بہت عرصہ میں نے قوم ثقیف سے اسے چھپائے رکھا اور اپنے جگر گوشہ کو ان کے پاس چھوڑے رکھا،،

یہ قصہ زیاد نے بھی سن رکھا تھا۔ اور بڑی ڈھٹائی اور بے حیائی سے کہتا تھا کہ میں اصل میں ابوسفیانؓ کا نطفہ اور قوم قریش کا فرد ہوں۔
حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس کو فارس کا حاکم بنایا، تو نظم مملکت قائم کرنے ان شہروں کی حالت درست کرنے اور فتنہ و فساد پہ قابو پانے میں اس کی کارگردگی بڑی شاندار رہی، اور اس کی تدابیر و تجاویز کے اچھے نتائج برآمد ہوئے۔
یہ حالت دیکھ کر جناب معاویہ رضی اللہ نے اس سے خفیہ رابطہ قائم کیا، تاکہ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو چھوڑ کر ان سے آملے۔ اور اسے لالچ دیا کہ اگر وہ اس کے لئے تیار ہو تو اسے شریک نسب بھی کر لیا جائے گا۔ کیونکہ ایسا خوش تدبیر اور لائق فائق اور کام کا آدمی اگر حریف سے کٹ کر اپنے سے آملے تو یہ بڑی سیاسی کامیابی تھی، آپ نے اس کو لکھا کہ اگر تو میرے پاس آگیا تو میں تجھے اپنا بھائی کہوں گا، اولاد ابوسفیانؓ میں تجھے شامل قرار دوں گا۔ کیونکہ تو آخر تو ابوسفیان ہی کا نطفہ ہے۔ اور تیری دانائی شرافت سوجھ بوجھ تیرے دعوی کی صداقت کے منہ بولتے گواہ ہیں۔ جب اس بحث و تمحیص کی اطلاع حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ملی تو آپ نے زیاد کو اس مضمون کا خط لکھا۔

قَدْ عَرَفْتُ اَنَّ مُعَاوِيَةَ كَتَبَ اِلَيْكَ يَسْتَزِلُّ لُبَّكَ وَ يَسْتَفِلُّ غَرْبَكَ فَاحْذَرْهُ اِنَّمَا هُوَ الشَّيْطَانُ يَاْتِي الْمَرْءَ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهِ وَعَنْ يَمِيْنِهِ وَعَنْ شِمَالِهِ لِيَقْتَحِمَ غَفْلَتَهُ وَيَسْتَلِبَ غِرَّتَهُ فَاحْذَرْهُ وَقَدْ كَانَ مِنْ اَبِي سُفْيَانَ فِيْ زَمَنِ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ فَلْتَةٌ مِنْ حَدِيْثِ النَّفْسِ وَنَزْغَةٌ مِنْ نَزَغَاتِ الشَّيْطَانِ لَا يَثْبُتُ بِهَا نَسَبٌ وَلَا يُسْتَحَقُّ بِهَا مِيْرَاثٌ وَالْمُتَعَلِّقُ بِهَا كَالْوَاغِلِ الْمُدَفَّعِ وَالنَّوْطِ الْمُذَبْذَبِ۔

مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ معاویہؓ نے تجھے خط لکھا ہے، وہ تجھے بیوقوف بنا کر تیری تیزی کو ماند کرنا چاہتا ہے تم اس سے ڈرتے رہو۔ وہ اس شیطان کی مانند ہے جو آدمی کو آگے سے پیچھے سے دائیں بائیں سے ہر طرف سے گھیرنے کی فکر میں رہتا ہے تاکہ جب اسے غافل یا بے فکر پائے تو قابو پا کر تباہ کر دے۔ تم اس سے ہوشیار رہو! اور عمرؓ کے زمانہ میں ابوسفیان کے منہ سے ایک بات نکل گئی تھی جو وسوسہ نفسانی یا شیطانی خیال ہی تھا کہ اس سے نہ کسی کا نسب ثابت ہو سکتا ہے نہ کسی میراث کا مستحق ہوتا ہے۔ اور اس کو سند و ثبوت میں پیش کرنے والا ایسا ہی ہوتا ہے جیسے زبردستی ہانک کر لایا گیا ہو، اور جو ادھر میں لٹکا ہوا، ادھر ادھر ہل رہا ہو،،

جب زیاد نے یہ خط پڑھا تو کہنے لگا۔ ورب الکعبہ شھد ابی الحسن بانی ابن ابوسفیان (رب کعبہ کی قسم علیؓ نے تو گواہی دی ہے کہ میں ابوسفیانؓ کا بیٹا ہوں)
مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت تک آپؓ کا رفیق رہا۔ ساتھ نہ چھوڑا۔ اور جب حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے خلافت و سیادت کا معاملہ جناب معاویہ رضی اللہ عنہ کے سپرد کر دیا، اور ادھر جناب معاویہ رضی اللہ عنہ نے اسے اپنے ساتھ ملانے کی حد سے زیادہ کوشش کی، اور ابوسفیانؓ رضی اللہ عنہ کے اسی قول کو دلیل بنا کر جو جناب عمرو بن عاص اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کے روبرو کہا تھا اس کو اپنا بھائی قرار دیا اور سکہ میں زیاد بن ابوسفیان اس کا لقب تجویز کر کے تمام قلمرو میں اعلان کرا دیا کہ آئندہ سے اسے زیاد بن ابوسفیان کہا جایا کرے! اور یہ سعی و کوشش اس لئے کی کہ وہ مدبر، شجاع اور بہت زیرک سردار تھا۔ جمعیت بھی اس کے ساتھ بہت تھی اپنے ساتھ ملانے سے ان کی ریاست میں استحکام اور مضبوطی پیدا ہونے کے ساتھ ساتھ ایک امکانی خطرہ کا سدباب بھی تھا۔ ممکن ہے وہ بغاوت کر کے ان کے لئے خطرات کا باعث بن جائے۔ بہرحال جناب معاویہ رضی اللہ عنہ اپنی سیاسی تدبیریں کامیاب ہوئے اور وہ آپ کا رفیق و

معاون بن گیا۔

اس بدفطرت نے جناب معاویہؓ کے ساتھ ہوجانے کے بعد حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی زندگی تک تو تھوڑا بہت ظاہری لحاظ برتا، مگر آپ کی وفات کے بعد جب عراق کا گورنر بنایا گیا تو کوفہ پر قبضہ کے بعد سب سے پہلے جناب سعید بن شریح رحمۃ اللہ علیہ کے پیچھے پڑ گیا آپ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بڑے مخلص رفقاء میں سے تھے ، اور آپ کے بلند قلعہ خاندان کے دلی دوستوں میں سے گنے جاتے تھے ۔ اس کا ان کے درپے آزار ہونا گویا خاندان و اولاد علی رضی اللہ عنہ سے عداوت و دشمنی کی ابتداء تھی !

جناب سعید کو جب اس کے ارادوں کی بھنک ملی تو وہ کوفہ سے نکل کر مدینہ منورہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے پاس آگئے ۔ ان کا کوفہ میں گھر تھا ۔ اہل عیال تھے مال و اسباب تھا ان سب پر زیاد نے قبضہ کر لیا ۔ مال و اسباب لوٹ کر گھر جلا دینے کا حکم دیدیا ۔

جب یہ اطلاع جناب حسین رضی اللہ عنہ کو معلوم ہوئی تو یہ خیال فرما کر کہ آخر اتنے عرصہ جناب امیر رضی اللہ عنہ کا رفیق ، و دوست رہا ہے ، لحاظ و مروت کچھ تو برتے گا ۔ آپ نے بطور سفارش اس کو خط لکھ دیا ۔

مِنْ حسین ابْنِ عَلِیٍّ اِلٰی زِیَادٍ اَمَّا بَعْدُ فَقَدْ عَمَدْتَ اِلٰی رَجُلٍ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ لَهٗ مَا لَهُمْ وَعَلَیْهِ مَا عَلَیْهِمْ فَهَدَمْتَ دَارَهٗ وَاَخَذْتَ مَالَهٗ وَعِیَالَهٗ فَاِذَا اَتَاكَ كِتَابِیْ هٰذَا فَابْنِ دَارَهٗ وَرُدَّ مَالَهٗ وَعِیَالَهٗ فَاِنِّیْ قَدْ اَجَرْتُهٗ فَشَفِّعْنِیْ فِیْهِ۔

حسین ابن علی کی طرف سے زیاد کو ، اما بعد تم نے ایک ایسے مسلمان شخص پر ہاتھ ڈالا ہے جس کے حقوق بھی وہی ہیں جو سب مسلمانوں کے ہیں اور اس کی ذمہ داریاں بھی وہی ہیں جو اور مسلمانوں کی ہیں ۔ تو نے اس کا گھر ڈھا دیا ۔ مال و اسباب اہل عیال پر قبضہ کر لیا ۔ (یہ تو نے کیا کیا!) اب جب مرا یہ خط تجکو ملے تو تجھے چاہیئے کہ اس کا گھر تعمیر کرا دے ، مال و عیال واپس کر دے کیونکہ میں نے اس کو اپنی پناہ میں لے لیا ہے اس کے متعلق مری یہ سفارش مان لے ۔

آپؓ کے اس خط کے جواب میں بدبخت ناشکرے نے جو کچھ لکھا وہ ذیل میں ملاحظہ کیجئے

مِنْ زِیَادِ بْنِ اَبِیْ سُفْیَانَ اِلَی الْحُسَیْنِ بْنِ فَاطِمَةَ اَمَّا بَعْدُ فَقَدْ اَتَانِیْ كِتَابُكَ تَبْدَءُ فِیْهِ بِاسْمِكَ قَبْلَ اِسْمِیْ وَاَنْتَ طَالِبٌ لِلْحَاجَةِ وَاَنَا سُلْطَانٌ وَاَنْتَ سُوْقَةٌ وَكِتَابُكَ اِلَیَّ فِیْ فَاسِقٍ لَا یُؤْوِیْهِ اِلَّا فَاسِقٌ مِثْلُهٗ وَشَرٌّ مِنْ ذٰلِكَ اِذَا اَتَاكَ وَقَدْ اٰوَیْتَهٗ اِقَامَةً مِنْكَ عَلٰی سُوْءِ الرَّاْیِ وَرِضًی بِذٰلِكَ وَ اَیْمُ اللّٰهِ لَا یَسْبِقُنِیْ اِلَیْهِ سَابِقٌ وَلَوْ كَانَ بَیْنَ جِلْدِكَ وَلَحْمِكَ فَاِنَّ اَحَبَّ لَحْمٍ اِلَیَّ اَنْ اٰكُلَهُ اللَّحْمُ اَنْتَ فِیْهِ فَاَسْلِمْهُ بِجَرِیْرَتِهٖ اِلٰی مَنْ هُوَ اَوْلٰی بِهٖ مِنْكَ فَاِنْ عَفَوْتُ عَنْهُ لَمْ اَكُنْ شَفَّعْتُكَ فِیْهِ وَاِنْ قَتَلْتُهٗ لَمْ اَقْتُلْهُ اِلَّا لِحُبِّهٖ اَبَاكَ

زیاد بن ابی سفیان کی طرف سے حسین بن فاطمہ کی طرف ! تمہارا خط مجھے ملا جس میں تم نے میرے نام سے پہلے اپنا نام لکھا حالانکہ تم مجھ سے درخواست کر رہے ہو ، اور رعایا ہو جبکہ میں حاکم ہوں ! تم نے یہ خط ایسے فاسق کے بارے میں لکھا ہے جسکو وہی پناہ دے گا جو اسی جیسا یا اس سے بھی بڑا فاسق ہو گا ۔ اور اس سے بڑھ کر یہ بات ہوئی کہ وہ تمہارے پاس آیا اور تم نے اسے پناہ دیدی اسی وجہ سے وہ اپنی غلط رائے پر اڑا ہوا ہے ، اور اس پر راضی ہے ۔ خدا کی قسم اگر وہ تمہارے گوشت پوست میں بھی سما جائے تب بھی میری گرفت اس تک سب سے پہلے پہنچے گی ، پس مجھے وہ گوشت بہت مرغوب ہوگا جس کے اندر تم سمائے ہوئے ہو لہذا اس غلطی کی پاداش میں تم اس کو اس کے حوالہ کر دو جو تم سے بہتر ہو اگر میں نے (بالفرض) اس کو معاف کر بھی دیا تو یہ اس وجہ سے نہیں ہو گا کہ تم نے اس کی سفارش کی تھی ، اور اگر میں نے اس کو قتل کیا

www.Ahlehaq.com

تو اسکی صرف یہ وجہ ہوگی کہ وہ تم سے رشتہ محبت رکھتا ہے "

سرکشی اور گستاخی سے لبریز جب یہ خط حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو ملا۔ تو آپ نے وہی خط ملفوف کر کے اپنی تحریر کے ساتھ کہ اصل واقعہ یہ تھا میں نے زیاد کو ایسا لکھا تھا جس کا اس نے یہ جواب دیا ہے۔ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو بھیج دیا۔

جناب معاویہ رضی اللہ عنہ یہ خط پڑھ کر سخت غصہ ہوئے اور فوراً اپنے ہاتھ سے خط لکھ کر زیاد کو بھیجا۔

مِنْ مُعَاوِيَةَ بْنِ اَبِيْ سُفْيَانَ اِلٰى زِيَادٍ اَمَّا بَعْدُ فَاِنَّ حُسَيْنَ ابْنَ عَلِيٍّ بَعَثَ اِلَيَّ كِتَابَكَ اِلَيْهِ جَوَابَ كِتَابِهِ اِلَيْكَ لِابْنِ شُرَيْحٍ فَعَلِمْتُ اَنَّكَ بَيْنَ رَأْيَيْنِ رَأْيٌ مِنْ اَبِيْ سُفْيَانَ وَرَأْيٌ مِنْ سُمَيَّةَ اَمَّا رَأْيُكَ مِنْ اَبِيْ سُفْيَانَ فَحِلْمُهُ وَعَزْمُهُ فَاَمَّا الَّذِيْ مِنْ سُمَيَّةَ فَكَمَا يَكُوْنُ رَأْيُ مِثْلِهَا وَمِنْ ذٰلِكَ كِتَابُكَ اِلَى الْحُسَيْنِ بِشَتْمِ اَبَاهُ وَتُعَرِّضُ لَهُ بِالْفِسْقِ وَلَعَمْرِيْ اَنْتَ اَوْلٰى بِالْفِسْقِ مِنَ الْحُسَيْنِ وَلَاَبُوْكَ اِذْ كُنْتَ تُنْسَبُ اِلٰى عُبَيْدٍ اَوْلٰى بِالْفِسْقِ مِنْ اَبِيْهِ وَاِنْ كَانَ الْحُسَيْنُ بَدَأَ بِاسْمِهِ ارْتِفَاعًا عَنْكَ فَاِنَّ ذٰلِكَ لَمْ يَضَعْكَ وَاَمَّا تَشْفِيْعُهُ فِيْمَا شَفَعَ فِيْهِ فَقَدْ دَفَعْتَهُ عَنْ نَفْسِكَ اِلٰى مَنْ هُوَ اَوْلٰى بِهِ مِنْكَ فَاِذَا اَتَاكَ كِتَابِيْ هٰذَا! فَخَلِّ مَا فِيْ يَدِكَ لِسَعِيْدِ بْنِ شُرَيْحٍ وَابْنِ لَهُ دَارَهُ وَلَا تَعَرَّضْ لَهُ وَارْدُدْ اِلَيْهِ مَالَهُ وَعِيَالَهُ فَقَدْ كَتَبْتُ اِلَى الْحُسَيْنِ اَنْ يُخَيِّرَ صَاحِبَهُ بِذٰلِكَ فَاِنْ شَاءَ اَقَامَ عِنْدَهُ وَاِنْ شَاءَ رَجَعَ اِلٰى بَلَدِهِ فَلَيْسَ عَلَيْهِ سُلْطَانٌ بِيَدٍ وَلِسَانٍ وَاَمَّا كِتَابُكَ اِلَى الْحُسَيْنِ بِاسْمِهِ وَلَا تَنْسُبُهُ اِلٰى اَبِيْهِ بَلْ اِلٰى اُمِّهِ فَاِنَّ الْحُسَيْنَ وَيْلَكَ مَنْ لَا يُرْمٰى بِهِ الرَّجَوَانِ اَفَاسْتَصْغَرْتَ اَبَاهُ وَهُوَ عَلِيُّ بْنُ اَبِيْ طَالِبٍ اَمْ اِلٰى اُمِّهِ وَكِلْتَهُ وَهِيَ فَاطِمَةُ بِنْتُ رَسُوْلِ اللّٰهِ اَفْخَرُ لَهُ اِنْ كُنْتَ تَعْقِلُ وَالسَّلَامُ۔

معاویہؓ کی طرف سے زیاد کے نام ۔ حسین بن علی رضی اللہ عنہما نے تمہارا وہ خط جو تم نے ان کے خط کے جواب میں لکھا تھا مجھے بھیجا ہے جس میں انہوں نے ابن شریح کی سفارش کی تھی، جس کو پڑھ کر میں نے اندازہ لگایا کہ تو دو نسبتوں (رائیوں) کے درمیان پھنسا ہوا ہے ایک نسبت ابوسفیان کی ہے تو دوسری طرف سمیہ کی، ابوسفیان کی نسبت سے تجھے بردبار متحمل، اور ارادہ کا پختہ ہونا چاہئے، اور سمیہ کی نسبت کا تقاضا ہے کہ تیری رائے ایسی گھٹیا ہونی چاہئے جیسے ان لوگوں کی ہوتی ہے اور اس کا ثبوت تیرا وہ خط ہے جو تو نے حسینؓ کو لکھا جس میں تو نے ان کی والدہ کو گالی دی اور ان کو فاسق ٹھہرایا۔ میں اپنی جان کی قسم کھا کر کہتا ہوں، کہ تو حسینؓ سے زیادہ فسق کا اہل ہے۔ اور تیرا باپ جب تو ایک غلام کی طرف منسوب کیا جائے ان کے باپ سے فسق کا زیادہ اہل ہے حسینؓ نے خود کو اونچا سمجھ کر اگر اپنا نام پہلے لکھ دیا تو کیا ہوا تجھے تو اس نے نہیں گھٹایا۔ اور ان کی سفارش رد کر کے اس نیکی کو جو قبول سفارش کی صورت میں حاصل ہوتی تو نے اپنے سے بہتر کی طرف لوٹا دیا جب مرا یہ خط تجھے ملے تو سعید بن شریح کا جو مال و متاع تیرے پاس ہے اس کے حوالہ کر دو۔ مال و عیال لوٹا دو اور گھر بنوا کر دو اور اس سے کسی قسم کی باز پرس نہ کرو۔ میں نے حسینؓ کو خط لکھ دیا ہے کہ وہ اپنے دوست کو ان احکامات کی خبر کر دیں، پھر اگر وہ چاہے تو ان کے پاس رہے اور چاہے تو اپنے شہر میں آجائے، بہرحال تیرے ہاتھ و زبان کو ان پر کوئی اختیار نہیں اور تو نے جو حسینؓ کو خط میں ان کے والد کی طرف منسوب کرنے کی بجائے والدہ کی طرف منسوب کیا ہے تو تمہارا یہ حرکت افسوس ناک ہے حسینؓ تو وہ ہیں جو نہ کسی بدی سے ذلیل کئے جا سکتے ہیں نہ عزت و مرتبہ سے گرائے جا سکتے ہیں کیا تو نے ان کے والد کو حقیر جانا؟ وہ علی ابن ابی طالب ہیں! اور ان کی والدہ کی

www.Ahlehaq.com

طرف نسبت کی! وہ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی
حضرت فاطمہ (رضی اللہ عنہا) ہیں۔ یہ نسبت تو اور بھی زیادہ قابل
فخر ہے! اگر تجھ میں کچھ سمجھ ہوتی،

غرض ابن زیاد اور اسکی اولاد میں سے خاصکر عبید اللہ کی شرارت وگستاخی، جناب امیر رضی اللہ عنہ کے خاندان کے ساتھ جس قابل نفرت حد تک پہنچی ہوئی ہے وہ تاریخ کا حصہ ہے!

اس تفصیل کے بعد شیعہ حضرات کے لئے مشکل صورت حال یہ ہے کہ ابن زیاد جب ولد الزنا تھا اور ولد الزنا امامیہ کے نزدیک (سور کی طرح) نجس العین ہوتا ہے۔ تو جناب امیر رضی اللہ عنہ نے اس کو فارس کے لوگوں پر نیز مسلمانوں کے لشکر پر حاکم وامیر کیسے بنا دیا۔ اور اس وقت چونکہ نماز پنجگانہ، جمعہ وعیدین کی امامت بھی امیر کے ذمہ ہوتی تھی تو گویا یہی نطفۂ نا تحقیق، مسلمانوں کو نمازیں بھی پڑھاتا رہا۔ اور بقول امامیہ نمازیں تباہ کرتا رہا۔ کیونکہ امامیہ کے ہاں یہ تحقیق وتصریح شدہ مسئلہ ہے کہ ولد الزنا کی امامت سے نماز فاسد ہو جاتی ہے۔ تو ایسی صورت میں شیعوں کا کیا منہ اور ان کو کیا حق ہے کہ وہ جناب عثمان غنی شہید رضی اللہ عنہ پر یہ طعن توڑیں اور اعتراض کریں کہ آپؓ کے عمال ظالم یا خیانت پیشہ تھے! (ایں گناہے است کہ در شہر شما نیز کنند!

اعتراض (۲) دوسرا اعتراض یہ ہے کہ حکم بن ابی العاص کو جو مروان کا باپ تھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی قصور کی بنا پر مدینہ بدر کر دیا تھا۔ آپ نے اس کو پھر مدینہ واپس بلالیا۔

جواب یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم کو مدینہ سے اس بنا پر نکال دیا تھا کہ منافقین سے اس کے دوستانہ تعلقات تھے، اور کفار سے بعض معاملات میں تعاون بھی کرتا تھا جس کی وجہ سے مسلمانوں میں باہمی فتنہ انگیزی کی نوبت بھی آجاتی تھی، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد بعہد شیخین رضی اللہ عنہما، کفر ومنافقت کا حجاز میں عموماً اور مدینہ منورہ میں خصوصاً نام ونشان ہی مٹ گیا۔ اور کافر ومنافق سے دوستی اور تعاون اور اس کے سبب فتنہ انگیزی کا خدشہ ہی نہ رہا تو بقاعدہ طے شدہ کہ جب کوئی حکم کسی علت، سبب اور وجہ سے مقید ہو تو علت کے ختم ہو جانے کے بعد وہ حکم بھی باقی نہیں رہتا، مدینہ بدری کا حکم بھی اس سے اٹھ گیا۔

اور جناب شیخین رضی اللہ عنہما نے بمصلحت اس کے مدینہ میں داخلہ کو پسند نہیں فرمایا کہ احتمال تو ابھی باقی تھا کہ یہ دونوں حضرات بنی تمیم سے تھے اور حکم بنو امیہ میں سے تھا ایسا نہ ہو کہ عداوت دور جاہلیت کے سبب رگ جاہلیت جوش مار جائے اور مسلمانوں میں کسی نوع کی چہ، چہ، میں، میں، شروع ہو جائے۔

اور جناب غنی رضی اللہ عنہ کا تو وہ چونکہ بھتیجا تھا اس قسم کا کوئی خدشہ نہ تھا۔ لہٰذا بطور صلہ رحمی آپ نے اسے مدینہ بلالیا اور یہ اعتراض لوگوں نے خود حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ سے بھی کیا تھا کہ آپ نے حکم کو مدینہ میں کیسے بلالیا۔ جس کا انہوں نے کافی وشافی جواب اسی وقت دیدیا تھا کہ میں نے وصال سے پہلے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی واپسی کی اجازت لے لی تھی! جب ابوبکر رضی اللہ عنہ خلیفہ تھے تو میں ان کے پاس گیا۔ آپ نے دوسرا گواہ طلب فرمایا۔ اسی طرح میں عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے پاس بھی گیا کہ شاید وہ مجھے تنہا کی گواہی قبول کرلیں۔ مگر انہوں نے بھی دوسرا گواہ مانگا۔ اب میں خود خلیفہ ہوں، اپنے علم یقینی کے سبب ان کو بلا سکتا ہوں لہٰذا میں نے بلالیا اس لئے اعتراض کی کوئی بات ہے نہ حکم رسول کی مخالفت کا سوال۔

اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے اس قول کی شہادت اہل سنت کی کتابوں میں موجود ہے بروایت صحیح یہ منقول ہے کہ حکم

مرضِ آخری میں ایک روز حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کاش میرے پاس ایک مردِ صالح آتا کہ میں اس سے ہمکلام ہوتا۔ ازواجِ مطہرات اور دوسرے خدامِ خاص نے عرض کی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا ابو بکر رضی اللہ عنہ کو بلوالیں۔ فرمایا نہیں، پھر حضرت عمر و حضرت علی رضی اللہ عنہما کے ناموں پر بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انکار فرمایا۔ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے نام پر ہاں فرمائی چنانچہ جب آئے تو تنہائی میں ان سے کچھ سرگوشی فرمائی۔ ہوسکتا ہے لطف و مہربانی کی اس خاص ساعت میں آپ نے اس کی بھی خطا بخشی کرائی ہو، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس "مردِ صالح" کی سفارش کو شرفِ قبول عطا فرمادیا ہو۔ کہ دوسرے اسی وجہ سے اس سے باخبر نہ ہوسکے۔

پھر یہ بات بھی ثابت ہوگئی ہے کہ حکم نے آخر عمر نفاق وفساد کی عادت سے توبہ کرلی تھی۔ اسی لئے اس کے بعد اس سے کوئی ایسی حرکت صادر نہیں ہوئی! اور پھر عمر کے لحاظ سے بھی وہ کس بل نہیں رہا تھا پیرِ فرتوت ہوگیا تھا کسی ضرر او فتنہ کا اندیشہ بھی نہ رہا تھا۔

اعتراض (۳) تیسرا اعتراض یہ ہے کہ اہلِ بیت اور اپنے عزیز و اقارب کو بہت زیادہ مال و دولت بخشا۔ اور بے انتہا اسراف کیا حتیٰ کہ بیت المال کو کنگال کردیا۔ حکم بن ابی العاص جب مدینہ میں آیا تو اسے ایک لاکھ درہم دیئے اس کے بیٹے حارث بن حکم کو مدینہ کے بازاروں کا محصول، عشور، خزانہ او رمنڈیاں عطا کیں، مروان کو افریقہ کا خمس دے ڈالا۔ عبداللہ بن خالد بن اسید بن ابی العاص بن امیہ جب مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ آیا تو اسے بطورِ انعام تین لاکھ درہم دیئے۔ اپنی لڑکی کو مروارید کے دو دانے ایسے دیئے جنکی قیمت جوہریوں اور تاجروں کے اندازے سے بھی زیادہ تھی۔ دوسری لڑکی کو یاقوت وبیش قیمت جواہر سے جڑی ہوئے سونے کی انگیٹھی دی۔ اور بیت المال کا اکثر روپیہ اپنی عمارتوں کی تعمیر باغات، اراضی اور کھیتوں کی درستگی میں صرف کیا۔

عبیداللہ بن ارقم اور معیقیب دوسی نے جو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہم کے عہد سے داروغہ بیت المال کی خدمت پر مامور تھے یہ حالت دیکھ کر اپنی خدمت سے استعفیٰ دیدیا اور اس خدمت سے سبکدوشی حاصل کرلی، تو مجبور ہوکر یہ خدمت جناب زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے سپرد کی۔ ایک روز تقسیم اموال بیت المال کے بعد ایک لاکھ روپیہ کی بقایا رقم جناب زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو بخشدی۔ ظاہر ہے جب اپنے مال کو مسرفانہ طور پر خرچ کرنا او رفضول اڑانا شریعت کے لحاظ سے قابلِ ملامت ہے۔ تو مسلمانوں کے اموال کو اس طرح فضول خرچیوں میں اڑانا کیوں نہ قابلِ ملامت اور لائقِ مذمت ہوگا۔

جواب یہ ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی داد و دہش اور بخشش و عطا کو بیت المال سے بتانا اور پھر اس کی بنا پر آپ پر اعتراض کرنا سراسر افتراء بہتان اور صریح جھوٹ ہے۔ آپ کا لقب غنی، خلافت کا مرہون تو نہیں تھا آپ کی ثروت اور دولت مندی تو حصولِ خلافت سے پہلے سے چلی آرہی تھی۔ (لشکر اسلام کی مدد، قحط کے وقت اہلِ مدینہ کے لئے آپ کا ایثار و امداد کون جھٹلا سکتا ہے، اس کے علاوہ ہر ضرورت کے وقت آپ کی بیش از بیش داد و دہش کے واقعات سے معمور اسلامی تاریخ سے کون آنکھیں بند کرسکتا ہے۔ (ن)

خصوصاً حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی خلافت مبارکہ کے آخری دور میں جب فتوحات کثرت سے ہوئیں بے اندازہ غنائم حاصل ہوئے ہر سمت سے دولت کے انبار در انبار سمٹ سمٹ کر مدینہ منورہ آنے لگے اور ان سے حصہ پا پا کر نبی محتشم صلی اللہ علیہ وسلم کے جاں نثار اور سچے رفیقوں رضوان اللہ عنہم اجمعین کے حالات بدل گئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض وہ رفقاء اور صحابی جو کبھی نانِ شبینہ کی صبر و رضا کے ساتھ حالت گذار چکے تھے اسی اسی ہزار کے حصوں کے مالک قرار پائے۔ (اور خود حالی جناب علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ جو وہ دور بھی گذار چکے تھے کہ اہل وعیال کو فاقہ کی حالت میں دیکھ کر خود سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ درہم عنایت فرمائے تھے کہ ان سے

بچوں کے لئے کھانا لے آئیں ۔ ن)

حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھی اس دور میں وسعت و فراخی حاصل ہوئی، بہتوں نے عمارتیں کھڑی کر لیں۔ باغات اور اراضیات خرید لئے اور جائدادیں بنا لیں، اسوقت حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ تاجر تو تھے ہی، اسوقت انکی تجارت کو اور بھی فروغ حاصل ہوا اور دولت و ثروت میں بھی خوب اضافہ ہوا۔ پھر آپ نہ تنگدل صاحب دولت تھے، اور نہ ہی آپ کا ہاتھ رُکا ہوا تھا۔ اپنے اور پرائے سب آپ کی داد و دہش سے فیضیاب ہوتے تھے آپ کے لطف و عنایت اپنے قبیلوں پر ہی نہ تھی، آپ غلاموں یتیموں بیواؤں پر ہمیشہ اپنا مال و دولت لٹاتے رہے۔ اور صدقہ و خیرات کا کوئی راستہ کوئی موقعہ آپ کے ہاتھ سے نہ نکل پاتا۔ آپ کا یہ معمول زبان زد خلائق ہے کہ آپ ہر جمعہ ایک غلام خرید فرما کر آزاد کیا کرتے تھے۔ اور انصار و مہاجرین رضوان اللہ علیہم کی روزانہ دعوت بھی آپ کے معمول میں شامل تھی جس میں پُر تکلف کھانا کھلاتے تھے! اس سلسلہ میں جناب حسن بصری رحمہ اللہ علیہ کا ارشاد ملاحظہ کیجئے!

شَهِدْتُ مُنَادِيَ عُثْمَانَ يُنَادِي يَا أَيُّهَا النَّاسُ اُغْدُوْا عَلٰى عِطِيَّاتِكُمْ فَيَغْدُوْنَ فَيَأْخُذُوْنَهَا وَافِرَةً يَا أَيُّهَا النَّاسُ اُغْدُوْا عَلٰى أَرْزَاقِكُمْ فَيَغْدُوْنَ فَيَأْخُذُوْنَهَا وَافِيَةً حَتّٰى وَاللّٰهِ لَقَدْ سَمِعْتُ أُذُنَايَ يَقُوْلُ عَلٰى كِسْوَتِكُمْ فَيَأْخُذُوْنَ الْحُلَلَ وَاغْدُوْا عَلَى السَّمْنِ وَالْعَسَلِ وَقَالَ الْحَسَنُ وَالْأَرْزَاقُ دَارَّةٌ وَخَيْرٌ كَثِيْرٌ۔ رَوَاهُ أَبُوْ عُمَرَ فِي الْاِسْتِيْعَابِ۔

میں گواہ ہوں کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی طرف سے صبح کے وقت یہ اعلان بذریعہ منادی کرایا جاتا۔ کہ حضرات آیئے اور اپنے عطایا لے جائیے، آیئے اپنی خوراک لے جائیے اور لوگ آتے تھے اور خوب لے جاتے تھے، اور میرے کانوں نے یہ اعلان بھی سنا کہ آؤ اپنے لئے لباس لے جاؤ۔ اور لوگ اپنی پوشاکیں حاصل کرتے اور اسی کے ساتھ گھی و شہد کے ناشتہ سے بھی لطف اندوز ہوتے حسن رحمہ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ خوراک وافر بھی ہوتی اور بہت عمدہ بھی۔ ابو عمر نے یہ روایت استیعاب میں کی ہے"

آپؓ کی داد و دہش اور جود و سخا کا جو اندازہ لگانا چاہے تاریخ کا مطالعہ کر کے لگا سکتا ہے!

اللہ کے لئے اللہ کے راستہ میں خرچ کو کسی نے اسراف نہیں بتایا خود حدیث کی رو سے بھلائی میں خرچ کرنا اسراف نہیں لَا إِسْرَافَ فِي الْخَيْرِ۔ اور اعزہ و اقارب پر خرچ کرنا تو دگنے اجر کا موجب ہوتا ہے، حدیث صحیح میں ہے کہ مسکین پر صدقہ صرف صدقہ ہے، اور خویش و اقارب پر صرفہ دو بھلائیاں رکھتا ہے، ایک صدقہ اور دوسرا صلہ رحمی۔ قرآن نے بھی اقارب کو دوسرے مصارف پر مقدم رکھا ہے۔ وَآتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتَامٰى وَالْمَسَاكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ (اور اس کی محبت پر مال دو، اقربا کو یتامیٰ، مساکین اور مسافروں کو)

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ علیہ نے سالم بن جعدؓ سے روایت بیان کی کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے صحابہ کرام کی ایک جماعت کو جن میں جناب عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ بھی تھے اپنے پاس بلایا اور ان کو قسم دلا کر پوچھا کہ سچ کہنا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بخشش و عطایا میں قریش کو دوسرے لوگوں پر مقدم خیال فرماتے تھے؟ اور اسی طرح بنی ہاشم کو قریش پر! اس پر تمام صحابہ نے سکوت کیا تو آپؓ نے فرمایا کہ اگر جنت کی کنجیاں میرے ہاتھ میں دیدی جائیں تو میں وہ بنی ہاشم کو دیدوں تاکہ ان میں سے کوئی باہر نہ رہ جائے۔ بلکہ وہ سب سے پہلے جنت میں داخل ہو جائیں! لیکن ان تمام مصارف کو بیت المال سے سمجھنا بڑا تعصب اور عناد ہے! خود حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے لوگوں نے اس سلسلہ میں جب سوال کیا تو آپ نے فرمایا۔ خلافت سے پہلے میرے پاس جتنی دولت تھی تمکو خوب معلوم ہے اور میری داد و دہش اور بخشش و عطایا کی جو کیفیت ہے وہ بھی تم سب جانتے ہو۔ یہ جانتے بوجھتے یہ بے جا شبہات اور عدل و تقوی کے خلاف گمان میرے بارے میں کیوں کرتے ہو؟

اب رہیں وہ باتیں جن کا ذکر اس قصہ کے شروع میں آیا ہے یہ نقل در نقل ہے، اور ان سے قصہ میں گڑبڑ پیدا کی گئی ہے بات کچھ اور ہے رنگ اس کو دوسرا دیدیا گیا ہے، بیت المال کا نام اپنے جھوٹ میں زور پیدا کرنے کے لئے دیدیا ہے حالانکہ کسی روایت میں اس کا ذکر نہیں اور اصل قصہ بھی اتنا ہے کہ جناب غنی شہید رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے کا نکاح حارث بن حکم کی بیٹی سے کیا۔ اور ان کو اپنی ذاتی دولت میں سے دھوکی رونمائی کہہ لو یا اسوقت کا کوئی رواج،) ایک لاکھ روپیہ انکو بھجوایا۔ اور اپنی بیٹی ام رومان۔ کو مروان بن حکم کے نکاح میں دیا تو اسکو بھی ایک لاکھ روپیہ دیا۔ اور یہ سب کچھ اپنے ذاتی مال و دولت سے دیا۔ بیت المال کا کوئی سوال ہی نہیں تھا! اور نیہ بھی صلہ رحمی اور خویش پن پر مبنی تھی! جو حکم شرع کے ساتھ ساتھ مقبول و پسندیدہ عوام و خواص فعل تھا۔

اور مروان کو افریقہ کے خمس کی بخشش کی داستان بھی جھوٹی اور سراسر افترا ہے! اصل واقعہ یہ ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے عبداللہ بن سعد بن ابی سرح رضی اللہ عنہ کی سرکردگی میں پیادوں و سواروں کا ایک لاکھ کا لشکر دیار مغرب کی فتح کے لئے روانہ کیا جب وہ مغرب کے پایہ تخت شہر افریقہ کے قریب پہنچا۔ تو میدان کارزار وہیں جما۔ مسلمانوں نے انتہائی جدوجہد اور کوشش سے وہاں فتح حاصل کی اور بے حد و حساب مال غنیمت ہاتھ آیا۔ جناب عبداللہ (مذکور) رضی اللہ عنہ نے نقد رقوم کا خمس نکالا جو رواجی سکہ کے مطابق پانچ لاکھ دینار بنتا تھا۔ اور یہ رقم دارالخلافہ کو روانہ کردی،

نقود کے علاوہ اسباب و مویشی کی صورت میں جو مال غنیمت تھا۔ وہ مدینہ سے دور و دراز کی مسافت باربرداری ناکافی ہونے اور اس پر اخراجات کے بار کی وجہ سے دارالخلافہ بھیجنے کی کوئی صورت نہ تھی اسوقت کے حالات اور سواری وغیرہ کی کیفیت کے ساتھ طویل مسافت کا جو کئی ماہ میں قطع ہوتی تھی تصور کیجئے اور پھر سوچئے کہ امیر لشکر نے ان مشکلات اور دشواریوں کے مدنظر اس اسباب و مویشی کو فروخت کرنے کا کتنا مناسب فیصلہ کیا۔ چنانچہ وہ اسباب غنیمت جو بیت المال کے خمس میں کا تھا امیر لشکر نے مروان کو ایک لاکھ درہم میں فروخت کردیا۔ مروان نے ایک لاکھ میں سے زیادہ رقم نقد ادا کردی، جو نقدی میں شامل کرکے مدینہ منورہ روانہ کردی گئی اور بقایا کے متعلق جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ سے یہ وعدہ وعید ہوئے کہ وہ مدینہ پہنچکر ادا کردوں گا اور خلیفہ کی خدمت میں پیش کر دوں گا۔

ادھر اہل مدینہ کو بڑی گھبراہٹ اور سخت پریشانی تھی کہ کسی کا کوئی نہ کوئی رشتہ دار اس جہاد میں شریک تھا جو کالے کوسوں، پرانے دشمن کی سرزمین پر برپا تھا، سب کو اندازہ تھا کہ بڑی سخت لڑائی ہوگی، مسافت بھی بڑی دور و دراز کی ہے، راستے اور سڑکیں جدید ہیں۔ نہ کوئی خبر نہ کسی کی اطلاع مجملاً خبر ملی بھی تو اتنی کہ دشمن بہت زیادہ بھی ہے اور قوی و طاقتور بھی، بڑی گھمسان کی لڑائی ہوئی ہے اور بہت آدمی شہید ہوئے ہیں۔ ایسی ادھوری و نامکمل اور حوصلہ شکن خبر سے ہر ایک فکرمند پراگندہ حواس اور پریشان تھا۔ ایسے پریشان عالم میں مروان کی آمد سے جو اموال غنیمت سے لدا پھندا تھا، جو فتح کی خوشخبری، کے ساتھ لشکریوں کے خطوط پیغامات اور تفصیلی خبریں لایا تھا اہل مدینہ کے لئے مژدہ جانفزا تھا۔ گھر گھر فتح کی خبر امن و سکون بنکر پہنچی، اور سب کے لئے خوشی و مسرت اور فرحت و شادمانی کا سامان مہیا ہوا۔ تاریخ کا اگر کوئی مطالعہ کرے تو اسے معلوم ہوگا کہ اس دن اہل مدینہ نے مروان کو کس نیک اور بہترین دعاؤں سے یاد نہ کیا اور تعریف و تحسین کا کونسا پہلو تھا جس سے دریغ کیا بے انتہا دلی دعاؤں کا تحفہ اسے دیا گیا۔ اور بہت تعریف و توصیف ہوئی اور اس وقت تک اس سے قابل شکایت کوئی بات سرزد بھی نہ ہوئی تھی کہ ان تمام باتوں پر اس کی وجہ سے پانی پھر جاتا۔ لہٰذا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس بشارت کے صلہ میں اور امانتداری اور دیانت سے اس اہم خدمت انجام دینے میں کہ اتنی دور و دراز کی مسافت اور پُرخطر راستوں اور طرح طرح کی مشقت برداشت کرکے مسلمانوں کی امانت بخیر و خوبی پہنچائی۔ اور اہل مدینہ کو فرحت و شادمانی

نصیب ہوئی تھا ، اسباب میں کی بقایا رقم کی ادائیگی اس کو معاف کر دی ۔ امام و خلیفہ وقت کو یہ اختیار ہے کہ بشارت دہندوں ، ملک و ملت کے لئے جاسوسی کی خدمت انجام دینے والوں اور مسلمانوں کے لئے خوشخبریاں لانے والے کو بیت المال سے انعامات دے ۔ اور پھر یہ کام بھی آپ نے تنہائی یا پوشیدہ طور پر نہیں صحابہ کی موجودگی اور اہل مدینہ کی رضا مندی سے کیا ۔ تو اب اعتراض و طعن کی اس میں کون سی بات ہے ۔

یہاں اسراف کے معاملہ میں ایک علمی لطیف نکتہ قابل غور ہے ، کہ انعام و عطایا ، داد و دہش کئے جانے والی رقوم و اموال کا اس مال سے جس سے یہ دیا جا رہا ہے تناسب دیکھا جائے گا اور اسی کے مطابق حکم لگایا جائے گا ۔ مثلاً اگر ایک لاکھ روپیہ میں سے ایک روپیہ یا سو روپیہ یا ہزار روپیہ عطیہ دیا ہے تو وہ اسراف نہیں کہا جا سکتا اس لئے کہ ایک لاکھ سے ایک ہزار کی ایسی ہی نسبت ہے جیسے دس کی ایک ہزار سے ۔

اور تمام عقلی و حسی امور میں تناسب کی رعایت عقل کے مقتضی کے بھی مطابق ہے ، اور شرع کے بھی ۔ مثلاً کسی دوا میں دو چیز گرم ہوں ، اور سو چیز ٹھنڈے تو اس دوا کو سخت گرم ، (مزاجاً) ہرگز نہیں کہیں گے ۔ یہی معاملہ شرع کا ہے ، کہ اگر کسی جگہ و مقام کا خراج ایک لاکھ روپیہ ہو ۔ اور وہاں سے پچاس ہزار وصول کیا جائے تو اس معاملہ کو عدل ہی کہا جائے گا ظلم و زیادتی اس کا نام رکھنا حکم شرع کے خلاف ہوگا ۔

اسی قیاس پر مقدار زکواۃ اور دیگر شرعی اندازوں اور غنیمتوں کی تقسیم میں تناسب کا لحاظ رکھا گیا ہے ۔ اور اکثر ایسا ہوا ہے کہ بڑی رقم میں سے چند ٹکے نکال لینے یا بچ رہنے کو معمولی اور حقیر شے قرار دے کر نظر انداز کیا جاتا رہا ہے ۔ (آج بھی اس کا امتحان کیا جا سکتا ہے اس طرح کہ اگر ایک آدمی کا ایک سو روپیہ اور ایک روپیہ والا نوٹ گر جائے اور تلاش کے وقت سو والا مل جائے ایک والا نہ ملے تو وہ کہے گا جانے دو لیک سو کا تو مل گیا ۔ روپیہ والا نہیں ملتا تو نہ ملے ۔ یہاں اگر اس کی نظر میں تناسب کی اہمیت نہ ہوتی تو بنئیے کی طرح حساب کی دمڑی تلاش کرنے کے لئے روپیہ کا تیل پھونکنے کی مثال یہی قائم کر دیتا ۔ کہ روپیہ کے نوٹ کے لئے ہلکان ہو جاتا ۔ جیسا اگر سو کا نہ ملتا تو ہوتا (ن)

لہٰذا اب اگر حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی پوری زندگی کی داد و دہش کو دیکھا جائے تو زمانہ خلافت کی وہ داد و دہش جس پر طعن و اعتراض کیا جاتا ہے اتنی حقیر معلوم ہوگی جیسے سوئی کے ناکہ پر پانی کی تری ۔ اس لئے اگر بیت المال سے بفرض محال اس خرچ کو تسلیم کر لیا جائے تب بھی اسے اسراف نہیں کہا جا سکتا ۔ کروڑوں روپیہ پوری فراخدلی سے راہ خدا میں بطیب خاطر لٹانے والے نے بیت المال سے چند لاکھ کی بخشش کر دی تو قاعدہ مذکورہ بالا کی رو سے یہ اسراف اور قابل اعتراض بات نہیں ، ہاں اگر ان مصارف کو ان کے مجموعی مصارف کے تناسب سے ہٹ کر دیکھیں تو اسراف کہا جا سکتا ہے ۔ لیکن اوپر معلوم ہو چکا کہ عقلی ، حسی اور شرعی امور میں تناسب کو نظر انداز کر کے افراط و تفریط کا حکم نہیں لگایا جا سکتا ۔ اگر کوئی لگائے تو وہ مردود و نامقبول ہوگا ۔ اسی لئے اس معاملہ میں حضرت غنی رضی اللہ عنہ پر اسراف کا الزام مردود اور ناقابل تسلیم ہے ۔

اور عبداللہ بن خالد بن اسید کو تین لاکھ درہم دینے کا جو لوگ کہتے ہیں (تو شیعوں کا حال تو تقریباً ہر معاملہ میں "کانا اور لے بھاگی" کا سا ہے ۔ ان کے لئے اتنا کافی ہے کہ عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا عہدا اور تین لاکھ کی رقم بس نتیجہ نکالنے میں ان کو کیا دیر ۔ کہہ دی ! فلاں کو عثمان رضی اللہ عنہ نے بیت المال سے تین لاکھ درہم دے ڈالے صحیح معاملہ کی کھوج سے انہیں چڑ ہے ۔ افتراء اور جھوٹ ان کے لئے شیر مادر ہے اسی لئے یہ جو کہتے ہیں عموماً جھوٹ نکلتا ہے ۔ اور یہاں بھی) وہ جھوٹ ہے ۔ صحیح بات یہ ہے کہ وہ قرضہ تھا جو باقاعدہ تحریر کے بعد ان کو دیا گیا تھا ۔ اہل مصر کے محاصرہ کے وقت یہی بات حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے فرمائی بھی تھی ! اور عبداللہ نے وہ روپیہ بیت المال کو ادا بھی کر دیا تھا ۔

اسی طرح حارث بن حکم کے بازاروں کا عشر ، چنگی وغیرہ کے سلسلہ میں جو کہا ہے ، وہ سب غلط ہے اس سلسلہ میں کوئی عطا و بخشش

www.Ahlehaq.com

نہیں کی گئی بات صرف اتنی تھی کہ حارث کو ملازم رکھا گیا اور محتسبوں کی طرح اس کی یہ ڈیوٹی لگائی گئی کہ وہ بازار کا گشت لگائے۔ بھاؤ تاؤ کی دیکھ بھال رکھے لوٹ کھسوٹ ظلم و زیادتی نہ ہونے دے۔ تول جوکھ کے ترازو بٹوں کی جانچ رکھے! ملازمت کو دو تین دن ہی ہوئے تھے کہ اہل شہر کی طرف سے یہ شکایت ہوئی کہ اس نے بازار کی ساری کھجور کی گٹھلیاں، خود خرید لیں دوسرے گاہگوں کو خریدنے کا موقعہ ہی نہیں دیا۔ اور یوں دوسروں کے اونٹ بے چارہ رہ گئے، کیونکہ یہ ان کی خوراک تھی۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے اس کو ڈانٹ ڈپٹ کی اور نوکری سے اسی وقت برخاست کرکے اہل شہر کی شکایت کا برمحل ازالہ کرکے ان کی تسلی خاطر کی!

اس میں عیب و طعن کی کیا بات ہے۔ یہ تو ان کا قابل تحسین اور لائق تعریف کارنامہ اور مبنی بر انصاف عمل ہے کہ قریبی رشتہ داری کے باوجود محض شکایت سنتے ہی اس کے خلاف کارروائی کر ڈالی۔

اسی طرح ابن ارقم اور معیقیب دوسی کے استعفیٰ کا معاملہ ہے کہ اس میں بھی دھوکہ دھڑی سے کام لیا، حقیقت کے بجائے اپنی طرف سے من گھڑت افسانہ تراش لیا صحیح بات یہی کہ انہوں نے کبرسنی، اور ضعف کے سبب اس محنت و مشقت طلب خدمت کی کما حقہ ادائیگی سے معذور ہو جانے کی بنا پر استعفیٰ دیا تھا۔ اور ان کے استعفیٰ کا حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے مجلس میں خطبہ کے دوران اعلان کیا اور فرمایا۔

يَآ أَيُّهَا النَّاسُ اَنَّ عَبْدَ اللهِ بن اَرْقَمَ لَمْ يَزَلْ عَلٰى خَزَآئِنِكُمْ مُنْذُ زَمَنِ اَبِيْ بَكْرٍ وَعُمَرَ اِلَى الْيَوْمِ وَاِنَّهٗ قَدْ كَبُرَ وَضَعُفَ وَقَدْ وَلَّيْنَا عَمَلَهٗ زَيْدَ بْنَ ثَابِتٍ۔

لوگو عبداللہ بن ارقم جناب ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے زمانہ سے آج تک تمہارے بیت المال کے خزانچی رہے ہیں، اب وہ بوڑھے اور کمزور ہوگئے اس لیے ہم نے ان کا کام زید بن ثابت (رضی اللہ عنہ) کے حوالہ کر دیا ہے۔

اور بطور اعتراض انہوں نے جو یہ بات کی ہے کہ آپ کی عمارات، باغات اور کھیت سب بیت المال کے پیسہ سے بنے! تو یہ بھی ان کا افتراء اور جھوٹ ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ روپیہ کمانے کا جو ہنر اللہ تعالیٰ نے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی فطرت میں ودیعت فرمایا تھا۔ اور جو ڈھب آپ کو سکھایا تھا، اس کی نظیر بعد میں بھی نہیں دیکھی گئی کہ حق حلال طریقہ پر انتہائی عزت و وقار کے ساتھ بلا تعب و مشقت کسی نے اس قدر مال و دولت کمایا ہو! آپ اپنی حلال کی کمائی کو اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کی خاطر اس قدر فراخدستی اور انبساط قلبی سے خرچ کرتے تھے کہ مضمون حدیث نعم المال الصالح للرجل الصالح۔ (پاک آدمی کی ملک میں پاک مال کی اچھائی کا کیا کہنا) کا صحیح مصداق بن گئے تھے۔

عہد خلافت سے پہلے کمائی کے بہت سے طریقے آپ اختیار فرماتے رہے اور خلافت کے بعد یہ تدبیر اور تجویز ذہن میں آئی کہ آپ اپنی قلمرو میں، عراق ہو یا حجاز، جہاں بھی بنجر و ناکارہ زمین ملتی خرید لیتے، اور پھر غلاموں اور ملازموں کو کھیتی باڑی کے سامان و اوزار دے کر اس افتادہ زمین کو قابل کاشت بنانے پر لگا دیتے، کہ زمین کو آباد کرو اور اس کی آمدنی سے اپنی گذر بسر کرو۔ جب زمین درست ہو جاتی تو باغ لگوا لیتے، اس میں میوہ دار درخت لگاتے، کنوئیں اور نہریں بنواتے۔ غرض ہر طرح سے اس زمین کی آبادی اور سرسبزی میں کوشاں رہتے اور یہی وجہ ہے کہ عرب کی زمین جو قحط زدہ، بنجر اور بے آب و گیاہ تھی آپ کے عہد خلافت میں اتنی آباد سرسبز و شاداب ہو گئی تھی، کہ بڑے بڑے پُر فضا علاقوں کی نظیر کہلانے کے مستحق تھی۔ جگہ جگہ چشمے جاری ہیں، آبشار رواں ہیں میووں سے درخت لدے ہوئے ہیں، کھیتیاں سرسبز و شاداب ہر طرف لہلہا رہی ہیں! گویا زمین نے سونا اگل دیا ہے۔ پھر موالی، غلام، ملازمین کے وہاں آباد ہو

جانے اور بس جانے سے، صحراؤں، وادیوں اور جنگلات میں رہزنی، چوری، چکاری کا خدشہ جاتا رہا، درندوں کا ڈر اور خوف جاتا رہا، کہ وہ آبادیوں کی وجہ سے وہ سے نکل بھاگے! مسافروں کے لئے راستے بے خطر اور پرامن ہوگئے۔ تجارتی قافلے بے کھٹکے آنے جانے لگے۔ راستہ میں ان کو قیام گاہ اور جانوروں کے لئے چارہ کی سہولت میسر آنے لگی۔ مختلف ملکوں اور شہروں سے تجارت کو فروغ ہوا۔ نفیس سامان اور عمدہ اور نوبہ نوع اشیاء کے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونے میں آسانی ہوگئی،

اور یہ دو امور امن وخوشحالی، آبادی وزراعت آپؓ ہی کے عہد سعادت مہد میں نصیب ہوئے۔ جو عرب میں عجائبات اور خرق عادات میں شمار ہوتے تھے! حدیث شریف میں ایک پیشین گوئی بایں الفاظ کی گئی ہے۔

لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰى تَعُوْدَ اَرْضُ الْعَرَبِ مُرُوْجًا وَّاَنْهَارًا۔ — جب تک عرب کی زمین مرغزار اور نہروں والی نہ بن جائے قیامت نہیں آئیگی۔

اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عدی بن حاتم طائی سے فرمایا۔

اِنْ طَالَتْ بِكَ الْحَيٰوةُ لَتَرَيَنَّ الظَّعِيْنَةَ تُسَافِرُ مِنْ حِيْرَةِ النُّعْمَانِ اِلَى الْكَعْبَةِ لَا تَخَافُ اَحَدًا اِلَّا اللّٰهَ۔ — اگر تمہاری عمر بڑی ہوئی تو تم دیکھوگے کہ ایک اونٹ سوار عورت مقام حیرۃ النعمان سے کعبہ تک (تنہا) سفر کریگی اور اس کے دل میں خدا کے ڈر کے سوا کسی کا ڈر نہ ہوگا۔

اور یہی نہیں بلکہ حدیث شریف میں عہد عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی صراحت کے ساتھ بطور اظہار مسرت یہ فرمایا گیا کہ عثمانؓ کے زمانہ میں مال و دولت کی کثرت ہوگی خزانہ بہت ہوگا لوگوں میں دولت کی بدولت تکلفات کا رواج ہوگا۔ وغیرہ وغیرہ۔

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی اس خوش تدبیری کا یہ اثر ہوا کہ اکثر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے نہ صرف اسے پسند کیا بلکہ اس پر عمل پیرا بھی ہوئے، منجملہ ان کے ایک حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی ہیں کہ آپ نے سواد ینبع، فدک، زہرہ اور دوسرے گاؤں میں اسی ترکیب کو استعمال فرمایا۔ اور حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نے غابہ اور اس کے گرد و نواح میں، اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہ ذی خشب اور جرف میں اسی تدبیر کو اختیار کیا۔ اسی طرح دیگر اصحاب کرام رضی اللہ عنہم نے بھی جہاں جہاں موقعہ ملا ایسا ہی کیا۔ چنانچہ مدینہ منورہ کے گرد و نواح خوب سرسبز و شاداب اور آباد ہوگئے۔ اگر حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا عرصہ خلافت کچھ اور دراز ہوجاتا تو پورے حجاز کی سرزمین، لالہ زار اور باغ و بہار ہوتی۔

اور جس طرح امام کی اجازت سے ہر شخص کو یہ حق حاصل ہے کہ اُفتادہ و بنجر غیر مملوکہ زمین کو اپنے خرچ و محنت سے کارآمد و آباد کرسکتا ہے۔ تو امام و خلیفہ کو اس حق سے محروم کرنے کا کیا جواز ہے۔ اور اس زمین کی کمائی خلیفہ کے لئے کیوں نہ حلال ہوگی۔ اور کیوں اس کا تصرف ناجائز ہوگا۔ صریح روایات اور تاریخی حوالوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُفتادہ و بنجر زمین میں کاشت کرتے، غیر آباد کو آباد کراتے، باغات لگواتے، کنویں کھدواتے اور نہریں جاری کراتے، اور یہ سب کچھ اپنے ذاتی روپیہ پیسہ سے کرتے اور اس کا صلہ وصول کرتے۔ اور آمدنی میں روز بروز اضافہ ہوتا۔ اور آپ کے زمانہ میں اہل مدینہ میں کون ایسا تھا جو کھیتی باڑی نہ کرتا یا باغات نہ لگواتا ہو!

اور بیت المال کے بقیہ کو جناب زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو دے دینے کا واقعہ بھی سچ تما جھوٹ ہے۔ صحیح روایت یہ ہے کہ آپؓ نے ایک بیت المال سے مستحقین میں رقم تقسیم فرمانے کا حکم دیا۔ مستحقین میں سے کوئی باقی نہ رہا اور رقم میں ایک ہزار درہم باقی بچ رہے۔ تو آپ نے وہ رقم جناب زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے سپرد کی اور فرمایا کہ اپنی صوابدید کے مطابق مسلمانوں کی ضروریات میں صرف کردیں چنانچہ انہوں نے یہ رقم مسجد نبوی کی مرمت و درستگی میں صرف فرمادی۔ محب طبری نے اہل سنت کے گذشتہ واقعات کے ضمن میں اسے بیان کیا ہے!

www.Ahlehaq.com

www.Ahlehaq.com

غرض بدگمانی کے مرض لاعلاج میں یہ بدگمان و متعصب لوگ اتنے آگے نکل گئے ہیں کہ جہاں کہیں حضرت عثمان غنی رضی عنہ کا ذکر دیکھتے اور اس کے ساتھ آپ کی بید عمرنگ اور فراخدلانہ بخشش و عطا کا حال سنتے ہیں، تعمیر مساجد و مقامات مقدسہ یا مسلمانوں پر دولت لٹانے کا، اقرباء کی امداد کا واقعہ پڑھتے ہیں تو آنکھ بند کر کے الزام لگا بیٹھتے ہیں کہ آپ نے یہ سب کچھ بیت المال کی رقم سے کیا، اور یوں مسلمانوں کی رقم ضائع کر کے ان کی حق تلفی کی ہے۔

اس خود ساختہ بدگمانی، اور تعصب و نادانی کا تو کوئی علاج نہیں۔ ان کی مثال تو لشکر درانی کے ان نوجوانوں کی سی ہے کہ جب احمد شاہ ابدالی کے دور میں وہ دہلی میں گھسے اور لوگوں کے مال و اسباب کو اپنے تصرف میں لائے تو جب وہ شہر میں گھومتے، اور سنہری مسجد اور منقش و عالی شان عمارتیں سرائیں، مدارس وغیرہ دیکھتے تو بہت افسوس کرتے حتیٰ کہ بعض تو روتے بھی۔ اور سبب پوچھنے پر کہتے کہ ہمیں اس کا صدمہ ہے کہ ہمارے بادشاہ کے اموال کو کس بے دردی سے ضائع کیا گیا ہے۔ اگر یہ ساری دولت سنبھال کر رکھی جاتی تو آج ہمارے بادشاہ کے کام آتی۔

اعتراض (۴) چوتھا اعتراض یہ ہے کہ آپ نے اپنے دور خلافت میں کئی صحابہ کو اپنے عہدہ سے معزول کیا۔ مثلاً جناب ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو بصرہ کی امارت سے معزول کر کے آپ کی جگہ عبد اللہ بن عامر بن کریز کو متعین کیا۔ عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کو مصر سے ہٹایا اور ان کی جگہ عبد اللہ بن سعد بن ابی سرح رضؓ کو مقرر کیا۔ حالانکہ یہ وہ ہیں جو مرتد ہو کر مشرکین سے جا ملے تھے اور جن کا خون حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حلال کر دیا تھا۔ اور فتح مکہ کے دن حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اس کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لائے اور پرزور سفارش کر کے ان کی خطا معاف کرائی، پھر یہ دوبارہ اسلام میں داخل ہوئے! جناب عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کو کوفہ کی ولایت سے معزول کیا۔ نیز جناب مغیرہ بن شعبہ کو بھی کوفہ سے ہٹایا۔ اور حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے کوفہ کی قضا، لے لی، اور خزانوں کا داروغگی سے علیحدہ کیا۔

جواب۔ اس طعن کا بے محل ہونا ہر سمجھ دار پر واضح ہے کہ اگر ائمہ و خلفاء کو کسی ماتحت کے عزل و نصب کا اختیار نہ ہو تو پھر اس کی کیا عزت اور وقار رہے گا۔ یہ ان کے اختیاری امور میں سے ہے جس کو چاہیں مقرر کریں جس کو چاہیں معزول کر دیں نہ ان پر یہ لازم ہے نہ وہ اس کے پابند ہیں کہ سابقہ عمال ہی کو برقرار رکھیں، ہاں اس بات کا ضرور خیال رکھیں کہ بلا قصور بلا وجہ معزول نہ کریں اور وجہ و سبب ذاتی کدورت ہی نہیں مملکت کے مفاد اور انتظامی و سیاسی معاملات بھی ہو سکتے ہیں۔

اور ان حضرات کی معزولی بھی بلا سبب نہیں تھی ان کے اسباب تھے جن کی تفصیل تاریخ کی کتابوں میں موجود ہے جس کو دیکھنے ہی سے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے حسن تدبیر کا پتہ چلتا ہے۔ فی الحقیقت ان حضرات کی علیحدگی اور دوسرے حضرات کا ان کی جگہ تقرر انتظام و استحکام مملکت کے ساتھ دوسرے شہروں کے فتح کا سبب بھی بنا۔ اور خلافت کی شان کچھ سے کچھ ہو گئی۔ لشکر و افواج میں اس قدر اضافہ ہوا، ولایت و مملکت کا دائرہ اسقدر کشادہ ہوا اور قلمرو اسلامی کا حلقہ اس قدر وسیع تر ہوا کہ قیصر و کسریٰ کی نسلوں نے خواب و خیال میں بھی نہیں دیکھا تھا۔ اسلامی مملکت کا طول اگر اندلس سے کابل تک تھا تو عرض قسطنطنیہ سے عدن تک پھیلا ہوا تھا۔ قاتلین عثمان دس بارہ سال صبر و چین سے اور بیٹھے رہتے تو ان کو ایران و خراسان طرح ہند و سندھ ترک و چین میں بھی "علی علی" کے نعرے لگاتے کو مل جاتے۔ ان بدبختوں کو یہ سوچنے کی بھی توفیق نہ ہوئی، کہ عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے ان کے ہاتھوں سے کام چھین کر گو بنو امیہ کو مسلط کیا مگر نام تو "محمد و آل محمد" کا بالا ہو رہا ہے۔ عبد اللہ بن عامر کریز کے طفیل ہی یہ مشہد، شیراز، نیشاپور وغیرہ میں "یا علیؓ" کا نعرہ لگانے کے قابل ہوئے اس لئے کہ خراسان اسی نے فتح کیا تھا۔ اور بنو امیہ کی ترک و چین، ہند و سندھ تک نارسائی ہی نے اس

علاقہ کے لوگوں کو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے نام نامی کے آوازے سے محروم رکھا۔ اور وہاں کوئی بھی نہ جان سکا کہ علی (رضی اللہ عنہ) کون تھے۔
ذیل میں ہم مجبوراً عزل و نصب کے اسباب کا اجمالی ذکر کرتے ہیں اور حوالہ میں شیعوں ہی کے معتبر مورخین ابن قتیبہ اور ابن اعثم کو پیش کرتے ہیں، تاکہ انہیں کچھ تو لاج آئے۔

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی علیحدگی اگر عمل میں نہ آتی تو سخت خانتشار اور فتنہ کا اندیشہ تھا، جو اگر پھوٹ پڑتا تو ناقابل تدارک ہوتا۔ کوفہ اور بصرہ دونوں تباہ ہو جاتے۔ کیونکہ دونوں شہر کے لشکریوں میں سخت اختلاف و نفاق رونما ہو چکا تھا۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہد ہی میں جناب ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ بصرہ کے گورنر تھے۔ اس کی حدود فارس سے ملتی تھی، جس کے زمیندار، خاصے طاقتور تھے ان سے مقابلہ کے لئے آپ نے خلافت سے امداد چاہی، چنانچہ پیشگاہ خلافت کی طرف سے کوفہ کے لشکر کو ان کی مدد و اعانت کے لئے مقرر کیا۔ وہ کوفی لشکر ابھی بصرہ نہیں پہنچا تھا کہ راستہ میں رامہرمز سے لڑنے کی نوبت آ گئی۔ یہ فارس و اہواز کے درمیان ایک بڑا شہر تھا یہ لشکر ادھر مڑ گیا۔ لڑائی ہوئی، اسلامی لشکر کو نمایاں فتح حاصل ہوئی، شہر بھی قبضہ میں آیا قلعہ بھی سرنگوں ہوا بے شمار مال و دولت، لونڈی غلام، ہاتھ آئے۔ اس سے پہلے بصرہ کے لشکر بھی ان سے نبرد آزما ہوتے رہے تھے۔ اس بنا پر جناب ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کا خیال تھا کہ مال غنیمت تنہا کوفی لشکر میں تقسیم نہ ہو بلکہ بصری لشکر کو بھی اس سے حصہ ملے۔ اس لئے انہوں نے کوفی لشکر کو کہا کہ جن لوگوں سے تم لڑے، جن کے مکانات تم نے تباہ و برباد کئے ان کو تو میں امان دے چکا تھا۔ اور چھ ماہ کی مہلت ان کو دے چکا تھا۔ اور تم کو تو میں نے صرف ڈرانے دھمکانے اور رعب ڈالنے کیلئے ملایا تھا تم تو ایک دم ان پر ٹوٹ پڑے اور جلد بازی سے کام لے لیا۔ مگر کوفی لشکر نے بصری لشکر کو غنیمت میں شریک کرنے سے انکار کیا اور کہا یہ امان دینے کا قصہ افترا اور جھوٹ ہے۔ باہم رد و کد نے شدت اختیار کر لی، اور دونوں لشکروں میں جھگڑے کی بنیاد پڑ گئی، جب اس قصہ کی خبر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو ہوئی تو آپؓ نے حکم دیا کہ جناب ابوموسیٰؓ رضی اللہ عنہ کے شریک لشکر بزرگ و محترم صحابہ مثلاً حذیفہ بن یمان، براء بن عازب، عمران بن حصین، انس بن مالک اور سعید بن عمرو انصاری (رضی اللہ عنہم) اس معاملہ کی تحقیق و تفتیش کریں، اور یہ دیکھیں کہ ابوموسیٰ (رضی اللہ عنہ) کی قسم کا کیا معاملہ ہے۔ میں انہیں حضرات کی تحقیق و تفتیش کے لحاظ سے اپنا فیصلہ دے دوں گا۔ جناب موسیٰ رضی اللہ عنہ نے ان سب حضرات کے سامنے قسم کھائی۔
تو خلافت کا حکم صادر ہوا۔ کہ مال اور قیدی، سب واپس کر دیئے جائیں۔ اور مدت معینہ امان تک ان کو بالکل نہ چھیڑا جائے!

یہ فیصلہ کوفی لشکر کو ناگوار ہوا، اور ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ سے ناراض ہو گئے، کوفی لشکر کی ایک جماعت خلیفہ کے ہاں پہنچی اور اعتراض کیا کہ اگر واقعی امان دی گئی ہوتی تو بصرہ کے لشکریوں کو تو اس کی اطلاع ہوتی اور ان میں یہ بات مشہور و معروف ہوتی حالانکہ لشکر میں کسی کو بھی اس کا پتہ نہیں اور ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ نے جھوٹی قسم کھائی ہے۔ جناب فاروق رضی اللہ عنہ نے جناب ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کو بلایا اور قسم کے بارے میں ان سے استفسار کیا، اسوقت بھی انھوں نے قسم کھا کر یہی کہا کہ میں نے سچی قسم کھائی ہے، اس پر آپ نے فرمایا اگر معاملہ یوں تھا تو پھر ان لشکریوں کو ان پر کیوں چڑھایا، کہ انہوں نے وہاں جا کر یہ سب کچھ کیا۔ قسم آپ کی اگر جھوٹی نہیں بھی ہے تب بھی ملک داری کی مصلحت کے خلاف یہ آپ کی بہت بڑی غلطی ہے۔ سردست میرے پاس کوئی مناسب آدمی نہیں کہ آپ کی جگہ مقرر کر دوں فی الحال آپ بصرہ جائیں، صوبہ داری اور لشکر کی سرداری سنبھالیں جب مجھے کوئی کام کا آدمی مل گیا تو آپ کو معزول کر دوں گا رہا آپ کی قسم کا معاملہ سو وہ خدا کے سپرد کرتا ہوں،

اسی دوران آپؓ شہید کر دیئے گئے اور امور خلافت کے ولی حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ ہوئے ادھر بصری لشکریوں نے بھی شکایتوں کی بھرمار کر دی۔ داد و دہش میں کنجوسی کی شکایات دربار خلافت میں پہنچائیں کوفی لشکر پہلے ہی ان سے کبیدہ خاطر تھا۔

ان حالات کو سامنے رکھ کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے غور کیا کہ اگر ان کو تبدیل نہ کیا گیا تو دونوں لشکر یا فروختہ ہوں گے اور فرائض منصبی بدلی سے انجام دینگے اور نتیجہ دونوں صوبوں کا حال ابتر ہو جائے گا لہٰذا مجبوراً ان کو وہاں سے ہٹا کر ان کی جگہ عبداللہ بن عامر بن کریز رضی اللہ عنہ کو مقرر کیا جو برگزیدہ قریشی جوان تھے۔ اور جب وہ بچے تھے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لائے گئے تو آپ نے اپنا لعاب مبارک ان کے منہ میں ڈالا! جوانی ہی میں جذبہ شہادت و نجابت کے آثار، سرداری و ریاست کے علامات ان کے اقوال واعمال وحرکات سے ہویدا تھے۔ ان کا تقرر ان اطراف کے انتظام وانصرام اور دونوں لشکروں کی دلبستگی کے لئے واقعی بہت عمدہ اور کارآمد ثابت ہوا۔

احمد بن ابی سیار نے تاریخ مرو میں روایت کی ہے کہ جب عبداللہ بن عامر رضی اللہ عنہ نے خراسان فتح کیا تو اعلان کیا کہ میں اظہار تشکر میں یہاں اس جگہ سے احرام باندھ کر نکلوں گا۔ چنانچہ وہ نیشا پور سے احرام باندھ کر نکلے! سعید بن منصور نے بھی اپنی سنن میں ایسی ہی روایت بیان کی ہے۔

اور جناب عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کا عزل اہل مصر کی بے شمار شکایات پر عمل میں آیا تھا۔ عہد فاروقی میں بھی بعض امور کی وجہ سے معزول ہوئے مگر توبہ کر لینے پر بحال کر دئے گئے تھے۔ لیکن شیعوں کو تو ان دو حضرات کی معزولی کی بنا پر حضرت عثمانؓ پر اعتراض کرنا کچھ زیب نہیں دیتا۔ اس لئے کہ یہ تو ان دونوں کو واجب القتل قرار دیتے ہیں۔ انہیں تو حضرت شہید رضی اللہ عنہ کا شکر گزار ہونا چاہیئے کہ ایسے لوگوں کو انہوں نے معزول کیا۔ جب وہ اسلام کی قابلیت ہی نہیں رکھتے تو اسلامی ریاست کا حق ان کو کیسے اور کیوں پہنچے اسی لئے بعض اہل سنت اس کو بطور لطیفہ یوں بیان کرتے ہیں کہ شیعوں کو تو یہ کہنا چاہیئے تھا کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے ان کو معزول کرنے پر اکتفا کیوں فرمایا ان کو قتل کیوں نہیں کیا۔ کہ تحکیم کے موقعہ پر امت کے حق میں بداندیشی اور امام وقت کی شان میں بدسگالی کر ہی نہ پاتے۔

بعض خوش طبع حضرات نے اس طعن کا جواب اس انداز سے دیا ہے کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ یہ تو سمجھتے تھے کہ اگر میں ان دونوں کو ختم کر دوں تو پھر میری امامت ہر خاص و عام کے نزدیک ثابت اور مسلّم ہو جائیگی۔ اور چونکہ غیب کا علم امام کی خصوصیت ہے۔ اس لئے شیعوں کو بھی انکار کا موقعہ نہ ہوگا مگر چونکہ آپ کے مزاج پر حیا و مروت غالب تھی، اس لئے یہ سمجھ کر کہ اس میں شیعوں کی کھلم کھلا تکذیب ہوگی اور وہ بے چارے نادم و شرمندہ ہوں گے، اس لئے ان کو صرف معزول کرنے پر اکتفا کیا، اس پر اگر شیعہ یہ اعتراض کریں کہ اگر جناب ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ معزول کئے جانے کے لائق ہوتے تو حضرت علی کرم اللہ وجہہ ان کو اپنی طرف سے ثالث (حَکم) کیوں مقرر کرتے، تو اس کے جواب میں ہم یہ کہیں گے کہ تاریخی طور پر یہ ثابت ہے کہ حضرت امیر رضی اللہ عنہ نے مجبوراً ان کو حَکم بنایا، رضی خوشی اور اختیاراً نہیں بنایا۔ اور چلو یہ مان لیں کہ خوشی ہی سے بنایا تب بھی تو چوک ہوئی۔

فائدہ جلیلہ

یہاں یہ بات ذہن نشین رہے کہ شیخین رضی اللہ عنہما پر مطاعن اور اعتراضات سوائے شیعوں کے اور کوئی نہیں کرتا۔ یہ مطاعن اہل سنت کی کتابوں میں شیعوں کی کتب سے ہی منقول ہوتے ہیں۔ جو اکثر شیعی اصول پر منطبق ہوتے ہیں۔ مگر حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ پر مطاعن باعتبار اکثر شیعہ اصولوں پر پورے نہیں اترتے۔ وجہ یہ ہے کہ آپ پر اعتراض کرنے والے شیعہ بھی ہیں اور خوارج بھی۔ لہٰذا اعتراضات کی دو قسمیں ہو گئیں ایک وہ جو اصول شیعہ کے بموجب ہیں دوسرے خوارج کے اصول کے موافق۔ اس لئے اہل سنت کی کتابوں میں دونوں اقسام خلط ملط کر کے بیان ہو جاتی ہیں اور شیعہ تو دانستہ کہ اعتراضات کی تعداد بہت معلوم ہو دونوں قسم کے اعتراضات تمیز و تفریق کے بغیر بیان کر جاتے ہیں۔

یہی سبب ہے کہ بعض اعتراضات جو شیعوں یا سنیوں کی کتب میں منقول و موجود ہیں وہ نہ اصول شیعہ کے مطابق ہیں نہ ان کے مذہب کے موافق چنانچہ جناب ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ پر اعتراض اسی نوع کا ہے اور حضرت عمرو بن عاصؓ کی موقوفی پر اعتراض نہ اصول شیعہ پر منطبق ہوتا ہے نہ اصول خوارج پر اسلئے کہ یہ دونوں گروہ تکفیر

کرتے ہیں اگرچہ جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان کو معزول کیا اس وقت ان سے کوئی قول و فعل موجب کفر سرزد نہیں ہوا تھا لیکن چونکہ آخر میں شیعوں اور خوارج کے نزدیک، وہ "کافر" اور "مرتد" ہو گئے تھے۔ اس لئے ایسی صورت میں تو ان کی موقوفی اور عزل حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی ایک کرامت سمجھی جانی چاہئے، نہ کہ قابل اعتراض!

اور حضرت شہید رضی اللہ عنہ کی یہ بھی کرامت ہے کہ شیعہ آپ سے جناب امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی موقوفی کی درخواست کرتے تھے۔ آپ نے ان کو دکھلایا کہ جناب عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کو موقوف کر کے عبداللہ بن ابی السرح رضی اللہ عنہ کو ان کی جگہ مقرر فرمایا۔ اگرچہ وہ ابتدائے اسلام میں مرتد ہو گئے تھے لیکن دوبارہ اسلام لانے کے بعد ان سے کوئی برا فعل سرزد نہیں ہوا بلکہ ان کی حسن و تدبیر اور نیک نیتی کے سبب مغرب کا پورا علاقہ فتح ہوا، اور بے شمار خزانے دربار خلافت کو حاصل ہوئے حتیٰ کہ مغربی جزائر پر بھی حملہ آور ہوئے، اور غنائم حاصل کئے، مورخین نے لکھا ہے کہ ان کے غنائم سے پچیس لاکھ دینار (کھرے سونے کے) جمع ہوئے اور دیگر سامان، لیدیات اور مویشیوں وغیرہ کا تو کوئی حد و شمار نہ تھا۔ اس کا پانچواں حصہ بیت المال کے لئے بھیجا جو مسلمانوں پر تقسیم ہوا اور باقی چار حصے اپنے لشکر میں شرعی طریقے پر تقسیم کئے۔ ان کے لشکر میں بہت سے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم بھی تھے اور صحابہ کی اولادیں بھی وہ سب کے سب ان کی عادات و اطوار اور طرز عمل سے خوش تھے، ان کے کسی طرز عمل پر ان کو کوئی اعتراض نہ تھا۔ ان حضرات میں عقبہ بن عامر جہنی، عبدالرحمٰن بن ابوبکر صدیق عبداللہ بن عمرو بن عاص وغیرہ رضی اللہ عنہم، تھے۔ پھر جب حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا واقعہ شہادت پیش آیا تو خود کنارہ کش اور غیر جانبدار رہے۔ کہتے تھے کہ ہم نے خدا سے عہد کیا ہے کہ کافروں سے جہاد و قتال کے بعد مسلمانوں سے قتال نہیں کریں گے۔ آخر عمر تک عزلت گزیں اور گوشہ نشین رہے۔

اور حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کی موقوفی کی نسبت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف کرنا یہ سراسر خلاف واقعہ بات ہے۔ ان کو تو حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے کوفیوں کی شکایت پر موقوف کیا تھا۔ اور ان کی موقوفی پر آپ نے یہ تاریخی کلمات فرمائے تھے۔

مَنْ يَعْذِرُنِي مِنْ أَهْلِ الْكُوفَةِ إِنِ اسْتَعْمَلْتُ عَلَيْهِمْ تَقِيًّا اسْتَضْعَفُوهُ وَإِنِ اسْتَعْمَلْتُ قَوِيًّا فَجَّرُوهُ۔

مجھے اہل کوفہ کے معاملہ میں کون معذور رکھ سکتا ہے اگر میں نے ان پر متقی عامل مقرر کیا تو اسے انہوں نے کمزور قرار دیا۔ اور اگر کوئی قوی عامل ان پر مقرر کیا تو اس میں کیڑے نکالنے لگے!

پھر ان کی جگہ جناب مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کو حاکم مقرر کیا۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں جب ان کو بھی رشوت ستانی سے متہم کیا۔ جو سراسر جھوٹ اور افتراپردازی تھی۔ مگر آپ نے رعایا کے پاس خاطر کے سبب ان کو بھی موقوف کر دیا۔

اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو کوفہ سے مدینہ کیوں بلایا اس کا حال بھی انشاء اللہ آگے بیان کیا جائے گا۔

اور ان سب باتوں سے قطع نظر خلیفہ کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ جس کو چاہے عامل مقرر کرے اور جسکو چاہے موقوف کر دے۔ کسی کو اعتراض کا کیا حق، اور طعن کی کیا مجال!

رہی یہ بات کہ صحابی کو موقوف کر کے غیر صحابی کو مقرر کرنا، تو یہ واقعات تو خود حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں بھی وقوع میں آئے۔ مثلاً حضرت عمر بن ابی سلمہ رضی اللہ عنہ کہ ام المؤمنین ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے بیٹے اور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ربیب تھے، جو جناب امیر رضی اللہ عنہ کے عہد میں آپ کی طرف سے بحرین کے عامل تھے۔ ان کو بلاوجہ و سبب اور بے قصور وہاں سے علیحدہ کیا۔ اور اس کا اعتراف آپؓ نے اس مراسلہ میں خود فرمایا جو ان کی معزولی کے سلسلہ میں ان کو لکھا گیا۔ اور جس کی نقل بحوالہ نہج البلاغہ باب مطاعن ابوبکر رضی اللہ عنہ گزر چکی۔ اور ان کی جگہ نعمان بن عجلان دورقی کو مقرر فرمایا، جو نہ صحابی تھا، نہ علم و تقویٰ عدل و دیانت میں جناب عمر بن ابی سلمہ رضی اللہ عنہ کا عشر عشیر اسی طرح جناب قیس بن سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کو جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے علمبردار تھے۔ اور خود صحابی و صحابی زادہ تھے جناب

www.Ahlehaq.com

امیر رضی اللہ عنہ نے مصر کی گورنری سے معزول کر کے مالک اشتر کو ان کی جگہ مقرر فرمایا۔ جو صحابی تو کیا صحابی زادہ بھی نہ تھا بلکہ فتنہ و فساد کی پوٹ تھا۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو اسی نے شہید کیا۔ حضرت طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما کو ورغلا کر بغاوت کا سبب بنا، اور اس کو اس علم یقینی کے باوجود مصر کا عامل بنایا کہ وہ جیسے ہی مصر پہنچے گا۔ تو جناب امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اس کو برداشت نہ کریں گے اور وہ مصر پر چڑھائی کر دیں گے اور معاملات دگرگوں ہو جائیں گے۔

اعتراض (۵)

پانچواں اعتراض آپؓ پر یہ ہے کہ جناب عبداللہ بن مسعود اور جناب ابی بن کعب رضی اللہ عنہما کا عہد فاروقی سے جو سالانہ وظیفہ مقرر تھا۔ اس کو بند کر دیا۔ اور حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کو مدینہ سے ربذہ بدر کر دیا۔ جناب عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ پر امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو امر بالمعروف کے سبب ناراض ہوئے، جناب عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کو منافق کہا۔ جناب عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کو اتنا مارا کہ آنت اترنے کی تکلیف لاحق ہو گئی۔ کعب بن عبداللہ بہزی رضی اللہ عنہ کو کلمہ حق کہنے کی بنا پر اہانت و تحقیر کی۔

یہ لوگ جلیل القدر صحابہ تھے جن کی اہانت اہل سنت کے نزدیک انسان کی دیانت مجروح ہونے کا سبب ہوتی ہے، تو جب اہل سنت کے نزدیک ان کی دیانت ہی برقرار نہ رہی تو ان کی امامت کیسے درست ہوگی۔

(روایت شیعہ کے مطابق) ان واقعات کی تفصیل یہ ہے کہ

(حضرت ابوذر غفاری (رضی اللہ عنہ) شام میں تھے، جب قاصدوں کے ذریعہ (حضرت عثمان (رضی اللہ عنہ) کے افعال ناشائستہ ان کو معلوم ہوئے، تو ان معائب کی برملا تشہیر اور ان پر کھلم کھلا تنقید اور نکتہ چینی کرنے لگے، تو جناب امیر (معاویہ (رضی اللہ عنہ) نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو لکھا کہ ابوذر (رضی اللہ عنہ) تمکو لوگوں کے سامنے ذلیل کرتے اور تمہاری اطاعت سے ان کو نکالتے ہیں۔ ان کا دفعیہ جلد از جلد کیا جانا چاہیئے تب آپ نے امیر معاویہ (رضی اللہ عنہ) کو لکھا۔ اَشْخِصْهُ اِلَيَّ عَلٰى مَرْكَبٍ وَعْرٍ وَسَائِقٍ عَنِيْفٍ۔ (ان کو میرے پاس تیز سواری اور تیز ہانکنے والے کے ہمراہ بھیجو)

چنانچہ جناب معاویہ (رضی اللہ عنہ) نے ان کو اسی صورت سے مدینہ روانہ کیا۔ جب (حضرت) عثمان (رضی اللہ عنہ) کے پاس پہنچے تو آپ ان پر غصہ ہوئے اور کہا کہ تم کیوں لوگوں کو مجھ پر جری کرتے اور ان کو میری اطاعت سے نکالتے ہو تو ابوذر (رضی اللہ عنہ) نے کہا کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سن چکا ہوں کہ آپ نے فرمایا کہ جب حکم بن ابی العاص کی اولاد تیس آدمیوں تک پہنچے گی تو خدا کے مال کو اپنا ٹھہرائیں گے اور اللہ کے بندوں کو لونڈی غلام سمجھیں گے اور خدا کے دین میں حیلہ اور جھوٹ کو دخل دیں گے جب وہ ایسا کریں گے تو اللہ تعالیٰ ان سے ناراض ہوگا اور بندگان خدا کو ان سے نجات بخشے گا۔ مجلس میں جو صحابہ موجود تھے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان سے پوچھا کہ آپ میں سے کسی نے یہ حدیث سنی ہے؟ سب نے انکار کیا۔ پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بلوا کر ان سے دریافت کیا آپ نے فرمایا میں نے حضور صلی سے یہ حدیث نہیں سنی۔ البتہ یہ دوسری حدیث سنی ہے کہ مَا اَظَلَّتِ الْخَضْرَاءُ وَلَا اَقَلَّتِ الْغَبْرَاءُ اَصْدَقَ لَهْجَةٍ مِنْ اَبِيْ ذَرٍّ۔ نہ کسی پر نیل گوں آسمان سایہ فگن ہوا اور نہ گرد آلود زمین نے کسی کو اٹھایا جو ابوذر سے بات میں سچا ہو)

پس حضرت عثمان رضی اللہ عنہ غصہ ہوئے اور ابوذر رضی اللہ عنہ سے کہا کہ تم شہر سے نکل جاؤ چنانچہ وہ ربذہ چلے گئے اور آخر دم تک وہیں رہے!

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ بھی شام میں تھے۔ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے لشکر میں اونٹوں کی ایک قطار کو جن پر نشہ اور شراب لدی ہوئی تھی جاتے دیکھا تو پوچھا یہ کیا ہے۔ بتایا گیا کہ یہ شراب ہے جو امیر معاویہ (رضی اللہ عنہ) نے بغرض فروخت بھیجی ہے۔ آپ چھری لے

www.Ahlehaq.com

کرا اُٹھے اور شراب کی مشکیں اور پکھالیں پھاڑ ڈالیں اور ساری شراب بہ گئی۔

پھر اہل شام کو (حضرت) عثمان (رضی اللہ عنہ) کی بری خصلتوں سے ڈرایا (جناب امیر معاویہ (رضی اللہ عنہ) نے یہ قصہ (حضرت عثمان (رضی اللہ عنہ) کو لکھ بھیجا اور یہ بھی لکھا کہ آپ عبادہ (رضی اللہ عنہ) کو اپنے پاس بلالیں یہاں رہنے سے لشکر و ملک میں وہ فساد کا سبب بن جائیں گے۔

چنانچہ (حضرت) عثمان (رضی اللہ عنہ) نے ان کو مدینہ بلوالیا اور سخت ناراض ہوئے کہ مجھ پر اور معاویہ (رضی اللہ عنہ) پر کیوں نکتہ چینی کرتے ہو کیا اولوالامر کی اطاعت کرنا بھی نہیں جانتے۔ جناب عبادہ (رضی اللہ عنہ) نے جواب دیا لَاطَاعَةَ لِمَخْلُوقٍ فِي مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ۔ خدا کی نافرمانی میں مخلوق کی اطاعت جائز نہیں۔

اور (حضرت) عبداللہ بن مسعود (رضی اللہ عنہ) کو جب عہدہ قضا اور خزانہ داری سے برطرف کیا اور ولید بن عقبہ کو حاکم بنایا۔ تو جناب (عبداللہ بن مسعود (رضی اللہ عنہ) نے ولید کے ظلم و ستم سے آشفتہ خاطر ہو کر لوگوں کے سامنے اس کے معائب بیان کرنا شروع کر دیئے۔ لوگوں کو کوفہ کی مسجد میں جمع کر کے (حضرت) عثمان (رضی اللہ عنہ) کی برائیاں ان کے سامنے رکھیں، اور کہا کہ لوگو اگر تم امر بالمعروف اور نہی عن المنکر نہیں کرو گے تو خدا کا غضب تم پر نازل ہوگا اور تم پر بُرے لوگ مسلط کر دیئے جائیں گے۔ نیکوں کی دعائیں مقبول نہیں ہوں گی۔ اور جب ان کو جناب ابوذر (رضی اللہ عنہ) کی شہر بدری کی اطلاع ملی، تو مجمع عام میں تعزیہ کی اور حضرت عثمان (رضی اللہ عنہ) پر طنز کرتے ہوئے یہ آیت پڑھی ثُمَّ أَنْتُمْ هٰؤُلَاءِ تَقْتُلُونَ أَنْفُسَكُمْ وَتُخْرِجُونَ فَرِيقًا مِنْكُمْ مِنْ دِيَارِهِمْ۔ (پھر تم وہ لوگ ہو جو اپنوں ہی کو قتل کرتے ہو اور اپنے ہی فریق کو ان کے گھروں سے نکالتے ہو۔

ولید نے یہ واقعات حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو لکھ بھیجے، تو آپ نے ان کو کوفہ سے بلالیا۔ جب وہ مسجد نبوی میں پہنچے تو اپنے غلام کو حکم دیا کہ وہ ان کو مارے۔ غلام نے ان کو پیٹ کر مسجد سے نکال دیا۔ ان کے قرآن کو جلا ڈالا اور ان کے گھر میں ان کو قید کر دیا۔ اور سالانہ وظیفہ چار سال کے لئے بند کر دیا اسی حال میں ان کا انتقال ہوگیا۔ انہوں نے وصیت کی کہ میری نماز جنازہ جناب زبیر (رضی اللہ عنہ) پڑھائیں۔ (حضرت) عثمان (رضی اللہ عنہ) نہ پڑھائیں۔ بیماری کی خبر سن کر (حضرت) عثمان (رضی اللہ عنہ) مزاج پرسی کو گئے تو ان سے کہا کہ اے ابن مسعود (رضی اللہ عنہ) میرے لئے خدا سے گناہوں کی معافی چاہو، ابن مسعود (رضی اللہ عنہ) نے کہا اے اللہ تو غفور رحیم لیکن عثمان سے درگذر نہ کرنا تاوقتیکہ تو اس میرا بدلہ نہ لے لے۔

جب سب صحابہ (حضرت) عثمان (رضی اللہ عنہ) سے آزردہ خاطر ہوئے اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف (رضی اللہ عنہ) پر بھائی چارہ کے تعلق پر ناراضگی کا اظہار کیا تو جناب عبدالرحمٰن (رضی اللہ عنہ) شرمندہ ہوئے اور کہنے لگے کہ مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ ایسے نکلیں گے۔ اب معاملہ تمہارے اختیار میں ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے کانوں تک یہ بات پہنچی تو کہا کہ عبدالرحمٰن (رضی اللہ عنہ) منافق ہے۔ اسے پرواہ نہیں کہ میرے منہ سے کیا نکل رہا ہے۔ عبدالرحمٰن (رضی اللہ عنہ) نے سخت قسم کھائی کہ جب تک زندہ ہوں عثمان (رضی اللہ عنہ) سے بات نہیں کروں گا۔ چنانچہ اسی جدائی کے عالم میں انتقال کیا۔

لہٰذا اگر عبدالرحمٰن (رضی اللہ عنہ) منافق تھے تو ان کی بیعت صحیح نہ رہی اور اگر منافق نہ تھے تو خود حضرت عثمان (رضی اللہ عنہ) ان پر نفاق کی تہمت لگانے کے سبب فاسق ہوئے۔ اور فاسق امامت کے قابل نہیں۔

اور عمار بن یاسر (رضی اللہ عنہ) کے پیٹنے کا قصہ یہ ہے کہ تقریباً پچاس صحابہ (رضوان اللہ علیہم) نے جمع ہو کر ایک خط لکھا اور اس میں (حضرت) عثمان (رضی اللہ عنہ) کے معائب لکھے اور جناب عمار (رضی اللہ عنہ) سے کہا تم یہ خط (حضرت) عثمان (رضی اللہ عنہ) کو پہنچاؤ۔ ممکن ہے وہ ان باتوں سے آگاہ ہو کر اپنی بداطواریوں سے باز آجائیں۔ اس خط میں یہ بھی لکھ دیا تھا کہ اگر تم ان بدعات سے باز نہ آئے تو ہم تم کو معزول کر دیں گے اور کسی دوسرے کو تمہاری جگہ مقرر کر دیں گے۔ جب آپ نے خط پڑھا تو اس کو زمین پر پھینک دیا۔ اس پر عمار (رضی اللہ عنہ) نے کہا اس خط کو حقیر نہ جانئے اسے اصحاب رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) نے لکھ کر آپ کو بھیجا ہے۔ خدا کی قسم میں آپ کے پاس نصیحت و خیر خواہی کے جذبہ سے آیا ہوں۔ اور

آپ کے بارے میں خوفزدہ ہوں۔ (حضرت) عثمان (رضی اللہ عنہ) نے کہا۔ اے ابن سمیہ تو جھوٹ بولتا ہے۔ اور اپنے غلاموں کو حکم دیا کہ ان کو ماریں۔ چنانچہ انہوں نے اتنا مارا کہ بیہوش ہو کر گر پڑے۔ پھر آپ خود اٹھے اور ران کے پیٹ اور عضو مخصوص پر لاتیں ماریں کہ آپ کو فتق کی بیماری لاحق ہو گئی۔ بیہوشی ہی کے عالم میں ان کی چار نمازیں بھی قضا ہو گئیں، جو ہوش میں آکر انہوں نے ادا کیں۔ فتق کے عارضہ کے سبب جس نے سب سے پہلے پاجامہ یا شلوار پہنی وہ عمار (رضی اللہ عنہ) ہی تھے۔

بنو مخزوم اس واقعہ سے بہت برہم ہوئے، اور کہا کہ اگر عمار (رضی اللہ عنہ) اس فتق کی بیماری سے مر گئے تو ہم ان کے بدلے میں بنو امیہ کے ایک بڑے آدمی کو مار ڈالیں گے۔ اس واقعہ کے بعد عمار (رضی اللہ عنہ) گھر میں گوشہ نشین ہو گئے تا آنکہ جناب امیر (رضی اللہ عنہ) خلیفہ ہوئے!

کعب بن عبدہ نہدی (رضی اللہ عنہ) کا قصہ یوں ہے کہ اہل کوفہ کی ایک جماعت نے (حضرت) عثمان (رضی اللہ عنہ) کو ایک خط لکھا اور اس میں آپ کے ایک ایک عیب اور برائی لکھی اور لکھا کہ اگر برائیوں سے باز آجاؤ تو ٹھیک ہے ورنہ ہم آپ کی اطاعت سے نکل جائیں گے، اطلاع شرط تھی سو وہ ہم نے پوری کر دی۔ یہ خط آپ تک پہنچانے کیلئے قافلہ کے کسی آدمی کو دیدیا۔ کعب بن عبدہ نے بھی الگ سے آپ کو ایک خط لکھا جس میں بڑے درشت اور سخت انداز میں آپ کو مخاطب کیا تھا وہ خط بھی اسی قاصد کو دیدیا (حضرت) عثمان (رضی اللہ عنہ) یہ خط پڑھ کر بہت غصہ ہوئے۔ اور (جناب) سعید بن العاص (رضی اللہ عنہ) کو لکھا کہ کعب بن عبدہ کو کوفہ سے نکال دو تاکہ وہ کوہستان چلا جائے۔ چنانچہ وہاں کے گھر گئے اور ان کو برہنہ کیا اور بیس کوڑے لگائے اور پھر شہر بدر کر کے کوہستان کی طرف بھیج دیا۔

سعید بن العاص۔ نے اشتر نخعی کی بھی توہین و تذلیل کی، اس کا قصہ یوں ہے (جناب) سعید جب کوفہ کے صوبہ دار ہوئے اور مسجد میں گئے تو سب لوگ آپ کے پاس آئے۔ اور کوفہ اور مضافات کی خوبیاں بیان کرنے لگے، عبدالرحمن بن حسین جو کوتوال شہر تھا۔ بولا کہ کاش کوفہ کے مضافات ہمارے امیر کی جاگیر میں آجائیں۔ اس پر اشتر نخعی بولا یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ اسے تو ہم نے تلوار سے فتح کیا ہے۔ اور خدا تعالیٰ نے ہمیں اس کا مالک بنایا ہے۔ عبدالرحمن نے اسے ڈانٹا، اور کہا کہ امیر اگر چاہیں تو یہ سارا علاقہ ضبط کر سکتے ہیں۔ اشتر نے درشتی اور سختی برتی تو اور لوگ بھی اس کی حمایت اور اپنی زمینوں کے پاس میں اٹھ کھڑے ہوئے اور عبدالرحمن کو اتنا مارا کہ وہ زمین پر گر پڑا۔

سعید نے یہ واقعہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو لکھ بھیجا۔ تو آپ نے جواب دیا کہ اشتر، اور اس کے مددگاروں کو کوفہ سے نکال کر شام بھیج دو، چنانچہ وہ شام چلے گئے، اور قتل عثمان (رضی اللہ عنہ) تک وہیں رہے! پھر سعید بھی کوفہ کا انتظام نہ سنبھال سکے، لوگ بلوہ کر کے ان پر چڑھ آئے۔ اور وہ مدینہ چلے گئے۔ اس وقت کوفہ کے سرداروں نے اشتر کو لکھا کہ تمہارے بھائیوں نے ایک عہد کر لیا اور قسم کھائی ہے۔ سعید کو کوفہ سے نکال دیا ہے۔ اور (حضرت) عثمان (رضی اللہ عنہ) پر چڑھائی کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اس موقعہ کو غنیمت سمجھو اور ہم سے آملو تاکہ سب مل جل کر یہ مہم سر کریں چنانچہ وہ فوراً کوفہ پہنچا اور ثابت بن قیس کوتوال شہر کو مار پیٹ کر نکال دیا۔ کوفہ کی تمام فوجیں اشتر کے ساتھ مل گئیں اور قسم کھالی کہ اب (حضرت) عثمان (رضی اللہ عنہ) کے کسی عامل کو کوفہ میں نہ آنے دیں گے۔ آخر آپ نے مجبور ہو کر انہیں لوگوں کی خواہش کے مطابق حضرت ابوموسیٰ اشعری کو کوفہ کا صوبہ دار مقرر کر کے بھیجا۔"

جواب:۔ اس طعن و اعتراض کا اجمالی اور الزامی جواب تو یہ ہے کہ جن حضرات کے حوالے سے شیعوں نے اپنے اعتراض کی بنیاد رکھی ہے ان میں سے اکثر تو خود ان کے نزدیک واجب القتل تھے۔ وہ عزت و احترام کے قابل ہی کب تھے، کیونکہ ان لوگوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان صریح کو چھپایا "ظالموں" کی مدد سے اہل بیت کے حق کو غصب کیا۔ اور شہادت حق سے خاموش رہے! اور شیعہ منطق کی رو سے ایسے حضرات سے جو برتاؤ جناب امیر رضی اللہ عنہ کو کرنا تھا وہ اگر حضرت عثمان شہید رضی اللہ عنہ نے کر دیا تو ان پر طعن و اعتراض کیوں؟ ان کی تعریف کرنی چاہیئے!

اور ایک دو حضرات جو شیعوں کے ہاں اس سلوک سے مستثنیٰ بھی ہیں تو ان کا ایک دوسرا "جرم" ایسا تھا کہ اس کی وجہ سے بھی انکو عقوبت ملنی چاہ

www.Ahlehaq.com

چاہیئے تھی۔ التقیہ دینی ودین آبائی۔ کے پیش نظر جب خود جناب امیر رضی اللہ عنہ خاموش تھے۔ تو انہوں نے یہ جواب کیوں ترک کیا۔ جناب امیرؓ کی تقلید کیوں نہ کی ان کو بھی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی باتوں کو خاموشی سے گوارا کرنا چاہیئے تھا اور خاموش رہنا چاہیئے تھا۔
پھر ان دونوں کا "جرم بے وفائی" بھی ثابت ہوگیا، کہ ذاتی معاملات کی وجہ سے تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر نکتہ چینی کی، ان کے مقابلہ پر اٹھ کھڑے ہوئے، اور ان کے ہاتھوں اہانت وغیرہ برداشت کی، مگر عہد ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ میں جبکہ نص امامت کے اظہار کا اصل موقعہ اور وقت تھا، خاموش رہے، جس کی وجہ سے جناب امیر رضی اللہ عنہ کا واجبی حق بھی تلف ہوا۔ اور دین پیمبر میں بھی خلل پڑا! ایسے "بے وفاؤں" کو اچھا ہوا سزا ملی۔ اس کی وجہ سے جناب عثمانؓ پر طعن کیوں؟ انہوں نے تو عین شیعہ فلسفہ کے مطابق ان پر گرفت فرمائی۔ کہ تقیہ کیوں چھوڑا۔ علی الاعلان بات کہنے کے مرتکب کیوں ہوئے۔
جواب (۳) خلافت وامامت کا معاملہ اتنا اہم اور مہتم بالشان ہے کہ اسکی حفاظت وبقا کے لیے، اور اس میں برہمی اور انتشار پیدا کرنے والوں، یا اس کی حرمت پر اثر اندازی کے وقت کسی قسم کا لحاظ ومروت کرنا سستی وغفلت برتنا مناسب اور زیبا نہیں، خود جناب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حرم رسول ام المؤمنین رضی اللہ عنہا کا لحاظ و پاس نہیں فرمایا،
جناب طلحہ وزبیر رضی اللہ عنہما جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے حواری، قدیم الاسلام، رشتہ دار تھے دونوں کو قتل کیا۔ اور محض خلافت کی حفاظت کی خاطر، ورنہ یہ بات تو جناب امیر رضی اللہ عنہ بخوبی اور بوثوق جانتے تھے کہ یہ حضرات اور ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہم آپؓ کی جان کے خواہاں نہیں تھے۔ وہ تو صرف قاتلان عثمانؓ کا مطالبہ کرتے تھے۔ مگر جناب امیر رضی اللہ عنہ کے خیال مبارک میں، لشکر سے اس قدر فوج کا کٹ کر علیحدہ ہو جانا خلافت ومملکت میں خلل پیدا کرتا اور خلیفہ کا حکم ناقابل عمل ٹھہرتا تھا، اس لئے ان سے لڑائی لڑی۔ اور رشتہ داری، سسرال، زوجیت اور صحبت رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) سارے ہی علاقے نظر انداز فرما دیئے!
اور جب کوفہ والوں کو جناب ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے جناب امیر رضی اللہ عنہ کی رفاقت سے باز رکھا، تو آپ رضی اللہ عنہ نے خاطر خواہ ان کی سرزنش کی۔ اور مالک اشتر کے ذریعہ ان کا گھر جلوا یا گیا مال واسباب لوٹا گیا اور آپؓ نے اسے روا رکھا! یہ باتیں ہر دو فرقہ کی تواریخ میں یکساں طور پر موجود ہیں۔ تو گویا معلوم ہوا کہ امیر خلافت کے استحکام وحفاظت کے سلسلہ میں چھوٹی موٹی مصلحتیں تلف ہوتی ہوں تو کوئی مضائقہ نہیں۔ کیونکہ وجود خلافت اور استحکام خلافت سب سے مقدم اور نہایت اہم مصلحت ہے۔ تو اگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس کی حفاظت وصیانت کے لیے بعض اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو ڈرایا ہو یا اہانت کی ہو، تو وہ موجب طعن کیوں؟ جبکہ یہ ڈرانا یا اہانت قتل سے بہرحال کم ہی ہے۔
اور جنگ جمل کے بعد ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی جس قدر توہین وتذلیل ہوئی۔ تاریخ کے اوراق پر ثبت ہے، یہ جوابات تو وہ تھے جو شیعی فلسفہ ومذاق کے مطابق تھے۔ لیکن اہلسنت نے صحیح روایات کی روشنی میں اس اعتراض وطعن کا جو جواب دیا ہے وہ یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دیگر اصحاب کی موجودگی میں بھی اور علیحدگی میں بھی بار بار بتاکید فرمایا تھا کہ اللہ تعالیٰ تمکو کسی وقت خلافت کی خلعت سے نوازے گا۔ منافق اس شرف کو تم سے چھیننا چاہیں تو مزاحمت اور جھگڑنے کے بجائے صبر کرنا۔ چنانچہ اہل سنت کی صحاح میں یہ روایت موجود ہے۔ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رفقاء کی مجلس میں ایک روز فتنہ کا ذکر فرما رہے تھے کہ عنقریب واقع ہوگا۔ اس ذکر سے رفقاء کو سراسیمہ دیکھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف اشارہ کرکے فرمایا کہ اس وقت یہ راہ راست پر ہوں گے۔ صحابہ کی ایک جماعت نے اسے روایت کیا ہے! پھر ایک مرتبہ اسی فتنہ کے ذکر کے دوران فرمایا کہ اس روز بیٹھا ہوا شخص کھڑے ہونے والے سے کھڑا ہونے والا چلنے والے اور چلنے والا دوڑنے والے سے بہتر ہوگا۔

مرض وصال میں ایک روز فرمایا لیت عندی رجلا اکلمہ ۔ کاش اسوقت میرے پاس وہ شخص ہوتا جس سے میں گفتگو کرنا چاہتا ہوں، اہل بیت کرام نے، حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کا نام لے کر دریافت کیا کہ ان کو بلائیں تو آپ نے انکار فرمایا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لئے بھی انکار فرمایا۔
جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا نام لیا گیا تو آپ نے فرمایا ہاں! جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ آئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان سے بہت دیر تک سرگوشی میں کچھ گفتگو فرماتے رہے، مرض کی وجہ سے آپ لیٹے ہوئے تھے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے سر کو سینہ مبارک پر رکھے ہوئے وصیت فرمارہے تھے۔ اور ان کے چہرہ کا رنگ متغیر ہو رہا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے اسوقت بے اختیار باواز بلند اللہ المستعان، اللہ المستعان۔ کے الفاظ ادا ہو رہے تھے۔ یہ روایت ازواج مطہرات اور اسوقت موجود دیگر خدام خانہ رضوان اللہ علیہم نے بیان فرمائی۔
ایک مرتبہ جناب ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو حکم فرمایا کہ عثمان رضی اللہ عنہ کو جنت کی بشارت دو، اور کہو کہ تم پر عام بلوہ ہوگا۔
خلاصہ کلام یہ کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس قطعی نصوص واحکام اور تاکیدی وصایا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے موجود تھیں۔ اور آپ ان وصایا پر ثابت قدم رہے! جب آپ نے دیکھا کہ منافقین کے ساتھ کچھ اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم بھی لاعلمی اور ناواقفی یا کسی غلط فہمی کے سبب منافقین کے ہم آہنگ وہم آواز ہو رہے ہیں، تو آپ نے یہ چاہا کہ یہ سچے مسلمان منافقوں کا ساتھ نہ دیں اس سلسلہ میں اپنی صوابدید کے مطابق ان حضرات کو مناسب تنبیہہ بھی فرمائی، مقصد ان کی خیر خواہی کے ساتھ ساتھ یہ بھی تھا کہ ان حضرات کی آڑ لے کر یہ منافق واوباش زور نہ پکڑیں۔

اہل سنت کے نزدیک عصمت خاصۂ انبیاء ہے۔ یہ حضرات بھی صحابہ کو معصوم نہیں جانتے تھے یہی وجہ ہے کہ عہد عثمان سے قطع نظر عہد صدیقی وفاروقی رضی اللہ عنہم حتیٰ کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں بعض صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم پر حدود جاری ہوئیں۔ بلکہ خود رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت مسطح بدری اور حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہما کو حد قذف میں پکڑا۔ کعب بن مالک مرارہ ابن ربیع اور ہلال بن امیہ رضی اللہ عنہم جن میں سے دو حضرات شریک بدر بھی تھے غزوۂ تبوک میں شریک نہ ہونے کے سبب بارگاہ نبوت سے نکال دئے گئے۔ اور سارے مسلمانوں کے مقاطعہ کا نشانہ بنے، ماعز اسلمی رضی اللہ عنہ کو رجم کیا گیا۔ کئی حضرات پر شراب نوشی کی حد جاری ہوئی۔ ان کے علاوہ بھی سزائیں ہوئیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بھی حسب موقعہ وحال بعض حضرات کو تنبیہہ فرمائی۔ مقصد صرف یہ تھا کہ منافق اور اوباش لوگوں کا ساتھ دیکر اپنا حشر ان کے ساتھ نہ کرائیں، اور جو دنیا وآخرت میں ان کے لئے عذاب ورو سیاہی مقدر ہو چکی ہے، اس سے بچ جائیں، اور بحمد اللہ ایسا ہی ہوگا کہ قتل عثمان میں کسی صحابی نے حصہ نہیں لیا منافقوں اور اوباشوں کے ہی دست ودامن خون عثمان سے تر ہوئے۔
اور چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے امر مقدر کا علم ہو چکا تھا اس لئے نہ ان بدبختوں کے حملہ کا بچاؤ کیا نہ کسی کو حمایت میں بلایا۔ بلکہ صبر ورضا کے ساتھ جام شہادت نوش فرمالیا۔

جن حضرات کو آپ نے تنبیہہ فرمائی یا گوشمالی کی وہ چونکہ عواقب ونتائج سے آپ کی طرح آگاہ نہ تھے اس لئے بعد میں ان سے معذرت بھی چاہی، اگر غور کیا جائے اور انصاف سے کام کیا جائے۔ تو اہل سنت کا یہ موقف درست نظر آتا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا حال ہو بہو جناب امیر رضی اللہ عنہ سے پورے طور پر ملتا ہے۔ کہ ان کو بھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے وصیت فرمائی تھی۔

یا علیُّ لا تجتمع الامۃ علیک بعدی وانک تقاتل الناکثین والقاسطین والمارقین۔

اے علی میرے بعد تمہاری خلافت پر ساری امت متفق ہوگی۔ تمہیں عہد شکنوں، بے انصافوں اور بددینوں سے، لڑائیاں لڑنی پڑینگی۔

چنانچہ جب آپ مسند خلافت پر متمکن ہوئے، تو حتی المقدور فتنہ کے فرو کرنے اور مخالفوں سے قتل وقتال اور جنگ وجدال کے ذریعہ اپنے سے دور کرنے کی کوشش فرمائی نہ اس میں کوئی تامل فرمایا، اور نہ کسی کے منصب ومقام کا کوئی لحاظ کیا نہ کسی مروت اور رعایت سے کام لیا،

اسی لئے آپ کی ان کاروائیوں کی ندمیں ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بھی آئیں، اور طلحہ و زبیر یعلی بن منبہ اور ابوموسی اشعری رضی اللہ عنہم یا دوسرے صحابہ کرام بھی آگئے! مگر مقدر نے یاوری نہیں کی۔ اس لئے امور خلافت حسب منشا انجام نہ پاسکے۔

ان اجمالی گذارشات کو ذہن نشین کر لینے کے بعد اب آپ سلسلہ بسلسلہ تفصیلی جوابات ملاحظہ فرمائیں۔

طعن و اعتراض میں قصص واقعات جس انداز میں ذکر ہوئے، وہ حسب دستور، دجل و فریب کے سوا کچھ نہیں۔ یہ ساری باتیں شیعوں کی من گھڑت اور بناوٹی ہیں، معتبر تاریخوں کا دامن ان کے ذکر سے خالی ہے۔ ان کتابوں میں واقعات کی جو اصل صورت حال ہے اس کے مطالعہ ہی سے اعتراضات کی قلعی کھل جاتی اور جواب خود بخود سامنے آجاتا ہے۔

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کا قصہ بحوالہ ابن سیرین، اور دیگر ثقہ تابعین کی روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ آپ مزاجاً بہت متشدد تھے۔ زبان بھی بے قابو تھی۔ خود سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں آپ کے خدام سے الجھ پڑتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے گتھم گتھا ہو گئے، اور ماں باپ تک پہنچ گئے! حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس زبان درازی پر ڈانٹا اور فرمایا اَعَیَّرْتَہٗ بِاُمِّہٖ اِنَّکَ اِمْرُؤٌ فِیْکَ جَاہِلِیَّۃٌ۔ (کیا تم اسے ماں کے حوالہ سے عار دلاتے ہو، تم ایسے شخص ہو جس میں جاہلیت کا اثر ہے)

عہد عثمانی میں لشکر شام میں جب انہیں قیام کا اتفاق ہوا تو فتوحات میں غنائم کی کثرت کے سبب بے شمار دولت ہاتھ آنے کے باعث مہاجر و انصار لکھ پتی ہو گئے، تو جناب ابوذر رضی اللہ عنہ نے سب پر اعتراضات شروع کر دیئے، پہلا نشانہ جناب امیر معاویہ رضی اللہ عنہ بنے، اور حوالہ کے لئے آیت وَالَّذِیْنَ یَکْنِزُوْنَ الذَّھَبَ الخ سنانے لگے! اور اموال کو خرچ کرنا فرض بتانے لگے! جناب معاویہ اور دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ہر چند سمجھایا کہ یہاں خرچ کرنے سے مراد بقدر زکوٰۃ ہے۔ سارا مال خرچ کرنا مراد نہیں ہے۔ اور اسکی دلیل میراث و فرائض کی آیت ہے۔ کیونکہ اگر سارے کے سارے مال کا خرچ کرنا فرض و واجب ہوگا تو متروکہ مال کی تقسیم کے کوئی معنی نہ رہیں گے۔ مگر بات ان کی سمجھ میں نہ آئی وہ اپنے خیال پر اڑے رہے۔ اور ہر ایک کے ساتھ سختی اور درشتی سے پیش آنے لگے!

شامی لشکر نے جمہور امت کی روش سے ہٹ کر ان کی روش پر انگشت نمائی شروع کر دی اب وہ جدھر جاتے لوگ گروہ در گروہ ان کے گرد اکٹھا ہو جاتے اور ان کو چڑاتے اور غصہ دلانے کے لئے جان بوجھ کر زور زور سے یہ آیت پڑھتے۔ انہوں نے گویا یہ چڑ بنالی۔ جب بات مذاق اور ہنسی ٹھٹے اور طعن و طنز تک پہنچ گئی تو جناب معاویہ رضی اللہ عنہ نے سارا ماجرہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو لکھ بھیجا۔ آپ نے حکم بھیجا کہ ان کو مدینہ روانہ کر دیں۔ چنانچہ ان کی شایان شان عزت و احترام کے ساتھ ان کو مدینہ منورہ روانہ کر دیا گیا۔ یہ شیعوں کی اپنی اپج ہے جو وہ کہتے ہیں کہ تیز رو سواری پر بھیجے گئے حقیقت سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

ان کے مدینہ منورہ پہنچنے سے پہلے ہی اہل مدینہ شام میں پیش آنے والے واقعات و قصہ سن چکے تھے یہاں کے خوش طبع اور رنگین مزاج لوگ بھی ان کے پیچھے لگ گئے۔ وہ بھی دل لگی اور مزاح کے لئے ان سے آیت کے معنے پوچھنے لگے۔ اسی دوران حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ جو عشرہ مبشرہ میں سے تھے فوت ہو گئے۔ آپ نے بے شمار دولت ترکہ میں چھوڑی، آدائیگی حقوق وصایا وغیرہ کے تقسیم ہوا تو آٹھواں حصہ چار عورتوں کو پہنچا۔ ان میں سے ایک بیوی کو مرض وفات میں چونکہ طلاق دیدی تھی اس لئے اس کو پورے حصہ کے بجائے ایک مقررہ رقم دینے پر صلح کر لی تھی اور وہ اسی ہزار درہم سے زیادہ تھی! (اسی سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ صحیح ورثا کے حصہ میں کتنا مال خطیر آیا ہوگا) دل لگی بازوں کو شوشہ ہاتھ آگیا۔ جناب ابوذر رضی اللہ عنہ کو چڑانے کے لئے جناب عبدالرحمن رضی اللہ عنہ کی مال داری کا قصہ سنایا۔ اس معاملہ میں ان کا ایک مزاج بنا ہوا تھا۔ لہذا حضرت عبدالرحمن رضی اللہ عنہ کے دوزخی ہونے کا فتوی لگا دیا۔ اور جوش میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت صریحہ کو بھی بھلا بیٹھے۔ یہ معاملہ ایک نص صریح کے چونکہ خلاف تھا جناب کعب احبار رضی اللہ عنہ، جو اہل کتاب کے علما

میں سے تھے اور عہد فاروقی میں مشرف باسلام ہو گئے تھے۔ جناب ابوذر رضی اللہ عنہ سے کہنے لگے کہ جناب یہ بات بالاجماع ثابت ہے کہ ملت حنیفیہ آسان ترین، کشادہ ترین مذہب ہے۔ اور سارے مال کا خرچ کرنا تو یہودی مذہب میں بھی واجب نہیں جو بہت تنگ اور سخت مذہب ہے۔ تو مذہب اسلام میں سارا مال خرچ کرنا کس طرح واجب ہو سکتا ہے، بات ذرا سوچ سمجھ کر کیا کیجئے۔ آپ حسب عادت غصہ میں آ گئے اور فرمانے لگے ارے یہودی تجھے ان مسائل سے کیا واسطہ! اور لاٹھی اٹھا کر انہیں مارنے دوڑے۔ وہ وہاں سے بھاگے اور سیدھے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی نشستگاہ میں آ گئے۔ اور آپ کی پیٹھ پیچھے چھپ گئے۔ جناب ابوذر رضی اللہ عنہ غصہ میں بھرے وہاں پہنچے اور آؤ دیکھا نہ تاؤ اور لاٹھی کا وار کعب احبار پر کر دیا۔ کہتے ہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بھی اس کی زد میں آئے اور آپ کے پاؤں پر لاٹھی سے چوٹ لگی۔ ان کی بدحواسی اور بیخودی دیکھ کر ہی حضرت شہید رضی اللہ عنہ نے خدام کو حکم دیا کہ انہیں پکڑو کہیں غصہ میں ایسی جگہ چوٹ نہ مار بیٹھیں کہ موت کا سبب بن جائے۔ چنانچہ خدام نے انہیں پکڑا اور گھر چھوڑ آئے۔ جب جوش ختم اور غصہ دور ہوا۔ تو آپ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور کہنے لگے، میں اپنے اس خیال پر اتنا پختہ ہوں اور یہی میرا مذہب ہے۔ کہ کل مال خرچ کرنے کو واجب سمجھتا ہوں۔ مگر پہلے شامی اور اب اہل مدینہ نے مجھے نشانہ تضحیک بنا لیا ہے۔ وہ مجھے چھیڑنے اور چڑانے کے لئے میرے اردگرد اکٹھا ہو جاتے ہیں، ہنسی مذاق اڑاتے ہیں اور مجھے پاگل کر دیتے ہیں، کہ ایسے واقعات کی نوبت آ جاتی ہے آپ مجھے مشورہ دیجئے میں کیا کروں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ ہاں اب بات تو ایسے ہی ہو گئی ہے۔ کہ لوگ پاگ آپ سے مزا لینے کے لئے ایسی حرکتیں کرنے لگے ہیں۔ آپ اگر ان مجمعوں سے کنارہ کشی گوارہ کر سکیں تو بہتر صورت یہی ہے۔ اس کے لئے مناسب یہ ہے کہ مضافات مدینہ میں سے کسی مقام پر سکونت اختیار کر لیں۔ چنانچہ مدینہ منورہ سے تین منزل کی دوری پر واقع مقام ربذہ میں آپ تشریف لے گئے۔ اور وہیں رس بس گئے۔ تھوڑے وقفہ سے مسجد نبوی کی زیارت اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے ملاقات کے لئے آتے جاتے رہے!

ان حالات سے متعلق حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی کوئی شکایت آپ سے منقول نہیں۔ جو بات ملتی ہے وہ یہی کہ آپ جناب شہید رضی اللہ عنہ کے انتہائی مطیع اور فرمانبردار تھے۔ اور اسکی دلیل وہ قصہ ہے جو تمام مورخین نے بیان کیا ہے کہ جب آپؓ ربذہ گئے اسوقت وہاں کا عامل حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا کوئی غلام تھا۔ جو مسجد میں جماعت پنجگانہ کی امامت بھی کرتا تھا۔ آپ کے پہنچنے پر جب نماز کا وقت آیا۔ تو اس نے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے کہا کہ آپ مجھ سے افضل اور بہتر ہیں اس لئے امامت آپ ہی فرمائیں۔ مگر آپ نے فرمایا تم عثمان (رضی اللہ عنہ) کے نائب ہو اور عثمان (رضی اللہ عنہ) مجھ سے افضل ہیں، اور نائب بھی اصل ہی کے حکم میں ہے اس لئے ضروری اور لازم ہے کہ امام تم ہی بنو، چنانچہ اس غلام نے امامت کی اور آپ نے اس کی اقتداء میں نماز ادا فرمائی۔ تو یہ ہے اصل قصہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کا۔ مگر اس فرقہ کا وطیرہ ہی بغض و عناد کا ہے۔ اس لئے قصوں میں حسب مطلب کانٹ چھانٹ اس کی عادت ہے۔ اور ایک قصہ سے دوسرے واقعہ کی پیوندکاری اس کا طریقہ۔ اور نتیجۃً خیالی تصویر اور وہمی بت تراش کر اسی کو معبود بنا لیتے ہیں۔

اور جناب عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کا قصہ بھی محض افتراء اور بہتان ہے، نہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے ان کی شکایت لکھی اور نہ ہی حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے ان کو مدینہ منورہ بلایا۔ کسی تاریخ سے اس کا پتہ نہیں چلتا۔ برخلاف اس کے معتبر تواریخ میں یوں مذکور ہے کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے جب قبرص پر لشکر کشی کی تو جناب عبادہ رضی اللہ عنہ بھی شریک لشکر تھے۔ اس لئے کہ اس جہاد کے فضائل اور اس میں شریک مجاہدین کی مغفرت کی شہادت خود فخر موجودات صلی اللہ علیہ وسلم نیز اپنی بیوی ام حرام بنت ملحان۔ رضی اللہ عنہا سے سن چکے تھے۔ جزیرہ کی فتح کے بعد جو مال غنیمت حاصل ہوا اس میں سے خمس علیحدہ کر کے دارالخلافہ روانہ کر دیا اور باقی مال مسلمانوں میں تقسیم کرنے کے لئے خود جناب معاویہ رضی اللہ عنہ بیٹھے۔ دوسری طرف چند صحابہ کرام جن میں جناب عبادہ، شداد بن اوس فہری،

ابو درداء، واثلہ بن اسقع، ابو امامہ باہلی اور عبداللہ بن بسر مازنی۔ رضی اللہ عنہم تھے۔ الگ گوشہ میں بیٹھے یہ دیکھ رہے تھے کہ تقسیم موافق سنت ہوتی ہے۔ یا خلاف سنت! اسی دوران دو فوجی، دو گدھے لئے جناب عبادہؓ کے سامنے سے گذرے تو آپ نے پوچھا تم یہ گدھے کہاں لئے جا رہے ہو؟ اور یہ کس کام کے لئے ہیں، لشکریوں نے بتایا کہ جناب امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے عنایت فرمائے ہیں تاکہ ان پر سواری کر کے سفر حج پر جائیں۔ اس پر جناب عبادہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یہ نہ تمہارے لئے حلال ہیں اور نہ معاویہؓ کی یہ بخشش جائز ہے۔ یہ سن کر لشکری واپس امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس آئے، گدھے واپس کر کے کہنے لگے کہ جناب عبادہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہمارے لئے ان کا لینا جائز نہیں۔ اس لئے ہم ان کو کیسے لے اور ان پر حج کر سکتے ہیں! امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے جناب عبادہ رضی اللہ عنہ کو بلا کر مسئلہ کی صورت حال معلوم کی تو آپ نے کہا۔

سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول فی غزوۃ حنین والناس یکلمونہ فی الغنائم فاخذ وبرۃ من بعیر وقال مالی مما افاء اللہ علیکم من ھذہ الغنائم مثل ھذہ الا الخمس والخمس مردود علیکم فاتق اللہ یا معاویۃ واقسم الغنائم علی وجھھا ولا تعط احدا منھا اکثر من حقہ۔

غزوہ حنین کے موقعہ پر جب لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے غنائم کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اونٹ کا ایک بال ہاتھ میں لیکر فرمایا کہ اس مال غنیمت میں میرے لئے خمس سے ایک بال بھی نہیں ہے۔ اور وہ خمس بھی تم مسلمانوں کے ہی صرف میں آتا ہے! تو اے معاویہ! اللہ سے ڈرو اور مال غنیمت اس طرح بانٹو کہ کسی کو اس کے حق سے زیادہ نہ دو!

اس پر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے ان سے کہا یہ مال غنیمت سنبھالو اور اپنی صوابدید پر اسے تقسیم کردو! اور مجھے اس بار گراں سے ہلکا کردو، میں تمہارا ممنون احسان ہوں گا؟ چنانچہ جناب عبادہ رضی اللہ عنہ داروغہ تقسیم بنے اور جناب ابو امامہ اور ابو درداء رضی اللہ عنہما دونوں آپ کے معاون و شریک کار بنے۔ اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت تک یہ نظم باقی و جاری رہا۔ جناب عبادہ رضی اللہ عنہ کی وفات شام میں ہوئی۔ بیت المقدس میں مدفون ہوئے۔ نہ وہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے جدا ہوئے اور نہ مدینہ منورہ تشریف لائے! لہٰذا یہ قصہ ہی جھوٹ ہے۔

یہی حال حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی ناخوشی کے قصہ کا ہے کہ یہ بھی افتراء اور جھوٹ ہے۔ کتب صحیحہ اس کے بیان سے خالی ہیں۔ صحیح واقعہ اسقدر ہے کہ جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے علم میں یہ بات آئی قرارت قرآن میں اختلاف کے سبب یہ نوبت آنے لگی ہے کہ لوگ اختلاف قرأت کو بہانہ بنا کر غیر منزل الفاظ بھی پڑھنے لگے ہیں۔ تو آپ نے حضرت حذیفہ بن یمان اور دیگر جلیل القدر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کے مشورہ سے یہ انتظام فرمایا کہ تمام عرب و عجم ایک ہی مصحف پر متفق ہو جائیں اور باہم مختلف نہ ہوں۔ اس سلسلہ میں حضرت ابی بن کعب اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما کے پاس جو مصاحف تھے ان میں قرأت شاذہ کے علاوہ بعض ادعیہ قنوت اور بعض تفسیری عبارات بھی درج تھیں، جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تلاوت قرآن مجید کے وقت بیان معانی کے طور پر فرمائی تھیں۔ ان مصاحف میں ان کی برقراری آئندہ چل کر فساد عظیم کا پیش خیمہ بن سکتی تھی۔ اس لئے کہ یہ نفس قرآن میں اختلاف ہوتا۔ جو رفتہ رفتہ بیش از بیش خرابیوں اور برائیوں کا سبب بنتا ہے ان حضرات نے اپنے مصاحف میں ان کو برقرار رکھنے پر اصرار کیا۔ مگر مصحف لینے میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے غلاموں نے جبر سے کام لیا اور مار پیٹ کی بھی نوبت آئی۔ مگر اس کی اجازت، یا حکم حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ہرگز نہیں دیا تھا۔ اور جناب ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے اپنا مصحف بخوشی بلا جبر دیدیا تھا۔ اس لئے ان کے ساتھ نہ کوئی بات ہوئی، نہ باہم کدورت کی نوبت آئی! اس کے باوجود حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ہر ممکن و مناسب طریقہ سے آپ کو راضی کرنا چاہا۔ اور عذر معذرت بھی پیش کی۔ ایسی صورت میں قرین انصاف یہ ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر کوئی الزام نہیں آتا۔

www.Ahlehaq.com

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیمار ہوئے تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بنفس نفیس ان کے مکان پر گئے۔ ان سے معافی چاہی۔ ان کا وظیفہ ساتھ لے گئے تھے وہ دینا چاہا۔ تو جناب ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جب مجھے ضرورت تھی اس وقت تو بھجوایا نہیں اب سفر آخرت پر جا رہا ہوں تو آپ دے رہے ہیں میں نہیں لوں گا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا بچیوں کے کام آئے گا رکھ لیجئے۔ تو فرمایا میں نے لڑکیوں سے کہدیا ہے کہ ہر رات سورۂ واقعہ کا ورد کیا کریں کیونکہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سن چکا ہوں کہ جو کوئی ہر رات سورہ واقعہ پڑھے گا فاقہ میں مبتلا نہ ہوگا

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ان کے پاس سے اٹھ کر ام المؤمنین ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں گئے اور ان سے درخواست کی کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کو مجھ سے راضی کرا دیجئے چنانچہ آپ رضی اللہ عنہا نے متعدد مرتبہ کہلا کر بھیجا۔ اس کے بعد پھر ایک مرتبہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ جناب ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے پاس گئے اور کہنے لگے اے عبداللہ تم بھی اپنے بھائیوں سے یوسف علیہ السلام کی طرح کیوں نہیں کہدیتے لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ وَهُوَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِينَ۔ (آج تم پر کوئی ملامت نہیں۔ اللہ تعالیٰ تم کو معاف فرمائے وہ ارحم الراحمین ہے) یہ سنکر جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ چپ رہے کوئی جواب نہیں دیا۔

لہٰذا اس معاملہ میں ان کو راضی کرنے اور اپنے قصور کی معافی چاہنے میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ اس سعی و کوشش کے بعد وہ بری الذمہ ہوگئے! اب ان پر الزام بنائے عناد تو ہو سکتا ہے از روئے دیانت و انصاف نہیں۔ اور پھر جناب ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی یہ شکر رنجی، دشمنوں کی سی نہیں، بھائیوں اور عزیزوں کی طرح کی تھی جو بعض اوقات معمولی بات پر بھی ہو جاتی ہے۔ اس شکر رنجی کی بنا پر نہ وہ آپ کی خلافت سے منکر ہوئے۔ نہ یہ عقیدہ رکھا کہ وہ اس کی لیاقت نہیں رکھتے تھے۔ چنانچہ سلمہ بن شقیق جو آپ کے خاص دوستوں میں سے تھے کہتے ہیں۔

دَخَلْتُ عَلَى ابْنِ مَسْعُودٍ فِي مَرَضِهِ الَّذِي تُوُفِّيَ فِيهِ وَعِنْدَهُ قَوْمٌ يَذْكُرُونَ عُثْمَانَ فَقَالَ لَهُمْ مَهْلًا فَإِنَّكُمْ إِنْ تَقْتُلُوهُ لَا تُصِيبُونَ مِثْلَهُ۔

میں ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے پاس مرض وفات میں ایک دن گیا تو آپ کے پاس کچھ لوگ بیٹھے ہوئے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے متعلق باتیں کر رہے تھے۔ اس وقت آپ نے کہا، بس چپ کر جاؤ۔ اگر کبھی تم نے ان کو قتل کر دیا تو ان جیسا کبھی نہ پاؤ گے!

غرض سیاست و انتظام ملکی میں اس قسم کے بے شمار چھوٹے بڑے واقعات پیش آتے ہیں اگر ان کو مطاعن میں شمار کریں تو شیعوں کا تو قافیہ تنگ ہو جائے گا۔ مثلاً وہ جناب علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے متعلق کیا کہیں گے کہ انہوں نے اپنے حقیقی بھائی حضرت عقیل بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو بالکل چھوڑ دیا۔ ان کا وظیفہ اتنا تنگ کر دیا کہ مجبور ہو کر جنگ صفین کے بعد وہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے جا ملے۔ اور جناب ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ جو جلیل القدر صحابی، آپ کے خاص ساتھی تھے۔ ان کو معزول کیا۔ ان کا وظیفہ بند کیا اور ان سے تعلقات توڑ لئے۔ حتیٰ کہ وہ آپ سے الگ ہو کر امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے طرفدار ہو گئے! جناب عقیل اور حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہما۔ مراتب و عزت میں حضرت ابوذر اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما سے کم تو نہیں۔ اگر ان کی وجہ سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ مستحق طعن ہیں تو یہ نادان یہ کیوں نہیں سوچتے کہ جناب امیر داماد رسول صلی اللہ علیہ وسلم بھی ان کے طعن کی زد میں آجاتے ہیں۔ کسی مسلمان کی تو یہ جرأت نہیں کہ عظیم المرتبت اصحاب کرام تو رہے اپنی جگہ کسی عام صحابی رسول صلے اللہ علیہ وسلم پر طعن کا خیال بھی دل میں لائے!

یہی حال حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کے قصہ کا ہے کہ اس کی بھی کوئی اصل و بنیاد نہیں۔ اگر حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ آپ کی تولیت اور بیعت چارگی پر نادم تھے تو آخر ان کو صاف اور بے دلوگ انداز میں کہنے سے کیا بات مانع تھی!

بات صرف اتنی صحیح ہے کہ ان دونوں حضرات میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے باہم اخوت کا رشتہ و تعلق جوڑا تھا۔ اس تعلق کی بنا پر جناب عبدالرحمن رضی اللہ عنہ، آپ سے خوش طبعی اور دل لگی بہت کرتے تھے! (اور یہ سب ہی جانتے ہیں کہ حضرت عثمانؓ بہت باحیا اور بامروت تھے۔ حیادار آدمی عموماً خوش طبعی سے پریشان اور دل تنگ ہو ہی جاتا ہے)۔ ایک روز ان کی خوش طبعی اور دل لگی سے اس قدر پریشان ہوئے کہ یہ الفاظ آپ نے فرمائے۔ اِنِّیْ اَخَافُ یَا ابْنَ عَوْفٍ اَنْ تَبْسُطَ مِنْ دَمِیْ (اے ابن عوف مجھے ڈر ہے کہ تو (اپنی دل لگی سے) مجھے مار نہ ڈالے)۔ اور دو ساتھیوں اور ہم صحبتوں میں اس قسم کے واقعات اکثر پیش آتے ہیں (مگر ان کی وجہ سے دل میں گرہ نہیں پڑتی) دل صاف رہتے ہیں!

جناب علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے بھی لوگوں کے ساتھ خوش طبعی کے واقعات ملتے ہیں۔ چنانچہ دارقطنی نے زیاد بن عبداللہ نخعی سے ایک روایت بیان کی ہے کہ "ہم مسجد اعظم میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی معیت بیٹھے ہوئے تھے ان دنوں کوفہ کے مکانات سفالپوش تھے کہ اتنے میں مؤذن نے آکر کہا کہ یا امیر المؤمنین (رضی اللہ عنہ) عصر کی نماز کا وقت ہوگیا، آپ نے فرمایا بیٹھ جاؤ۔ وہ بیٹھ گیا۔ پھر تھوڑی دیر بعد آیا اور اسی طرح کہا، اس پر آپ نے (ازراہ دل لگی) فرمایا۔ یہ کتا ہم کو سنت سکھاتا ہے"

دارقطنیؒ نے اسی زیاد مذکور سے ایک اور روایت بیان کی ہے۔ کہ ایک شخص جناب مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی خدمت میں آیا اور وضو کے بارے میں آپ سے پوچھا، (کہ دائیں ہاتھ سے شروع کرنا چاہیئے یا بائیں سے)، آپؓ نے فرمایا دائیں سے شروع کرو یا بائیں سے! پھر آپ نے منہ سے گوز کی آواز نکال (گویا وضو ٹوٹنے کا اظہار فرمایا) پھر پانی منگایا اور وضو بائیں ہاتھ سے شروع فرمایا"

اور حضرت عمار رضی اللہ عنہ کا قصہ جس انداز میں بیان کیا ہے وہ بھی صحیح اہل سنت کی روایات کے مطابق یہ قصہ یوں ہے کہ ایک دن حضرت سعد بن ابی وقاص اور جناب عمار رضی اللہ عنہما مسجد میں آئے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو اطلاع بھجوائی کہ ہم مسجد میں بیٹھے ہیں آپ بھی مسجد میں آجائیں، آپ کی طرف سے صادر شدہ بعض امور جو عوام کی شکایت کا سبب بنے ہوئے ہیں۔ ان کے متعلق آپ سے گفتگو اور مشورہ کرنا ہے! آپؓ نے اپنے غلام کے ہاتھ کہلوایا، اسوقت تو مجھے بہت سے کام درپیش ہیں، اس وقت تو آپ لوگ جائیں اور فلاں روز ملاقات کا وعدہ ہے۔ جو باتیں ہوں میں سنوں گا۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ تو یہ سنکر چلے گئے۔ مگر جناب عمار رضی اللہ عنہ نے پھر کہلوایا کہ آپ کو آج ہی ابھی آکر بات کرنی چاہیئے۔ آپؓ نے پھر عذر کیا۔ مگر عمار رضی اللہ عنہ نے پھر تقاضا کیا مگر آپؓ نے عذر فرمایا۔ مگر عمارؓ مُصر رہے۔

اسوقت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے غلام نے ان سے ہاتھا پائی کی، مسجد سے گھسیٹ کر باہر نکال دیا اور کہنے لگے کہ شریعت میں اجازت کی حد تین مرتبہ ہے آپ حد شرعی سے بڑھ گئے لہذا آپ کو سزا دینا ضروری ہوا، جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو اس کی خبر ہوئی تو دوڑے ہوئے مسجد میں آئے، لوگوں کو اکٹھا کیا۔ عمار رضی اللہ عنہ کو بھی بلوایا اور قسم کھا کر کہا کہ غلام کی یہ حرکت نازیبا میرے ایماء و اجازت سے نہیں ہوئی۔ اس غلام کو ڈانٹا ڈپٹا۔ اور فرمایا۔ هٰذِهٖ يَدِيْ لِعَمَّارٍ فَلْيَقْتَصَّ مِنِّيْ اِنْ شَاءَ۔ (یہ میرا ہاتھ عمار کے سامنے ہے، وہ اگر چاہیں تو مجھ سے اپنا قصاص لے سکتے ہیں۔) اس پر جناب عمار رضی اللہ عنہ نے آپ کا ہاتھ چوما۔ اور آپ سے راضی و خوش ہوگئے!

اور اس کی واضح و قوی دلیل یہ ہے کہ محاصرہ کے ایام میں جناب عمار رضی اللہ عنہ ان لوگوں میں شامل تھے جو بلوائیوں کو سمجھا بوجھا کر، اور جناب عثمان رضی اللہ عنہ کے حقوق کو یاد دلاکر محاصرے سے روک رہے تھے۔ اور جس دن آپؓ کا پانی بند کیا گیا۔ تو عمار رضی اللہ عنہ باہر آئے اور بلند آواز سے فرمایا سبحان اللّٰہ قَدِ اشْتَرٰی بِئْرَ رُوْمَةَ وَ تَمْنَعُوْنَهٗ مَاۗءَهَا۔ (سبحان اللہ جس نے بیر رومہ خریدا تم اس کا پانی بند کرتے ہو) پھر دوڑتے ہوئے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچے اور کہا کہ آج بلوائیوں نے عثمان (رضی اللہ عنہ) کا پانی بند کر دیا ہے۔ میں نے سمجھایا مگر وہ مانتے نہیں کوئی ترکیب کرنی چاہیئے کہ ان تک پانی پہنچے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ بلوائیوں سے کہنا سننا بے کار ہے وہ تو مانیں گے نہیں، کوئی خفیہ تدبیر کرنی چاہیئے: آخر سعی و کوشش کرکے اونٹ کی ایک پکھال پانی بھر کر پہنچائی گئی۔

لہٰذا جناب عمار رضی اللہ عنہ کے حوالہ سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر طعن کرنا تو اس مثل کا مصداق بنتا ہے کہ " مدعی و مدعی علیہ راضی ہو گئے مگر منصف راضی نہیں ہوا "!

اور کعب بن عبدہ نہدی رضی اللہ عنہ کا قصہ پورا بیان نہیں کیا۔ آدھا حصہ چھوڑ دیا پورا قصہ یوں ہے کہ

جب جناب کعب رضی اللہ عنہ کے پیٹنے کی اطلاع آپ کو ہوئی تو آپ نے جناب سعید بن عاص رضی اللہ عنہ کو ڈانٹ کر خط لکھا اور کہا کہ کعبؓ کو عزت و احترام کے ساتھ میرے پاس بھیجو! جب وہ آپ کے پاس پہنچے، تو آپ نے کعبؓ سے فرمایا تم نے مجھے بہت سخت خط لکھا۔ یہ نہ مشورہ کا طریقہ ہے اور نہ بھائیوں کو نصیحت کرنے کا اصول۔ نصیحت تو بڑے نرم اور دل نشیں طریق پر کرنی چاہیئے! نہ کہ ڈانٹ ڈپٹ ہو، خصوصاً خلفا، امراء کے معاملہ میں تو رفق و نرمی ہی لازم ہے۔ فرعون باوجودیکہ سلسلہ شقی و بدبخت تھا مگر اس کے معاملہ میں بھی اللہ تعالیٰ نے اپنے اولوالعزم پیغمبر کو نرم روی کی تعلیم دی۔ فقولا لہ قولا لینا۔ (تم دونوں اس سے نرمی و رفق سے بات کرنا) میں نے تمہارے مارنے پیٹنے کا حکم نہیں دیا تھا، میرے حکم و اجازت کے بغیر تمہیں پیٹا گیا ہے۔ اس کے باوجود میں بدن سے قمیص اتارتا ہوں، یہ چابک موجود ہے تم اپنا بدلہ مجھ سے لے سکتے ہو! اس پر کعب رضی اللہ عنہ نے کہا کہ آپ کے اس منصفانہ جذبات و خیالات کو دیکھتے ہوئے میں اپنے معاملات درگذر کرتا ہوں، سخت الفاظ استعمال کرنے میں واقعی میں نے قصور کا ارتکاب کیا۔ اس کے بعد جناب کعب رضی اللہ عنہ آپ کے مصاحب خاص کی حیثیت سے آپ کے پاس رہے!

اب رہا اُشتر نخعی کا قصہ تو وہ اسی طرح صحیح جس طرح ان لوگوں نے بیان کیا ہے مگر وہ نہ صحابی تھا، نہ صحابی زادہ۔ وہ تو کوفہ کا ایک فتنہ پرور اوباش تھا۔ اس نے حاکم وقت کا لحاظ نہیں کیا، خلیفہ کے عامل کی اہانت کی، اور دوسروں کو بھی ورغلایا۔ اگر ایسے شورہ پشتوں سے حاکم و حکومت چشم پوشی کریں تو ایک فساد برپا ہو سکتا ہے۔ اُشتر نخعی تو وہی ہے جس نے فتنہ کی بنیاد ڈالی، اور بالآخر اس کی بھڑکائی ہوئی شورش نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو جام شہادت پلایا مگر یہ اس کے بعد بھی فتنہ انگیزی سے باز نہ آیا حضرت طلحہ و حضرت زبیر رضی اللہ عنہما کو اسی نے قتل کی دھمکیاں دے کر مدینہ چھوڑنے اور ام المؤمنین رضی اللہ عنہا کے دامن عافیت میں پناہ لینے پر مجبور کیا۔ اور بالآخر جناب امیر رضی اللہ عنہ سے جنگ تک نوبت آئی۔ اشتر نخعی کی یہ ساری فتنہ سامانیاں اور یہ حرکتیں جناب علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی خلافت میں بدنظمی کا موجب بنیں، یہ ہمیشہ جناب امیرؓ پر حکم چلاتا تھا۔ اس نے کبھی آپ کی ایسی اطاعت نہیں کی جیسی کسی خلیفہ و امام وقت کی کی جانی چاہیئے تھی! یہ باتیں نہ کوئی سربستہ راز ہیں نہ من گھڑت، تاریخ کے اوراق میں محفوظ اور زبان زد خلائق ہیں۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے تو اس کے اور اس کے دوستوں کی فرمائش پر حضرت ابوموسیٰ اشعری کو والی کوفہ اور جناب حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہما کو داروغہ خراج بھی مقرر فرمایا مگر فتنہ پرداز سرشت نے نچلا نہ بیٹھنے دیا۔ سازشوں میں لگا رہا۔ اہل مصر سے ساز باز کر کے آپ کو شہید کر دیا۔ بعض روایات میں تو یہ ہے کہ خود بھی قتل میں شریک تھا۔ قتل عثمانؓ کا واقعہ قیامت تک کے فتنہ کا سبب بنا، اور اس فتنہ کے دروازے کو کھولنے والوں میں ایک نام اُشتر نخعی کا بھی ہے! ایسا شخص تو قتل کر دیا جانا تو مناسب تھا۔ کہ امت سے فساد کی جڑ کٹ جاتی، اخراج اور ڈانٹ ڈپٹ تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی مروت و رحم دلی تھی کہ اسی تک نوبت پہنچ کر رہ گئی!

اعتراض (۶) چھٹا طعن اور اعتراض یہ کرتے ہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جناب عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے قصاص نہیں لیا۔ حالانکہ انہوں نے ہرمزان بادشاہ اہواز جو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں مسلمان ہو گیا تھا قتل کر دیا تھا۔ اور اس پر تہمت یہ لگائی کہ وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قتل میں شریک تھا۔ اور پھر یہ تہمت بھی پایۂ ثبوت کو نہ پہنچی اور آپؓ نے ابولولو کی ایک کم عمر لڑکی کو مار ڈالا۔ اور جفینہ نصرانی کو بھی اسی تہمت میں قتل کیا کہ وہ بھی قتل عمر فاروق رضی اللہ عنہ میں شریک تھا۔

سب صحابہ جمع ہو کر آپؓ کے پاس آئے اور کہا کہ ابن عمر رضی اللہ عنہ سے قصاص لیجئے! جناب امیر رضی اللہ عنہ نے بھی یہی مشورہ دیا۔ مگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بیت المال سے دیت تو دیدی مگر قصاص نہیں لیا۔ حالانکہ قصاص کا حکم کتاب اللہ سے ثابت ہے اور جو شخص کتاب اللہ کے حکم کا اجراء نہ کرے وہ امامت کے قابل نہیں "

جواب :- جمہور علماء کے مذہب کے مطابق ابو لولو کی لڑکی کا قصاص نہیں لیا جاسکتا تھا کیونکہ وہ مجوسیہ تھی۔ اور اسی وجہ سے حفینہ نصرانی کا قصاص بھی واجب نہیں ہوتا کیونکہ نصرانی تھا اور مسلمان و نصرانی (کافر) میں قصاص نہیں ہوتا اس لئے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا صریح ارشاد موجود ہے لایقتل مسلم بکافر۔ (مسلمان کافر کے قصاص میں قتل نہیں کیا جائے گا۔)

اب رہی بات ہرمزان کی کہ وہ بظاہر مسلمان تھا پھر بھی اس کا قصاص نہ لینے کی اہل سنت نے وجوہ بیان فرمائی ہیں۔

اول :- ہرمزان اہواز کا بادشاہ تھا۔ اہل فارس کے ان تختوں سے چونکہ ان کا ملک نکل چکا تھا جس کی وجہ سے ائمہ اسلام (اور عام مسلمانوں پر) یہ خار کھائے ہوئے تھا جنگ سے کامیابی کی امید کھو کر مکاری اور فریب سے کام لے کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے امان حاصل کی۔ اس کے فریب کا قصہ تو بڑا مشہور ہے، کہ جب وہ گرفتار ہو کر آیا تو تمام صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کا متفقہ فیصلہ تھا کہ اسے قتل کر دیا جائے۔ جب اسے خلیفہ ثانی رضی اللہ عنہ کے سامنے پیش کیا گیا۔ تو بڑی بے چینی کا اظہار کر کے پانی پلانے کی درخواست کی، جب پانی کا پیالہ اسے دیا گیا تو کہنے لگا کہ پانی پینے اور سیراب ہونے تک کی کچھ مہلت مل جائے تو پانی پی لوں ورنہ میں ادھر منہ پیالے سے لگاؤں اور اُدھر میری گردن ماری جائے تو کیا فائدہ جناب امیر رضی اللہ عنہ نے فرمایا، اطمینان رکھ جب تک تو پانی نہ پی لے تجھے امان ہے۔ کوئی تجھے نہ مارے گا۔ اس مکار نے تمام حضرات کے سامنے دو تین مرتبہ اس کا اقرار کرایا۔ اور پھر پانی زمین پر گرا دیا اور کہنے لگا، اب مجھے قتل کرو گے تو نقض امان لازم آئے گا۔ جناب امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ اس کی مکاری پر تعجب کے ساتھ فرمانے لگے کہ چالاک معلوم ہوتے ہو، بہتر ہے تم اسلام میں آجاؤ۔ اس نے کلمہ پڑھا۔ اور یوں مدینہ میں رہنے کی صورت نکال لی۔ عراق کا کچھ علاقہ بھی بطور جاگیر اسے مل گیا! یہاں رہ کر اسکو موقعہ ملا کہ وہ خلافت مآب رضی اللہ عنہ کے معمولات پر نظر رکھ سکے جب اس نے دیکھا کہ امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ کے پاس نہ حشم و خدم ہے، نہ چوکی، پہرہ، تو اسے بہت افسوس ہوا کہ ایسے بے احتیاط رئیسوں سے بچنا چھڑانا کون مشکل بات تھی، شاہان فارس ان حالات سے غافل ہی رہے اور ان کو قتل نہ کرا سکے، چنانچہ اس نے سازباز کی اور ابو لولو کو خفیہ طور پر بلا کر اسے حکم دیا اور شہادت امیر المؤمنین کا سانحہ پیش آیا۔ حفینہ اور دوسرے کافروں کو بھی اس نے گانٹھ لیا تھا۔ وہ سب اکٹھے ہو کر اس کام کے لئے تنہائی میں تدبیریں کرتے اور منصوبے سوچتے رہتے تھے،

چنانچہ حضرت عبید اللہ اور جناب عبدالرحمٰن بن ابی بکر رضی اللہ عنہم نے گواہ پیش کئے کہ ابو لولو، اور حفینہ، اس کے پاس آتے جاتے اور قتل امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ کے متعلق مشورے کرتے ہیں۔ ہرمزان نے ہی آلہ قتل (دو دھاری خنجر) تیار کرایا تھا۔ اور کہتا تھا کہ وہ کون جوانمرد ہوگا جو اپنی قوم اور اپنے دین کی حمایت میں اس شخص سے بدلے گا، جس نے نہ ہماری عزت ہی مٹی میں نہ ملائی دین و دولت کو بھی خاک میں ملا دیا۔ چنانچہ اسکی انگیخت پر ابو لولو نے اس کام کا بیڑا اٹھایا۔ یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی کہ امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ کے قتل کا حکم دینے والا ہرمزان ہی تھا۔ تب صحابہ کرام کے مجمع میں یہ طے پایا کہ آلۂ قتل لایا جائے اور جو صورت اس کی بیان کی گئی ہے اگر وہ اس کے مطابق نکلے تو شہادت پختہ اور ان تینوں کی شرکت قتل تسلیم کی جائے گی ورنہ نہیں۔ جب وہ خنجر پیش ہوا تو وہ ہو بہو وہی تھا جس کے متعلق گواہوں نے گواہی دی تھی۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مسلک کے مطابق (اور یہی امام شافعی، امام مالک اور دوسرے آئمہ رحمہم اللہ کا مذہب ہے) قتل کا حکم دینے والا خود واجب القتل ہوتا ہے۔ اس لئے آپ نے قصاص نہیں لیا۔ یہ حکم تو عام لوگوں کے بارے میں ہے۔ لیکن خلفاء اور امامان ریاست کے متعلق یہ حکم ہے کہ ان کو قتل کرنے کا حکم دینے والا اگر بدلہ اور قصاص میں نہ بھی مارا جائے تب بھی از روئے سیاست اور تدبیر مملکت! اس کا قتل از

بس ضروری ہے۔

دوم۔ اگر اس کا قصاص حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے لیا جاتا تو ایک بڑا ہنگامہ اور شورش برپا ہو جاتی۔ کیونکہ بنو تمیم، بنو عدی بنو امیہ اور بنو جمح سارے کے سارے قصاص میں قتل کئے جانے کے خلاف تھے، بلکہ بنو سہم تو خاص طور پر برہم اور آمادہ فساد تھے وہ تو کہتے تھے کہ اگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ عبیداللہ سے قصاص لیں گے تو ہم خانہ جنگی شروع کر دیں گے۔ چنانچہ جناب عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ رئیس بنو سہم نے تو بھرے مجمع میں بآواز بلند کہہ دیا تھا کہ بھائیو یہ کہاں کا انصاف ہے کہ کل امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ قتل ہوئے اور آج ان کا بیٹا مارا جائے اللہ کی قسم ایسا ہرگز نہ ہوگا۔

اور یہ بات صحیح ہے کہ فتنہ فرد کرنے کی خاطر قصاص موقوف کر دیا جائے اور ورثاء مقتول کو درگذر یا دیت پر راضی کر لیا جائے تو درست ہے۔

اور پھر اس بارے میں کیا کہا جائے گا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا قصاص بھی تو جناب امیر رضی اللہ عنہ نے فتنہ کے خوف سے موقوف فرما دیا تھا۔ وہاں تو یہ بھی ہوا کہ ورثاء عثمان رضی اللہ عنہ کو نہ دیت دلائی گئی اور نہ ہی ان کو راضی کیا گیا، یہاں تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ہرمزان کے ورثاء کو اتنا مال و دولت دے کر راضی اور خوش کر دیا تھا کہ پھر وہ قصاص کا نام بھی زبان پر نہ لائے: اگر فتنہ کے خوف سے قصاص کی موقوفی کو وجہ اعتراض بنا لیا جائے گا تو جناب علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے خلاف نواصب کے طعن کا جواب نہ بن پڑیگا: اس لئے صحیح جواب ہر دو اطراف یہی مناسب اور موزون ہے کہ فتنہ کے خوف سے قصاص موقوف کیا گیا۔ بلکہ جناب عثمان رضی اللہ عنہ کے حق میں کسی خلش کی گنجائش بھی نہیں ہے کیونکہ انہوں نے ہرمزان کے ورثاء کو راضی کر لیا تھا۔

سوم۔ تیسری وجہ جیسا کہ بعض حنفیہ نے لکھا اور محمد بن جریر طبری اور دوسرے ائمہ مورخین نے اس کی تصریح کی ہے کہ ہرمزان کے سارے ورثاء مدینہ منورہ میں موجود نہیں تھے، کچھ فارس میں تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان کو طلب بھی فرمایا مگر غالباً وہ بُعد کی وجہ سے نہیں آئے اور قصاص کے لئے یہ امر ضروری ہے کہ سارے ورثاء حاضر ہوں اور مطالبہ کریں۔ ایسی صورت میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا قصاص لینا درست و جائز نہ تھا۔ لامحالہ ایسی صورت میں بجز دیت اور کوئی صورت نہ تھی وہ بھی بیت المال سے دی جا سکتی تھی قاتل کے مال سے نہیں، کیونکہ کتب حنفیہ میں اس کی بھی تصریح ہے۔ کہ امام عادل کے قتل میں جس نے کسی نوع کی مدد کی ہو گو وہ اس میں بالذات شریک نہ ہوا ہو وہ واجب القتل ہے۔

اور یہ بات کہ اس کے سارے ورثاء مدینہ منورہ میں موجود نہ تھے صرف اہل سنت کی ہی کتابوں سے نہیں معلوم ہوتی، شریف مرتضیٰ اور دوسرے امامیہ کے ہاں بھی اس کا مذکور ہے! یہاں یہ بات ذہن نشین رہے کہ اس موقعہ پر بعض شیعوں نے کچھ اور اعتراض بھی کئے تھے جن کا ذکر نصیر الدین طوسی نے اپنی کتاب تجرید میں کیا ہے۔ مگر شیعی مورخین نے ان کو اپنی تاریخوں سے حذف کر دیا ہے۔ اسی لئے ہم نے بھی ان کو مستقل طور پر ذکر نہیں کیا۔ اسی اعتراض کے ضمن میں اجمالی طور پر کچھ بیان کئے دیتے ہیں۔ ان اعتراضوں میں سے ایک اعتراض تو یہ ہے کہ جناب ولید بن عقبہ نے شراب پی۔ مگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس پر شراب کی حد جاری نہیں کی! لیکن یہ روایت ہی غلط ہے۔ یہی بات صاحب استیعاب نے کہی ہے اور طبری کہتے ہیں۔

اَنَّہٗ تَعَصَّبَ عَلَیْہِ قَوْمٌ مِّنْ اَھْلِ الْکُوْفَۃِ بَغْیًا وَّحَسَدًا وَّ شَھِدُوْا عَلَیْہِ زُوْرًا اَنَّہٗ تَقَیَّأَ الْخَمْرَ۔

اہل کوفہ نے ان سے تعصب برتا اور بغض و حسد کی بنا پر یہ جھوٹی گواہی دی کہ انہوں نے شراب کی قے کی۔

پھر یہ پورا قصہ بیان کیا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس سے کہا۔

یَا اَخِیْ اصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰہَ یَاْجُرُکَ وَیَبُوْءُ الْقَوْمُ بِاِثْمِکَ

میرے بھائی تم صبر کرو اللہ تعالیٰ تم کو اس کا بدلہ عنایت فرمائے گا۔ اور وہ لوگ تیرے گناہوں کا بوجھ اٹھائیں گے۔

www.Ahlehaq.com

www.Ahlehaq.com

اس کے آگے اصل صورت حال بیان کی ہے۔

وَهٰذَا الْخَبَرُ مِنْ أَهْلِ الْأَخْبَارِ لَا يَصِحُّ عِنْدَ أَهْلِ الْحَدِيْثِ وَلَا عِنْدَ أَهْلِ الْعِلْمِ لَهٗ أَصْلٌ. وَالصَّحِيْحُ عِنْدَهُمْ مَا رَوَاهُ عَبْدُ الْعَزِيْزِ بْنُ الْمُخْتَارِ وَسَعِيْدُ بْنُ أَبِيْ عَرُوْبَةَ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ الدَّانَاجِ عَنْ حُضَيْنِ بْنِ الْمُنْذِرِ أَبِيْ سَاسَانَ أَنَّهٗ رَكِبَ إِلٰى عُثْمَانَ فَأَخْبَرَهٗ بِقِصَّةِ الْوَلِيْدِ وَقَدِمَ عَلٰى عُثْمَانَ رَجُلَانِ فَشَهِدَا عَلَيْهِ بِشُرْبِ الْخَمْرِ وَأَنَّهٗ صَلَّى الْغَدَاةَ بِالْكُوْفَةِ أَرْبَعًا ثُمَّ قَالَ أَزِيْدُكُمْ قَالَ أَحَدُهُمَا رَأَيْتُهٗ يَشْرَبُهَا وَقَالَ الْآخَرُ رَأَيْتُهٗ يَتَقَيَّأُهَا فَقَالَ عُثْمَانُ لَمْ يَتَقَيَّأْهَا حَتّٰى شَرِبَهَا فَقَالَ لِعَلِيٍّ أَقِمْ عَلَيْهِ الْحَدَّ فَقَالَ عَلِيٌّ لِابْنِ أَخِيْهِ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ جَعْفَرٍ أَقِمْ عَلَيْهِ الْحَدَّ فَأَخَذَ السَّوْطَ فَجَلَدَهٗ وَعُثْمَانُ يَعُدُّهٗ حَتّٰى بَلَغَ أَرْبَعِيْنَ فَقَالَ عَلِيٌّ أَمْسِكْ جَلَدَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَرْبَعِيْنَ وَجَلَدَ أَبُوْ بَكْرٍ أَرْبَعِيْنَ وَجَلَدَ عُمَرُ ثَمَانِيْنَ وَكُلُّ ذٰلِكَ سُنَّةٌ

اہل حدیث کے نزدیک اہل خبر کی یہ روایت صحیح نہیں۔ اور نہ اہل علم کے نزدیک اس کی کوئی اصل و بنیاد ہے۔ ان کے نزدیک وہ روایت صحیح ہے جس کو عبد العزیز بن مختار اور سعید بن ابی عروبہ نے عبد اللہ الداناج سے روایت کیا ہے، اور اس نے حضین بن منذر ابی ساسان سے کہ وہ سوار ہو کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور ولید کے قصہ کی خبر دی۔ پھر دو آدمی بطور گواہ آئے اور انہوں نے اس کے شراب پینے کی گواہی دی۔ اور یہ بھی کہا کہ اس نے فجر کی چار رکعت پڑھائیں۔ اور کہا یہ دو کی زیادتی میری طرف سے تمہارے لئے ہے! ایک گواہ نے تو کہا میں نے اسے شراب پیتے دیکھا اور دوسرے نے کہا میں نے اسے شراب قے کرتے دیکھا۔ اس پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا اس نے شراب پی تب ہی تو شراب کی قے کی۔ اس لئے آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا اس پر حد جاری کر دیں اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے بھتیجے عبد اللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ سے فرمایا ان کے کوڑے لگاؤ۔ انہوں نے کوڑے مارنے شروع کئے تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے انکی گنتی شروع کر دی۔ جب چالیس کوڑے لگ چکے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا بس اب رک جاؤ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے چالیس چالیس کوڑے لگوائے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسی۔ مگر یہ سب سنت ہیں،،

ایک اور روایت دیکھئے۔

وَرَوَى ابْنُ عُيَيْنَةَ عَنْ عَمْرِو بْنِ دِيْنَارٍ عَنْ أَبِيْ جَعْفَرٍ مُحَمَّدِ بْنِ عَلِيٍّ الْبَاقِرِ قَالَ جَلَدَ عَلِيٌّ الْوَلِيْدَ بْنَ عُقْبَةَ فِي الْخَمْرِ أَرْبَعِيْنَ جَلْدَةً بِسَوْطٍ لَهٗ طَرَفَانِ

ابن عیینہ نے بحوالہ عمرو بن دینار جناب ابی جعفر محمد بن علی باقر سے روایت بیان کی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے شراب کی حد میں ولید بن عقبہ کو چالیس کوڑے لگوائے۔ کوڑا دو شاخہ تھا۔

اب آپ غور فرمالیں کہ ان کا اعتراض کہاں تک مبنی بر صداقت تھا۔

اور دوسرا اعتراض یہ تھا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ جنگ احد میں ثابت قدم نہ رہے بلکہ بھاگ اٹھے اور بیعت رضوان اور بدر میں آپ شریک نہ ہوئے! اب جہاں تک احد سے بھاگنے کا معاملہ ہے تو تیس صحابہ کرام کے سوا سارے ہی تتر بتر ہو گئے تھے۔ تو اعتراض صرف حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر کیوں؟ اور پھر اس معاملہ کو جب اللہ تعالیٰ نے معاف فرما کر رفت گذشت کر دیا۔ اور قرآن میں اس معافی کی آیت نازل فرما دی۔ تو اب تو کسی پر بھی اعتراض کی گنجائش نہ رہی۔

ترجمہ آیت۔ دو جماعتوں کے ملنے والے دن جو لوگ تم سے منہ پھیر گئے تو درحقیقت ان کی بعض لغزشوں کے سبب شیطان نے ان کے

قدم ڈگمگا دیئے مگر اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ لغزش معاف فرمادی کیونکہ اللہ غفور رحیم ہے "

اور بالفرض اگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نہ بھی بھاگتے تو شیعہ پھر بھی ان کو کہاں بخشتے دیکھو اس دن ثابت قدم رہنے والوں میں حضرت ابوبکر و حضرت عمر رضی اللہ عنہما سر فہرست رہے مگر شیعوں کے طعن سے ان کے سینے بھی فگار ہیں ثابت قدم رہنے والوں میں تیرہ مہاجر اور باقی انصار تھے، مگر ان میں سے اکثر حضرات شیعہ نارک آگنی کا شکار رہیں!

مہاجرین میں سے حضرت ابوبکر، حضرت عمر، جناب طلحہ، جناب عبدالرحمن بن عوف اور جناب سعد بن ابی وقاص، رضی اللہ عنہ اجمعین۔ سارے کے سارے شیعہ دشمنی کا شکار رہیں۔ یہی حال انصار رضوان اللہ علیہم کا ہے۔

اہل سنت کے نزدیک ایسے موقعہ پر بھاگنا زیادہ سے زیادہ گناہ کبیرہ کے تحت آتا ہے جس سے لیاقت وقابلیت امامت متاثر نہیں ہوتی۔ اور یہاں تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے معافی مل جانے کے بعد وہ گناہ بھی مٹ گیا! تعصب سے خالی الذہن شخص کتب تاریخ وسیر کا مطالعہ کرے تو وہ ان بھاگنے والے حضرات کو معذور سمجھے گا۔ کیونکہ سردار لشکر کی قتل کی افواہ کے بعد لشکر کا اپنی جگہ ڈٹے ہی رہنا بہت ہی مشکل ہوتا ہے۔ اور پھر یہ حضرات بھاگے ہی کہاں، لشکرگاہ میں ہی تتر بتر تھے۔ کہ صورت حال کا صحیح علم ہوتے ہی سارے سمٹ آئے!

اب رہا بدر میں عدم شرکت کا واقعہ تو سب ہی جانتے ہیں کہ بنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم بی بی رقیہ رضی اللہ عنہا کی دیکھ بھال اور تیمارداری کے لئے خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے آپ مدینہ میں رُکے رہے۔ جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے حکم سے بچوں اور اہل خانہ کی نگہداشت کیلئے حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ غزوہ تبوک میں شریک نہ ہو سکے تھے! اور اس صورت حال کی وجہ سے تو عدم حاضری حاضری سے بہتر شمار ہوتی ہے! یہ نادان خوب کو ناخوب سمجھ رہے ہیں! یہی وجہ تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا عثمان کو وہی اجر ملیگا جو بدر میں شریک دوسرے حضرات کو! اور غنیمت میں بھی ایک آدمی کے برابر ان کا حصہ ہے!

رہی بیعت رضوان! کہ وہ تو ہوئی ہی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی وجہ سے وہ تو بذات خود اس بیعت کی غایت اور سبب تھے! جب سوال در پیش ہوا کہ کافروں سے جاکر کون سوال وجواب کرے تو کسی نے اس کی حامی نہ بھری رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس خدمت پیغامبری اور سفارت کے لئے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو حکم فرمایا آپ تشریف لے گئے، تو یہ افواہ اڑ گئی کہ دشمنوں نے ان کو قتل کر دیا اور ایک بڑے لشکر کے ساتھ حملہ آور ہو رہا ہے! تب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دوستوں اور ساتھیوں سے بیعت موت لی کہ عثمان رضی اللہ عنہ کا انتقام لینے کے لئے لڑتے لڑتے مر جائیں گے۔ مگر منہ نہ موڑیں گے۔ مگر بعد میں جب معلوم ہوا خبر جھوٹی تھی اور آپ زندہ ہیں تو لشکر میں تسلی واطمینان پیدا ہوا۔ اب ظاہر ہے کہ جو بیعت ان کی موت کی خبر کی بنا پر ہو رہی ہے وہ اس میں کس طرح شریک ہو سکتے تھے۔ وہ موجود ہوتے تو بیعت رضوان ہی کہاں ہوتی۔ اور پھر یہ بھی دیکھو کہ اس موقعہ پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنا سیدھا ہاتھ بائیں ہاتھ پر مارکر فرما رہے ہیں کہ یہ ہاتھ عثمان کا ہے۔ یا بعض روایات کے مطابق، یہ ہاتھ عثمان کے لئے ہے، یعنی اس کے ذریعہ عثمان بھی شریک بیعت شمار ہوں گے تو جس جگہ ایسا ذی حشم اور مولائے کائنات نائب موجود ہو تو وہاں ان کی عدم حاضری کا کیا نقصان اور ضرر ہے۔

غرض ان اعتراضات کے بودے پن کا احساس کرکے ہی اکثر علمائے امامیہ نے ان کو اپنی کتابوں سے خارج کر دیا ہے!

اعتراض۔ (۷) ساتواں اعتراض یہ ہے کہ جناب عثمان رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو بدل ڈالا۔ اس لئے کہ ۱۰ تا ۱۴ ذی الحجہ منیٰ میں آپ نے پوری نماز ادا فرمائی قصر نہیں کی۔ حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سفر میں عموماً اور اس جگہ خاص طور پر قصر فرماتے تھے! اسی بنا پر تمام صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم نے آپ کے طرز عمل پر اعتراض بھی کیا!

جواب:۔ تعصب ملاحظہ ہو کہ بات میں زور پیدا کرنے کیلئے صحابہ کرام کے اعتراض کا تو ذکر کیا مگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے جواب

www.Ahlehad.com

کو گول کر گئے۔) جن حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم نے یہ اعتراض کیا تھا وہ حقیقت حال سے واقف نہیں تھے۔ ان کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بتایا کہ اب میں نے مکہ میں بھی ایک شادی کر کے یہاں بھی اپنا گھر بنالیا ہے! اب میں یہاں آکر مسافر نہیں رہتا اس لئے قصر بھی نہیں کرتا۔ اس کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے آپ پر اعتراض نہیں کیا۔ امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ کا یہ جواب امام احمد، طحاوی، ابوبکر بن ابی شیبہ اور ابن عبدالبر نے اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے۔ روایت کے الفاظ یہ ہیں۔

اَنَّ عُثْمَانَ صَلّٰی بِالنَّاسِ بِمِنٰی اَرْبَعًا فَاَنْكَرَ النَّاسُ عَلَيْهِ فَقَالَ اَيُّهَا النَّاسُ اِنِّیْ تَاَهَّلْتُ بِمَكَّةَ مُنْذُ قَدِمْتُ وَاِنِّیْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَنْ تَاَهَّلَ بِبَلَدٍ فَلْيُصَلِّ صَلٰوةَ الْمُقِيْمِ فِيْهَا اَخْرَجَهُ اَحْمَدُ عَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ اَبِیْ ذُبَابٍ عَنْ اَبِيْهِ وَغَيْرُهُمَا عَنْ غَيْرِهٖ۔)

جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو منیٰ میں نماز پڑھائی تو چار رکعت پڑھائی، جس پر لوگوں نے آپ پر اعتراض کیا تو جواباً آپ نے فرمایا کہ لوگو جب سے میں آیا ہوں تب سے مکہ مکرمہ میں خانہ داری کرلی ہے۔ (شادی کر کے یہاں گھر بسا لیا ہے۔) اور میں بات میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا ہے۔ کہ جو کوئی کسی شہر میں خانہ دار ہو جائے تو وہ اس شہر میں مقیم کی طرح نماز پڑھے۔

اس کے بعد تو کسی اعتراض کی گنجائش ہی نہیں رہی۔ ایسی صورت میں تمام مذاہب کے علماء کے نزدیک قصر درست نہیں۔

اعتراض۔ (۸) یہ ہے کہ آپ نے حوالی مدینہ منورہ کی چراگاہ نقیع نامی کو قرق کر کے لوگوں کو اس چراگاہ سے روک دیا۔ پھر آہستہ آہستہ اس کا رقبہ دوگنا کر کے رمنہ میں داخل کر دیا۔ حالانکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ

اَلْمُسْلِمُوْنَ شُرَكَاءُ فِیْ ثَلَاثٍ اَلْمَاءِ وَالْكَلَاءِ وَالنَّارِ۔ تین چیزوں میں سارے مسلمان شریک ہیں پانی۔ گھاس۔ (چارہ) اور آگ۔

نیز مدینے کے بازار کو قرق کیا، تاکہ ان کا گماشتہ جب تک کھجور کی گٹھلیوں کی خرید فروخت سے فارغ نہ ہو جائے کوئی اور گٹھلیاں نہ خریدے۔ اور دریا کی کشتیوں کو قرق کیا تاکہ ان کے مال تجارت کے علاوہ کوئی اور مال نہ لیجائیں

جواب:۔ چراگاہ کا قصہ صحیح ہے، اور اس کی وجہ آپ نے خود صحابہ کرام کے روبرو بیان کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ لَاحِمٰی اِلَّا لِلّٰهِ وَلِرَسُوْلِهٖ۔ (چراگاہ صرف اللہ اور اس کے رسول ہی کے لئے ہے) اور میں نے اس کو صدقہ اور بیت المال کے اونٹوں اور جہاد کے گھوڑوں کے لئے چراگاہ بنایا ہے اور چراگاہ کو رمنہ ٹھہرایا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاد کے گھوڑوں اور صدقہ کے اونٹوں کے لئے خود چراگاہ بنائی ہے۔ اس پر صحابہ کرام نے فرمایا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تو بہت مختصر سی چراگاہ بنائی تھی مگر آپ نے تو اس سے کئی گنا بڑی بنائی۔ آپ نے فرمایا کہ اسوقت کے بیت المال اور اسوقت کے بیت المال میں موازنہ کرلو اور اسی تناسب سے چراگاہ میں زیادتی سمجھ لو۔ آپ کے اس جواب کو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے تسلیم کرلیا اور خاموش ہو رہے!

بازار قرق کرنے والی بات سراسر غلط ہے! اتنی بات ضرور ہوئی کہ حارث بن حکم جو بازار کا داروغہ بنا تھا اس نے اپنی طرف سے کچھ ایسی پابندی عائد کی تھی، اور یہ بات دو تین روز ہی چلی۔ جب امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ کو اس کا علم ہوا۔ داروغہ کو موقوف فرما دیا۔

رہا کشتیوں کا معاملہ! تو وہ ان کی ذاتی ملکیت کی کشتیاں تھیں، پہلے جب اور لوگوں کی اپنی کشتیاں نہیں تھیں تو وہ اپنا مال و اسباب مع گماشتوں کے آپ کی ہی کشتیوں میں لایا کرتے تھے۔ جب اور لوگوں نے بھی کشتیاں بنالیں تو آپ نے اپنی کشتیوں پر بار برداری کی ممانعت فرمادی کہ دوسروں کا مال بار نہ کریں یہ نہیں کیا (جیسا کہ اعتراض سے تاثر ملتا ہے) کہ سب ہی کی کشتیوں کو قرق و پابند کر دیا ہو۔ پہلے اجازت دینا ان کا احسان تھا۔ اب اگر آپ یہ احسان نہیں کر رہے تھے تو اس میں ملامت وطعن کی کیا بات ہے!

اعتراض۔ (۹) نواں اعتراض یہ ہے کہ آپ نے اپنے دوستوں اور مصاحبوں کو بہت سی جاگیریں، اور اراضی قطعات عنایت فرمائے۔ جو

Www.Ahlehaq.com

بیت المال کی ارضیات میں سے تھے۔ اسطرح آپ نے گویا مسلمانوں کا حق تلف کیا۔

جواب :- آپ نے اپنے رفیقوں، یا مصاحبوں کو ارضی قطعات دئے وہ تمام اس مقصد کے لئے تھے کہ افتادہ اور غیر آباد زمین کو وہ آباد کریں۔ کاشت شدہ زمین آپ نے کسی کو مرحمت نہیں فرمائی۔ اس کی ساری تفصیلات کتب تاریخ میں محفوظ ہیں۔ افتادہ اور بنجر زمین اگر آباد ہو جائے تو اس میں تو ملک اور قوم کی بھلائی ہے۔ ملک آباد ہوتا ہے۔ حکومت کی آمدنی میں اضافہ ہوتا ہے۔ اور خلق خدا کے رزق میں وسعت اور کشادگی پیدا ہوتی ہے۔ بھلا اس میں اچھائی کا کون سا پہلو ہے کہ ہزاروں ایکڑ زمین ناکارہ پڑی رہے۔ نہ ملک کے کام آئے نہ مخلوق خدا کے۔ بلکہ چوروں، ڈاکوؤں کی پناہ گاہ کے کام آئے! ملک آباد ہو، زمین کا چپہ چپہ پر کاشت ہونے لگے۔ تو ایک طرف خلق خدا کو آسودگی میسر آتی ہے دوسری طرف رہزنوں اور فسادیوں کے ٹھکانے بھی ختم ہو جاتے ہیں، یہ تو قابل تعریف کارنامہ تھا جو بغض وعناد رکھنے والوں نے طعن میں بدل ڈالا۔

اس کے علاوہ اہل سیر نے یہ بھی ذکر کیا ہے کہ آپ کے زمانہ میں یمن کے بہت سے شریف خانہ بدوش آپ کے پاس آئے، اور کہنے لگے ہم نے جہاد کی خاطر اپنا گھر بار اور زمینیں چھوڑی ہیں، آپ ہمیں جہاد کے علاقوں کے قرب وجوار میں زمینیں عنایت فرمائیں تاکہ دشمنان اسلام کے ساتھ جہاد میں دور دراز کی مسافت سے بھی بچیں، اور باری باری اس میں حصہ لے سکیں، اس وقت فارس کا علاقہ اس علاقہ کے زمیندار بہت سرکش تھے ان لوگوں کو آپ نے وہیں آباد کیا اور انہیں حدود میں ان کو ان کی متروکہ زمین کے بدلے قطعات ارضی بھی عنایت فرمائے۔ اور بعض صحابہ کی زمین بطور تبادلہ بھی ان کو دی۔ مثلاً جناب طلحہ رضی اللہ عنہ سے ان کی حضر موت والی زمین اُن کو دلوادی، اور ان کی حضرت طلحہ کو! اور جناب اشعث بن قیس رضی اللہ عنہ سے کندہ کی زمین لے کر انکو دوسری جگہ اس کے بدلہ دیدی! اور یہ سب کچھ باہمی رضامندی سے ہوا! اس میں طعن واعتراض کہاں سے نکل آیا۔

اعتراض۔ (۱۰) شیعہ کہتے ہیں سارے ہی صحابہ ان کے قتل پر خوش تھے، ان کی ہجو اور مذمت کرتے تھے، تین دن ان کا لاشہ یوں ہی ڈالے رکھا اور دفن کی کوشش نہ کی!

جواب :- دروغ گوئیم برروئے تو، قسم کا اعتراض شیعوں کے سوا اور کوئی کر بھی نہیں سکتا صریح جھوٹ اور بہتان انہیں کا حصہ ہے! اگر "سارے" ہی صحابہ ان سے ناخوش تھے تو ان کے قصاص کیلئے لڑنے والے یہ طلحہ وزبیر عائشہ، معاویہ، اور عمرو بن عاص وغیرہم، رضی اللہ عنہم اجمعین کون تھے! اور یہ کس عثمان رضی اللہ عنہ کے لئے لڑ رہے تھے کیا انہوں نے کسی اور خیالی وہمی عثمان کے لئے یہ ساری تگ ودو کی تھی۔ سنیوں اور شیعوں دونوں کی تاریخیں موجود ہیں۔ بلوہ مٹانے کی سارے صحابہ نے کوشش کی جب بلوائیوں نے ان کی کوئی بات نہ سنی تو انہیں حضرات نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے مقابلہ کی اجازت مانگی۔ آپ نے لڑائی کی اجازت نہ دی، بڑی شدت سے ان کو روکا۔ آپ کے منع کرنے پر وہ حضرات خاموش تو ہو گئے مگر آپ کی پانی، اور دیگر تکالیف کے ازالہ میں آخر دم تک کوشاں رہے، اور تدبیر وحیلہ سے کام لیتے رہے۔

حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ انصار کی جمعیت کے ساتھ آپ کے پاس آئے نوجوانان انصار نے ان سے کہا ان شئت کنا انصار اللہ مرتین۔ (آپ اجازت دیں تو ہم دوبارہ بھی انصار اللہ کا کردار ادا کریں)

اُدھر حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما تمام مہاجرین کو لے کر آپ کے پاس آئے اور فرمانے لگے کہ آپ پر چڑھ دوڑنے والے یہ لوگ ہماری تلواروں کے زخم خوردہ ہیں، اس سے ڈر کر مسلمان ہوئے ہیں۔ اب بھی ڈر سے ان کے ہوش خطا ہیں۔ یہ ساری لاؤ دہو، اور لن ترانیاں صرف اس لئے ہیں کہ وہ بظاہر کلمہ گو ہیں۔ اور آپ کلمہ کی عزت وحرمت کا پاس ولحاظ کرتے ہیں۔ آپ حکم دیں ابھی ذرا دیر میں ان کو وہ بات یاد دلا دیں جو ان کے حافظہ سے محو ہو گئی ہے: اور ان کو ان کی حقیقت سے آگاہ کر دیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا صبر، علم ومروت

www.Ahlehaq.com

www.Ahlehaq.com

ملاحظہ ہو کہ آپ نے فرمایا ایسا نہ کہو میری جان کی خاطر اسلام میں رخنہ پیدا نہ کرو

اس کے باوجود حضرات حسنین، عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن زبیر، ابوہریرہ، عبداللہ بن عامر بن ربیعہ، اور دوسرے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے گھر میں موجود رہے اور جب بھی بلوائی بلہ بولتے تو یہ حضرات مدافعت کرتے، اور ان کو دھکیل دیتے۔

ان کے علاوہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ذاتی غلاموں کی اچھی خاصی نفری موجود، اگر آپ ذرا بھی اشارہ فرما دیتے، تو بلوائیوں کو اپنی حقیقت معلوم ہو جاتی۔ یہ حضرات نہتے بھی نہیں تھے ہتھیاروں سے مسلح اور پوری طرح تیار ہو کر آپ کے پاس آئے، وہ بلوائیوں سے دو دو ہاتھ کرنے کو سخت بے چین اور بے قرار تھے۔ وہ کہتے تھے کہ ہم وہی تو ہیں جنکی تلوار کی تاب خراسان سے لے کر افریقہ تک کوئی نہ لا سکا۔ صرف آپ اجازت دیدیں پھر دیکھئے ہم ان کا کیا حشر کرتے، اور تماشا بناتے ہیں۔ یہ لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانیں گے۔ یہ سمجھ گئے کہ کلمہ کی حرمت کے سبب کوئی ہمیں نہیں چھیڑتا۔ اسی لئے دیدہ دلیر ہو گئے ہیں، اور سمجھانے بجھانے کو خاطر میں نہیں لاتے۔ نہ آپ کی بات سنتے ہیں نہ صحابہ کرام کے کہنے پر کان دھرتے ہیں۔ مگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ یہی فرماتے رہے کہ میری رضامندی چاہتے اور میرے احسان و سلوک کا حق ادا کرنا چاہتے ہو تو اپنے ہتھیار رکھدو۔ اور اپنے اپنے گھر جاؤ، اور سنو، جو اپنے ہتھیار رکھدے۔ وہ میری غلامی سے آزاد ہے۔

وَاللهِ لَأَنْ أُقْتَلَ قَبْلَ الدِّمَاءِ أَحَبُّ إِلَيَّ مِنْ أَنْ أُقْتَلَ بَعْدَ الدِّمَاءِ۔

خدا کی قسم مجھے یہ بات زیادہ محبوب ہے کہ میں خونریزی کرائے بغیر قتل کر دیا جاؤں بجائے اس کے خونریزی کراؤں اور پھر قتل ہو جاؤں۔

مطلب یہ تھا کہ میرا قتل مقدر ہو چکا ہے۔ میرے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم اس سے آگاہ فرما چکے ہیں اگر تم لڑے بھی تب بھی میری شہادت نہیں ٹلے گی۔ تو اس خونریزی کا کیا حاصل جس سے مقصود مدعا بھی حاصل نہ ہو۔

بیانات فریقین کی تاریخ سے ثابت ہے کہ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے اپنے صاحبزادوں، اولاد ابو جعفرؓ اور اپنے مصاحب خاص قنبرؓ کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دروازہ پر متعین فرما دیا تھا۔ نیز حضرت طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما نے بھی اپنے لڑکوں کو حفاظت کے لئے متعین کیا ہوا تھا کہ بوقت ضرورت بلوائیوں کا مقابلہ کریں، چنانچہ جب بھی بلوائی ہلہ بولتے تھے تو یہ حضرات پتھروں اور ڈنڈوں سے مار مار کر انہیں بھگا دیتے تھے اسی مدافعتی لڑائی میں حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے چوٹ کھائی۔ محمد بن طلحہ، اور قنبر کے سر پھوٹے، مگر دروازہ سے بلوائیوں کو داخل نہ ہونے دیا برابر کے کسی انصاری کے گھر میں نقب لگا کر اندر گھسے اور آپ کو شہید کر ڈالا۔

شیعوں کی صحیح ترین کتاب اس واقعہ کی گواہ ہے! حضرت علی رضی اللہ عنہ سے یہ الفاظ مروی ہیں واللہ قد دفعت (اللہ کی قسم میں نے خود ان کا دفاع کیا ہے) آپ جب بھی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے گھر تشریف لاتے، بلوائیوں کو کوڑے مار کر دور ہٹاتے، انہیں بُرا بھلا کہتے۔

کسی مؤمن کا یہ کام نہیں کہ اس تمام بات چیت اور معاملہ کو نفاق کہے اور ظاہر و باطن کے اختلاف پر محمول کرے۔ خود جو منافق ہو وہی ایسی بات منہ سے نکال سکتا ہے۔ اور ایسے پاک دل بزرگ کے دامن کو اپنے ناپاک خیال سے آلودہ کر سکتا ہے۔

اور اگر اسوقت نفاق (تقیہ) کی گنجائش تم کہتے ہو تو کوفہ میں (جبکہ آپ خلیفہ و امام تھے) جو خطبہ مرحمت فرمایا اس میں کیوں قسم کھائی۔ کہ میں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتلوں کو دفع کیا ہے اور آپ کی شہادت کے بعد ببانگ دھل یہ کیوں فرمایا۔

إِنَّمَا مَثَلِي وَمَثَلُ عُثْمَانَ كَمَثَلِ أَثْوَارٍ ثَلَاثَةٍ كُنَّ فِي أَجَمَةٍ أَبْيَضُ وَأَسْوَدُ وَأَحْمَرُ وَمَعَهُنَّ فِيهَا أَسَدٌ فَكَانَ لَا يَقْدِرُ مِنْهُنَّ عَلَى شَيْءٍ لِاجْتِمَاعِهِنَّ عَلَيْهِ فَقَالَ لِلثَّوْرِ الْأَسْوَدِ وَالْأَحْمَرِ لَا يُدِلُّ عَلَيْنَا فِي أَجَمَتِنَا هٰذِهِ

میری اور عثمان کی مثال ان تین بیلوں کی سی ہے جو ایک جنگل میں تھے ایک کالا، دوسرا سفید اور تیسرا سرخ تھا۔ اس جنگل میں ایک شیر بھی تھا مگر تینوں کے اتفاق و اتحاد کے سبب ان کا شکار نہیں کر سکتا تھا۔ اسنے (چال چلی اور) کالے اور سرخ بیل سے کہا کہ اس جنگل میں ہمارے موجود ہو

www.Ahlehaq.com

إِلَّا الثَّوْرُ الْأَبْيَضُ فَإِنَّ لَوْنَهٗ مَشْهُوْرٌ وَلَوْنِيْ عَلٰى لَوْنِكُمَا فَلَوْ تَرَكْتُمَانِيْ أَكَلْتُهٗ وَصَفَتْ لَكُمُ الْأَجَمَةُ فَقَالَا دُوْنَكَ فَكُلْهُ فَأَكَلَهٗ فَلَمَّا مَضَتْ أَيَّامٌ قَالَ لِلْأَحْمَرِ لَوْنِيْ عَلٰى لَوْنِكَ فَاتْرُكْنِيْ آكُلِ الْأَسْوَدَ فَقَالَ دُوْنَكَ فَكُلْهُ فَأَكَلَهٗ ثُمَّ قَالَ لِلْأَحْمَرِ الْآنَ آكُلُكَ فَقَالَ دَعْنِيْ أُنَادِيْ ثَلَاثًا فَقَالَ افْعَلْ فَنَادٰى ثَلَاثًا أَلَا إِنِّيْ أُكِلْتُ يَوْمَ أُكِلَ الْأَبْيَضُ ثُمَّ رَفَعَ أَمِيْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ صَوْتَهٗ فَقَالَ أَلَا إِنِّيْ هُنْتُ يَوْمَ قُتِلَ عُثْمَانُ۔

کی کسی کو خبر نہیں ہو سکتی، اس لیے تمہارا اور میرا رنگ تو ایک سا ہے۔ البتہ یہ سفید بیل جس کا اجلا رنگ ہر ایک کو نظر آجاتا ہے ورنہ ہم سب کو مروا ڈالے گا، اگر تم کچھ نہ کہو تو میں اس کو کھا جاؤں۔ پھر تم دونوں کے لیے جنگل میں کوئی خطرہ نہیں رہے گا۔ دونوں نے کہا ٹھیک ہے اسے کھا جاؤ۔ چند دن گذرے تھے کہ سرخ بیل کے پاس آیا اور کہنے لگا ہم تم تو ہم رنگ ہیں یہ کالا ہم میں نہیں ملتا۔ اسے بھی کھا جاؤں؟ سرخ بیل نے کہا کھا جاؤ۔ شیر اسے بھی چٹ کر گیا۔ اب سرخ سے کہا اب تمہاری باری ہے۔ اس نے کہا مجھے اتنی مہلت دو کہ میں تین دفعہ آواز لگاؤں۔ شیر نے کہا ٹھیک ہے، لگا لو آوازیں۔ بیل نے کہا سنو! میں تو اسی دن کھا لیا گیا تھا جب سفید بیل کھا لیا گیا تھا۔ پھر امیر المومنین رضی اللہ عنہ نے باآواز بلند فرمایا۔ سنو! میں اسی دن سبک رہ قدر ہو گیا تھا جس دن عثمان قتل کئے گئے۔"

اور یہ قصہ شہرت و تواتر میں اس حد تک پہنچا ہے کہ فریقین کی کتابوں میں محفوظ و مذکور ہے۔ اس کا اب کوئی انکار نہیں کر سکتا۔

جناب عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ ہر روز صبح بلوائیوں کے پاس جاتے اور کہتے ان کو قتل نہ کر دینا کہ ان کے قتل کے نتیجہ میں فتنے اور فساد برپا ہوں گے۔ اور حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ جو منافقین کے متعلق پورا علم رکھتے تھے، اور جناب امیر رضی اللہ عنہ نے ان کے اس علم کی گواہی بھی دی ہے۔ وہ ہمیشہ ڈرایا کرتے تھے کہ عثمان رضی اللہ عنہ کو قتل نہ کرنا کہ یہ امر فتنہ و فساد کا سبب بنجائیگا۔

اور آپ کا دفن نہ ہونا۔ تو اس کا سبب بلوائیوں کا ہلڑ، اور فساد تھا۔ اور افراتفری جوان اوباشوں نے صحابہ کرام کو ڈرا دھمکا کر پھیلا دی تھی اس کا باعث بنی، رات کو جب بلوائی نیند میں مدہوش تھے تو حضرات زبیر بن عوام، حکیم بن حزام، مسور بن مخرمہ، جبیر بن مطعم، ابوجہم بن حذیفہ بدری، نیسار بن مکرم اور آپ کے لڑکے عمرو بن عثمان رضی اللہ عنہ نے شہیدوں کی طرح خون آلود کپڑوں میں نماز جنازہ ادا کر کے آپ کو دفن کیا جناب جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ نے نماز کی امامت کی! تابعین رحمہم اللہ کی ایک جماعت بھی شریک تھی، جن میں حسن بصری، امام مالک کے دادا مالک رحمہم اللہ بھی تھے! آدمیوں کے علاوہ آپ کے جنازہ میں فرشتے بھی شریک تھے، چنانچہ حافظ دمشقی نے مرفوعاً حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ الفاظ مبارک روایت کئے ہیں۔

یَوْمَ یَمُوْتُ عُثْمَانُ یُصَلِّیْ عَلَیْہِ مَلَائِکَۃُ السَّمَاءِ جس دن عثمان وفات پائیں گے آسمان کے فرشتے ان پر نماز جنازہ پڑھیں گے!

اس روایت کی تائید ابن ضحاک کی روایت سے بھی ہوتی ہے جو بطریق سہم بن خنیس مروی ہے۔ یہ شہادت کے واقعہ میں موجود تھا۔ وہ کہتا ہے۔

فَلَمَّا أَمْسَيْنَا قُلْتُ لَئِنْ تَرَكْتُمْ صَاحِبَكُمْ حَتّٰى تُصْبِحُوْا مَثَّلُوْا بِهٖ فَانْطَلَقْنَا بِهٖ إِلٰى بَقِيْعِ الْغَرْقَدِ فَأَمْكَنَّا لَهٗ مِنْ جَوْفِ اللَّيْلِ ثُمَّ حَمَلْنَاهُ فَغَشِيَنَا سَوَادٌ مِّنْ خَلْفِنَا فَهِبْنَاهُمْ حَتّٰى كِدْنَا نَتَفَرَّقُ فَإِذَا مُنَادٍ يُنَادِيْ لَا رَوْعَ عَلَيْكُمْ اُثْبُتُوْا فَإِنَّا جِئْنَا لِنَشْهَدَهٗ وَكَانَ ابْنُ خُنَيْسٍ يَقُوْلُ هُمُ الْمَلَائِكَةُ۔

جب شام ہوئی تو میں نے لوگوں سے کہا اگر تم نے اپنے سردار کو صبح تک اسی حال میں رہنے دیا تو یہ بلوائی ان کے ناک کان کاٹ کر مثلہ کر دیں گے ہمیں آدھی رات کے وقت ان کی لاش اٹھانے کا موقعہ ملا تو ہم ان کو لے کر بقیع کی طرف چلے تو اچانک ایک جماعت نے ہمیں پیچھے سے آگھیرا جس سے ہم ڈر گئے اور ہم ڈر کی وجہ سے بھاگنے کی سوچ ہی رہے تھے کہ اچانک کسی نے پکار کر کہا۔ ڈرو مت، حوصلہ رکھو ہم بھی جنازہ میں شرکت کیلئے آئے ہیں۔ ابن خنیس

کہتے تھے کہ وہ فرشتے تھے۔

اور یہ جو کہتے ہیں کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم آپ کی ہجو اور برائی کیا کرتے تھے تو ان کی من گھڑت، اور افتراء محض ہے۔ اس سلسلہ میں اہل بیت کی ایک روایت ملاحظہ ہو:

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ رَأَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي الْمَنَامِ عَلٰى بِرْذَوْنٍ وَعَلَيْهِ عِمَامَةٌ مِّنْ نُوْرٍ تَعَمَّمَ بِهَا وَبِيَدِهٖ قَضِيْبٌ مِّنَ الْفِرْدَوْسِ فَقُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنِّيْ اِلٰى رُؤْيَاكَ بِالْاَشْوَاقِ وَاَرَاكَ مُبَادِرًا فَالْتَفَتَ اِلَيَّ وَتَبَسَّمَ وَقَالَ اِنَّ عُثْمَانَ بْنَ عَفَّانَ اَضْحٰى عِنْدَنَا فِي الْجَنَّةِ مَلِكًا عَرُوْسًا وَقَدْ دُعِيْنَا اِلٰى وَلِيْمَتِهٖ فَاَنَا مُبَادِرٌ لِذٰلِكَ۔

جناب ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ میں نے خواب میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس حال میں دیکھا کہ گھوڑے پر سوار ہیں نورانی عمامہ زیب سر ہے، اور جنت کے کسی درخت کی چھڑی دست مبارک میں ہے۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) میں تو آپ کے دیدار کا مشتاق ہوں، (مگر معلوم ہوتا ہے کہ) آپ کو کہیں تشریف لے جانے کی عجلت ہے۔ تب آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے میری طرف توجہ فرمائی اور مسکراتے ہوئے فرمایا، کہ عثمان بن عفان ابھی صبح ہمارے پاس جنت میں آئے ہیں اور اس طرح آئے ہیں جیسے شاہی دولہا، اور ہمیں ان کی دعوت ولیمہ میں بلایا گیا ہے اسی لئے میں ذرا جلدی میں ہوں۔"

یہ روایت حسین بن عبداللہ البنار الفقیہ نے بیان کی ہے۔

اور ابو شجاع دیلمی جو مشہور محدثین میں شمار ہوتے ہیں اور جن کو شیعہ بھی معتبر مانتے ہیں اپنی کتاب منتقی میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہی خواب اسی طرح بیان کرتے ہیں۔ اسی طرح حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کا خواب بھی صحیح روایت کے ساتھ مشہور ہے۔ جیسے دیلمی مذکور نے بھی منتقی میں روایت کیا ہے۔

عَنْ حَسَنِ بْنِ عَلِيٍّ قَالَ مَا كُنْتُ لِاُقَاتِلَ بَعْدَ رُؤْيَا رَاَيْتُهَا رَاَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاضِعًا يَدَهٗ عَلَى الْعَرْشِ وَرَاَيْتُ اَبَا بَكْرٍ وَاضِعًا يَدَهٗ عَلٰى مَنْكِبِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَرَاَيْتُ عُمَرَ وَاضِعًا يَدَهٗ عَلٰى مَنْكِبِ اَبِيْ بَكْرٍ وَرَاَيْتُ عُثْمَانَ وَاضِعًا يَدَهٗ عَلٰى مَنْكِبِ عُمَرَ وَرَاَيْتُ دَمًا دُوْنَهٗ فَقُلْتُ مَا هٰذَا فَقَالُوْا دَمُ عُثْمَانَ يَطْلُبُ اللّٰهَ بِهٖ۔

حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما سے روایت ہے فرماتے ہیں، کہ جو خواب میں دیکھ چکا ہوں اس کے بعد اب میں نہیں لڑوں گا۔ میں نے دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عرش پر ہاتھ رکھے کھڑے ہیں آپ کے برابر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کاندھوں پر ہاتھ رکھے ہوئے ہیں، اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے ہاتھ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے شانوں پر ہیں اور جناب عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے کندھوں پر ٹکے ہوئے ہیں وہاں میں نے خون دیکھا اور اس کے بارے میں پوچھا کہ یہ کیا ہے۔ تو جواب ملا یہ خون عثمان ہے جو اللہ تعالیٰ سے اپنا قصاص طلب کر رہا ہے۔"

اور ابن سمان نے قیس بن عبادہ رضی اللہ عنہ سے یوں روایت کی ہے۔

قَالَ سَمِعْتُ عَلِيًّا يَوْمَ الْجَمَلِ يَقُوْلُ اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَبْرَاُ اِلَيْكَ مِنْ دَمِ عُثْمَانَ وَلَقَدْ طَاشَ عَقْلِيْ يَوْمَ قُتِلَ عُثْمَانُ وَاَنْكَرَتْ نَفْسِيْ وَجَاءُوْنِيْ لِلْبَيْعَةِ فَقُلْتُ اَلَا اَسْتَحِيْ مِنَ اللّٰهِ اُبَايِعُ

یوم جمل کے موقع پر میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو یہ فرماتے سنا ہے اے اللہ میں تیرے سامنے خون عثمان سے برأت ظاہر کرتا ہوں جس دن ان کا قتل ہوا (صدمہ سے)، عقل گم ہوگئی اور مجھے حد درجہ صدمہ و ناگواری

www.AhleHaq.com

قوماً قتلوا رجلاً قال قال لہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الا استحیی رجلاً تستحیی منہ الملائکۃ وانی لاستحیی من اللہ ان ابایع وعثمان قتیل فی الارض لم یدفن بعد فانصرفوا فلما دفن رجع الناس یسئلون البیعۃ فقلت اللھم انی مشفق مما اقدم علیہ ثم جاءت عزیمۃ فبایعت فقالوا یا امیر المؤمنین فکانما صدع قلبی۔

ہوئی۔ پھر وہ لوگ بیعت کے لئے میرے پاس آئے تو میں نے ان سے کہا کیا میں ان لوگوں سے نہ شرماؤں جنہوں نے عثمانؓ کو قتل کیا جن کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ جس سے فرشتے شرماتے ہیں کیا میں اُس سے نہ شرماؤں۔ مجھے اللہ تعالیٰ سے حیا آتی ہے کہ وہ تو بے گور و کفن کشتہ پڑے ہوں اور میں بیعت لے لوں۔ تو سب لوگ واپس چلے گئے، اور جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ مدفون ہو چکے تو وہ لوگ پھر واپس آئے۔ اور بیعت پر اصرار کرنے لگے تو میں نے کہا، اے اللہ میں جو اقدام (بیعت) کر رہا ہوں اس سے میں ڈر رہا ہوں۔ پھر مجھے (موجودہ حالات کے پیش نظر) اس کی اہمیت کا خیال آیا تو میں نے بیعت کر لی۔ بعد بیعت جب انہوں نے مجھے امیرالمؤمنین کہہ کر پکارا۔ تو ان کے ایسا کہنے سے میرا دل پارہ پارہ ہو گیا،

اور اسی راوی نے جناب محمد بن الحنفیہ رحمہ اللہ علیہ سے بھی یہ روایت بیان کی ہے کہ

اِنَّ عَلِیًّا قَالَ یَوْمَ الْجَمَلِ لَعَنَ اللّٰہُ قَتَلَۃَ عثمان فِی السَّھْلِ وَالْجَبَلِ۔

جناب علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے یوم جمل کے موقعہ پر فرمایا قاتلین عثمان پر اللہ لعنت کرے۔ خواہ وہ زمین پر ہوں خواہ پہاڑ پر!

اور اس روایت کا بھی یہی راوی ہے۔ کہ

اَنَّ عَلِیًّا بَلَغَہٗ اَنَّ عَائِشَۃَ تَلْعَنُ قَتَلَۃَ عُثْمَانَ فَرَفَعَ یَدَیْہِ حَتّٰی بَلَغَ بِھِمَا وَجْھَہٗ فَقَالَ اَنَا اَلْعَنُ قَتَلَۃَ عُثْمَانَ لَعَنَھُمُ اللّٰہُ فِی السَّھْلِ وَالْجَبَلِ مَرَّتَیْنِ اَوْ ثَلَاثًا

جب حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو یہ اطلاع ملی کہ ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا قاتلین عثمان پر لعنت فرماتی ہیں تو آپ نے اپنے ہاتھ چہرہ تک اٹھا کر دو تین مرتبہ فرمایا میں بھی قاتلین عثمانؓ پر لعنت بھیجتا ہوں۔ اللہ ان پر لعنت فرمائے وہ زمین میں ہوں یا پہاڑ پر،

اور اسی راوی نے جناب عبداللہ بن حسین بن حسین رضی اللہ عنہم سے یہ روایت بھی ذکر کی ہے کہ

وَقَدْ ذُکِرَ عِنْدَہٗ قَتْلُ عُثْمَانَ فَبَکٰی حَتّٰی بَلَّ لِحْیَتَہٗ۔

جب قتل عثمان کی خبر آپ کو پہنچائی گئی تو آپ زار و قطار روئے کہ آپ کی ریش مبارک آنسوؤں سے تر ہو گئی۔

ایک اور روایت ملاحظہ ہو۔

وعن جُنْدُبٍ قَالَ دَخَلْتُ عَلٰی حُذَیْفَۃَ فَقَالَ لِیْ مَا فَعَلَ الرَّجُلُ یَعْنِیْ عُثْمَانَ فَقُلْتُ اَرَاھُمْ قَاتِلِیْہِ ثُمَّ قَالَ اِنْ قَتَلُوْہُ کَانَ فِی الْجَنَّۃِ وَکَانُوْا فِی النَّارِ۔

حضرت جندب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کے پاس آیا تو مجھ سے پوچھا کہ حضرت عثمان کے معاملہ کا کیا ہوا۔ میں نے کہا میرا خیال ہے وہ (بلوائی) ان کو قتل کر ڈالیں گے۔ تو آپ نے فرمایا اگر ان کو قتل کر دیں گے تو وہ جنت میں جائیں گے اور قاتلین جہنم میں۔

یہ ہیں اہل بیت کرام رضوان اللہ علیہم کے اقوال و تاثرات حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے اور ان کے قتل کے بارے میں! اور جناب حذیفہ رضی اللہ عنہ تو خود شیعوں کے نزدیک اس روایت کی بنا پر جو ان کی کتابوں میں موجود ہے صاحب الحدیث، (سچ بولنے والے) ہیں! اور اگر ہم وہ ساری روایات، اقوال و تاثرات بیان کرنے لگیں جو قتل حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی مذمت میں نیز ان کے جنتی ہونے اور ان قاتلوں کے جہنمی ہونے کے بارے میں صحابہ کرام اور

Www.Ahlehaq.Com

تابعین عظام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے منقول و ثابت ہیں تو اس کیلئے بڑا دفتر درکار ہوگا۔
ان چند مشہور روایات سے بھی یہ ثابت ہوگیا کہ یہ کہنا کہ آپ کا لاشہ تین دن بے گور و کفن پڑا رہا صریحاً جھوٹ اور افتراء ہے جس کی تکذیب و تردید تمام تاریخی کتابوں میں موجود ہے! اس لئے کہ اس بات پر تمام مورخین متفق ہیں کہ آپ کی شہادت ۱۸ ذی الحجہ بروز جمعہ بعد عصر واقع ہوئی۔ اور ہفتہ کی رات کو آپ کی تدفین عمل میں آئی۔
پھر جس ذات گرامی قدر کی نسبت سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ شہادت موجود ہو کہ وہ بلا حساب و کتاب جنت میں جائیں گے اور شہادت بھی ایسی جو تواتر کی حد تک ثابت ہے تو اب وہ کون سی شہادت ہے جس کی ضرورت باقی رہتی ہے!
مناسب ہے کہ اس عنوان کو یہیں ختم کر کے دوسرے عنوانات کو لیں۔ اہل انصاف اور صاحب بصیرت اہل ایمان کے لئے یہ بیان کردہ حصہ ہی کافی و شافی ہے! اور ہدایت دینے والا تو اللہ ہی ہے!

مطاعن ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا۔

اعتراض۔ (۱) یہ پاک بی بی مدینہ سے مکہ گئیں اور پھر وہاں سے بصرہ! حالانکہ ازواج مطہرات (رضی اللہ عنہن) کو خدا تعالیٰ نے گھروں سے باہر نکلنے سے منع اور گھروں میں ٹھہرے رہنے کا حکم فرمایا ہے۔ لہٰذا ان کے لئے یہ کب مناسب تھا کہ رسول کی عزت کی حفاظت کرنے کے بجائے سولہ ہزار کے "اوباش" لشکر کے ساتھ نکل پڑتیں۔

جواب:۔ اگر آیت حجاب، سے گھر میں ٹھہرے رہنا اور باہر مطلقاً نہ نکلنا مراد ہوتا تو نزول آیت کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان محترمات طیبات کو نہ حج وعمرہ کے لئے جانے کی اجازت دیتے نہ غزوات میں ساتھ لے جاتے! نہ ہی والدین سے ملاقات، مریضوں کی عیادت، اور مردوں کی تعزیت کے لئے باہر جانے کی اجازت مرحمت فرماتے۔ اس لئے آیت کا جو مطلب معترضین نے نکالا ہے وہ قطعاً غلط ہے۔ اس ممانعت اور حکم سے صرف حجاب اور پردہ کی تاکید مقصود و مراد ہے۔ کہ دیگر چادر پوش عورتوں کی طرح کوچہ و بازار میں ادھر اُدھر نہ پھرتی پھریں! اور سفر کرنے میں حجاب اور پردہ کے خلاف کوئی بات نہیں۔ آج اس (گئے گذرے) زمانے میں بھی پردہ نشین خواتین، ستر و حجاب کی پابندیوں کے ساتھ سفر کے لئے نکلتی ہیں۔ خاص طور پر وہ سفر جو دینی ملی یا دنیاوی مصالح پر مبنی ہو، جیسے حج وعمرہ، جہاد وغیرہ۔
تو ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا یہ سفر بھی اس نوعیت کا تھا کہ مسلمانوں میں باہم رخنہ پڑ گیا ہے اسکی اصلاح ہو، اور امام عادل کے قتل کے قصاص کے مطالبہ میں سب مسلمان متفق و شریک ہوں۔ آپؓ کا یہ سفر حج وعمرہ کے سفر کی مانند تھا۔ آج بھی اگر یہ کہا جائے کہ فلاں عورت گھر میں بیٹھنے والی ہے باہر نہیں نکلتی۔ تو اس سے کیا مطلب لیا جاتا ہے۔ خود ہی غور کر لیں، انصاف کو کام میں لائیں۔ ہٹ دھرمی نہ کریں۔
(اگر اس سیدھے سادے علمی جواب سے انکی تسلی نہ ہوتی ہو تو مجبوراً ہم) ایک جواب اور دیتے ہیں۔ کہ خلافت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ میں جب اہل بیت کے "حقوق سلب" ہوئے تو جناب علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ (بقول شیعہ راوی) بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، خاتون جنت بی بی فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہا کو سوار کر کے مدینے کے محلوں، اور انصار کے گھروں میں خانہ بخانہ رات کو گشت کراتے اور امداد و معاونت طلب فرماتے تھے۔ یہ روایت شیعہ حضرات کے نزدیک مشہور اور متواتر ہے اور ان کی کتابوں میں موجود ہے۔ اب یہاں غور کا مقام ہے کہ ننگ و ناموس کے تحفظ کے معاملہ میں بیٹی، بیوی سے زیادہ نہ ہو تو کم بھی نہیں ہوتی۔ اب دیکھئے ناموس رسول کے گھر سے سفر کے لئے نکلنے اور اپنے خیمہ یا مستقر میں قیام کرنے، اور دوسروں کے گھروں میں نہ جانے، اور در بدر پھرنے میں آخر کوئی تفاوت و فرق ہے یا نہیں۔ اور پھر دو تین گاؤں ضبط ہونے کا ضرر تو ذاتی اور انفرادی ہو سکتا تھا اور قتل خلیفہ نے تو پوری امت کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اس میں دنیا ہی نہیں دین کا بھی ایسا ضرر تھا جس کی لپیٹ میں

پوری ملت مسلمہ آگئی تھی!

تو ذاتی نقصان کے تدارک کے لئے سفر کرنے، اور پوری ملت کے نقصان کی تلافی کرانے کے لئے سفر کرنے میں جو فرق وہ صاف ظاہر ہے، اس سے کون انکار کرسکتا ہے، اس لئے جب وہ سفر قابل طعن نہیں تو یہ سفر کس منطق سے قابل اعتراض قرار پاسکتا ہے!

ایک اور جواب یہ ہے کہ تمام ازواج مطہرات مثلاً ام المومنین حضرت ام سلمہ اور ام المومنین حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا جو شیعوں کے نزدیک بھی محترم و مقبول و معتبر ہیں حج وعمرہ کے لئے گھروں سے باہر تشریف لے جاتی تھیں۔ بلکہ ام المومنین ام سلمہ رضی اللہ عنہا تو اس سفر میں ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ مکہ مکرمہ تک شریک سفر تھیں، اور آپ کی خواہش تو یہ تھی کہ ام المومنین حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ ہی آگے بھی جائیں۔ مگر عمر بن ابی سلمہ رضی اللہ عنہ نے جو آپ کے بیٹے تھے اپنی کسی مصلحت سے ان کو روک دیا۔

یہ عجیب دھاندلی ہے کہ اللہ تعالیٰ تو حجاب وستر کو ملحوظ رکھتے ہوئے ازواج مطہرات کو سفر کی اجازت مرحمت فرمائیں اور یہ خدائی خوار اس پر طعن وتشنیع کریں! ملاحظہ فرمائیے خدائی اجازت!

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِأَزْوَاجِكَ وَبَنَاتِكَ وَنِسَاءِ الْمُؤْمِنِينَ يُدْنِينَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيبِهِنَّ ۚ ذَٰلِكَ أَدْنَىٰ أَنْ يُعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ ۗ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَحِيمًا۔

اے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنی بیویوں بیٹیوں اور مسلمان عورتوں سے کہدیجئے کہ وہ اپنے اوپر چادر ڈال رکھیں یہ ان کے لئے ایک پہچان ہے تاکہ وہ ایذا نہ پہنچائی جائیں۔ اور اللہ غفور رحیم ہے۔

اور حدیث صحیح سے یہ ثابت ہے کہ اس آیت کے نازل ہونے کے بعد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ أُذِنَ لَكُنَّ أَنْ تَخْرُجْنَ لِحَاجَتِكُنَّ۔ (اپنی ضروریات کے لئے تمکو گھروں سے باہر نکلنے کی اجازت دیدی گئی)۔ ہاں سفر کے لئے محرم کا ہونا شرط ہے، تو آپ (رضی اللہ عنہا) کے اس سفر میں سگے بھانجے حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ آپ کے ہمراہ تھے۔ پھر آپ کی بہن ام کلثوم بنت ابی بکر صدیق کے شوہر جناب طلحہ بن عبیداللہ (رضی اللہ عنہم) بھی ساتھ تھے اور دوسری بہن جناب اسماء بنت ابی بکر کے شوہر حضرت زبیر بن عوام۔ (رضی اللہ عنہم) بھی ہمرکاب تھے۔ اور ان دونوں کی اولادیں بھی شریک سفر تھیں۔

ابن قتیبہ جس کی کتاب پر شیعوں کو کتاب اللہ سے زیادہ اعتماد ہے اپنی تاریخ میں رقمطراز ہے۔

لَمَّا بَلَغَهَا بَيْعَةُ عَلِيٍّ أَمَرَتْ أَنْ يُعْمَلَ لَهَا هَوْدَجٌ مِنْ حَدِيدٍ فِيهَا مَوْضِعُ الدُّخُولِ وَالْخُرُوجِ فَخَرَجَ وَابْنَا طَلْحَةَ وَالزُّبَيْرِ مَعَهَا۔

جب حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کی اطلاع ملی تو آپ نے ایک آہنی (ھودج) بنوایا جس میں اترنے چڑھنے کا راستہ بھی رکھا۔ پھر جناب طلحہ کے دونوں بیٹوں اور جناب زبیر رضی اللہ عنہم کی معیت میں سفر کے لئے روانہ ہوگئیں۔

پھر ازواج مطہرات تو امہات المومنین ہیں ! اس حیثیت سے باعتبار احترام وعزت پوری امت انکی اولاد ہے۔ اسی لئے تمام علمائے امت کا مذہب یہی ہے کہ امت کے کسی بھی فرد کی معیت میں ان کو سفر کرنا جائز ہے!

یہی وجہ تھی کہ خلیفہ ثانی امیرالمومنین عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد خلافت میں ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کو سفر حج کے لئے بھیجا تو جناب عثمان غنی اور عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہما کو ان کے ہمراہ روانہ کیا اور فرمایا تم ان کے سعادت مند بیٹے ہو۔ اس لئے تم میں سے ایک ان کی سواری کے آگے رہے۔ اور دوسرا پیچھے! اور ان سب سے قطع نظر خود قرآنی آیت کے الفاظ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَىٰ۔ سے صاف پتہ چلتا ہے کہ مطلق نکلنے سے منع نہیں فرمایا، بلکہ جاہلیت اولیٰ کے طریق پر بنا ؤ سنگار کی نمائش کرتے ہوئے نکلنے کو منع فرمایا، تو اس نہی سے استدلال نہیں رہا۔ اب رہی یہ بات وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ کی، تو یہ پہلے معلوم ہوچکا ہے کہ شیعوں کے نزدیک امر وجوب کے لئے متعین نہیں

توپھر اس کے خلاف کرنے سے خرابی کیسے لازم آسکتی ہے!

اعتراض ۔ (۲) کہتے ہیں کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے خون عثمان شہید رضی اللہ عنہ کے قصاص کے لئے سفر اختیار فرمایا حالانکہ ان کا کوئی تعلق نہ تھا، نہ وہ وارث تھیں اور نہ کوئی رشتۂ قرابت تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ آپ کو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے دشمنی وعناد تھا۔ اسی لئے ان کے خلاف فتنہ برپا کیا۔ جبکہ اس سے پہلے خود لوگوں کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل پر برانگیختہ فرمایا کرتی تھیں، اور فرماتی تھیں اُقْتُلُوْا نَعْثَلاً۔ چنانچہ ابن قتیبہ نے اپنی کتاب میں ذکر فرمایا ہے۔

اِنَّ عَائِشَةَ اَتَاهَا خَبَرُ بَيْعَةِ عَلِيٍّ وَكَانَتْ خَارِجَةً مِّنَ الْمَدِيْنَةِ فَقِيْلَ لَهَا قُتِلَ عُثْمَانُ وَبَايَعَ النَّاسُ عَلِيًّا فَقَالَتْ مَا اُبَالِيْ اَنْ تَقَعَ السَّمَآءُ عَلَى الْاَرْضِ قُتِلَ وَاللّٰهِ مَظْلُوْمًا وَاَنَا طَالِبَةٌ بِدَمِهٖ فَقَالَ عُبَيْدٌ اَوَّلُ مَنْ حَمَشَ عَلَيْهِ وَاَطْمَعَ النَّاسَ فِيْ قَتْلِهٖ لَاَنْتِ وَلَقَدْ قُلْتِ اُقْتُلُوْا نَعْثَلاً فَقَدْ فَجَرَ فَقَالَتْ عَائِشَةُ قَدْ وَاللّٰهِ قُلْتُ وَقَالَ النَّاسُ فَقَالَ عُبَيْدٌ فَمِنْكِ الْبَدَاءُ وَمِنْكِ الْغِيَرُ وَمِنْكِ الرِّيَاحُ وَمِنْكِ الْمَطَرُ وَاَنْتِ اَمَرْتِ بِقَتْلِ الْاِمَامِ وَقُلْتِ لَنَا اِنَّهٗ قَدْ فَجَرَ۔

جب آپ مدینہ منورہ سے باہر تھیں تب حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کی ان کو اطلاع ملی، آپ کو بتایا گیا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ قتل کر دیئے گئے اور لوگوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بیعت کر لی۔ آپ نے اسوقت فرمایا۔ آسمان بھی ٹوٹ پڑے تو بھی مجھے کوئی پرواہ نہیں۔ اللہ کی قسم وہ مظلوم قتل کیئے گئے۔ اور میں ان کے خون کا مطالبہ کرتی ہوں۔ عبید نے ان سے کہا سب سے پہلے جس نے لوگوں کو بھڑکایا اور ان کے قتل پر ابھارا وہ آپ ہی تھیں، اسوقت آپ نے کہا تھا کہ نعثل کو مار ڈالو کہ وہ فاجر ہوگیا ہے۔ اس پر جناب صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ بے شک میں نے ایسا کہا اور لوگوں نے بھی کہا اس پر عبید نے کہا کہ اس کی ابتدا بھی آپ نے کی اور اس میں تبدیلی بھی آپ ہی کی طرف سے ہو رہی ہے۔ آپ ہی کی طرف سے ہوا بھی ہے، اور آپ ہی کی طرف سے بارش بھی۔ امام کے قتل کا آپ ہی نے ہمیں حکم دیا کہ وہ فاجر ہوگئے ہیں،،

جواب:۔ اس اعتراض کے جواب میں اول تو یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیئے کہ خلیفہ عادل کے خون کا بدلہ لینا ہر مسلمان کا حق ہے۔ ورثہ کے ساتھ یہ حق مخصوص نہیں! کیونکہ خلیفہ عادل۔ اموال کی حفاظت اور فیئے وغنائم کے انتظام وتقسیم میں تمام مسلمانوں کا نائب ہوتا ہے۔ پھر حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا جو ام المؤمنین اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حرم محترم ہیں، اس مطالبہ کے کرنے کی عام مسلمانوں سے زیادہ حقدار تھیں۔ احکام الٰہی کے نفاذ کے لئے وہ کیوں تگ و دو نہ فرمائیں۔ خصوصًا قصاص جیسے اہم دینی معاملہ میں! جبکہ وہ قصاص بھی ایک مظلوم کا ہو جسے خلافت وامارت کا مالک ہوتے ہوئے بلا کسی شرعی وجہ کے قتل کر دیا ہو۔ اور حضرت عائشہ وحضرت علی رضی اللہ عنہما کے باہم دلی بغض وعناد کا تو کسی مسلمان کا دل میں تصور تک نہیں آسکتا۔ ہر مسلمان ایسے خیال وتصور سے اللہ کی پناہ مانگتا ہے یہ محترم ومقدس ہستیاں تو ایک دوسرے کے فضائل ومناقب میں رطب اللسان ہیں۔ چنانچہ دیلمی نے حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا کے حوالہ سے یہ روایت بیان کی ہے وہ فرماتی ہیں کہ قَالَ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حب علی عبادۃ۔ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ علی رضی اللہ عنہ کی محبت عبادت کا درجہ رکھتی ہے) آپؓ کا سفر حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جنگ وجدال کا نہیں تھا، قتل سے باہم جو کشیدگی پڑ گئی اور دلوں میں جو گرہ لگ گئی تھی اس کی اصلاح اور باہم صلح وصفائی اور خون عثمان کا قصاص مقصد سفر تھا۔ ان کا مقصد صرف یہ تھا کہ قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ سے قصاص لیا جائے اور ان کو جناب امیر رضی اللہ عنہ کے لشکر سے نکال دیا جائے۔ اور قاتلین عثمان کی دھمکیوں اور ڈراوے میں آکر جناب طلحہ وزبیر اور دیگر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم مدینہ چھوڑ کر ادھر اُدھر منتشر ہوگئے تھے، مطمئن ہو کر جناب امیر رضی اللہ عنہ کے رفیق

www.Ahlehaq.com

ومعاون نبیں؛ اور باہم اتفاق ومودت سے خلافت کا نظام حسن وخوبی کے ساتھ انجام پذیر ہوتا ہے ۔ ادھر جناب امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اور دیگر مخالفین بھی حد سے زیادہ آگے نہ بڑھیں ۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے جسے جھٹلانا کسی کے بس میں نہیں کہ قاتلین عثمان نے بعد قتل، حضرات طلحہ وزبیر اور دیگر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کو قتل کی دھمکیاں دیں ۔ اور علی الاعلان منافقانہ گفتگو کرتے رہے ۔

وہی بات حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا کی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل پر لوگوں کے اکسانے کی تو یہ ابن قتیبہ، ابن اعثم کوفی اور سماطی، کا پیشہ ورانہ جھوٹ اور افتراء ہے ۔ یہ تو مشہور کذابوں میں گنے جاتے ہیں ۔ چنانچہ جنگ جمل اور دوسری لڑائیوں کی جو رپورٹنگ انہوں نے کی ہے ۔ وہ شیعہ وسنی دونوں کے نزدیک افتراء اور بہتان پر مبنی ہے (یہ جھوٹے اور مفتری واقعات میں کہ یہ شیعہ سے آگے بڑھ کر واقعات تخلیق کرنے میں بدنام ہیں) یہ عدد رجہ ناانصافی اور بغض وعناد کا گھناؤنا اظہار ہے کہ زوجہ محبوبہ، رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی شان اللہ اور رسول کی شہادت کو بالائے طاق رکھ کر چند اخوان الشیاطین جھوٹے اور بے ایمان کو فیوں کا دم چھلا بنجائیں (اور انہیں کی تال پر ناچنے لگیں) اور ان کی اتباع و پیروی میں اپنے ایمان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھیں ۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ۔

اَلطَّيِّبَاتُ لِلطَّيِّبِيْنَ وَالطَّيِّبُوْنَ لِلطَّيِّبَاتِ اُولٰئِكَ مُبَرَّءُوْنَ مِمَّا يَقُوْلُوْنَ لَهُمْ مَغْفِرَةٌ وَرِزْقٌ كَرِيْمٌ ۔

پاک باز عورتوں پاک مردوں کے لئے اور پکباز مرد پاک عورتوں کے لئے زیبا ہیں ان کے متعلق جو کچھ کہتے ہیں وہ اس سے پاک دامن ہیں ان کے لئے مغفرت اور اچھا رزق ہے !

اہل سنت حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی بابت ابن قتیبہ کی بات کو کس طرح وقعت دے سکتے ہیں جبکہ ترمذی، ابن ماجہ اور ابو حاتم رازی نے بطریق متعدد یہ روایت کی ہے کہ سیدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی تھیں ۔

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِعُثْمَانَ ۔ يَا عُثْمَانُ لَعَلَّ اللّٰهُ يُقَمِّصُكَ قَمِيْصًا فَاِنْ اَرَادُوْكَ عَلٰى خَلْعِهٖ فَلَا تَخْلَعْهُ لَهُمْ ثَلَاثًا ۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے مخاطب ہو کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تین مرتبہ فرمایا اے عثمان، شاید اللہ تعالیٰ تمہیں کوئی پوشاک پہنائے ۔ اگر لوگ وہ پوشاک اتارنا چاہیں تو تم ان کی خاطر وہ پوشاک نہ اتارنا ۔

اعتراض ۔ (۴) تیسرا اعتراض یہ ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے نہ صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت فرمائی بلکہ اس پر جمی بھی رہیں ۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ نعیم بن حماد نے کتاب الفتن میں اور محمد بن مسکویہ نے تجارب الامم میں، اور ابن قتیبہ نے کتاب السیاست میں ایک روایت یوں بیان کی ہے کہ جب جناب صدیقہ رضی اللہ عنہا کا ایک لشکر راستہ میں ایک ایسے مقام سے گذرا جہاں پانی تھا ۔ تو وہاں کتوں نے بھونکنا شروع کر دیا، جناب صدیقہ رضی اللہ عنہا نے محمد بن طلحہ رضی اللہ عنہ سے پوچھا اس پانی کا کیا نام ہے ۔ انہوں نے بتایا کہ اسے حوأب کہتے ہیں بسنکر آپ فرمانے لگیں مجھے یہاں سے واپس لے چلو؛ جناب محمد بن طلحہ رضی اللہ عنہ نے پوچھا آخر کیوں ؟ آپ نے فرمایا میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی ازواج سے یہ فرماتے سنا ہے !

كَاَنِّيْ بِاِحْدٰكُنَّ تَنْبَحُهَا كِلَابُ الْحَوْاَبِ فَاِيَّاكِ اَنْ تَكُوْنِيْ يَا حُمَيْرَاءُ ۔

گویا میں تم میں سے ایک پر حوأب کے کتوں کو بھونکتا دیکھتا ہوں ۔ تو اے حمیرا تم وہ نہ ہونا ۔

پس یہ ممانعت یاد ہونے کے باوجود آپ وہاں سے واپس نہ ہوئیں ۔

جواب :۔ جو روایات ان لوگوں نے بیان کی ہیں ان سے بھی یہ بات تو ظاہر ہوتی ہے کہ جناب صدیقہ رضی اللہ عنہا نے واپسی کا ارادہ فرمایا ۔ اور اہل سنت کی روایات میں بصراحت آپ کے یہ الفاظ ملتے ہیں رُدُّوْنِيْ رُدُّوْنِيْ ۔ (مجھے واپس لے چلو ۔ واپس لے چلو) اسی کے ساتھ ان کی روایات میں بطور تتمہ یہ بیان کیا گیا ہے کہ آپ نے واپسی میں پس وپیش کیا ۔ مگر اہل لشکر نے اس سلسلہ میں آپؓ سے موافقت نہ کی اور

www.Ahlehaq.com

www.Ahlehaq.com

باہم اختلاف رائے پیدا ہوا۔ اسی دوران مروان بن حکم رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے لشکری قریب کے دیہات و آبادی سے اسی ایسے افراد کو بطور گواہ لائے یہ کہتے تھے کہ یہ پانی حَوّاب نہیں کہلاتا، بلکہ وہ کوئی اور پانی ہے۔ اس گواہی کے بعد آپ رضی اللہ عنہا کے آگے روانہ ہوئیں۔ یہ جواب تو روایت کے مقابلہ میں روایت سے تھا۔ اب از روئے درایت ایک اور جواب ملاحظہ فرمائیے، کہ

حدیث میں پانی پر سے گذرنے کی ممانعت نہیں ہے۔ بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک معصیت سے جو ان میں سے کسی ایک کو پیش آسکتی ہے اس سے خبردار فرما رہے ہیں، اس حدیث سے نہی سمجھنا اور مخالفت رسول پر اصرار اور ضد کی نسبت حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا کی طرف کرنا کس طرح ممکن ہے خاص کر اس صورت میں جبکہ "اِیَّاکِ ان تکونی یا حُمَیرَاءُ" کے الفاظ اہل سنت کی معتبر و مستند کتابوں میں موجود ہی نہیں ہیں: اور اگر بالفرض موجود بھی ہوں تو ان کا مطلب وہی ہوگا جیسے کوئی سربراہ خاندان افراد خاندان کو اونچ نیچ سمجھاتے ہوئے آئندہ پیش آنے والے خطرات و خدشات سے آگاہ کرے۔ اور ان سے ڈرائے۔ جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد اسی قسم کی پیش بینی اور احتیاط کے لئے تھا۔ یہ شرعی نہی تھی جس کی مخالفت معصیت کہلاتی ہے۔ صراحتاً شرعی نہی کی عدم موجودگی میں آپ رضی اللہ عنہا کے عمل کو معصیت قرار دے کر طعن کرنا سوائے تعصب و بغض و عناد کے کچھ نہیں!

یہ واقعہ اوراق گذشتہ میں آپ دیکھ چکے ہیں کہ ایک شب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاں تشریف لے گئے اور نماز تہجد کی تاکید فرمائی مگر آپ نے جواباً قسم کھا کر کہا کہ ہم سوائے فرض کے ہرگز کوئی نماز نہ پڑھیں گے۔ وَاللہ لانصلی الاما کتب اللہ لنا۔ یہ سن کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم واپس لوٹے تو اپنے زانو پیٹتے یہ فرماتے جا رہے تھے۔ (انسان کتنا جھگڑالو ہے) اب ذرا دونوں جگہوں کی مخالفت کا موازنہ کرلیں (تو کیا فیصلہ ہے شیعہ حضرات کا جناب امیر علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے متعلق۔) حقیقت میں بنظر انصاف دیکھا جائے تو ام المومنین حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا تو اپنے اصرار میں معذور رہی تھیں، مکہ مکرمہ سے روانگی کے وقت ان کو کہاں معلوم تھا کہ راستہ میں چشمہ حواب بھی پڑے گا۔ اور اس پر سے گذرنا ناگزیر بھی ہوگا۔ اور پھر وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ یہ وہی مقام ہے، تو واپسی کا ارادہ بھی کیا۔ مگر لشکر نے اس کی موافقت نہ کی۔ اس لئے اس پر عمل نہ ہوسکا۔ اور پھر حدیث میں بھی اس کی تصریح نہیں ہے کہ اگر ایسا واقعہ پیش آجائے تو کیا کرنا چاہئے! آپ کا مقصد سفر چونکہ باہم صلح وصفائی بین المسلمین تھا جو اپنی جگہ اہم تو ہے ہی مگر شرعاً اس کا حکم بھی ہے۔ اسی کے پیش نظر آپ نے سفر جاری رکھا۔

اعتراض۔ (۴) یہ ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا لشکر بصرہ پہنچا۔ تو اس نے بیت المال لوٹ لیا۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے عامل عثمان بن حنیف انصاری رضی اللہ عنہ کو جو صحابی تھے۔ اہانت کے ساتھ نکال دیا۔

جواب۔ یہ ہے کہ یہ واقعہ نہ آپ کے اشارہ سے ہوا۔ اور نہ آپکی مرضی سے ہوا۔ اور جب آپ کو اطلاع ہوئی تو آپ نے نہ صرف یہ کہ جناب عثمان انصاری رضی اللہ عنہ سے عذر و معذرت کی بلکہ حد سے زیادہ ان کی دلجوئی فرمائی۔ اور ان کا دل خوش کرنے کے لئے مقدور بھر کوشش فرمائی۔ تاریخ میں اسی جیسا ایک اور واقعہ بھی محفوظ ہے۔ کہ جناب امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ایک لشکری مالک اشتر اور اس کے ساتھیوں کے ہاتھوں عہد عثمانی کے ایک گورنر جناب ابوموسیٰ اشعری صحابی رضی اللہ عنہ کا کوفہ میں گھر جلایا گیا۔ مال و اسباب لوٹا گیا۔ تو کیا ان کے نزدیک یہ بھی طعن کی بات ہے؟ اگر نہیں تو لشکریان عائشہ رضی اللہ عنہا کے ہاتھوں بیت المال لٹنے سے جناب صدیقہ رضی اللہ عنہا پر طعن کیوں۔ اگر ہو تو دونوں جگہ ہو، ورنہ کہیں بھی نہیں۔ جیسا کہ سنیوں کا مسلک ہے! اور پھر ان دونوں واقعات میں قابل لحاظ و غور ایک نمایاں اور بنیادی فرق بھی ہے۔ یہاں بیت المال پر دست درازی ہوئی۔ جس میں ان دست درازوں کا بھی حق و حصہ تھا۔ جناب عثمان انصاری عامل بصرہ کی ذاتی املاک واموال پر دست درازی نہیں کی گئی مگر وہاں ذاتی املاک لوٹی گئیں۔ جلائی گئیں اور تباہ کر دی گئیں!

اور پھر یہاں جو کچھ ہوا آخری چارہ کار کے طور پر ہوا۔ ان کے زندہ رہنے اور بقا کے لئے کوئی صورت چھوڑی نہیں گئی۔ واقعہ یوں ہے کہ جناب

طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہما نے اول جناب عثمان انصاری رضی اللہ عنہ کو پیغام بھیجا کہ خلیفہ شہید رضی اللہ عنہ کے قصاص کی خاطر ہمارے ساتھ مسلمانوں کی ایک جمعیت آئی ہے۔ ہم جو زادِ راہ لے کر چلے تھے وہ ختم ہوگیا اگر آپ بیت المال کے اموال ہمارے پاس لے آئیں تو ان میں تقسیم کر دیئے جائیں۔ جناب عثمان رضی اللہ عنہ نے نہ صرف اس سے انکار کیا بلکہ آمادۂ پیکار ہوئے، اور حکم جاری کیا کہ کوئی لشکری بصرہ میں داخل نہ ہونے پائے، کھانا پینا، دانہ، چارہ سب بند کر دیا۔ جب لشکر کی جان کے لالے پڑ گئے، تو معاملہ برداشت سے باہر ہوگیا۔ لشکر میں جو اکثر طمزاج لوگ تھے۔ اور اسوقت کے حالات کے مطابق ایسے لوگوں کو پورے طور پر قابو میں رکھا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ چنانچہ وہ بلہ کرکے شہر میں گھس گئے اور بیت المال کو جس میں ان کا حق بھی تھا لوٹ لیا۔ تو ایسی صورت میں اعتراض اور برہمی کی کہاں گنجائش!

اور اس سب کچھ کے باوجود اہل سنت میں کوئی بھی جب حضرت عائشہ، وطلحہ وزبیر رضی اللہ عنہم تک کو "معصوم" نہیں کہتا، تو لشکریوں کی عصمت کا کون قائل ہوگا کہ ان سے اس قسم کے اعمال کے صدور سے عقیدہ میں فرق آئے!

اور جب جناب طلحہ وزبیر رضی اللہ عنہما قتل کئے گئے، ام المؤمنین زوجہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی توہین جناب امیر رضی اللہ عنہ کے لشکریوں کے ہاتھوں وقوع پذیر ہوئی۔ تو ان کے عقیدہ میں فرق کیوں نہیں پڑا۔ جب کہ باعتبار مراتب جناب عثمان انصاری کو جناب صدیقہ رضی اللہ عنہا سے کوئی نسبت ہی نہیں۔ پھر اس قسم کے واقعات کے صدور سے ان کے عقیدہ میں کیوں خلل پیدا ہوگا۔

مجشر بن زیاد الضبی راوی ہے کہ میں نے احنف بن قیس کو یہ کہتے ہوئے سنا۔

لَمَّا ظَهَرَ عَلِيٌّ عَلَى أَهْلِ الْجَمَلِ أَرْسَلَ إِلَى عَائِشَةَ ارْجِعِي إِلَى الْمَدِينَةِ قَالَ فَأَبَتْ قَالَ فَأَعَادَ إِلَيْهَا الرَّسُولُ وَاللهِ لَتَرْجِعَنَّ أَوْ لَأَبْعَثَنَّ إِلَيْكِ نِسْوَةً مِنْ بَكْرِ بْنِ وَائِلٍ مَعَهُنَّ شِفَارٌ حِدَادٌ يَأْخُذْنَكِ بِهَا فَلَمَّا رَأَتْ ذٰلِكَ خَرَجَتْ۔ رَوَاهُ أَبُوْ بَكْرِ بْنُ أَبِي شَيْبَةَ فِي الْمُصَنَّفِ۔

جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اہل جمل پر قابو پالیا تو حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا سے کہلوایا کہ آپ مدینہ منورہ واپس چلی جائیں آپ نے انکار فرمایا۔ تو دوبارہ قاصد بھیجا کہ واللہ یا تو آپ واپس چلی جائیں گی، یا پھر میں بکر بن وائل کی خنجر بردار عورتوں کو بھیجوں گا کہ وہ آپ کو ان کے ذریعہ قابو کر لیں گی۔ جناب صدیقہ رضی اللہ عنہا نے جب یہ صورت حال دیکھی تو آپ مدینہ روانہ ہوئیں۔ (ابوبکر بن شیبہ نے اپنی مصنف میں اسے روایت کیا۔)

اعتراض۔ (۵)

یہ ہے کہ جناب صدیقہ رضی اللہ عنہا نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا راز افشا کر دیا جس پر آیت قرآنی نازل ہوئی

وَإِذْ أَسَرَّ النَّبِيُّ إِلَىٰ بَعْضِ أَزْوَاجِهِ حَدِيثًا فَلَمَّا نَبَّأَتْ بِهِ وَأَظْهَرَهُ اللهُ عَلَيْهِ عَرَّفَ بَعْضَهُ وَأَعْرَضَ عَنْ بَعْضٍ فَلَمَّا نَبَّأَهَا بِهِ قَالَتْ مَنْ أَنْبَأَكَ هَٰذَا قَالَ نَبَّأَنِيَ الْعَلِيمُ الْخَبِيرُ

جب نبی نے اپنی کسی بیوی سے بطور سرگوشی ایک بات کہی تو ان بیوی نے وہ بات بیان کر دی۔ جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی پہ ظاہر کر دیا کہ بعض کو یہ بات بتادی اور بعض سے چھپالی، اور جب نبی نے اپنی بیوی کو بتایا کہ تم نے ایسا کیا، تو وہ کہنے لگیں آپ کو یہ کس نے بتایا۔ آپ نے فرمایا مجھے علیم وخبیر (خدا) نے بتایا۔"

جواب: مفسرین اس پر متفق ہیں کہ راز حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے افشا کیا تھا کیونکہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جناب ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ دروازہ کی درز سے اپنے بستر پر دیکھا تھا۔ اور جناب حفصہ رضی اللہ عنہا سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرما چکے تھے کہ میں نے ماریہ کو اپنے لئے حرام کر لیا ہے۔ تو تم میرا یہ راز چھپائے رکھنا کسی سے ذکر نہ کر دینا۔"

مگر آپ اس خوشی میں جو ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا کے حرام کر لینے کی خبر سے انہیں ہوئی تھی کتمان راز کی تاکید کو بھول گئیں، اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر یہ راز فاش کر دیا اور اسی وجہ سے جناب ماریہ رضی اللہ عنہا سے بھی یہ واقعہ کہہ ڈالا۔ وہ تحریم کے معاملہ کے بجائے "راز کی بات" اس واقعہ کو

www.Ahlehaq.com

سمجھتی رہیں جو در سے انہوں نے دیکھا تھا اس لئے تحریم کی بات کہہ ڈالی۔

ان حالات کے پیش نظر حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی طرف افشاء راز کی نسبت کرنا محض تہمت و افتراء ہے؟

اور پھر حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے متعلق اہل سنت کا جو عقیدہ ہے، اس میں ان کا یہ عمل بھی کوئی خلل نہیں ڈالتا۔ اس لئے کہ امر، اگر وجوب کیلئے بھی ہو، استحباب مقصود نہ ہو، تب بھی زیادہ سے زیادہ یہی کہا جائے گا کہ خلاف وجوب معصیت اور گناہ ہے۔ اور آیت کا جملہ "ان تتوبا الی اللّٰہ" صاف بتاتا ہے کہ اس معصیت سے توبہ مقبول ہے۔ اور بالاجماع یہ بات بھی ثابت ہے کہ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے توبہ کی اور وہ مقبول ہوئی۔ اور آپ آخر دم تک ازواج مطہرات میں داخل رہیں، اور خوشخبری پائی۔

طبرسی کی مجمع البیان جو شیعوں کی معتبر تفسیر سمجھی جاتی ہے اس میں طبرسی کہتا ہے۔

قِيلَ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَسَّمَ الْاَيَّامَ بَيْنَ نِسَآئِهِ فَلَمَّا كَانَ يَوْمُ حَفْصَةَ قَالَتْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ لِيْ اِلٰى اَبِيْ حَاجَةً فَاْذَنْ لِيْ اَنْ اَزُوْرَهُ فَاَذِنَ لَهَا فَلَمَّا خَرَجَتْ اَرْسَلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِلٰى جَارِيَتِهِ مَارِيَةَ الْقِبْطِيَّةِ اُمِّ اِبْرَاهِيْمَ وَقَدْ كَانَ اَهْدَاهَا الْمُقَوْقِسُ فَاَدْخَلَهَا بَيْتَ حَفْصَةَ فَوَقَعَ عَلَيْهَا فَاَتَتْ حَفْصَةُ فَوَجَدَتِ الْبَابَ مُغْلَقًا فَجَلَسَتْ عِنْدَ الْبَابِ فَخَرَجَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَوَجْهُهُ يَقْطُرُ عَرَقًا فَقَالَتْ حَفْصَةُ اِنَّمَا اَذِنْتَ لِيْ مِنْ اَجْلِ هٰذَا۔ اَدْخَلْتَ اَمَتَكَ بَيْتِيْ ثُمَّ وَقَعْتَ عَلَيْهَا فِيْ يَوْمِيْ وَعَلٰى فِرَاشِيْ اَمَا رَاَيْتَ لِيْ حُرْمَةً وَحَقًّا فَقَالَ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلَيْسَ هِيَ جَارِيَتِيْ قَدْ اَحَلَّ اللّٰهُ ذٰلِكَ لِيْ اُسْكُتِيْ فَهِيَ حَرَامٌ عَلَيَّ اَلْتَمِسُ بِذٰلِكَ رِضَاكِ وَلَا تُخْبِرِيْ بِذٰلِكَ اِمْرَاَةً مِنْهُنَّ وَهُوَ عِنْدَكِ اَمَانَةٌ فَلَمَّا خَرَجَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَرَعَتْ حَفْصَةُ الْجِدَارَ الَّذِيْ بَيْنَهَا وَبَيْنَ عَائِشَةَ فَقَالَتْ اَلَا اُبَشِّرُكِ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَدْ حَرَّمَ عَلَيْهِ اَمَتَهُ مَارِيَةَ وَقَدْ اَرَاحَنَا اللّٰهُ مِنْهَا وَاَخْبَرَتْ عَائِشَةَ بِمَا رَاَتْ وَكَانَتَا مُتَصَافِيَتَيْنِ مُتَظَاهِرَتَيْنِ عَلٰى سَائِرِ اَزْوَاجِهِ فَنَزَلَتْ يٰاَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَا اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ فَاعْتَزَلَ نِسَآئَهُ تِسْعَةً وَعِشْرِيْنَ يَوْمًا وَقَعَدَ فِيْ مَشْرُبَةِ اُمِّ اِبْرَاهِيْمَ مَارِيَةَ

کہا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ازواج کے مابین باری کے دن مقرر فرما رکھے تھے۔ (ایک مرتبہ) حفصہ رضی اللہ عنہا نے اپنی باری کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ مجھے اپنے والد سے کچھ کام ہے آپ اجازت فرمائیں تو میں ان سے مل آؤں۔ آپ نے ان کو اجازت دیدی جب وہ چلی گئیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اُم ابراہیم جناب ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا کو بلوایا۔ یہ شاہ مصر مقوقس کی طرف سے آپ کو ہدیہ کے طور پر ملی تھیں۔ ان کو آپ جناب حفصہ رضی اللہ عنہا کے مکان میں لے گئے۔ اور صحبت فرمائی اسی دوران حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا واپس آگئیں۔ گھر کا دروازہ بند پاکر باہر دروازہ ہی پر بیٹھ گئیں۔ جب کچھ دیر بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باہر تشریف لائے تو آپ کے چہرہ مبارک سے پسینہ ٹپک رہا تھا۔ تب حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کہنے لگیں کہ آپ نے مجھے اس لئے اجازت دی تھی، کہ میرے گھر، میرے بستر اور میری باری کے دن اس لونڈی سے صحبت فرمائیں۔ آپ نے میری عزت اور حق کا کچھ خیال نہ فرمایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا یہ لونڈی اللہ تعالیٰ نے میرے لئے حلال نہیں کی ہے۔ اچھا شکوہ نہ کرو میں تمہاری دلجوئی کی خاطر اس کو اپنے لئے حرام کرلیتا ہوں۔ مگر اس بات کا ذکر باقی ازواج سے نہ کرنا۔ یہ میرا راز تمہارے پاس امانت ہے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باہر تشریف لے گئے تو حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا دوڑ کر اس دیوار کے پاس گئیں جو ان کے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے گھر کی مشترکہ تھی اور کہنے لگیں خوشخبری سنو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی لونڈی ماریہ رضی اللہ عنہا کو اپنے اوپر حرام کرلیا ہے۔ اور یوں اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے سکون و راحت مہیا فرمادی۔ اور پورا واقعہ جو دیکھا تھا

حَتّٰی نَزَلَتْ اٰیَۃُ التَّخْیِیْرِ وَقِیْلَ اِنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ خَلَا یَوْمًا لِعَائِشَۃَ مَعَ جَارِیَۃِ الْقِبْطِیَّۃِ فَوَقَفَتْ حَفْصَۃُ عَلٰی ذٰلِکَ فَقَالَ لَھَا رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَا تُعْلِمِیْ عَائِشَۃَ بِذٰلِکَ وَحَرَّمَ مَارِیَۃَ عَلٰی نَفْسِہٖ فَاَعْلَمَتْ حَفْصَۃُ عَائِشَۃَ الْخَبَرَ وَاسْتَکْتَمَتْھَا فَاَطْلَعَ اللّٰہُ نَبِیَّہٗ عَلٰی ذٰلِکَ وَھُوَ قَوْلُہٗ وَاِذْ اَسَرَّ النَّبِیُّ اِلٰی بَعْضِ اَزْوَاجِہٖ حَدِیْثًا یَعْنِیْ حَفْصَۃَ وَلَمَّا حَرَّمَ مَارِیَۃَ الْقِبْطِیَّۃَ اَخْبَرَ حَفْصَۃَ اَنَّہٗ یَمْلِکُ مِنْ بَعْدِہٖ اَبُوْ بَکْرٍ وَّعُمَرُ فَعَرَّفَھَا بَعْضَ مَآ اَفْشَتْ مِنَ الْخَبَرِ وَاَعْرَضَ عَنْ بَعْضٍ اَنَّ اَبَا بَکْرٍ وَّعُمَرَ یَمْلِکَانِ بَعْدِیْ۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو سنادیا تھا۔ باقی ازواج مطہرات کی نسبت ان دونوں بی بیوں میں دوستی اور اتفاق کے باہم روابط زیادہ استوار تھے اس پر آیت تحریم یاایھا النبی لم تحرم ما احل اللہ لک نازل ہوئی تو آپ نے انتیس روز تک اپنی ازواج سے کنارہ کشی اختیار فرما کر ام ابراہیم کے بالاخانہ پر قیام فرمایا تاآنکہ آیت تخییر نازل ہوئی۔ بعض راویوں نے یہ کہا کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی باری کے دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا سے خلوت فرمائی تو حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا وہاں موجود تھیں۔ اور ان سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے اس کا ذکر نہ کرنا۔ اور آپؐ نے ماریہؓ کو اپنے اوپر حرام ٹھہرالیا۔ مگر بی بی حفصہ رضی اللہ عنہا نے اس کی اطلاع اس تاکید کے ساتھ کہ کسی سے ذکر نہ کرنا حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا کو کردی جس کی اطلاع اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دیدی۔ اس آیت میں مراد بی بی حفصہ رضی اللہ عنہا مراد ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب جناب ماریہ رضی اللہ عنہا کو اپنے اوپر حرام ٹھہرا لینے کی خبر بی بی حفصہ رضی اللہ عنہا کو دی اسی کے ساتھ یہ خبر بھی دی تھی کہ میرے بعد جناب ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما خلیفہ ہوں گے۔ انہوں نے خبر کا ایک حصہ افشا کردیا اور دوسرا نہیں بتایا۔

اس روایت سے صاف پتہ چلتا ہے کہ افشا حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کی طرف سے ہوا۔ نہ کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے: اور جناب حفصہ رضی اللہ عنہا سے بھی یہ افشا خوشی و فرحت کی زیادتی کے سبب ہوا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کا ارادہ ہرگز نہ تھا۔

اور پھر عیاشی کی وہ روایت جو اس نے جناب باقر رحمہ اللہ علیہ کے حوالہ سے کی ہے اور وہ شیعوں کے نزدیک بہترین محدثین شمار ہوتا ہے۔ وہ صاف رضامندی پر دلالت کرتی ہے کیونکہ اس سے شیخین رضی اللہ عنہما کی خلافت کا علم ہوتا ہے۔ اور اس راز کے افشا پر کوئی عتاب بھی نہیں! یہاں ایک اور مسئلہ بھی واضح ہوگیا، کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی الٰہی کے ذریعہ حضرات شیخین رضی اللہ عنہما کی خلافت کا علم ہوگیا تھا، تو اس کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کا حکم، امر الٰہی کے مخالف ہوتا ہے اور انبیاء کرام علیہم السلام تو تقدیر الٰہی کے خلاف دعا تک نہیں کرتے چہ جائیکہ خلافت کی تقرری و موقوفی کے احکام صادر فرمائیں! معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا نہیں فرمایا۔ یہ سب یاروں کی گھڑنت اور افترا ہے! ۔ چنانچہ ارشاد ربانی ہے۔

فَلَمَّا ذَهَبَ عَنْ اِبْرَاهِيْمَ الرَّوْعُ وَجَآءَتْهُ الْبُشْرٰى يُجَادِلُنَا فِيْ قَوْمِ لُوْطٍ ۔ اِنَّ اِبْرَاهِيْمَ لَحَلِيْمٌ اَوَّاهٌ مُّنِيْبٌ ۔ يَآ اِبْرَاهِيْمُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا اِنَّهٗ قَدْ جَآءَ اَمْرُ رَبِّكَ وَاِنَّهُمْ اٰتِيْهِمْ عَذَابٌ غَيْرُ مَرْدُوْدٍ ۔

جب ابراہیم علیہ السلام، کا خوف دور ہوا اور بشارت (ان کو) ملی، تو وہ ہم سے قوم لوط کے معاملہ میں اصرار کرنے لگے (کہ انہیں عذاب نہ دیا جائے) وہ نرم دل بردبار اور خدا کی طرف رجوع کرنے والے ہیں (اسی لئے یہ اصرار کر رہے تھے) ہم نے ان سے کہا ابراہیم اس (اصرار) سے گریز کرو، تمہارے رب کا اس معاملہ میں حکم جاری ہو چکا اب تو ان پر عذاب آئیگا جو لوٹایا نہیں جاسکتا۔

www.Ahlehaq.com

Www.AhlehaQ.Com

اعتراض ۔ (۶) خود حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا۔

مَا غِرْتُ عَلٰى اَحَدٍ مِّنْ نِّسَآءِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا غِرْتُ عَلٰى خَدِيْجَةَ وَمَا رَاَيْتُهَا قَطُّ وَلٰكِنْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُكْثِرُ ذِكْرَهَا

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج میں سے سوائے خدیجہ رضی اللہ عنہا کے کسی کے حال پر مجھ کو غیرت نہیں آئی حالانکہ میں نے ان کو بالکل نہیں دیکھا مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کا ذکر کثرت سے فرمایا کرتے تھے۔

جواب :۔ غیرت اور رشک تو عورتوں کا طبعی تقاضا ہے! اور طبعی تقاضے پر کوئی گرفت نہیں۔ ہاں غیرت و رشک کی بنا پر کوئی قول و فعل خلافِ شرع سرزد ہو تو البتہ گرفت کا موقعہ ہوتا ہے۔

حدیث صحیح میں ایک واقعہ مذکور ہے کہ جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کسی بیوی کے گھر میں تھے کہ ایک دوسری زوجۂ محترمہ نے آپ کے لئے عمدہ کھانا تیار کرکے بھجوادیا مگر ان محترمہ نے غیرت کے مارے خادمہ سے طشت لے کر زمین پر پٹخ دیا کہ طشت تو ٹوٹا ہی کھانا بھی بکھر گیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کھانے کی حرمت کے لحاظ سے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے بنفس نفیس خود اٹھے اور کھانا چننے لگے، ساتھ ہی یہ بھی فرماتے جاتے، غارت امکم۔ مگر اس کے علاوہ نہ ان محترمہ رضی اللہ عنہا سے کچھ فرمایا نہ ناراض ہوئے۔ جب اس معاملہ میں نبی محترم صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنی محترمات کے ساتھ یہ سلوک و معاملہ ہے ایسے غیرے کو حق کہاں پہنچتا ہے کہ ان امہات محترمات رضی اللہ عنہن کو اعتراض کا نشانہ بنائے۔ اور اپنی عاقبت خراب کرے!

کتب امامیہ میں تو ابو البشر حضرت آدم علیہ السلام کے متعلق یہ درج ہے کہ انہوں نے ائمہ کے معاملہ میں حسد و رشک کا اظہار فرمایا، تو ان کے مقابلہ میں بی بی عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی یہ غیرت کیا وزن رکھتی ہے، اور کیسے اس پر یہ لوگ اعتراض کر سکتے ہیں۔

اعتراض ۔ (۷) حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا، آخر عمر میں فرمایا کرتی تھیں قَاتَلْتُ عَلِيًّا وَلَوَدِدْتُّ اَنِّيْ كُنْتُ نَسْيًا مَّنْسِيًّا۔ میں علی (رضی اللہ عنہ) سے لڑ پڑی۔ اور میری خواہش ہے کہ میں بھولی بسری بات ہوتی!

جواب :۔ ان الفاظ سے کوئی روایت بطریق صحیح منقول نہیں۔ صحیح بات یہ ہے کہ یوم جمل کی یاد جب بھی آتی، آپ بے اختیار اشکبار ہو جاتیں یہاں تک کہ چادر مبارک آنسوں سے تر ہو جاتی۔ یہ رونا اس بنا پر ہوتا کہ کاش میں نکلنے میں جلدی نہ کرتی، پہلے حالات کی تحقیق کیوں نہ کرلی، غور و فکر کیوں نہ کیا، کہ اتنا زبردست المیہ پیش آگیا۔ اگر یہ اپنی لکھی ہوئی بات منوانے پر اتنے مصر تو اہل سنت کی معتبر، صحیح اور مستند کتابوں کی بات بھی تو سنیں اور اسے قبول کریں جن میں ایسے ہی الفاظ جناب علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہیں کہ جب ام المؤمنین رضی اللہ عنہا کے لشکر کو ہزیمت ہو گئی اور دونوں طرف کے کافی لوگ ہلاک و شہید ہو گئے تو آپ جب مقتولین کی لاشوں کے ملاحظہ کے لئے گئے تو اپنے زانو پیٹ پیٹ کر یہ فرما رہے تھے، يٰلَيْتَنِيْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا وَكُنْتُ نَسْيًا مَّنْسِيًّا۔ (اے کاش میں اس سے پہلے مر کر بھولی بسری بات کیوں نہ ہو گیا)، اگر جناب صدیقہ رضی اللہ عنہا نے ایسا فرمایا بھی ہو تو وہ اسی قبیل سے ہوگا۔ اور جہاں مقصد انصاف پسندی، اور رجوع الی الحق ہو وہاں طرفین سے اسی قسم کے احساسات ندامت کا اظہار ہوتا ہے جو باہم مرتبہ شناسی پر مبنی ہوتا ہے!

کیا یہ تعجب اور دکھ کی بات نہیں کہ ایسے قابل قدر جذبات و احساسات کو بھی یہ لوگ مطاعن میں شمار کرتے ہیں۔

اعتراض ۔ (۸) کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے حجرۂ مبارکہ کو جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا مسکن تھا اپنے والد اور ان کے دوست حضرت عمر رضی اللہ عنہما کا مقبرہ بنا دیا۔

جواب :۔ کتب اہل سنت میں جو احادیث صحیحہ مروی و منقول ہیں ان سے ثابت ہے کہ گاہ بصراحت گاہ باشارہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ خوشخبری دی ہے کہ یہ دونوں محترم حضرات آپ کے جوار میں مدفون ہوں گے! چنانچہ جب فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی تدفین وہاں پا گئی تو جناب علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔

إِنِّیْ کُنْتُ لَاَظُنُّ أَنْ یَّجْعَلَکَ اللّٰہُ مَعَ صَاحِبَیْکَ إِذْ کُنْتُ کَثِیْرًا أَسْمَعُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کُنْتُ أَنَا وَأَبُوْبَکْرٍ وَّعُمَرُ وَقُمْتُ أَنَا وَأَبُوْبَکْرٍ وَّعُمَرُ وَانْطَلَقْتُ أَنَا وَأَبُوْبَکْرٍ وَّعُمَرُ۔

میرا پختہ گمان تھا کہ اللہ تعالیٰ تمکو اے عمر، تمہارے دونوں دوستوں کے ساتھ ملادے گا۔ اس لئے کہ میں نے کئی مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس قسم کا کلام سنا کہ میں، ابوبکر اور عمر وہاں تھے۔ میں، ابوبکر و عمر کھڑے تھے۔ میں، ابوبکر اور عمر چلے!

لہٰذا آپ کے وہاں دفن ہونے کے جواز کا اس سے صاف اور کھلا حکم اور کیا ہوگا جو کمال رضامندی اور خوشنودی کا پتہ دیتا ہے۔ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صریحی اجازت درکار ہوتی تو پھر جناب حسن رضی اللہ عنہ نے اس حجرہ میں دفن ہونیکی خواہش کا اظہار کیوں فرمایا تھا۔ جبکہ آپ بخوبی جانتے تھے کہ اب اس قسم کی اجازت اور حکم شرعی کا حصول ناممکن اور محال ہے!

دوسرا جواب یہ ہے کہ ازواج مطہرات کے تمام حجرے ان کی ذاتی ملکیت تھے۔ اس لئے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو مالک بنادیا تھا اور ہر ایک کے لئے ایک ایک مکان نامزد فرمادیا تھا۔ حکم فقہی کا بھی یہی تقاضا ہے کہ جب ایک شخص اپنی کسی اولاد کے نام کوئی مکان بنائے یا خریدے اور پھر اس کو اسی کے قبضہ میں چھوڑے رکھے تو وہ اسی کی ملک ہوجاتا ہے۔ دوسری اولاد یا وارثوں کا اس میں کوئی دخل نہیں رہتا۔ اور یہی حکم ازواج اور دیگر اقارب کا ہے۔

ازواج مطہرات کی ملکیت کا ثبوت یہ بھی ہے کہ وہ اپنے اپنے مکانات میں مالکانہ تصرف فرماتی رہتی تھیں، مثلاً توڑ پھوڑ، مرمت، ان کو تنگ یا کشادہ کرنا۔ دروازہ نکالنا وغیرہ۔ اور یہی حال سیدہ فاطمۃ الزہراء اور جناب اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کے حجروں کا بھی ہے کہ یہ دونوں اپنے اپنے گھروں کے مالک تھے۔

اور قرآن مجید کی آیت وَقَرْنَ فِیْ بُیُوْتِکُنَّ میں اشارہ قریب قریب تصریح کے ہے۔ پھر حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا بموجودگی اصحاب کرام جن میں جناب امیر رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے اجازت طلب کرنا اور کسی کا بھی انکار نہ کرنا اسبات کی قطعی دلیل ہے کہ حجرہ جناب صدیقہ رضی اللہ عنہا کی ملکیت میں تھا۔ اور یہ سب ہی کو معلوم ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم خلفاء کی چھوٹی چھوٹی باتوں پر نظر رکھتے اور معمولی تغیرات پر گرفت فرماتے تھے! اگر اس معاملہ میں بھی وہ دیکھتے کہ کوئی امر خلاف شرع ہے تو وہ کبھی خاموش نہ رہتے! لہٰذا اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ تمام صحابہ و تابعین رضوان اللہ علیہم کے نزدیک اپنے اپنے حجروں پر ازواج مطہرات کی ملکیت مسلم الثبوت تھی! کسی نے بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی اجازت طلبی پر اعتراض نہیں کیا۔ اور یہ بات تو شیعی کتب سے ثابت ہے کہ سیدنا حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے بھی اسی حجرہ مبارک میں اپنے جد اطہر صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلو میں دفن ہونیکی اجازت حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا سے چاہی تھی! یہ الگ بات ہے کہ ان کی وفات کے بعد مروان کی مداخلت کے باعث ایسا نہ ہوسکا۔ اس سلسلہ میں سیدنا حضرت حسین رضی اللہ عنہ مع اہل و عیال اور دوسرے احباب مسلح ہو کر آمادہ پیکار بھی ہوئے مگر مروان نے فوری طور پر مسجد نبوی اور روضہ اطہر کے اردگرد فوج متعین کردی! اندیشہ پیدا ہوگیا تھا کہ اس معاملہ میں جناب حسین رضی اللہ عنہ اور آپ کے ہمراہیوں کو گزند پہنچ جائے، کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیچ میں پڑ کر اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو سمجھا بجھا کے نیز مصلحت وقت دکھا کر آپ کے غصہ کو کم کیا۔ اور معاملہ بغیر خون خرابے کے نمٹ گیا۔

لہٰذا اگر حجرہ شریف حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی ملک نہ تھا تو جناب سیدنا حسن رضی اللہ عنہ نے اجازت کیوں طلب فرمائی، ایسی صورت میں مروان سے اجازت لینی چاہئے تھی کہ وہ حاکم وقت ہونیکی حیثیت سے بیت المال، اور اوقاف وغیرہ پر متصرف تھا۔ اور اس کے حکم کی وجہ سے جناب صدیقہ رضی اللہ عنہا کی اجازت بھی مفید نہ ہوئی۔ اگر کسی کو اس روایت سے انکار ہو تو اسے چاہئے کہ وہ ابن صباغ کی کتاب فصول مہمہ فی معرفۃ الائمہ، یا دوسری کتابوں کا مطالعہ کرے۔ اس موقعہ پر اپنے دلی بغض و عناد سے مجبور ہو کر بہت سے شیعہ بطریق تہمت و افتراء جناب صدیقہ رضی اللہ عنہا پر یہ اتہام

لگاتے ہیں، کہ آپ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو اجازت دینے کے بعد پچھتائیں، اور ایک خچر پر سوار ہو کر مسجد کے دروازہ پر آئیں، دفن سے روکا۔ میراث کا دعویٰ کیا۔ اور جناب ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یہ اونکا بونکا شعر پڑھا۔

تَجَمَّلْتِ تَبَغَّلْتِ وَاِنْ عِشْتِ تَفَيَّلْتِ
لَكِ التِّسْعُ مِنَ الثُّمُنِ وَبِالْكُلِّ تَطَمَّعْتِ

(تم شتر سوار ہوئیں خچر سوار ہوئیں اور زندہ رہیں تو ہاتھی سوار بھی ہوگی تمہارا حصہ تو آٹھویں حصہ کا نواں حصہ ہے مگر تم تو سارا مال ہضم کر گئیں۔

حالانکہ انہیں شاید یہ پتہ نہیں کہ حدیث نحن معاشر الانبیاء لا نرث و لا نورث (انبیاء کی ہماری جماعت نہ کسی کے وارث ہوتے نہ ہمارا کوئی وارث ہوتا ہے) کی راوی خود حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا ہی تو ہیں۔ اور پھر جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام ازواج مطہرات رضوان اللہ علیہم کو میراث طلب کرنے سے روکا۔ تو آپ میراث کا دعویٰ کیسے کر سکتی تھیں۔ اور آپ کو سوار ہو کر مسجد کے دروازہ پر آنے کی کیا ضرورت تھی تدفین آپ ہی کے حجرہ میں ہونی تھی۔ اپنے حجرہ کا دروازہ بند فرما لیتیں

اور جناب ابن عباس رضی اللہ عنہما کا جواب کیسے صحیح ہو سکتا ہے، کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کل متروکات کے آٹھویں حصہ کا نواں جس میں حجرے، سکونت و کاشت کی زمین ہتھیار، اونٹ خچر اور گھوڑے بھی شامل تھے۔ بالیقین جناب عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرہ کے علاوہ تھے تو حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا پر ان کے ہضم کر جانے کا الزام کیسے درست ہو سکتا ہے۔ کل میراث نہ آپ کے قبضہ میں تھی نہ آپ نے کھائی!

غرض جھوٹوں پر خدا کی لعنت کے قانون کے مطابق ان مفتریوں کے ہاتھ، لعنت، ندامت اور رسوائی کے سوا کچھ نہیں آتا۔ اور قانون الٰہی ایسے جھوٹوں کو خود ان کی اپنی زبان سے رسوا کرتا ہے۔

اعتراض - (۹)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن مسکن عائشہ رضی اللہ عنہا کی طرف اشارہ فرما کر دوران خطبہ یہ الفاظ فرمائے۔

اَلَا اِنَّ الْفِتْنَةَ هٰهُنَا ثَلَاثًا مِنْ حَيْثُ تَطْلُعُ قَرْنُ الشَّيْطَانِ۔

آگاہ رہو، فتنہ یہیں ہے۔ تین مرتبہ فرمایا، جہاں سے شیطان کا سینگ نکلتا ہے!

اور اس سے مراد عائشہ (صدیقہ رضی اللہ عنہا) کا فتنہ ہے جبکہ آپ امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ سے لڑنے کیلئے مدینہ سے بصرہ گئیں۔ اور ہزاروں مسلمانوں کے قتل کا سبب بنیں!

جواب: - کلام صحیح ہے مگر مراد باطل ہے۔ اور یہ دانستہ کلام پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی صریح تحریف ہے۔ اس لئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ الفاظ بہت سی جگہوں اور مقامات پہ فرمائے ہیں اور اشارہ مسکن عائشہ کی طرف نہیں مشرق کی طرف فرمایا ہے۔ ہر جگہ مسکن صدیقہ رضی اللہ عنہا کہاں! مسجد نبوی میں جہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ فرماتے تھے یہ اتفاق ہے کہ وہاں سے رخ کرنے سے حجرہ عائشہ رضی اللہ عنہا سامنے پڑتا ہے۔ کیونکہ آپ کا مسکن مشرقی جانب تھا۔ پھر آئندہ کی عبارت کو تو دیکھو کیوں کہ قرن شیطان کے طلوع کی جگہ مسکن عائشہ نہیں سمت مشرق ہے اور وہ روایت جو ان الفاظ سے سمت مشرق کی مراد ظاہر کرتی ہے خود انہیں کی کتابوں میں موجود ہے۔ مگر انتہائی بغض و حسد اور شرارت کی بنا پر ادھر سے آنکھیں موندلی ہیں اور غلط مراد و معنی کو پھیلانے میں اخوان الشیاطین کا کردار ادا کرتے جا رہے ہیں۔

حضرت ابن عباس اور دوسرے صحابہ رضوان اللہ علیہم کی روایت اس قصہ کے سلسلہ میں بیجا شبہ دور کرتے ہیں کافی ہے اس کے الفاظ یہ ہیں۔

رَأْسُ الْكُفْرِ هٰهُنَا وَاَشَارَ نَحْوَ الْمَشْرِقِ حَيْثُ يَطْلُعُ قَرْنُ الشَّيْطَانِ فِيْ رَبِيْعَةَ وَمُضَرَ۔

کفر کا سرا یہاں ہے اور اشارہ فرمایا سمت کی طرف جہاں قرن شیطان طلوع ہوتا ہے ربیعہ مضر میں۔

اس امت مرحومہ میں جو فتنہ بھی اٹھا اسی سمت سے اٹھا۔ سب سے پہلا فتنہ مالک بن اشتر کا خروج تھا۔ وہ اور اس کے ساتھی حضرت عثمان

شہید رضی اللہ عنہ کے خلاف کوفہ سے نکلے اور کوفہ مدینہ منورہ سے جانب مشرق ہے!

دوسرا فتنہ عبید اللہ بن زیاد کا تھا جو حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کا باعث بنا اس کے بعد مدعی نبوت مختار ثقفی کا فتنہ نمودار ہوا، پھر اکثر بدعات اور باطل عقائد ان ہی اطراف سے رونما ہوتے رہے، اسی لیے رافضیوں کا منبع بھی کوفہ ہے اور معتزلہ کی جائے پیدائش بصرہ۔ واصل بن عطا بصری ہے۔ قرامطہ کوفہ کے علاقہ کی پیداوار ہیں۔ خوارج نہروان سے نکلے تو دجال اصفہان سے!

اس شخص کے کفر میں کیا شک ہوسکتا ہے جو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے سفر بصرہ کو آڑ بنا کر آپ کے مسکن و محل کو مقام فتنہ کہتا یا خیال کرتا ہے۔ کیونکہ وہ تو منبع ایمان، سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس کا مسکن تھا، جن کے اسم مبارک ہی سے فتنہ کفر بھاگتے ہیں۔ اور طرفہ تماشہ یہ ہے کہ جناب صدیقہ رضی اللہ عنہا تو اپنے اس حجرہ مبارک سے حج کے لئے مکہ مکرمہ روانہ ہوئیں تھیں۔ فتنہ انگیزی تو ان کے حاشیۂ خیال میں بھی نہیں تھی۔ اگر بصرہ کا سفر معاندین کے نزدیک ناگوار سفر ہو بھی تو اس کے لیے تو آپ مکہ مکرمہ سے روانہ ہوئیں، تو اب مکہ مکرمہ (العیاذ باللہ) محل فتنہ ہونا چاہیئے حجرہ مبارک کیوں؟

اعتراض۔(۱۰)

یہ لوگ روایت کرتے ہیں کہ

اِنَّ عَائِشَۃَ شَوَّفَتْ جَارِیَۃً وَقَالَتْ لَعَلَّنَا نُصِیْدُ بِھَا بَعْضَ فِتْیَانِ قُرَیْشٍ۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ایک لونڈی کا بناؤ سنگار کیا اور مقصد یہ بتایا، کہ شاید اس طرح ہم کسی قریش جوان کو شکار کر سکیں۔

کہ وہ اس کی طرف مائل ہو کر اس سے نکاح کرنے پر آمادہ ہو جائے اور میرے حلقۂ تابعداری میں آجائے۔

جواب:۔ اول تو چند وجوہ یہ روایت مجروح ہے، اور اس سے ثبوت پیش کرنا درست نہیں، مثلاً یہ روایت وکیع بن جراح سے مروی ہے جو انہوں نے عمار بن عمران سے انہوں نے غنم (قبیلہ) کی ایک عورت سے اور اس نے حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایت کی ہے اس میں عمار بن عمر مجہول الحال ہے، کوئی نہیں جانتا وہ کیسا آدمی تھا۔ اور غنم کی عورت اسم و مسمی دونوں جہت سے مجہول الحال ہے نہ کوئی اس کا نام جانتا ہے نہ اس کا حال چال۔ اس لیے ان دونوں کی بات معتبر اور قابل حجت نہیں۔ پھر اس روایت میں عنعنہ ہے۔ اور یہ مرسل و منقطع دونوں کا احتمال رکھتا ہے کوئی جہت اس سے متعین نہیں ہوتی، ایسی بے سروپا روایات سے تمسک کرکے ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی ذات مطہر پر طعن کرنا کسی مؤمن کی تو شان نہیں ہوسکتی۔ اگر وجہ عداوت شے دیگر ہو تب بھی یہ خلاف انصاف ہے کہ اپنی عداوت کے اظہار کے لئے دوسرے کے ایمان میں خلل اندازی کرے اور ان کے لئے ایسے حربے استعمال کرے۔ اور پھر یہ طعن کی بات ہے ہی نہیں۔ اپنی متبنیٰ، لڑکی یا پروردہ لونڈی وغیرہ کے لئے مناسب بر ڈھونڈنا کونسی عار بات ہے۔ اور اس غرض و مقصد سے لڑکی کا بناؤ سنگھار کرنا کہ اس سے نکاح کی رغبت ہو مسنون مستحب ہے! اور ہمیشہ سے رائج اور جاری ہے۔ دکیا طعن کرنے والے اپنی لڑکیوں کو دولہا کے اعزہ کے سامنے بھوتنی بنا کر پیش کرتے ہیں۔ یا کچھ بناؤ سنگھار کرتے ہیں! اور کیا وہ بہترین داماد کے حصول کے لئے، زیبائش کو واقعی قابل اعتراض طریقہ مانتے ہیں،) صحاح میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ الفاظ منقول ہیں جو آپ نے اپنے متبنیٰ جناب اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کی نسبت فرمائے۔ جو سیاہ فام اور کریہ المنظر تھے!

لَوْکَانَ اُسَامَۃَ جَارِیَۃً لَکَسَوْتُھَا وَحَلَّیْتُھَا حَتّٰی اَنْفَقَھَا۔

اگر اسامہؓ لڑکی ہوتے تو میں ان کا بناؤ سنگھار کراتا۔ ان کو زیور پہناتا تاکہ ان کی طرف لوگ راغب ہوں۔

اور آج بھی شرفاء و غیر شرفاء سب میں یہ طریقہ جاری ہے کہ منگنی کے وقت لڑکیوں کا بناؤ سنگھار کرتے، اچھا لباس اور بقدر میسر زیورات وغیرہ سے زیبائش بڑھاتے ہیں۔ بلکہ ایسے موقعہ پر زیور مانگ مانگ کر آرائش اور نا موری کرتے ہیں۔ تاکہ عام دنوں میں نظر آنے والی لڑکی میں

ایسا نکھار نظر آئے جو باعث ترغیب ہو، اور دولہا دلہن متاثر ہو کر اسے پسند کر لیں۔ تو ایسی بات جو دنیا کے تمام طبقات (حتیٰ کہ طعن کرنے والوں کے اپنے ہاں بھی) رائج اور معمول بہ ہو اور شرعاً بھی سنت و مستحب ہو وہ قابل اعتراض و موجب طعن کس منطق سے ہو گئی!

بلا تخصیص عام صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم پر اعتراضات

ایسے اعتراضات دس ہیں۔

اعتراض۔ (۱) صحابہ کرام (رضوان اللہ علیہم) نے دو مرتبہ گناہ کبیرہ کا ارتکاب کیا۔ **اوّل** جنگ اُحد میں کہ سب بھاگ اٹھے **دوم** جنگ حنین میں کہ وہاں بھی ان کے قدم اکھڑ گئے۔ یہ دونوں جہاد کفار کے مقابلہ میں تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمراہی میں کفار کی لڑائی سے بھاگنا۔ گناہ کبیرہ ہے!

جواب:۔ جنگ اُحد کے وقت تک فرار سے ممانعت کے احکام نازل نہیں ہوئے تھے۔ اور پھر یہ لغزش معاف بھی کر دی گئی۔ وَلَقَدْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهُمْ! (خدا نے جسے معاف کر دیا اگر آپ اسے معاف کرنے پر تیار نہیں۔ ایسی حالت میں تو آپ اپنے ایمان کی خیر منائیے۔ ن)

اور پھر جنگ اُحد میں منافقین تو لڑائی سے پہلے ہی بھاگ لئے تھے! مسلمان دو بدو ہوئے باقاعدہ لڑائی لڑی۔ مگر جب شکست ہوئی اور یہ مشہور ہوا کہ (خاکم بدہن) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے شہادت پائی۔ تو ایسی حالت میں کہ سردار لشکر نہ رہے اور جمعیت تباہی کی نذر ہوئی ہو تو ایسی حالت میں فرار کی ممانعت نہیں۔

اور جنگ حنین کی پسپائی کو فرار کہنا تو کھلی دھاندلی ہے۔ یہ تو ایک جنگی چال تھی جو پہلی غلط چال اور بے تدبیری، کی اصلاح اور لشکر کو نقصان سے بچانے کے لئے کی گئی۔ ہوا یہ کہ میدان جنگ کا بغور جائزہ لینے کا موقعہ نہ ملنے کے سبب یہ بات اور دشمن کی چال سامنے نہ آسکی کہ دشمن نے تنگ راستہ کے اطراف کی جھاڑیوں میں اپنے تیر انداز متعین کر کے چھپا دئیے ہیں۔ مسلمان بے فکر آگے بڑھے تو اس اچانک حملہ اور افتاد سے سراسیمہ ہو گئے، اور انتشار میں مبتلا ہو گئے، اس وقت بھی پسپا ہونے والے بھی مہاجر و انصار کے کبار صحابہ رضوان اللہ علیہم نہیں تھے بلکہ وہ مسلمان صحابہ تھے جو فتح مکہ یا بعد میں مسلمان ہوئے۔ مگر ان کی پسپائی کو بھی فرار کہہ سکتے اس لئے صورت حال سمجھ میں آنے کے بعد یہ فوراً پلٹے اور پھر مسلمان فتح سے ہمکنار ہوئے۔ (اور پھر جس ذات گرامی و محترم صلی اللہ علیہ وسلم، کی جھوٹی حمایت، کا دم بھر کر یہ معترض ان کے جاں نثاروں کو مطعون کرنے اور انہیں گناہ کبیرہ کا مرتکب قرار دینے کے لئے مضطرب و بے چین ہیں جب انہوں نے ہی اپنے اصحاب و ساتھیوں کو کچھ نہ کہا تو یہ جو نہ تین میں نہ تیرہ میں۔ کیوں ناڑ خانی میں اپنا ایمان ضائع کر رہے ہیں۔ ن) اللہ تعالیٰ نے فرمایا ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَاَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا۔ (پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول اور مسلمانوں پر اپنی سکینت نازل فرمائی۔ اور ایسے لشکر اتارے جنکو تم دیکھ نہ پائے تھے۔)

(تم جن کو بزعم خود کبیرہ کا مرتکب قرار دے کر اپنے بغض و کینہ کا نشانہ بنا رہے ہو، اللہ کے ہاں ان کے مرتبہ کا کچھ جلوہ نظر آیا کہ نہیں۔ ان کے لئے سکینت خداوندی کا نزول ہو رہا ہے لشکر خداوندی ان کی مدد کے لئے اتر رہا ہے۔ اور پھر وہ مظفر و منصور لوٹ رہے ہیں! مگر اس سب کے باوجود تمہیں وہ اب تک کبیرہ کے مرتکب ہی نظر آ رہے ہیں۔ ن) ابو القاسم بن سعید شیعی نے اپنی کتاب شرائع میں بطور نص یہ بیان کیا ہے کہ جب جنگ میں ہلاکت کا یقین ہو جائے تو جنگ سے بھاگنا جائز ہے۔ (تو اب یہ کس منہ سے مسلمانوں پر اعتراض کرتے ہیں)

www.Ahlehaq.com

www.Ahlehaq.com

اور پھر یہ شیعہ تو اپنی کتابوں میں درج صحیح روایتوں کے سبب انبیا کرام علیہم السلام کو بھی گناہ کبیرہ کا مرتکب مانتے ہیں۔ مثلاً حضرت آدم علیہ السلام، حضرت یونس علیہ السلام وغیرہ جنکا معصوم ہونا قطعی ہے۔ اس پر اجماع بھی ہے۔ تو اگر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم سے جو معصوم بھی نہیں ہیں۔ کسی کبیرہ کا ارتکاب ہو بھی گیا تو ان کے نزدیک طعن کا کیا جواز خصوصاً جب وہ گناہ، توبہ و استغفار اور رحمت الہٰی سے محو بھی کر دیا گیا ہو۔

پھر یہ گناہ ان کی طاعات اور جہاد کی مشقتوں کے اجر کو ملیا میٹ نہیں کر سکتا۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کی شان میں وارد قرآن و احادیث متواترہ کی بشارات سے چشم پوشی کرنا اور اکا دکا بشری لغزشوں کی ٹوہ میں لگا رہنا۔ کسی صاحب ایمان کی شان تو ہرگز نہیں۔ (معاندین کے جھک مارنے سے اللہ و رسول کے نزدیک تو ان کے مرتبہ میں رتی بھر کمی نہیں آسکتی۔ البتہ عاقبت انہیں کی خراب ہوگی۔ ن)

ویسے بھی ان شبہات سے اہل سنت کے اعتقاد میں تو کوئی خلل پڑتا نہیں اس لئے معاندین کی یہ ساری تگ و دو لاحاصل ہے کیونکہ وہ صحابہ کی عصمت کے قائل نہیں۔ اگر ان سے کوئی گناہ سرزد ہو بھی گیا ہو تو کیا غم۔ (جبکہ غفور الرحیم خدا کی ذات ہے۔ اور معاندین کے ہاتھ میں بخشش کا کام ہوتا۔ تو سوچئے۔ ن)

اہل سنت کی راہ اعتدال کی راہ ہے اس لئے وہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کے تمام امور کو پیش نظر رکھتے ہیں۔ مثلاً حقوق صحبت، خدمت رسول، ان کی جانبازیاں و جاں نثاریاں، راہ خدا میں گھربار، جان و مال، آل و اولاد لٹا بیٹھنا، دین و شریعت کو رائج کرنا، اور وہ آیات جو ان کی شان میں نازل ہوئیں اور وہ احادیث جو ان کی رفعت شان اور بلندی درجہ پر حرف آخر ہیں وہ سب ان کے پیش نظر رہتی ہیں لیکن شیعہ! کہ ان کو عیبوں اور گناہوں کے علاوہ کچھ سوجھتا ہی نہیں

اعتراض۔ (۳۲) کچھ بلکہ اکثر صحابہ کرام نے جب ڈھول اور اونٹوں کی آواز سنی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تنہا خطبہ دیتے چھوڑ کر کھیل تماشے اور خرید و فروخت کے لئے دوڑ پڑے۔ اور اس دنیا کی متاع قلیل پر نماز جیسی اہم اور بنیادی رکن اسلامی کو اور وہ بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی امامت میں قربان کر دیا۔ ان کا یہ عمل صاف طور پر بے دیانتی پر دال ہے جس کا ذکر قرآن میں یوں فرمایا گیا۔ وَإِذَا رَأَوْا تِجَارَةً أَوْ لَهْوًا انْفَضُّوا إِلَيْهَا وَتَرَكُوكَ قَائِمًا۔ جب کاروبار یا کھیل کود کی کوئی بات دیکھ پاتے ہیں تو اس کی طرف چھپٹ پڑتے ہیں اور آپ کو اکیلا کھڑا چھوڑ جاتے ہیں۔

جواب ـــ یہ قصہ ہجرت کے ابتدائی ایام کا ہے، جبکہ ہنوز احکام و آداب شریعت سے سب حضرات کو پوری واقفیت حاصل نہ تھی۔ قحط کے ایام تھے، جس کی وجہ سے سب کو پریشانی لاحق تھی! تجارتی قافلہ کا شدت سے انتظار تھا۔ خدشہ یہ بھی تھا کہ قافلہ کا سارا اناج یکمشت کسی نے لے لیا، یا قافلہ گذر گیا تو نرخ گراں تر ہو جائے گا۔ انہی حالات کی بنا پر اضطراری طور پر اُدھر جھپٹ پڑے۔ مگر کبار صحابہ مثلاً ابوبکر صدیق و عمر بن خطاب رضی اللہ عنہما بدستور مسجد میں بیٹھے رہے۔ پور تربیت و تادیب سے قبل کا کوئی فعل، افعال جاہلیت کی مانند قابل عتاب اور لائق اعتراض نہیں ہوتا۔ قرآن مجید کا انداز گو عتاب اور تادیب کا ہے مگر اس کے باوجود انجام کار سے ڈرایا یا کسی عذاب کا مورد نہیں بتایا گیا، اور پھر سب سے بڑی بات یہ کہ خود سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے حضرات پہ نہ عتاب فرمایا نہ غصہ ہوئے نہ ڈانٹ ڈپٹ فرمائی۔ تو اب اور کس کی یہ مجال یا حق ہے کہ وہ ان نفوس مقدسہ پر طعن یا اعتراض کرے۔

اور پھر لغزش کا صحابہ یا امتیوں سے سرزد ہونا نہ بعید از عقل ہے نہ تعجب کی بات کہ ان میں عصمت کا جوہر ہوتا ہی نہیں۔ معصوم انبیاء و رسل علیہم السلام تک سے بعض ایسے امور صادر ہوئے جو عتاب الٰہی کا باعث تھے! ایسے امور کا تقاضائے بشریت کے سبب ظہور ناگزیر ہے۔ پے بہ پے تنبیہات کے سبب ہی تو تہذیب و تادیب حاصل ہوتی ہے۔

اعتراض۔ (۳۳) اہل سنت کی صحاح میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی یہ روایت موجود ہے۔

سَیُجَاءُ بِرِجَالٍ مِنْ اُمَّتِیْ فَیُؤْخَذُ بِهِمْ ذَاتَ الشِّمَالِ فَاَقُوْلُ اُصَیْحَابِیْ اُصَیْحَابِیْ فَیُقَالُ اِنَّكَ لَا تَدْرِیْ مَا اَحْدَثُوْا بَعْدَكَ فَاَقُوْلُ كَمَا قَالَ الْعَبْدُ الصَّالِحُ وَكُنْتُ عَلَیْهِمْ شَهِیْدًا مَا دُمْتُ فِیْهِمْ فَلَمَّا تَوَفَّیْتَنِیْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِیْبَ عَلَیْهِمْ وَاَنْتَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ شَهِیْدٌ فَیُقَالُ اِنَّهُمْ لَنْ یَّزَالُوْا مُرْتَدِّیْنَ عَلٰی اَعْقَابِهِمْ مُنْذُ فَارَقْتَهُمْ۔

(حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا) میری امت کے کچھ لوگوں کو دوزخ کی طرف لیجایا جائیگا تو میں کہوں گا یہ تو میرے امتی ہیں، یہ تو میرے امتی ہیں (انہیں جہنم میں کیوں لے جا رہے ہو) اس پر مجھے بتایا جائیگا کہ آپ واقف نہیں۔ آپ کے بعد انہوں نے کیسے کیسے عمل کئے۔ جنکی پاداش میں ان کو لیجایا جا رہا ہے) تب میں وہ الفاظ دہراؤں گا جو اللہ کے ایک صالح بندہ (عیسیٰ علیہ السلام) نے کہے تھے۔ کہ جب تک میں ان میں موجود رہا ان کا نگران رہا اور تو نے مجھے ان کے درمیان اٹھا لیا۔ تو آپ ان کے نگران رہے۔ اور آپ تو ہر شے کے نگران اور جاننے والے ہیں۔ تو کہا جائیگا کہ جب آپ ان سے جدا ہوئے تو یہ تب سے مرتد ہی رہے۔

جواب:۔ حدیث مذکورہ سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اس میں مرتد سے مراد وہ لوگ ہیں جنکی موت ارتداد ہی پر ہوئی۔ اور جو مرتد ہوئے ان میں سے کسی کو بھی اہل سنت نہ صحابی کہتے اور مانتے ہیں، نہ ان کے فضائل دخوبی کا کوئی معتقد ہے۔ قبیلہ بنی حنیفہ اور بنی تمیم کے اکثر لوگ بصورت وفد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کو آئے مگر وہ ارتداد کی وبا کا شکار ہو کر خائب و خاسر ہوئے!

اہل سنت کی گفتگو کا موضوع تو وہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم ہیں جو ایمان و عمل صالح کے ساتھ راہی سفر آخرت ہوئے۔ اور اختلاف رائے کے باعث آپس میں لڑے جھگڑے بھی۔ قتل و قتال تک کی نوبت بھی باہم ہوئی۔ اس سب کے باوجود دونوں متحارب جماعتوں نے باہم ایک دوسرے کو نہ کافر کہا، نہ بدعتی! بلکہ دونوں ایک دوسرے کے ایمان کی گواہی دیتے اور مؤمن کہتے اور مانتے رہے!

ایسے باایمان اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ان کی زنبیل میں کوئی روایت ہو تو پیش کریں۔

یہ قصہ تو ان مرتدوں کا ہے جو فریقین کے نزدیک مرتد تھے! بحث تو مرتدوں کے ساتھ جنگ و جدال کرنے والے مسلمانوں سے ہے! وہ تو بلا شبہ دین کا علم بلند کرنے والے تھے۔ انہوں نے تو جہاد فی سبیل اللہ کے ذریعہ قیصر و کسریٰ کی عظمت و قوت کو پاش پاش کیا لاکھوں لوگوں کو مسلمان کیا۔ قرآن مجید کی تعلیم دی۔ صلوٰۃ قائم کی شریعت سکھائی۔

خدا کے دشمنوں سے جہاد میں، کافر کو مسلمان بنانے، دین و شریعت اور قرآن کی تعلیم دینے میں جو اجر و ثواب ہے اسے ہر مسلمان جانتا ہے۔ اسی کے ساتھ ایسے حضرات کے بارے میں خصوصیت کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے بشارتیں بھی دیں اور اچھے وعدے بھی فرمائے۔ ذیل میں آیات ملاحظہ ہوں۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِی الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَیُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِیْنَهُمُ الَّذِی ارْتَضٰی لَهُمْ وَلَیُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا یَعْبُدُوْنَنِیْ لَا یُشْرِكُوْنَ بِیْ شَیْئًا

تم میں سے اہل ایمان اور اچھے عمل کرنے والوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ ہے۔ کہ انکو خلافت ارضی کا اسی طرح حقدار بنا دیگا جسطرح ان سے پہلوں کو بنایا تھا۔ اور ان کو ان کے اس دین میں جو ان کے لئے پسند کیا گیا ہے تمکن عطا فرمائے گا۔ اسکے بعد انکے خوف کو امن میں بدل دے گا تاکہ یہ میری عبادت کریں اور اس میں کسی کو بھی میرا شریک نہ ٹھہرائیں۔

چند جگہ ان کے متعلق ارشاد فرمایا۔ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ! (اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہے اور یہ اللہ تعالیٰ سے راضی ہیں)

وَاَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا اَبَدًا۔

ان کے لئے ایسے باغات تیار کر رکھے ہیں جنکے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں۔ ان میں یہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔

www.Ahlehaq.com

وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ بِاَنَّ لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ فَضْلًا كَبِيْرًا۔

مؤمنوں کو یہ بشارت دیجئے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے لئے بڑے اعزاز واکرام ہیں!

فَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاُوْذُوْا فِيْ سَبِيْلِيْ وَقٰتَلُوْا وَقُتِلُوْا لَاُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ۔

پس جنہوں نے ہجرت کی اور اپنے گھروں سے نکالے گئے اور جنکو محض میری راہ میں تکلیف دی گئی اور جنہوں نے جہاد کیا مرنے بھی مارا بھی، میں ان کی لغزشوں کو معاف کروں گا اور ان کو ایسے باغوں میں رکھوں گا جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی۔

یہاں ایک باریک بات جان لینی چاہیئے کہ انبیاء السلام پر سب وشتم اور طعن اس لئے کفر وحرام ہے، کہ ان میں سب وشتم کی وجہ یعنی گناہ وکفر سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔ بلکہ اس کے برعکس یہ حضرات کرام تو اپنی ذات میں تعظیم وتوقیر اور مدح وتعریف کے بے شمار اسباب اپنے اندر رکھتے ہیں۔ اب مسلمانوں کی وہ جماعت جو اپنے اندر اعزاز واکرام، تعظیم وتوقیر کے اسباب کی حامل ہو اور نص قرآنی سے ان کے گناہوں اور لغزشوں کی بخشش ومعافی بھی ثابت ہو چکی ہو تو ایسی جماعت بالیقین اعزاز اکرام میں انبیاء کا حکم رکھتی ہے۔ اس لئے ایسی جماعت کی بدگوئی کرنا اس کو ہدف ملامت بنانا اس کی اہانت وتحقیر کرنا بھی حرام ہے! فرق صرف اتنا ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام میں تو اسباب تحقیر سرے سے تھے ہی نہیں۔ ان میں تھے مگر وہ مٹا دیئے گئے اور مآل کار یہ کہے سکتے ہیں کہ گویا کہ یہ اسباب ان میں تھے ہی نہیں، اس لئے کہ توبہ کر لینے والے کی طرف گناہ ولغزش کی نسبت حرام ہے!

سوائے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے عام امتیوں کا یہ حال نہیں ہے کہ ان کے گناہوں کی معافی کا ہمکو علم وحی، اور قرآن سے قطعی معلوم ہو گیا ہو، یا ان کی طاعتوں کا قبول ہونا اور ان کے اعمال سے بالتخصیص اللہ تعالیٰ کا راضی ہونا بطریق یقین ثابت ہو گیا ہو۔ گویا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا طبقہ انبیاء کرام علیہم السلام اور عام امتیوں کے درمیان بطور برزخ ہے۔ اسی لئے جمہور علماء امت کا مذہب یہ ہے کہ صحابہ کے علاوہ کوئی شخص کتنا ہی متقی، پرہیزگار ہو صحابہ کرام کے درجہ کو نہیں پہنچتا۔ یہ بڑا قیمتی اور نفیس نکتہ ہے! اسے ذہن نشین رکھنا چاہیئے۔ پھر ایک جگہ یہ ارشاد فرمایا گیا۔ يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَرِضْوَانٍ وَّجَنّٰتٍ لَّهُمْ فِيْهَا نَعِيْمٌ مُّقِيْمٌ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا اَبَدًا۔

ان کا رب ان کو بشارت دیتا ہے اپنی رحمت اپنی خوشنودی اور ان باغات کی جو ان کے لئے ہیں جن میں برقرار رہنے والی نعمتیں ہیں جس میں وہ ہمیشہ ہمیش رہیں گے۔

یہ بھی ارشاد فرمایا۔ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَكَرَّهَ اِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْيَانَ۔

لیکن اللہ تعالیٰ نے تمکو ایمان کی محبت عطا فرمائی اسے تمہارے دلوں کی رونق وزینت بنایا۔ اور کفر وفسق اور گناہ سے تمہارے اندر نفرت اور کراہت پیدا فرمائی

اس آیت سے یہ نکتہ معلوم ہوا کہ پاکبازوں کی اس جماعت میں سے کسی سے اگر کسی فسق وعصیان کا ارتکاب ہوا بھی ہے تو وہ خطا، سہو، یا مغالطہ اور غلط فہمی کے سبب ہوا۔ ورنہ فسق ونافرمانی کو برا جانتے اور سمجھتے ہوئے اس کا ارتکاب محال وناممکن ہے۔ اور عقلاء کے نزدیک یہ بات اپنی جگہ ثابت وطے شدہ ہے کہ اختیاری اعمال وافعال کرنیکے لئے یہ بات ابتدائی ضروری ولازمی شرط ہے کہ وہ اس کو کرنے سے پہلے اچھا بھی سمجھتا ہو اور اس کی طرف شوق ومیلان بھی رکھتا ہو۔ اور یہ اوپر کی آیت سے معلوم ہو گیا کہ ان حضرات کے دلوں کی گہرائی میں کفر، فسق اور عصیان سے کراہیت اور نفرت موجود تھی۔ اس لئے، دانستہ اور شوق وخوشی سے کسی برائی کے ارتکاب کا ان کے متعلق خیال بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ایک اور جگہ ارشاد ہے۔

www.Ahlehaq.com

www.AhleHaq.com

أُولٰئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ حَقًّا لَهُمْ دَرَجَاتٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَمَغْفِرَةٌ وَرِزْقٌ كَرِيمٌ۔

وہی سچے پکے مومن ہیں۔ اپنے رب کے نزدیک ان کے لئے مراتب عزت بھی ہیں۔ معافی بھی ہے۔ اور عمدہ رزق بھی!

اس آیت سے معلوم ہوگیا کہ ان کے ظاہری افعال و اعمال، نماز روزہ، حج و جہاد نہ دکھاوے کے تھے نہ ان میں نفاق وغیرہ کا کھوٹ ملا ہوا تھا یہ تو بڑے سچے اور کھرے مومن تھے۔ کہ اپنے رب کے پاس باعزت مراتب بھی رکھتے تھے۔ اور عمدہ میزبانی بھی حاصل تھی۔ اور یہ مراتب و میزبانی کی عزت اسی لئے پائی تھی کہ ان کے رب نے ان کی بخشش و مغفرت فرمادی تھی۔ اور ان کا ایمان حقیقی اور یقینی تھا!

یہ بھی ارشاد فرمایا لٰكِنِ الرَّسُولُ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ جَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ وَأُولٰئِكَ لَهُمُ الْمُفْلِحُونَ۔

ہاں رسول اور ان کے ایمان والے ساتھیوں نے اپنی جان و مال کے ساتھ جہاد کئے اور بھلائیاں انہیں کے لئے ہیں۔ اور کامیاب و کامران بھی یہی ہیں!

ایک جگہ ارشاد ہے۔ لَا يَسْتَوِي مِنْكُمْ مَنْ أَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقَاتَلَ۔ أُولٰئِكَ أَعْظَمُ دَرَجَةً مِنَ الَّذِينَ أَنْفَقُوا مِنْ بَعْدُ وَقَاتَلُوا وَكُلًّا وَعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ۔

تم میں سے فتح سے قبل جان و مال سے جہاد کرنے والوں کی کوئی برابری نہیں کرسکتا وہ بڑے بلند مرتبہ لوگ ہیں۔ ان کے مقابلہ میں جنہوں نے فتح کے مال و جان سے جہاد کیا۔ اور اللہ کا وعدہ ہر ایک سے بھلائی اور بہتری کا ہے! اور اللہ تعالیٰ تمہارے ہر عمل سے باخبر ہے!

یہ بھی اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ لِلْفُقَرَاءِ الْمُهَاجِرِينَ الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ وَأَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا۔ وَيَنْصُرُونَ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ أُولٰئِكَ هُمُ الصَّادِقُونَ۔

نقراء مہاجرین جو اپنے گھروں سے نکالے گئے ان کے اموال چھینے گئے، وہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کے طلبگار اور اللہ و رسول کی مدد کرنے والے ہیں۔ یہی لوگ سچے ہیں۔

آخر آیت تک کا مضمون سامنے رکھئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ان نفوس مقدسہ سے نفاق کے احتمال تک کو واضح اور کھلے الفاظ میں باطل کرتی ہے!

نیز ارشاد ربانی۔ يَوْمَ لَا يُخْزِي اللّٰهُ النَّبِيَّ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ۔ نُورُهُمْ يَسْعٰى بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَبِأَيْمَانِهِمْ۔

وہ دن کہ نہیں رسوا کرے گا اللہ تعالیٰ اپنے نبی کو اور ان کے مومن ساتھیوں کو ان کا نور ان کے آگے اور دائیں جانب دوڑتا پھریگا۔

یہ ارشاد اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ آخرت میں ان کو کوئی عذاب نہ ہوگا۔ نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ نبی کی وفات کے بعد بھی ان کا نور زائل نہ ہوگا۔ ورنہ زائل شدہ اور لٹا ہوا نور قیامت کے دن ان کے کیسے کام آسکتا ہے۔

اور اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان، وَلَا تَطْرُدِ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيدُونَ وَجْهَهُ۔

اپنے پاس سے ان کو نہ ہٹائیے جو صبح و مسا اپنے رب کو پکارتے ہیں اور اسی کی ذات کے طالب ہیں!

بھی ان محترم و مکرم حضرات رضی اللہ عنہم کے متعلق نفاق کے احتمال کو بھی باطل کرتا ہے۔

وَإِذَا جَاءَكَ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِآيَاتِنَا فَقُلْ سَلَامٌ عَلَيْكُمْ۔ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ أَنَّهُ مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوءًا بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنْ بَعْدِهِ وَأَصْلَحَ فَأَنَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ۔

ہمارے فرمانوں کو ماننے والے اور ان پر ایمان رکھنے والے جب، آپ کے پاس آئیں تو بعد سلام ان کو بتائے کہ تمہارے رب نے ازراہ رحمت اپنے لئے یہ طے فرمالیا ہے کہ تم میں سے ازراہ ناواقفی کوئی برائی کر بیٹھے اور اس کے بعد وہ توبہ کرکے اپنی اصلاح کرلے (تو اسکی مغفرت ہوگی) کیونکہ وہ غفور رحیم ہے!

ان کے گناہوں کے بخشے جانے کی اس سے واضح اور صاف دلالت کیا ہوگی۔ جب رب غفور نے ان کو دامن رحمت میں لے کر معاف فرمادیا تو

www.Ahlehaq.com

اب مواخذہ کا سوال ہی نہیں! ایک اور جگہ ارشاد ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ وَالْقُرْاٰنِ وَمَنْ اَوْفٰی بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ۔

اللہ نے مؤمنوں سے ان کی جان و اموال کے بدلے جنت کا سودا کر لیا ہے۔ کہ وہ اللہ کی راہ میں جہاد کر کے مریں گے بھی ماریں گے بھی! یہ پختہ وعدہ توراۃ و انجیل اور قرآن میں درج ہے اور اللہ سے اپنے عہد کو پورا کرنے میں کون بڑھ سکتا ہے۔

لہٰذا معلوم ہو گیا کہ ان حضرات کے حق میں بدا محال ہے، کہ بہشت اور مغفرت کے خبر دینے کے بعد ان کو عذاب دیں، یا دوزخ میں ڈالیں۔ اس لئے کہ وعدہ میں بدا جائز نہیں۔ ورنہ وعدہ خلافی لازم آئیگی۔ نیز فرمایا لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ۔ (اللہ تعالیٰ ان مؤمنوں سے خوش اور راضی ہوا جنہوں نے درخت کے نیچے آپ سے بیعت کی۔ ان کے دلی جذبات سے بھی آگاہ ہوا۔) اس آیت سے معلوم ہوا کہ رضامندی محض ان کے عمل سے نہ تھی بلکہ ان کے دلوں میں ایمان صدق و اخلاق، ثابت و برقرار تھے، اور جو ان کے رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے تھے رضاء الٰہی کا وہی اصلی سبب تھے!

یہاں بعض نادان شیعہ کہتے ہیں کہ کام سے رضامندی، اس شخص سے رضامندی کو مستلزم نہیں۔ مگر وہ عناد سے اتنے مغلوب معلوم ہوتے ہیں کہ آیت کے الفاظ پر توجہ دینے کی بھی توفیق نہیں ہوئی۔ یہاں اللہ تعالیٰ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ فرمایا ہے۔ عَنْ بَيْعَةِ الْمُؤْمِنِيْنَ نہیں فرمایا۔ اور فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ کو اس کا ضمیمہ و تتمہ بتایا۔ تو ظاہر ہے کہ ثبات و اخلاص اور ارادوں کا محل تو دل ہے، تو خوشنودی صاحب فعل سے متعلق ہے فعل سے نہیں۔ اور نفع اندوزی منشاء فعل سے متعلق ہے صورت فعل کے ساتھ نہیں۔

حاصل کلام یہ کہ اگر کسی کو حفظ قرآن کی نعمت میسر آجائے اور اسکی حدیث و روایات تک رسائی نہ بھی ہوئی ہو تب بھی اس کے لئے یہ ناممکن ہے کہ وہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کے متعلق شبہ میں پڑے یا ان کی بزرگی اور اعزاز و اکرام میں کسی قسم کا شک کرے۔ اس لئے کہ قرآن کا اکثر حصہ ان ہی نفوس قدسیہ کی تعریف و توصیف سے بھرا ہوا ہے۔ ناظرہ خواں بیچارہ آیت کا ایک لفظ پڑھ اور سن لیتا ہے مگر اس کو اس کے آگے پیچھے کا کچھ پتہ نہیں ہوتا اور اسی لئے وہ اس پر غور و تدبر بھی نہیں کر سکتے۔ نہ یہ معلوم کر سکتے ہیں اس میں کون کون سی قیود ہیں اور نظم قرآنی میں اس کا ضمیمہ کس کس چیز کو قرار دیا گیا ہے تا کہ غلط راہوں، اور جاہلوں کو اس میں تاویل و تحریف یا من مانے معنے پہنانے کی گنجائش نہ مل سکے!

اللہ کی قسم! اگر میرے والد ماجد مجھے حفظ قرآن کے علاوہ کوئی اور تعلیم نہ بھی دیتے تب بھی ان کا یہ کام عظیم الشان ہوتا کہ میں تا عمر اس کا شکریہ نہ ادا کر سکتا۔ یہ ساری نعمت مجھے حفظ قرآن کی بدولت میسر آئی کہ ہر دینی مشکل میں اسی سے کام لے کر حل کر لیتا ہوں۔ والحمد للہ حمدا کثیرا طیبا مبارکا فیہ۔

اعتراض۔ (۴) یہ کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے "قرطاس و قلم" طلب فرمایا تو صحابہ نے تعمیل کے بجائے حیلے حوالے سے کام لیا اور آپ سے حجت بازی کی اور جھگڑے!

جواب:۔ اس کا اصل اور تفصیلی جواب حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ پر اعتراض کے موقعہ پر دیا جا چکا ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ جنکے دماغوں میں بغض و عناد اور بدگمانی و بدظنی کا غبار بھرا ہو وہ دوستی اور محبت کے لطیف جذبات کو نہ سمجھ پاتے ہیں نہ ان کی قدر کرتے ہیں۔ جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کی بیماری کے سبب اسوقت جو کیفیت تھی اور آپ جتنے مضطرب و بے چین تھے، اسوقت آپ کو ایسے معاملہ کے لئے جو کسی عنوان طے پا چکا ہو، اور آئین و شریعت کی اس کے ذریعہ کوئی ضرورت پوری بھی نہ ہو رہی ہو، ایسے عالم میں ہر محب مخلص اپنے محبوب

www.Ahlehaq.com

کو ناروا اور فضول مشقت سے بچانا چاہتا ہے۔

اس کے علاوہ اس اعتراض کا ایک دوسرا جواب یہ ہے کہ اسوقت کے حاضرین مجلس میں اکثریت حضرات اہل بیت رضوان اللہ علیہم کی تھی صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم تو کم تعداد میں تھے۔ اب اعتراض کا سارا زور اقلیت پر ڈالدینا جبکہ اکثریت کی شرکت اور مرضی سے وہ فعل انجام پذیر ہوا ہو، انتہائی درجہ بددیانتی اور بیہودگی ہی کہلا سکتی ہے۔

پھر اس واقعہ کے بعد نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم پانچ یوم حیات رہے۔ اہل بیت ہمیشہ خدمت میں رہے، سامان نوشت وخواند موجود اور دسترس میں رہا۔ کاتب بھی متعین رہے۔ اگر وہ کوئی بہت ہی اہم دینی معاملہ تھا تو ساری سہولتوں کی موجودگی کے باوجود آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوبارہ اس خواہش کا یا اس کی تکمیل کا اظہار یا اعادہ کیوں نہ فرمایا۔ اسوقت تو کوئی حیلہ باز اور جھگڑنے والا آپ کے آس پاس نہ تھا۔ کیا کوئی مسلمان نبی محترم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں "ترک واجب" کی سوئے ظنی کے بعد بھی اپنا ایمان سلامت رکھ سکتا ہے!

اللہ تعالیٰ کی جناب سے جنکو "خیر امت" اور "امت وسط" کے معزز القاب عنایت ہوئے ہوں، جن کا فریضہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر ہو، اور جو "شہداء علی الناس" کا تمغہ رکھتے ہوں ان کی نسبت "بدترین امت" کا اعتقاد، خیال وگمان رکھنا۔ اللہ تعالیٰ کی مرضی ہی کے خلاف نہیں نصوص قرآنیہ کی کھلم کھلا مخالفت بھی ہے!

اعتراض۔ (۵)

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے احکامات کی بجا آوری میں سہل انگاری سے کام لیتے تھے مستعدی اور لپک جھپک نہیں دکھاتے۔ بلکہ کاہلی اور سستی دکھاتے۔ آپ کے مقاصد سے روگردانی کرتے۔ جان چراتے اور بے جا ٹال مٹول سے کام لیتے۔ اسکی دلیل میں وہ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کی یہ روایت پیش کرتے ہیں کہ یوم احزاب کے موقعہ پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

اَلَا رَجُلٌ يَأْتِيْنِيْ بِخَبَرِ الْقَوْمِ جَعَلَهُ اللّٰهُ مَعِيْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَلَمْ يُجِبْ اَحَدٌ وَكَانَتْ تَهُبُّ رِيْحٌ شَدِيْدَةٌ وَقَالَ يَا حُذَيْفَةُ ثُمَّ فَلَمْ اَجِدْ بُدًّا اِذْ دَعَانِيْ بِاسْمِيْ اِلَّا اَنْ اَقُوْمَ قَالَ فَاذْهَبْ فَأْتِنِيْ بِخَبَرِ الْقَوْمِ فَلَمَّا وَلَّيْتُ مِنْ عِنْدِهٖ جَعَلْتُ كَاَنَّمَا اَمْشِيْ فِيْ حَمَّامٍ حَتّٰى رَاَيْتُهُمْ وَرَجَعْتُ وَاَنَا اَمْشِيْ فِيْ مِثْلِ الْحَمَّامِ فَلَمَّا اَتَيْتُهٗ وَاَخْبَرْتُهٗ قُرِرْتُ۔

کیا کوئی شخص ایسا ہے جو مخالف لشکر کی مجھے خبر لادے۔ (اس کے اجر میں) اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اسے میرے ساتھ رکھیں گے، مگر کسی نے جواب نہ دیا۔ اسوقت سخت طوفانی جھکڑ چل رہے تھے اور بہت ٹھنڈک تھی، پھر آپ نے ارشاد فرمایا حذیفہ تم اٹھو! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب میرا نام لیکر فرمایا تو مجھے اٹھ جانے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ آپ نے فرمایا جاؤ اور مخالف لشکر کی خبر لاؤ۔ جب میں وہاں سے چلا ہوں تو ایسا معلوم ہوا کہ میں حمام میں چل رہا ہوں حتیٰ کہ میں لشکر کو دیکھ کر واپس ہوا تب بھی کیفیت ایسی ہی تھی۔ جب واپس آکر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع دے چکا تو مجھے ٹھنڈ لگنے لگی۔

ان لوگوں کا یہ اعتراض اس لئے بے محل جواب نہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد حکم کی شکل میں نہیں تھا بلکہ ایسی بات کی صورت میں تھا جو عمومی طور پر سامنے رکھی جاتی ہے۔ اس کی مثال اللہ تعالیٰ کے درج ذیل ارشادات کی طرح ہے

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا۔

ہم نے اپنی امانت زمین وآسمان اور پہاڑوں کے سامنے رکھی، کہ اسے برداشت کریں، مگر وہ اس سے ڈر گئے اور اسے اٹھانے سے انکار کردیا۔

نیز فرمایا۔ فَقَالَ لَهَا وَلِلْاَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا۔

پس اس سے اور زمین سے فرمایا کہ دونوں خوشدلی سے آؤ یا بادل نخواستہ!

www.Ahlehaq.com

فَقَالَتَا اَتَیْنَا طَآئِعِیْنَ۔	دونوں نے کہا ہم خوشدلی ہی سے آتے ہیں!

اور قرائن حالیہ بھی یہی ظاہر کرتے ہیں کہ یہ امر شرعی تبلیغ نہ تھا۔ اور امر ہونے کے باوجود یہ کہاں سے لازم آیا کہ وہ وجوب کے لئے تھا بلکہ اس کا جملہ جعلہ اللہ معی یوم القیمۃ۔ اس کے مندوب و مستحب ہونے پر واضح دلیل ہے۔ کیونکہ واجبات میں ثواب کا وعدہ نہیں فرماتے۔ اگر فرماتے بھی ہیں دخول جنت یا دوزخ سے نجات پر اکتفا فرماتے ہیں۔ اس خاص ثواب کا وعدہ اس کے مندوب ہونے کی واضح دلیل ہے!

بطور اصول یہ بات طے شدہ ہے کہ امر وجوب کے لئے بھی ہو تو وہ وجوب کفایہ ہوگا۔ موسم چونکہ بہت شدید سرد تھا اس لئے ہر ایک نے چاہا کہ یہ کام کوئی دوسرا کرے۔ اگر یہ حکم فرداً فرداً ہر ایک پر واجب ہوتا تو اس کی بجا آوری میں سارے ہی اٹھ کھڑے ہوتے اور جلد از جلد بجا آوری کا مظاہرہ کرتے۔

اگر یہ کوئی بھی بات نہ مانیں تو پھر یہ بتائیں کہ کیا یہ طعن جناب علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ پر وارد نہیں ہوتا۔ کیونکہ وہ بھی تو اس وقت اس جماعت میں شامل اور موجود تھے! آپ نے اس حکم کی تعمیل کیوں نہ فرمائی اور حکم بجا لانے میں عجلت کیوں نہ برتی! اتنے کچھ کے بعد بھی اگر جناب امیر و دیگر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کی شان میں یاوہ گوئی کرے اور خیالات بد کو دل میں جگہ دے، تو ان کا منہ توڑنے کے لیے، کتاب اللہ احادیث رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور کتب سیر سے ہزاروں دلیلیں ان کے منہ پر ماری جا سکتی ہیں۔ یُطِیْعُوْنَ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ۔ کا تمغۂ صداقت و شہادت ان حضرات کے لئے قرآن مجید میں موجود ہے۔ جو مہاجرین و انصار اور مجاہدین رضی اللہ عنہم کو اطاعت و انقیاد کی وجہ سے مرحمت فرمایا گیا۔

بخاری و مسلم اور کتب سیر میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کی جان نثاری، پروانہ وار فدائیگی اور آپ پر دل و جان قربان کرنے کی کیفیات ساری کی ساری محفوظ و موجود ہیں: ان حضرات کے متعلق یہ الفاظ تاریخ نے محفوظ کر رکھے ہیں کہ

کَانُوْا یَبْتَدِرُوْنَ اِلٰی اَمْرِہٖ۔ وَکَادُوْا یَقْتَتِلُوْنَ عَلٰی وَضُوْئِہٖ وَاِذَا تَنَخَّمَ وَقَعَ فِیْ کَفِّ رَجُلٍ مِّنْھُمْ فَدَلَکَ مِنْھَا عَلٰی وَجْھِہٖ۔	وہ آپ کے حکم بجالانے میں ایک دوسرے پر سبقت کرتے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے وضو کے پانی پر لڑ پڑنے کے قریب ہو جاتے۔ اگر آپ کی کلی کا پانی کسی کی ہتھیلی پر آپڑتا تو وہ فوراً اسے اپنے منہ پر مل لیتا۔

کسی ذات کے ساتھ یہ شیفتگی و وارفتگی کسی نے پہلے کہاں دیکھی ہوگی، اور جس نے اب دیکھ لی وہ حیران رہ گیا۔ صلح حدیبیہ کے موقعہ پر جناب عروہ بن مسعود ثقفی رضی اللہ عنہ جو اسوقت مشرکین مکہ میں سے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جانی دشمن۔ وہ مکہ والوں کی طرف سے سوال و جواب کے لئے آئے ہوئے تھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی محبت و شیفتگی کی یہ کیفیت دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ جب مکہ واپس گیا تو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کی مدح سرائی۔ اور تعریفوں کے پل باندھ دئے۔ اور کہا کہ میں نے قیصر و کسریٰ اور شاہان عجم اور دوسرا سلاطین سب کو دیکھا سب کے درباروں میں گیا ہوں، مگر کسی کو بھی گو اسکی سات پشتیں نوکری میں گزر گئی ہوں اتنا مطیع و منقاد نہیں دیکھا۔

ان شیعوں پر تو کلمہ گوئی ایک تہمت ہی ہے۔ ورنہ کوئی کلمہ گو کلمہ پڑھ لینے کے بعد ان نفوس مقدسہ کے متعلق ایسی یاوہ گوئی اور ہرزہ سرائی نہیں کر سکتا! اگر امتثال امر میں اس قسم کی سستی موجب طعن ہوتی ہے تو انہیں چاہئے کہ وہ انبیاء کرام علیہم السلام کے لئے بھی ایک دفتر لکھ ڈالیں! اور سر فہرست ابو البشر سیدنا آدم علیہ السلام کا اسم مبارک لکھ لیں! کہ اللہ تعالیٰ نے بلا واسطہ ایک درخت کے کھانے سے منع فرمانے کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتا دیا یہ شیطان تمہارا دشمن ہے، ایسا نہ ہو تم دونوں کو جنت سے نکلوا دے۔ مگر اس کے باوجود آپ نے شیطانی وسوسہ کے زیر اثر اس درخت کو کھالیا! ایک بات البتہ ہے۔ یہ معترض شیعہ آخر انہیں اسلاف کے اخلاف تو ہیں جو جناب امیر رضی اللہ عنہ کے لشکری تھے، اور جو عدول حکمی اور شوخ چشمی میں بدنامی کی حد تک مشہور ہیں ان کی نافرمانی کی گواہی تو خود جناب علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے بر سر منبر دی، جس کی کیفیت انہیں کی اصح الکتب نہج البلاغہ میں مسطور و مرقوم ہے۔ اور جس کا حوالہ اس کتاب

میں بھی گذر چکا ہے۔ یہ لوگ ان اسلاف پر عائد شدہ مطاعن کو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم جیسے پاکباز محب و منقاد حضرات کے کھاتے میں ڈالنا چاہتے ہیں۔

اعتراض۔ (۶) کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دوستوں سے فرمایا

أَنَا آخِذٌ بِحُجَزِكُمْ عَنِ النَّارِ هَلُمَّ عَنِ النَّارِ هَلُمَّ عَنِ النَّارِ فَتَغْلِبُونَنِي وَتَتَقَحَّمُونَ فِيهَا

میں تمہاری کمر پکڑ کر آگ سے کھینچتا ہوں اور کہہ رہا ہوں کہ آگ سے ادھر آؤ، آگ سے ادھر آؤ۔ مگر مجھ سے چھوٹ کر آگ میں گر پڑتے ہو!

یہ اعتراض پہلے اعتراض سے بھی زیادہ لچر پوچ ہے! اس روایت کے سیاق و سباق سے پتہ چلتا ہے کہ یہ ایک نبی اور ایک امت کی مثال ہے۔ وہ کوئی بھی نبی ہو سکتا ہے۔ اور کوئی سی بھی امت! اس میں اپنے اصحاب کرام رضوان اللہ علیہم کی تخصیص ہو بھی کیسے سکتی ہے جبکہ ہر شخص کی شہوات نفسی و غضبی اسے دوزخ کی طرف کھینچتی ہیں۔ اور پیغمبر کی نصیحت اور فرمان اس کو اس سے روکتا ہے لہذا ہر نبی کی مثال اپنی امت کے ساتھ اس شخص کی سی ہے جو محض شفقت و ہمدردی و خیر خواہی کے جذبہ سے ہر شخص کی کمر پکڑ کر اپنی طرف کھینچتا اور وہ غلبہ غضب و شہوت کے سبب اس سے چھڑا کر جلتی آگ میں گھسا جاتا ہے، اور اکثر لوگوں میں چونکہ شہوت و غضب کا غلبہ شدید ہوتا ہے اس لئے پیغمبر کی شفقت و جذبہ کارگر نہیں ہوتی اور آگ میں گر پڑتے ہیں۔ اور پھر یہ تو تمثیل میں ذکر کردہ آگ ہے، آتش دوزخ آخرت نہیں ہے۔ اور اس آگ سے مراد گناہ اور خواہشات و شہوات ہیں جو عموماً آتش دوزخ میں جانے کا باعث بنتے ہیں۔ یہاں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کا دوزخ میں گرنا ہرگز مراد نہیں ہے۔ ورنہ تو یہ حدیث قرآنی آیت کے صریحاً مخالف ہوگی۔ جس میں فرمایا گیا ہے کہ وَكُنْتُمْ عَلَىٰ شَفَا حُفْرَةٍ مِنَ النَّارِ فَأَنْقَذَكُمْ مِنْهَا۔ (تم دوزخ کے گڑھے کے کنارے پہ تھے کہ اس نے تمہیں بچا لیا)

اس کے علاوہ بھی قرآن مجید میں بہت سی آیات میں ان کے لئے جنت تیار کرنے اور عظیم کامیابی اور بہترین اجر کا وعدہ ہے۔

اور پھر اگر انہیں لفظ کے عموم سے دلیل لانے پہ اصرار ہی ہے تو پھر یہ سب کو شامل ہوگی، اور ان سب میں جناب علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی ذات گرامی بھی شامل ہوگی۔ (پناہ بخدا) اور اگر خصوص خطاب سے دلیل لیتے ہیں تو پھر بعض کے فعل سے سب پہ اعتراض کرنا لازم آتا ہے جو بالکل غیر معقول ہے!

اعتراض۔ (۷) صحیح مسلم میں جناب عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے ایک روایت مروی ہے کہ

أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ. إِذَا فُتِحَتْ عَلَيْكُمْ خَزَائِنُ فَارِسَ وَالرُّومِ أَيُّ قَوْمٍ أَنْتُمْ قَالَ عَبْدُ الرَّحْمٰنِ بْنُ عَوْفٍ كَمَا أَمَرَنَا اللَّهُ تَعَالَىٰ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَلَّا بَلْ تَتَنَافَسُونَ تَتَحَاسَدُونَ ثُمَّ تَتَدَابَرُونَ ثُمَّ تَتَبَاغَضُونَ.

جناب رسول اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب روم و فارس کے خزانوں پر تمہاری دسترس ہوگی اسوقت (باعتبار اخلاق) تم کیسی قوم ہوگے۔ عبدالرحمٰن بن عوف نے فرمایا اللہ کے حکم کے مطابق۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہرگز نہیں بلکہ تم باہم حریص ہوگے ایک دوسرے سے حسد کروگے۔ ایک دوسرے سے آنکھیں چراؤگے اور ایک دوسرے سے بغض رکھوگے!

جواب:۔۔۔ اس طعن و اعتراض کا یہ ہے کہ یہاں انہوں نے بددیانتی کا حسب عادت مظاہرہ کیا ہے، وہ الفاظ نقل کر دیے جن پہ اعتراض کرنا مقصود تھا اور حدیث کا تتمہ جو ان کے مذموم مقصد کی تردید کرتا اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کو اعتراض سے بچاتا اور اصل مراد کو ظاہر کرتا ہے اسے گول کر گئے! بالکل اسی ملحد کی طرح جو لا تقربوا الصلوٰۃ، کو تو اپنی مطلب برآری کے لئے پڑھتا ہے مگر اتمام سکاری کو ہضم کرتا ہے۔ چوری تو ہر جگہ اور ہر معاملہ میں قابل نفرین حرکت ہے مگر خاص کر ایسے مقامات پہ حدیث کی چوری نہ صرف نازیبا بلکہ چور کی منافقت

سمجھی جائے گی۔ حدیث کا آخری حصہ ان الفاظ پر مشتمل ہے۔

ثُمَّ تَنْطَلِقُوْنَ اِلٰی مَسَاکِنِ الْمُهَاجِرِیْنَ فَتَحْمِلُوْنَ بَعْضَهُمْ عَلٰی رِقَابِ بَعْضٍ۔

پھر تم مہاجرین کی طرف جاؤگے اور وہاں ان کے بعض کو دوسرے کی گردن پر سوار کروگے!

اس سے دو باتیں معلوم ہوئیں کہ بغض و حسد کرنے والا کوئی اور فرقہ ہے! اور یہ فرقہ مہاجرین صحابہ کا تو بالکل نہیں۔ خواہ وہ انصار ہوں یا دوسرے۔ مگر انصار کرام رضی اللہ عنہم سے بھی ایسی حرکت سرزد نہیں ہوئی کہ مہاجرین کو باہم ورغلا کر لڑا دیا ہو۔ اب لے دے کے ایسے لوگوں کا وجود تابعین ہی میں پایا جا سکتا ہے۔ کیونکہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم جو موضوع بحث میں دو ہی گروہوں میں منقسم ہیں۔ یعنی مہاجر و انصار۔ ان کا مہاجر ہونا تو از روئے حدیث غلط ٹھہرا۔ اور انصار ہونے کی حالات و واقعات تردید کر رہے ہیں۔ اور حدیث کے الفاظ غیر مبہم طور پر اعمال بد کے وقوع کا زمانہ فارس و روم کے خزانے فتح کرنے کے بعد متعین کرتے ہیں۔ کہ اسوقت تم میں سے بہت سے لوگ خزائن و فتوحات کی کثرت کی بنا پر بغاوت و فساد کی راہ اختیار کریں گے۔ اور مہاجرین کو کہ خلافت و ریاست ان کا ورثہ ہے چرب زبانی، دروغ گوئی اور لگائی بجھائی کر کے باہم لڑادوگے! جب ہم تاریخ کے اوراق میں اس جماعت اور اس کے سرغنوں کا کھوج لگاتے ہیں تو وہاں، جناب عبد الرحمٰن بن ابی بکر، مالک اشتر، مروان بن حکم، اور ان جیسے لوگوں کے نام نمایاں درج ملتے ہیں۔

لہٰذا اس اعتراض و طعن کا ہدف صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم ہرگز نہیں۔ ورنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام مبارک میں معاذ اللہ کذب لازم آئے گا۔

ایک اور جواب اس قسم کے اعتراض کا نبوت کی بحث میں گذرا ہے، کہ شیعی روایت کے مطابق اللہ تعالیٰ کی طرف سے تنبیہہ اور ملامت کے باوجود ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام، تمام عمر ائمہ اہل بیت کی طرف سے حسد و بغض میں گرفتار رہے۔ (نعوذ باللہ من ذلک) تو ان معصوم کی پیروی میں غیر معصوم صحابہ بھی قدم زن ہوگئے تو اعتراض کیوں! اگر شیعوں کے ہاں پیغمبر معصوم کے عمل کی کوئی توجیہہ یا جواب ہو سکتا ہے تو حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کی بابت اہل سنت کی طرف سے بھی وہی توجیہہ یا جواب تصور کر لیا جائے!

اعتراض۔ (۸) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ مَنْ اٰذٰى عَلِيًّا فَقَدْ اٰذَانِيْ۔ جس نے علی رضی اللہ عنہ کو ستایا اس نے گویا مجھے ستایا، اور حضرت بی بی فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کی نسبت فرمایا۔ مَنْ اَغْضَبَهَا اَغْضَبَنِيْ۔ جس نے انہیں غصہ دلایا اس نے گویا مجھے غصہ دلایا۔ حالانکہ سب صحابہ نے علیؓ کی عداوت اور بی بی زہراء (رضی اللہ عنہا) کی ایذا رسانی پر اتفاق کیا ہے۔ انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جنگ کی ان کو رسوا کیا جبکہ حضرات شیخین رضی اللہ عنہما نے ان کے گھر کو جلانا چاہا۔

اسکی تفصیل شیعہ یوں بیان کرتے ہیں کہ

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے چچا زاد بھائی قنفذ کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بلانے کے لئے بھیجا۔ کہ وہ آکر بیعت کریں مگر وہ نہیں آئے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو طیش آیا۔ اور خود ان کے گھر گئے اور ساتھ ہی اپنے ساتھ لکڑی کے گٹھے اور آگ بھی لے گئے۔ گھر پہنچے تو دروازہ بند دیکھا تو زور سے آواز دی کہ علی بن ابی طالب (رضی اللہ عنہ) دروازہ کھولو۔ مگر جناب علی (رضی اللہ عنہ) خاموش رہے اور دروازہ نہ کھولا۔ تو آپ نے دروازہ کو آگ لگادی اور بلا تامل اندر گھس گئے۔ جب سیدہ زہراء (رضی اللہ عنہا) نے یہ دیکھا تو بے اختیار حجرہ سے نکل آئیں اور عمر (رضی اللہ عنہ) کے سامنے آکر اپنے بابا صلی اللہ علیہ وسلم کا نام لے لے کر رونا شروع کر دیا۔ تب عمر (رضی اللہ عنہ) نے اپنی تلوار مع میان کے ان کی کوکھ میں چبھوئی۔ اور علی (رضی اللہ عنہ) سے کہا ہاں اٹھو اور ابوبکر (رضی اللہ عنہ) کے ہاتھ پر بیعت کر لو۔ ورنہ میں تمکو قتل کردوں گا۔ سارے صحابہ اسوقت موجود تھے مگر کسی نے دم نہ مارا۔ اور پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کی دختر و داماد (رضی اللہ عنہما) کو ظالموں

کے ہاتھ میں دیدیا۔ اور پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اس وصیت کو جو آپ نے اہل بیت کے حق میں فرمائی تھی پس پشت ڈالدیا،،

جواب: اس اعتراض کا یہ ہے کہ یہ سارا قصہ اور بیان شیعوں اور کوفہ کے کذابوں کا من گھڑت افترا اور دروغ بے فروغ ہے! تو وہ جھوٹ گھڑیں، بہتان باندھیں اور اس کا جواب اہل سنت سے مانگیں، تو یہ بے چارے کیسے عہدہ برآ ہو سکیں گے جب اہل سنت سے ہی جواب لینا ہے تو پہلے اہل سنت کی کتابوں سے اسکی حقیقت معلوم کرو اور پھر جواب مانگو اس لیے کہ اہل سنت کے ہاں روایات میں دروغگوئی کا چلن نہیں۔ ان کے ہاں تو جو بات صحیح ہے وہ بلاکم وکاست حوالہ قرطاس وقلم ہوتی ہے۔ یہ ہر مسلمان کو جان لینا چاہیئے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم میں سے کوئی بھی جناب امیر اور سیدہ زہراء رضی اللہ عنہما کے درپے آزار نہ ہوا نہ ان کے ساتھ پرخاش رکھی بلکہ ہمیشہ ان کی شان کے شایاں عزت وتوقیر کرتے ہر طرح کی مدد ونصرت کے لیے کمربستہ رہتے۔ اور سر آنکھوں پر بٹھاتے رہے جب بھی ان کی طرف سے کسی اعانت کی طلب ہوئی یا کسی ضرورت کو محسوس کیا گیا۔ ان کی مدد واعانت کی گئی۔ چنانچہ عبدالرحمٰن ابزی کہتا ہے۔

شَهِدْنَا صِفِّيْنَ مَعَ عَلِيٍّ فِيْ ثَمَانِ مِائَةٍ مِمَّنْ بَايَعَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ بَيْعَةَ الرِّضْوَانِ وَقُتِلَ مِنْهُمْ ثَلَاثَةٌ وَسِتُّوْنَ رَجُلًا مِنْهُمْ عَمَّارُ بْنُ يَاسِرٍ وَخُزَيْمَةُ بْنُ ثَابِتٍ ذُوْ الشَّهَادَتَيْنِ وَجَمْعٌ كَثِيْرٌ مِنَ الْمُهَاجِرِيْنَ وَالْأَنْصَارِ وَقَدْ ذَكَرَهُمْ وَغَيْرُهُ

ہم (حضرت) علی (رضی اللہ عنہ) کے ساتھ جنگ صفین میں آٹھ سو نفر تھے جنہوں نے بیعت رضوان کی تھی ان میں سے تریسٹھ افراد مقتول ہوئے جن میں عمار بن یاسر اور خزیمہ بن ثابت ذوالشہادتین رضی اللہ عنہما بھی تھے۔ اور مہاجرین والانصار (رضوان اللہ علیہم) کی ایک بہت بڑی جماعت تھی جن کا اس نے اور دوسروں نے بھی ذکر کیا ہے یہ

یہ بات جناب امیر رضی اللہ عنہ کے خطبہ مندرجہ نہج البلاغہ میں موجود ہے، علاوہ ازیں آپؓ کے جناب معاویہ رضی اللہ عنہ کو جو خطوط تحریر فرمائے وہ سب موجود ہیں جن میں آپؓ نے مہاجرین وانصار کے ساتھ ہونے کو اپنی خلافت کے حق ہونے کی دلیل قرار دیا ہے! ایسی صورت میں یہ کیسے ممکن ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسے دانا اور فہیم سے ایسا عمل ظہور میں آئے۔ اور یہ قنفذ کون ہے جس کے نہ نام کا پتہ نہ ذات کا۔ یہ کس حیثیت سے آپ کے ساتھ ایسا سلوک کرسکتا تھا۔

آپؓ کا ساتھ دینے والے اور جنگ صفین میں آپ کے دوش بدوش یہی مہاجر وانصار تو تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نظروں سے ابھی ابھی اوجھل ہوئے تھے، جناب زہراء رضی اللہ عنہا موجود تھیں۔ جناب شیخین رضی اللہ عنہما کی قوت وشوکت انہیں دو گروہوں سے تھی۔ بخلاف جناب معاویہ رضی اللہ عنہ کے کہ ان کے پاس تو ایک لاکھ شامی پہلوان پشت پناہی کے لیے موجود تھے، وہ اگر انصار ومہاجرین کو نظرانداز کرتے تھے تو یہ بات سمجھ میں آسکتی ہے۔ لیکن اس دور میں جبکہ سارے کے سارے مہاجر وانصار زندہ ہوں۔ کوئی فوت نہ ہوا ہو اور نہ ہی قتل ہوا ہو، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جدا ہوئے بھی دو چار گھڑیاں ہوئے ہوں۔ تو یہ کیسے تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ ان مہاجر وانصار نے خاندان رسول پر "ظلم" ہوتے دیکھا اور خاموش رہے! ظلم وغضب کے معاملہ میں خاموشی! یہ ان نفوس زکیہ پر الزام واتہام ہے، ان کی اجتماعی خاموشی کا صرف ایک ہی مطلب تھا جو ہوسکتا ہے عین منشاء نبوت کے مطابق ہو رہا ہے اور کسی پہلو بھی نہ کسی پر جبر ہے نہ ظلم، اور نہ کسی کی حق تلفی کی جارہی ہے نہ کسی کو ستایا جارہا ہے نہ اسے ذلیل کیا جارہا ہے! افہام وتفہیم کی فضا ہے، آراء کا اختلاف اگر ہے بھی تو اسے فہم وفراست سے حل کیا جارہا ہے۔ لاٹھی یونکا، اور وہ ایسے معاملہ میں جس کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات موجود ہوں، اہل اللہ دھتہ انہیں تسلیم کرکے عمل پیرا ہو چکے ہوں۔ یہ صرف دشمنان اسلام کا پروپیگنڈہ ہے اور کچھ نہیں۔ پھر جناب معاویہ رضی اللہ عنہ کے معاملہ میں دیکھ لیں، کہ وہ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ پر حملہ آور نہیں ہوئے بلکہ آپ ہی نے ان کی سرکشی کی وجہ سے ان پر حملہ کیا تھا۔ مگر اس کے باوجود مہاجر وانصار رضوان اللہ علیہم معتدبہ تعداد آپ کے زیر علم اور شانہ بشانہ تھی! اگر سارے ہی مہاجر وانصار ان

www.Ahlehaq.com

کے خلاف اور ان کو دشمنوں کے حوالہ کرنے والے تھے تو یہ تعداد کہاں سے آگئی بغرض یہ سب کچھ کسی بھی عقل رکھنے والے کی سمجھ میں نہیں آتا ہاں جسکی عقل شیطان یا اخوان الشیطان نے مار رکھی ہو وہ البتہ صحرائے ضلالت و گمراہی میں، بھٹکنے والا ہی ایسی باتیں گھڑتا یا باور کرتا تھا اب پہلے آپ یہ ملاحظہ فرمائیے کہ حضرت ابو بکر صدیق اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما دونوں کے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے متعلق کیا خیالات اور کیا برتاؤ تھا۔

جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ہمیشہ آپ کے اوصاف و فضائل میں رطب اللسان رہتے دوسرے صحابہ کرام کو آپکی عزت و توقیر کرنے کیلئے تاکیدات فرماتے رہتے۔ چنانچہ دارقطنی رحمۃ اللہ علیہ نے شعبی رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کی ہے کہ

ایک مرتبہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے وہاں حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی تشریف لے آئے تو آپ کو دیکھ کر جناب صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا جسے ایسے آدمی کے دیکھنے کی خواہش و خوشی ہو جو لوگوں میں باعتبار مرتبہ بلند ہو، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے باعتبار قرابت سب سے قریب ہو، اور آپ کی پیروی و متابعت میں سب سے افضل و برتر ہو تو اسے چاہیئے کہ وہ ان آنے والے صاحب کو دیکھ لے!

اسی طرح حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ بھی آپ کی توقیر و تعظیم کرتے، آپ سے صلاح و مشورہ طلب کرنے میں مبالغہ فرماتے تھے۔ دارقطنی نے سعید بن مسیب کی روایت میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے یہ الفاظ روایت کئے ہیں۔

اَیُّھَا النَّاسُ اِعْلَمُوْا اَنَّہٗ لَا یَتِمُّ شَرَفٌ اِلَّا بِوِلَایَۃِ عَلِیِّ بْنِ اَبِیْ طَالِبٍ ۔ (لوگو خوب سمجھ لو کہ شرافت کی تکمیل علی کی دوستی ہی سے ہو سکتی ہے)۔ اور جب موؤدہ کے متعلق سوال اٹھا تو صحابہ کرام باہم مختلف الرائے تھے، اسی میں یہ سوال پیش آیا کہ مہینہ دو مہینہ کا ساقط کردہ حمل بھی موؤدہ کہلائے گا یا نہیں۔ تو محتاط صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کی رائے تھی کہ وہ بھی موؤدہ میں شامل ہے مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا واللہ جب تک اس پر سات مرتبہ نہ گذر لیں وہ موؤدہ نہیں ہوتی۔ یہ حضرت جناب فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا، صَدَقْتَ اَطَالَ اللّٰہُ بَقَاءَکَ اَبَا الْقَاسِمِ۔ (ابوالقاسم اللہ آپ کی زندگی دراز فرمائے آپ نے سچ فرمایا)

حریری نے "درۃ الغواص فی اغلاط الخواص" میں لکھا ہے کہ یہ دعائیہ جملہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پہلے پہل ادا فرمایا۔

عظیم باپ کے صحیح خلف الرشید حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما برگزیدہ اصحاب کرام میں شمار ہوتے ہیں۔ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہمراہ جہاد و قتال میں عدم شرکت پر ہمیشہ ملول و متاسف رہے۔ طبرانی نے اوسط المعاجم، میں روایت بیان کی ہے کہ جب حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو مکہ میں یہ معلوم ہوا کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ جانب عراق روانہ ہو گئے ہیں۔ تو یہ مکہ سے دوڑ پڑے اور تین دن رات کے فاصلہ کی مسافت پر آپ کو جالیا آپ سے کہا۔

اَیْنَ تُرِیْدُ فَقَالَ الْحُسَیْنُ اِلَی الْعِرَاقِ فَاِذَا مَعَہٗ کُتُبٌ وَطُوَامِیْرُ فَقَالَ ھٰذِہٖ کُتُبُھُمْ وَبَیْعَتُھُمْ فَقَالَ لَا تَنْظُرْ اِلٰی کُتُبِھِمْ وَلَا تَاْتِھِمْ فَقَالَ ابْنُ عُمَرَ اِنِّیْ مُحَدِّثُکَ حَدِیْثًا اِنَّ جِبْرَئِیْلَ اَتَی النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَخَیَّرَہٗ بَیْنَ الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ فَاخْتَارَ الْاٰخِرَۃَ وَاِنَّکَ بِضْعَۃٌ مِّنْ رَّسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَا یَلِیْھَا اَحَدٌ مِّنْکُمْ فَاَبٰی اَنْ یَّرْجِعَ وَاَعْتَنَقَہٗ ابْنُ عُمَرَ

آپ کا ارادہ کہاں جانے کا ہے؟ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے بتایا کہ عراق جا رہا ہوں۔ اور آپ کے ساتھ مکاتیب و عہد ناموں کے بڑے دفتر اور طومار تھا۔ جس کے متعلق فرمایا کہ یہ وہاں کے لوگوں کے خطوط ہیں اور یہ بیعت نامے ہیں! حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کہنے لگے ان خطوط اور بیعت ناموں پر نہ جائیے۔ میں جو کہتا ہوں بغور سنئے، کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جبرئیل امین آئے اور دنیا و آخرت میں سے ایک کے اختیار کرنے کا حق دیا کہ ان میں سے جو چاہیں پسند فرمالیں

نبکی واجھش فی البکاءِ، استکود عک من قتیلٍ.

فرمائیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے آخرت کو اختیار فرمایا۔ اور آپ بھی ان کے جسد مبارک کا ایک جزو ہیں آپ میں سے کوئی بھی متولی خلافت نہ ہوگا۔ پھر بھی حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے واپسی سے انکار فرمایا تو عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے ان سے معانقہ کیا اور باواز بلند رو رو کر کہے جا رہے تھے کہ اے مقتول میں تمہیں خدا کے سپرد کرتا ہوں ۔۔

مرزانے بھی عمدہ وصحیح سند کے ساتھ اسی قسم کی روایت بیان کی ہے!

اب ہم ان لڑائیوں کے معاملہ کو لیتے ہیں جو حضرت طلحہ، جناب زبیر اور ام المؤمنین رضی اللہ عنہم اجمعین اور جناب امیر رضی اللہ عنہ کے مابین واقعہ ہوا۔ اس سلسلہ میں یہ بات تو بلاخوف وتردید بلا تامل کہی جا سکتی ہے کہ ان لڑائیوں کی بنا جناب امیر رضی اللہ عنہ سے بغض وعناد ہرگز نہ تھا۔ نہ آپ کو ایذا پہنچانا مطمح نظر تھا بلکہ ان کے کچھ دوسرے ہی سیاسی قسم کے اسباب وعوامل تھے۔ جنکو قابل اعتما د مورخین نے شرح وبسط اور اور خاصی تفصیل سے مدوّن ومرتب کیا ہے۔ اور وہ سارے کے سارے اسباب وعوامل وقوع میں بھی آئے۔

اجمالاً ان کو یوں بیان کیا جا سکتا ہے، کہ جب حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو کوفہ ومصر کے اوباشوں اور شورش پسند بد معاشوں نے شہید کر دیا۔ تو اسوقت فضا وحالات کو دیکھتے ہوئے جناب امیر رضی اللہ عنہ نے ان سے الجھنا یا دار وگیر کرنا مصلحتاً مناسب خیال نہیں فرمایا۔ اور خاموشی اختیار فرمائی۔ مگر ان بدبختوں نے اپنے اس فعل قبیح وشنیع کو لائق ستائش سمجھا اور اس پر فخر کرنا اور حضرت شہید رضی اللہ عنہ کو برائی سے یاد کرنے کی مذموم حرکت بھی شروع کر دی۔ اور علی الاعلان کہنے لگے کہ ہم نے جو کیا یہی حق ہے۔ دوسری طرف چند برگزیدہ صحابہ کی ایک جماعت جسمیں جناب طلحہ وزبیر، نعمان بن بشیر، اور کعب بن عجرہ، وغیرہ رضی اللہ عنہم قتل عثمان رضی اللہ عنہ سے بہت دلگیر اور متاسف وملول تھے۔ وہ کہتے تھے کہ یہ بدترین سانحہ ہے جو امت میں رونما ہوا اگر ہمیں ابتدا ہی میں صحیح طور پر معلوم ہو گیا ہوتا کہ ایسا ہوگا تو اب اول قدم پر ہی اس کا سدباب کر دیتے! افسوس وہ مظلوم مارے گئے۔ وہ یقیناً حق پر تھے، ان کے قاتلین ہی غلط رو اور باطل پر تھے! قاتلوں اور شورش پسندوں کو جب یہ معلوم ہوا کہ بعض حضرات ہمارے خلاف یہ رائے رکھتے ہیں تو انہوں نے طے کیا کہ ان کو بھی جام شہادت پلا کر حضرت عثمان شہید رضی اللہ عنہ کی راہ پر روانہ کر دیں۔ بعض مخلص اور ہمدرد لوگوں کے ذریعہ اس بخت وپز کی اطلاع ان حضرات کو ملی اور یہ حضرات مکہ مکرمہ روانہ ہو گئے۔ وہاں ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بسلسلہ حج پہلے سے قیام فرما تھیں! ان حضرات نے سارے حالات وکوائف سے آپ کو آگاہ کر کے یہ بھی کہا کہ اب ہم آپ کی پناہ میں ہیں۔ کہ پریشانی میں ماں کی گود بچہ کے لئے باعث سکون ہوتی ہے۔ آپ مسلمانوں کی ماں ہیں۔ مسلمانوں پر جو افتاد آپڑی ہے اور عربوں کی جو آفت ہمارے سروں پر مسلط ہو گئی ہے اس کو اب صرف آپ ہی ٹال سکتی ہے! کیونکہ امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ نے تو مصلحت وقت کے پیش نظر ان بدبختوں کے سامنے خاموشی اختیار فرمائی ہے! اور شرپسندوں نے اس خاموشی کو کمزوری سمجھ لی ہے۔ اور اب وہ ظلم وتعدی پر زیادہ جری اور بے باک ہوتے جا رہے ہیں۔ جب تک حضرت عثمان شہید کا قصاص ان سے نہ لیا جائے گا۔ اور ان کی بدکرداری کی قرار واقعی سزا نہ دی جا سکیگی معاملات صحیح نہ ہوں گے۔ ان کا ظلم وتعدی بڑھتی رہیگی۔ کوئی ان کا ہاتھ پکڑنے والا نہ ہوگا تو من مانی کریں گے۔ دیار وامصار میں انتشار وافتراق پھیل جائے گا اور سارے مسلمان امن واطمینان سے محروم ہو جائیں گے!

اسوقت جناب صدیقہ رضی اللہ عنہا نے مشورہ دیا کہ جب تک امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ ان کے گھیرے میں ہیں اور وہ لوگ مدینہ میں ہیں تم مدینہ نہ جاؤ، جہاں اطمینان وسکون نظر آئے وہاں قیام کرو، اس دوران تدبیروں سے حیلے حوالوں سے یہ کوشش جاری رکھو کہ

www.Ahlehaq.com

جناب امیر رضی اللہ عنہ ان کے نرغہ سے نکل آئیں۔ جب ان سے ان بدبختوں کا اثر ختم ہوجائے گا تو اسوقت تمہاری رفاقت ان کے لئے مفید بھی ہوگی اور موثر بھی۔ اسوقت جب وہ تمہارے ساتھ ہوں گے اور تمہاری رفاقت قبول کریں گے تب اس پر غور کرنا اور سوچنا کہ خلیفہ مظلوم کا قصاص کس طرح لیا اور قاتلوں کو سرزنش تنبیہہ اور گوشمالی کس طرح ہو کہ دوسروں کو اس سے عبرت حاصل ہو، مگر یہ کام بہت بڑا ہے۔ اسے بچوں کا کھیل نہ سمجھنا۔ تمام موجود صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم نے اس رائے کو پسند کیا۔ اور چونکہ اسوقت مسلمانوں کی فوجیں عراق و بصرہ میں تھیں اس لئے انہیں اطراف کو قیام کے لئے مناسب خیال کیا۔ اور ام المؤمنین حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا پر زور ڈالا کہ جب تک فتنہ فرو نہ ہو اور امن و امان نہ قائم ہو، اسور خلافت صحیح طور پر انجام نہ پانے لگیں۔ اور ہماری ملاقات امیر المؤمنین سے نہ ہو جائے، آپ ہمارے ساتھ ہی قیام فرمائیے۔ آپ ہمارے لئے بہت بڑا سہارا ہیں۔ آپ امت کی ماں ہیں آپ کا اعزاز و اکرام بھی تمام امہات سے بڑھا ہوا ہے۔ آپ کے ہوتے ہوئے ہم پر ہاتھ اٹھانے کی کسی بدبخت کو جرأت نہ ہوگی۔ لہٰذا بہت سی مصالح ملکی و ملی کی خاطر اور اس توقع پر کہ جو خلیج مسلمانوں میں پیدا کر دی گئی ہے۔ اس کو پاٹنے اور مسلمانوں کی شیرازہ بندی میں آپ کی مساعی ممکن ہے بارآور ہو جائیں ام المؤمنین رضی اللہ عنہا نے ان کے ساتھ رہنے کا فیصلہ فرمالیا۔ ان میں سے آپؓ کے اقارب بھی تو تھے۔ ایک سگے بھانجے، دوسرے بہنوئی۔ اور بھی دیگر اصحاب! چنانچہ آپ بصرہ کی طرف روانہ ہوئیں۔

مگر قاتلین اور شورش پسندوں کی یہ حرکت کسی فوری جذبہ یا ابال کا نتیجہ نہ تھیں نہ ہی اس کا سبب تھا کہ حضرت عثمان شہید رضی اللہ عنہ خلیفہ راشد و عادل نہ تھے۔ بلکہ یہ اسلام کے خلاف کفر کی اولین سازش تھی جس کی پشت پر پوری شیطنت اور ابلیسیت کی طاقت مرکوز تھی!

مدتوں منصوبہ بندی کی گئی، رجال کار تیار کئے گئے، اور اس کی خشت اول عبداللہ بن سبا یہودی تھا۔ برسوں سے خفیہ واعلانیہ تحریک چلائی جارہی تھی۔ اطراف واکناف سے شورش پسندوں اور فسادیوں کو ورغلایا اور ابھارا گیا تھا۔ پھر یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ برسوں کی محنت اور تیاری پر وہ کسی بے تدبیری سے پانی پھیر دیتے - لہٰذا قتل عثمان کے بعد بیعت حاکہ پر انہوں نے اپنی گرفت ڈھیلی نہیں کی۔ اول پروگرام - بیعت حضرت علی رضی اللہ عنہ۔ جب اطمینان سے پورا کر لیا، تب بھی ان کے گرد سے اپنا گھیرا نہیں ہٹایا۔ بلکہ گرفت اور گھیراؤ اور سخت مضبوط کر دیا۔ اور حالات کو اس نہج پر لے آئے کہ سازشی گروہ معتبر مانا جانے لگا۔ وہ جو کچھ کہتے وہی صحیح تسلیم ہوتا۔ وہ جو سازش بھی چاہتے کامیاب ہو جاتی تھی۔ چنانچہ ام المؤمنین رضی اللہ عنہا کے پیش نظر اصلاح بین المسلمین کا پروگرام تھا وہ اگر کامیاب ہو جاتا تو نہ صرف قاتلان عثمان کیفر کردار کو پہنچا دئے جاتے بلکہ منافقت بھی اپنی موت آپ مرجاتی، مگر مشیت ایزدی میں کچھ اور ہی طے تھا اس لئے ام المؤمنین کے سفر خیر کو بھی دشمن نے اُلٹا مطلب برآری بنالیا۔ اور جناب امیر تک یہ قصہ بہت سی رنگ آمیزیوں کے ساتھ دوسرے انداز میں پیش کیا۔ اور آپ پر زور دیا کہ آپ کو لامحالہ ان کا تعاقب کرنا چاہیئے۔ حضرات حسنین، عبداللہ بن جعفر اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم نے ہر چند اس سے روکا۔ اور مخالفت کی، مگر آپ پر اثر فسادیوں کا ہی غالب رہا ان حضرت کی بات آپ نے نہیں مانی۔ بالآخر آپ تعاقب میں روانہ ہو گئے!

جب بصرہ پہنچے، تو آپ نے قعقاع کو ام المؤمنین اور حضرت طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہم کے پاس بھیجا کہ معلوم کریں ان حضرات کا ارادہ و مقصد کیا ہے۔ چنانچہ قعقاع آپ کی خدمت میں آئے اور دریافت کیا ام المؤمنین آپ کے سفر کی کیا غرض ہے آپ نے فرمایا مسلمانوں میں باہم مصالحت۔ پھر طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما کو بلوایا وہ آئے تو قعقاع نے پوچھا کہ یہ بتائیے کہ صلح و اصلاح کس طرح ترکیب سے ہوگی، انہوں نے قاتلین عثمان کی حوالگی کیلئے کہا تو قعقاع کہنے لگا یہ موجودہ حالات میں ناممکن ہے، فتنہ فرو ہو کر مسلمان سب متفق ہو کر مطالبہ کریں تب

www.ahlehaq.com

ہی ایسا ہو سکتا ہے، لہٰذا تقاضائے وقت یہ ہے کہ فی الحال اس معاملہ میں نرمی اختیار کر لو، ان دونوں حضرات نے تسلیم کر لیا کہ تمہاری رائے صائب ہے قعقاع جناب امیر رضی اللہ عنہ کی طرف لوٹے اور واقعات کی اطلاع دی۔ حالات رو براہ ہوتے دیکھ کر سب ہی کو خوشی تھی، اور یقین ہو تا جا رہا تھا کہ صلح کی رکاوٹ اب دور ہو گئی ہے۔ عنقریب صلح ہو جائیگی۔ لشکر وہاں تین دن مقیم رہا، تیسرے دن کی شام کو باہمی نامہ و پیام کے ذریعہ یہ طے پا گیا کہ اگلے دن جناب طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما تنہائی میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ملاقات کریں گے اور اس مجلس میں قاتلین۔ عثمان میں سے کوئی نہ ہوگا۔ یہ خبر ایسی تھی کہ منافقوں کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے، ان کو نظر آنے لگا کہ ساری محنت مٹی میں مل کر اکارت ہی نہیں جائیگی جان کے لالے بھی پڑ جائیں گے اور ایک ایک کو چن چن کو قصاص میں قتل کر دیا جائے گا۔ حیران و پریشان اپنے مربی اور استاذ عبداللہ بن سبا کے پاس گئے۔ حالات بتا کر چارہ کار پوچھا۔ اس نے کہا بس صورت ایک ہی ہے۔ رات کو لشکر ام المؤمنین پر شب خون مارو، اور چیخ چیخ کر کہو مسلمانوں نے دھوکہ دے کر ہم پر حملہ کر دیا۔ یہی بات امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ کے بھی دل نشین کرو۔ بالآخر انہوں نے یہی کیا۔ لشکر ام المؤمنین پر ٹوٹ پڑے اور الزام یہ لگایا کہ طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما نے غدر کیا۔ امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ خبر سن کر تعجب میں رہ گئے۔ مگر اب وقت گذر گیا تھا، جنگ کی آگ پورے زور سے بھڑک چکی تھی۔ سر قلم ہو رہے تھے، منافقوں کی چالبازی مومنوں کی فراست پر بازی لے گئی تھی۔ ناچار امیر رضی اللہ عنہ بھی شریک جنگ ہو گئے، اور پھر ہوا جو ہونا تھا!

قرطبی کے علاوہ دیگر اہل سنت کے مورخین کی اکثریت نے اس واقعہ کو اسی طرح بیان کیا ہے، اور جناب حسن، جناب عبداللہ بن جعفر اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم سے بھی اسی قسم کی روایات منقول ہیں۔ اب شیعوں کے اسلاف۔ قاتلان عثمان۔ جو ان کے پیشوا بھی ہیں۔ ادھر ادھر کی زٹلیات بیان کرنے لگیں، تو ہم انہیں گوز شتر کے برابر بھی اہمیت نہیں دیتے۔

اول اول اہل شام کا مطالبہ بھی یہی تھا کہ قاتلان عثمان سے قصاص لیا جائے اور انہیں پوری سزا ملنی چاہیئے۔ مگر جناب امیر رضی اللہ عنہ کی طرف سے اسوقت بھی یعنی جنگ جمل کے بعد کہ اب میدان صاف تھا مخالف اور جھگڑنے والے ختم ہو گئے تھے،

آپ کی طرف سے عذر واجبی کیا گیا۔ تو وہ بدگمان ہو گئے اور خلافت سے منکر ہو کر آپ کی برائیاں کر کے کہنے لگے کہ در اصل آپ خلافت کے اہل ہی نہیں ہیں۔ اور پھر وہ مد مقابل بنکر اٹھ کھڑے ہوئے، جناب امیر رضی اللہ عنہ کا ایک فرمان بحوالہ نہج البلاغہ پہلے بیان ہو چکا ہے جس میں آپ نے فرمایا۔ "ہم ایسے ہو گئے کہ اپنے مسلمان بھائیوں سے لڑتے ہیں اس لئے کہ اس میں کجروی، گمراہی، شبہ اور تاویل نے جگہ لے لی ہے،،

اور قاتلین عثمان (رضی اللہ عنہ) کے بارے میں بھی نہج البلاغہ میں یہ الفاظ موجود ہیں کہ آپ نے فرمایا۔

قَالَ لَهٗ بَعْضُ اَصْحَابِهٖ لَوْ عَاقَبْتَ قَوْمًا اَجْلَبُوْا عَلٰى عُثْمَانَ فَقَالَ يَا اِخْوَتَاهُ اِنِّيْ لَسْتُ اَجْهَلُ مِمَّا تَعْلَمُوْنَ وَلٰكِنْ كَيْفَ بِهِمْ وَالْمُجْلِبُوْنَ عَلٰى شَوْكَتِهِمْ يَمْلِكُوْنَنَا وَلَا نَمْلِكُهُمْ وَهَا هُمْ هٰٓؤُلَاءِ قَدْ ثَارَتْ مَعَهُمْ عُبْدَانُكُمْ وَالْتَفَّتْ اِلَيْهِمْ اَعْرَابُكُمْ وَهُمْ خِلَالَكُمْ يَسُوْمُوْنَكُمْ مَا شَاءُوْا۔

آپ کے بعض رفقاء نے کہ کاش ان لوگوں کو سزا دیتے جنہوں نے حضرت عثمان پر بلوہ کیا۔ فرمایا بھائیو! میں اس چیز سے ناواقف نہیں جو تم کہہ رہے ہو، لیکن ایسا ہو کس طرح سکتا ہے، اس لئے کہ صاحب قوت و شوکت ان کے پاس ہے۔ وہ ہم پر حاکم ہیں، ہم ان پر نہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے ساتھ مل کر تمہارے غلاموں نے چڑھائی کی اور تمہارے صحرائیوں نے اکٹھے ہو کر ان کا ساتھ دیا۔ اور یہ تم ہی میں سے ہیں جو دل کھول کر تمہاری ہی برائیاں کرتے پھرتے ہیں،،

www.Ahlehaq.com

مذکورہ بالا اقتباس سے معلوم ہوگیا کہ صحابہ کرام، حضرت علی رضوان اللہ علیہم، سے جس بات کا تقاضا کرتے تھے آپ اس سے تغافل محض اس لئے فرما رہے تھے کہ آپ مجبور محض ہو کر رہ گئے تھے، اور ضرورت اسی کی متقاضی تھی۔ اور جناب امیر اس میں معذور تھے۔

نہج البلاغۃ کے مندرجات تو شیعہ حضرات کے مرغوبات اور پسندیدہ ہیں، ان میں تو اہل سنت کو کوئی عمل دخل نہیں۔ اگر ہم اپنی روایات ذکر کریں تو پوری حقیقت کھل کر سامنے آجائے۔ اور بات روز روشن کی طرح عیاں ہو جائے!

حالانکہ شیعہ ایسی روایات ذکر نہیں کرتے، بڑے خفیہ طریقہ پر راز رکھتے ہیں کہ مذہب کا سارا تار و پود ہی نہ بکھر جائے، لیکن یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک کھلی دلیل ہے کہ خواہی نہ خواہی کہیں نہ کہیں دو چار عبارات ان سے انہیں کی معتبر کتابوں میں ایسی درج کرادی ہیں۔ جو اہل سنت کے بہت ہی کام آتی ہیں! اور ان کے خود ساختہ مذہب کی خود ہی پول کھول دیتی ہیں۔

قنفذ کا قصہ، سیدہ زہرا رضی اللہ عنہا کے گھر کا دروازہ جلانا۔ یا ان کی کوکھ میں تلوار کا ٹھوکا۔ یہ سب ان کے کوفے کے اخوان الشیطان مفتریوں اور کذابوں کی من گھڑت ہے۔ جو "محسن الفاق" سے ان شیعوں کے پیشوا اور مقتدا بھی ہیں!

اہل سنت کی کتاب میں بطریق صحیح تو کیا بطریق ضعیف بھی اس کا ذکر نہیں۔ شیعی راویوں کا تفصیلی احوال پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ ان بدبختوں نے تو اپنے ائمہ کو نہیں بخشا۔ طرح طرح کی تہمتیں ان پر جڑیں۔ نوع بنوع افترائات ان سے منسوب کئے۔ اور یہ کچھ تو انہوں نے دعوائے محبت و اخلاص کے علی الرغم کیا، اب آپ خود سوچ لیں جن سے ان کو عداوت ہے جو ان کا دین و ایمان بھی ہے ان کے متعلق تو یہ جھوٹ کے مینار کھڑے کرنے سے بھی نہ ہچکچائیں گے۔ اور انہوں نے ایسا ہی کیا بھی ہے! بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ ان کی کتابوں میں کذب و افترا اور بہتان کے سوا کچھ نہیں۔ جب صورت حال یہ ہو تو اہل سنت ان جھوٹوں کی ان جھوٹی روایات پر کیوں کان دھرینگے جو قرآن مجید، اور عترت کے یکسر مخالف ہیں۔ کیونکہ اہل سنت کے دین و ایمان کا رشتہ تو قرآن مجید اور اقوال عترت سے وابستہ ہیں۔ اور یہ دو عادل گواہ ان کے بہتان اور افترا کی جڑ کاٹنے کے لئے کافی وافی ہیں۔

ان اصحاب کرام رضوان اللہ علیہم کے متعلق قرآن کی شہادت درکار ہو تو وہ بھرا پڑا ہے جگہ بجگہ ہم ان کے حوالے بیان کرتے چلے آئے ہیں، یہ آیت اذلۃ علی المؤمنین اعزۃ علی الکافرین۔ کس کے بارے میں ہے۔ اشداء علی الکفار رحماء بینھم کن لوگوں کی شان میں آیا ہے۔ الذین ان مکنٰھم الآیہ۔ کس جماعت کے حق میں نازل ہوئی۔ کیا آیت میں مذکورہ امید کا پسندیدہ مشغلہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر یہی تھا کہ خانۂ زہرا رضی اللہ عنہا کو جلائیں اور ان کی کوکھ میں تلوار چبھائیں! اسی کے ساتھ اس آیت پر بھی نظر رہے۔ و لکن اللہ حبب الیکم الایمان الآیہ۔ یہ کس کو خطاب کر رہی ہے فعل بد فسوق ہے یا نہیں؟ مگر یہ آیت کو اس پاکباز جماعت سے فعل بد کی پسندیدگی کی تردید کر رہی ہے۔ وہ فعل بد کو پسند ہی نہیں کرتے اس کے ارتکاب کا ان سے کیا سوال،

اور اگر اس گروہ اتقیا و اصفیاء کے متعلق حضرت امیر المؤمنین علی کرم اللہ وجہہ کی شہادت ہی سننا چاہتے ہو تو نہج البلاغۃ ہی اٹھا کر دیکھ لو کہ انہوں نے پیغمبر اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب گرامی قدر رضوان اللہ علیہم کے متعلق کیا ارشاد فرمایا ہے۔ ان اصحاب کرام کا اپنے دوستوں کے سامنے تذکرہ کرتے ہوئے آپ نے فرمایا۔

لَقَدْ رَأَيْتُ أَصْحَابَ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَمَا أَرَىٰ أَحَدًا مِنْكُمْ يُشْبِهُهُمْ لَقَدْ كَانُوا يُصْبِحُونَ شُعْثًا غُبْرًا بَاتُوا سُجَّدًا وَقِيَامًا لَا يُرَاوِحُونَ بَيْنَ جِبَاهِهِمْ وَأَقْدَامِهِمْ يَقِفُونَ

مجھے تم میں سے کوئی بھی اصحاب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی مانند دکھائی نہیں دیتا۔ وہ دن محنت و مشقت کے کاموں میں گذارتے تو رات نماز کے سجود و قیام میں۔ نہ وہ اپنی پیشانیوں کو آرام دیتے نہ قدموں کو۔ گویا آخرت کے ڈر تے انہیں آتش زیر پا کر رکھا

www.Ahlehaq.com

www.Ahlehaq.com

عَلٰی مِثْلِ الْجَمْرِ مِنْ ذِكْرِ مَعَادِهِمْ كَأَنَّ بَيْنَ أَعْيُنِهِمْ رُكَبًا مِنْ طُوْلِ سُجُوْدِهِمْ إِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ هَمَلَتْ أَعْيُنُهُمْ حَتّٰى تَبُلَّ جِبَاهَهُمْ وَمَادُوْا كَمَا يَمِيْدُ الشَّجَرُ فِي الْيَوْمِ الْعَاصِفِ خَوْفًا مِّنَ الْعِقَابِ وَرَجَاءً لِّلثَّوَابِ۔

ہو۔ ان کی پیشانیوں پر طویل سجدوں کے نشان پڑ گئے تھے۔ اللہ کے ذکر پر آنکھوں سے اسقدر آنسو ابل پڑتے کہ چہرہ تر ہو جاتا۔ اور وہ اللہ کے عذاب کے خوف اور ثواب کی امید میں طوفان میں لرزیدہ درختوں کی مانند کانپتے رہتے“

اور یہ بھی فرمایا۔

وَقَالَ أَيْضًا لَقَدْ كُنَّا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَقْتُلُ أَبْنَاءَنَا وَآبَاءَنَا وَإِخْوَانَنَا وَأَخْوَالَنَا وَأَعْمَامَنَا وَمَا يَزِيْدُنَا ذٰلِكَ إِلَّا إِيْمَانًا وَتَسْلِيْمًا وَمُضِيًّا عَلَى اللَّقَمِ وَصَبْرًا عَلٰى مَضِيْضِ الْأَلَمِ وَجِدًّا عَلٰى جِهَادِ الْعَدُوِّ وَقَدْ كَانَ الرَّجُلُ مِنَّا وَالْآخَرُ مِنْ عَدُوِّنَا يَتَصَاوَلَانِ تَصَاوُلَ الْفَحْلَيْنِ يَتَخَالَسَانِ أَنْفُسَهُمَا أَيُّهُمَا يَسْقِي صَاحِبَهُ كَأْسَ الْمَنُوْنِ فَمَرَّةً لَنَا وَمَرَّةً لِعَدُوِّنَا مِنَّا فَلَمَّا رَأَى اللّٰهُ صِدْقَنَا أَنْزَلَ بِعَدُوِّنَا الْكَبْتَ وَأَنْزَلَ عَلَيْنَا النَّصْرَ حَتّٰى اسْتَقَرَّ الْإِسْلَامُ مُلْقِيًا جِرَانَهُ وَمُتَبَوِّءًا أَوْطَانَهُ وَلَعَمْرِيْ لَوْ كُنَّا نَأْتِيْ مَا أَتَيْتُمْ مَا قَامَ لِلدِّيْنِ عَمُوْدٌ وَلَا اخْضَرَّ لِلْإِسْلَامِ عُوْدٌ۔

ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمراہی میں قتال کرتے اور مقتول بیٹے، باپ، بھائی، ماموں، چچا ہوتے۔ اور یہ ایمان کے تقاضہ الطاعت کے جذبہ۔ راہ راست پر چلنے کی خاطر۔ صدمہ کی تکلیف پر صبر کرتے ہوئے دشمن کے خلاف جہاد میں کوشش کرتے ہوئے کرتے، ایک ہم میں سے دوسرا دشمنوں میں سے دونوں باہم ایک دوسرے پر شیر کی طرح حملہ آور ہوتے اور ایک دوسرے کی جان لینے کی کوشش کرتے کہ دونوں میں سے کون اپنے مدمقابل کو موت کا جام پلاتا ہے۔ کبھی ہم بازی لے جاتے، کبھی ہمارا دشمن جیت جاتا۔ جب اللہ تعالیٰ نے ہماری صداقت پرکھ لی، تو دشمن پر ذلت تھوپی اور ہمیں فتح عطا فرمائی۔ حتیٰ کہ اسلام کا سکہ جم گیا۔ اور اسے استقرار نصیب ہوا۔ اس کے پڑوسی مطمئن، اس کے دیار و امصار جائے امن و قرار ٹھہرے۔ اور میری جان کی قسم کہ ہم بھی اگر وہی کرتے جو تم کر رہے ہو۔ تو نہ دین کو قیام و قرار نصیب ہوتا، نہ ہی شجر اسلام سرسبز و بار آور ہوتا۔

اور پھر ان جملہ شہادتوں سے قطع نظر کی صورت میں بھی ایک آیت قرآنی ہمیں ایسی موجود ملتی ہے جو اس قصہ کو جھٹلانے کے لئے کافی ہے۔

لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَوْ كَانُوْٓا اٰبَآءَهُمْ اَوْ اَبْنَآءَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِيْرَتَهُمْ اُولٰٓئِكَ كَتَبَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْاِيْمَانَ وَاَيَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ۔

جو قوم اللہ و رسول اور یوم آخرت پر ایمان رکھتی ہے آپ اس کو ایسا نہ پائیں گے کہ وہ اللہ و رسول سے ضد و کد رکھنے والے سے دوستی رکھیں، خواہ وہ ان کے باپ ہوں ان کے بیٹے ہوں، یا ان کے بھائی یا ان کے کنبہ والے۔ وہ لوگ وہی ہیں جنکے قلوب پر ایمان کندہ کر دیا گیا ہے۔ اور اپنی روح سے ان کو تقویت پہنچائی“

اس آیت سے بالکل صاف اور صریح طور پر یہ بات معلوم ہو گئی کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کا ایسے شخص کی طرف راغب ہونا یا دوستی کا ہاتھ بڑھانا جو اللہ تعالیٰ و رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مخالف ہو یا اسکی حمایت کرنا۔ یا اس کی دوستی کو حکم الٰہی کے نفاذ میں رکاوٹ بنانا محال و ناممکن ہے۔ لہٰذا ایسے بلند اوصاف رکھنے والے حضرات سے یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ ایسے واقعہ پر سکوت اختیار کریں۔ چہ جائیکہ

ان میں سے کوئی ایسے نازیبا عمل کا ارتکاب کرے، حالانکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد دین کا علم بلند رکھنے میں انہوں نے اپنی جانیں اور اموال نثار کردیں ہوں اور ساری زندگی سنت رسول کے زندہ کرنے میں گذار دی ہو۔ سبحانک ھذا بھتان عظیم۔

جب اہل سنت کے سامنے خدا و رسول، جناب امیر و حسنین رضی اللہ عنہم کی وقیع شہادت موجود ہو تو ان سے یہ توقع کیوں رکھی جاتی ہے کہ وہ ان اخوان الشیطان کی بکواس اور ابن مطہر حلی اور ابن شہر آشوب مازندرانی کی افترا پردازی و ترانہ خانی پہ کان دھرینگے۔ ان کی نظر میں تو یہ صدائیں کوئے کی کائیں کائیں ہیں۔ اور صوت حمار سے زیادہ وزن نہیں رکھتیں!

اعتراض۔ (۹)

بخاری و مسلم میں بروایت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ مروی ہے کہ

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَا تَقُوْمُ السَّاعَۃُ حَتّٰی تَأْخُذَ اُمَّتِیْ مَاخَذَ الْقُرُوْنِ قَبْلَھَا شِبْرًا بِشِبْرٍ وَذِرَاعًا بِذِرَاعٍ قَالُوْا یَارَسُوْلَ اللّٰہِ کَفَارِسَ وَالرُّوْمِ قَالَ وَمَنِ النَّاسِ اِلَّا اُولٰئِکَ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت اسوقت تک نہیں آئیگی جب تک میری امت وہ کچھ نہ کرے جو پہلے کی امتیں کر چکی ہیں۔ ایک ایک بالشت اور ایک ایک ہاتھ کی مقدار۔ حاضرین نے پوچھا یا رسول اللہ کیا وہ فارس و روم کے لوگ ہیں تو آپ نے فرمایا ان کے علاوہ اور کون ہو سکتے ہیں۔

اس اعتراض وطعن میں ان ناہنجاروں نے دنیا کو اپنی عقلوں پر ماتم کرنے کی دعوت دینے کا مضحکہ خیز اقدام کیا ہے، کہ ساری امت کو اول تو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم میں محصور قرار دیا اور پھر اس حدیث کو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کے خلاف استعمال کیا۔ حالانکہ اس حدیث میں لفظ امت مذکور ہے۔ صحابہ کا لفظ نہیں ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی امت زیادہ تر کفار فارس و روم کے ساتھ مشابہت رکھتی ہے کیا عقائد میں، کیا اعمال میں، کیا اخلاق میں، کیا رسم و رواج میں، مثلاً رومی تثلیث کے قائل ہیں، کہتے ہیں اللہ تین میں سے ایک ہے۔ غالی رافضی بھی پانچ خدا مانتے ہیں۔ باب اول میں اس کی تفصیل بیان ہو چکی ہے۔ پھر رومی کہتے ہیں کہ حشر روحانی ہوگا نہ کہ جسمانی اسمٰعیلیوں اور دوسرے رافضیوں کا بھی یہی مذہب ہے۔ رومی پیشاب پاخانہ کی نجاست سے نہیں بچتے، نہ کوئی اہتمام ان کے ہاں اس کے لئے پایا جاتا ہے۔ امامیہ کے ہاں بھی انسانی بول و براز نجس نہیں جانتے۔ اس میں اگر یہ لتھڑ بھی جائیں تب بھی ایسی حالت میں نماز جائز قرار دیتے ہیں۔ اس کا بیان باب فقہ میں گذر چکا ہے۔

رومی خدا اور رسول پر افترا کرتے اور جھوٹے الزامات لگاتے ہیں، امامیہ بھی افترا و کذب میں اپنے ان استادوں کو پیچھے چھوڑ کر خود استاد کا منصب سنبھالے ہوئے ہیں!

فارس والے خالق خیر و شر کو علیحدہ علیحدہ ثابت کرتے ہیں، تو امامیہ بلکہ سارے رافضی خدا کو خالق خیر اور بندو و شیطان کو خالق شر جانتے ہیں۔ فارسی تقدیر کا انکار کرتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ آدمی کا ارادہ تو وقوع میں آجاتا ہے مگر اللہ کا ارادہ واقع نہیں ہوتا۔ امامیہ بشمول جملہ رافضی بھی یہی مذہب اپنائے ہوئے ہیں۔ فارسی نوروز کی بہت تعظیم کرتے، اسے بمثل عید شمار کرتے ہیں۔ قمر کو عقرب میں، اور بھورے کی رسم اور محاق (چاند کا سورج کے مقابلہ میں آجانے) کو منحوس مانتے ہیں۔ بالکل (شبر البشبر) اسی طرح امامیہ بھی نوروز کی تعظیم کرتے اور ان امور کو منحوس سمجھتے ہیں، متعہ اور شرمگاہوں کا حلال ہونا جس پر ہندوستان کے راجہ عمل پیرا رہتے ہیں۔ امامیہ کے نزدیک بھی جائز ہے۔

محرمات سے نکاح اور اغلام، مجوسی فارسیوں کا دین ہے۔ رافضیوں میں باطنی فرقہ کا بھی یہی مذہب ہے۔ ماتم نوحہ گری، چاک گریبانی اور سیاہ لباس کرنا مصیبت و آفت کے وقت فارسی مجوسیوں میں رائج ہے۔ امامیہ بھی اپنے وطیرہ میں ان کے قدم بقدم ہیں۔

www.Ahlehaq.com

یہ تو مشتے نمونہ از خروارے ہے۔ بنظر تحقیق و تفتیش دیکھا جائے تو یہ قوم شیعہ کفر و شرک کی بہت سی گندگیوں میں، انہیں کے ہم عنان او شیر البشیر، فلعا بذراعا کی زندہ مثال نظر آئیگی۔

اب عام ناظرین کے ساتھ دل چاہے تو شیعہ قوم بھی غور کرلے کہ اس حدیث مبارک کو عملاً صحیح ثابت کرنے میں اور اس کا مصداق بننے میں آگے آگے کون ہے!

اعتراض۔(۱۰) یہ ہے کہ بخاری شریف میں بحوالہ ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا یہ مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

لَوْلَا اِنَّ قَوْمَكِ حَدِيْثٌ عَهْدِهِمْ بِكُفْرٍ وَنَخَافُ اَنْ تُنْكِرَ قُلُوْبُهُمْ لَاَمَرْتُ اَنْ يَّهْدَمَ الْبَيْتُ وَ اُدْخِلَتْ فِيْهِ مَا اُخْرِجَ مِنْهُ وَاَلْزَقْتُهٗ بِالْاَرْضِ وَجَعَلْتُ مَا بَيْنَ شَرْقِيًّا وَغَرْبِيًّا وَبَلَغْتُ بِهٖ اَسَاسَ اِبْرَاهِيْمَ۔

اگر تمہاری قوم کا عہد کفر ابھی قریب نہ گزرا ہوتا اور مجھے یہ ڈر نہ ہوتا کہ وہ اسے گوارا و پسند نہ کریں گے تو میں خانہ کعبہ کو ڈھانے کا حکم دیتا۔ اور اس میں سے نکالا ہوا حصہ اس میں شامل کرتا، اس کی کرسی زمین سے ملا دیتا۔ اس میں شرقاً غرباً دو دروازے قائم کرتا، اور اس کو ابراہیمی بنیاد پر از سر نو تعمیر کرتا۔

تو عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا، کی قوم قریش ہی تو تھی۔ تو معلوم ہوا ان کے دل اور باطن صاف نہ تھے۔ اور ان کے باطن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خائف تھے اور ان کے ڈر سے بعض شرعی امور میں آپ تقیہ فرماتے تھے۔

جواب ۔ اس اعتراض کا یہ ہے کہ قومکِ سے سارے ہی قریش مراد ہوں تو اس میں اوروں کے ساتھ جناب امیر رضی اللہ عنہ بھی داخل ہوں گے بلکہ پورا ہاشمی قبیلہ بھی کیونکہ وہ بھی قریش میں سے ہیں۔ اور اگر چند افراد مراد ہوں تو اس سے بات نہیں بنتی کیونکہ مولفۃ القلوب اور فتح مکہ کے موقعہ پر مسلمان ہونے والے افراد سے خوف کا اظہار ہے جو نہ ابھی آداب شریعت سے مؤدب ہوئے تھے اور نہ ہی قوت ایمانی ابھی مستحکم ہوئی تھی، اپنے خاص اصحاب اور رفقاء قدیم سے آپ کو کوئی خوف نہ تھا۔

اب رہی تقیہ کی بات تو وہ تبلیغی امور احکام شرعی اور واجبات میں ثابت کرنا چاہیے، دنیوی مصالح اور عمارات کی شکست و ریخت میں بات بنتی نہیں۔ اگرچہ وہ عمارت کعبہ شریف ہی کیوں نہ ہو۔ کیونکہ یہ عمل بالاتفاق نہ مامور باللہ ہے اور نہ واجب۔ اور پھر حدیث میں لفظ خوف ہے اور خوف سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ چیز واقع بھی ہو جائے۔ لہٰذا اس حدیث کے ساتھ تمام اصحاب پر طعن کرنا اور خصوصاً ان پر جو یہاں زیر بحث مسئلہ میں سخت بد دیانتی کے ساتھ تعصب و عناد کا گھناؤنا مظاہرہ بھی ہے۔

www.Ahlehaq.com

گیارھواں باب

خصوصیات مذہب شیعہ

اہل سنت رحمہم اللہ نے بڑی کدو کاوش اور تلاش و جستجو، اور تفتیش و تحقیق سے اس فرقے کے پانچ ایسے خواص معلوم کئے جو کسی دوسرے اسلامی فرقے میں نہیں ملتے، ملتے ہیں تو شاذ و نادر اور وہ بھی شیعوں کے میل ملاپ کا اثر ہوتا ہے وہ خواص خمسہ یہ ہیں۔

(۱) اوہام (۲) عادات (۳) غلوات (۴) تعصبات اور (۵) ہفوات، اول تو آپ ان خواص خمسہ کے معنے ذہن نشین کرلیں اسکے بعد بطور نمونہ ہر ایک سے کچھ کچھ ذکر کیا جائے گا انشاء اللہ۔

الف:۔ عادات۔ وہ ہیں جو ان کے عوام و خواص میں بلا ان کے علماء کی تصریح و تذکر شہرت رکھتی ہیں۔ ان عادات کا ذکر نہ انکی کتابوں میں ہے۔ نہ ان کے علماء نے تصریح کرکے کوئی مذہبی ثبوت پیش کیا ہے۔ مثلاً اولیاء اللہ کے خوارق کا انکار، ماتم، نوحہ، شیون، تصویر سازی، تربت نوازی، بموقعہ ایام عاشورہ۔ ان باتوں کے متعلق عبادت کا گمان رکھنا اور یہ عقیدہ قائم کرنا کہ اس سے تمام سال کے گناہ مٹ جاتے ہیں۔ اور بابا شجاع الدین کے عید کے دن آٹے کا پتلا بشکل فاروق اعظم رضی اللہ عنہ بنانا اسکے پیٹ میں شہد ڈالنا اور اسکو قتل کر ڈالنا اور اس شہد کو پی جانا۔ دوشنبہ کے دن کو منحوس سمجھنا، چار کے عدد سے الرجک ہونا، بارہ کے عدد کو مبارک جاننا اور اسی طرح کی عادتیں۔

اس فرقہ کی یہ عادات اسلیئے قابل گرفت نہیں کہ ہر فرقہ نے اپنے لیے کچھ عادات کچھ رسوم، کچھ بدعات گھڑ رکھی ہیں۔ لیکن چونکہ اس فرقہ کے علماء و خواص ان امور سے انکار کرتے اور انہیں خلاف کتاب اللہ جانتے ہیں تو ان سے اعتراض ساقط ہوگیا اور یہی وجہ ہے کہ ہم نے اپنی اس کتاب میں انکی ان عادات کو نظر انداز کیا ہے، اسے موضوع بحث نہیں بنایا، البتہ انکی بعض عادات جو علمی انداز میں پیش کی جاتی ہیں اگرچہ بحوالہ کتب اور بلحاظ قرداد علماء ان کا ثبوت نہیں ہم نے باب فقہ میں انکا ذکر کیا ہے، مثلاً جمعہ اور جماعات کا ترک، وضو میں پاؤں کا مسح کرنا، موزوں پر مسح ترک کرنے کو سنت بتانا تراویح کو ترک کرنا، دبر میں وطی کرنا، اور متعہ کو افضل عبادات جاننا،

ب:۔ ہفوہ:۔ یہ ہے کہ اپنے مذہب کی حفاظت کی خاطر یا مخالف مذہب کو شکست دینے کی غرض سے حس، عقل صریح، اور تواتر کے خلاف کسی امر کا ارتکاب کیا جائے۔

ج:۔ غلو:۔ یہ ہے کہ جو بات اپنے نزدیک ثابت نہ ہو وہ اپنے محبوب افراد کے ساتھ انتہائی محبت و عقیدت کے پیش نظر وہ بات انکے لیے ثابت کرتے ہیں، یا جو چیز خود کے نزدیک ثابت ہے انکے بارے میں اس سے انکار کر دیتے ہیں۔

د:۔ تعصب:۔ یہ ہے کہ جن افراد سے انکو انتہائی بغض ہے انکے بارے میں منفی شئی کو ثابت اور ثابت کو منفی بتاتے اور ثابت کرتے ہیں، گویا غلو اور تعصب دونوں ایک ہی تھیلی کے دو چٹے بٹے ہیں۔ کیونکہ ہر دو میں اپنے مسلمات کی نفی اور اپنے منکرات کی تسلیم کرتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ جب یہ عمل اپنی محبوب شخصیات کے لیے ہو

تو وہ غلو ہوتا ہے اور مبغوض شخصیت کیلیے ہو تو اسے تعصب کہتے ہیں اور یہ دونوں عادتیں نص قرآنی کے مطابق حرام ہیں۔

(۱) یَاۤ اَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِیْ دِیْنِكُمْ وَ لَا تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ ۔	اے اہل کتاب اپنے دین میں غلو مت کرو اور اللہ تعالٰے کی نسبت حق بات ہی منہ سے نکالو۔
(۲) یَاۤ اَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ وَ اَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ۔	اے اہل کتاب گواہی دے دینے کے بعد تم اللہ تعالٰی کی آیات کے ساتھ کفر کیوں کرتے ہو۔

اسی باعث اس کتاب میں غلو و تعصب کو ایک ہی فصل کے تحت بیان کیا ہے اور شہرت کی بنا پر غلو کو بھی تعصب کے عنوان سے بیان کیا ہے۔ اور اوہام چونکہ گمراہی کی جڑ اور بنیاد ہوتے ہیں، اس لیے انکو مستقل فصل میں سب سے پہلے بیان کیا گیا ہے۔ اس طرح یہ باب تین فصلوں پر مرتب کیا گیا ہے۔

(۱) فصل اوہام (۲) فصل تعصبات (۳) فصل ہفوات۔

پہلی فصل

شیعی اوہام

واضح رہے کہ عقل کے تفکر میں زیادہ تر غلطی غلبۂ وہم سے ہوتی ہے اسی لیے ہر اس فرقہ کا جس پر اوہام غالب ہوں عقلی اعتبار اٹھ جاتا ہے۔ مثلاً بچے اور عورتیں اسی لیے بچوں کے نزدیک لکڑی کا ہر گھوڑا دوڑنے والا ہوتا ہے اور قالین کا شیر پھاڑنے والا ہوتا ہے۔ اور عورتوں کے نزدیک ہر بیماری کا سبب اوپری، پرائی یا سایہ آسیب، یا شیخ سدو کا دخل ہوتا ہے۔ انکے نزدیک شادی و غمی کی مقررہ رسمیں چھوڑنا ایسا ہی ہے جیسا کوئی شرعی حکم چھوڑنا۔ اور وہ اسے باعتبار عقل محال سمجھتی ہیں اور اچھے برے شگون لینا، فال نکالنا انکے نزدیک وحی منزل من اللہ کا حکم رکھتی ہے۔ لہذا جب شیعی مذہب کے دلائل میں وہم کا غلبہ ہوا تو انکی عقل پر سے اعتماد اٹھ گیا۔ اسی لیے سلف نے فیصلہ دیا کہ شیعہ اس امت کی عورتیں ہیں۔

اب ان کے اوہام کی تفصیل سننے سے پہلے یہ اور جان لیجیے کہ وہم کا عقل پر غلبہ مطالب حقہ و صحیحہ کی دریافت میں چند انواع و طرق سے ہوتا ہے۔

نوع اول:۔ یہ کہ عقل حکم جزئی (خصوصی) کو کلی (عام) جانتی ہے مثلاً یہ کہ ہر مخالف دشمن ہے۔ اب یہاں غلطی کا منشا یہ ہے کہ بجائے اسکے کہ اسکے عکس کو کلی مانیں جو حقیقت میں ہے بھی۔ یہ وہم میں پڑ کر اس کو کلی تسلیم کر لیتے ہیں۔ اہل بیت اور اصحاب کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں شیعوں کو یہی غلطی لاحق ہوئی بلکہ اہلسنت اور اہل بیت کے حق میں بھی۔ کہ صحابہ اور اہل سنت کے بیشتر فقہی مسائل کو امامت سے تعلق رکھتے ہیں انہوں نے اہل بیت سے مخالف پایا تو یہ حکم لگا بیٹھے کہ انکو اہل بیت کرام رضی اللہ عنہم سے عداوت ہے حالانکہ باعتبار عقل مخالفت کو عداوت کہنا ہرگز صحیح نہیں۔ کیونکہ اگر ایک ہی مقصد کے طالب حصول مقصد کیلیے جدا راستوں پر گامزن ہوں تو انہیں باہم دشمن نہیں کہتے چنانچہ فقیہ و امام اعظم اہلسنت ابو حنیفہ رحمۃ اللہ

Www.Alheraq.Com

علیہ کے شاگرد قاضی ابویوسف وامام محمد بن حسن شیبانی رحمۃ اللہ علیہما نے بہت سے مسائل میں اپنے استاد سے اختلاف کیا ہے۔ اب کون عقلمند انکو اپنے استاد کا دشمن کہے یا مانے گا۔

اسی قاعدہ سے بہت سی شاخیں پھوٹتی ہیں۔ مثلاً اگر باہم دو شخص کسی معاملہ میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں یا ایک دوسرے کے کسی مشورہ واجتہاد میں کوئی غلطی پکڑتا ہے تو وہ اسکا دشمن ہے۔ اسی لیے جناب امیر کا حضرت عثمان رضی اللہ عنہما کی بعض باتوں کو ناپسند کرنا۔ یا ان کے بعض اجتہادی مسائل میں انکو خطا کار ٹھہرانا شیعوں کے نزدیک دشمنی کی کھلی اور صاف دلیل ہے۔ اسی طرح جناب صدیقہ رضی اللہ عنہا کا قصاص عثمان رضی اللہ عنہ میں تاخیر کو بنظر انکار دیکھنے کو یہ لوگ دشمنی پر محمول کرتے ہیں۔ تو جب اصل ہی غلط ہے اس سے جو شاخیں نکلیں گی وہ سب ہی غلط ہونگی۔ حالانکہ کتب شیعہ میں اسی اصل کے خلاف ثابت ہے۔ ابو مخنف جناب حسین رضی اللہ عنہ سے روایت کرتا ہے کہ آپ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی صلح کو ناپسند فرماتے تھے اور جسکو جناب حسن رضی اللہ عنہ کی غلطی اور خطا قرار دیتے تھے۔

لہذا اگر انکی تسلیم کردہ اصل کے مطابق کسی بات کا ناپسند کرنا یا اسکو خطا ٹھہرانا عداوت پر مبنی ہو تو لازم آتا ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ جناب حسن رضی اللہ عنہ کے دشمن ہوں ایسا اعتقاد کفر صریح کی طرف لے جاسکتا ہے۔

دوسری نوع: حصر کے صیغہ کو اکبر میں اپنی طرف سے بڑھالیتے ہیں کہ نتیجہ غلط نکلے اور شیعوں کے اکثر دلائل اسی نوع کے ہیں جس کا نمونہ باب امامت میں گذر چکا۔ مثلاً جناب امیر رضی اللہ عنہ، عالم تھے، شجاع تھے اور متقی تھے اور جو ان اوصاف کا حامل ہو امام وہی ہے دوسرا نہیں۔ حالانکہ صغریٰ میں حصر بالکل نہیں۔ اور یہ غلطی اس لیے ہے کہ ہر دو مقدمات میں حد اوسط پوری پوری مکرر نہیں آئی۔ حالانکہ نتیجہ نکالنے کیلیے حد اوسط کا مکرر آنا شرط ہے، لیکن وہم جو معانی کی قیودات کی گہرائی تک پہنچنے سے قاصر وعاجز ہوتا ہے وہ اس سے غافل رہ کر سمجھ بیٹھتا ہے کہ شاید اس میں حد اوسط مکرر آگئی ہے۔ چنانچہ یہ دلیل بھی اسی نوع اور قبیل کی ہے کہ جناب امیر واجب الاطاعت ہیں اور جو واجب الاطاعت ہو وہی امام ہے وغیرہ وغیرہ۔

تیسری نوع: یہ کہ مطلوب کچھ اور ہوتا ہے اور نتیجہ کچھ اور نکل آتا ہے لیکن چونکہ ان دونوں میں قرب اور نزدیکی کچھ ایسی ہوتی ہے کہ وہم سمجھ بیٹھتا ہے کہ مطلوب حاصل ہوگیا اسی وجہ سے شیعوں کے اکثر دلائل ناکمل وناتمام ہوتے ہیں۔ اس کتاب کے مباحث امامت میں اسکی بحث گذر چکی ہے۔ مثلاً یہ کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ مدینۃ العلم کے دروازہ ہیں اور جو مدینۃ العلم کا دروازہ ہو امام ہے۔ وہم نے سمجھا کہ امام چونکہ رئیس امت ہے اور دروازہ بھی گھر کی ریاست کسی نہ کسی وجہ سے رکھتا ہے پس جناب امیر رضی اللہ عنہ جب دروازہ ہوئے تو امام بھی ہوئے حالانکہ مدینۃ العلم کا دروازہ ہونا کچھ اور ہے اور امام ہونا کچھ اور۔ ان میں آپس میں نہ اتحاد ہے نہ لزوم۔

چوتھی نوع: یہ مصادرت برمطلوب کی شکل میں ہوتا ہے کہ وہم لفظیا مفہوم کے تغیر کی وجہ سے خیال کرتا ہے کہ دلیل کا مقدمہ کچھ اور ہے اور مطلوب کچھ اور ہیں نے ایک کو دوسرے سے ثابت کر دیا حالانکہ عقل دونوں کو ایک جانتی یا ایک ذات سمجھتی ہے لہذا اسکو ثابت کرنا اثبات الشئ لنفسہ، کا مصداق ہے۔

مثلاً شیعہ کہتے ہیں کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ اولی بالتصرف ہیں اور جو اولی بالتصرف ہو وہ امام ہے حالانکہ

امام کے اصلی معنی ہی ۔ اولی بتصرف عام ۔ کے ہیں لہذا اکبر واوسط ایک ہی چیز ہوئے ۔ اور صغری اور مطلوب بلحاظ معنی ایک قضیہ اگرچہ لفظاً میں تغائر ہو ۔

اور مصادرت کی ایک قسم یہ ہے کہ دلیل کے مقدمات مطلوب سے زیادہ واضح نہ ہوں بلکہ مقابل نزدیک پوشیدہ اور قابل منع ہو مثلاً جناب امیر رضی اللہ عنہ معصوم ہیں اور امام معصوم ہوتا ہے اہلسنت کے نزدیک جناب امیر رضی اللہ عنہ کی امامت تو بہرحال کسی نہ کسی وقت ثابت ہے لیکن معصومیت وہ صرف انبیاء کرام علیہم السلام کا خاصہ مانتے ہیں ۔ اور جناب امیر رضی اللہ عنہ کو کسی وقت بھی معصوم نہیں جانتے ہاں محفوظ سمجھتے ہیں ۔ آپ کی امامت کو ثابت کرنے والی دلیلیں بڑی واضح اور مضبوط ہیں ۔ مگر آپ کی عصمت ثابت کرنے والے دلائل خدشہ اور قباحت سے خالی نہیں ۔

پانچویں نوع :۔ لفظی اشتراک کی غلطی ہے ۔ یعنی دو چیزوں پر ایک لفظ کا اطلاق کرتے ہیں اور اس چیز کا حکم دوسری چیز کے لیے ثابت کرتے ہیں ۔ مثلاً نبی نزول شریعت اور وحی میں امام ہے ۔ اور نبی کا خلیفہ بھی حکم و احکام صلح و جنگ میں امام ہے ۔ لہذا جب نبی معصوم ہوگا تو خلیفہ بھی معصوم ہوگا ۔ حالانکہ امام کا اطلاق نبی پر کسی اور معنے کے لحاظ سے ہے اور خلیفہ پر دوسرے معنی سے ۔

نحوی توجیہات میں اس قسم کی غلطی واقع ہوتی ہے مثلاً کہتے ہیں وھم راکعون ویؤتون الزکوۃ سے حال واقع ہوا ہے تو چاہیے کہ ایتاء الزکوۃ سے مقارن ہو حالانکہ وہ یقیمون الصلوۃ سے حال ہے تاکہ صلوۃ یہود سے احتراز ہو جائے ۔ غلط مجاز بھی اسی قبیل سے ہے یعنی بطور مجاز ایک چیز پر ایک لفظ کا اطلاق کرتے ہیں پھر حقیقی معنے کے لازم کو اس چیز کیلیے ثابت کرتے مثلاً بعض روافض کہتے ہیں کہ اللہ نور ہے اور ہر نور محسوس ہے تو اللہ بھی محسوس ہے چنانچہ ہشام بن حکم اور ان کے دوسرے پیشواؤں کا یہی مذہب ہے حالانکہ اللہ تعالی کی پاک ذات پر نور کا اطلاق بر بنائے مجاز ہے اور محسوسیت حقیقی معنی کا لازم ہے مجازی معنے کا نہیں ۔ یا مثلاً کہتے ہیں کہ جناب علی مرتضی رضی اللہ عنہ کو اللہ تعالی نے نفس نبی فرمایا ہے اور نفس نبی ، معصوم ہوتا ہے ، واجب الاطاعت ہوتا ہے ، اور اولی بتصرف ، اور تمام مخلوق وانبیاء سے افضل ۔ تو یہ تمام امور جناب امیر رضی اللہ عنہ کے لیے ثابت کرتے ہیں حالانکہ آپ کو نفس نبی مجازاً فرمایا گیا اور مجاز پر حقیقت کا حکم مرتب نہیں ہوتا ورنہ بہادر کو شیر کہنا اس سے انسانیت سلب کرنا ہوگا ۔

چھٹی نوع :۔ ایہام العکس کی ہے یعنی ایک سچا مقدمہ عقل کے ہاتھ لگتا ہے اور وہم اسکے عکس کو بھی کلیہ صادقہ سمجھ بیٹھتا ہے اور اس سے دلیلوں میں کام نکالتا ہے مثلاً یہ کہ ہر انسان معصوم قابل امامت ہے یہ ایک سچا مقدمہ ہے مگر وہم نے اسکا عکس تراش لیا کہ ہر قابل امامت ، معصوم ہے ۔ حالانکہ منطقیوں کے نزدیک یہ بات طے اور ثابت ہے کہ موجبہ کلیہ کا عکس موجبہ کلیہ نہیں آتا ۔

ساتویں نوع :۔ اغفال اللزوم کی ۔ ہے یعنی حکم ملزوم لازم اعم کو دیتے ہیں اور یوں غلطی میں پڑ جاتے ہیں مثلاً کہتے ہیں کہ نبی کیلیے عصمت اس لیے ضروری ہے کہ وہ امت کی ریاست کا مالک ہوتا ہے تو جو بھی رئیس ہوگا وہ معصوم ہوگا حالانکہ نبی کی عصمت معجزہ کی تصدیق کے سبب سے ہے ریاست کے باعث نہیں ۔ اور یہ لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ جناب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو سورہ براۃ کی تبلیغ سے معزول کرنا اسی سبب سے تھا کہ آپ نیابت پیغمبر کے قابل نہ تھے تو پھر

آپ کسی نیابت کے قابل نہ رہے انکا ایسا کہنا بھی اسی قبیل سے ہے اس لیے کہ آپ کا یہ عزل عرب عادت کے مطابق تھا جو ان کے ہاں نقض عہد کے وقت جاری تھی اور اسی زمرہ میں ہے انکا یہ کہنا کہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ چونکہ اہل بیت میں سے نہیں تھے کہ انکو حق خلافت پہنچتا۔ اسلیے وہ جناب علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا مقابلہ کرنے کے معاملہ میں خطاکار تھے۔ گویا کہتے ہیں کہ اہل بیت کے مقابلہ میں ہر صحابی کو دعوائے خلافت کا حق نہیں اور بھی اسی طرح کے اقوال ہیں۔ جو اغفال اللزوم کے زمرہ میں آتے ہیں۔

آٹھویں نوع:۔ یہ دو متنافی اشیاء کا دو وقت میں بھی ہونا محال قرار دیتے ہیں۔ اور انکی یہ غلطی زمانے سے غفلت پر مبنی ہے۔ مثلاً کہتے ہیں کہ خلفاء ثلاثہ رضوان اللہ علیہم کسی نہ کسی زمانہ میں کافر تھے اور کافر قابل امامت نہیں حالانکہ یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ دو متنافی چیزوں کا ایک وقت میں جمع ہونا تو محال ہے مگر ایک ذات میں دو وقتوں میں جمع محال نہیں مثلاً سونا، جاگنا، گرمی، سردی وغیرہ وغیرہ۔

نویں نوع:۔ قوۃ کو فعل کی جگہ استعمال کر لینا مثلاً یہ کہتے ہیں کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بھی امام تھے کیونکہ آپ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا۔ انت منی بمنزلۃ ہارون من موسیٰ (جو نسبت ہارون کی موسیٰ سے تھی وہی نسبت تم کو مجھ سے ہے) اسلیے اگر آپؓ بلا فصل امام نہ ہوں تو آپ کا عزل لازم آتا ہے۔ اور امام کا معزول ہونا جائز نہیں حالانکہ اصل بات یہ ہے کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ کے حضور۔ امام بالقوہ۔ تھے امام بالفعل نہ تھے۔ اور امام بالقوہ۔ کو جب ان سے قابل ترجیح افراد کی موجودگی کے سبب مقرر ہی نہیں کیا گیا تو عزل کا کیا سوال۔

دسویں نوع:۔ جزکو کل کی جگہ لے لینا۔ مثلاً کہتے ہیں کہ اولاد پیغمبر جزو پیغمبر ہیں اور پیغمبر معصوم ہیں۔ لہذا اولاد بھی معصوم ہے حالانکہ معصوم پیغمبر کی مکمل شخصیت ہے اسکا کوئی جزو نہیں اور اسی میں غلط مجاز کی شکل بھی موجود ہے اس لیے کہ اولاد جز حقیقی نہیں ہوتی۔

گیارھویں نوع:۔ یہ کہ عرض کو ذات کی جگہ لے لینا اور تابع کو متبوع کا حکم دینا مثلاً کہتے ہیں کہ امام نائب پیغمبر ہوتا ہے تبلیغ کے معاملہ میں۔ تو وہ احکام کا اسی طرح مبلغ ہوگا جس طرح نبی اور پیغمبر۔ اور پیغمبر معصوم ہے تو چاہیئے کہ امام بھی معصوم ہو۔ حالانکہ یہ نہیں دیکھتے کہ پیغمبر مبلغ بالذات ؑ ہے اور امام مبلغ بالتبع۔ ہے اور عصمت مبلغ بالذات کا خاصہ ہے اور اسی قبیل سے وہ بات ہے جو یہ کہتے ہیں کہ اس امت کا امام نائب پیغمبر ہے جو تمام پیغمبروں سے بہتر ہیں لہذا امام کو بھی تمام پیغمبروں سے بہتر ہونا چاہیئے حالانکہ نائب شخص کو تمام صفات میں اس شخص کا حکم نہیں ملتا۔

(جب وہ نائب پیغمبر ہونے کے باوجود پیغمبر کے مرتبہ پر نہیں تو تمام پیغمبروں سے افضل ہونا تو بعد کی بات ہے)

بارھویں نوع:۔ یہ ہے کہ ایک لازم مشترک میں شریک دو چیزوں کے اتحاد کا حکم لگانا مثلاً مشیر۔ مکرہ (منع کرنے والا ہے) کیونکہ جب معاملہ میں مشورہ ہوا یا جس میں مجبور کیا گیا۔ دونوں کی رضامندی کو دخل ہے مثلاً حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب قصہ قرطاس میں مشیر ہوئے تو مکرہ بھی ہوئے اور جو نبی کو کسی چیز پر مجبور کرے وہ گنہگار ہے حالانکہ مشورہ دینے اور مجبور کرنے میں عقل کے نزدیک فرق ظاہر ہے اگرچہ وہم اسکا یقین نہ کرے اسی لیے بچے عورتیں اور نادان مشیر کو بھی مکرہ کی طرح ملامت کرتے ہیں۔

تیرھویں نوع :- یہ کہ عدم ملکہ کو ایجاب وسلب کی جگہ جاننا مثلاً یہ کہتے ہیں کہ جب خلفاء ثلاثہ رضوان اللہ علیہم معصوم نہ تھے تو فاسق ہوئے حالانکہ عصمت نہ ہونے سے فسق لازم نہیں آتا کیونکہ انکے درمیان محفوظ کا ایک واسطہ ہے۔

چودھویں نوع :- یہ کہ "مجموعی کل" کو افرادی کل کا حکم دینا مثلاً کہتے ہیں کہ ہر صحابی معصوم نہ تھا تو گویا کل صحابہ بھی معصوم نہ ہوئے اسلیے انکا اجماع خطا کا احتمال رکھے گا۔ حالانکہ مجموعی کل اور افرادی کل کے احکام میں بہت فرق ہے مثلاً ہر انسان اس گھر میں سما سکتا ہے اور یہ روٹی اسکا پیٹ بھر سکتی ہے مگر سب انسان نہ اس گھر میں سما سکتے ہیں اور نہ یہ روٹی سب کا پیٹ بھر سکتی ہے

پندرھویں نوع :- یہ کہ نئی نئی مثالوں کو ایک خاص چیز جاننا اور اس قسم کا وہم کمزور عقل والوں پر غلبہ کرتا ہے یہاں تک کہ دریا کے پانی، چراغ کے شعلے اور فوارہ کے پانی کو اکثر اشخاص ایک پانی اور ایک شعلہ خیال کرتے ہیں اور اکثر شیعہ اپنی عادات میں اس خیال میں منہمک ہیں۔ مثلاً عاشورہ کا دن جو ہر سال آتا ہے اسکو جناب حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کا دن خیال کرتے ہیں اور نوحہ و ماتم، نالہ و شیون، گریہ و زاری، سینہ کوبی و بیقراری بالکل ان عورتوں کی طرح شروع کر دیتے ہیں جو ہر سال اپنے مردوں پر کرتی ہیں حالانکہ عقل جانتی اور مانتی ہے کہ زمانہ سیال اور غیر قار ہے اسکے اجزاء کو ہرگز قرار نہیں اور جو معدوم ہوگیا اسکا لوٹنا محال ہے جناب حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت اس دن ہوئی تھی جسکو بارہ سو (اور اب چودہ سو) سال کا عرصہ ہوتا ہے اس دن کو آج کے اس دن سے کیا اتحاد اور کونسی مناسبت ہے۔ عید الفطر اور عید الاضحیٰ کو اسپر اس لیے قیاس نہیں کیا جاسکتا کہ وہاں سرور وشادمانی کے اسباب ہر سال تازہ اور نئے ہوتے ہیں یعنی رمضان کے روزوں کی ادائگی اور خانہ کعبہ کے حج کی ادائگی جو نئی نعمت کا شکریہ ہیں جو سال بسال نیا سرور اور نئی فرحت پیدا کرتے ہیں اسی لیے شرعی عیدیں اس وہم فاسد پر مقرر نہیں ہوئی ہیں۔ بلکہ اکثر عقلائے نے بھی نوروز و مہرجان اور اس قسم کے دنوں کو عید منایا ہے کہ یہ ہر سال آسمانی تغیرات کے سبب نئی نئی فرحت لاتے ہیں اور نئے نئے احکام کا سبب بنتے ہیں۔

باباشجاع الدین کی عید، عید غدیر سب اسی خیال فاسد پر مبنی ہیں۔ یہیں سے ایک بات یہ بھی معلوم ہوئی کہ آیت اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ کا دن یا نزول وحی کا پہلا دن، اور شب معراج کو شرعاً عید کیوں قرار نہیں دیا۔ عید الفطر عید النحر کو قرار دیا۔ اسی طرح کسی نبی کے یوم تولد یا یوم وفات کے دن کو عید قرار نہیں دیا۔ اور صوم یوم عاشورہ کو کیوں منسوخ فرمایا جسکو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سال اول میں یہود کی موافقت میں ادا فرمایا ان سب میں یہی راز کار فرما ہے کہ وہم کو اسمیں مداخلت کا موقعہ نہ ملے۔

سولھویں نوع :- ایک چیز کی صورت (تصویر) کو وہی چیز قرار دینا اور اس قسم کے اوہام نے اکثر بت پرستوں کی رہزنی کی اور انکو گمراہی میں مبتلا کیا۔ کمسن اور نادان بچے بھی اس وہم میں پڑ کر بہت خوش ہوتے ہیں۔ کہ مٹی کے کھلونے ہتھیار گھوڑے بنا کر انہیں اصلی گھوڑے اور ہتھیار سمجھتے ہیں۔ کمسن بچیاں رنگ برنگ کپڑے پہنا کر انکی شادیاں کرتی اور بہت خوش ہوتی ہیں۔

اس قسم کے وہم کا شیعوں پر تو بہت ہی غلبہ ہے حضرات حسنین، جناب امیر، جناب سیدہ رضی اللہ عنہم

www.Ahlehaq.com

کی مصنوعی قبور بناتے ہیں اور حقیقی قبروں کی طرح انہیں مان کر ان کی انتہائی تعظیم کرتے ہیں سجدے کرتے ہیں، فاتحہ وسلام پہنچاتے ہیں، مورچھل، مگس راں اٹھائے مجاوروں کی طرح ان کے پاس کھڑے رہتے ہیں اور خوب داد کفر دیتے ہیں عقل کے نزدیک بچوں کی حرکت اور ان "پیران نابالغ" کی حرکات میں کوئی تفاوت اور فرق نہیں۔

سترھویں نوع :۔ کسی شخص کو کسی دوسرے شخص کے نام سے موسوم کرکے تعظیم یا اہانت، سب وشتم مار پیٹ کا سلوک کرتے اور یہ سمجھتے ہیں کہ ہم یہ سلوک اصل شخص سے کر رہے ہیں ان کا یہ وہم پہلے وہم سے بھی زیادہ کمزور ہے۔

آپ نے بچوں کو یہ کھیل کھیلتے دیکھا یا سنا ہوگا کہ وہ اپنے میں سے کسی کو بادشاہ، کسی کو وزیر، کسی کو چور، کسی کو کوتوال بنا کر باہم اسی طرح کا سلوک کرتے ہیں، شیعہ بھی محرم میں یہ ناٹک رچاتے ہیں کسی کا نام یزید، کسی کا شمر، اور بعض خواتین کو خواتین اہل بیت کا نام دے کر ان سے وہی سلوک عملاً کرتے ہیں، جو ان کے نزدیک ہونا چاہیئے تھا۔ ان کے اس وہم کو اللہ کی کتاب کی ایک آیت باطل کرنے کیلئے کافی ہے۔

اِنْ هِيَ اِلَّآ اَسْمَآءٌ سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ۔	یہ کچھ نہیں صرف ایسے نام ہیں جو تم نے اور تمہارے باپ دادوں نے رکھ لیے ہیں بغیر اللہ کی منظوری کے

ان کی اسی وہم کی پیداوار ان کی یہ حرکت ہے کہ جب کسی کا نام عبداللہ یا عبدالرحمٰن دیکھتے ہیں تو اسکی تحقیر واہانت کرتے ہیں حالانکہ حدیث صحیح میں یہ خبر دی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ناموں میں سے سب سے زیادہ محبوب عبداللہ و عبدالرحمٰن نام ہیں۔

بالکل معمولی اور سامنے کی بات ہے کہ کسی چیز کا نام اس چیز کے خواص واثرات نہیں رکھتا۔ مثلاً آگ کا نام گرم نہیں، پانی کا نام ٹھنڈا نہیں، شکر کا نام مٹھاس نہیں اور ایلوے کے نام میں کڑواہٹ نہیں پائی جاتی۔

اٹھارویں نوع :۔ یہ کہ ظرف کو تناقض کی شرط نہیں جانتے اس وہم نے بھی عوام میں بہت گمراہی پھیلائی ہے اور انہیں راہ راست سے بھٹکایا ہے۔

دو نقیضوں کے دو مختلف ظرفوں میں جمع ہو جانے کو یہ محال ہی جانتے ہیں۔ چنانچہ مسئلہ اجتہاد میں شیعہ اسی وہم میں گرفتار ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر امام خدا کی جانب سے مقرر نہ ہو اور ایسے احکام جن پر نص شرعی نہ ہو اگر وہ مجتہدین کی رائے سے وابستہ ہوں تو اجتماع نقیضین لازم آئیگا کیونکہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اگر ایک چیز کو حلال قرار دیا ہے تو امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اسکو حرام قرار دے رہے ہیں۔ حالانکہ صاف بات ہے کہ جب ظرف مختلف ہوا تو اجتماع نقیضین کہاں ہوا دونوں کا ظن ایک ہوتا اور احکام مختلف تو کہا جا سکتا تھا۔

ہر شخص جانتا ہے کہ محمود کے گمان میں حامد کھڑا ہے مگر احمد کے گمان میں کھڑا ہوا نہیں ہے تو اسمیں نقیض کہاں اور یہ باہم متناقض کیسے ہوئے۔

یہاں بھی غیر منصوصات میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی حکم متعین نہیں بلکہ ہر شخص کے لیے وہی حکم متعین ہے جو اسکے یا اسکے پیشواؤں کے اجتہاد کے مطابق ہو اور یہ اختلاف امتی رحمۃ کے یہی معنے ہیں۔

انیسویں نوع :۔ یہ کہ ایک چیز کو دوسری کے ساتھ تشبیہ دینے میں مشبہ اور مشبہ بہ میں پوری پوری

مساوات کا سلب جاننا۔
یہ وہم کمسن بچوں کو لاحق ہوتا ہے تمیز دار اور شعور رکھنے والے لڑکوں کو نہیں شیعوں کو یہ وہم بہت ہوتا رہتا ہے مثلاً وہ کہتے ہیں کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ کو زہد، تقوی، حلم اور علم میں جب اولوالعزم انبیاء علیہم السلام سے تشبیہ دی ہے تو امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ کو ان انبیاء اولوالعزم کے برابر ہونا چاہئے اور جو اولوالعزم انبیاء علیہم السلام کے برابر ہو گا وہ دوسرے انبیاء علیہم السلام سے افضل ہو گا اب ایسی لچر بات کا کوئی کیا جواب دے۔

بیسویں نوع:۔ یہ کہ عادیات کو اولیات کے بجائے لاتے ہیں۔ یہ وہم اکثر گمراہ فرقوں کو لگا ہے اور بڑے بڑے اہل علم اس بھنور میں غوطے کھاتے ہیں۔ مثلاً کہتے ہیں کہ ہر شخص کی ریاست اسکی اولاد اور اسکے خاندان میں چلتی ہے اور دلیل یہ کہ قیصر و کسریٰ کے ہاں یہی ہوتا تھا۔ اور زمینداروں یا راجپوتوں میں اسی کے مطابق عمل ہوتا ہے داماد کے ہوتے ہوئے خسر کو ریاست کا حق نہیں پہنچتا۔
اسی وہم کے مقابلہ میں اسی جنس کا ایک دوسرا وہم بھی ہے یعنی کہ انسان کے مرنے کے بعد ریاست کے اختیارات اسکی بیوی کے سپرد ہیں اور اگر اسکی کئی بیویاں ہوں تو جو بیوی اسکی خاص ہو اور جو کنوارپنے کی حالت میں اسکی بیوی بنی ہو امامت کا معاملہ اسکے ہاتھ میں ہے۔ نہ اس معاملہ میں لڑکی کو کوئی دخل ہے نہ داماد کو۔
بہر حال عقل کے نزدیک دونوں وہم فاسد اور غلط ہیں شرع میں عہدہ اور ریاست ورثہ میں شمار نہیں۔ قابلیت، صلاحیت لیاقت یا صاحب ریاست کے اشارہ پر ترجیح کا دارو مدار ہے۔

اکیسویں نوع:۔ غائب کو نظر آنے والی چیز پر قیاس کرنا ہے مثلاً اللہ تعالے اور پیغمبر علیہ السلام کو مخلوق اور امت پر قیاس کرنا اس سخت بیماری نے بھی بہت سوں کے عقائد خراب کئے ہیں۔ چنانچہ شیعوں کے الٰہیات و معاد کے اکثر مسائل اسی اصل پر موقوف ہیں خصوصاً وجوب اصلح و لطف اور وجوب عدل اور مطیع کو ثواب دینا اور عاصی کو عذاب دینا وغیرہ اس وہم سے جو خرابی پیدا ہوتی ہے گذشتہ ابواب میں ان کا بیان گذر چکا ہے۔

بائیسویں نوع:۔ ترک اضافات یعنی یہ کہ ایک چیز کو چند چیزوں سے دو تین نسبتیں حاصل ہوں ایک نسبت کوئی حکم چاہتی ہو دوسری کچھ اور اب ان میں سے ایک کا لحاظ کریں اور باقی کو نظر انداز کر دیں امامیہ کو یہ وہم اکثر مسائل میں لاحق ہوا ہے مثلاً کہتے ہیں کہ امامت چونکہ نبی کی نیابت ہے اسلیے وہ نبی کی اجازت پر موقوف ہو گی لہذا امام کی امامت پر نص ہونا واجب ہوا۔ حالانکہ امامت ریاست امت ہے اور انہیں کے اختیار پر موقوف ہے۔ تو اس لحاظ سے امام کا منصوص علیہ ہونا ضروری نہیں یا مثلاً کہتے ہیں کہ امیر سے محبت کرنا واجب ہے جبکہ ام المؤمنین رضی اللہ عنہا نے ان سے پرخاش رکھی لہذا وہ واجب البغض ہوئیں حالانکہ اسکا یہ پہلو بھی تو ہے کہ حضور علیہ الصلوۃ والسلام واجب المحبت ہیں اور ام المؤمنین آپ کی محبوب زوجہ لہذا وہ واجب المحبت ہوئیں۔
اس قسم کا وہم ان کے تمام معتقدات میں گھسا ہوا ہے۔ اور حفظت شیئاً و غابت عنک اشیاء (ایک چیز یاد رہ گئی اور باقی ساری چیزیں تیری نظر سے غائب ہو گئیں)۔ کی پرانی مثل ان پر صادق آتی ہے کہ وہم کے سوا انکو سب کچھ بھول گیا۔

تیئیسویں نوع: - یہ کہ جو کچھ دلی آرزو ہو مثلاً کمال انتظام حسن سیاست ملک، اور لوازم ریاست ان چیزوں کے متعلق واقعی یہ گمان کرنا یا اعتقاد رکھنا کہ گویا تحقیق شدہ ہے مثلاً کہتے ہیں کہ ہر شرعی حکم اور دنیوی مصلحت کیلئے امام معصوم واجب الطاعت ہے۔ اسلیے کہ اسپر غیب سے القا ہوتا ہے وہ اپنی تدبیر و حکم میں ہرگز غلطی نہیں کرتا یہ عجیب لطیفہ ہے کہ ایک چیز کو یا واقع تو ہوئی مگر ہماری نظر سے غائب ہے نہ ہم اسکو دیکھتے ہیں نہ اسکی خبر سنتے ہیں پھر بھی یقین سے جانتے ہیں کہ ایسا ہے یہ وہم تو ہے ہی غفلت اسپر مزید ہے کہ جب ہم اسکو نہ دیکھ رہے ہیں نہ اسکی خبر سن رہے ہیں ایسی بات یا چیز کا تو وجود و عدم برابر رہا۔ تو اسکے وقوع میں کونسا لطف اور کیا حاصل۔

چوبیسویں نوع: - یہ ہے کہ ہمیں اپنی معلومات میں جسکی دلیل نہ ملے وہ باطل ہے سابقہ بے وقوفوں میں سے اکثر نے اسی کو دلیل بناکر اندھیرے میں رنگوں کا انکار کیا ہے اور کہا ہے کہ اندھیری میں کوئی رنگ نہیں اسلیے کہ ہم نہیں دیکھ پاتے اور جو ہم دیکھ نہ سکیں اسکا وجود نہیں۔ مگر اتنا نہیں سمجھتے کہ اسکا جواز ہے کہ رنگ موجود مگر ہم اسکو سمجھ نہ سکتے ہوں اکثر شیعہ اس وہم کا شکار رہیں اور اسی بنا پر ازواج مطہرات اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کے فضائل کا انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہماری کتابوں میں مذکور نہیں۔ ارباب سیر و تواریخ کے ذکر کردہ امور واقعیہ کا انکار کرتے ہیں انکے باطل و غلط ہونے کا عقیدہ رکھتے ہیں۔ اس بارے میں اگر ان کے سامنے آیات یا متفق علیہ احادیث پیش کی جائیں تو کہتے ہیں کہ ہم نہیں سمجھتے کہ اس عبارت سے یہ مدعا ثابت ہوتا ہو یہ تو در اصل۔ وَقَالُوا قُلُوبُنَا غُلْفٌ بَلْ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَقَلِيلًا مَّا يُؤْمِنُونَ. کا مصداق ہیں۔

پچیسویں نوع: - یہ کہ زمانہ میں تقدم، کتابوں کی تصنیف، رسائل کی تدوین، دنیا میں شہرت، شاگردوں اور ساتھیوں کی کثرت، یہ سب حق پر ہونے کی دلیلیں ہیں۔ لہذا ہمارے علماء کے پیشوا چونکہ یہ تمام صفات بدرجہ اکمل رکھتے تھے اس لیے بلا شبہ انکے تمام معتقدات واقعہ کے مطابق ہی ہوں گے۔ اس وہم کی اصلیت یہ ہے کہ دنیاوی مناصب میں مال و جاہ کا حصول، شہرت، پیروؤں و خدام کی کثرت و بہتات بزرگی۔ ثروت و شان و شوکت کی دلیل ہوتی ہے۔ اور یہ لوگ دنیاوی طور پر آگے بڑھے ہوئے افراد کے تقدم کو ادراک حق کے تقدم کے برابر جانتے اور علمی اور دینی دنیا میں بھی انکو سبقت و پیش دستی کا مستحق سمجھ بیٹھتے ہیں ایسے خیال و وہم کی غلطی ڈھکی چھپی نہیں۔ بالکل آشکارا ہے۔

ایسی باتیں اور مغالطے حکماء ہند و یونان میں ان لوگوں سے زیادہ پیش آتے رہے ہیں حالانکہ انکے اکثر معتقدات خصوصاً الٰہیات۔ نبوت اور معاد میں انکی بے وقوفی کی شہادت دے رہے ہیں۔

حاصل کلام یہ کہ اس بے وقوف فرقہ کے مغالطے اور اوہام اگر ہم پورے پورے بیان کرنے بیٹھ جائیں تو دفتر کے دفتر بھی انکے لیے کافی نہ ہونگے۔

مجبوراً اسی پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ اتنے سے بھی پتہ چل جاتا ہے کہ یہ کتنے پانی میں ہیں۔

***

www.Ahlehaq.com

www.Ahlehaq.com

دوسری فصل

شیعی تعصبات

واضح رہے کہ تعصب اسے کہتے ہیں کہ ایک چیز اپنے نزدیک دلیل قطعی سے ثابت ہے مگر مخالف کے مقابلہ میں اسکا انکار کر دیا جائے اور جو چیز اپنے نزدیک قابل انکار ہے اسی چیز سے فریق مخالف پر الزام رکھنا گویا مخالف بھی نفی واثبات میں خود کے موافق ہو ورنہ اگر وہ موافق نہ ہوگا تو وہ دلیل الزامی ہوگی۔ تعصب نہ ہوگا اور چونکہ درحقیقت غلو بھی یہی ہے کہ منفی کا اثبات کیا جائے اور مثبت کی نفی کی جائے۔ محض شدت محبت کے سبب تو اسے بھی تعصب میں شمار کیا گیا ہے۔ اس فصل میں اسکا بھی ذکر ہوگا مگر عنوان کلام ہر دو میں تعصب ہی رہے گا۔

تعصب (۱) :۔ کتاب اللہ، سنت رسول اللہ سے آفتاب سے زیادہ روشن دلائل جو اہل بیت اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بطریق تواتر اہل سنت کے ہاں مروی ہیں انکے سامنے پیش کی جاتی ہیں تو ان سے صاف انکار کر دیتے ہیں اور وہ واہی تباہی روایات جو ان کے مجروح ومطعون اور غیر معتبر راویوں سے طریق قوم کے موافق امامیہ سے منقول ہیں انکو قبول کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ امام جس کی روایت کرے وہ موجب علم وعمل ہے اگرچہ اسکی اسناد میں مجہول، ضعیف، جھوٹے اور وضاع راوی ہی کیوں نہ ہوں اور اہل سنت کی مرویات چاہے ثقہ راویوں سے ہوں واجب الرد اور انکار کے قابل ہیں۔ حالانکہ باب اخبار میں انکے تمام علماء بھی کہتے ہیں کہ موثق روایت ضعیف سے مقدم ہے، بہتر اور معتبر ہے، اور ثقات اہل سنت کی روایات بلاشبہ ان کے نزدیک موثق ہیں۔

تعصب کی ایک بات یہ بھی ہے کہ ان خفی الدلالت آیات کو نص صریح جانتے ہیں جو قواعد واصول عربیت کے موافق انکے مدعا پر ہرگز دلالت نہیں کرتیں اور نصوص صریحہ کو متشابہات سمجھتے ہیں جو اہل سنت کے مذہب پر صحیح دلالت کرتی ہیں۔

حالانکہ اس سلسلہ میں انکے علماء کا اس طور بارہا امتحان بھی ہوا۔ کہ بعض کافر ذمی لوگوں کو جو نہ کسی مذہب سے سروکار رکھتے تھے۔ اور اہل مذاہب سے انکا کوئی تعلق نہیں تھا، لغت عربی کی تعلیم یا ترجمہ تحت اللفظ سیکھنے پر جب انکو وہ آیات سنا کر پوچھا گیا کہ تم ان سے کیا سمجھے تو انہوں نے بلا توقف اہل سنت کے مدعا پر گواہی دی شیعہ مدعا اس آیت سے نہ انکے سمجھ میں آیا اور نہ اسپر انہیں یقین آیا۔

تعصب (۲) :۔ حضور خاتم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم اور جناب علی رضی اللہ عنہ کو برابر جانتے ہیں حالانکہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام مخلوقات پر افضلیت خود انکے نزدیک بھی بتواتر منقول ہے

تعصب (۳) :۔ علی رض کی محبت جسکے دل میں ہوگی خواہ وہ کافر و مشرک ہو، یہودی و نصرانی ہو وہ جنت میں داخل ہوگا۔ اور جو دل میں صحابہ کی دوستی رکھے خواہ عابد و متقی ہو اور اہل بیت سے بھی محبت رکھتا ہو پھر بھی وہ دوزخی ہے۔

www.Ahlehaq.Com

چنانچہ رضی الدین لغوی شیعی نے اپنے چند شعروں میں زنیبا بن اسحاق نصرانی کے بہشتی ہونے کا حکم لگایا ہے حالانکہ اس نے جناب ابوبکرؓ و عمرؓ کو برا نہیں کہا ہے۔

ابیات

عَدِیٌّ وَتَیْمٌ لَا اُحَاوِلُ ذِکْرَھُمْ | بِسُوْءٍ وَلٰکِنِّیْ مُحِبٌّ لِھَاشِمِ
وَمَا یَعْتَرِیْنِیْ فِیْ عَلِیٍّ وَّاَھْلِہٖ | اِذَا ذُکِرُوْا فِی اللّٰہِ لَوْمَۃُ لَائِمِ
یَقُوْلُوْنَ مَا بَالُ النَّصَارٰی یُحِبُّھُمْ | وَاَھْلُ النُّھٰی مِنْ اَعْرُبٍ وَّاَعَاجِمِ
فَقُلْتُ لَھُمْ اِنِّیْ لَاَحْسِبُ حُبَّھُمْ | سَرٰی فِیْ قُلُوْبِ الْخَلْقِ حَتَّی الْبَھَائِمِ

ترجمہ :۔ میں عدی وتیم (ابوبکر وعمر کے قبیلے) کا ذکر برائی سے کرنے کا کوئی ارادہ نہیں کرتا۔ لیکن میں بنی ہاشم سے محبت رکھتا ہوں۔ اور جب دین خدا میں علیؓ اور اسکے گھرانے کا ذکر کیا جائے تو مجھے ملامت گر کی ملامت نہیں چھوتی۔ کہتے ہیں کہ اسکا کیا سبب ہے عرب وعجم اور نصاریٰ کے عقلمند ان سے محبت کرتے ہیں۔ تو میں ان سے کہتا ہوں کہ انکی محبت انسانوں کے دلوں میں کیا بہائم کے دلوں تک میں اثر کر گئی ہے۔

اور ابن فضلوں یہودی کو تو انکے علماء ان دو بیتوں کی وجہ سے بھلائی سے یاد کرتے ہیں۔

یَا رَبِّ ھَبْ لِیْ مِنَ الْجَنَّۃِ سُؤْلِیْ | وَاعْفُ عَنِّیْ بِحَقِّ اٰلِ الرَّسُوْلِ
وَاسْقِنِیْ شَرْبَۃً بِکَفِّ عَلِیٍّ | سَیِّدِ الْاَوْلِیَاءِ بَعْلِ بَتُوْلِ

ترجمہ :۔ میرے پروردگار میرا جنت کا سوال پورا فرما۔ اور آل رسول کے طفیل میرے گناہ بخش دے۔ اور علیؓ کے ہاتھ سے مجھے پانی پلا جو ولیوں کے سردار اور شوہر بتول ہیں۔

حالانکہ حضرت علیؓ اور اہل بیت رضوان اللہ علیہم کی محبت انکی مدح گوئی، منقبت خوانی بالاجماع موجب اجر و ثواب اور ایک طرح کی عبادت ہے مگر تمام قابل اجر و ثواب اعمال میں قبولیت کیلئے ایمان شرط اول ہے جیساکہ ارشاد ربانی ہے۔

وَمَنْ یَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَھُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا کُفْرَانَ لِسَعْیِہٖ وَاِنَّا لَہٗ کَاتِبُوْنَ۔ | اور جو اچھے کام کرتا ہے بشرطیکہ وہ مومن بھی ہو تو اسکی سعی وکوشش ضائع نہیں ہوتی۔ ہم اسکو لکھ رکھتے ہیں۔

جب محبوب خدا پیغمبر اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت بھی آپ کے لائے ہوئے دین پر ایمان لائے بغیر کافروں پر اثر انداز نہ ہوئی۔ تو جناب امیر و اہل بیت رضوان اللہ عنہم جو بلاشبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پیرو اور تابعدار ہیں۔ تو انکی محبت کافر کے حق میں کیسے کارگر ہو سکتی ہے۔ اور پھر کافروں کی دوزخ سے رہائی اور بہشت میں انکا دخول خود ان شیعوں کے نزدیک باطل ومحال ہے۔ خواہ وہ کتنے بھی اعمال خیر کیوں نہ کرلیں۔ اور اہل ایمان خواہ کس قدر بھی گناہ نہ رکھتے ہوں انکے نزدیک بہشت میں ضرور داخل ہونگے صحابہ سے محبت زیادہ سے زیادہ معصیت اور گناہ کبیرہ ہی ہوگی تو اہل سنت انکی دوستی کیوجہ سے بہشت سے کیوں محروم رہیں گے۔ حالانکہ وہ اہل بیت کرام سے بھی بلاشبہ محبت رکھتے ہیں۔ اور جب اہل بیت کی محبت کافر کو دوزخ سے نکال کر جنت میں پہنچا سکتی ہے تو اہل سنت جو صرف صحابہ سے دوستی رکھنے کے مرتکب ہیں دوزخ سے خلاصی پاکر جنت

www.Ahlehaq.com

میں کیوں داخل نہ ہوں۔

تعصب (۴) :۔ یہ ہے کہ کہتے ہیں جناب امیر رضی اللہ عنہ سے محبت رکھتے ہوئے کوئی معصیت ضرر نہیں پہنچاتی حالانکہ یہ بات نصوص قرآنی کے خلاف ہے مثلاً مَنْ یَّعْمَلْ سُوْٓءًا یُّجْزَ بِهٖ (جو برا کام کریگا اسکا بدلہ پائے گا) مَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا یَّرَهٗ (جو ذرہ برابر برائی کریگا وہ اسکے آگے آئیگی) علاوہ ازیں اسکے خلاف خود ائمہ کرام رحمہم اللہ سے صحیح روایات مروی ہیں جو کتاب میں بیان ہو چکی ہیں۔

تعصب (۵) :۔ صحابہ کرام رضوان اللہ عنہم سے انتہائی بغض و عداوت کی وجہ سے پوری امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا نام ان بدبختوں نے "ملعونہ" رکھدیا اور اللہ تعالیٰ کے فرمان کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّةٍ کو بھی پس پشت پھینک دیا ہے اور اپنے امام جناب حسن عسکری رحمۃ اللہ علیہ کی اس روایت کو جو ابن بابویہ نے بسند صحیح اپنی تفسیر میں روایت کی ہے فراموش کردیا ہے جس کے الفاظ یہ ہیں۔

اَمَا عَلِمْتَ یَا مُوْسٰی اَنَّ فَضْلَ اُمَّةِ مُحَمَّدٍ عَلٰی سَائِرِ الْاُمَمِ کَفَضْلِیْ عَلٰی خَلْقِیْ۔	اے موسیٰ کیا تم جانتے نہیں کہ امت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی فضیلت تمام امم کے مقابلہ میں ایسی جیسی میری فضیلت میری تمام مخلوق پر۔

اسی طرح آیت وَکَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَکُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَی النَّاسِ بھی انہوں نے نظر انداز کردی ہے۔

تعصب (۶) ۔۶۔ موجودہ قرآن مجید سے بریت ظاہر کرتے ہیں حالانکہ یہ بلا شبہ ان کے ائمہ حضرات رحمہم اللہ کے نزدیک منقول بالتواتر ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم دوران نماز و خارج نماز بہ نیت عبادت اسکی ہی تلاوت فرماتے تھے اور جناب حسن عسکری اور دیگر ائمہ رحمہم اللہ نے اسی قرآن کی تفسیر لکھی اور اسی کی آیات و الفاظ سے اپنے کلام میں دلائل و استشہادات پیش کئے۔ مگر یہ کہتے ہیں کہ یہ قرآن منزل نہیں بلکہ یہ (حضرت عثمان رضی اللہ عنہ) کا تحریف کردہ ہے کیونکہ انہوں نے ہی اسے جمع کیا اور انہوں نے ہی اسے رواج دیا۔ کوئی حد ہے اس بغض و عناد کی؟

تعصب (۷) :۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ پر لعنت کرنے کو ذکر الٰہی اور تلاوت قرآن سے بڑھکر جانتے ہیں حالانکہ کسی بھی ملت و شریعت میں بروں کی برائی کار ثواب نہیں مانی گئی چہ جائیکہ وہ ذکر الٰہی سے زیادہ ثواب کا درجہ رکھے جو باجماع جملہ ملل و نحل افضل ترین شغل اور احسن ترین عمل ہے (یہ بات بغض و عناد سے اٹی کھوپڑی میں جڑ پکڑ سکتی ہے اور وہی ایسا لغو و بے ہودہ عقیدہ رکھ سکتے ہیں)

تعصب (۸) :۔ بڑے بڑے صحابہ (رضی اللہ عنہم) ازواج مطہرات (رضی اللہ عنہن) پر لعنت بھیجنے کو بڑی عبادت شمار کرتے اور پنجوقتہ نمازوں کی طرح اسکو ہمیشہ ادا کرنا فرض خیال کرتے ہیں۔ ابو جہل فرعون و نمرود کو جو بلا شبہ خدا اور اسکے رسولوں کے دشمن ہیں کبھی کچھ نہیں کہتے نہ انکی کتابوں میں اسکے متعلق کچھ لکھا ہے انکی کتابوں میں تو یہ لکھا ہے کہ جناب شیخین رضی اللہ عنہما پر ہر صبح لعنت بھیجنا ستر نیکیوں کے برابر ہے مگر ابو جہل فرعون و نمرود پر لعنت رتی بھر بھی حسنہ نہیں۔

تعصب (۹): ۔بنات پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ام کلثوم اور بی بی رقیہ رضی اللہ عنہما کا عقد چونکہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ سے ہوا تھا اسلیے ان ہر دو محترمات کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد سے خارج کرتے اور کہتے ہیں کہ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادیاں نہیں تھیں ۔ بلکہ بعض تو انکو حضرت خدیجۃ الکبری رضی اللہ عنہا کی بیٹیاں بھی نہیں مانتے کہ کہیں ماں کی طرف سے ہی بی بی زہرا رضی اللہ عنہا سے اشتراک نہ ہو حالانکہ یہ آیت يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِأَزْوَاجِكَ وَبَنَاتِكَ (اے نبی اپنی بیویوں اور بیٹیوں سے کہو) کے سراسر خلاف ہے (ایک بیٹی کیلئے بنات، صیغہ جمع کی کیا تک تھی)

نہج البلاغہ میں ذکر ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی تغیر سیرت پر ناراض ہوتے ہوئے یہ الفاظ فرمائے ،، کہ دامادی کے سبب آپ اس رتبہ تک پہنچے کہ شیخین رضی اللہ عنہما بھی نہ پہنچے تھے ،، (یہ کن کی دامادی کی طرف اشارہ ہے)

اور دیکھئے ابوجعفر طوسی اپنی کتاب تہذیب میں جناب جعفر صادق رحمۃ اللہ علیہ سے یوں روایت کرتا ہے کہ وہ اپنی دعا میں یہ فرمایا کرتے تھے ۔

اللھم صل علی رقیۃ بنت نبیک	اے اللہ اپنے نبی کی بیٹی رقیہ پر رحمت فرما
اللھم صل علی ام کلثوم بنت نبیک	اے اللہ اپنے نبی کی بیٹی ام کلثوم پر رحمت فرما ۔

کلینی کی روایت بھی ملاحظہ کیجئے ۔

تَزَوَّجَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَدِيْجَةَ وَهُوَ ابْنُ بِضْعٍ وَعِشْرِيْنَ سَنَةً فَوُلِدَ لَهُ مِنْهَا قَبْلَ مَبْعَثِهٖ عَلَيْهِ السَّلَامُ الْقَاسِمُ وَرُقَيَّةُ وَزَيْنَبُ وَاُمُّ كُلْثُوْمٍ وَوُلِدَ لَهُ بَعْدَ الْمَبْعَثِ الطَّيِّبُ وَالطَّاهِرُ وَفَاطِمَةُ ۔	جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے شادی فرمائی تو آپ کی عمر پچیس سال تھی تو آپ کی بعثت سے قبل، قاسم، رقیہ، زینب اور ام کلثوم (رضی اللہ عنہم) پیدا ہوئیں ، اور بعثت کے بعد طیب وطاہر ، اور فاطمہ رضی اللہ عنہم تولد ہوئے ۔

اور دوسری روایت میں اس نے بیان کیا ہے کہ بعثت کے بعد صرف فاطمہ رضی اللہ عنہا ہی پیدا ہوئیں اور طیب وطاہر رضی اللہ عنہما بعثت سے پہلے پیدا ہوئے ،، ملا طاہر قزوینی نے شرح میں قصہ کی تفصیل لکھی ہے ۔

تعصب (۱۰): ۔یہ کہتے ہیں کہ جناب ابوبکر صدیق ، عمر فاروق ، اور عثمان غنی رضی اللہ عنہم منافقوں میں سے تھے حالانکہ یہ بات انکے نزدیک ثابت ہے کہ آیت مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلٰى مَا اَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتّٰى يَمِيْزَ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ ۔ کے ذریعہ مؤمن ومنافق باہم ممیز ہو چلے تھے ۔ آخر حیات میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو امام نماز مقرر فرمایا حالانکہ منافق کو بالاجماع امام نماز بنانا جائز نہیں ۔ اور پھر حضرت علی مرتضی رضی اللہ عنہ ہمیشہ حضرت ابوبکر حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہم کی اقتدا میں نماز ادا فرماتے رہے انکے علاوہ جناب ابوذر ، سلمان فارسی ، مقداد اور جناب عمار رضی اللہ عنہم بھی ان تینوں حضرات کے پیچھے نماز پڑھتے رہے اور کبھی انکی اقتدا سے علیحدہ نہیں ہوئے ۔

تعصب (۱۱): ۔کہ تیمی اور عدوی جناب ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کے دو بت تھے جنکو وہ چھپائے رکھتے

اور انہیں کی عبادت کرتے تھے ۔حالانکہ یہ بات انہی لوگوں کے نزدیک ثابت ہے کہ جناب محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہ کو جناب امیر رضی اللہ عنہ نے اپنا متبنیٰ بنایا تھا اور اپنی صاحبزادی کا نکاح کرنا چاہتے تھے ۔ اگر انکی بکواس صحیح مان لی جائے تو پہلی بات تو یہ کہ جناب اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا جو مومنہ تھیں جناب ابوبکر رضی اللہ عنہ سے انکا نکاح کیسے صحیح ہوا اور جناب محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہ کی ولادت کیسی ہوئی ۔ اور غلط ولادت والے کو جناب امیر رضی اللہ عنہ نے اپنا متبنیٰ کیسے بنالیا اور اپنی بیٹی انکے نکاح میں دینے کا کیوں ارادہ کیا ایک معصوم ، کا بت پرستوں سے اس قسم کے معاملات کرنا کس شرع و منطق کی رو سے صحیح قرار پائے گا ۔

تعصب (۱۲) :۔ یہ کہتے ہیں کہ قرآن کی وہ آیات جو حضرات مہاجرین و انصار خصوصاً حضرت ابوبکر، و عمر عثمان و طلحہ ، زبیر اور جناب صدیقہ رضی اللہ عنہم کی شان میں نازل ہوئیں سب متشابہات ہیں جنکے معنی کا پتہ نہیں ۔ ابن شہر آشوب السروی مازندرانی نے جو انکے عالموں میں سے ہے یہ بات لکھی ہے ۔ اور دوسرے بھی اسکے دیکھا دیکھی یہی بیان کرنے لگے ہیں ۔

تعصب (۱۳) :۔ اہل سنت کے متعلق یہ کہتے ہیں کہ یہ لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بغض رکھنے میں حد سے بھی بڑھ جاتے ہیں اور آپ کی ذات گرامی سے عناد رکھتے ہیں افراط سے کام لیتے ہیں اسی وجہ سے ان حضرات کو نواصب کے لقب سے یاد کرتے ہیں ۔ اس افتراء و بہتان کا سہرا ابن شہر آشوب نے اپنے سر باندھا ہے ۔ حالانکہ یہی لوگ خود اپنی کتابوں میں اہل سنت کی کتابوں خصوصاً بیہقی ابوالشیخ اور دیلمی سے نقل کرتے ہیں ۔

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يُؤْمِنُ اَحَدٌ حَتّٰى اَكُوْنَ اَحَبَّ اِلَيْهِ مِنْ نَفْسِهٖ وَيَكُوْنَ عِتْرَتِيْ اَحَبَّ اِلَيْهِ مِنْ نَفْسِهٖ ۔	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تک میں کسی کو اپنی جان سے زیادہ پیارا نہ ہو جاؤں وہ مومن نہیں ہوتا اور میری عترت بھی اسکو اپنی جان سے زیادہ پیاری نہ ہو جائے ۔
عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَحِبُّوا اللّٰهَ لِمَا يَغْذُوْكُمْ مِنْ نِعَمِهٖ وَاَحِبُّوْنِيْ لِحُبِّ اللّٰهِ وَاَحِبُّوْا اَهْلَ بَيْتِيْ لِحُبِّيْ اِلٰى هٰذِهٖ الخ	ابن عباس رضی اللہ عنہما راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ سے محبت کرو کہ وہ تم پر انعام فرماتا ہے اور اللہ سے دوستی کے سبب مجھ سے محبت کرو اور میری محبت کی وجہ سے میرے اہل بیت سے محبت کرو ۔

ان روایات کے علاوہ شیعہ یہ بھی جانتے ہیں کہ اہل سنت جناب امیر اور آپ کی ذریت رضی اللہ عنہم سے محبت فرائض ایمان میں سے شمار کرتے ہیں ۔ چنانچہ شیخ فریدالدین عطار رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے عربی اشعار میں فرمایا ہے

فَلَا تَعْدِلْ بِاَهْلِ الْبَيْتِ خَلْقًا	فَاَهْلُ الْبَيْتِ هُمْ اَهْلُ السَّعَادَةِ
فَبُغْضُهُمْ مِنَ الْاِنْسَانِ خُسْرٌ	حَقِيْقِيٌّ وَحُبُّهُمْ عِبَادَةٌ

(اہل بیت کو عام مخلوق کی طرح کا نہ سمجھو وہ نیک بخت لوگوں کی جماعت ہے ۔ ان سے عداوت و بغض انسان کے لیے حقیقی خسارہ ہے ۔ اور ان سے محبت عبادت کا سا درجہ رکھتی ہے)۔

ان اشعار کو شیخ بہاء الدین آملی نے اپنے کشکول میں ذکر کر کے شیخ موصوف سے یہ بھی نقل کیا کہ آپ نے

www.Ahlehaq.com

فرماتے تھے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر تو ایمان لے آیا مگر آپ کے اہل بیت پر ایمان نہیں لایا تو وہ مومن نہیں۔ اور ان شیعوں کو امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے حب اہل بیت کا حال بھی معلوم ہے اور اس سلسلے میں جناب اعمش رحمۃ اللہ علیہ سے امام صاحب کی پرخاش بھی پوشیدہ بات نہیں ہوتا یہ تھا کہ جناب اعمش حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اس واقعہ کو جو ابوجہل کی بیٹی کیلیے پیغام نکاح دینا اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اس پر اظہار ناراضگی فرمانے کو بیان کیا کرتے تھے۔ مگر امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ ان سے کہتے تھے کہ گو واقعہ صحیح ہے۔ مگر تم جس انداز بیگانہ اور بے ادبانہ میں اسکو بیان کرتے ہو یہ درست نہیں۔ اور جب کوئی دینی مسئلہ اس پر موقوف بھی نہیں تو کیوں بیان کرتے ہو۔ چنانچہ شریک بن عبداللہ بن شبرمہ، ابن ابی لیلی رحمہم اللہ جو امام صاحب کی رائے سے متفق تھے۔ سب مل کر اعمشؒ کے گھر گئے اور ان سے اس واقعہ کے بیان کرنے پر ملامت کی، جناب اعمشؒ رحمۃ اللہ علیہ نے جواب دیا کہ جہاں تک حب علی رضی اللہ عنہ کا سوال ہے تو میں اسمیں تم سے بھی دو قدم آگے ہوں مگر حدیث کو جس طرح سنا ہے اسی طرح روایت کیا ہے۔ میرا بھی منصبی فریضہ ہے پھر ان حضرات کے سامنے امیر المومنین رضی اللہ عنہ کے مناقب میں بہت سی روایات بیان کیں کہ سب حضرات خوش ہوگئے اور خوش خوش واپس آگئے۔ اور امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کو جناب محمد باقر، جناب جعفر صادق رحمۃ اللہ علیہما سے علم و طریقت کے استفادہ کی جو شاگردانہ نسبت حاصل ہے یا جناب زید بن علی بن حسین رضی اللہ عنہما سے جو رابطہ و تعلق ہے وہ نہ محتاج بیان ہے نہ محتاج ثبوت۔ جناب امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے والد گرامی جناب ثابت رحمۃ اللہ علیہ نے بچپن میں اپنے والد کے ہمراہ امیر المومنین رضی اللہ عنہ کی زیارت کی جناب امیر نے اسکے حق میں برکت اولاد کی دعا فرمائی چنانچہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ آپ کی دعا کی قبولیت کی علامت ہیں جناب امام شافعیؒ رحمۃ اللہ علیہ کی محبت اس خاندان سے کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں اس سلسلہ میں ان کے اشعار شیعہ کتب میں مذکور و مسطور ہیں۔ ہم انکی توجہ انکی اپنی کتابوں میں مندرج اشعار کی طرف دلاتے ہیں کہ انہیں دیکھیں۔ اور اپنے الزام کی مضحکہ خیزی پر ہو سکے تو ندامت سے سر جھکالیں۔

اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ تو جناب صادق رحمۃ اللہ علیہ کے دوستوں میں سے تھے۔ پوری زندگی ان کے ہم مجلس رہے آپ سے علم حاصل کیا اور آپ کے شاگرد رشید شمار ہوئے ہیں۔ اور جب جناب علی رضا رحمۃ اللہ علیہ نیشاپور پہنچے تو ایک خچر پر سوار تھے، شقیق بلخی رحمۃ اللہ علیہ جو اہل سنت کے بڑے صوفیا میں سے ہیں آپ کے آگے آگے جلوداری کرتے چلتے تھے اور صوفیہ کی ایک دوسری جماعت اپنی چادروں سے آپ پر سایہ کئے ہوئے ہوتی۔

حافظ ابو زرعہ رازی، اور محمد بن اسلم طوسی رحمہما اللہ اپنے تمام طلباء اور حدیث کے کاتبان کے ساتھ اپنے مدرسوں اور اپنے مقامات سے باہر آپ کی زیارت کیلیے نکل آئے۔ اور شہر میں ایک ہل چل مچ گئی۔ لوگ باگ آپ کی زیارت کو امنڈ آئے۔ محدثین اہل سنت نے عرض کیا کہ اس موقع پر آپ اگر ایک دو حدیثیں اپنی آباء کی سند یعنی سلسلۃ الذہب سے مجمع کے سامنے بیان فرمادیں تو ہم سب بہت احسانمند ہونگے۔ چنانچہ آپ نے اب وجد کے حوالہ سے یہ روایت بیان فرمائی۔

لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ حِصْنِيْ فَمَنْ قَالَهَا دَخَلَ حِصْنِيْ وَمَنْ دَخَلَ حِصْنِيْ اٰمِنَ مِنَ الْعَذَابِ۔	کلمہ لا الٰہ الا اللہ میرا قلعہ ہے جس نے یہ کلمہ پڑھ لیا وہ میرے قلعہ میں داخل ہو گیا اور جو میرے قلعہ میں داخل ہو گیا وہ عذاب سے مامون ہو گیا۔

اسوقت اہل سنت علماء محدثین اور طلباء جو دوات بردار تھے ان کی تعداد لگ بھگ بیس ہزار تھی۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ جب اس روایت کو ذکر کرتے تو فرماتے اگر یہ پاگل پر پڑھی جائے تو اسے ہوش آجائے اور بیمار پر پڑھی جائے وہ صحت یاب ہو جائے۔

ابن اثیر نے کامل میں اسی طرح ذکر کیا ہے۔ امامیہ میں سے صاحب الفصول نے بھی تاریخ الائمہ میں ایسا ہی ذکر کیا ہے حضرت سعید بن مسیب رحمۃ اللہ علیہ سے یہ روایت مشہور ہے۔

كَانَ عِنْدَهُ رَجُلٌ مِنْ قُرَيْشٍ فَاَتَاهُ عَلِيُّ بْنُ حُسَيْنٍ فَقَالَ لَهُ الرَّجُلُ الْقُرَشِيُّ يَا اَبَا عَبْدِ اللّٰهِ مَنْ هٰذَا قَالَ سَعِيْدٌ هٰذَا الَّذِيْ لَا يَسَعُ مُسْلِمًا اَنْ يَجْهَلَهُ هُوَ عَلِيُّ بْنُ حُسَيْنِ بْنِ عَلِيِّ بْنِ اَبِيْ طَالِبٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمْ اَجْمَعِيْنَ۔	کہ انکے پاس ایک قریشی بیٹھے ہوئے تھے کہ جناب علی بن حسین رضی اللہ عنہما تشریف لائے قریشی نے پوچھا ابو عبد اللہ یہ کون صاحب ہیں سعید نے کہا یہ وہ ہیں جن سے ناواقف رہنا کسی مسلمان کیلیے جائز نہیں یہ علی بن حسین بن علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہم ہیں۔

پھر تصوف کے اکثر سلسلے انہی حضرات تک منتہی ہوتے ہیں۔ تو گویا یہ اہل سنت کے سب فرقوں کے پیر و مرشد ہیں اور اہل سنت کے نزدیک پیر و مرشد کی جو عزت و احترام اور عظمت ہے وہ سب پر واضح اور روشن ہے۔ یہ حضرات تو اپنے مرشد سے بغض و عناد رکھنے یا انکی اہانت کرنے کو سلسلۂ طریقت سے نکل جانے کے مترادف سمجھتے ہیں۔

اب لائق غور اور قابل توجہ یہ بات ہے کہ اہل سنت کا دار و مدار شریعت اور طریقت پر ہی تو ہے اور انہی دو باتوں کو وہ سرداری اور بزرگی کا ذریعہ جانتے ہیں شریعت کے ستون اور بڑے یہی چار ائمہ عظام رحمۃ اللہ علیہم ہیں۔ اور طریقت کے بڑے صوفیا کے خاندان کے افراد ہیں اور ہر دو فرقوں۔ اہل شریعت و اہل طریقت کا رجوع اہل بیت ہی کی طرف ہے اور یہ انہی بزرگوں کے خوان فیض کے ریزہ چیں ہیں۔ لہذا اہل بیت سے بغض رکھنے کی نسبت اہلسنت کی طرف کرنا ایسا ہی ہے جیسے ایک محسوس چیز کا انکار کرنا یا اجتماع ضدین کا دعویٰ کرنا کوئی بھی عقلمند اسکو گوارا نہیں کرتا۔

اور اہلسنت کو نواصب کہنا، نور کو اندھیرا، یا آفتاب کو تاریک کہنے کے مترادف ہے تاریخ کی اس گواہی کو کوئی نہیں جھٹلا سکتا کہ اہل سنت ہمیشہ نواصب سے برسر مقابلہ رہے ہیں وہ انکی ہفوات اور بکواس کی ہمیشہ تردید کر کے منہ توڑ جواب دیتے رہے ہیں۔ انکے شاعروں نے ان کے مقابلہ میں زبان سے سیف سنان کا کام لیا ہے۔ کثیر عزہ، مشہور شاعر کے دو شعر دیکھے۔

لَعَنَ اللّٰهُ مَنْ يَسُبُّ حُسَيْنًا	اَوْ اَخَاهُ مِنْ سُوْقَةٍ وَاِمَامٍ
وَرَمَى اللّٰهُ مَنْ يَسُبُّ عَلِيًّا	بِصَدَامٍ وَاَوْتَقٍ وَجُذَامٍ

www.Ahlehaq.com

وحسین کو گالی دینے والے پر اللہ کی لعنت ہو یا انکے بھائی کو جو انکے ماتحت و امام ہیں گالی دینے والے پر بھی۔ اور علی رضی اللہ عنہم انکو گالی دینے والے کو اللہ تعالیٰ، صدمے، لغزش، اور جذام کی مار مارے) حقیقت اور واقعہ یہ ہے کہ شیعہ اہل بیت سے اہل سنت کی محبت کو نہ سمجھ سکتے ہیں نہ اسکا تصور کر سکتے ہیں (کیونکہ انکی پیدائش بغض و عناد اور نفاق کے خمیر سے ہوئی، محبت کی نہ انکو ہوا لگی نہ وہ اس سے واقف و آگاہ ہیں اور یہ ان کے خمیر کا ہی قصور ہے کہ وہ اپنے مقتداؤں اور رہنماؤں کو بھی دانستہ یا نادانستہ اپنے بغض و عناد کا نشانہ بنائے ہوئے ہوتے ہیں) اگر انہیں اہلسنت کی محبت کی کیفیت کا اندازہ کرنا ہو تو پھر ناصبی مذہب اختیار کر کے سامنے آئیں۔ اور اور دیکھیں کہ اہلسنت ان سے کیا سلوک کرتے ہیں

تعصب (۱۴):۔ یہ کہتے ہیں کہ اہلسنت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے قتل کو فسق نہیں کہتے اور انکے قاتل ابن ملجم سے امام بخاریؒ نے روایت کی اور اسکی تعدیل و توثیق بھی کی ہے۔

انکا یہ جھوٹ انتہا درجہ کا افترا اور بہتان ہے۔ اور انکی بے شرمی اور بے حیائی کا منہ بولتا ثبوت ہے اسلئے کہ کتاب صحیح بخاری کوئی نادر الوجود کتاب تو ہے نہیں بشہروں کو چھوڑئے چھوٹے قصبات میں اسکے نسخے گن لیں گے اسکے راوی گنے چنے، اور موثق و مضبوط۔

اہلسنت قتل مومن کو شرک باللہ کے بعد سب سے بڑا گناہ کہتے ہیں۔ انکی کتب عقائد میں بھی یہی لکھا ہے اس نفس مقدس کے قتل کو تو وہ حدیث نبوی کے بموجب کفر جانتے ہیں۔ اہلسنت کی تمام کتابوں میں حدیث اشقی الآخرین کا مورد بھی ملعون بیان کیا گیا ہے۔ یہ بات تو کوئی سنی محدث اس سے روایت بیان کرے گا خارج از بحث ہے اور پھر بخاری جیسا امام۔

طبرانی نے ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی ہے۔ انہوں نے کہا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

أَشْقَى النَّاسِ ثَلٰثَةٌ. عَاقِرُ نَاقَةِ ثَمُوْدَ وَابْنُ آدَمَ الَّذِيْ قَتَلَ أَخَاهُ. وَقَاتِلُ عَلِيِّ بْنِ أَبِيْ طَالِبٍ	سارے انسانوں میں بدبخت ترین تین افراد ہیں ثمود کی اونٹنی کی کوچیں کاٹنے والا۔ آدمؑ کا وہ بیٹا جس نے اپنے بھائی کو قتل کیا۔ اور علی ابن ابی طالبؓ کا قاتل۔

ابن شہر آشوب نے بھی اس افترا کو اپنی مثالب میں امام بخاری پر بہتان باندھتے ہوئے بیان کیا ہے۔ اور اسی سے اندازہ ہوتا ہے کہ شیعوں نے اہلسنت پر افترا پردازی اور بہتان تراشی میں بے حیائی کی تمام حدود پار کر لی ہیں (سچ ہے کہ جب حیا جاتی رہے تو جو چاہے کرو)

تعصب (۱۵):۔ انکو اہلسنت سے جو بغض و عناد ہے اور جس کی بنا ان کی نسبت سنت پیغمبر ہے۔ تو یہ شیعہ اس بغض و عناد میں اتنے اندھے ہو گئے ہیں کہ ان کے علما سنت پیغمبر پر لعنت کر کے اپنا ایمان کفر کے مول بیچ چکے ہیں وہ کہتے ہیں ہمکو کفر قبول ہے مگر سنت پیغمبر کو اچھا کہنا منظور نہیں یہ تو وہی مثال ہوئی غصہ تو سوکن پر آیا مگر قتل شوہر کو کر دیا اور یہ بات کوئی مفروضہ نہیں صاحب ابن عباد جو سلاطین دیالمہ کا وزیر تھا اس فرقہ کے داعیوں میں اسکی نظیر ناپید ہے وہ اپنے اشعار میں کہتا ہے۔

حُبُّ عَلِيِّ بْنِ أَبِيْ طَالِبٍ | هُوَ الَّذِيْ يَهْدِيْ إِلَى الْجَنَّةِ

إِنْ كَانَ تَفْضِيلِي لَهُ بِدْعَةً | فَلَعْنَةُ اللهِ عَلَى السُّنَّةِ ۔

(علی بن ابی طالب کی محبت ہی جنت میں لے جاتی ہے میرا ان کو افضل ٹھہرانا اگر بدعت ہے تو پھر سنت پر اللہ کی لعنت ہو۔ (نعوذ باللہ من ذلک الھفوات)

تعصب (۱۶) :۔ اہل سنت کی بعض روایات پر زبان طعن دراز کرتے اور انہیں سخت سست کہتے ہیں مثلاً سہو پیغمبر والی روایت، یا لیلۃ التعریس میں آپ کی نماز قضا ہو جانے والی روایت، چنانچہ ابن مطہر حلی نے انہی دو روایات کے نقل کرنے پر بہت واہی تباہی بکی ہے۔ مگر ان اندھوں کو یہ نظر نہیں آیا کہ خود انکی کتابوں میں ان روایات کو نہ صرف نقل ہی کیا گیا بلکہ انکی تصحیح بھی بیان کی گئی ہے۔

ان میں سے حدیث ذوالیدینؓ تو یہ ہے۔

أَنَّ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَلَّى الظُّهْرَ أَوِ الْعَصْرَ رَكْعَتَيْنِ فَقَالَ ذُو الْيَدَيْنِ أَقُصِرَتِ الصَّلٰوةُ أَمْ نَسِيتَ يَا رَسُولَ اللهِ فَقَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِمَنْ خَلْفَهُ أَصَدَقَ ذُو الْيَدَيْنِ قَالُوا نَعَمْ صَلَّيْتَ رَكْعَتَيْنِ فَبَنٰى عَلٰى صَلٰوتِهِ وَأَتَمَّ أَرْبَعًا وَسَجَدَ لِلسَّهْوِ سَجْدَتَيْنِ ثُمَّ تَشَهَّدَ وَسَلَّمَ	رسول اللہ صلی اللہ نے ظہر، عصر کی نماز ادا فرمائی اور دو رکعت پر سلام پھیر دیا۔ تو جناب ذوالیدین رضی اللہ عنہ نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ! نماز میں قصر ہو گیا۔ یا آپ سے سہو ہوا۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیگر مقتدیوں سے دریافت فرمایا کیا ذوالیدین صحیح کہہ رہے ہیں سب نے عرض کی بے شک۔ تب آپ نے اسی نماز پر بنیاد رکھتے ہوئے دو رکعت اور پڑھیں اور سہو کے دو سجدے کیے اور تشہد پڑھ کر سلام پھیرا۔

اور حدیث لیلۃ التعریس وہ یہ ہے کہ۔

عَرَّسَ فِي مُنْصَرَفِهِ مِنْ خَيْبَرَ فَنَزَلَ قَبْلَ طُلُوعِ الصُّبْحِ فَرَقَدَ فَغَلَبَتْ عَيْنَاهُ فَلَمْ يَسْتَيْقِظْ حَتّٰى وَقَعَ عَلَيْهِ حَرُّ الشَّمْسِ ثُمَّ اسْتَيْقَظَ وَتَوَضَّأَ وَصَلّٰى قَضَاءَ الصُّبْحِ وَقَالَ هٰذَا وَادِي الشَّيْطَانِ ۔	خیبر سے واپسی پر ایک جگہ طلوع فجر سے کچھ دیر پہلے شب باشی کے لیے آپ نے قیام فرمایا نیند کا غلبہ تھا کہ آپ سو گئے اور جب دھوپ کی گرمی محسوس ہوئی تو آپ کی آنکھ کھل گئی تب آپ نے وضو فرما کر صبح کی نماز قضا پڑھی اور فرمایا یہ شیطان کی وادی ہے۔

ان روایات کی نسبت ابن مطہر حلی کہتا ہے۔ کہ پہلی روایت عبادات میں پیغمبر کے نسیان کو ظاہر کرتی ہے اور دوسری شیطان کے تسلط کو۔ اور ہر دو نبوت میں سقم پیدا کرتی ہیں۔ لہذا یہ اہلسنت کا افترا ہے۔ مگر خود اس مفتری کے دیدے پٹم ہو گئے اور اسے یہ نظر نہیں آیا کہ پہلی حدیث ابو جعفر طوسی نے تہذیب میں حسین بن سعید سے بطریق صحیح روایت کی ہے اور اس نے ابو عبداللہ رحمۃ اللہ علیہ سے اور کلینی نے بھی بحوالہ ابی عبداللہ سماعہ سے روایت کی ہے۔ اور دوسری اسناد سے بھی بحوالہ ابی عبداللہ سعید اعرج سے روایت کی ہے اور اسکے آخر میں کہا ہے کہ۔

إِنَّ رَبَّكُمْ عَزَّ وَجَلَّ هُوَ الَّذِي أَنْسَاهُ رَحْمَةً	امت پر مہربانی کی نظر سے اللہ تعالیٰ نے آپ سے سہو

لِلْأُمَّةِ الْأُمِّيِّ اَنَّ رَجُلًا اَوْصَنَعَ مِثْلَ هٰذَا لَعِيْرَ وَقِيْلَ مَا تُقْبَلُ صَلٰوتُكَ فَمَنْ دَخَلَ عَلَيْهِ الْيَوْمَ مِثْلَ هٰذَا قَالَ قَدْ سَنَّ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَصَارَ وَامْ اُسْوَةً ۔

کرایا۔ تم خیال نہیں کرتے کہ اگر کسی سے ایسی حرکت ہوتی تو اسے ملامت کی جاتی اور کہا جاتا کہ تمہاری نماز نہیں ہوئی۔ مگر اب آج اگر کسی سے ایسی حرکت سرزد ہو تو کہا جائے گا کہ ایسا تو حضور کو بھی پیش آچکا ہے اور وہ ہمارے لیے نظیر واسوہ ہے۔

اور دوسری روایت کو طوسی نے تہذیب میں حسین بن سعید سے بحوالہ عبداللہ رحمۃ اللہ علیہ روایت کیا ہے۔ کلینی نے کافی میں حمزہ بن طیار سے بحوالہ ابی عبداللہ رحمۃ اللہ علیہ روایت کیا اور آخر میں یہ اضافہ کیا کہ

اَنَا اَنَمْتُكَ وَاَنَا اَيْقَظْتُكَ فَاِذَا قُمْتَ فَصَلِّ لِيَعْلَمُوْا اِذَا اَصَابَهُمْ كَيْفَ يَصْنَعُوْنَ لَيْسَ كَمَا يَقُوْلُوْنَ اِذَا نَامَ هَلَكَ ۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا میں نے ہی تجھے سلایا میں نے ہی تجھے جگایا۔ جب جاگ جاؤ تو نماز پڑھ لو تاکہ امت کو معلوم ہوجائے کہ ان کو جب ایسا واقعہ پیش آئے تو وہ کیا کریں۔ ایسا نہیں جیسا کہ کہتے ہیں کہ جو سویا اسکی نماز گئی۔

ان روایات سے جو اعتراض انہوں نے کیا ہے کہ دونوں باتیں نبوت میں خلل انداز ہیں، تو انکی یہ بات بالکل غلط ہے۔ اس لیے بھول چوک، نسیان ولزوم کی طرح بشری احکام میں سے ہیں، ہاں امور تبلیغی ہوتے تو بات کچھ درست ہوسکتی تھی اس لیے کہ ان امور میں رسولوں سے کوتاہی جائز نہیں۔ مثلاً نہی کے بجائے امر یا اسکے برعکس۔ ایسی بھول چوک کسی پیغمبر سے نہیں ہوئی۔

متفرق انبیاء ورسل علیہم السلام کے متعلق اللہ تعالیٰ کے ارشادات دیکھئے۔

موسیٰ علیہ السلام ۔ لَا تُؤَاخِذْنِيْ بِمَا نَسِيْتُ ۔ بھول چوک میں میری گرفت نہ کیجئے

آدم علیہ السلام ۔ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا ۔ وہ بھول گئے ہم نے انکا ارادہ پختہ نہ پایا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم ۔ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ اِذَا نَسِيْتَ ۔ جب کچھ بھول جاؤ تو اپنے رب کو یاد کرو

اور اس وادی میں آپ پر شیطان کا تسلط ہرگز نہیں ہوا، بلکہ یہ اثر حضرت بلال رضی اللہ عنہ پر ہوا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انکو جاگنے اور محافظت کا فرض سونپ کر اطمینان سے آرام فرمایا تھا۔ شیطان نے بصورت سید حضرت بلال رضی اللہ عنہ پر غلبہ پالیا اور اس بہانہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب رضوان اللہ علیہم کی نماز قضا ہوگئی۔ اگر کسی شخص کے گماشتہ یا وکیل پر کوئی ظالم وغاصب تسلط پالے تو اسے ہرگز اس شخص پر تسلط پالینا نہیں کہتے گو نقصان کا اثر اس شخص تک بھی پہنچے۔

تعصب (۱۷) :۔ یہ کہتے ہیں کہ نماز میں اگر کوئی شخص تعالیٰ جدّ ربّنا کہے تو اسکی نماز فاسد ہوجاتی ہے حالانکہ تعالیٰ جدّ ربّنا قرآن میں آیا ہے۔ اور اس آیت وسورۃ کا نماز میں پڑھنا انکے نزدیک بھی جائز ہے۔ ممنوع نہیں۔ دوران بحث انکا جواب یہ تھا کہ یہ الفاظ اللہ تعالیٰ نے جنوں کے قول کے طور پر نقل کئے ہیں حالانکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں کئی جگہ کفار کے اقوال نقل کئے ہیں مثلاً وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ ابْنُ اللّٰهِ

وَقَالَتِ النَّصَارَى الْمَسِيحُ ابْنُ اللّٰهِ (یہود نے کہا عزیر اللہ کے بیٹے ہیں اور نصاریٰ نے کہا عیسیٰ مسیح اللہ کے بیٹے ہیں) اور جہاں کہیں کافروں کا قول نقل فرمایا وہاں اسکے عقب میں اسکی تکذیب بھی ساتھ ہی لگا دی ہے۔ قرآن کے تفصیلی مطالعے سے اسکا پتہ چلتا ہے مگر اس جگہ اس قول کی تکذیب بالکل مذکور نہیں۔ اگر اس آیت کے حوالے سے بھی ان کے تعصب کی آگ نہ بجھے تو جناب امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ کے اس قول کے بارے میں یہ کیا کہیں گے جو نہج البلاغۃ نے آپ کے ایک خطبہ کے ذیل میں نقل کیے ہیں اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الْفَاشِیْ حَمْدُہٗ وَالْغَالِبِ جُنْدُہٗ اَلْمُتَعَالِیْ جَدُّہٗ (ساری تعریف اس اللہ کے لیے ہیں جسکی حمد عام، جسکے لشکر غالب ہیں۔ جسکی شوکت بالاتر ہے)۔

تعصب (۱۸): ان کا کہنا ہے کہ اہلسنت یہود و نصاریٰ سے بدتر ہیں۔ یہ بات ابن المعلم نے بیان کی ہے اس اچھوتی بات کی واقعی داد نہیں دی جاسکتی کہ خدا، رسول، فرشتوں، قرآن، دیگر کتب الٰہیہ اور روز آخرت پر ایمان لانے والے رسول و خاندان رسول کے ساتھ انکی جانی و مالی محبت و وابستگی۔ یہ ساری باتیں تو انکے نزدیک رائیگاں۔ البتہ یہود و نصاریٰ کا کفر پیغمبر کے ساتھ ان کی عداوت اور انکا انکار، فرشتوں خصوصاً حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ساتھ انکی عداوت یہ سب اس فرقہ کو پسند اور گوارا ہے۔ سچ ہے۔ گندگی کا کیڑا گندگی ہی میں خوش ہے۔

اور پھر اس قول سے تو انہوں نے اپنے پیشواؤں اور مقتداؤں کی پیروی کا حق ادا کر دیا انہوں نے بھی تو جناب امیر رضی اللہ عنہ کے عہد میں کافروں اور بت پرستوں کو اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے بہتر کہا تھا شیعوں کو بھی حق وفاداری کا پاس کرتے ہوئے ان کی اگلی ہوئی گندگی کو نگلنا ہی چاہیئے تھا (قرآن کریم نے ان باطل پرستوں کے لیے ایک آئینہ مہیا کیا ہے۔ انہیں وہ دیکھ لینا چاہیئے تا کہ انہیں اپنی اصلی شکل میں کوئی شبہ نہ رہے)

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِیْنَ اُوْتُوْا نَصِیْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ یُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ وَیَقُوْلُوْنَ لِلَّذِیْنَ كَفَرُوْا هٰۤؤُلَآءِ اَهْدٰى مِنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا سَبِیْلًا۔

تم نے نہیں دیکھا ان کو جو صاحب کتاب تھے کہ وہی اب بتوں اور شیطان پر ایمان لے آئے ہیں۔ اب وہ کہتے ہیں کہ یہ کافر مومنوں کے مقابلہ میں زیادہ راہ راست پر ہیں۔

(شیعہ کو بھی کتاب (قرآن) سے حصہ ملا تھا۔ مگر جب یہ کتاب سے فرنٹ ہو کر جبت وطاغوت (ابن سبا وغیرہ) پر ایمان لے آئے تو انہیں اپنے پیشرو اور مقتداؤں کی اتباع میں لازماً انہیں کے قول کو دہرانا اور یہود و نصاریٰ کو مسلمانوں سے اچھا بتانا ہی چاہیئے تھا)۔

تعصب (۱۹): یہ کہتے ہیں، غالی، کیسانی، اسماعیلی، اور رافضیوں کے دوسرے فرقے جو ائمہ کی امامت کے منکر ہو کر امامت ہی کے مکذب کہلائے اور ائمہ کی شان میں انہوں نے دریدہ دہنی بھی کی ہے یہ سب کے سب محبت علیؓ کے باعث جنت میں جائیں گے۔ اور اہلسنت ہمیشہ ہمیش دوزخ میں رہیں گے اور ان کی تمام ائمہ کی دوستی بھی کام نہ آئیگی۔ اور شریعت و طریقت میں ان کو اپنا امام تسلیم کرنا فائدہ دے گا اگرچہ انہوں نے ان حضرات میں سے کسی کی تحقیر بھی نہیں کی بلکہ سب کی تعظیم ہی کرتے رہے۔ مگر جائیں گے دوزخ ہی میں۔ اب یہ بات اللہ ہی جانے کہ اہل سنت کی حب علی کیوں بے اثر ہے اور کیسانیوں اور اسماعلیوں

www.Ahlehaq.com

کی ائمہ کی تکذیب کیوں بے اثر نہیں ۔

تعصب (۲۰) :۔ یہ ہے کہ ایسی احادیث جو شیعوں کے نزدیک ان کے اپنے طریقے کے مطابق صحیح الثبوت ہیں ۔ اگر سوء اتفاق سے ان روایات کا مضمون اہل سنت کے مذہب سے موافقت کر جائے تو وہ روایات ان کے نزدیک ناقابل عمل ناقابل قبول بلکہ نظر انداز کر دیئے جانے کے قابل ہیں اس لیے اس صورت میں اہلسنت کی موافقت کا کفر ، لازم آتا ہے ۔ مثلاً مذی ومنی کے نجس ہونے کی روایات یا ان کے نکلنے سے وضو ٹوٹ جانے روایت اور سجدہ سہو کی روایات ۔ کہ ابو جعفر طوسی وغیرہ نے اس کی تصحیح کی ہے ۔ اور بڑے تالاب میں غسل کی روایات جنکا ذکر ابن المعلم نے کیا ہے ۔ اور ڈھیلے کے بعد پانی سے استنجاء خود ان کے اقرار سے سنت پیغمبر ہے جسکی تصریح صاحب الجامع نے کی ہے ۔

ان کے شیخ الطائفہ نے ایک قاعدہ اور اصول مقرر کیا ہے کہ کلینی کی بعض روایات یا اس کے شیخ محمد بن نعمان کی روایات یا شیخ الشیخ محمد بن بابویہ قمی کی روایات یا خود شیخ الطائفہ نے جن روایات کی تصحیح کی ہے جب ایسی روایات پر عام لوگ عمل کرنے لگیں تو ان کو متروک العمل سمجھ لینا چاہیئے ۔

معلوم نہیں یہ اپنے ، برے ہمزاد ، اہل سنت سے کہاں کہاں بھاگیں گے ۔ اور ان سے بچنے کیلئے کہاں کہاں ہاتھ پاؤں ماریں گے ۔ اجزائے کلمہ (دینیا دعقیدہ) اور الفاظ قرآن کے اشتراک سے کیسے پیچھا چھڑائیں گے ۔ اور علی ، حسن ، حسین ، فاطمۃ الزہرا (رضی اللہ عنہم) کے نئے نام رکھ کر کب اہل سنت کی موافقت سے جان چھڑائیں گے ۔

ایک دوسرا اصول اور قاعدہ باتفاق انکے ہاں یہ بھی مقرر ہے کہ جب کسی مسئلہ میں دو روایات ہوں تو ان میں سے جو روایت اہل سنت کے موافق ہو ، اسکے الٹ پر عمل کرنا چاہیئے کیونکہ رشد و ہدایت اسی میں ہے ۔

تعصب (۲۱) :۔ ان کی بہت سی کتابوں میں لکھا ہوا ہے ۔ کہ اہلسنت یہود و نصاریٰ سے بہت گندے ہیں ۔ ان کے بدن سے کوئی چیز چھو جائے تو اسے دھونا چاہیئے النسائوں کو نجس اور گندہ کہنے والوں کا اپنا یہ حال ہے کہ النسائی پاخانہ بھی ان کے ہاں نجس نہیں اس سے بدن لتھڑا ہوا ہو تب بھی انکی نماز میں کوئی خلل واقع نہیں ہوتا ۔ ٹھیک ہے یہ اہل سنت کے ہاتھ نہ لگائیں مگر ان کے پاخانہ سے مستفیض ہوتے رہیں کہ وہ تو ان کے نزدیک نجس نہیں ! پاک ہے ۔

تعصب (۲۲) ہر کام مثلاً کھانا پینا پہننا ، سوار ہونا ، اٹھنا ، بیٹھنا وغیرہ بجائے بسم اللہ کے ابوبکر و عمر (رضی اللہ عنہما) پر لعنت سے شروع کرنا چاہیئے ۔ وہ اسے مبارک اور بابرکت خیال کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ ان دونوں حضرات کے نام کاغذ پر لکھ کر مع لعن کے ۔ اسے بطور فلیتہ جلائیں اور بخار کے مریض کو اسکی دھونی دیں تو وہ بخار سے شفا پا جائے گا ۔

ایک بات یہ کہتے ہیں کہ جب کسی کھانے پر ستر مرتبہ ان دو اسمائے (مبارکہ) پر لعن کر کے دم کر دیں تو اس کھانے میں بہت برکت ہو جاتی ہے ۔ بات دراصل یہ ہے کہ جو خود لعنتی ہو اسکی لعنت تو بے اثر ہوتی ہے ۔ یہ ان محترم و مقدس بزرگوں کے اسماء مبارکہ کی تاثیر ہے کہ مریض شفایاب ہوتے اور کھانوں میں برکت ہوتی ہے

اور یہ اتنا بڑا افضل واعلٰی ہے کہ لعنتی لوگ۔ خود غیر محسوس طور پر اسکے اقرار پر مجبور ہوئے۔ انہیں یقین کرنا چاہیئے کہ جب وہ ان اسماء مبارکہ کے ساتھ لعنت چسپاں کرتے ہیں تو لعنت تو لعنتی کو دیکھ کر اس سے چمٹ جاتی ہے اور اسماء مبارکہ پاک وصاف رہ جاتے ہیں۔ اور اپنا صحیح اثر دکھاتے ہیں۔ ن)

کافی کلینی میں یہ مرقوم ہے کہ خدا کے نزدیک عورتوں میں بدترین نام "حمیرا" ہے۔ اور یہ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا لقب ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اسی لقب سے مخاطب فرماتے تھے۔ مگر یہ لوگ ابولہب کی بیوی کو برا نہیں جانتے جسکی برائی اللہ تعالیٰ نے قرآن میں نازل فرمائی (شاید اسلیے کہ آجکل ابولہب کے مشن کے وارث یہی ہوں)۔

ان کے ہاں یہ روایت موجود ہے کہ جناب علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے اپنے لڑکوں کے نام ابوبکر وعمر وعثمان (رضی اللہ عنہم) رکھے تھے۔ اور یہ بھی بالیقین معلوم ہے کہ باپ پر بیٹوں کا یہ حق ہے کہ وہ انکے نیک و اچھے نام رکھے پس جب ابوبکر وعمر وعثمان میں کوئی برائی نہیں تو صدیقہ کا لقب کب برا ہو سکتا ہے۔ اگر معاملہ جناب امیر سے عداوت کا ہے تو جناب صدیقہ ان تینوں حضرات سے بڑھ کر تو مخالف نہیں تھیں۔ اور پھر لقب کا رتبہ اختصاص میں نام سے کمتر ہے کیونکہ تعیین وتشخیص کے لیے وضع اصلی میں علم کا ہی اعتبار ہے لقب تو دراصل صفات سے ہوتا ہے اور غلبۂ استعمال سے اختصاص پیدا کرلیتا ہے اور ظاہر ہے کہ جو چیز بالذات مخصوص ہو وہ مخصوص بالعرض سے زیادہ قوت والی ہوتی ہے (یہاں بطور لطیفہ دو باتیں ذہن نشین ہو جائیں تو کیا مضائقہ اول تو یہ شیعہ چونکہ اپنے لڑکوں کا نام عموماً۔ ابوبکر وعمر وعثمان (رضی اللہ عنہم) نہیں رکھتے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہ نام رکھے تو شیعہ ان کے پیرو نہیں رہے۔ دوسرا لطیفہ یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ کے نزدیک بھی یہ نام اچھے شمار ہوتے ہیں۔ تب ہی اس نے برے لوگوں سے یہ توفیق ہی سلب کرلی کہ وہ ان اچھے اور بابرکت ناموں کا کبھی فیض ہی حاصل نہ کرسکیں۔ اور انہیں کبھی یہ توفیق نہ ہو تو اپنے لڑکوں کے ایسے بابرکت نام رکھ سکیں۔ ن)

تعصب (۲۳): حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر طعن کی طرح جناب حفصہ رضی اللہ عنہا پر طعن کو بھی عبادات بلکہ فرائض پنجوقتہ میں شمار کرتے ہیں بعد ادائیگی پنجگانہ دیگر ورد و وظائف کے مقابلہ میں اسکے ورد کو بہترین وظیفہ قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سے کوئی ایسا امر صادر نہیں ہوا جو انکی بدگوئی کا سبب اور اسکا یہ خود بھی اقرار کرتے ہیں کہ وہ کوئی گناہ نہیں رکھتیں بجز اسکے کہ وہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی تھیں۔ حالانکہ ولا تزر وازرۃ وزر اخریٰ۔ اسکے صریح خلاف ہے اگر بی بی حفصہ رضی اللہ عنہا کے لیے یہی سبب موجب طعن ہے تو تعجب ہے جناب محمد بن ابی بکر کو اسی طرح کی نسبت رکھتے ہوئے ان لوگوں نے کیوں معاف کیے رکھا۔ اور ان پر لعن وطعن کیوں نہیں کرتے اگر یہ کہیں کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ کی رفاقت وصحبت ان کے حق میں مانع لعن ہے۔ تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت ورفاقت اور تعلق زوجیت حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے حق میں کیوں مانع طعن نہیں ہوا۔ جناب امیر رضی اللہ عنہ تو جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کے تعلق قرب وصحبت کے سبب ہی معزز ومحترم تھے۔ اس لیے اس سلسلہ میں حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کا تعلق زیادہ قابل لحاظ ہونا چاہیئے تھا۔

www.Ahlehaq.com

تعصب (۲۴) :- اس فرقہ کے ایک نابکار شیخ مقداد نامی نے الزام لگایا ہے کہ جناب عمر رضی اللہ عنہ نے جناب معاویہ رضی اللہ عنہ کی والدہ سے فعل شنیع کیا تھا۔

حالانکہ شریف مرتضیٰ نے "تنزیہ الانبیاء والائمہ" نامی کتاب میں اور دوسرے علماء امامیہ نے قطعی طور سے حکم لگایا ہے کہ جناب عمر رضی اللہ عنہ اور دوسرے خلفاء رضوان اللہ علیہم ظاہری شریعت کی پاسداری اور زہد دین و تقویٰ کے امور کو شائع کرتے اور رواج دینے کا بہت اہتمام کرتے اور خاص خیال رکھتے تھے تاکہ اسمیں کوتاہی کے سبب منصب امامت کی لیاقت مجروح نہ ہو اور لوگوں کی نظروں سے نہ گر جائیں خصوصاً عمر (رضی اللہ عنہ) کو اس معاملہ میں بڑی کدو کاوش رہتی اور بہت احتیاط و پرہیز مدنظر رہتا۔

تعصب (۲۵) :- یہ کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ بلکہ تمام امہات المومنین رضی اللہ عنہن کے طلاق کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سپرد کر دیا تھا کہ جب چاہیں طلاق دیدیں حالانکہ اللہ تعالیٰ نے خود حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو بھی ازواج مطہرات کے طلاق کا مختار نہ بنایا تھا۔ آپ اس معاملہ کو دوسرے کے سپرد کیسے فرما سکتے تھے ارشاد باری ہے۔

لَا يَحِلُّ لَكَ النِّسَاءُ مِنْ بَعْدُ وَلَا أَنْ تَبَدَّلَ بِهِنَّ مِنْ أَزْوَاجٍ وَلَوْ أَعْجَبَكَ حُسْنُهُنَّ۔	آپ کیلئے ان عورتوں کے بعد نہ تو کوئی اور حلال ہے۔ اور نہ انکا تبادلہ دوسری زوجات سے کہ آپ کو ان کا حسن بھلا کیوں نہ لگتا ہو۔

اس آیت کا صاف مطلب یہ ہے کہ اب حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو پابند فرما دیا گیا کہ نہ مزید کوئی نکاح فرمائیں گے اور نہ ہی موجودہ ازواج میں سے کسی کو الگ کر کے ان کے بدلے دوسری بیوی لائیں گے۔

ازواج مطہرات کو یہ فضیلت وعزت اس لیے نصیب ہوئی کہ انہوں نے اپنے حق اختیار کو استعمال کرتے ہوئے دنیا کو خیر باد کہہ کر آخرت کو قبول کر لیا تھا اور حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی محبت و رفاقت کو دنیاوی عیش، ساز و سامان اور کامرانی کے مقابلہ میں پسند کیا تھا۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے بھی یہ چاہا کہ ان کو دنیا و آخرت میں پیغمبر کی رفاقت سے جدا نہ کرے اور پیغمبر طلاق کی تلخی سے انہیں ناآشنا رکھے۔ چنانچہ آیت تخییر کے ذیل میں خود شیعی تفاسیر میں ان کی ثابت قدمی مذکور و مسطور ہے۔ اور یہ بات بالاجماع ثابت ہے کہ ایثار و اختیار میں تمام ازواج مطہرات سے حضرت صدیقہ (رضی اللہ عنہا) کو سبقت نصیب تھی۔ اس لیے یہ ممکن ہی نہ تھا کہ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کو طلاق دیتے یا کسی کو اسکا اختیار دیتے۔

اور اگر آپ ایسا اختیار کسی کو سپرد فرماتے بھی تو شیعوں کو اس سے کیا فائدہ۔ کیونکہ آپ صلے اللہ علیہ وسلم کے عین حیات تو وہ طلاق عمل میں آئی نہیں۔ اور وصال کے بعد وہ توکیل و تفویض کالعدم ہو گئی۔ اس لیے کہ سارے فرقوں کے اجماع کے مطابق موکل کی وفات کے بعد وکالت باطل ہو جاتی ہے اور جب جناب صدیقہ رضی اللہ عنہا جناب امیر رضی اللہ عنہ سے برسر پرخاش تھیں اس وقت آپ طلاق کے مالک نہ تھے۔ اور پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ وفات کے بعد طلاق دینے کے کوئی معنی ہی نہیں۔

اس فرقہ کی بنیاد اور شرط وجود ہی۔ کذب و افتراء، توہمات و تعصبات پر ہے اس لیے نہ ان کے تعصبات

کی کوئی حد ہے اور نہ وہ کبھی رک سکتے ہیں۔ ہر دور اور ہر زمانہ میں مناسب احوال ان میں تبدیلی و اضافہ ہوتا ہی رہے گا۔ ہم کہاں تک ان کا تعاقب کر کے کھوج لگائیں گے۔ اس لیے جو کچھ ذکر کیا جا چکا اسی پر اکتفا کرتے ہیں ہم نے تینوں فصلوں میں بطور نمونہ ہی پیش کیا ہے۔ پورے تعصبات کا احاطہ نہیں ہو سکا ہے۔

تیسری فصل

شیعی ہفوات

ھفوہ (۱): یہ کہتے ہیں کہ انبیاء و ائمہ کا کام دین و مذہب کا چھپانا ہے۔ انہوں نے پوری زندگی تقیہ میں بسر کی ہے۔ کسی کو بھی مذہب و دین واضح طور پر نہیں بتایا۔

یہ ہفوہ چھوڑتے وقت وہ یہ بھول گئے کہ ایسا ہے تو پھر انبیاء کی بعثت اور ائمہ کے تقرر سے حاصل کیا ہوا یعنی کچھ بھی نہیں۔ دنیا ان کی آمد سے پہلے بھی اندھیرے میں تھی آمد کے بعد بھی اندھیرے میں رہی۔

در اصل اس باطل خیال کی بنیاد اس تخیل پر ہے کہ ہر صاحب عزم، یا ہر طالع آزما جو ایک سلطنت کا علم بلند اور دوسری کا سر نگوں کرنا چاہتا ہے۔ وہ اپنے ارادوں کو راز رکھتا، اور اپنی تدبیروں کا کسی کو پتہ نہیں لگنے دیتا اور کج فطرت لوگ ایسے ہی لوگوں پر انبیاء و ائمہ کو قیاس کر کے مذکورہ غلط و باطل تصور و عقیدہ گھڑنے کے مرتکب ہوئے ذرا سا بھی غور کر لیں تو پتہ چل جائے گا کہ نبی کو مبعوث اور امام کو مقرر کر کے ان کو اخفاء راز کا مکلف بنانا ایسا ہی ہے کہ کسی کو قاضی شہر مقرر کر کے پابند کر دیا جائے کہ نہ کسی سے بات کرے، نہ کسی کی فریاد سنے، نہ کوئی فیصلہ دے تو ایسے تقرر کو ایک نادان دیکھ بھی کھیل سمجھے گا اور مذاق اڑائے گا اور بظاہر یہ فعل بے قوفی سمجھا جا سکتا اور ایسا کرنا بعثت نبی اور تقرر امام کے سر اسر خلاف ہے۔ اگر انبیاء اور ائمہ حکم خدا کے بجائے اپنی مرضی سے یہ تقیہ کرتے ہیں تو وہ عاصی اور گنہگار اور تارک۔ واجب قرار پائیں گے اور پھر عصمت کی کوئی صورت ہی باقی نہیں رہے گی۔

خلاصۂ کلام یہ کہ جھوٹ بولنا، نفاق اختیار کرنا، انبیاء و ائمہ کی شان کے خلاف ہے اور ان بزرگ و محترم و مقدس ہستیوں کے متعلق یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اپنی پوری زندگی میں ان بری خصلتوں کو اپنا شعار بنائے رکھیں۔ اور لوگوں کو ہدایت و رہنمائی کے بجائے دھوکہ دیں اور گمراہ کریں اگر منکرین و مخالفین اور معاندین کی طرف سے ان کو کوئی اندیشہ یا خطرہ بھی ہوتا ہے تو بھی کلمہ حق کہنے سے باز نہیں رہتے انہی حضرات انبیاء علیہم السلام کی شان میں اللہ تعالے ارشاد فرماتے ہیں۔

يُبَلِّغُوْنَ رِسَالَاتِ اللّٰهِ وَيَخْشَوْنَهٗ وَلَا يَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰهَ وَكَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا۔	اللہ کے پیغامات کی تبلیغ کرتے ہیں اسی سے ڈرتے ہیں اور اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے انکی نگرانی کو اللہ ہی کافی ہے۔

اگر ان ہفواتیوں کے کہنے کے مطابق انبیاء تقیہ کیے ہوئے ہوتے تو کفار کی طرف سے اذیت کیوں برداشت

کرتے، مار پیٹ، گالم گلوچ، بے عزتی، بے حرمتی، جلاوطنی ان کے ہاتھوں کیونہ بھگتتے۔ جبکہ عام مسلمانوں کے لیے فرمایا گیا، "کہ کیا تم سمجھتے ہو کہ تم جنت میں بغیر اپنے سے پہلوں کی طرح تکلیفوں اور اذیتوں کو برداشت کئے بغیر جنت میں داخل ہو جاؤ گے۔ وہ تکالیف اتنی سخت تھیں کہ نبی اور انکے ساتھی یہ کہنے لگے تھے کہ اللہ کی نصرت و مدد آخر کب آئے گی"۔ تو انبیاء وائمہ کے بارے میں کیا خیال کرنا چاہیئے۔

اور اس بیہودہ کی تان اس پر توڑی ہے کہ آیت إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ میں "أَتْقَاكُمْ" سے مراد وہ ہے جو تقیہ میں سب سے بڑھا ہوا ہو۔ ان کے مفسرین نے ان الفاظ کی یہی تفسیر کی ہے (گویا انہوں نے دوسروں کو اجازت دی ہے کہ وہ اپنے ہاں کے اتقا کو منافق اعظم کہے جانے کا برا نہیں مانیں گے۔ کیونکہ شیعوں سے قطع نظر پوری دنیا کے نزدیک تقیہ و نفاق ہم معنی ہیں۔ ن) اور اس تفسیر کے موجب لازم آتا ہے کہ حضرت یحییٰ و حضرت زکریا علیہما السلام اور جناب حسین رضی اللہ عنہ جنہوں نے بالاجماع تقیہ نہیں کیا خدا کے نزدیک کرامت و بزرگی نہ رکھتے ہوں۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں جتنے بھی منافق تھے وہ بزرگی و کرامت کے اعلیٰ مراتب پر فائز ہوں۔ سُبْحَانَكَ هَذَا بُهْتَانٌ عَظِيمٌ۔ (ناظرین یہ یاد کرلیں کہ خدا کے ہاں جناب حسین رضی اللہ عنہ جو کرامت و بزرگی بھی رکھتے ہوں مگر شیعوں کے نزدیک تقیہ نہ کرنے کی وجہ سے کوئی عزت و حرمت نہ رہ گئی تھی۔ اور کوفہ کے شیعوں نے اس کا عملی ثبوت دیا۔ خطوط کی ترسیل سے لیکر کارگاہ شہادت کی تاریخ کا مطالعہ کر جائیے کہ ہر جگہ شیعہ آپ کو گھیر گھار کر کشاں کشاں، اور دھکیلتے ہوئے مقتل تک لے جاتے نظر آئیں گے جہاں پہنچا کر وہ خود منہ پھیر کر دشمنوں سے سازش کے دام کھرے کر کے بیچ گئے۔ آج یہ جتنے چاہیں مرثیے جوڑ لیں۔ روز قیامت بہت قریب ہے انشاء اللہ خون حسین کے ایک ایک قطرہ کا ان کو حساب دینا ہی ہوگا۔ کیونکہ قاتلان حسین میں سرفہرست یہی ہیں۔ ن)

اور تقیہ کے وجوب اور اسکی خوبیوں کے سلسلہ میں جناب جعفر صادق رحمۃ اللہ علیہ سے یہ جو کچھ روایت کرتے ہیں وہ سب جھوٹ من گھڑت اور افتراء۔ جناب صادق اس قسم کی ہفوات کو جائز ہی نہیں سمجھیں گے چہ جائیکہ وہ اسے واجب قرار دیں۔ اور اپنے جد امجد جناب امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ کی مخالفت فرمائیں گے۔ نہج البلاغہ ان کی اصح الکتب ہے اور متواتر بھی۔ اس میں جناب امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ کی نص صریح بایں الفاظ موجود ہے۔ عَلَامَةُ الْإِيمَانِ إِيثَارُكَ الصِّدْقَ حَيْثُ يَضُرُّكَ عَلَى الْكَذِبِ۔ (جب جھوٹ کے مقابلہ پر سچ بولنا نقصان کا سبب ہو، اس وقت سچ بولنا ایمان کی علامت ہے) یہ نص بتاتی ہے کہ تقیہ کرنے والا ایمان ہی نہیں رکھتا۔

أُولَئِكَ يُؤْتَوْنَ أَجْرَهُمْ مَرَّتَيْنِ بِمَا صَبَرُوا الخ | وہ اپنے صبر کی وجہ سے دوہرا اجر دئے جائیں گے۔

کی تفسیر بھی یہ تقیہ ہی سے کرتے ہیں کہتے ہیں حسنہ تقیہ ہے اور اسکا اظہار سیئہ ہے حالانکہ اس سے پہلے کی آیت صاف طور پر اظہار پر دلالت کرتی ہے وَإِذَا يُتْلَى عَلَيْهِمْ قَالُوا آمَنَّا۔ آخر تک۔

پھر تقیہ میں صبر کی ضرورت بھی تو نہیں۔ یہ تو بلا مشقت حسب دلخواہ مال اڑانا اور عیش کرنا ہے۔ کیونکہ تقیہ میں تو ہمہ دم بہرحال سراسر موافقت واتحاد اور تسلیم و رضا ہے، نہ مخالفت نہ عناد پھر بھی صبر کی گھاٹی کہاں

www.ahlehaq.com

www.Ahlehaq.com

اور کیسے پیش آسکتی ہے۔

کذب افترا انکی گھٹی کا جزنہ ہوتا تو شاید ان کو توفیق مل جاتی کہ اپنے ہی فرقہ کی کتابوں میں مندرج تقیہ کو باطل کرنے والی منہ بولتی روایات ہی کا مطالعہ کر لیتے جو کسی اور سے نہیں اہل بیت کرام رحمہم اللہ سے مروی ہیں ان میں ایک وہ روایت ہے جو جناب امیر المومنین رضی اللہ عنہ سے منقول ہے اور رضی نے نہج البلاغہ میں ان الفاظ سے نقل کیا ہے۔

امیر المومنین رضی اللہ عنہ نے فرمایا اللہ کی قسم میں ان کے مقابلہ میں تن تنہا آؤں اور وہ اتنی کثیر تعداد میں ہوں کہ زمین ان سے پٹی پڑی ہو تو بھی ان کی پرواہ نہ کروں نہ ان سے دہشت کھاؤں۔ میں ان کی گمراہی سے بھی باخبر ہوں اور اپنی ہدایت سے بھی۔ مجھے اپنی طرف سے نیز اپنے رب کی طرف سے ہدایت کا یقین ہے۔ میں اللہ تعالیٰ سے اچھے اجر اور ملاقات کا امیدوار ہوں اور منتظر بھی۔

پس جو شخص تن تنہا ہوتے ہوئے دشمن کے اتنے بڑے لشکر سے جس نے زمین کا چپہ چپہ بھر رکھا ہو نہ ڈرے نہ ان سے دہشت زدہ ہو۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کی ملاقات کا منتظر، اور امیدوار عنایات و کرامات ہو۔ ایسے شخص کی زندگی و موت کے معاملات میں تقیہ کی گنجائش اور اسکا امکان کہاں پایا جاسکتا ہے۔ پھر تقیہ بغیر خوف کے نہیں ہوتا۔ اور خوف دو طرح کا ہوتا ہے۔ اول جان کا خوف اور ائمہ کرام کو یہ خوف بالکل نہیں ہوتا۔ اسکی دو وجوہ ہیں پہلی تو یہ کہ ان کی موت ان کے اختیار میں ہوتی ہے۔ کلینی نے کافی میں یہ مسئلہ ثابت کیا ہے اور سارے ہی امامیہ کا اس پر اجماع ہے۔ دوسری وجہ یہ کہ ائمہ کو ماکان و مایکون کا علم ہوتا ہے۔ گویا وہ اپنی موت۔ اس کی کیفیت و وقت سے باخبر ہوتے ہیں اور اسکا تفصیلی علم رکھتے ہیں۔ لہذا وقت سے پہلے جان کا خوف ان کو کیوں ہونے لگا۔ دوسرا خوف، بدنی یا روحانی ایذا کی مشقت کا ہوتا ہے، اور ان تکالیف کو برداشت کرنا اور گوارا کرنا ہمیشہ نیکو کاروں کا وطیرہ اور طرۂ امتیاز رہا ہے انہوں نے اوامر الٰہی کے امتثال میں تکلیفوں کو گوارا کیا ہے۔ جابر اور قاہر بادشاہان وقت اور فراعین زمانہ سے مقابلہ کیا ہے اگر اس معاملہ میں بزدلی دکھائیں، اور عبادت و مجاہدہ میں مشقت کا تحمل گوارا نہ کریں تو وہ نیکوں ہی کے شمار میں نہیں آسکتے چہ جائیکہ وہ نیکوں کے امام شمار ہوں لہذا ان کیلیے کسی طرح بھی تقیہ ثابت و جائز نہ ہوا۔

پھر اگر بقول شیعہ تقیہ جائز یا واجب ہوتا۔ تو شیعوں کے گمان کے مطابق جناب امیر رضی اللہ عنہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بیعت میں چھ ماہ کا توقف کیوں کرتے اتنے عرصہ بیعت سے رکے رہنا تو صراحتاً ملال و ناخوشی کا اظہار ہے (جو تقیہ کی نفی ہے) سب کے ساتھ بیعت ہی کر لیتے۔

تیسری روایت جو تقیہ کو باطل ٹھیراتی ہے۔ عیاسی نے زرارہ بن اعین سے اس نے ابی بکر بن حزم سے روایت کی ہے۔

قَالَ تَوَضَّأَ رَجُلٌ وَمَسَحَ عَلٰی خُفَّيْهِ فَدَخَلَ الْمَسْجِدَ وَصَلّٰی فَجَاءَ عَلِيٌّ فَوَجَأَ رَقْبَتَهٗ فَقَالَ وَيْلَكَ تُصَلِّيْ عَلٰی غَيْرِ وُضُوْءٍ فَقَالَ اَمَرَنِيْ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ فَاَخَذَ بِيَدِهٖ فَانْتَهٰی بِهٖ اِلَيْهِ ثُمَّ قَالَ اُنْظُرْ مَا يَقُوْلُ هٰذَا عَنْكَ وَرَفَعَ صَوْتَهٗ عَلٰی عُمَرَ فَقَالَ اَنَا اَمَرْتُهٗ بِذٰلِكَ۔

کہا کہ ایک شخص نے وضو کیا موزوں پر مسح کیا اور مسجد میں آکر نماز ادا کی اتنے میں جناب علی رضی اللہ عنہ تشریف لائے تو اسکی گدی دبوچ کر فرمایا ارے تیرا ناس ہو بغیر وضو کے نماز پڑھتا ہے۔ اس نے کہا مجھے تو عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے حکم دیا تھا آپ نے اسکا ہاتھ پکڑا اور اسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں لاکر کہا دیکھئے یہ آپ کے بارے

میں کیا کہتا ہے۔ اور انداز تخاطب گرجنے برسنے جیسا تھا
حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہاں میں نے اسے یہی کہا تھا

اب یہاں تقیہ کہاں رہا۔ جب غلط کار کو گدی سے دبوچ لیا اور خلیفۂ وقت پر گرج برس لیے تو تقیہ رخصت ہوگیا۔
چوتھی روایت شیعوں کے مقتدا اور نہج البلاغہ کے شارح راوندی کی ہے۔ جسے اس نے اپنی کتاب جرائح الجرائح، میں حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔

أَنَّ عَلِيًّا بَلَغَهُ عَنْ عُمَرَ أَنَّهُ ذَكَرَ شِيْعَتَهُ
فَاسْتَقْبَلَهُ فِي بَعْضِ طُرُقَاتِ بَسَاتِيْنِ الْمَدِيْنَةِ
وَفِي يَدِ عَلِيٍّ قَوْسٌ فَقَالَ يَا عُمَرُ بَلَغَنِي عَنْكَ
ذِكْرُكَ لِشِيْعَتِي فَقَالَ ارْبَعْ عَلَى ضَلْعِكَ فَقَالَ
عَلِيٌّ إِنَّكَ لَهٰهُنَا ثُمَّ رَمٰى بِالْقَوْسِ عَلَى الْأَرْضِ
فَإِذَا هُوَ ثُعْبَانٌ كَالْبَعِيْرِ فَاغِرًا فَاهُ وَقَدْ أَقْبَلَ نَحْوَ
عُمَرَ لِيَبْتَلِعَهُ فَقَالَ عُمَرُ اللّٰهَ اللّٰهَ يَا أَبَا الْحَسَنِ لَا عُدْتُ
بَعْدَهَا فِي شَيْءٍ وَجَعَلَ يَتَضَرَّعُ إِلَيْهِ فَضَرَبَ بِيَدِهِ
إِلَى الثُّعْبَانِ فَعَادَتِ الْقَوْسُ كَمَا كَانَتْ فَمَضٰى إِلٰى
بَيْتِهِ فَقَالَ سَلْمَانُ فَلَمَّا كَانَ فِي اللَّيْلِ دَعَانِي
عَلِيٌّ فَقَالَ سِرْ إِلٰى عُمَرَ فَإِنَّهُ حُمِلَ إِلَيْهِ
مِنْ نَاحِيَةِ الْمَشْرِقِ مَالٌ وَقَدْ عَزَمَ أَنْ يَخْبِسَهُ
فَقُلْ لَهُ يَقُوْلُ لَكَ عَلِيٌّ أَخْرِجْ مَا حُمِلَ إِلَيْكَ مِنَ
الْمَشْرِقِ فَفَرِّقْهُ عَلٰى مَنْ هُوَ لَهُمْ وَلَا تَحْبِسْهُ
فَأَفْضَحَكَ قَالَ سَلْمَانُ فَمَضَيْتُ إِلَيْهِ وَأَدَّيْتُ
الرِّسَالَةَ فَقَالَ أَخْبِرْنِي عَنْ أَمْرِ صَاحِبِكَ مِنْ أَيْنَ
عَلِمَ بِهِ فَقُلْتُ فَهَلْ يَخْفٰى عَلَيْهِ مِثْلُ هٰذَا
فَقَالَ يَا سَلْمَانُ اقْبَلْ مِنِّي مَا أَقُوْلُ لَكَ مَا
عَلِيٌّ إِلَّا سَاحِرٌ وَإِنِّي لَمُسْتَيْقِنٌ بِكَ وَالصَّوَابُ أَنْ
تُفَارِقَهُ وَتَصِيْرَ مِنْ جُمْلَتِنَا قُلْتُ لَيْسَ كَمَا
قُلْتَ وَلٰكِنَّهُ وَرِثَ مِنْ أَسْرَارِ النُّبُوَّةِ مَا قَدْ رَأَيْتَ
مِنْهُ وَعِنْدَهُ أَكْثَرُ مِنْ هٰذَا فَقَالَ ارْجِعْ إِلَيْهِ
فَقُلْ السَّمْعُ وَالطَّاعَةُ لِأَمْرِكَ فَرَجَعْتُ إِلٰى عَلِيٍّ فَقَالَ
أُحَدِّثُكَ عَمَّا جَرٰى بَيْنَكُمَا فَقُلْتُ أَنْتَ

حضرت علی (رضی اللہ عنہ) کو خبر ملی کہ حضرت عمر رضی اللہ
عنہ ان کے شیعوں کے بارے میں کچھ کہتے ہیں مدینہ کے
باغات کے راستہ میں آپ دونوں کا آمنا سامنا ہوگیا
اس وقت حضرت علیؓ کے ہاتھ میں کمان تھی آپ نے
کہا اے عمر (رضی اللہ عنہ) مجھے اطلاع ملی ہے کہ تم میرے
شیعوں کے متعلق کچھ کہتے رہتے ہو جواب میں حضرت
عمر رضی اللہ عنہ نے کہا اے علی (رضی اللہ عنہ) اپنے مٹی
کے سر پر رحم کھاؤ۔ اس پر علی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اچھا
تم اس درجہ تک پہنچ چکے ہو۔ اور اپنی کمان زمین پر ڈال
دی جو فوراً اژدھا بن کر منہ کھولے ہوئے عمر کو نگلنے کیلیے
ان کی طرف لپکی۔ اس پر عمر چلائے خدا کے لیے لئے ابوالحسن
اب میں تمہارے کسی معاملہ میں دخل نہ دوں گا اور ان کے
آگے گڑگڑانے لگے۔ پس علیؓ نے اژدھے پر ہاتھ ڈالا تو
وہ کمان بن گئی۔ اس کے بعد جناب عمر رضی اللہ عنہ اپنے
گھر لوٹ گئے سلمان رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رات ہوئی تو
حضرت علی رضی اللہ عنہ نے مجھے طلب کیا اور فرمایا عمر رضی اللہ
عنہ کے پاس جاؤ مشرق سے ان کے پاس مال آیا ہے
جسے وہ ہضم کرنا چاہتے ہیں لہذا ان سے کہو کہ علیؓ
کہتے ہیں جو مال مشرق سے آیا ہے نکالو اور حقداروں
میں اسے بانٹ دو اسے دبانے کا خیال نہ کرو ورنہ میں تمہیں
ذلیل کردوں گا۔ سلمانؓ کہتے ہیں میں ان کے پاس گیا اور
جاکر یہ پیغام پہنچایا۔ وہ کہنے لگے تم یہ تو بتاؤ کہ تمہارے دوست
کو اس مال کی خبر کیسے لگی۔ میں نے کہا ان سے ایسی بات
کہاں چھپ سکتی ہے تو کہنے لگے سلمان! میری بات مان لو

www.Ahlehaq.com

اَعْلَمُ مِنِّیْ فَتَكَلَّمَ بِكُلِّ مَا جَرٰى بَيْنَنَا فَقَالَ اِنَّ رُعْبَ ثُعْبَانٍ فِیْ قَلْبِهٖ اِلَّا اَنْ يَّمُوْتَ ....

علی تو ایک جادوگر ہیں میرا تمہارے بارے میں یقین ہے اور مناسب بھی یہی ہے کہ تم ان سے جدا ہو کر ہم ہیں آملو میں نے کہا جیسا آپ خیال کرتے ہیں معاملہ ایسا نہیں ہے ان کے بارے میں آپ نے جو ملاحظہ کیا وہ وہ اسرار نبویہ ہیں جو انہیں ورثہ میں ملے ہیں۔ اور ان کے پاس تو اس سے بھی زائد ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا اچھا ان کی طرف واپس جاؤ اور ان سے کہو کہ میں نے آپ کا حکم سنا اور مانا۔ لہذا میں جناب علی رضی اللہ کے پاس واپس آیا تو آپ نے پوچھا کہو جو باتیں عمر (رضی اللہ عنہ) سے ہوئیں سناؤں۔ میں نے کہا آپ مجھ سے زیادہ جانتے ہیں پھر آپ نے وہ تمام باتیں دھرا دیں جو ہمارے درمیان ہوئی تھیں اور آپ نے یہ بھی کہا کہ اژدھے کا خوف مرتے دم تک ان کے دل میں رہے گا۔۔

اس روایت میں تقیہ کی گردن ماری گئی ہے۔ اور خوب دل کھول کر اس کی بیخ کنی کی گئی ہے۔ لہذا اس سے معلوم ہوا کہ شیخین رضی اللہ عنہما کی خلافت کے عہد میں جناب امیر رضی اللہ عنہ کی طرف سے جن امور پر سکوت عمل میں آیا مثلاً قصۂ فدک، اور جناب ام کلثوم رحمہا اللہ کا نکاح وغیرہ وہ محض اس بنا پر تھا کہ آپ کے نزدیک وہ درست تھے۔ اور آپ انہیں پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے تھے۔ ورنہ انکار و تنقید کی پوری طاقت رکھتے تھے۔ اگر انکار کی طاقت رکھتے ہوئے شرع کی منع کردہ باتوں پر سکوت فرماتے اور سستی برتتے تو فاسق نہ ہو جاتے۔ بلکہ دختر سیدۃ الزہرا رضی اللہ عنہا کے نکاح کے بارے میں اگر اس تمام اقتدار کے باوجود سستی یا رواداری سے کام لیتے تو کونسی ایسی برائی تھی جو لازم نہ آتی۔ اور کچھ نہ سہی اسکی وجہ سے منصب امامت کی لیاقت سے تو میلوں دور جا پڑتے۔

چنانچہ ایک دو مرتبہ کوئی ممنوع و ناگوار چیز سامنے آئی، یا علم غیب سے معلوم کیا تو اتنے شدید غصہ سے کام لیا۔ ظالموں کے سخت ترین انسان عمر بن خطاب (رضی اللہ عنہ) سے جنکو کسی کا لحاظ نہ تھا اس قدر خائف ہو گئے۔ لہذا معلوم ہوا کہ متعہ کی حرمت، سنت تراویح کا اجراء، ورواج یا تا خمس وغنائم کی تقسیم، عمال کا تقرر، اور دوسرے مہمات خلافت ان سب کو آپ پسند فرماتے تھے۔ ورنہ تو چشم ابرو کے ایک اشارے سے سارا کارخانۂ خلافت درہم برہم کر سکتے تھے۔ کسی لاؤ و لشکر۔ اعوان و انصار کی بھی مطلق ضرورت وحاجت نہ تھی وہ ایک ہی تیر کی ایک کمان ہی کافی تھی۔

عہد فاروقی میں جناب امیر رضی اللہ عنہ کے سکوت۔ اور دین وخلافت کے ظاہری امور میں موافقت کی جو جو وجوہ کتب امامیہ میں لکھی گئی ہیں کہ آپ بے بس، لاچار، ذلیل و بے مقدرت تھے۔ مقابلہ کی طاقت نہیں

www.Ahlehaq.com

رکھتے تھے۔ ایسی وجوہ ہیں کہ اول تو آپ کے یہ باتیں شایان شان نہیں۔ دوسرے امامیوں کی یہ واہی تباہی بکواس کے سوا کچھ نہیں۔ جناب امیر رضی اللہ عنہ عہد شیخین میں بڑے معزز اور بڑے لائق احترام رہے۔ دونوں حضرات کے مشیر و خیر خواہ سے۔ اور ملت حنیفیہ پر قائم رہے۔ ان کے دوستوں، ساتھیوں اور خلفاء نے ان کو کبھی بے مقدرت، بے بس، لاچار، اور بے وقر نہیں سمجھا۔ ہمیشہ ان کے شایان شان برتاؤ کیا۔ یہ تو شیعہ ہی ہیں جنہوں نے روز اول سے آپ کو اپنا آلہ کار سمجھا۔ اور ان کی حقیقی محبت و عزت نہیں کی۔ ان سے تقیہ جیسی ذلیل حرکت منسوب کر کے ان کا سارا وقار، دبدبہ اور عزت خاک میں ملا دی۔

ان سے تقیہ منسوب و ثابت کرنے سے دراصل اہل بیت کیلیے ایسی باتیں لازم آتی ہیں جو انکی غیرت عزت آبرو سب میں خلل انداز ہوتی ہے۔ مثلاً اپنی بیٹی کافر کے نکاح میں دینا یا اپنی تمام بہنوں بیٹیوں کو کفار کے حوالے کرنا خصوصاً ایسی صورت میں جبکہ ان حضرات کو وہ مقدرت و قوت حاصل تھی کہ اسکا دفاع کر سکتے۔ اور ایک معجزہ دکھا کر ایسے حضرات کو چشم زدن میں ذلیل کر سکتے تھے۔

اہلسنت اور کتب شیعہ میں باتفاق تواتر سے یہ بات ثابت ہے کہ جناب امیر و اہل بیت رضی اللہ عنہم نے خلفاء ثلاثہ اور دیگر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم سے فروع فقہیہ کے بہت سے مسائل میں اختلاف کیے ان سے بحث و مناظرہ کیا۔ لیکن اس مخالفت یا مناظرہ کی بنا پر کسی ایک نے بھی صراحتاً تو کیا اشارہ و کنایہ میں بھی انکو مطعون نہیں کیا ایذا دہی تو بہت دور کی بات تھی۔ اس سے بھی تقیہ باطل ہوا۔ کیونکہ بعض مسائل میں واقعہ کا اظہار ہونے کے باوجود کوئی ضرر نہیں پہنچا۔ گویا ثابت ہو گیا کہ اظہار کی قوت موجود تھی اور نقصان کا خوف معدوم۔

اور اگر تقیہ مانا جائے تو وہ یا خدا کے حکم سے ہوگا۔ یا بغیر حکم خدا ہوگا۔ پہلی شق میں ثابت ہوتا ہے کہ معاذ اللہ۔ خدا تعالیٰ حکیم نہیں کیونکہ ایک کام کا حکم دینا اور پھر اسکے خلاف کا امر صادر کرنا۔ تو حکمت و دانائی کی جگہ سفاہت و حماقت لگتا ہے اور اگر شق ثانی ہو۔ یعنی محض لوگوں کی ایذا رسانی کے ڈر سے تقیہ ہو تو ائمہ و اہل بیت جیسے داعیان حق پر بزدلی، سستی اور بے صبری تھوپنے کے سوا کچھ نہیں۔ اور یہ باتیں ظاہر کرتی ہیں کہ ایسے شخص میں امامت کی لیاقت نہیں۔

سارا قرآن جہاد کی مشقتوں پر تحمل اور مصائب پر صبر کی تلقین سے بھرا ہوا ہے۔ صابرین کی مدح سرائی بھی جا بجا ملتی ہے۔ اور ان امور سے بھاگنا یا جان چرانا صالحین اور صابرین کا طریقہ بھی نہیں رہا۔

ایک اور بات کہ اگر تقیہ واجب ہی ہوتا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے یہ نہ فرماتے۔

"اگر مجھے اس عہد کا پاس نہ ہوتا جو مجھ سے میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم نے لیا تھا تب تم دیکھتے کہ مددگاروں کی تعداد کے لحاظ سے کمزور کون ہے۔" اسکا حوالہ کتب امامیہ کے حوالے سے پہلے بھی مذکور ہو چکا ہے۔

یہاں یہ بات بھی واضح رہے کہ عام امامیوں کا یہ خیال ہے کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ پر اپنی خلافت سے قبل تقیہ واجب تھا۔ اور خلافت کے بعد حرام ہو گیا۔ لہذا آپ سے جو روایات خلافت و ولایت کے بعد منقول ہیں ان میں تقیہ ہرگز نہیں ماننا چاہیئے ورنہ لازم آئے گا کہ ایک معصوم حرام کا مرتکب ہوا۔ لیکن ان میں سید مرتضیٰ امامی اس بات کا قائل ہے کہ آپ پر خلافت اور ولایت کے بعد بھی تقیہ واجب تھا۔ مگر ظاہر ہے کہ اسکا یہ قول غلط اور باطل ہے۔ اس لیے کہ اگر بعد خلافت بھی تقیہ واجب ہوتا تو آپ جناب امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو معزول

نہ فرماتے۔ اس لیے کہ آپ ان سے خوفزدہ تھے جسکا اظہار بھی ان الفاظ میں فرمایا تھا۔
اِنِّی اَخَافُ کَیْدَہٗ وَاِنَّ کَیْدَہٗ لَعَظِیْمٌ۔ میں انکی تدبیر سے خائف رہتا ہوں انکی چال بڑی گہری ہوتی ہے۔

جناب ابن عباس اور مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہم نے بھی یہی مشورہ دیا وَلِّہٖ شَھْرًا وَاعْزِلْہُ دَھْرًا (ایک ماہ کیلیے ان کو حاکم بناؤ، اور پھر ہمیشہ کیلیے معزول کردو) مگر آپ نے اسکا جواب دیا۔ وَمَا کُنْتُ مُتَّخِذَ الْمُضِلِّیْنَ عَضُدًا (میں فساد پیشہ سے مدد و قوت لینے والا نہیں ہوں) چنانچہ یہی معزولی فساد عظیم کا باعث بنی، زمین سے فتنے ابل پڑے اور نوبت قتل و قتال تک پہنچکر رہی۔

سید مرتضی کہتا ہے کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ کی ولایت و خلافت تو ایک دکھاوا تھی یوں ہی برائے نام۔ حقیقت سے خالی۔ کیونکہ جناب امیر معاویہ رضی اللہ عنہ آپ سے پرخاش رکھتے تھے جو آپ کی وفات تک جاری رہی اور آپ کے متبعین اور فوج میں ایسے لوگ تھے جو اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد تھے۔ اور درپردہ وہ آپ کے دشمن تھے۔ اور شیخین رضی اللہ عنہما کے اتصاف اور فضائل کے معتقد اور ان کے معاونین اور حامیوں کے مداح۔ ایسی صورت میں اگر جناب امیر رضی اللہ عنہ خاطر خواہ انداز پر اپنے عقیدہ کا اظہار فرماتے یا اس پر عمل پیرا ہوتے تو گمان غالب تھا کہ یہ متبعین ساتھ چھوڑ جاتے۔ اور امر خلافت اور کٹھن ہو جاتا۔ اس وجہ سے ولایت کی حالت میں آپ پر تقیہ واجب تھا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ شیعیت کے دعوی کے ساتھ جناب امیر رضی اللہ عنہ کی ولایت کو بھی نمائشی اور بے معنی قرار دیتے ہیں۔

اہلسنت کے نزدیک یہ ولایت سراسر بامعنی تھی اور ولایت کی حقیقت اس پر منحصر تھی در حقیقت ولایت کے معنی ملک میں تصرف کرنے، احکام جاری کرنے، رعایا سے محصولات و خراج لینے اور مفسدوں کی تنبیہ و تادیب پر قدرت رکھنے کے ہیں۔ اور اس وقت کے اکثر اسلامی شہروں پر جناب امیر رضی اللہ عنہ ایسے تصرف و ولایت کی قدرت بدرجہ کمال رکھتے تھے۔ خصوصاً حجاز، حرمین، یمن، عمان، بحرین، آذربائیجان، عراقین، فارس، و خراسان میں بغیر کسی جھگڑے، مقابلہ یا رکاوٹ کے احکام جاری و نافذ تھے۔ اور وہاں کے باشندے دل و جان سے آپ کے مطیع و فرماں بردار تھے۔ اگر مخالف تھا تو شام کا علاقہ تھا۔ اگر ملک کے کسی ایک حصہ میں گڑبڑ ہو جائے تو یہ معنی ولایت کے منافی نہیں اس سے خلافت و امامت نمائشی و برائے نام نہیں کہلا سکتی ذرا صدر اول۔ عہد ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ پر تو نظر ڈالیے۔ کہ آپ خلیفہ مقرر ہوئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زیر تصرف سوائے جزیرۃ العرب کے کوئی علاقہ نہ تھا۔ اور اس میں بھی سب دشمن اور مفسد بڑے زور آور تھے مثلاً مسیلمہ کذاب، بنو حنیفہ، بنی تمیم کی مدعیہ نبوت سجاح، اور بنو تمیم وہ قبیلہ تھا کہ سارے عرب میں لڑاکا مشہور تھے۔ اس کے مرد مردان کارزار سمجھے جاتے تھے۔

دوسری طرف مانعین زکوۃ کی شورش تھی تو شام میں بنو غسان، حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما سے برسر پرخاش تھے۔ اور پھر ارد گرد کے تمام عرب قبائل فتنہ ارتداد میں گرفتار۔ غرض کیفیت یہ تھی کہ سوائے اہالیان مکہ و مدینہ کے آپ کا کوئی حامی و ناصر نظر نہیں آتا تھا۔ مگر اس سب کے باوجود آپکی استقامت و ثبات کا یہ عالم تھا

Www.Ahlehaq.Com

کہ آپ نے کسی شرعی معاملہ میں معمولی سی مداہنت اور کمزوری یا رواداری کو بار پانے نہیں دیا۔ اور ایسے عالم میں بھی اعلان فرمایا تو یہ فرمایا۔

لَوْ مَنَعُوْنِیْ عِقَالًا کَانُوْا یُؤَدُّوْنَهٗ اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَقَاتَلْتُهُمْ۔	اگر جانور کی رسی بھی جو یہ زکوۃ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا کرتے تھے مجھے نہ دینگے تو میں ان سے قتال کرونگا

اور جناب امیر رضی اللہ عنہ تو سب سے زیادہ بہادر تھے۔ ملک کے ایک علاقہ کے بسنے والوں سے ڈر کر دین محمدی کو مٹنے اور دولت سرمدی کے زوال کو کیسے روا رکھتے۔ یہ بات صرف شیعہ کی سمجھ میں آئے تو آئے کسی مسلمان کے تو تصور میں بھی نہیں آسکتی۔ وہ تو ایسے خیال پر سُبْحَانَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِیْمٌ پڑھتے ہیں ایک طرف تم ان کو وصی بحق کہتے ہو اور دوسری طرف ان پر الزام لگاتے ہو کہ گویا جناب امیر رضی اللہ عنہ نے دین محمدی میں خلل کو جائز رکھا اور گوارا کیا، کیا تمہاری عقلوں کو زنگ لگ گیا۔ یا آنکھیں بصارت کھو بیٹھیں۔ کہ نہ یہ دیکھتے ہو کہ کیا کہہ رہے ہو نہ یہ سوچتے ہو کہ کس کے متعلق کہہ رہے ہو اور یہ بات جو انہوں نے کہی کہ آپکے متبعین اور افواج میں دشمنوں کی اولاد کی اکثریت تھی اور وہی ان کے پیرو تھے۔ تو اس میں اکثریت والی بات تو بالکل غلط ہے۔ اسلیے کہ اکثریت تو کوفیوں مصریوں اور قاتلین عثمان کی تھی۔ جنکی ساری تگ و دو صحابہ کرام کے مطاعن کی تلاش میں صرف ہو رہی تھی وہ تو ان حضرات کرام کی بزرگی اور اعزاز کے انہدام کے خواہاں تھے۔ یا عراق وعجم، خراسان و فارس اور اہواز کے ایسے لوگ تھے جو خلفاء ثلاثہ رضوان اللہ علیہم کے عہد کے زخم خوردہ تھے۔ اور ان کی فوجوں سے دو بدو شکست کا زخم کھا کر دلوں میں کینہ چھپائے ہوئے تھے۔ یا پھر وہ اکھڑ، اور ان گھڑ عرب جو فتنہ انگیزی جنگجوئی، طعن و بدگوئی کو اپنی فطرت میں لے کر اس دنیا میں آئے۔ اور جنکا محبوب مشغلہ احکام وحکام میں ردوبدل اور اکھاڑ پچھاڑ۔ اور پھر ایسے مزاج کے لوگوں کے سامنے مسائل بھی عین ان کی خواہش و آرزو اور تمناؤں کے بر لانے والے ہوں جیسے متعہ کہ عیاش طبع اور شہوت پرست لوگوں کی کشش کا باعث، یا مسح رجلین کا مسئلہ کہ آدھے وضو سے چھٹی یا تراویح کی معافی۔ کہ بے ایمان روزہ دار کیلیے افطار کے بعد ایسا ہے جیسے موت کے بعد عذاب قبر پھر اکثر عجمیوں و عربوں پر تراویح بہت شاق و دشوار تھی۔ چنانچہ ایک مشہور شاعر طرطوسی نے اس سلسلہ میں جو کہا ہے اسکا ترجمہ ملاحظہ ہو۔

"روزہ کا دن بدبختی کا دن ہے اور تراویح کی رات مصیبت کی رات ہے۔ بیمار بن جاؤ کہ پاک چیزیں تمہارے لیے حلال ہو جائیں گی۔ اور بعض وقت بیمار بننا ہی عین شفا ہے۔ اور اگر روزہ رکھنا ہی پڑ جائے تو اکثر بعد عشاء کا روزہ رکھو"

تو ان مسائل نے جن لوگوں کے دلوں کو کھینچا وہ بھی آپ کے ساتھیوں اور فوجیوں میں شامل تھے۔ تو معلوم ہو گیا کہ اکثریت کن لوگوں کی تھی۔ اور صحابہ کی جو اولادیں آپ کے ساتھ تھیں وہ انصار تھے جو ہمیشہ سے محب علی اور شیعان علی شمار ہوتے تھے وہ شیخین رضی اللہ عنہما کا عدل اور ان کی فضیلت سے آگاہ تھے۔ اور اپنے والدین سے وضع و آئین پیمبری سے بھی واقف ہو گئے تھے، تو گویا بقول شیعہ شیخین کی طرف سے سنت پیغمبری میں جو تحریف یا التغیر ہوا تھا اسے خوب جانتے تھے اور کُلُّ جَدِیْدٍ لَذِیْذٌ کے مصداق

www.Ahlehaq.com

نادر مسائل پرانے مسائل کے مقابلہ میں انکو پسند اور جمعیت خاطر کا سبب بھی ہوں گے۔ اس طرح یہ سارے مٹھی میں تھے۔ پھر خوف کس سے تھا، محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہ یا ان جیسے دو ایک ہوں گے۔ تو وہ مصر میں جب مارے گئے تو ان کا خوف بھی زائل ہو گیا۔ اب رہے امیر معاویہ اور جناب عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما ان سے اگر خوف تھا تو وہ بغاوت اور محاذ آرائی کا تھا۔ اسکے لیے مخالفت میں انہوں نے کونسی کمی کی تھی کہ اگر آپ اظہار حق فرماتے اور اصل امور شرع مروج فرماتے تو وہ اپنی مخالفت میں کیا اضافہ کرتے۔

اس کے ساتھ جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا طرز عمل بھی سامنے رہے کہ ابتدائے بعثت سے لیکر حیات مبارکہ کے آخری لمحہ تک آپ کے اکثر پیرو (متبعین) یا تو آپ کے جانی دشمنوں کی اولاد تھے یا ان کے بھائی بند مثلاً عکرمہ بن ابوجہل، حارث بن ہشام، صفوان بن امیہ بن خلف، جبیر بن مطعم، اور خالد بن ولید (رضی اللہ عنہم اجمعین) جو امیر الامراء اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شمشیر برہنہ تھے یہ سب کے سب ان کافروں کے فرزند تھے جو آپ کے سخت ترین جانی دشمن تھے۔ اسکے باوجود آپ نے کبھی بھی امور شرعیہ میں کسی رو رعایت یا نرمی و سستی سے کام نہیں لیا۔

یہی حال سابقہ انبیاء و رسل علیہم السلام اور ان کے ورثا کا رہا ہے۔ کہ ہمیشہ دشمنوں اور مخالفوں سے پالا پڑتا رہا۔ اگر ان کے اسلاف کی دشمنی و عداوت، تبلیغ احکام و امور شرع میں ملحوظ رکھی جایا کرتی تو شرع کیسے ظہور میں آتی اور دین حق دین باطل سے کس طرح ممتاز ہوتا۔

پھر جناب امیر رضی اللہ عنہ کے پیروؤں نے آپ کی بات مان لینے، آپ کی تعظیم و توقیر کرنے اور آپ کی رفاقت میں جان لڑا دینے میں کوئی کمی اٹھا نہ رکھی چنانچہ جنگ جمل و صفین، اور نہروان کے واقعات موجود ہیں، اور جو شخص کسی پر جان نچھاور کرنے کے آخری اقدام پر تلا ہوا ہو وہ ان کے شرعی فرمان سے کیوں منہ موڑنے لگا۔

اور اتنا تو بہر حال تمام متبعین اور پیروؤں کے بارے میں متفق علیہ ہے کہ وہ سب کے سب آپ کا شمار خلفائے راشدین میں کرتے اور اپنے زمانہ و وقت میں ساری مخلوق سے بہتر سمجھتے تھے۔ اہل سنت کا بھی یہی عقیدہ و مذہب ہے اور ان کے نزدیک یہ بھی طے شدہ ہے کہ خلفائے راشدین کی سنت حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی سنت کا حکم رکھتی ہے تو جن لوگوں کے ایسے خیالات اور عقائد ہوں ان سے ڈرنا اور تقیہ کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔

پانچویں روایت جو کلینی کی ہے یہ ہے۔

رَوَی الْکُلِیْنِیُّ عَنْ مُعَاذِ بْنِ کَثِیْرٍ عَنْ اَبِیْ عَبْدِاللّٰہِ عَلَیْہِ السَّلَامُ قَالَ اِنَّ اللّٰہَ عَزَّ وَجَلَّ اَنْزَلَ عَلٰی نَبِیِّہٖ کِتَابًا فَقَالَ ھٰذِہٖ وَصِیَّتُکَ اِلَی النُّجَبَاءِ فَقَالَ وَمَنِ النُّجَبَاءُ یَا جِبْرِیْلُ فَقَالَ عَلِیُّ بْنُ اَبِیْ طَالِبٍ وَوَلَدُہٗ. وَکَانَ عَلَی الْکِتَابِ خَوَاتِیْمُ مِنْ ذَھَبٍ فَدَفَعَہٗ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِلٰی عَلِیٍّ وَاَمَرَہٗ اَنْ یَّفُکَّ خَاتَمًا مِنْہُ فَیَعْمَلَ بِمَا

کلینی نے بحوالہ معاذ بن کثیر جناب ابی عبد اللہ رحمتہ اللہ علیہ سے روایت کی کہ آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی پر ایک کتاب نازل فرمائی اور فرمایا کہ یہ تمہاری طرف سے نجبار کیلیے وصیت ہے۔ آپ (صلے اللہ علیہ وسلم) نے جبریل (علیہ السلام) سے دریافت فرمایا وہ نجبار کون ہیں؟ انہوں نے کہا کہ علی بن ابی طالب اور انکی اولاد (رضی اللہ عنہم) اور کتاب پر سونے کی مہریں تھیں پس رسول اللہ

www.Ahlehaq.Com

فِيهِ ثُمَّ دَفَعَهُ إِلَى الْحَسَنِ فَفَكَّ خَاتِمًا فَعَمِلَ بِمَا
فِيهِ ثُمَّ دَفَعَهُ إِلَى الْحُسَيْنِ فَفَكَّ خَاتِمًا فَوَجَدَ فِيهِ
أَنْ أَخْرِجْ بِقَوْمٍ إِلَى الشَّهَادَةِ فَلَا شَهَادَةَ لَهُمْ إِلَّا
مَعَكَ وَاشْتَرِ نَفْسَكَ لِلّٰهِ فَفَعَلَ ثُمَّ دَفَعَهُ إِلَى
عَلِيِّ بْنِ الْحُسَيْنِ فَفَكَّ خَاتِمًا فَوَجَدَ فِيهِ أَنْ أَطْرِقْ
وَاصْمُتْ وَالْزَمْ مَنْزِلَكَ وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتَّى يَأْتِيَكَ
الْيَقِينُ فَفَعَلَ ثُمَّ دَفَعَهُ إِلَى ابْنِهِ مُحَمَّدِ بْنِ
عَلِيِّ بْنِ الْحُسَيْنِ فَفَكَّ خَاتِمًا فَوَجَدَ فِيهِ حَدِّثِ
النَّاسَ وَأَفْتِهِمْ وَانْشُرْ عُلُومَ أَهْلِ الْبَيْتِ وَصَدِّقْ
آبَاءَكَ الصَّالِحِينَ وَلَا تَخَافَنَّ أَحَدًا إِلَّا اللّٰهَ فَإِنَّهُ
لَا سَبِيلَ لِأَحَدٍ عَلَيْكَ ثُمَّ دَفَعَهُ إِلَى جَعْفَرٍ الصَّادِقِ
فَفَكَّ خَاتِمًا فَوَجَدَ فِيهِ حَدِّثِ النَّاسَ وَأَفْتِهِمْ وَ
لَا تَخَافَنَّ أَحَدًا إِلَّا اللّٰهَ فَانْشُرْ عُلُومَ أَهْلِ بَيْتِكَ
وَصَدِّقْ آبَاءَكَ الصَّالِحِينَ فَإِنَّكَ فِي حِرْزٍ وَأَمَانٍ
فَفَعَلَ ثُمَّ دَفَعَهُ إِلَى ابْنِهِ مُوسَى وَهٰكَذَا إِلَى
قِيَامِ الْمَهْدِيِّ وَرَوَاهُ مِنْ طَرِيقٍ آخَرَ عَنْ مُعَاذِ بْنِ
كَثِيرٍ أَيْضًا عَنْ أَبِي عَبْدِ اللّٰهِ وَفِيهِ فِي الْخَاتَمِ
الْخَامِسِ وَقُلِ الْحَقَّ فِي الْأَمْنِ وَالْخَوْفِ وَلَا تَخْشَ
إِلَّا اللّٰهَ۔

صلے اللہ علیہ وسلم نے وہ کتاب علی (رضی اللہ عنہ) کو دی اور حکم فرمایا کہ ان مہروں میں سے ایک کو توڑیں اور اس میں جو کچھ درج ہے اس پر عمل کریں۔ پھر حسن (رضی اللہ عنہ) کو دی آپ نے مہر توڑی اور جو کچھ اس میں پایا عمل کیا۔ پھر حسین (رضی اللہ عنہ) کو دی اور انہوں نے مہر توڑی تو اس میں یہ لکھا پایا کہ ایک قوم کی ہمراہی میں شہادت کے لیے نکلو کیونکہ تمہارے بغیر ان کی شہادت معتبر نہیں اور راہ خدا میں اپنی جان کی بازی لگاؤ تو انہوں نے ایسا ہی کیا پھر علی بن الحسین رحمۃ اللہ علیہ کو دی انہوں نے بھی ایک مہر توڑی تو اسمیں یہ لکھا پایا کہ سر تسلیم خم کرو خاموش رہو گھر میں بیٹھے رہو اور مرتے دم تک اپنے رب کی عبادت کرتے رہو انہوں نے ایسا ہی کیا۔ پھر ان کے بیٹے محمد بن علی بن الحسین (رحمۃ اللہ علیہ) کے سپرد کی انہوں نے ایک مہر توڑی تو اسمیں یہ پایا لوگوں سے حدیث بیان کرو، ان کو فتوی دو اور اہل بیت کے علم کو پھیلاؤ اور اپنے نیک بخت باپ دادا کی تصدیق کرو اور سوائے خدا کے کسی سے نہ ڈرو کیونکہ کوئی تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ پھر جعفر صادق (رحمۃ اللہ علیہ) کے حوالہ کی آپ نے ایک مہر توڑی تو اسمیں یہ لکھا ہوا پایا کہ لوگوں سے حدیث بیان کرو ان کو فتوی دو اور سوائے خدا کے کسی سے نہ ڈرو اہل بیت کا علم پھیلاؤ اور اپنے نیک بخت باپ دادا کی تصدیق کرو تم یقیناً امن و حفاظت میں ہو تو انہوں نے ایسا ہی کیا۔ پھر ان کے بیٹے موسیٰ (رحمۃ اللہ علیہ) کے حوالہ کی اور اسی طرح ظہور مہدی تک ہوتا چلا جائیگا۔ اور ایک دوسرے سلسلہ سند سے بھی معاذ بن کثیر سے روایت کی ہے اور اس نے ابی عبداللہ (رحمۃ اللہ علیہ) سے اسمیں پانچویں مہر میں یوں ہے۔ امن و خوف میں حق بات کہہ اور اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈر۔

یہ روایت بڑے اچھے فوائد پر مشتمل ہے۔

الف:۔ ائمہ حضرات جو کچھ کرتے تھے خدا کے حکم کے مطابق کرتے اگر ان کو جن باتوں کا حکم دیا گیا انہوں نے وہ انجام دیں۔ لیکن زمین پر اقتدار حاصل کرنے اور امور مملکت میں دخل اندازی کا ان میں سے کسی بزرگ کو بھی حکم نہیں ملا ورنہ وہ اسکے لیے تگ و دو کرتے اور ضرور کامیاب ہوتے۔

ب:۔ جناب امیر رضی اللہ عنہ عہد خلفائے ثلاثہ رضوان اللہ علیہم میں خاموش رہنے کوئی گڑبڑ نہ کرنے اور

www.Ahlehaq.com

خلفائے ثلاثہ کی اطاعت و فرماں برداری سے پیش آنے پر مامور تھے۔ اور انہوں نے اس حکم الٰہی کی پوری پوری پابندی فرمائی فھوالمراد یہی ہمارا مقصد ہے۔

ج: بعض ائمہ مثلاً جناب باقر و صادق رحمۃ اللہ علیہما کو کسی کے ساتھ تقیہ کرنا ممنوع قرار دیا گیا۔ لہٰذا ان کے وہ تمام افعال و روایات جو اہل سنت کے نزدیک ان سے بطریق تواتر و شہرت مروی ہیں سب کے سب سچائی اور ظاہر پر مبنی ہیں۔ امام اعظم ابو حنیفہ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہما علماء اہل سنت نے آپ سے جو کچھ سیکھا وہ سب فرمودۂ خدا تھا۔ مگر شیعوں نے جو وطیرہ اختیار کر رکھا ہے وہ ان اقوال میں جو اہلسنت کی موافقت میں ہیں اور انکی کتابوں میں مذکور ہیں رد و بدل کر کے ان کو تقیہ پر محمول کرتے ہیں تو یہ تحریف و تنسیخ تو ہے ہی مگر اسی کے ساتھ وصیت کے بھی صاف طور بر خلاف ہے۔

چھٹی روایت سلیم بن قیس ہلالی نے اپنی کتاب احتجاجات میں اشعث بن قیس سے ایک طویل روایت کے ذیل میں بیان کیا ہے۔

أَنَّ أَمِيرَ الْمُؤْمِنِينَ قَالَ لَمَّا قُبِضَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَمَالَ النَّاسُ إِلَى أَبِي بَكْرٍ فَبَايَعُوهُ حَمَلْتُ فَاطِمَةَ وَأَخَذْتُ بِيَدِ الْحَسَنِ وَالْحُسَيْنِ وَلَمْ نَدَعْ أَحَدًا مِنْ أَهْلِ بَدْرٍ وَأَهْلِ السَّابِقَةِ مِنَ الْمُهَاجِرِينَ وَالْأَنْصَارِ إِلَّا نَاشَدْتُهُمُ اللّٰهَ حَقِّي وَدَعَوْتُهُمْ إِلَى نُصْرَتِي فَلَمْ يَسْتَجِبْ لِي مِنْ جَمِيعِ النَّاسِ إِلَّا أَرْبَعَةُ رَهْطٍ الزُّبَيْرُ وَسَلْمَانُ وَأَبُو ذَرٍّ وَالْمِقْدَادُ۔

امیر المومنین (رضی اللہ عنہ) نے فرمایا کہ جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے وفات پائی اور لوگوں کا جھکاؤ ابوبکر (رضی اللہ عنہ) کی طرف ہوا اور آپ سے بیعت لی گئی تو میں نے فاطمہ (رضی اللہ عنہا) کو اونٹ پر سوار کیا اور حسن و حسین (رضی اللہ عنہما) کا ہاتھ پکڑا اور اہل بدر، مہاجرین و انصار کے سابقین میں سے کسی کو نہ چھوڑا جسکو میں نے اپنے حق کیلئے قسم نہ دی ہو اور اپنی مدد کے لیے نہ بلایا ہو مگر ان حضرات میں سے چار کے سوا میری بات کسی نے بھی نہ مانی۔ یعنی زبیر، سلمان، ابوذر اور مقداد (رضی اللہ عنہم)

یہ روایت بھی صاف غمازی کر رہی ہے کہ امام برحق پر تقیہ واجب نہ تھا اگر واجب ہوتا تو خاتون جنت اور شباب اہل جنہ کے سرداروں کو لیکر یوں دربدر نہ پھرتے۔ اس میں فائدہ کی کوئی بات نہ تھی بلکہ جو لوگ بیعت کر چکے تھے ان کے سامنے ایسی بات کے اظہار میں تو سراسر مضرت تھی۔

ساتویں روایت۔ بھی سلیم بن قیس سے ایک دوسری کتاب میں جو شیعوں کے ہاں "ابان بن عیاش" کے نام سے مشہور ہے اس نے سلیم سے اسکی یوں روایت کی ہے

إِنَّ أَبَا بَكْرٍ بَعَثَ إِلَى عَلِيٍّ قُنْفُذًا حِينَ بَايَعَهُ النَّاسُ وَلَمْ يُبَايِعْهُ عَلِيٌّ وَقَالَ لَهُ انْطَلِقْ إِلَى عَلِيٍّ فَقُلْ لَهُ أَجِبْ خَلِيفَةَ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَانْطَلَقَ فَبَلَّغَهُ فَقَالَ لَهُ مَا أَسْرَعَ مَا كَذَبْتُمْ عَلَى رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

جب لوگوں نے ابوبکر (رضی اللہ عنہ) کی بیعت کر لی اور علی (رضی اللہ عنہ) نے ان سے بیعت نہ کی تو ابوبکر رضی اللہ عنہ نے قنفذ کو ان کے پاس یہ پیغام دیکر بھیجا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے خلیفہ کو تسلیم کر لو پس اس نے جاکر یہ بات پہنچا دی تب علی (رضی اللہ عنہ) نے فرمایا تم لوگوں نے

وَارْتَدَدْتُمْ وَاللّٰهِ مَا اسْتَخْلَفَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ غَيْرِيْ ۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر کس قدر جلد جھوٹ منسوب کر دیا۔ اور ان سے پھر گئے خدا کی قسم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے سوا کسی کو خلیفہ نہیں بنایا۔

یہ روایت بھی تقیہ کے بطلان کا علی الاعلان اظہار کر رہی ہے۔

آٹھویں روایت کتاب سلیم میں اسی ابان سے مروی ہے۔

اِنَّهٗ لَمَّا لَمْ يُجِبْ عَلِيٌّ غَضِبَ عُمَرُ وَاَضْرَمَ بِالنَّارِ بَابَ دَارِ عَلِيٍّ فَاَحْرَقَ الْبَابَ وَدَفَعَهٗ فَاسْتَقْبَلَتْهُ فَاطِمَةُ وَصَاحَتْ يَا اَبَتَاهُ وَيَا رَسُوْلَ اللّٰهِ فَرَفَعَ عُمَرُ السَّيْفَ وَهُوَ فِيْ غِمْدِهٖ فَوَجَىٰ بِهٖ جَنْبَهَا وَرَفَعَ السَّوْطَ فَضَرَبَ بِهٖ ذِرَاعَهَا فَصَاحَتْ يَا اَبَتَاهُ فَاَخَذَ عَلِيٌّ بِتَلَابِيْبِ عُمَرَ وَهَزَّهٗ وَوَجَىٰ اَنْفَهٗ وَرَقَبَتَهٗ ۔

جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت نہیں مانی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ بہت خفا ہوئے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دروازہ کو آگ لگادی اور جلا کر اسکو ڈھا دیا فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا بابائی دہائی دیتی ہوئی آئیں تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے میان سمیت اپنی تلوار سے انکی کوکھ میں کچوکا دیا اور کوڑا ان کے پیرہن پر مارا وہ پھر ہائے بابا چلائیں تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی گردن دبوچی اور اسے جھٹکا دیا ناک وگدی کو بھی رگڑا۔

نویں روایت اسی کتاب میں یہ بھی درج ہے۔

قَالَ عُمَرُ لِعَلِيٍّ بَايِعْ اَبَا بَكْرٍ ۔ قَالَ اِنْ لَمْ اَفْعَلْ ذٰلِكَ قَالَ اِذًا وَاللّٰهِ يُضْرَبُ عُنُقُكَ قَالَ كَذَبْتَ وَاللّٰهِ يَا ابْنَ صَهَّاكَ لَا تَقْدِرُ عَلٰى ذٰلِكَ اَنْتَ اَلْاَمُ وَاَضْعَفُ مِنْ ذٰلِكَ ۔

عمر رضی اللہ عنہ نے علی رضی اللہ عنہ سے کہا ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت کر لو آپ نے کہا اگر نہ کروں تو پھر کیا ہوگا انہوں نے فرمایا تب بخدا تم قتل کر دیئے جاؤ گے علیؓ نے کہا اے ابن صہاک بخدا تم نے جھوٹ کہا تم اس پر قادر نہیں ہو سکتے تم تو اس سے زیادہ لئیم اور کمزور ہو۔

اس روایت نے تو تقیہ کا نس ہی مار دیا۔ اور جبر بلیا دسے اکھاڑ کر پھینک دیا کہ جناب امیرؓ نے گالی بھی دی تکذیب بھی کی اور اس پر قسم کھا کر اسے پختہ اور مؤکد بھی کیا اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو اضعف الخلق کہا۔

حالانکہ شیعوں کی اصح الکتب نہج البلاغۃ میں منقول ومروی ہے کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ نے جب یہ سنا کہ ان کے لشکری اہل شام کی بدگوئی کرتے اور گالیاں دیتے ہیں تو آپ نے انکو اس سے روکا اور فرمایا کہ مجھے تمہارا گلیر ہونا پسند نہیں۔ اب پتہ نہیں آپ نے اپنی زبان کو گالی سے آلودہ کرنا کیوں پسند فرمایا۔

(دراصل نہ یہ زبان آپ کی ہے۔ نہ آپ کا اخلاق ہے۔ یہ تو کسی بدفطرت کی کرشمہ سازی ہے کہ وہ اپنی زبان ان کے دہن مبارک میں ٹھونسنے کی ناپاک جسارت کر رہا ہے۔ ن)

دسویں روایت محمد بن سنان کی روایت ہے۔

اَنَّ اَمِيْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ قَالَ لِعُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ يَا مَغْرُوْرُ اِنِّيْ اَرَاكَ فِي الدُّنْيَا قَتِيْلًا بِجِرَاحَةِ

امیر المومنین نے عمر بن خطاب (رضی اللہ عنہما) سے کہا اے مغرور میں تجھکو دنیا میں مقتول دیکھ رہا ہوں کہ عبد ابن معمر

Www.Ahlehaq.Com

مِنْ عَبْدٍ بْنِ اُمِّ مَعْتَمٍ تَحْكُمُ عَلَيْهِ جَوْرٌ اَفَيَقْتُلُكَ يَدْخُلُ بِذَالِكَ الْجِنَانَ عَلٰى رَغْمِهٖ مِنْكَ۔

اس فیصلہ کی وجہ سے جو تم اسکے حق میں ظلما صادر کرو گے اور وہ تمہیں قتل کر دے گا اور تمہارے نہ چاہنے کے باوجود جنت میں جائیگا۔

پڑھتا جا شرماتا جا، اس طرح چمک میں کہیں تقیہ کا وجود نظر آتا ہے، کوسوں منزلوں اسکا تو پتہ نہیں۔

گیارہویں روایت بھی محمد سنان راوی ہے۔

اَنَّ اَمِيْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ قَالَ لِعُمَرَ اِنَّ لَكَ وَلِصَاحِبِكَ الَّذِيْ قُمْتَ مَقَامَهٗ هَتْكًا وَصَلْبًا تُخْرَجَانِ مِنْ جِوَارِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَتُصْلَبَانِ عَلٰى دَوْحَةٍ يَابِسَةٍ فَتُوْرِقُ فَيُفْتَتَنُ بِذَالِكَ مَنْ وَالَاكُمَا ثُمَّ تُؤْتٰى بِالنَّارِ الَّتِيْ اُضْرِمَتْ لِاِبْرَاهِيْمَ وَيَاْتِيْ جَرْجِيْسُ وَدَانِيَالُ وَكُلُّ نَبِيٍّ صِدِّيْقٍ فَتُصْلَيَانِ فِيْهَا فَتُحْرَقَانِ وَتَصِيْرَانِ رَمَادًا ثُمَّ تَاْتِيْ رِيْحٌ ثُمَّ تَنْسِفُكُمَا فِي الْيَمِّ نَسْفًا۔

امیر المومنین نے عمر (رضی اللہ عنہما) سے کہا کہ تمہارے لیے نیز جسکی جگہ تم نے سنبھالی ہے یقینا بے آبروئی اور سولی پر چڑھنا ہے۔ تم دونوں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پڑوس سے نکالدیے جاؤگے اور سولی دیے جاؤگے ایک سوکھے درخت پر جو پتے لے آئیگا۔ اس سے تمہارے ہمدرد فتنہ میں پڑجائیں گے۔ اس کے بعد وہ آگ لائی جائیگی جو ابراہیم کے لیے بھڑکائی گئی تھی اور جرجیس، دانیال اور ہر نبی صدیق آئیں گے پس تم دونوں اسمیں ڈالے جاؤگے اور جلائے جاؤگے اور راکھ ہو جاؤگے پھر ہوا آئے گی اور تم کو سمندر میں ڈال کر نیست و نابود کر دیگی۔

یہاں بھی دامن تقیہ تار تار ہے اور اصول تقیہ اشکبار۔

(مندرجہ بالا روایت کے متعلق بلا ریب و شک ہر مسلمان جانتا ہے کہ جناب امیر یہ الفاظ و بیان تو کجا انکو پتہ تک نہیں ہو گا کہ سبائیوں نے ان کی طرف کیا کیا جھوٹ منسوب کر کے پھیلا دیا ہے۔ البتہ اس روایت سے رافضیوں کی ان وارداتوں کی ضرور تصدیق ہوگئی جو تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہیں۔ جن میں ان بدبختوں نے کئی مرتبہ حضرات شیخین رضی اللہ عنہما کے اجساد مبارکہ کو پہلوئے رسول صلے اللہ علیہ وسلم سے نکال کر اسی سبائی بکواس کو عملی جامہ پہنانے کی ناکام کوشش کی۔ اور اسی کوشش میں ایک مرتبہ ۴۰ رافضی مسجد نبوی میں غرق زمین ہو کر کندۂ جہنم بنے۔ جسکا نشان ہنوز موجود ہے۔ ن)

گو تقیہ کے بطلان کی روایات کتب شیعہ میں بے شمار موجود ہیں مگر یہاں صرف بارہ روایات پر اکتفا کیا گیا۔ کسی بھی عقلمند کو ان روایات کے مطالعہ کے بعد یہ شک نہیں رہے گا کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ جو اپنے دشمنوں میں جری، ہیبت، سرکشی اور دبدبہ میں مشہور اور ضرب المثل تھے وہ جناب امیر المومنین رضی اللہ عنہ کے سامنے ہر معاملہ میں بودے، پست ہمت اور حقیر و ذلیل تھے۔ تو پھر دوسرے حضرات جو آپ سے کمزور ضعیف و بزدل تھے ان کا معلوم نہیں بدحواسی میں کیا حال ہوتا ہوگا۔ ان کے تو ہاتھ پاؤں پھول جاتے ہونگے لہذا معلوم ہو گیا کہ جناب امیر کا امور مملکت میں دخل نہ دینا۔ اور ان کو ان ہی چند ضعیف و کمزور و حقیر لوگوں کے صوابدید پر دیدہ و دانستہ چھوڑے رکھنا بے بسی اور تقیہ پر مبنی نہیں تھا اگرچہ یہ بھی پتہ چل

www.Ahlehaq.com

کیا تھا کہ ایسا کرنا مخلوق کے دین وایمان کے فساد کا سراسر سبب بنا اور شریعت کی تحریف اور کتاب اللہ کی تبدیلی جیسے نتائج اس پر مرتب ہوئے۔ اب اسکا جواب شیعہ ہی دیں کہ اسقدر طاقت وقوت اور دبدبہ رکھتے ہوئے جناب امیر نے فساد عقیدہ، تحریف شریعت اور تبدیلی کتاب اللہ کیسے اور کیوں گوارا فرمالی۔ جبکہ مذکورہ بالا روایات نے تقیہ کے اصول کو تو جھٹلا دیا۔

ائمہ سے تقیہ کا وقوع سراسر جبن، بزدلی، بے عزتی اور ناحفاظتی ہے۔ خاص کر ایسی صورت میں کہ موت بھی ان کے ہاتھ میں ہو گذشتہ وآئندہ حالات کی ان کو خبر بھی ہو اور پھر تقیہ بھی اس حد تک کہ فاسق وفاجر انکی لڑکیاں اور بہنیں چھین لیں وہ انتقام کی قدرت بھی رکھتے ہوں بلکہ اول قدم پر ہی دفاع اور روکدینے کی صلاحیت بھی حاصل ہو۔ کہ پھر کسی تعب ومشقت کی بھی ضرورت نہ رہے، صرف ایک کمان ڈال دینے اور زبان ہلا دینے سے کام تمام ہو جائے بہرحال ایسا ذلیل اور قابل نفرت خیال وتصور ان محترم حضرات کی شان میں کسی مسلمان کے دل ودماغ میں تو ہرگز نہیں آسکتا۔ اس لیے کہ یہ صریح کفر ہے یہ ساری قباحتیں اور نحوستیں تو اس منحوس تقیہ کے اصول کی پیداوار ہیں اور اس کے واجب ہونے سے کیا بلکہ صرف واقع ہو جانے سے وہ ساری اغراض فوت ہو جاتی ہیں جو نصب امام سے مقصود ہوتی ہیں نہ ہی امامت ظاہر ہو پاتی ہے نہ ہی شریعت کی حفاظت اور نہ ہی حق باطل سے تمیز پاتا ہے۔ اور اگر کوئی ابتداء دعوی امامت وخلافت کرے اور جب دیکھے کہ لوگ اسکی امامت کے منکر ہیں اور اس سے سختی ودرشتی سے پیش آتے ہیں تو وہ تقیہ اختیار کر کے بیٹھ جاتے اور ہر معاملہ میں ان کا شریک عمل رہے تو عوام وخواص یہی سمجھیں گے کہ اس نے اپنے دعوی سے رجوع کر لیا ہے۔ اور یہ بھی یقین کرلیں گے کہ آدمی تھڑدلا اور بڑبولا تھا کہ اتنے بڑے منصب کا دعوی تو کر بیٹھا مگر کچھ چلتی نہ دیکھ کر کنارہ کش ہو گیا۔

درحقیقت یہ خیال حد درجہ نازیبا وناشائستہ ہے اور کوئی بھی مسلمان اسکو پسند نہیں کر سکتا مگر اسکو کیا کیا جائے۔ کہ شیعہ روایات جو ان کے ہاں جناب امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ کی بابت ملتی ہیں اسی حالت کو ثابت کرتی ہیں۔ بفرض محال ہم یہ مان بھی لیں کہ تقیہ میں کوئی خرابی نہیں، مگر لڑکیوں اور بہنوں کے چھین لیے جانے پر دب جانا اور دم بخود رہ جانا مسلمان کی دل شکنی اور نفرت قلبی کے لیے تو یہی کافی ہے۔ اور ان کی یہ اشک شوئی بھی بے کار اور افتراء ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ دختر جناب امیر رضی اللہ عنہ پر حاوی نہ ہو سکے کہ ایک جن بیچ میں حائل ہو گیا۔ یہ ایک دیدہ دلیرانہ چوری ہے جو حضرت سارہ علیہا السلام کے قصہ سے اڑائی گئی ہے۔ سب کو معلوم ہے کہ ایک ظالم نے ان عفت مآب کو غصب کر لیا تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام سر بسجدہ مصروف التجا تھے۔ وہ بدبخت جب بھی بدنیتی کرتا بے ہوش ہو کر گر پڑتا۔ مگر یہاں تو قطعی اور یقینی طور پر ثابت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے باقاعدہ نکاح میں آگئیں پھر ان کے بطن سے زید بن عمر رحمۃ اللہ علیہ نہ صرف پیدا ہوا بلکہ زندگی کی بیس بہاریں بھی دیکھیں اور عین عالم شباب میں بنی عدی کی باہم خانہ جنگی میں صلح وصفائی کے لیے جاتے ہوئے رات کی اندھیری میں کسی نامعلوم فرد کے ہاتھوں مغالطہ میں شہید ہو گئے اور اتفاق یہ کہ آپ کی والدہ سیدہ ام کلثوم رضی اللہ عنہا بھی اسی روز بیماری کے سبب فوت ہو گئیں۔ دونوں

www.Ahlehaq.com

جنازے ساتھ لائے گئے جناب حسین و عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم نے نماز جنازہ پڑھی اور دفن کیا۔ اور کچھ نہ بھی ہو تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی زندگی کے آخری لمحہ تک ان پاکباز محترمہ رضی اللہ عنہا کا آپ کے گھر میں رہنا بلا شبہ ثابت ہے۔ اول تو جگر پارۂ رسول کا ایک ''فاجرو کافر'' کے ہاتھوں چھن جانا ہی متصور نہیں اور اگر ہو بھی گیا تھا تو یہاں خلاصی زیادہ متوقع تھی۔ اور نکاح کے بارے میں عذر پیش کرنے کی خاطر بے حیا قوم جناب صادق رحمۃ اللہ علیہ سے جو روایت نقل کرتی ہے کہ اول فرج غصب منا۔ اس کو سنکر تو مسلمانوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ مگر لعنت ہے ان بد باطن بدبختوں پر کہ محض عداوت عمر میں اتنے اندھے ہو گئے کہ اس قسم کی کفریات پاکباز ائمہ اطہار پر بکنے میں بھی انہیں ذرا شرم و عار نہیں۔ حالانکہ ان کے شرمناک جھوٹ کی تکذیب کے لیے خود کتب امامیہ میں صحیح روایات موجود ہیں۔ جو عداوت عمر کی بنا پر طاق نسیان بنا رکھی ہیں۔ ادھر آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے۔ یہ ادھر سے اندھے ہیں۔ تو دنیا تو اندھی نہیں ملاحظہ فرمائیے۔

سُئِلَ الْاِمَامُ مُحَمَّدُ بْنُ عَلِيِّ الْبَاقِرِ عَنْ تَزْوِيْجِهَا فَقَالَ لَوْلَا اَنَّهٗ رَاٰهُ اَهْلًا لَهَا مَا كَانَ يُزَوِّجُهَا اِيَّاهُ وَكَانَتْ اَشْرَفَ نِسَاءِ الْعَالَمِ جَدُّهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاَخَوَاهَا الْحَسَنُ وَالْحُسَيْنُ سَيِّدَا شَبَابِ اَهْلِ الْجَنَّةِ وَاَبُوْهَا عَلِيٌّ ذُو الشَّرَفِ وَالْمَنْقَبَةِ فِي الْاِسْلَامِ وَاُمُّهَا فَاطِمَةُ بِنْتُ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَجَدَّتُهَا خَدِيْجَةُ بِنْتُ خُوَيْلِدٍ۔

جناب محمد بن علی الباقر رحمۃ اللہ علیہ سے ان کے نکاح کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا کہ اگر حضرت عمر کو جناب ام کلثوم رضی اللہ عنہا کے لائق نہ پاتے تو ان سے نکاح ہی کیوں کرتے وہ تمام مستورات عالم میں شریف ترین تھیں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ان کے نانا۔ جوانان جنت کے سردار حضرات حسنین رضی اللہ عنہما۔ ان کے ماں جائے بھائی شرف و منقبت کے مالک حضرت علی رضی اللہ عنہ ان کے والد اور سیدہ فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا رسول اللہ کی جگر گوشہ ان کی والدہ ہیں ام المومنین حضرت خدیجہ بنت خویلد رضی اللہ عنہا ان کی نانی۔

ان کو یہ بات تو سامنے رکھنی چاہیے تھی کہ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے ایک شیعہ کی برائی کرنے پر اتنی شدت سے باز پرس کی اور کھان کا اثر دہا بنا کر ان کو ہراساں اور بے عزت کیا۔ تو کیا وہ اپنی بیٹی کے چھن جانے پر اور عزت و ناموس کا سوال درپیش ہونے پر ایسے ہی ٹھنڈے مزاج کا ثبوت دیتے اور ان کی رگ غیرت و حمیت میں کوئی جنبش نہ ہوتی اور وہ خاموشی سے بغیر تعارض کئے اسے گوارا کر لیتے۔ ایسی پاک مطہر گرامی قدر لائق احترام ہستیوں کے متعلق وقوع زنا کا وہم بھی اپنے دل میں لانا کو مجبوری سے ہو مسلمانوں کے کھلا کفر ہے۔ مگر کھلے کفر کے مرتکب یہ ناپاک اور بد فطرت گروہ چاہتا ہے کہ اللہ تعالی نے جن ہستیوں کی پاکی و پاکبازی قرآن مجید میں نازل فرمائی ہے ان کے پاک دامن کو محض عداوت و بغض و عناد عمر رضی اللہ عنہ کے سبب اس فعل کے داغ سے داغدار کرے اور جناب امیر اور حضرات حسنین رضی اللہ عنہم کو بے غیرتی اور بے ناموسی کے اتہام سے متہم کرے۔ مگر یہ اتنا نہیں سمجھتے کہ یہ ساری کالک ان ملعونوں

ہی کے چہروں کا تا قیام قیامت بزر رہے گی۔ اس لیے کہ انہوں نے اپنے سبائی منصوبوں کی خاطر سارے ہی قابل احترام و شرف بزرگوں کو مجروح کرنے کی ناپاک منصوبہ بندی کی جسارت کی ہے جنکی پاک دامنی کا خدا گواہ ہے ان کے دامن پر تو یہ منافق و کافر کیا دھبہ کاری کریں گے۔ البتہ خود ہی قردۃ خاسئین بنکر رہیں گے۔ انہوں نے تعداوت و بغض میں جس کفر و زندیقیت کا مظاہرہ کیا اسکی نظیر کسی فرقہ میں پائی گئی نہ پائی جائیگی۔ شیطان بزبان قرآن آدم (انسان) کا کھلا دشمن ہے اور انتہا درجہ کی عداوت اور بغض رکھتا ہے مگر اس نے بھی خدا تعالیٰ پر کوئی تہمت یا جھوٹ نہیں جوڑا اور اسے مجبوری وبے بسی جیسے نقائص سے متہم نہیں کیا۔

فائدہ عظیمہ

جب تقیہ کی بات بحث میں آہی گئی تو فرق اسلامیہ میں اسکے سلسلہ میں جو افراط و تفریط پائی جاتی ہے اسے بھی مختصرا بیان کر دینا مناسب معلوم ہوا۔

اگر تقیہ میں شیعوں کے ہاں حد درجہ افراط ہے تو اسکے مقابلہ میں خوارج کے ہاں بے انتہا تفریط۔ شیعوں کا افراط ان کی کتابوں میں دیکھا جاسکتا ہے کہ یہ معمولی اور بہت ہی معمولی خوف یا لالچ کے باعث اظہار و اقرار کفر بھی جائز سمجھتے ہیں۔ بلکہ واجب گردانتے ہیں۔ اور خوارج کی تفریط یہ ہے کہ وہ دین کے مقابلہ میں جان و ناموس کا بھی لحاظ نہیں کرتے۔ بلکہ وہ تو اپنے انتہا پسند مزاج کے باعث اس باب میں عجیب عجیب زیادتیوں سے کام لیتے ہیں۔ اس میں سے ایک یہ کہ اگر کوئی شخص نماز پڑھ رہا ہو اور کوئی چور یا غاصب آکر اسکا بہت سا مال و دولت لے جانا چاہے تب بھی اسکو نیت توڑنا حرام ہے۔ چنانچہ وہ حضرت بریدہ اسلمی صحابی رضی اللہ عنہ پر سب و شتم کرتے ہیں کہ وہ نماز میں اپنے گھوڑے پر نظر رکھتے تھے کہ بدک کر بھاگ نہ جائے۔

اسلئے مناسب ہوا کہ مذہب اہل سنت جو درمیانی درجہ ہے کو تحریر میں لے آئیں اہلسنت کی اکثر کتب میں اس کی وضاحت نہیں کی گئی۔ پہلی بات تو یہ کہ تقیہ ایک مشروع فعل ہے چنانچہ آیات ذیل اسکی دلیل ہیں۔

لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكَافِرِيْنَ اَوْلِيَاءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذَالِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللّٰهِ فِيْ شَيْءٍ اِلَّا اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰةً ۔

مومنوں کو یہ نہیں چاہیئے کہ وہ مومنوں کو نظر انداز کرکے کافروں کو دوست بنائیں اور جو ایسا کرے وہ اللہ کے نزدیک کسی شمار میں نہیں ہاں اگر ان سے کوئی آڑ لینی ہو تو اور بات ہے۔ یا فرمایا۔

اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّ بِالْاِيْمَانِ ۔

مگر وہ جو مجبور کر دیا جائے دراں حالیکہ اسکا دل ایمان پر جما ہوا ہو۔

ان کے علاوہ بھی اور بہت سی آیات ہیں

تقیہ کی تعریف یہ ہے کہ جان، مال، اور آبرو کو دشمن کے شر اور اسکی دست و برد سے بچائیں۔

دشمن دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جن سے دینی و ملی اختلاف کے سبب دشمنی ہو جیسے کافر مشرک

مرتد وغیرہ، دوسرا وہ جس سے کسی دنیاوی اغراض واسباب کے سبب دشمنی ہو۔ جیسے مال وجائیداد، اسباب وغیرہ، جب دشمنی دو طرح کی ہوئی تو لامحالہ تقیہ کی بھی دو قسمیں ہوں گی۔

پہلی قسم جس میں ازروئے شرع تقیہ کی صورت یہ ہوگی کہ جب مسلمان کسی ایسی جگہ گھر جائے جہاں کافروں کی وجہ سے دین ومذہب کو ظاہر نہ کر سکے تو اس پر ہجرت واجب ہو جاتی ہے وہ اس جگہ کو چھوڑ کر ایسی جگہ چلا جائے جہاں اسے اپنے دین مذہب کے اظہار کی آزادی اور پوری قوت میسر ہو۔ اسکے لیے یہ ہرگز جائز نہیں کہ اپنی کمزوری کیلیے کوئی جواز تلاش کرکے اپنے مذہب وطریقۂ اسلام کو چھپائے۔ اس پر قرآنی قطعی نصوص وارد ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

یٰعِبَادِیَ اِنَّ اَرْضِیْ وَاسِعَۃٌ فَاِیَّایَ فَاعْبُدُوْنِ ۔	میرے بندو میری زمین بڑی وسیع ہے۔ پوجا صرف

میری ہی کرو۔ یا ارشاد ہوا۔

اِنَّ الَّذِیْنَ تَوَفّٰھُمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ ظَالِمِیْٓ اَنْفُسِھِمْ قَالُوْا فِیْمَ کُنْتُمْ قَالُوْا کُنَّا مُسْتَضْعَفِیْنَ فِی الْاَرْضِ قَالُوْٓا اَلَمْ تَکُنْ اَرْضُ اللّٰہِ وَاسِعَۃً فَتُھَاجِرُوْا فِیْھَا فَاُولٰٓئِکَ مَاْوٰھُمْ جَھَنَّمُ وَسَآءَتْ مَصِیْرًا ۔	جن لوگوں نے اپنے آپ پر ظلم کیا ہوا ہوتا ہے فرشتے جب انکی روح قبض کرتے ہیں تو ان سے کہتے ہیں کہ تم کہاں پھنسے ہوئے تھے وہ کہیں گے کہ ہم زمین کے کمزور افراد تھے۔ فرشتے ان سے کہیں گے کیا اللہ کی

زمین کشادہ نہ تھی۔ تم وہاں ہجرت کیوں نہ کر گئے۔ ایسے ہی لوگوں کا ٹھکانہ جہنم ہے جو بہت برا ٹھکانہ ہے ہاں ترک ہجرت میں کوئی واقعی عذر ہو تو وہ قابل لحاظ ہوگا۔ مثلاً عورتیں، بچے، اندھے، لنگڑے، لولے، اپاہج، زیرحراست یا قیدی، یا انہیں کی مانند۔

مخالفین اگر خود اسکو یا اسکے ماں باپ بیوی بچوں کو قتل کرنے پر آمادہ ہوں اور گمان غالب ہو کہ وہ اپنا ارادہ قتل پورا کرکے رہیں گے۔ خواہ یہ قتل دانہ پانی بند کرنے یا جلاوطن کرنے یا کسی اور صورت سے ہو ایسی صورت میں بقدر ضرورت ان سے زبانی موافقت کی اجازت ہے۔ مگر ایسی حالت سے بچ نکلنے کی کوشش اور حیلہ جوئی واجب ہے۔

اور اگر یہ خیال ہو کہ کچھ مالی یا بدنی نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے جو قابل برداشت ہو، مثلاً قید وبند، یا غیر مہلک مار پیٹ، ایسی صورت میں مخالف کے ساتھ موافقت جائز نہیں۔ جواز کی صورت میں بھی موافقت رخصت ہے ورنہ اس وقت بھی عزیمت یہی ہے کہ دھڑلے سے اپنے مذہب کا اظہار کرے چاہے جان جاتی ہی رہے۔ (درحقیقت یہ شیعوں کے تقیہ سے بالکل ہی جدا ایک دوسری ہی کیفیت ہے۔ اسکو رخصت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ گو صورۃً تقیہ ہی معلوم ہوتی ہے۔ مگر حقیقت کے لحاظ سے آسمان وزمین کا فرق ہے)

اب ذرا شیعوں کی سہل انگاری اور زیادتی دیکھیے کہ معمولی سے مال وزر کی خاطر بلکہ مجلس میں کسی اعزاز واکرام کی امید میں بلکہ صرف زبانی طور پر خود کو قبلہ وصاحب کہلوانے اپنا دین وایمان تج کر مخالف کا کلمہ پڑھنے لگتے ہیں۔ اور ہجرت کو ہرگز واجب نہیں جانتے اور ان تمام قرآنی آیات کو نظر انداز کر دیتے ہیں جن میں ترک ہجرت پر کھلم کھلا عتاب فرمایا گیا ہے اور یہ کوئی پہلی مثال نہیں بلکہ انکا معاملہ تمام قرآن

www.Ahlehaq.Com

کے ساتھ ایسا ہی ہے۔ ان کی معتبر کتب میں یہ مذکور و مسطور ہے۔

مَنْ صَلّٰی خَلْفَ سُنِّیٍّ فَکَاَنَّمَا صَلّٰی خَلْفَ نَبِیٍّ۔ | جس نے سنی کے پیچھے نماز پڑھی اس نے گویا نبی کے پیچھے نماز پڑھی۔

مگر تھوڑے سے نان و آش کی خاطر دیکھ لیجیے اپنی نماز کس طرح خراب کرتے اور اس نماز کے مقابلہ میں دوسری نمازوں کے زیادہ ثواب کے امیدوار بنے رہتے ہیں۔

ایسی ہی باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ یہ فرقہ مذہبی اعتقادات میں کتنا بودا اور لاپرواہ اور حیلہ ساز واقع ہوا۔ غیرت اور شدت کی تو اسمیں بوباس تک نہیں انکسار اوڑھنا بچھونا، وہ تعصب اور اندھاپن ہے جو یہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم پر بدگوئی کرنے اور طعن و تشنیع میں صرف کرتے ہیں دینی مشقت برداشت کرنا ہرگز گوارا نہیں کرتے۔ دنیا کا حقیر ساز و سامان یہاں کی راحت و لذت ان کے نزدیک دین و آخرت کے بڑے منافع اور دیرپا نعمتوں سے بھی زیادہ عزیز تر اور اہم تر ہیں۔ یہ واضح اور صحیح طور پر اس آیت کے مصداق ہیں۔

اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ اشْتَرَوُا الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا بِالْاٰخِرَةِ فَلَا یُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ یُنْصَرُوْنَ۔ | یہی لوگ ہیں جنھوں نے دنیاوی زندگی کو آخرت کے داموں خریدا ہے۔ وہاں نہ ان کے عذاب میں تخفیف کی جائیگی نہ ہی ان کی مدد کی جائے گی۔

دنیا بھر کے عقلاء کا اس پر اتفاق ہے کہ محبت و بغض، تصدیق و تکذیب، اور اخلاص و نفاق کے دعوے کے جھوٹ سچ جانچنے اور پرکھنے کا طریقہ یہ ہے کہ تجربہ اور بلاؤ مصائب کے وقت منافع کے تلف ہو جانے، لذتوں کے ترک کرنے اور رنج و مشقت کے برداشت کرنے کے باوجود اپنے دعویٰ پر مصر اور ثابت قدم ہے تو ٹھیک ہے۔ ورنہ یوں تو ہر شخص مصلحت وقت کے موافق اپنے متعلق کوئی نہ کوئی دعوی رکھتا ہی ہے۔ اگر ان عام اور معمولی تکالیف سے بچنے کیلیے تقیہ لازم ہو جائے تو سچ جھوٹ میں تمیز کیسے ہو سکے گی۔ اگرچہ علم الہی میں دلوں کی پوشیدہ اور سینہ کی چھپی ہوئی باتیں روشن ہیں۔ اور اسکو امتحان کی حاجت بھی نہیں۔ لیکن دینی تکلیف کا مدار اور اوامر و نواہی پر عمل کا پتہ تو امتحان نا معاملات پر ہے۔ چنانچہ اس معاملہ کو صفائی سے ظاہر فرمایا۔

لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا۔ | تاکہ تمہیں پرکھے کہ بلحاظ اعمال کون اچھا ہے۔

یا فرمایا۔

وَلَنَبْلُوَنَّکُمْ حَتّٰی نَعْلَمَ الْمُجَاهِدِیْنَ مِنْکُمْ وَالصَّابِرِیْنَ۔ | ہم تم کو یقیناً آزمائیں گے تاکہ معلوم ہو جائے کہ تم میں سے مجاہدین اور صابرین کون ہیں۔

اور فرمایا

وَلَنَبْلُوَنَّکُمْ بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ۔ | البتہ ہم آزمائیں گے تمکو خوف و دہشت اور بھوک سے (دسا بقہ ڈال کر) اور مالوں جانوں اور پیداوار میں کمی ڈال کر۔

www.Ahlehaq.com

اب رہی دوسری قسم تو اس صورت میں ہجرت واجب ہونے اور نہ ہونے میں علماء کی آراء مختلف ہیں ایک گروہ اسے واجب کہتا ہے اور اس آیت کو بطور دلیل پیش کرتا ہے وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ (اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو) اور دوسری دلیل مال کے ضائع کرنے کی ممانعت سے دی ہے۔

دوسرا گروہ کہتا ہے کہ ہجرت واجب نہیں۔ کیونکہ ہاں سے ہجرت دنیاوی مصالح میں سے ایک مصلحت اور ملت کے اتحاد کے سبب ہجرت نہ کرنے سے اس کمزور و ضعیف شخص کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا کیونکہ اسکا غالب دشمن بحیثیت مسلمان اس سے کوئی سروکار نہیں رکھے گا۔

دونوں گروہوں کے مابین فیصلہ کن بات یہ ہے کہ اپنی جان یا عزیز و اقارب کی ہلاکت کا یا شدید بے عزتی کا خطرہ ہے تو یہاں سے بھی ہجرت واجب ہے۔ لیکن یہ ہجرت عبادت اور لائق ثواب نہیں کہ اس پر اسے ثواب بھی ملے اسکا وجوب محض اس شخص کی دنیاوی مصلحت کی بنا پر ہے

تحقیق کی بات یہ ہے کہ ہر واجب عبادت نہیں ہوتا بہت سے واجبات ہیں کہ ان پر کوئی ثواب نہیں مثلاً سخت بھوک کے وقت کھانا، مرض میں یقینی اور ظنی نقصانات سے بچنا صحت کی حالت میں سمیات سے پرہیز کرنا وغیرہ وغیرہ۔

یہ ہجرت بھی اسی قسم کی ہے۔ یہ ہجرت الی اللہ و رسولہ نہیں ہے کہ ثواب آخرت کا سبب بنے۔ تقیہ سے متعلق اس مفید بحث کے بعد اب ہم اصل معاملہ کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

اہل سنت کہتے ہیں کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ نے خلفاء ثلاثہ رضوان اللہ علیہم کے عہد مبارک میں ہرگز تقیہ نہیں کیا۔ پسندیدہ دین کے اظہار پر آپ کو قدرت تھی۔ دین و دنیا کے کسی معاملہ میں آپ کسی سے خائف نہیں تھے۔ امر دین میں خائف نہ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ آپ نے ہجرت نہیں فرمائی اگر آپ خائف ہوتے تو آپ پر بموجب آیت قرآنی اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفّٰهُمُ الخ کے۔ اور دنیاوی امور میں خائف نہ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ مال و جان کے بارے میں آپ سے نہ کوئی لڑا جھگڑا نہ الجھا اور نہ سخت کلامی سے پیش آیا اسکے برعکس سب کبھی و مہ آپ کی نہایت تعظیم و توقیر کرتے۔ اور محبت سے پیش آتے تھے اور آپ کا برتاؤ بھی سب کے ساتھ علی قدر مراتب تھا۔ چنانچہ تاریخ اس پر گواہ ہے۔

رہا شیعوں کا مذہب تو وہ پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ ان کے محققین تو آپ کی خود اپنی خلافت میں بھی تقیہ کو واجب بتاتے ہیں چہ جائیکہ خلفائے ثلاثہ رضی اللہ عنہم کے زمانہ میں۔ یہاں قاضی نور اللہ شوستری نے بڑی پوچ اور گزشتہ قسم کی بات کہی ہے وہ کہتا ہے کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ سے لڑائی کا نہ ہونا (یعنی عہد خلفاء ثلاثہ میں) ایسا ہے جیسا کہ ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا قبل ہجرت مقاتلہ نہ کرنا یا اکثر انبیاء کا مقاتلہ نہ کرنا۔

یہاں قاضی صاحب کو ہجرت کے لفظ سے دھوکا لگا ہے اگر جناب امیر رضی اللہ عنہ کا حال نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے قبل ہجرت حال کی طرح ہے تو پھر ان کا حال حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے ہجرت کے وقت یا ہجرت کے بعد کے حال کے مطابق کیوں نہ ہو حالانکہ جناب امیر رضی اللہ عنہ نے ہجرت کا ارادہ ہی نہیں فرمایا یہ بات

www.Ahlehaq.Com

بالاجماع ثابت ہے اس سے انکار وفرار ممکن ہی نہیں۔
خدا اور رسول کے متعلق ہلکی بات یا بغیر سوچے سمجھے کوئی کلمہ منہ سے نہیں نکالنا چاہئے۔ اور پھر قبل ہجرت ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا یہ حال تھا کہ وہ ابوجہل، اور امیہ بن خلف کے ساتھ مل کر نعوذ باللہ لات ومنات کو پوجتے تھے یا دوسرے رسوم جاہلیت اور ذبح لغیر اللہ میں ان کے شریک عمل تھے یا ان کی مدح وثنا اپنا ورد بنایا ہوا تھا۔ یا ان کے ساتھ ہم پیالہ وہم نوالہ رہتے تھے۔ یا احکام میں ان کی پیروی کرتے یا یہ کہ ہر وقت وہمیشہ باہم مقابلہ گفت وشنید اور مارپیٹ رہتی تھی۔
آپ تو ان کی عادات اور رسوم کی برائی اور ہجو برملا کرتے۔ لوگوں کو بر سر میدان علی الاعلان دین حق کی طرف بلاتے اور سختیاں برداشت کرتے۔ حتی کہ بعد ہجرت کے انصار ومددگار پیدا ہوئے تو زبانی دعوت سے گذر کر نوبت تلوار وتفنگ تک پہنچی۔ تو گویا وہاں تو مراتب اظہار میں ترقی تھی تقیہ اور پوشیدگی کا وہاں کیا سوال۔ یہی حال انبیاء سابقین علیہم السلام کا تھا ہاں جب اور جن انبیاء کرام پر جہاد بالسیف واجب نہ تھا بلکہ اسکا تعلق امراء وملوک سے تھا اور جو انبیاء کے زیر فرمان تھے اس لیے وہ خود جنگ وجدال اور جمع لشکر میں مشغول نہ ہوتے تھے۔ اور جب ہمارے پیغمبر صلے اللہ علیہ وسلم مامور بجہاد ہوئے (اور یہ جہاد تاقیام قیامت جاری قرار بھی دیا گیا) تو یہ ضروری قرار پایا کہ آپکے خلفاء ہی نہیں آپ کی ساری امت بھی مامور بجہاد ہو۔
اب اگر کوئی شخص انبیاء سابقین کی سنت جہاد کو ترک کرے اور اس ترک کو لازم قرار دے لے تو بلاشبہ کافر ہو جاتے۔ اور کبھی ایسا نہ ہوا نہ ہوگا کہ بغاوت اور کفر کے ظہور کے بعد ہمارے پیغمبر صلے اللہ علیہ وسلم کے نائب یا خلیفہ سے وجوب جہاد ساقط ہو جائے۔
لہذا جناب امیر رضی اللہ عنہ کے حال کو انبیاء سابقین کے حال پر قیاس کرنا ایسا ہے جیسے کوئی یہ کہے کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ کیلئے نماز میں بیت المقدس کی طرف منہ کرنا فرض تھا نہ کہ کعبہ مکرمہ کی طرف۔ اور آیت استقبال قبلہ سے پیشتر آپ کا حال بھی وہی تھا جو انبیاء سابقین اور خود ہمارے رسول مقبول صلے اللہ علیہ وسلم کا یہی حال تمام احکام شرعیہ میں تھا۔ ایسی مجنونانہ بڑ لگانے والے کو عقلاء کی فہرست سے خارج کر دینا چاہئے آیت جہاد کے نزول سے پہلے اگر حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو اسکے نزول کا انتظار تھا اور آپ ترک قتال فرمائے ہوئے تھے۔ تو جناب امیر رضی اللہ عنہ کو کس بات کا انتظار تھا۔ قرآن میں تو امت محمدیہ پر جہاد وقتال واجب ہو چکا تھا۔ پھر اولوالامر جو پیغمبر علیہ السلام کے نائب ہیں اور جنکے تقرر سے غرض محض یہ ہے کہ جہاد کریں۔ دین کا اعلان کریں اور ظالم سے مظلوم کا حق دلائیں۔ کس بات کا انتظار کرتے رہے اور کیوں ، جہاد ، نہیں کیا۔ یہ ہے مبلغ علم ان کے علماء کا اور حال ان کے محققین کی بے سروپا بکواس کا عوام کا تو کہنا ہی کیا۔
اب تقیہ سے متعلق اہلسنت کے خیالات بھی گوش گذار کر لیجئے۔
اہل تاریخ کا اس پر اجماع ہے کہ جب حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو یہ پیغام پہنچا کہ آپ اگر یزید کی بیعت کر لو اور اسے امام برحق تسلیم کر لو تو ہم تم سے کوئی تعرض نہ کریں گے۔ جہاں رہنا منظور ہو بخوشی رہو بار بار یہ پیشکش ہوئی مگر جب آپ نے یزید کو اپنے رویہ پر ڈٹا پایا اور اسے قابل امامت نہ سمجھا تو آپ نے کھلم کھلا اس کی بیعت

سے انکار کر دیا اور ہرگز کوئی تقیہ نہ فرمایا اور پھر پیش آیا جو پیش آنا تھا۔
لہٰذا اگر تقیہ واجب ہوتا تو اسکے اس سے زیادہ سازگار حالات اور کیا ہو سکتے تھے۔ کہ دشمنوں کا خوف بے انتہا تھا۔ ستر نفر مار ڈالے جانے کیلیے تیس ہزار لشکریوں میں محصور ہو چکے تھے قتل و بے عزتی اور بے آبروئی یقینی ہو چکی تھی۔ ایسے عالم میں آپ کے ثبات نے یہ بتا دیا کہ وجوب تو بڑی بات ہے آپ رحمۃ اللہ علیہ تقیہ کے جواز کے بھی قائل نہ تھے۔
ایک دوسری بات۔ تاریخ گواہ ہے کہ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد جناب امیر رضی اللہ عنہ کی دو حالتیں تھیں اول یہ کہ عہد شیخین اور زمانہ ذی النورین رضی اللہ عنہم میں آپ نے بیعت خلافت کی کسی سے کوئی تعارض نہ فرمایا نماز، روزہ، حج، مشورہ، تدابیر امور مہمہ میں انکے ساتھ شریک و دخیل رہے۔ اور خلاء ملا برابر رہا۔
دوسری حالت یہ کہ جناب ذی النورین رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد لوگوں سے بیعت، جناب امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے کئی بار مقابلہ کیا اگرچہ آپ کے ساتھی کم تھے چنانچہ قاضی نور اللہ نے مجالس المؤمنین میں لکھا ہے کہ قریش میں سے صرف پانچ نفر آپ کے ساتھ تھے جبکہ تیرہ قبیلے امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھے اس لیے آپ کو فتح نصیب نہ ہوئی اور آپ دفع شر نہ فرما سکے تو لا محالہ پہلی صورت میں بھی خلفاء ثلاثہ رضوان اللہ علیہم سے آپ کی موافقت تقیہ و بے چارگی کی بنا پر نہ تھی ورنہ یہاں بھی تقیہ فرماتے۔
ایک اور بات یہ کہ شیعوں کی ایک معتبر کتاب بحر المناقب میں مناقب اخطب سے نقل کرتے ہیں کہ اس نے محمد بن خالد سے روایت کی۔

خَطَبَہُمْ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ فَقَالَ لَوْ صَرَفْنَاکُمْ عَمَّا تَعْرِفُوْنَ اِلٰی مَا تُنْکِرُوْنَ مَا کُنْتُمْ صَانِعِیْنَ قَالَ فَسَکَتُوْا قَالَ قَالَ ذَالِکَ ثَلٰثًا فَقَامَ عَلِیٌّ فَقَالَ اِذًا کُنَّا نَسْتَتِیْبُکَ فَاِنْ تُبْتَ قَبِلْنَاکَ قَالَ وَاِنْ لَّمْ قَالَ اِذًا نَضْرِبُ الَّذِیْ فِیْہِ عَیْنَاکَ فَقَالَ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ جَعَلَ فِیْ ھٰذِہِ الْاُمَّۃِ مَنْ اِذَا اعْوَجَجْنَا اَقَامَنَا۔

جناب عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے ان کو خطبہ دیا اور فرمایا کہ اگر میں تم کو جانی پہچانی راہ سے اجنبی راہ کی طرف پھیر دوں تو تم کیا کرو گے۔ راوی کے مطابق سب چپ رہے۔ آپ نے تین مرتبہ اسے دھرایا۔ تو جناب علی رضی اللہ عنہ اٹھ کھڑے ہوئے اور فرمایا اس وقت ہم تم سے توبہ کا مطالبہ کریں گے۔ اگر توبہ کر لو گے تو ہمارے لیے قابل قبول رہو گے۔ عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا اگر میں ایسا نہ کروں ؟
کہا اس وقت ہم تمہارا سر قلم کر دیں گے جسمیں تمہاری آنکھیں ہیں جناب عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا خدا کا شکر ہے کہ اس امت میں وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ٹیڑھے راستہ پر چل نکلیں تو وہ ہم کو سیدھا کر دیں۔
اس روایت سے صاف معلوم ہو گیا کہ جناب مرتضیٰ علی رضی اللہ عنہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں کسقدر پختگی سے قائم تھے، اور ممنوعات شرعیہ میں سستی نہ کرتے اور ان سے انکار کرنے کی قدرت رکھنے میں آپ کا مرتبہ کس قدر بلند و رفیع تھا اور جب یہ حال ہو اور معاملہ کی نوعیت ایسی ہو تو تقیہ کی وہاں کوئی گنجائش نہیں رہتی۔
پھر قاضی نور اللہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا ذکر کرتے ہوئے رقمطراز ہے کہ آپ بھی ان میں سے ہیں جو اعراف میں ہونگے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم آپ کو بہت عزیز اور دوست رکھتے تھے اور فرماتے تھے کہ عباس میرے والد کی

جگہ ہیں۔ غرض آپ کے فضائل اتنی تفصیل سے بیان کیے کہ اس مختصر میں اسکی سمائی بھی مشکل ہے اسکے بعد یہ لکھا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے کہنے پر آپ نے جناب ام کلثوم رضی اللہ عنہا کا حضرت علی رضی اللہ عنہ سے رشتہ مانگا۔ آپ نے پہلی بار انکار کیا دوسری بار سکوت فرمایا۔ اسکے بعد خود جناب عباس رضی اللہ عنہ نے متولی نکاح بنکر حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا کا نکاح حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے باندھ دیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ بوجہ تقیہ اس سے نہ روک سکے اور اسی لیے سکوت فرمایا۔ ہر عقلمند بلا ادنیٰ تامل کے یہ جان لے گا کہ اتنے فضائل رکھنے والی ہستی کے متعلق یہ خیال بھی نہیں کیا جا سکتا کہ اس قسم کے ظالم کے ظلم میں آپ نے اعانت کی ہو۔

ھفوہ (۲) :- یہ کہ شیخین رضی اللہ عنہما اہل نفاق میں سے تھے حالانکہ ان کی قوت ایمانی بطریق تواتر ثابت ہے حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے ایمان کو اپنے ساتھ شمار فرمایا ہے۔ کلینی سے باب الامت میں درجات ایمان سے متعلق جو حدیث روایت کی گئی ہے اسمیں تصریح ہے کہ مہاجرین اولین کے ایمان کو تمام امتیوں کے ایمان پر بدرجہا ترجیح ہے۔ پھر جناب کی جو نص نہج البلاغہ میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی شان میں مذکور ہے وہ بھی آپ کے کمال ایمان پر شاہد و دال ہے۔ اور جناب محمد باقر اور دوسرے ائمہ رحمہم اللہ کا آپ کو صدیق کے لقب سے ملقب کرنا اس ہفوہ کی ریڑھ ہی مار دیتا ہے۔

ھفوہ (۳) :- یہ کہ شیخین اصحاب العقبہ میں سے تھے۔ یعنی وہ بارہ منافق جنہوں نے غزوۂ تبوک سے واپسی پر اثنار راہ آپ صلے اللہ علیہ وسلم کو تنہا پاکر قتل کرنا چاہا تھا۔ عمار بن یاسر اور حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہما اس سازش سے آگاہ ہوگئے اور بروقت مداخلت کر کے ان کی سازش ناکام بنادی۔

یہ ہفوہ تواتر اور بداہت کے صاف خلاف ہے۔ اس لیے کہ ان دونوں حضرات کی صاحبزادیاں حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی زوجیت میں تھیں۔ ان کو اس قسم کے کام کے وہاں زیادہ مواقع حاصل تھے۔ پھر ان حضرات کا خانہ نبوت میں آنا جانا، آپ سے خلوت وجلوت میں ملاقات و یکجائی اتنی مشہور و معروف ہے کہ ضرب المثل ہو گئی ہے۔ اس قسم کے رازدانوں اور جلوت و خلوت کے ساتھیوں کو فرصت و تنہائی کے وقت کی تلاش کی بھلا کیا ضرورت۔ رفیق غار، اور صاحب عریش (بموقعہ جنگ بدر) کو اس کام کی تکمیل کیلیے ان سے اچھے مواقع کب مل سکتے تھے۔ خلاصہ کلام یہ کہ جس کی نظر کتب سیر پر ہو اور آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شیخین کی صحبت یا ان حضرات سے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی الفت و موانست، شفقت و موانست و حمایت معلوم ہو وہ ان حضرات کی نسبت اس قسم کے احتمال کو ہرگز جائز نہیں رکھے گا۔ ان حضرات کے متعلق ایسا احتمال کرنا بالکل ایسا ہی ہے جیسا کوئی جناب امیر رضی اللہ عنہ کے متعلق ایسا احتمال رکھے۔ ان دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ پھر ان شیعوں ہی کی تفاسیر سے یہ ثابت ہے کہ یہ آیت اصحاب العقبہ ہی کی شان میں نازل ہوئی۔

يَحْلِفُونَ بِاللّٰهِ مَا قَالُوا وَلَقَدْ قَالُوا كَلِمَةَ الْكُفْرِ وَكَفَرُوا بَعْدَ إِسْلَامِهِمْ وَهَمُّوا بِمَا لَمْ يَنَالُوا۔	اللہ کی قسم کھاتے ہیں کہ انہوں نے نہیں کہا حالانکہ انہوں نے کفر کا کلمہ کہا۔ اور اسلام لاکر پھر کافر ہوئے۔ اور جو چاہا تھا وہ نہیں پایا۔

اس آیت سے بات صاف طور پر معلوم ہوئی کہ اصحاب عقبہ کا حال دو صورتوں سے خالی نہیں یا تو توبہ کریں اور عذاب نفاق سے نجات پالیں، یا گناہ پر اصرار کریں تو اس صورت میں دنیا و آخرت میں عذاب کے سزاوار ٹھہریں اور

ان کا کوئی معین و مددگار نہ ہو اور شیعہ اس پر متفق ہیں کہ جناب ابوبکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ نے اس نفاق سے توبہ نہیں کی۔ تو آیت کی رو سے ان کو عذاب الیم دنیا میں پہنچنا چاہیئے اور ان کو کوئی حامی و ناصر بھی میسر نہ ہونا چاہیئے۔ مگر ان کی پوری زندگی آئینہ کی مانند سامنے ہے۔ انہیں کوئی عذاب نہیں پہنچا رہا حمایت و نصرت کا معاملہ تو ان حضرات کو جو حمایت و نصرت میسر رہی اس سے کوئی شیعوں کی طرح اندھا ہی انکار کر سکتا ہے اور تاریخ کو جھٹلا سکتا ہے۔
اب ایک طرف کتاب اللہ ہے دوسری طرف شیعہ۔

پوری امت اس پر متفق ہے کہ کتاب اللہ میں جھوٹ کو مطلق دخل نہیں اسکے اندر تو جھوٹ کیا ہوتا کوئی باہر سے بھی اس میں جھوٹ داخل نہیں کر سکتا۔ دوسری امت مسلمہ اس پر بھی متفق ہے کہ شیعہ جھوٹ بولنے، جھوٹ گھڑنے، اور جھوٹ منسوب کرنے میں عالمگیر شہرت کے مالک ہیں۔ لہذا معلوم ہوا کہ یہاں بھی شیعوں نے جھوٹ بولا۔ حضرات شیخین رضی اللہ عنہما اصحاب عقبہ میں سے نہیں ہیں۔

ھفوہ (۴): یہ کہ امام کے محض وجود کو لطف قرار دیتے اور کہتے ہیں کہ اللہ تعالے نے امام مقرر فرما کر لطف کا حق ادا فرما دیا۔ اب اسکو ظاہر کر کے تسلط اور غلبہ دینا یہ لطف کیلیے بالکل ضروری نہیں۔ یہ اتنی کچی بات ہے کہ اس پر ہوشمند تو کیا مکتب کے بچے بھی یقین کرنے کو تیار نہ ہوں گے۔ ذرا کسی مدرسہ کے لڑکوں کو کہئے کہ تمہارے لیے ایک ایسے استاد کا انتظام کیا گیا ہے۔ جسکو نہ تم دیکھ سکتے ہو نہ اس کی آواز سن سکتے ہو اور نہ ہی وہ تم کو دیکھ سکتا ہے نہ ہی تمہاری آواز سن سکتا ہے پھر جو رد عمل ہو گا آپ کو پتہ ہی چل جائے گا۔

ھفوہ (۵): حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اوصاف خدائی سے متصف کرتے اور کہتے ہیں کہ آپ اعراض اَیْنَ و مَتیٰ سے پاک ہیں۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ آپ کو بشر نہیں کہنا چاہیئے۔ یہ امور بداہت عقلی کے صاف و صریح خلاف اور اسکو جھٹلانے والے ہیں۔ کسی شیعی شاعر کا ایک شعر ہے۔

يَجِلُّ عَنِ الْاَعْرَاضِ وَالْاَيْنِ وَالْمَتٰى ٭ وَيَكْبُرُ عَنْ تَشْبِيْهِهٖ بِالْعَنَاصِرِ

(وہ اعراض، اور این و متی سے برتر ہیں اور وہ اس سے بھی بالاتر ہیں کہ ان کو عناصر سے تشبیہ دی جائے)
ایک دوسرا شاعر دوسرے خیال کو یوں نظم کرتا ہے۔

اَهْلُ النُّهٰى عَجَزُوْا عَنْ وَصْفِ حَيْدَرَةٍ ٭ وَالْعَاشِقُوْنَ بِمَعْنٰى حُبِّهٖ تَاهُوْا
اِنْ اَدْعُهٗ بَشَرًا فَالْعَقْلُ يَمْنَعُنِيْ ٭ وَاَخْتَشِيَ اللّٰهَ فِيْ قَوْلِيْ هُوَ اللّٰهُ

(اہل عقل حیدر کی تعریف سے عاجز رہ گئے اور عاشق ان کی محبت میں حیران ہیں)
(اگر ان کو بشر کہوں تو مجھے عقل روکتی ہے۔ اگر ان کو اللہ کہوں تو اللہ سے ڈرتا ہوں)
یہ خیال و عقیدہ غالی شیعوں کے عقائد سے قریب اور کفر و زندیقیت کے سوا کچھ نہیں۔

ھفوہ (۶): یہ ہے کہ اللہ تعالی نے تمام انبیاء و رسل علیہم السلام کو جناب علی رضی اللہ عنہ کی ولایت کی پاسداری کے لیے بھیجا تھا۔ وہ در پردہ تمام انبیاء کے ساتھ تھے اور ظاہراً حضور ختمی مرتبت صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اور جو اس بات کا انکار کرے انکے مذہب میں اسے کافر کہا جاتا ہے یہ بات ابن طاؤس اور دوسروں نے اپنی کتابوں میں ذکر کی ہے۔

www.Ahlehaq.com

ابن المعلم نے جناب محمد ابن الحنفیہ رضی اللہ عنہ سے یہ بھی روایت کی ہے کہ لَوْلَا عَلِیٌّ لَمْ یُخْلَقِ الْاَنْبِیَاءُ (علی اگر نہ ہوتے تو انبیاء پیدا نہ کئے جاتے) یہ بھی ان کا کہنا ہے کہ قیامت کے دن علی (رضی اللہ عنہ) کا درجہ سارے انبیاء اور رسولوں سے بلند ہوگا۔ تمام انبیاء اور رسول محبت علی اور آپ کی شیعیت بطور دین مانے ہوئے تھے۔ اور اسکی آرزو رکھتے تھے کہ ان کا حشر بحیثیت شیعہ علی ہو حتی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی اسکے آرزومند تھے یہ بات ابن طاؤس نے ذکر کی ہے۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ علی (رضی اللہ عنہ) کا حق خدا تعالےٰ پر ثابت ہے۔ یہ تمام ہفوات اور بکواس ساری آسمانی شرائع اور نصوص قرآنیہ کی تکذیب کرنے والے اور کفر و زندیقیت کی اصل و بنیاد ہیں۔

ھفوۃ (۷): یہ کہ قرآن مجید کی تحریف کرتے ہیں اور سیاق و سباق کے خلاف اسکو خلاف مراد معنی پر محمول کرتے ہیں حتی کہ جاہل نا عاقل اسکو نشانہ مذاق بناتا ہے۔ اس فرقہ کی تمام تفاسیر اسی قماش کی ہیں۔

بطور نمونہ چند مثالیں درج ذیل ہیں۔

(۱) صِرَاطَ مُسْتَقِیْمَ۔ کے متعلق کہتے ہیں اس سے حب علی۔ مراد ہے

(۲) اَلَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ۔ سے مراد علی و اولاد علی (رضی اللہ عنہم) ہیں۔

یہ دونوں تفسیریں نہ صرف یہ کہ نظم قرآن سے کوئی ربط نہیں رکھتیں باہم بھی ایک دوسرے کی تکذیب کرتی ہیں۔

(۳) وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰہِ۔ سے مراد عشرہ مبشرہ (رضوان اللہ علیہم) کے لوگ ہیں۔

(۴) جہاں کہیں لفظ ربک کا آیا ہے وہاں علی مراد ہیں حتی کہ آیت اِنَّھُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّھِمْ وَاَنَّھُمْ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ میں بھی گویا علی رضی اللہ عنہ کو روز جزا کا مالک بھی قرار دیتے ہیں یہ پہلے بھی باب مکائد میں بیان ہو چکا ہے۔ عنقریب پھر بیان ہوگا۔

(۵) وَکَانَ الْکَافِرُ عَلٰی رَبِّہٖ ظَھِیْرًا۔ (یعنی کافر اپنے پروردگار پر دلیر ہے) کی تفسیر ای فی اخذ الخلافۃ (یعنی خلافت لینے میں) کرتے ہیں حالانکہ یہاں کافر سے مراد بت پرست ہیں اس سے پہلے کی عبارت اسکی دلیل ہے۔ فرمایا وَیَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ مَالَا یَنْفَعُھُمْ وَلَا یَضُرُّھُمْ (اور اللہ کے سوا ایسی ہستیوں کی پوجا کرتے ہیں جو نہ ان کو فائدہ پہنچا سکتی ہیں نہ نقصان)

(۶) یہ بھی کہتے ہیں کہ لَئِنْ اَشْرَکْتَ لَیَحْبَطَنَّ عَمَلُکَ سے مراد شَرِکْتَ فِی الْخِلَافَۃِ مَعَ عَلِیٍّ غَیْرَہٗ ہے۔ (یعنی تم خلافت میں علی کے غیر کو شریک کرتے ہو اس لیے تمہارے اعمال حبط و ضائع ہو جائیں گے) لیکن انکو اتنا معلوم نہیں کہ اس آیت کا کچھ اول بھی ہے وَلَقَدْ اُوْحِیَ اِلَیْکَ وَاِلَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکَ (آپ کی طرف اور جو آپ سے قبل گذرے وحی بھیجی گئی۔ کہ اگر تم نے شرک کیا تو تمہارے اعمال ضائع و بے کار جائینگے) اس میں خلافت علی میں غیر کی شرکت کہاں گھس آئی کہ اس سے نہی ہو۔ اور اگر نہی تھی ہی تو پھر دوسروں کو خلیفہ کیوں کیا۔ اور اگر صرف ہمارے پیغمبر صلے اللہ علیہ وسلم کا حال تمام انبیاء علیہم السلام کو بذریعہ وحی پہنچا تھا تو اس منادی کی کیا ضرورت تھی۔ پھر آیت کا سیاق بَلِ اللّٰہَ فَاعْبُدْ وَکُنْ مِّنَ الشّٰکِرِیْنَ ہے اور سباق قُلْ اَفَغَیْرَ اللّٰہِ تَاْمُرُوْنِّیْٓ اَعْبُدُ اَیُّھَا الْجٰھِلُوْنَ اور یہ سیاق و سباق کی دونوں آیات صاف بتا رہی ہیں کہ شرک سے مراد غیر اللہ کی عبادت ہے اور یہ قاعدہ و اصول شیعوں کے ہاں بھی طے کردہ و تسلیم شدہ ہے کہ شارع کے کلام میں جب کوئی لفظ آئے تو شرعی معنی پر

محمول ہوگا۔ لغوی معنی پر نہیں ہوگا خصوصاً جبکہ لغوی معنی ضمیر کا بھی محتاج ہو جس کا کوئی قرینہ موجود نہ ہو۔

(۷) یہ بھی کہتے ہیں کہ آیت وَنَجْعَلُ لَكُمَا سُلْطٰنًا فَلَا يَصِلُوْنَ اِلَيْكُمَا بِاٰيٰتِنَا اَنْتُمَا وَمَنِ اتَّبَعَكُمَا الْغٰلِبُوْنَ میں سلطان سے مراد جناب علی رضی اللہ عنہ کی صورت ہے یعنی جب فرعون حضرت موسیٰ و حضرت ہارون علیہما السلام کو کوئی اذیت پہنچانا چاہتا فوراً اسے علیؓ کی صورت دکھا دی جاتی وہ سہم کر رہ جاتا۔ حالانکہ قرآن مجید میں غلبہ کو آیات سے تعبیر فرمایا گیا ہے اور آیات جمع کا صیغہ ہے کم از کم دو آیات تو ہونی چاہئیں اور صورت علی تو ایک ہی آیت ہوگی (اگر ہوئی بھی تو) پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی آیات کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں جہاں کہیں ان کا قصہ بیان فرمایا ہے دس معجزات پر اکتفا فرمایا ہے۔ عصا، اور ید بیضا جیسا سورۂ طٰہٰ میں مذکور ہے تو آسان نشانی کا ذکر اور اتنی بڑی نشانی کو نشانیوں کے شمار میں نظر انداز کر دینا شان بلاغت کے خلاف ہے۔

اور پھر یہ کیا بات ہوئی کہ فرعون تو صرف آپ کی تصویر سے سہم اور ڈر جاتا تھا مگر جناب ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما پر آپؓ کے جیتے جاگتے جسم حقیقی نے اتنا بھی اثر نہ کیا کہ اسکے دیکھنے سے ان کے مزاج میں کچھ نرمی ہی آجاتی۔

(۸) یہ کہتے ہیں کہ يٰۤاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ الایہ میں رب سے مراد علیؓ ہیں۔

(۹) یہ قائل ہیں کہ لَا يُسْئَلُ عَنْ ذَنْۢبِهٖۤ اِنْسٌ وَّلَا جَآنٌّ میں انس و جن سے علی کے شیعہ مراد ہیں کیونکہ ان سے کسی گناہ کے بارے میں سوال نہیں ہوگا علی کی ولایت انکے گناہوں کو نیکیوں سے بدل دیگی اور جب گناہ رہے ہی نہیں تو سوال کس بات کا ہوگا ابن بابویہ، ابن طاؤس اور دوسروں نے اسکو بیان کیا ہے۔ مگر یہ عالم و فاضل ایک تو یہ بات نہیں سمجھ پائے کہ سیاق نفی میں انس و جان نکرہ ہے اور وہ عام الفاظ میں سے ہیں ان سے شیعان علی کی تخصیص کے کوئی بنیاد اور وجہ نہیں دوسرے یہ کہ کیا شیعہ واقعی یہ سمجھتے ہیں کہ اگر وہ اپنی محرمات سے زنا اور اپنے لخت جگر یا شریک دودھ سے اغلام بازی کرے۔ نیز ساری زندگی شراب نوشی خنزیر خوری اور سود کاری جھوٹ و غیبت میں گذارنے کے باوجود پرسش سے نہ صرف محفوظ رہیں گے بلکہ یہ اعمال بد ان کے لیے نماز روزہ و دیگر عبادات و اعمال صالحہ کی طرح موجب اجر و ثواب بھی ہوں گے اگر وہ ایسا ہی خیال کرتے ہیں تو یہ تو اباحیوں اور زندیقیوں کا مذہب ہوا۔ بلکہ ان سے بھی دو قدم آگے۔ کیونکہ وہ لوگ ان امور کو مباح خیال کر کے ان کے ارتکاب پر عذاب کا خوف نہیں رکھتے۔ اور یہ شیعہ تو عذاب کے خوف سے ہی مامون نہیں بلکہ ان خباثتوں اور نجاستوں اور بداعمالیوں پر اجر و ثواب کی امید رکھتے اور ان بدکاریوں کو عبادت جانتے ہیں۔

(۱۰) یہ بھی کہتے ہیں کہ قرآن مجید میں جہاں کہیں صبر کا حکم اور صابرین کی تعریف بیان ہوئی ہے۔ ان سب سے مراد، شیعہ اور انکا وہ صبر مراد ہے جو یہ جناب مہدی کے آنے تک مخالفین کے ہاتھوں تکلیفیں اور مصائب اٹھائیں گے ان مذکورہ تفاسیر سے اگر کوئی شیعہ انکار کرے تو اسے یہ تمام تفسیریں شیعوں کی اصح الکتب کلینی میں موجود ملیں گے وہاں وہ دیکھ سکتا ہے اسکے علاوہ ان کو تفسیر علی بن ابراہیم۔ اور تفسیر ابن بابویہ جسکو یہ جناب حسن عسکری رحمۃ اللہ علیہ کی طرف منسوب کرتا ہے نیز شریف مرتضیٰ کی کتاب تنزیہہ الانبیاء والائمہ کے مطالعہ کی اگر توفیق مل جائے تو وہاں یہ سارے حوالے ان کو موجود ملیں گے۔

هفوه (۸) یہ کہ روز جزا کے مالک و حاکم حضور صلے اللہ علیہ وسلم اور جناب علیؓ ہوں گے اس خیال خام کی تردید

قرآن مجید میں جا بجا ملتی ہے مَالِكِ يَوْمِ الدِّينِ ۔ لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ۔ وغیرہ وغیرہ اسکی مثالیں ہیں ۔ اگر یہ حضرات حاکم ہوں تو شفاعت بے معنی ہو جائیگی امت کو پھر خوف و خطر کیوں ہوگا اور یہ حضرات خود ان کو کیوں ڈرائیں گے ایک بات لائق توجہ یہ بھی ہے کہ ان شیعوں کے نزدیک حساب کتاب، وزن اعمال، سوال وغیرہ جو روز قیامت کی ہولناکیاں ہیں شیعوں کو تو ان سے سابقہ پیش ہی نہیں آئے گا یہ سب تو غیر شیعوں کیلیے مخصوص ہیں ۔ وہ تو برملا کہتے ہیں کہ علی کو دوست رکھنے والا خواہ یہودی ہو خواہ نصرانی یا ہندو مشرک دوزخ میں نہیں جائیگا ۔

علل الشرائع ابن بابویہ کی ایک کتاب ہے اس نے اسمیں یہی بات لکھی ہے ۔ اس نے اس روایت کو بحوالہ مفضل بن عمر جناب ابی عبداللہ رحمۃ اللہ علیہ سے منسوب کیا ہے معانی الاخبار میں بھی یہ روایت موجود ہے اور شیعہ اعتقادًا اس مسئلہ کو متواتر سمجھتے ہیں اس صورت میں حب علی کے مقابلہ میں نہ خدا و رسول پر ایمان کی کوئی حیثیت ہے نہ تمام عقائد اور تکلیفات کی ضرورت اور تمام حدود اور ساری تعزیرات ساقط اور الفظ ہو جاتے اور امور شریعت میں کوئی شرعی امر ضروری نہیں رہتا ۔

یہ ہفوہ بے شمار فسادات کی بنیاد اور اصل ہے ۔ ایسے ہفوات پر اعتقاد رکھنے کے بعد تو اثنا عشریوں کو چاہیئے کہ اپنے مذہب کو حمیریہ معمریہ کہا کریں ۔ کہ اعتقادات کی ہمرنگی کا یہی تقاضہ ہے ۔

ہفوہ (۹) :۔ کہتے ہیں کہ جناب عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حیلوں بہانوں سے کام لے کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو قتل کرنا چاہا ۔ چنانچہ علی بن مظاہر واسطی نے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے ایک روایت بھی بیان کر ڈالی ہے حالانکہ جناب فاروق اعظم کا حضرت علی رضی اللہ عنہما کے ساتھ خصوصی لگاؤ دلی محبت عزت و احترام اور توقیر سسرال ہو جانے پر فخر عطایا کے رجسٹر میں آپ کی حضرات حسنین رضی اللہ عنہما کی فضیلت اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فضائل کی روایات خود ان شیعوں کے ہاں بتواتر ثابت ہیں اور نہج البلاغہ کے شارحوں نے جو اکثر شیعہ ہیں ان سب کو اپنے شرحوں میں لکھا ہے ۔

اور شریف مرتضیٰ (شیعی) کی کتاب تنزیہ الانبیاء والائمہ ، میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی تعریف ان الفاظ میں موجود ہے ۔

اِنَّ عُمَرَ كَانَ مُظْهِرًا لِلْاِسْلَامِ وَالْمُتَمَسِّكَ بِشَرَائِعِهٖ كلها ۔	بے شک عمر اسلام کو ظاہر کرنے والے اور تمام احکام اسلام پر عمل کرنے والے تھے ۔

ایسے اوصاف سے متعلق شخص کے متعلق کوئی فاتر العقل ہی یہ خیال کر سکتا ہے کہ وہ اپنے دوست، مشیر، دست و بازو، محب اور خسر کو جو باپ کے درجہ کا ہوتا ہے قتل کرنے کی تدبیر کرے گا ۔

ہفوہ (۱۰) :۔ کہتے ہیں کہ جو شخص فلاں فلاں پر ستر بار لعنت کرے تو اسکو ستر نیکیوں کا ثواب ملے گا ستر گناہ محو کر دئے جائیں گے ۔ اور جنت کے ستر درجے اسے الاٹ کر دیئے جائیں گے ۔ چنانچہ ابو جعفر طوسی نے بحوالہ جناب جعفر صادق رحمۃ اللہ علیہ مختلف روایات کے ضمن میں اسکا ذکر کیا ہے ۔ یہ ایسا سفید جھوٹ ہے کہ سارے مذاہب و شرائع اپنے اپنے انداز میں اسکی تردید رکھتے ہیں ۔ اس لیے کہ بروں کو بھی برا کہنا کسی شریعت میں ثواب کا موجب نہیں

www.Ahlehaq.com

بروں اور بدوں کا سردار شیطان ہے مگر اسکو برا کہنا بھی نیکی میں شمار نہیں ہوتا۔ آپ صبح سے شام تک اس پر لعنت کریں گے تو بھی آپ کے نامۂ اعمال میں ذرہ بھر نیکی نہیں لکھی جائیگی (اس سلسلہ میں عام مسلمانوں کیلئے عموماً اور شیعوں کیلئے خصوصاً جناب اکبر الہ آبادی مرحوم کا ایک شعر پیش کرتا ہوں شاید کسی کی آنکھ کھل جائے ؎

نئی ترکیب شیطاں نے نکالی ہے یہ اغوا کی ٭ خدا کی حمد کیجئے ترک بس مجھکو برا کہئے ۔ شیعہ علماء کا ھفوہ بالا بھی شیعی عوام کیلئے شیطانی اغواء سے کم نہیں ۔ ان محترم ہستیوں پر لعنت سے انکا تو کچھ بگڑتا نہیں البتہ شیعوں کی اپنی عاقبت یقیناً خراب ہوگی ۔ ن)

بطریق صحیح جناب امیر المومنین رضی اللہ عنہ سے یہ بات ثابت ہے کہ آپ نے اپنے رفقاء کو جب اہل شام کو گالیاں بکتے سنا تو فرمایا کہ مجھے یہ پسند نہیں کہ تم گالیاں بکنے والے بنو (بحوالہ نہج البلاغہ) نیز حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ پر لعنت کو خدا کی حمد و ثنا اور ذکر سے افضل کہتے ہیں چنانچہ احول کے ذریعہ متعدد طرق سے جناب صادق کی روایات ملتی ہیں حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ذکر کو اکبر فرمایا ہے وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ ۔ مگر یہ احول وہ ہے جس نے بار بار جناب صادق رحمۃ اللہ علیہ پر جھوٹ باندھا ہے اور آپ نے اسے افتراء پرداز اور جھوٹا کہا ہے لیکن اسکا کیا علاج کیا جائے کہ شیعہ مذہب کی بنیاد ہی جھوٹ وجل اور فریب پر رکھی گئی ۔ اور وہ ہی آجتک اسکو سہارا دیئے ہوئے ہیں ۔

ھفوہ (۱۱) یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کراماً کاتبین کو یہ حکم دیدیا ہے کہ قتل عمرؓ کے یوم سے تین دن تک لوگوں کے نامۂ اعمال نہ لکھے جائیں ۔ نہ کسی کا گناہ درج کیا جائے یہ روایت علی بن مظاہر واسطی نے احمد بن اسحٰق قمی سے اس نے جناب حسن عسکری سے انہوں جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے جس میں حکایت اب بیان ہو رہی ہے یہ روایت افتراء اور جھوٹ پر مبنی ہے یہ نہ صرف اصول شریعت کے خلاف ہے بلکہ متواتر روایات کو بھی جھٹلانے والی ہے۔ اس روایت کو ماننے والا ذرا غور کرکے بتائے کہ ایک شخص قتل عمر کے یوم بالغ ہوا اور تین دن تک قابل تصور اور ناقابل تصور سارے ہی کبیرہ گناہ کا دھڑلے سے ارتکاب کرتا رہا جسمیں محرمات کے ساتھ زنا، اغلام، شراب نوشی، قتل بت پرستی، چوری اور جناب علی رضی اللہ کا سب و شتم سب ہی کچھ شامل ہے۔ اور وہ تین دن کے میعادی وقفہ میں انتقال کرگیا۔ اب وہ بغیر حساب جنت میں چلا جائے ۔ تو کیا روایت بالا کے مطابق درست ہوگا۔ اگر کسی میں رمق بھر عقل اور صحیح دینداری ہوگی وہ اس روایت کے باطل ہونے پر کوئی شک نہیں کریگا ۔

ھفوہ (۱۲) :۔ کہتے ہیں کہ تیمی اور عدوی نام کے دو بت تھے اور ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما خدا کو چھوڑ کر ان کی پوجا کیا کرتے تھے ۔ ابان بن عیاش اور دوسروں نے سلیم بن قیس ہلالی سے یہ روایت کی ہے اور سلمان فارسی رضی اللہ عنہ پر یہ تہمت لگائی گئی ہے ۔ جناب فصل تعصبات میں اسکی برائی بیان کی گئی ہے ۔

ھفوہ (۱۳) کہتے ہیں کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ خطاب کے صلبی فرزند نہ تھے بلکہ ولد الزنا تھے ۔ حالانکہ اوروں کو چھوڑئیے خود امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ نے نیز دیگر ائمہ نے سینکڑوں مرتبہ ان کو ابن الخطاب کہہ کر مخاطب کیا ہے ۔ امہات المومنین میں حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی ہیں ۔ دوسری طرف امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا آپ کی زوجہ محترمہ ہیں ۔ گویا آپ نبی محترم کے خسر ہیں تو علی مکرم کے داماد اور حب علی کے بدبخت دعویدار اس سے بالکل نہ شرمائے کہ علیؓ

www.Ahlehaq.com

www.Ahlehaq.com

پھر یہ الزام لگائیں کہ انہوں نے ولدالزنا کو داماد بنالیا۔
سارے امامیہ کا حضرت فاروق رضی اللہ عنہ کے نسب کے انکار پر اتفاق ہے ان کے علماء انساب کی کتابوں میں اسکو لکھا بھی ہے ان میں حمید الدین نخعی صاحب بحر الانساب بھی ہے۔ اور حسن بن سلمان العذری اپنی ملتقطات میں اس پر اجماع کا دعوی کیا ہے۔

ھفوہ (۱۴): کہتے ہیں کہ ہر سال موسم حج میں فرشتے جناب ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کو اپنی قبور سے زندہ کر کے منیٰ میں لاتے ہیں اور رمی جمار کی جگہ ان کو سولی پر چڑھاتے ہیں۔ ابوالحضر نے اپنے باپ دادا کے حوالے سے جناب محمد باقر رحمۃ اللہ علیہ سے یہ روایت بیان کی ہے۔
یہ ہفوہ بھی شیعی کذب و افتراء کا شاہکار ہے۔ اور ائمہ کو بدنام کرنے کی ناپاک سعی یا پھر پاگلوں کی بڑ ہے اس لیے کہ دار الجزاء تو آخرت ہے دنیا تو نہیں۔ یہ ہفوہ خلاف نقل ہونے کے علاوہ عقل و حس کے بھی خلاف ہے یہ لاکھوں حاجی ہر سال حج کیلیے منیٰ میں تین چار دن قیام کرتے ہیں انکو کہیں نہ سولی گڑی دکھائی دیتی ہے نہ کہیں کوئی لٹکا ہوا نظر آتا ہے آخر یہ شیعہ ذہنی سولی کس کو دیتے ہیں (میرے خیال میں ان ایام میں یہ خود کو سولی پر لٹکا ہوا محسوس کرتے ہیں اور اس وقت یہ اپنا نام ابوبکر و عمر رکھ لیتے ہونگے۔ ن)
اگر یہ کہیں کہ حجاج کو دکھانا منظور نہیں تو ہم کہیں گے کہ آخر عذاب قبر میں کونسی کمی تھی کہ فرشتے ان کو قبروں سے نکالتے اور بازار منیٰ میں لاتے ہیں اگر حاجیوں کو عبرت دلانا اور خود انکو اپنی تذلیل و رسوائی سے آگاہ کرنے کا مقصد تھا اور وہ کسی نے دیکھا نہیں تو ساری تگ و دو لاحاصل، عبث اور لغو ثابت ہوئی اور اللہ تعالیٰ عبث سے پاک ہے یہ بات شیعہ عقائد میں بھی تسلیم شدہ ہے۔

ھفوہ (۱۵): کہتے ہیں کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو سفر ہجرت میں اسلیے ساتھ لیا تھا کہ کہیں قریش مکہ کو سمت سفر سے مطلع نہ کردیں کہ آپ کس طرف تشریف لے گئے۔ اس ہفوہ پر یہ شیعہ خود بغلیں بجانا چاہیں تو انہیں کون روک سکتا ہے ورنہ یہ اتنا ظاہر البطلان ہے کہ تردید کی مطلق حاجت نہیں۔ اگر بات وہ ہوتی جو یہ کہتے ہیں تو حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو کیا ضرورت تھی کہ موسم گرما کی دوپہر ان کے گھر تشریف لے جا کر ارادہ ہجرت سے مطلع فرماتے اور مشورہ طلب فرماتے کہ کب و کس طرح نکلنا چاہیے، زادراہ اور سواری ان سے کیوں لیتے، سفر کا کھانا اور ناشتہ ان کے گھر سے ان کی صاحبزادی سے تیار کرایا۔ پھر ابوبکر ہی کے چیلے عامر بن فہیرہ کو راہ نما کی حیثیت دی سواری کے اونٹ اسکے حوالے کیے انہیں ابوبکر کے بڑے بیٹے عبد اللہ (رضی اللہ عنہما) کو حالات کے تجسس اور خبرگیری کے لیے اور قریش کی تجویزوں و خبروں سے آگاہی کیلیے ہرکارہ مقرر کیا۔ اور پھر اللہ تعالےٰ نے کیوں حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ابوبکر رضی اللہ عنہ کی فکرمندی اور غم کو اور آنحضرت صلے اللہ کا ان کو معیت کا گھر ازفشار کرتے ہوئے تسلی و دلاسہ دینے کو حکایتًا بیان فرمایا اِذْ یَقُوْلُ لِصَاحِبِہٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا اس ہفوہ سے شیوں کی اس اندرونی کھولن اور بھڑکتی ہوئی آتش عداوت کا پتہ چلتا ہے جو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی اس عزت و فضیلت کے سبب ہے جو آپ کو اس سفر صحبت و رفاقت میں میسر آئی۔ جس کا ذکر رہتی دنیا تک قرآن مجید میں محفوظ ہوگیا وہ چاہتے ہیں ہفوے اڑا اڑا کر جھوٹ اور افتراء بازی کر کر کے اس فضیلت میں کیڑے نکالیں مگر یہ سراپا محض خیالی

www.Ahlehaq.com

تکے سے تمام واقعہ، اسکے پس منظر پیش منظر ما لہٗ و ما علیہ کو یہ کیسے جھٹلا سکتے ہیں اسکے تو ہر ہر رخ اور ہر ہر پہلو سے ان کے بکواس کی تردید اور انکی ذلت ہیں اضافہ پر اضافہ ہوگا۔ يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّحِقَّ الْحَقَّ وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ ایسے ہی موقع کیلیے فرمایا گیا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ملا عبداللہ مشہدی مصنف اظہار الحق نے اس قصہ اور آیت کا بڑی کاوش اور باریک بینی سے جائزہ لیکر مجبوراً یہ منصفانہ رائے ظاہر کردی ہے کہ واقعہ اور حقیقت یہ ہے کہ یہ احتمال (جو شیعوں نے بیان کیا ہے) حقیقت سے بہت دور ہے (یعنی شیعوں کا یہ بیہودہ غلط در غلط ہے) اسمیں تعجب کی کیا بات ہے کہ آپ خلیفہ اول کو اپنی رفاقت و ہمراہی کیلیے چن لیں جن کو سسر ہونے کی نسبت بھی حاصل تھی۔ اور لوگوں سے ایمان و اسلام میں سبقت لے جانے کی برتری بھی آپ کو نصیب تھی اور اکثر اوقات رسالتمآب صلے اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں موجود رہتے اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم ان کی صحبت سے دل بستگی محسوس ہوئی ہو (کلام ملا بجنسہٖ تمام ہوا) قاضی نور اللہ شوستری نے مجالس المومنین ہیں اس بحث کی رکاکت کی تصریح کی ہے والحمد للہ۔ مفسر نیشاپوری نے کہا ہے۔

ثُمَّ اِنَّا لَا نُنْكِرُ اَنَّ اِضْطِجَاعَ عَلِيٍّ عَلٰى فِرَاشِهٖ طَاعَةٌ وَفَضِيْلَةٌ اِلَّا اَنَّ صُحْبَةَ اَبِيْ بَكْرٍ اَعْظَمُ لِاَنَّ الْحَاضِرَ اَعْلٰى مِنَ الْغَائِبِ وَلِاَنَّ عَلِيًّا مَا تَحَمَّلَ الْمِحْنَةَ اِلَّا لَيْلَةً وَّاحِدَةً وَّاَبُوْبَكْرٍ مَكَثَ فِي الْغَارِ اَيَّامًا وَاِنَّمَا اخْتَارَ عَلِيًّا لِلنَّوْمِ عَلٰى فِرَاشِهٖ لِاَنَّهٗ كَانَ صَغِيْرًا وَلَمْ يَظْهَرْ مِنْهُ دَعْوَةٌ بِالدَّلِيْلِ وَالْحُجَّةِ وَلَا جِهَادٌ بِالسَّيْفِ وَالسِّنَانِ بِخِلَافِ اَبِيْ بَكْرٍ فَاِنَّهٗ دَعَا جَمَاعَةً اِلَى الدِّيْنِ وَقَدْ ذَبَّ عَنِ الرَّسُوْلِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِالنَّفْسِ وَالْمَالِ وَكَانَ غَضَبُ الْكُفَّارِ اَشَدَّ مِنْ غَضَبِهِمْ عَلٰى عَلِيٍّ وَلِهٰذَا لَمْ يَقْصُدُوْا عَلِيًّا بِضَرْبٍ وَّاَلَمٍ لَمَّا رَاَوْا اَنَّ الْمُضْطَجِعَ هُوَ عَلِيٌّ۔

پھر ہم اس سے انکار نہیں کرتے کہ علیؓ کا آپکے بستر پر سونا فضیلت و طاعت ہے مگر صحبت ابوبکرؓ اس سے بڑھکر ہے کیونکہ حاضر بمقابلہ غائب بلند مرتبہ ہوتا ہے اور اس لیے کہ علیؓ نے صرف ایک رات تکلیف برداشت کی مگر ابوبکرؓ غار میں کئی دن ٹھہرے اور حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے علیؓ کو اپنے بستر پر سونے کیلیے اس لیے انتخاب فرمایا تھا کہ آپ ابھی بچے تھے آپ نے ابھی دلیل و حجت سے دعوت دینی شروع کی تھی نہ تلوار اور بھالے سے بخلاف ابوبکرؓ کے کہ انہوں نے ایک جماعت کو دین کی طرف بلایا تھا اور جان و مال کی بازی لگاکر رسول کو بچایا تھا۔ کفار کا غیض و غضب علیؓ کی نسبت ابوبکرؓ پر زیادہ تھا اسی لیے جب انہوں نے دیکھا کہ سونے والے وہ ہیں تو انہوں نے علیؓ کو مارنے یا تکلیف پہنچانے کا ارادہ ہی نہیں کیا۔

ھفوہ (۱۶):۔ یہ کہتے ہیں کہ قیامت کے دن فلاں عورت کے بدن کی کھال اصحاب کہف کے کتے کی کھال سے بدل جائے گی۔ دراصل باتوں اور روایتوں میں حسب مرضی کانٹ چھانٹ اور کتربیونت اس فرقہ کی پرانی عادت اور شرارت ہے یہ الفاظ دراصل بلعم باعورا کی نسبت آئے ہیں وہ ان کے نزدیک سزا کا سزاوار نہ قرار پایا تو روایت میں اصلاح کے طور پر تحریف و تصرف کر کے اس قسم کی روایت کی یہ ان کا پرانا پیشہ اور عادت ہے کہ یہ ان کافروں کا بھی پاس کرتے اور ان کو برائی سے یاد نہیں کرتے جنکے کفر پر اللہ و رسول کے کلام میں صراحت وارد ہوتی ہے اور جنہوں نے اللہ و رسول سے انتہائی دشمنی اور عداوت برتی اور جنکی بد بختی اور بد انجامی پہ قرآن مجید گویا ہے اور نہ انکی بدحالی

Www.Ahlehaq.com

کو یہ کوئی اہمیت دیتے ہیں۔ بلکہ ان کے بارے میں جو سزائیں وارد ہیں انکو انکے مرتبہ سے زیادہ جان کر خلفاء رسول اور ازواج رسول کے حق میں یہ روایت کرتے اور چسپاں کرنے کی ناپاک جسارت کرتے ہیں۔ اور یوں قرآن و حدیث کی تحریف اور ان میں تصرف کر کے اپنی عاقبت خراب کرتے ہیں اور ان کا حال اس بے وقوف کا سا ہے جسنے بعض قرآنی آیات کی اصلاح کی تھی کہ اسنے جب پڑھا وَعَصٰى آدَمُ رَبَّهٗ. یا. وَخَرَّ مُوْسٰى. تو یوں اصلاح کی وَعَصٰى مُوْسٰى رَبَّهٗ۔ وَخَرَّ عِيْسٰى۔ اور کہنے لگا کہ عصا موسی علیہ السلام کا تھا نہ کہ آدم علیہ السلام اور خر (گدھا) تو عیسی علیہ السلام کا تھا نہ کہ موسیٰ علیہ السلام کا۔ اس ہفوہ کی تردید کیلیے قرآن کی یہی آیت کافی ہے کہ۔

اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا۔	اے اہل بیت اللہ تعالے چاہتا ہے کہ تم سے نجاست اور گندگی دور فرما کر تم کو طاہر و مطہر کر دے۔

اور کتے کی کھال گو وہ اصحاب کہف ہی کا ہو نجس ہے۔

یا یہ آیت۔ اَلطَّيِّبَاتُ لِلطَّيِّبِيْنَ وَالطَّيِّبُوْنَ لِلطَّيِّبَاتِ اُولٰٓئِكَ مُبَرَّءُوْنَ مِمَّا يَقُوْلُوْنَ۔ یا یہ آیت۔ لَا يَحِلُّ لَكَ النِّسَآءُ مِنْ بَعْدُ وَلَآ اَنْ تَبَدَّلَ بِهِنَّ مِنْ اَزْوَاجٍ۔ جب ازواج کی تبدیلی دوسری ازواج سے بھی جائز نہ رہی تو ازواج کی تبدیلی ناپاک و نجس کتے سے کیسے جائز ہوگی۔

اس ہفوہ میں ایک یہ بات بھی قابل غور ہے کہ انھوں نے آیت ذیل کے مضمون کو خود اپنے اوپر کس طرح چسپاں کر لیا ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَاَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا مُّهِيْنًا۔	جو لوگ اللہ و رسول کو اذیت دیتے ہیں (خواہ عمل سے خواہ باتوں سے) انکے لیے دنیا و آخرت میں لعنت ہے اور انکے لیے بڑا دردناک عذاب تیار ہے۔

اور یہ اس لعنت ہی کا اثر ہے کہ وہ یہ وعید دیکھ، پڑھ اور سنکر بھی اسی پر ڈٹے ہوئے ہیں اور اپنی حرکات شنیعہ سے باز نہیں آتے اپنا ایمان برباد کرتے اور اللہ و رسول کو اذیت دینے والے اعمال و عقائد سے چمٹے ہوئے ہیں۔

ھفوہ (۱۷): ۔ کہتے ہیں کہ زمین کا وہ حصہ جو کسی معصوم کے بدن سے چھو جائے کعبہ مکرمہ سے ہزار درجہ بہتر ہے یہ بات ان کے شیخ مقتول نے دروس میں بیان کی اور دوسروں نے اس پر نص کی ہے۔

اس ہفوہ کا باطل و غلط ہونا بالکل ظاہر ہے۔ کیونکہ اسکو مان لینے سے لازم آئے گا کہ یہود و نصاری کے کنیسے، رہبان کے معبد، دیر، مجوس کے آتش خانے اور بتوں کے استحقاق جہاں کسی معصوم کا گذر ہوا ہو خصوصًا کوفہ و صفین کے درمیان کی منزلیں کعبہ مکرمہ سے بہتر ہوں۔ بلکہ خلفائے عباسیہ کے وہ گھر جہاں ائمہ معصومین نظر بند رہے کعبہ سے ہزار درجہ افضل ہوں۔ اور جناب امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا وہ گھر جہاں یزید پیدا ہوا اور جسمیں ایک مرتبہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ عیادت کیلیے تشریف لے گئے کعبہ مکرمہ سے ہزار درجہ بہتر ہو۔ تف ہے ان ہفوہ بازوں پر کہ وہ نہیں سوچتے کہ ان کے زبان و قلم سے کیا نکل رہا ہے۔

ھفوہ (۱۸) ایک طرف تو یہ خود اقراری ہیں کہ صاحب امر حقیقی بادشاہ امام معصوم مہدی منتظر ہیں۔ ان کے علاوہ کسی کو یہ حق نہیں کہ سزائیں مقرر کرے یا سزائیں نافذ کرے لوگوں کے جھگڑے نمٹنے چکائے، جمعہ و جماعت

قائم کرے جہاد کا حکم دے۔ اور جو ان کی اجازت کے بغیر ان امور میں دخل دے وہ فاسق ہے اور نافرمان۔ پھر دوسری طرف خود ہی کہتے ہیں کہ امام معصوم کی غیر موجودگی میں امور شرع اس مجتہد کی ذمہ داری ہیں جو اپنے اندر نیابت تک کی شرائط رکھتا ہو۔ یعنی جو اجتہاد کے درجہ تک پہنچا ہوا ہو اور اسکے زمانہ میں اس سے بڑا کوئی عالم نہ ہو تو وہ جہاد کے علاوہ ہر بات میں امام کا نائب ہے۔ یہ مسئلہ امامیہ کا متفقہ اور اجماعی ہے۔ اس میں پہلی بات تو یہ کہ اہل سنت پر جو یہ طعن کرتے تھے، وہ کہاں گیا۔ کہ یہ لوگ بغیر نص کے اپنے اجماع سے رسول کا خلیفہ مقرر کرتے ہیں۔ اور یوں دین پیغمبر میں تصرف کرتے اور دخل دیتے ہیں، اب یہ کس نص اور دلیل سے اپنے امام کا نائب مقرر کرتے ہیں۔ دوسری بات قابل قباحت و خلش یہ کہ انکے پاس وہ کونسا پیمانہ اور ذرائع ہیں جس سے یہ معلوم کریں گے کہ شرق و غرب پوری دنیا میں موجود علماء وقت میں کون سب سے بڑا عالم ہے عملی طور پر یہ کام جتنا مشکل و محال ہے سب پر ظاہر ہے۔ اسی کے ساتھ یہ بات بھی ہے کہ ان کے وہ بعض علماء جنکے اجماع پر یہ اعتماد رکھتے ہیں اور جنکو انہوں نے اپنے ہاں امام کا درجہ دے رکھا ہے اور انکے امر و نہی سے ایک انچ ہٹنے کو تیار نہیں۔ مثلاً ابن بابویہ، ابن المعلم، سید مرتضیٰ، ابن مطہر حلی، شیخ مقتول، وغیرہ وغیرہ ان کا اپنے زمانہ میں سب سے زیادہ عالم ہونا کسی بھی جہت سے ثابت نہیں۔

اب دیکھنے اور غور کرنے کی بات یہ ہے کہ جب نیابت امام کی شرط اعلم ہونا ٹھہری اور اسکا معلوم ہونا محال و مشکل ہے تو لامحالہ دو صورتیں ہوں گی یا تو احکام شرعیہ بغیر عمل معطل پڑے رہیں گے یا امام معصوم کے فرمان کے خلاف عمل ہوگا یہ ایسا ضغطہ اور آفت ہے جس سے ان کا نکلنا محال ہے۔

ھفوہ (۱۹):۔ یہ کہ وقت محدود کے علاوہ دیگر اوقات میں جہاد کو فاسد اور معصیت خیال کرتے ہیں۔ حالانکہ قرآن مجید اور احادیث رسول بطریق تواتر جہاد کی ہمہ وقت فضیلت پر صاف طور پر گواہ ہیں۔ معمولی عقل والا بھی یہ کہے گا کہ وجوب جہاد کا سبب جب دشمنوں کا دفعیہ اور اسلام کا بول بالا قرار پایا تو جب تک دشمن موجود اور اعلائے کلمۃ اللہ کی ضرورت ہے جہاد جاری رہے گا ان ہر دو اسباب کے ہوتے ہوئے جہاد نہ کرنا ایسا ہی ہے جیسا پکے ہوئے پھوڑے سے مواد نہ نکالنا۔ اور اعضائے رئیسہ کے کمزور ہونے کے باوجود قوت کی دوا استعمال نہ کرنا۔

ھفوہ (۲۰) یہ لوگ قرآن کو مُنزَّل نہیں مانتے بلکہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا تحریف کردہ خیال کرتے ہیں یہ اپنے عقیدہ پر ہی جمے رہتے تو کسی بات پر تو ثبات و استقامت کی انکے ہاں مثال مل جاتی اس عقیدہ کے باوجود یہ خود ہی اپنے ائمہ سے روایت بیان کرتے ہیں کہ وہ اسی قرآن کو نمازوں میں پڑھا کرتے تھے۔ اور بہ نیت ثواب اسی قرآن کی تلاوت فرماتے تھے اسکی آیات کو احکام شرعیہ کیلیے دلیل ٹھیراتے تھے۔ غضب بالائے غضب یہ کہ ان کے پاس بھی قرآن منزلٌ موجود نہیں اور سارے امامیہ اسی تحریف شدہ کلام اللہ کی تلاوت کرتے اور اپنے مردوں کو اسی کا ایصال ثواب کرتے ہیں۔ اگر وہ عقیدہ ہے تو یہ خلاف عقیدہ لغو حرکت کیوں۔

ھفوہ (۲۱):۔ یہ کہتے ہیں کہ دَابَّۃُ الْاَرْضِ سے مراد حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں۔ اللہ انہیں جہنم رسید کرے کتنے بے ادب ہیں۔ آیت وَاِذَا وَقَعَ الْقَوْلُ عَلَیْہِمْ اَخْرَجْنَا لَھُمْ دَابَّۃً الْاَرْضِ۔ کی تفسیر کلینی نے یہی بیان کی ہے۔ اور افتراء و تہمت کے لیے جناب جعفر صادق رحمۃ اللہ علیہ کا کندھا تلاش کیا ہے اور ان کے حوالہ

www.Ahlehaq.com

سے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے یہ کہلوایا انا الدابۃ الارض التی تکلم الناس (میں ہی وہ زمینی چوپایہ ہوں جو لوگوں سے بات کرتا ہے) حالانکہ قرآن مجید میں صاف طور پر مذکور ہے۔ کہ دابۃ الارض کے خروج کا وقت قرب قیامت کا زمانہ ہے اور لوگوں پر ہلاکت و مصائب ٹوٹ پڑنے کا وقت ہے۔ اور جناب امیر رضی اللہ عنہ کا زمانہ اس سے سینکڑوں سال مقدم ہے اور آپ کی واپسی کا زمانہ بمطابق عقیدۂ امامیہ امام مہدی کا وقت ہے۔ اور ابھی تو قیامت میں عرصہ دراز کا بعد ہے۔

ھفوہ (۲۲):۔ اپنی لونڈیوں، کنیزوں اور بیویوں کی شرمگاہوں کو مہمانوں، دوستوں کو بحق دوستی و میزبانی بطور عاریت سپرد کرنا بہترین عبادت خیال کرتے اور اونچے درجہ کی طاعت جانتے ہیں۔ اور اس پر اجر جزیل کی روایت بھی بیان کرتے ہیں۔ رقعہ مزورہ کے راقم ابن بابویہ نے حضرت صاحب الزمان سے رقعہ نقل کیا ہے جس کے پڑھنے سے ہر شریف مسلمان کے رونگٹے کھڑے ہوتے اور سر ندامت سے جھک جاتے ہیں۔ مگر اس طائفہ ملعونہ کی بے حیائی اور ڈھٹائی ملاحظہ ہو۔ کہ اس قدر گندے اور شرافت و پاکبازی سے عاری خیالات ایسے نفوس قدسیہ عالی مرتبت حضرات کی طرف منسوب کرتے اور ذرا نہیں شرماتے۔

ھفوہ (۲۳):۔ یہ عورتوں کے متعہ کو بہترین عبادت اور افضل طاعت خیال کرتے ہیں۔ تفسیر فتح اللہ میں آیت فَمَا اسْتَمْتَعْتُم بِهِ مِنْهُنَّ فَآتُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ فَرِيضَةً۔ کے ذیل میں بحوالہ ابن بابویہ جناب جعفر صادق رحمۃ اللہ علیہ یہ روایت مذکور ہے۔ کہ کوئی خالصتاً لوجہ اللہ کسی عورت سے متعہ کرے تو اس سے جو بات یا اس کے ساتھ جو حرکت بھی کرے اسے اللہ تعالیٰ اسے ایک نیکی عطا فرمائے گے اور اگر اس سے ہمبستری کرے تو حق عز اسمہ اسکے تمام گناہ معاف فرما دے گا اور جب غسل کرے گا تو ہر بال کے عوض جس پر پانی بہے اسکی مغفرت کرے اور رحمت برسائے گا۔ لہٰذا اس روایت کے بموجب انسان کے لیے عمر بھر میں ایک مرتبہ متعہ کرنا گناہوں کی معافی کیلئے کافی ہے۔

تفسیر مذکور میں حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی ایک روایت بھی بیان کی گئی ہے۔ کہ جو دنیا سے بغیر متعہ کے چلا گیا ہو تو قیامت میں بگڑی صورت اور کریہہ المنظر بنا ہوا اٹھے گا۔ اس شخص کی طرح جس کی ناک کاٹ دی گئی ہو۔

معاذ اللہ، ثم معاذ اللہ! کیا اس روایت کی رو سے انبیاء کرام علیہم السلام اور ائمہ رحمہم اللہ جنہوں نے بالاجماع متعہ نہیں کیا۔ زد نہیں پڑتی اور کیا وہ اس ذلت میں گرفتار قرار نہیں پاتے۔

اسی تفسیر میں حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے منسوب یہ روایت بھی ہے کہ آپ نے فرمایا جو ایک بار متعہ کرے اسکا درجہ حسین رضی اللہ عنہ کے برابر ہوگا۔ جو دو مرتبہ متعہ کرے اسکا درجہ حسن رضی اللہ عنہ کے درجہ کے برابر ہوگا اور جو تین مرتبہ متعہ کرے اسکا درجہ علی رضی اللہ عنہ جیسا ہو اور جو چار مرتبہ متعہ کرے اسکا درجہ محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) جیسا ہو۔ یہ روایت سنکر ایک لطیفہ گو کہنے لگے کہ اس روایت میں ایک کمی رہ گئی۔ آخر میں یہ اضافہ ہونا چاہیے تھا کہ جو پانچ مرتبہ متعہ کرے اسکا درجہ اللہ تعالیٰ جیسا ہوگا تاکہ متعہ کی عظمت و شان پورے طریق پر ثابت ہو جاتی۔

اسی تفسیر میں جناب سلمان فارسی جناب مقداد جناب اسود کندی اور جناب عمار یاسر رضی اللہ عنہم سے روایت مذکور ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھے کہ آپ اٹھے اور ایک پر اثر تقریر فرمائی۔ اسکے بعد فرمایا لوگو میرے بھائی جبرئیل علیہ السلام اللہ تعالیٰ کی طرف سے میرے پاس ایک تحفہ

www.Ahlehaq.com

لائے ہیں اور وہ مومن عورتوں سے متعہ کرتا ہے۔ مجھ سے پہلے کسی پیغمبر کو یہ تحفہ نہیں بخشا گیا۔ میں تم سے کہتا ہوں یہ میری سنت ہے میرے زمانے ہی میں نہیں میرے بعد بھی جو اسے قبول کرے، اس پر عمل پیرا ہو وہ مجھ سے ہے اور میں اس سے۔ اور جس نے میرے اس حکم کی مخالفت کی اس نے گویا خدا سے مخالفت کی جان لو کہ اہل مجلس میں سے جو میری مخالفت کرے اور میرے ساتھ بغض رکھنے کی وجہ سے اسکو باطل ثابت کرے تو میں گواہی دیتا ہوں کہ وہ دوزخی ہے اس پر خدا کی لعنت ہو جو میری مخالفت کرے کیونکہ اس نے جس نے انکار کیا تو گویا اس نے میری نبوت کا انکار کیا اور خدا کی مخالفت کی اور جو خدا کی مخالفت کرے وہ دوزخی ہوگا۔

جو اپنی پوری زندگی میں ایک بار متعہ کرے وہ جنتی ہے۔ جب عورت اپنے مرد ممنوع کے پاس بیٹھتی تو فرشتہ ان پر اترتا ہے اور جب تک اپنی نشستگاہ سے اٹھیں انکی رکھوالی کرتا ہے۔ اگر باہم ہم کلام ہوں تو وہ کلام ان کے حق ذکر و تسبیح کا حکم رکھتا ہے اور جب ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑیں تو جو بھی گناہ کئے ہوں وہ سب انگلیوں کے پوروں سے جھڑ جائیں اور جب باہم بوسہ بازی کریں تو اللہ تعالے ہر بوسہ کے عوض ایک حج و عمرہ کا ثواب لکھتا ہے۔ بمقدار اونچے اونچے پہاڑوں کے۔ اور جب اٹھ کر غسل میں مشغول ہوں تو اللہ تعالے اپنے فرشتوں سے کہتا ہے کہ میرے ان دو بندوں کو دیکھو کہ اٹھ کر غسل کرنے لگے ہیں اور اعتقاد رکھتے ہیں کہ میں ان کا پروردگار ہوں تم گواہ رہو کہ میں نے ان کے گناہ معاف کئے۔ ان کے بدن کے جس بال پر پانی گرتا ہے حق تعالی ہر بال کے عوض ایک نیکی لکھتا اور ایک گناہ معاف کرتا ہے اور دس درجے بلند کرتا ہے۔ اس پر حضرت علی رضی اللہ عنہ اٹھے اور عرض کیا یا رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) اس بارے میں جو صرف کوشش کرے اسکا کیا درجہ ہے۔ فرمایا وہی جو مرد متمتع اور عورت متمتعہ کا ہے۔ اس کے بعد فرمایا اے علیؓ جب یہ دونوں غسل سے فارغ ہوتے ہیں تو جو قطرہ ان کے بدن سے گرتا ہے اس سے اللہ تعالی ایک فرشتہ پیدا کرتا ہے جو اللہ تعالی کی تسبیح و تقدیس میں مشغول ہو جاتا ہے اور قیامت تک اسکا ثواب غسل کرنے والے کے نامۂ اعمال میں لکھا جاتا ہے۔ اے علیؓ جو اس سنت کو حقیر جانے اور اسے زندہ نہ کرے وہ میرے شیعہ میں سے نہیں ہے میں اس سے بیزار رہوں گا۔

اب ان روایات پر غور کر لیا جائے کہ تمام شرائع اور ادیان و ملل سے کس قدر مخالف ہیں۔ نکاح جو بالاتفاق انبیاء علیہم السلام کی سنت ہے۔ اسکو کسی نے گناہ معاف ہونے اور درجات بڑھنے کا ثواب نہیں بتایا پس حرکت فاحشہ کی کیا حیثیت۔ کسی بھی دین و آئین میں شہوت رانی اور نفس کی خواہش پوری کرنے کو اسقدر ثواب تو کیا بلکہ اسکے عشر عشیر کا سبب بھی نہیں ٹھیرایا۔ ایسی حرامکاری کو وہی دین و آئین اپنے دامن میں جگہ دے سکتا ہے جس میں خدا کے دشمنوں کے ساتھ جہاد اور رمضان کی راتوں میں شب بیداری جسکی قرآن میں تعریف آچکی ہو۔ سب سے بڑی معصیت اور گناہ کبیرہ ہو۔ مگر بصورت متعہ حرامکاری میں شب بیداری وہ عبادت ہو کہ ایک بار کرنے سے درجہ امامت اور چار بار کرنے سے درجہ نبوت پر فائز کردے۔

کتنے افسوس کی بات ہے کہ قرآن مجید جو محض ثواب کے اسباب بتانے اور لوگوں کو جنت میں پہنچنے کا راستہ بتانے کیلئے نازل ہوا وہ تو اس سب سے بڑی عبادت کی بو باس اور محاسن سے یکسر خالی ہے۔ اس میں اس سہل اور آسان راستہ کی ہوا تک نہیں لگنے دی اور انبیاء و ائمہ کے درجات تک پہنچنے کا راستہ نامعلوم ہی رہا۔

www.Ahlehaq.com

اگر چند ضعیف و من گھڑت اور واہی تباہی روایات ابن بابویہ کی تھیلی یا میر فتح اللہ کے پٹارے میں "ثوب ناپاک" کی طرح چھپی پڑی ہوں اور کسی نے ان پر یقین نہ کیا تو پھر اسمیں لطف واحسان الٰہی کیا رہا۔ ایسے عمدہ و دلچسپ مضمون کو تو ایک بار نہیں بار بار قرآن مجید میں لانا چاہیئے تھا۔ اور نماز روزہ، حج زکاۃ و جہاد جیسی اہمیت کے ساتھ بیان کرنا چاہیئے تھا۔ تاکہ خاص و عام اس سے واقف ہوتے مکتب کا ہر بچہ اسکو پڑھتا اور تواتر و شہرت کی حد تک وہ پہنچتا۔

بہرحال ان کے نزدیک جب متعہ ایک بڑی عبادت ٹھیرا تو انہوں نے اسمیں وسعت بھی دی تاکہ کوئی آدمی کسی بھی وقت کسی بھی جگہ اس کے "ثواب" سے محروم نہ رہے۔ وہ وسعت کیا ہے ملاحظہ فرمائیے۔ علی بن احمد بیہقی فرقہ امامیہ کا چوٹی کا عالم کربلائے معلی کی جامع مسجد کا امام اور خطیب بھی تھا اس کا شمار ان کے واجب الاطاعت مجتہدین میں ہوتا تھا۔ اس نے اور ان کے دوسرے عالموں نے کہا ہے امامیہ کے نزدیک بالاتفاق "متعہ دوریہ" جائز ہے۔ اور وہ یہ ہوتا ہے کہ ایک ہی رات ایک عورت چند مردوں سے گھڑی دو دو گھڑی، کے لیے متعہ کر سکتی ہے اور باری باری سب کو نمٹا سکتی ہے (مگر اس صورت میں غسل کرنے کے ثواب میں یہ عورت کونسے متمتع کے ساتھ شریک قرار دی جائیگی۔ ن)

اور انہوں نے یہ بھی کہا ہے کہ ہم امامیوں کے نزدیک زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ خاوند والی عورت سے بھی متعہ جائز ہے جبکہ ان کے خاوند سنی المذہب ہوں اسلئے کہ ہمارے نزدیک اہل سنت کا نکاح صحیح نہیں یوں ان کی عورتیں نکاح کے باوجود بغیر خاوند والی ہیں۔ اور ایسی عورتوں سے متعہ بالاجماع جائز ہے۔ بلکہ یہ تو کہتے ہیں کہ ہندو اور مجوسی عورت سے بھی متعہ جائز ہے بشرطیکہ وہ زبان سے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کہدے چاہے اسکے دل میں ان الفاظ کے کوئی معنی و مفہوم نہ ہوں۔

خاتمہ باب۔ خلاصہ حساب

واضح رہے کہ خلیفہ راشد حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی شہادت تک امت محمد صلے اللہ علیہ وسلم ایک ہی مذہب پر برقرار و متحد و متفق تھی۔ بانیان قتل اور قاتلان عثمان رضی اللہ عنہ نے ایک بڑے دور رس سازشی منصوبہ کی داغ بیل ڈالی۔ اور حضرت امیر رضی اللہ عنہ کے عہد میں ان کی مرضی کے خلاف ایک نئے شیعی مذہب کو وجود میں لے آیا گیا۔ جو ہر لحاظ سے مسلمانوں سے الگ ایک مستقل مذہب ہے اس لیے کلمہ سے لے کر قبر کے گڑھے میں دفن ہونے تک کوئی شرعی مسئلہ ایسا نہیں جو اہلسنت سے موافق ہو۔ اگر نادانستگی میں اسکی موافقت کسی وقت ظاہر بھی ہو جائے تب بھی دانستہ اور جان بوجھ کر یہ ہمیشہ مذہب اہلسنت کے مخالف ہی رہے ہیں۔

جب صورت حال یہ ہو تو ہر دو جماعت میں سے ہر ایک کی حقانیت کو پرکھنے کیلیے کوئی معیار ہونا چاہیئے تو وہ معیار کتاب اللہ اور اقوال عترت رسول ہیں اب ہمیں چاہیئے کہ یہ دیکھیں کہ اس معیار کے مطابق کونسا مذہب کافروں کے مذہب کے مشابہ ہے اور کونسا مذہب کافروں کے مذہب کے منافی اور بالکل اسکا الٹ ہے

کیونکہ کافروں کے متعلق دونوں جماعتوں کا یہ اجماعی اور متفقہ فیصلہ ہے کہ وہ لعنت گمراہی میں گرفتار ہیں۔
اس بات کی ضرورت اس لیے بھی اہم ہے کہ دونوں جماعتوں کے اختلاف کے وقت ایک دوسرے کی روایات کو قبول نہیں کیا جاتا ہے۔ لہذا کتاب اللہ اور اقوال عترت رسول جس مذہب کی حقیت کی گواہی دیں گی ہمارے نزدیک وہی مذہب حق ہوگا۔ اور اس کے مقابل مذہب کو ہم باطل سمجھیں گے۔ اور جو آئین کفر و شرک اور انکے مذہب سے ملتا جلتا اور مشابہ ہوگا اسکو ہم مذہب باطل سمجھیں گے اور اسکے مقابل کو مذہب حق۔
لہذا ہم اول قرآن مجید کو سامنے لاتے ہیں۔ کہ اسمیں بہت سی آیات ہیں جو مذہب اہل سنت کی حقیت ثابت کرتی ہیں۔ مگر ہم تبرکاً ان سے بارہ ائمہ کے عدد کے موافق بارہ آیات قرآنیہ بیان کرتے ہیں۔

آیت (۱) :۔ مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللّٰهِ وَالَّذِينَ مَعَهٗ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ تَرَاهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا سِيمَاهُمْ فِي وُجُوهِهِمْ مِّنْ أَثَرِ السُّجُودِ۔

محمد اللہ کے رسول ہیں اور ان کے ساتھ والے (اصحاب) جو ہیں وہ کافروں پر سخت گیر مگر باہم بہت نرم دل ہیں۔ تم انہیں رکوع و سجود میں اللہ تعالےٰ کا فضل و رضا طلب کرتے ہوئے پاؤ گے۔ ان کی پیشانیوں پر سجدوں کے نشان ثبت ہیں۔

اس آیت کا صاف اور واضح مطلب یہ ہے کہ محمد صلے اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کا دین دراصل دین حق ہے اس لیے کہ ممدوح کا موافق بھی ممدوح ہوتا ہے۔

آیت (۲) :۔ وَالَّذِينَ جَاءُوا مِنْ بَعْدِهِمْ يَقُولُونَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِإِخْوَانِنَا الَّذِينَ سَبَقُونَا بِالْإِيمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِي قُلُوبِنَا غِلًّا لِّلَّذِينَ آمَنُوا رَبَّنَا إِنَّكَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ۔

اور ان کے بعد آنے والے کہتے ہیں اے پروردگار ہمکو اور ہمارے سابق الایمان بھائیوں کو بخشدے اور ایمان والوں کے خلاف ہمارے دلوں میں کینہ پیدا نہ کر اے ہمارے رب تو مہربان و رحم والا ہے۔

اس آیت سے معلوم ہوا مذہب حق ان لوگوں کا ہے جو کسی مومن کے خلاف دل میں کینہ نہیں رکھتے۔ اور اپنے سے پہلے ایمان لانے والوں کے لیے خدا سے مغفرت طلب کرتے ہیں۔ اور یہ صحابہ کرام اور امہات المؤمنین رضوان اللہ علیہم ہیں کیونکہ اس آیت سے پہلے مہاجرین و انصار کا ذکر ہے۔

آیت (۳) :۔ وَمَنْ يُشَاقِقِ الرَّسُولَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدَىٰ وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ نُوَلِّهِ مَا تَوَلَّىٰ وَنُصْلِهِ جَهَنَّمَ وَسَاءَتْ مَصِيرًا۔

جس کے لیے سیدھی راہ کھل گئی ہو اسکے بعد بھی وہ رسول کی مخالفت کرتا اور مومنوں کے راستہ کے علاوہ دوسرے راستہ پر چل پڑتا ہے وہ اپنے کئے کو خود ہی بھگتے گا اور ہم اسے دوزخ کے حوالہ کر دیں گے اور وہ بہت برا ٹھکانہ ہے۔

آیت سے یہ معلوم ہوا مومنوں کے خلاف راستہ اختیار کرنے والا مستحق دوزخ ہے۔ اس آیت کے نزول کے وقت مومنین صرف صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم ہی تھے۔

آیت (۴) :۔ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ

جو ایمان لا کر نیک کام کریں گے ان سے اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ انکو اسی طرح زمین میں اقتدار دے گا جسطرح ان

كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْئًا. وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ۔

سے پہلوں کو اقتدار دیا۔ اور انکے لیے جو دین پسند کیا ہے ان کے لیے اسے تمکن عطا فرمائے گا۔ انکے خوف کو امن سے بدل دے گا۔ وہ میری ہی بندگی کرتے ہیں میرے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھیراتے۔ اس حالت کے بعد اگر کوئی کفر کرے تو وہی لوگ فاسق ہیں۔

آیت بالا سے معلوم ہوا کہ خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم کے زمانہ میں جس دین نے تمکن استحکام اور مضبوطی حاصل کی خدا کا پسندیدہ دین وہی تھا۔ اور وہ دین جسکا اس وقت وجود ہی نہ تھا یا اگر تھا تو کچھ منافقوں، سازشیوں، اور شر پسند قاتلوں کے دلوں میں انکی سازشوں اور نفاق کے ساتھ مخفی و پوشیدہ تھا۔ وہ اللہ کا پسندیدہ دین نہیں اور خدا کے پسندیدہ دین کے مخالف اور اسلامی اقتدار کی نعمت کی ناشکری کرنے والے فاسق ہیں اور طاعت خداوندی سے خارج مثلاً رافضی، خوارج۔ اور نواصب،

آیت (۵): ـ هُوَ الَّذِيْ يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وَمَلٰٓئِكَتُهٗ لِيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ۔ (وہ وہ خدا ہے کہ جو خود اور اسکے فرشتے تم پر رحمت کا نزول کرتے ہیں تاکہ تم کو اندھیروں سے نکال کر روشنی میں لے آئے)

اس آیت کے اصل مصداق تو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم ہی ہیں مگر جس نے بھی ان کی پیروی کر لی وہ بھی گمراہی کے اندھیروں سے نکل کر ایمان کی روشنی میں آگیا۔ اسلیے کہ اگر کوئی رات کی اندھیریوں میں مشعل لے کر چلے تو روشنی اسے ہی میسر نہیں ہوتی اسکے قدم بقدم ہمسفر بھی اس روشنی سے مستفید ہوتے ہیں تاریکی سے وہ بھی خلاصی پا لیتے ہیں۔

آیت (۶): ـ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَاَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوٰى وَكَانُوْٓا اَحَقَّ بِهَا وَاَهْلَهَا۔ (اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول اور مسلمانوں پر اپنی طمانینت و سکینہ نازل فرمایا۔ اور پرہیزگاری کی بات پر انکو ثابت قدم رکھا (کیونکہ) وہ اسکے بہت زیادہ حقدار بھی تھے اور اسکے لائق بھی)

معلوم ہوا صلح حدیبیہ کے وقت حضور صلے اللہ علیہ وسلم کیلیے جو سکینت اور طمانینت نازل فرمائی گئی۔ اسمیں آپ کے رفقاء اور جاں نثار اصحاب رضی اللہ عنہم بھی شریک و سہیم تھے اور اس وقت انکے دلوں پر کلمۃ التقوی کندہ اور چسپاں کر دیا گیا تاکہ کسی وقت بھی وہ ان سے الگ نہ ہو سکے۔ یہی سبب ہے کہ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد بھی ان سے خلاف تقویٰ کوئی بات صادر نہیں ہوئی اگر ایسا ہوتا تو الزام کلمۃ التقویٰ بے معنی بات ہو جاتی۔ کہ اللہ تعالیٰ کا کندہ کلمہ بھی نشان چھوڑ گیا۔ جبکہ کلمات رب نہ کبھی تبدیل ہوتے ہیں نہ ان کا اثر زائل ہوتا ہے۔

اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا وہ جماعت ہی کلمہ تقوی کی زیادہ مستحق بھی تھی اور اسکی اہل بھی مستحق تو اسلیے کہ مسلمان ہی صرف وہ تھے باقی تو سارا جہان کفرستان تھا۔ اور اہل اسلیے کہ وہ سید المرسلین صلے اللہ علیہ وسلم کے تربیت دادہ تھے اور یہ اسکی برکت و عظمت ہے کہ ان حضرات کو قیامت تک نجوم ہدایت قرار دیا گیا کہ جو بھی تقوی کا طالب ہو اب وہ انہی احق و اہل، اصحاب نبی صلے اللہ علیہ وسلم کی پیروی و اقتدار کرے ان کی پیروی سے جو روگش ہوا اسے تقوی کی ہوا بھی نہ لگی۔

www.Ahlehaq.com

www.Ahlehaq.com

آیت (۷) :۔ لٰكِنِ الرَّسُولُ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ جَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ ۚ وَأُولَٰئِكَ لَهُمُ الْخَيْرَاتُ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۔

لیکن رسول اور انکے مسلمان ساتھی کہ انہوں نے جہاد میں اپنے اموال کھپا دیئے اپنی جانیں لڑا دیں ۔ (اسلیے) بھلائیاں بھی انہیں کا حصہ ہیں اور کامیاب بھی وہی ہیں ۔

ظاہر ہے کامیاب و بامراد کے جو قدم بقدم ہو گا وہ بھی کامیاب ہو گا ۔ (رسول جس راستہ پر چل کر رضائے الٰہی کی جس جنت میں پہنچے آپکے اصحاب کرام انہیں قدموں پر قدم رکھتے ہوئے منزل مراد تک پہنچے گویا یہ منزل مراد کی راہ متعین ہو گئی اب جو اس منزل کو حاصل کرنا چاہے اسے چاہیئے کہ وہ انہیں قدموں پر چل کر جائے اس لیے کہ اسکے سوا منزل مقصود کا کوئی راستہ ہی نہیں ۔ ن)

آیت (۸) :۔ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ حَبَّبَ إِلَيْكُمُ الْإِيمَانَ وَزَيَّنَهُ فِي قُلُوبِكُمْ وَكَرَّهَ إِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوقَ وَالْعِصْيَانَ ۚ أُولَٰئِكَ هُمُ الرَّاشِدُونَ فَضْلًا مِّنَ اللَّهِ وَنِعْمَةً ۔

لیکن اللہ نے ایمان کی محبت تم کو عطا کی اور اسے تمہارے دلوں کی زینت بنایا (یعنی باوقعت ، اور کفر، فسق اور نافرمانی کی نفرت تم میں پیدا کی ۔ ان کی ہدایت و رشد اللہ تعالیٰ کے فضل و نعمت کے سبب سے ہے ۔

جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و احسان سے بھلا بنا کر دنیا بھر کیلیے نمونہ قرار دیا تو ظاہر ہے کہ ایسے بھلے کا تابع بھی بھلا ہو گا ۔

آیت (۹) :۔ الَّذِينَ إِن مَّكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنكَرِ ۔

یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو زمین پر تمکن عطا کر دیں تو یہ صلوٰۃ و زکوٰۃ کی پابندی سے ادائیگی کریں اور بھلے کاموں کا حکم دیں اور برے و ناگوار کاموں سے منع کریں ۔

یہ آیت مہاجرین رضی اللہ عنہم کے حق میں نازل ہوئی ۔
قاعدہ کے مطابق مقدم کے ساتھ تالی (تابع) کا وجود لازم ہے ۔ تا کہ کلام اللہ کے متعلق کوئی جھوٹا شبہ بھی نہ کر سکے ۔ اب یہاں مقدم کا ذکر ہو گیا اور ان کے اوصاف بھی معلوم ہو گئے ۔ لہذا ان کے تالی (تابع) بھی ایسے ہی ہونگے ان کے دین حق پر ہونے میں بھی کوئی شبہ نہیں ہو گا ۔

آیت (۱۰) :۔ هُوَ اجْتَبَاكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ ۚ مِّلَّةَ أَبِيكُمْ إِبْرَاهِيمَ ۚ هُوَ سَمَّاكُمُ الْمُسْلِمِينَ مِن قَبْلُ وَفِي هَٰذَا لِيَكُونَ الرَّسُولُ شَهِيدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ ۚ فَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَاعْتَصِمُوا بِاللَّهِ هُوَ مَوْلَاكُمْ ۖ فَنِعْمَ الْمَوْلَىٰ وَنِعْمَ النَّصِيرُ ۔

اس نے تم کو انتخاب کیا ، تمہارے لیے دین میں کوئی تنگی نہ رکھی یہ تمہارے باپ ابراہیم کا دین ہے ۔ اس نے پہلے بھی اور اس کتاب میں بھی تمہارا نام مسلمان رکھا ۔ تا کہ رسول تو تمہارے گواہ ہوں اور تم لوگوں کے ۔ پس قائم کرو ۔ زکوٰۃ ادا کرو ۔ اللہ پر مکمل اعتماد رکھو وہی تمہارا آقا ہے اور کیسا بہتر آقا اور کتنا اچھا مددگار ہے ۔

چنیدہ اور منتخب خدا کا تابع بھی یقینی طور پر نجات پانے والا ہوتا ہے ۔
آیت (۱۱) :۔ كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ (تم

www.Ahlehaq.com

بہترین امت ہو جو لوگوں کیلئے پیدا کی گئی ہے۔ تاکہ تم سے بھلائیوں کے کرنے کے حکم اور برائیوں سے روکنے کی نہی کا کام لے)

امت محمد صلے اللہ علیہ وسلم کا نام اللہ تعالیٰ نے خیر امت رکھا ہے اس امت کو اس نام کے علاوہ بطور طعن کسی دوسرے نام یا گالی سے یاد کرنے والا نہ تو مسلمان ہو سکتا ہے نہ خیر امت کا کوئی فرد۔ دوسری بات یہ امت وصف خیریت سے متصف ہے اور اس خیریت کا باعث اسکا فریضۂ منصبی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے۔ اس امت کا نام تقیہ، اخفار، احکام الٰہی میں نرمی نہیں ہے۔ اور نہ ایسے لوگ جو ان اوصاف سے متصف ہوں خیر امت کا حصہ ہیں۔

آیت (۱۲):۔ هُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ

(وہ وہی ذات حق ہے جس نے ہدایت و دین حق کے ساتھ اپنے رسول کو مبعوث فرمایا تاکہ تمام ادیان پر اسکی فوقیت و برتری ظاہر فرمائیں)

معلوم ہوا کہ دین حق کا یہ نمایاں وصف ہے کہ وہ کھلم کھلا اور ظاہر و باہر ہو، بلی کے گو کی طرح چھپایا اور پوشیدہ رکھا جانے والا دین، ہرگز حق نہیں۔ بلکہ سرے سے کوئی دین ہی نہیں وہ تو بعض بازوں کا اختراع اور گھڑا ہوا ایک عجوبہ ہے۔

اس آیت کے سلسلہ میں یہ بات جو یہ حضرات کہتے ہیں کہ شیعہ مذہب کے ظہور کا وقت امام مہدی کا زمانہ ہے تو ان کا یہ قول لچر و پوچ ہے اس لیے کہ لیظہرہ کا لام ارسل رسولہ سے متعلق ہے لہذا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے متصل ہی اس دین کا ظہور ہو۔ اور وہ جاری رہے۔ اور ظاہری طور پر کوئی دین بجز اہلسنت کے جاری و زندہ نہیں۔
آیات قرآنیہ سے استدلال و ثبوت کے بعد ہم اب اقوال عترت رسول کی طرف آتے ہیں۔ اس سلسلہ میں ہم نے روایات اہل سنت سے بالکل مدد نہیں لی بلکہ شیعہ کتب کی اوراق گردانی اور انکی روایات کی چھان بین کی ہے۔ اور ہمیں ان ہی کتابوں میں خاطر خواہ کافی مواد ملا ہے۔ انکی کتابوں میں اہل بیت گرامی سے مروی بہت سی ایسی روایات ہیں جو بڑے واضح اور صاف انداز میں اہلسنت کے مذہب کی حقانیت اور مذہب شیعہ کے بطلان پر دلالت کرتی ہیں۔ ذیل کی پہلی روایت "کتاب السواد والبیاض" کے امامی مصنف نے اپنی مذکورہ کتاب میں درج کی ہے۔

(۱):۔ عَنِ الْاِمَامِ اَبِیْ عَبْدِ اللّٰهِ جَعْفَرِ الصَّادِقِ فَاِنَّهٗ قَالَ فِیْ تَفْسِیْرِ قَوْلِهٖ تَعَالٰی وَالسَّابِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهَاجِرِیْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِیْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ قَالَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ بِمَا سَبَقَ لَهُمْ مِنَ التَّوْفِیْقِ وَالْاِعَانَةِ وَرَضُوْا عَنْهُ بِمَا مَنَّ عَلَیْهِمْ مِنْ مُتَابَعَتِهِمْ رَسُوْلَهٗ وَقَبُوْلِهِمْ مَا جَآءَ بِهٖ۔

امام ابی عبد اللہ جعفر صادق رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ انہوں نے اللہ تعالے کے قول "والسابقون الاولون ۔۔ ورضوا عنہ" تک کی تفسیر میں فرمایا کہ اللہ تو ان سے یوں راضی ہوا کہ انہوں نے اس سے پہلے توفیق و مدد سے کام لیا۔ اور وہ یوں اللہ سے راضی ہوئے کہ اس نے ان پر یہ احسان کیا کہ رسول کی متابعت اور ان کے لائے ہوئے دین کی پیروی کا موقعہ نصیب ہوا۔

www.Ahlehaq.com

لہذا معلوم ہوا کہ مہاجرین و انصار رضوان اللہ علیہم کے تابعین کو رضوان الٰہی کا مرتبہ و مقام حاصل ہے۔ اور بموجب نص قرآنی۔ ورضوان من اللہ اکبر۔ اللہ کی ذرا سی رضا تمام دنیاوی و اخروی لذائذ و نعائم سے بڑھ چڑھ کر ہے۔

(۲) :۔ انہی روایات میں سے ایک روایت صاحب الفصول کی ہے جو ایک امامی اثنا عشری مصنف ہے۔

عَنْ اَبِیْ جَعْفَرٍ مُحَمَّدِ بْنِ عَلِیٍّ الْبَاقِرِ عَلَیْهِ السَّلَامُ اَنَّهٗ قَالَ لِجَمَاعَةٍ خَاضُوْا فِیْ اَبِیْ بَکْرٍ وَعُمَرَ وَعُثْمَانَ اَلَا تُخْبِرُوْنِیْ اَنْتُمْ مِنَ الْمُهَاجِرِیْنَ الَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ یَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا وَیَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ قَالُوْا لَا قَالَ فَاَنْتُمْ مِنَ الَّذِیْنَ تَبَوَّؤُا الدَّارَ وَالْاِیْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ یُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَیْهِمْ قَالُوْا لَا قَالَ اَمَّا اَنْتُمْ فَقَدْ بَرِئْتُمْ اَنْ تَکُوْنُوْا اَحَدَ هٰذَیْنِ الْفَرِیْقَیْنِ وَاَنَا اَشْهَدُ اَنَّکُمْ لَسْتُمْ مِنَ الَّذِیْنَ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی وَالَّذِیْنَ جَآءُوْا مِنْ بَعْدِهِمْ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِیْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِیْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِیْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَا اِنَّکَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ۔

ابی جعفر محمد بن علی باقر رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے انہوں نے اس گروہ سے جو حضرات ابوبکر و عمر و عثمان رضوان اللہ عنہم کے بارے میں باتیں بنا رہے تھے۔ فرمایا مجھے بتاؤ تو کیا تم مہاجر ہو جو اپنے گھروں سے نکالے گئے اور جن کا مال اس لیے ضبط کیا گیا۔ کہ وہ اللہ کے فضل و رضا کے طالب تھے اور اللہ و رسول کی جی جان سے مدد کرتے ہیں۔ انہوں نے جواب دیا نہیں ہم وہ مہاجر نہیں۔ تب آپ نے دریافت کیا کہ کیا تم وہ لوگ ہو جنہوں نے دار ہجرت میں مقام کیا اور ایمان میں سبقت کی اور جو لوگ ہجرت کر کے ان کے پاس گئے یہ ان سے محبت کرتے ہیں۔ وہ کہنے لگے نہیں ہم ان میں سے بھی نہیں۔ تب آپ نے فرمایا گویا تمکو اقرار ہے کہ ان دونوں فرقوں میں سے ہونے کا تمہارا کوئی دعوی نہیں۔ اور میں بھی گواہی دیتا ہوں کہ تم ان میں سے نہیں ہو جنکے متعلق اللہ تعالی نے یہ فرمایا ہے۔ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا ۔۔۔ آخر آیت تک۔۔

اس اثر سے صاف معلوم ہوا کہ صحابہ کبار رضوان اللہ علیہم کی شان میں بدگوئی کرنے والے یہ کہ نہ صرف گمراہ ہی ہیں بلکہ دائرۂ ملت سے بھی خارج ہیں۔

(۳) :۔ انہی روایات میں سے جناب امام سجاد رحمۃ اللہ علیہ کی یہ روایت ہے کہ آپ نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کے حق میں دعا فرمائی ان پر درود بھیجا اور ان الفاظ میں ان کی مدح و ثنا فرمائی۔

بِاَنَّهُمْ اَحْسَنُوا الصُّحْبَةَ وَاَنَّهُمْ فَارَقُوا الْاَزْوَاجَ وَالْاَوْلَادَ فِیْ اِظْهَارِ کَلِمَتِهٖ وَاَنَّهُمْ کَانُوْا مُصِرِّیْنَ عَلٰی مَحَبَّتِهٖ۔

وہ نیک صحبت لوگ تھے انہوں نے کلمۃ اللہ کی خاطر اپنی بیوی بچوں کو بھی چھوڑ دیا اور اسی کی محبت پر ڈٹے رہے۔

اور بعد دعا یہ بھی فرمایا۔

لِلَّذِیْنَ اتَّبَعُوا الصَّحَابَةَ بِاِحْسَانٍ الَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِیْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِیْمَانِ۔

جنہوں نے صحابہ کی پیروی واقعی صحیح طور کی وہ اپنی دعاؤں میں (دلوں میں یاد رکھتے ہیں) اور کہتے ہیں اے ہمارے رب ہمیں اور ہمارے ان بھائیوں کی مغفرت فرما جو ایمان کے

www.Allehaq.com

ساتھ ہم سے پہلے گذر چکے ہیں۔

بحمد اللہ اس وصف سے متصف فرقہ اہلسنت ہی کا ہے۔ ناصبی خوارج اور رافضی تو کھلم کھلا اس وصف سے محروم ہیں۔

(۴) :۔ روایت ذیل کو شیعہ محدثین نے جناب امام حسن عسکری رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے۔ اور جس تفسیر کو شیعہ انہیں کی طرف منسوب کرتے ہیں اس تفسیر میں بھی یہ موجود ہے۔

إن الله أوحى إلى آدم يا آدم إن محمداً لو وزن به جميع الخلق من النبيين والمرسلين والملائكة المقربين وسائر عباد الله الصالحين من أول الدهر إلى آخره ومن الثرى إلى العرش لرجح بهم يا آدم لو أحب رجل من الكفار أو جميعهم رجلاً من آل محمد وأصحابه لكافاه الله عز وجل عن ذلك بأن يختم له بالتوبة والإيمان ثم يدخله الجنة۔

اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو بذریعہ وحی مطلع فرمایا کہ اگر محمدؐ کو ایک طرف رکھ کر اور باقی ساری مخلوق ۔ انبیاء ورسل مقرب فرشتے نیک بندے از ابتدار تا انتہائے زمانہ۔ از زمین تا عرش۔ کو دوسری طرف رکھکر تولا جائے تب بھی محمدؐ کا پلڑا بھاری ہوگا۔ اور اے آدمؑ کافروں میں سے کوئی یا سب اولاد محمد یا اصحاب محمد میں سے کسی کو محبوب رکھے تو اللہ اسکے لیے کافی ہوجائے گا کہ اسکا خاتمہ ایمان توبہ پر فرمائے اور اسکو جنت میں داخل کرے

اس روایت میں کسی شیعی، خارجی، ناصبی، کیلیے تمسک کی کوئی گنجائش ہی نہیں کہ وہ بھی یہ کہکر کہ ہم بھی بعض آل یا اصحاب محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) کو محبوب رکھتے ہیں اس لیے ہمارا بھی حشر ایسا ہی ہوگا۔ اسلئے کہ کسی سے محبت کے ساتھ ساتھ یہ شرط بھی تو ہے کہ انہیں میں سے کسی کے ساتھ بغض وعداوت بھی نہ رکھتا ہو۔ کسی کے ساتھ عداوت رکھتے ہوئے کسی دوسرے کی محبت کا دعوی قابل قبول نہیں۔ یہ کوئی گہری بات نہیں بالکل ظاہر اور سامنے کی بات ہے کہ جب ایک شخص کی محبت فضیلت کا سبب ہوئی تو اسکے خلاف بغض یقیناً باعث ذلت ونقصان ہوگا۔ اور چلئے ان امور سے تھوڑی دیر قطع نظر کرلیتے ہیں، مگر پھر بھی یہ بات تو ماننی پڑے گی کہ جو لوگ تمام آل اور تمام اصحاب کے ساتھ محبت رکھتے ہوں۔ وہ زیادہ حق رکھتے زیادہ بہتر ہونگے، اور درجہ میں زیادہ بلند ہوں گے ان سے جو چند سے محبت کرتے ہوں، اور ہمارا مقصد بھی یہی ہے۔

(۵) :۔ اسی تفسیر مذکورہ میں یہ روایت بھی مذکور ہے۔

إن الله تعالى أوحى إلى آدم أن الله ليفيض على كل واحد من محبي محمد وآل محمد وأصحاب محمد ما لو قسمت على كل عدد ما خلق الله من طول الدهر إلى آخره وكانوا كفاراً لأداهم إلى عاقبة محمودة وإيمان بالله حتى يستحقوا به الجنة وإن رجلاً ممن يبغض آل محمد وأصحابه أو واحداً منهم يعذبه الله عذاباً

اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی آدم علیہ السلام کو بتایا کہ اللہ تعالےٰ محمدؐ، آل محمدؐ اور اصحاب محمد صلے اللہ علیہ وسلم سے ہر محبت کرنے والے پر اسقدر مہربانیاں لٹاتا ہے کہ اگر وہ ابتدائے زمانہ سے لیکر آخر زمانہ تک کی کافر مخلوق پر تقسیم کردی جائے تو وہ ایمان باللہ اور انکی آخرت ایسی سنوار دے کہ وہ جنت کے مستحق بن جائیں۔ اور جو شخص آل محمد یا اصحاب محمد سے یا ان میں سے کسی ایک سے بغض وعداوت رکھ

www.alhaq.com

لَوْقُسِّمَ عَذَابُہٗ مِثْلِ خَلْقِ اللّٰہِ لَاَھْلَکَھُمْ اَجْمَعِیْنَ | تو اللہ تعالیٰ اسکو ایسا عذاب دے گا کہ اسے ساری مخلوق پر تقسیم کردیا جائے تو سب کو ہلاک کر ڈالے۔

ان روایات میں قابل غور ایک بات یہ بھی ہے کہ محبت کے ذکر میں واحداً (یعنی کسی ایک سے) نہیں فرمایا گیا جس سے معلوم ہوا کہ محبت تمام آل واصحاب رضی اللہ عنہم کی مطلوب ومقصود ہے اور بغض کے ذکر میں سب کے علاوہ۔ واحداً بھی علیحدہ سے ذکر کیا ہے جسکا صاف مطلب یہ ہے کہ ان حضرات میں سے کسی ایک سے بغض وعداوت بھی ہلاکت کیلیے کافی ہے۔ اب یہ بات دن میں چمکتے سورج کی طرح ظاہر ہے کہ تمام آل وتمام اصحاب رضوان اللہ علیہم سے محبت کرنے اور ان تمام کے بغض سے بری ہونے میں اہلسنت ہی تنہا ہیں۔ دوسرا کوئی نہیں۔ والحمد للہ علی ذالک۔

(۶) :۔ اسی سلسلہ کی ایک وہ روایت ہے جو نہج البلاغہ میں جناب امیر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔

اَنَّہٗ قَالَ اَلْزِمُوا السَّوَادَ الْاَعْظَمَ فَاِنَّ یَدَاللّٰہِ عَلَی الْجَمَاعَۃِ وَاِیَّاکُمْ وَالْفُرْقَۃَ فَاِنَّ الشَّاذَّ مِنَ النَّاسِ الشَّیْطَانُ۔ | آپ نے فرمایا کثرت کے ساتھ وابستہ رہو کہ جماعت پر اللہ کا ہاتھ ہوتا ہے۔ اور بچھڑ جانے سے بچو کیونکہ جماعت سے بچھڑ جانے والا شیطان ہے۔

اور ابتدار سے لیکر آجتک سواد اعظم اہلسنت ہی ہیں۔ رافضی، خارجی اور نواصب کسی بھی زمانہ میں نہ سواد اعظم رہے ہیں اور نہ انشاء اللہ قیامت تک ہونگے۔ انکے سواد اعظم ہونیکی صرف ایک ہی صورت ہے کہ وہ عقائد اہلسنت دل سے قبول کرلیں۔

(۷) :۔ بحوالہ امیر المومنین رضی اللہ عنہ نہج البلاغہ نے یہ روایت نقل ومحفوظ رکھی ہے۔

اِنَّ اَمِیْرَالْمُؤْمِنِیْنَ قَالَ لِلنَّاسِ۔ جَمَاعَۃٌ یَدُ اللّٰہِ عَلَیْھَا۔ وَغَضَبُ اللّٰہِ عَلٰی مَنْ خَالَفَھَا۔ | امیر المومنین رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ لوگوں کی ایک جماعت ایسی ہے جس پر اللہ کا ہاتھ ہے۔ اس جماعت کی مخالفت اللہ کے غصہ وغضب کو بھڑکاتی ہے۔

چودہ صدیاں بیت گئیں۔ آجتک سوائے اہل سنت کے کوئی جماعت نہیں گذری، لطیفہ یہ کہ شیعوں کے ہاں ان کا نام ہی جماعت پڑ گیا۔ اب گویا اس جماعت کا مخالف بقول جناب امیر المومنین رضی اللہ عنہ خدا کے غضب کا سزاوار ہوا۔

ان ہر دو روایات بالا کو ان کے دوسرے محدثین مثلاً ابوجعفر محمد بن یعقوب رازی کلینی، محمد بن علی بن بالویہ قمی، شیخ الطائفہ محمد بن الحسن الطوسی، اور دوسروں نے بھی روایت کیا ہے۔ قطع نظر اس سے کہ وہ نہج البلاغہ میں وارد ہے جو شیعوں کے نزدیک پوری کی پوری متواتر ہے۔ اور شیعہ اپنی کتابوں میں مختلف طرق سے لائے ہیں۔

یہ ہیں اہل بیت کرام رضوان اللہ علیہم کی وہ روایات جو اہل سنت کے مذہب کی حقیت وصحت کو ثابت کرتی ہیں۔ اور اگر بنظر غور دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اہلسنت کے پیشواؤں نے سب کچھ سیکھا ہی اہل بیت سے ہے۔ کیا فقہ واصول عقائد اور کیا سلوک طریقت یا تفسیر وحدیث سب کچھ انہیں سے حاصل کیا۔ اہل بیت سے ان کی شاگردی کا تعلق کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں بلکہ عالم آشکارا حقیقت ہے اور بہت مشہور ومعروف ہے۔ اور اسی تعلق کی بنا پر اہل بیت ہمیشہ ان سے نرمی، خلق اور فراخ قلبی سے پیش آتے رہے۔ بلکہ بشارتیں بھی دیں ہیں۔

اور اس بات کا اعتراف و اقرار علمائے امامیہ سے بھی ثابت ہے۔ اگر کوئی جان بوجھ کر ڈھیٹ پنے سے حق سے آنکھ چرائے تو اسکا کوئی علاج نہیں۔ ابن مطہر حلی نے نہج الحق اور منہج الکرامہ میں اسکا اعتراف کیا ہے کہ امام اعظم ابوحنیفہ امام مدینہ امام مالک رحمہما اللہ نے جناب صادق رحمۃ اللہ علیہ سے علم حاصل کیا۔ امام شافعیؒ امام مالک رحمہما اللہ کے اور امام احمد بن حنبل امام شافعی رحمہما اللہ کے شاگرد ہیں۔ اور جناب امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے جناب باقر اور زید شہید رحمہما اللہ سے بھی تلمذ کیا ہے۔

امامیہ اپنے ان مجتہدوں کو واجب الاطاعت مانتے ہیں۔ جو امام کی غیر موجودگی میں اجتہاد کی شرائط اپنے اندر رکھتے ہوں لیکن وہ مجتہد جو ائمہ کی موجودگی میں شروط اجتہاد کا مالک ہی نہ ہو بلکہ ائمہ سے اجتہاد اور فتویٰ کی اجازت بھی حاصل کر چکا ہو۔ امامیہ کے نزدیک اسکے مذہب کا اتباع تو بطریق اولیٰ ہونا چاہیے (لیکن ایسا نہیں ہے) یہ بات خود شیخ حلی کو تسلیم ہے وہ اعتراف کرتا ہے کہ جناب باقر، زید شہید اور جعفر صادق رحمہم اللہ نے امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو فتویٰ کی اجازت دی ہے۔ لہٰذا آپ کا جامع الشروط ہونا بھی نص امام سے ثابت ہوا۔ اب شیعوں میں سے جو بھی امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو واجب الاطاعت نہ جانے وہ گویا "معصوم" کی شہادت کو جھٹلاتا ہے۔ اور یہ بات عامی شیعہ بھی جانتا ہے کہ معصوم کی شہادت جھٹلانا کفر ہے۔ خصوصًا امام کی غیر موجودگی میں۔ ان کا مذہب ابن بابویہ، ابن عقیل، اور ابن المعلم کے مقابلہ میں زیادہ قابل اتباع ہوگا۔

کہیں تو یہ انصاف کریں اور تعصب اور عناد سے دست بردار ہوں۔ اس بارہ میں اہلسنت کی روایات نہیں مانتے چلو نہ مانیں خود امامیوں کی روایات تو انکے لیے قابل قبول ہونی چاہئیں۔ چنانچہ ابوالمحاسن حسن بن علی نے اپنی اسناد سے ابی البجیری سے روایت کی ہے: کہ

دَخَلَ اَبُوْحَنِيْفَةَ عَلٰى اَبِيْ عَبْدِ اللهِ عَلَيْهِ السَّلَامُ فَلَمَّا نَظَرَ اِلَيْهِ الصَّادِقُ قَالَ كَاَنِّيْ اَنْظُرُ اِلَيْكَ وَاَنْتَ تُحْيِيْ سُنَّةَ جَدِّيْ بَعْدَ مَا انْدَرَسَتْ وَتَكُوْنُ مَفْزَعًا لِكُلِّ مَلْهُوْفٍ غِيَاثًا لِكُلِّ مَهْمُوْمٍ يَسْلُكُ الْمُتَحَيِّرُوْنَ اِذَا وَقَفُوْا وَتَهْدِيْهِمْ اِلٰى وَاضِحِ الطَّرِيْقِ اِذَا تَحَيَّرُوْا فَلَكَ مِنَ اللهِ الْعَوْنُ وَالتَّوْفِيْقُ يَسْلُكُ الرَّبَّانِيُّوْنَ بِكَ الطَّرِيْقَ۔

ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ جناب ابی عبداللہ رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں آئے جناب صادق رحمۃ اللہ علیہ نے جب ان کو دیکھا تو فرمایا گویا میں دیکھ رہا ہوں کہ تم میرے نانا کی سنت کو زندہ کر رہے ہو جبکہ وہ مٹ چکی ہے۔ تم ہر مضطر کی جائے پناہ ہوگے اور ہر غمگین کی فریادرسی کا مرکز ہوگے جب حیرت زدہ ٹھٹھک کر کھڑے کے کھڑے رہ جائیں گے تو تم ہی سے راستہ پوچھیں گے۔ اور جب وہ حیرانی میں ہونگے تو تم ہی ان کو کھلے راستہ پر لگاؤ گے تو اللہ کی طرف سے تم کو مدد اور توفیق ملے گی۔ اللہ والے تم سے راستہ پوچھا کریں گے۔

سارے ہی امامیہ یہ روایت کرتے اسے تسلیم کرتے اور مانتے ہیں کہ "جب امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ خلیفہ وقت ابومنصور کے پاس آئے تو اسکے پاس عیسیٰ بن موسیٰ حاضر تھے وہ کہنے لگے اے امیر المؤمنین یہ آج پوری دنیا کے بڑے اور نامور عالم ہیں اس پر منصور نے پوچھا اے نعمان! تم نے کس سے اکتساب علم کیا ہے؟ ابوحنیفہؒ بولے علیؓ کے ساتھیوں سے اور انہوں نے علیؓ سے۔ اور عبداللہ بن عباس کے ساتھیوں سے اور انہوں نے عبداللہ بن عباس سے اس پر منصور بولا۔ اے جوان! تم نے بڑا درجہ استناد حاصل کیا ہے۔

www.AhleHaq.com

اور یہ بھی ان امامیوں ہی کی کتب میں مسطور و مرقوم ہے کہ "ابو حنیفہؒ مسجد حرام میں بیٹھے ہوئے تھے آپ کے ارد گرد لوگوں کا ہجوم تھا جو آپ کو گھیرے ہوئے تھے اور ہر طرف سے آپ سے سوال پوچھے اور آپ کی طرف سے جوابات دیئے جا رہے تھے۔ سوالات کے جواب اتنے برجستہ اور فوری ہوتے گویا وہ پہلے سے آپ کی جیب میں ہوں اور آپ نکال نکال کر دے رہے ہوں۔ اسوقت اچانک ابو عبداللہ رحمۃ اللہ علیہ آپکے پاس آکر کھڑے ہو گئے۔ جناب ابو حنیفہؒ نے جب آپ کو دیکھا فوراً تعظیماً کھڑے ہو کر کہا اے ابن رسول اللہ۔ اگر آپ کی آمد کی مجھے بھنک بھی مل جاتی تو اللہ تعالیٰ مجھے اس حال میں نہ دیکھتا کہ میں بیٹھا ہوں اور آپ کھڑے ہوں۔ ابو عبداللہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا تم بیٹھے رہو۔ لوگوں کو جواب دیتے رہو میں نے اپنے باپ دادا کو اسی طرح پایا ہے"۔

حضرت امیر رضی اللہ عنہ کے مسئلہ تفضیل کے ذیل میں شرح تجرید ابن مطہر حلی میں یہ دونوں روایتیں موجود ہیں۔

اگر اس موقع پر کسی شیعہ کے دل میں یہ شیطانی وغدغہ پیدا ہو کہ جب امام ابو حنیفہؒ یا ان جیسے مجتہدین اہلسنت حضرات ائمہؒ کے شاگرد تھے تو پھر بہت سے مسائل میں ان حضرات کے خلاف فتاوی کیوں دیئے۔ تو اسکا جواب قاضی نور اللہ شوستری کی مجالس المومنین میں موجود ہے وہ کہتے ہیں کہ جناب عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما جناب امیر رضی اللہ عنہ کے شاگرد تھے اور آپ کے سامنے ہی درجۂ اجتہاد تک پہنچ چکے تھے اور آپؓ کی موجودگی میں اجتہاد کیا کرتے تھے اور بعض مسائل میں جناب امیر رضی اللہ سے اختلاف بھی کرتے تھے۔ اور آپ اسے جائز سمجھتے۔

ہشام احول، ابن سالم، میثمی، زرارہ، اصول عقائد الٰہیہ میں مثلاً تجسیم وصورت اور حدوث علم باری تعالیٰ میں حضرات ائمہ کے صریح مخالف تھے۔ کلینی اور امامیہ کی دوسری صحیح کتابوں میں بذریعہ ثقات ایسی روایات موجود ہے کہ حضرات ائمہ ان سب مذکورہ لوگوں سے ان عقائد میں مخالفت کے سبب نفرت فرماتے اور انہیں سرزنش بھی کرتے اس سب کے باوجود بھی ان بزرگوں سے انکی شاگردی اور تلمذ سے کسی کو انکار نہیں۔ اور جب یہ لوگ ان ائمہ سے روایات بیان کرتے ہیں تو ان سے کوئی بھی سرتابی نہیں کرتا۔

امام ابو حنیفہ اور امام مالک رحمہما اللہ کا اختلاف تو محض فروع فقہیہ میں ہے اصول عقائد میں کوئی اختلاف نہیں۔ پھر بھی انکو نظر سے گرایا جا رہا ہے۔ اسکا سبب؟ تعصب وعناد کے سوا اسکو تو کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔

اس سے معلوم ہوا کہ مجتہد کو اپنی دلیل کی پیروی لازم ہے۔ ہاں مسائل منصوصہ کے خلاف دیدہ و دانستہ کرنا اس کیلئے حرام ہے۔ اور جب مسئلہ کے لیئے کوئی نص موجود نہ ہو تو مجتہد اور "امام معصوم" میں یہ فرق ہے کہ مجتہد کے اجتہاد میں خطا کا احتمال رہتا ہے اور "امام معصوم" کا قول یقیناً صحیح ہوتا ہے۔ اور خطا کی صورت میں مجتہد پر کوئی عتاب نہیں بلکہ اسکو ایک گونہ اجر ملتا ہے۔ چنانچہ معالم الاصول شیعہ میں اسکی تصریح موجود ہے۔ تو مجتہد کی خطائے احتمالی بمنزلہ صواب یقینی کے ہوئی جسے کوئی خوف و خطر نہیں ہوتا۔ نہ اسکے ہی حق میں نہ مقلد کے حق میں۔ البتہ یہ شرط ضرور ہے کہ اجتہاد اپنی جگہ اور صحیح صورت حال کے ساتھ ہو یعنی قرآن صریح۔ خبر متواتر یا مشہور اور اجماع امت کے مقابلہ میں اجتہاد نہ ہو۔ اس لیے کہ ان دلائل کی موجودگی میں اجتہاد درست نہیں۔

پھر ہم نے یہ بھی دیکھا کہ اہلسنت کے مجتہدین اور ان کے راوی سارے کے سارے تقویٰ، عدالت اور دیانت میں

اتنے مشہور و معروف ہیں کہ شیعہ بھی عقیدۂ سنت کے طعن کے سوا ان میں فسق، کذب، یا دنیاداری جیسا کوئی عیب بھی لگانے کی جرأت نہیں کر سکتے۔ جبکہ دوسرے فرقوں خصوصاً شیعوں کے رواۃ کا جو حال ہے وہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ انکے راوی خود انہی کے ہاتھوں ایسے مجروح و مطعون ہیں کہ باید و شاید کسی اور فرقے کے راوی ایسے ہوں۔

صفین کی جنگ کے بعد جناب امیرؓ کے لشکری جو خلاصۂ فرقہ ہیں اور اس گروہ کے قرن اول اور جناب امیر رضی اللہ عنہ کے اقوال و افعال زیادہ تر انہی مطعون و مجروح رواۃ کی وساطت سے مروی ہیں ان کا حال آنجنابؓ کے خطبوں منقولہ نہج البلاغہ میں پوری شرح و بسط کے ساتھ بیان ہو چکا کہ یہ کس قدر خائن فاسق امامؑ کے احکامات کے نافرمان کاذب اور جھوٹے تھے۔ انکے سارے طور طریقے منافقوں کے سے تھے۔ جناب امیر رضی اللہ عنہ نے بھی ان کی منافقت کی گواہی دی۔ اور کوفہ کی جماعت جنکی روایت پر عقیدہ کا دار و مدار ہے۔ جیسے ہشامین، زرارہ، میثمی وغیرہ ان سب کو خود ائمہ نے تجسیم کے معاملہ میں افتراء پرداز کہا اور ان کو بدعادی اور لعنت بھیجی ہے۔ بعض کو اپنی صحبت میں آنے سے روک دیا جیسا کہ عبداللہ بن مسکان۔ شیخ مقتول نے "ذکری" میں اسکا ذکر کیا ہے۔

اور ان رواۃ میں بعض تو ایسے ہیں کہ انکا اسلام بھی ثابت نہیں مثلاً زکریا بن ابراہیم نصرانی جس سے ابو جعفر طوسی اور دوسرے لوگوں نے روایات لی ہیں۔ اور عباسی دور میں جب ائمہ نظر بند رکھے جاتے تھے تو شیعوں کے اکثر راوی عباسیوں کے ڈر سے گھر سے باہر تک نہ نکلتے تھے نہ ائمہ سے اپنے تعلق کا اظہار کر سکتے تھے۔ بخلاف اہلسنت کے کہ ان کے علماء اس وقت بھی ائمہ سے شرف ملاقات حاصل کرتے اور اکتساب فیض کرتے تھے۔ ساری تاریخوں میں یہ لکھا ہوا ہے کہ جناب موسیٰ کاظم رحمۃ اللہ علیہ عباسی خلیفہ کی جیل میں نظر بند تھے تو امام محمد (محمد بن الحسن الشیبانی) اور قاضی ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہما ان کی زیارت کو جاتے اور علمی مشکلات کو حل کرتے ایسے عالم میں کہ وہ متہم ہونیکی بنا پر اسیر حکومت تھے۔ ان حضرات کا ان سے ملاقات کرنا انکے انتہائی خلوص اور تعلق خاطر کا مظہر ہے اور یہ تاریخی بات امامیہ کی اپنی کتابوں میں بھی مذکور ہے۔ امامیہ میں سے صاحب الفصول نے مذکورہ بالا ہر دو حضرات سے جناب موسیٰ کاظم رحمۃ اللہ علیہ کے خرق عادات کے باب میں روایت بھی بیان کی ہے

أَنَّهُمَا قَالَا لَمَّا حَبَسَهُ هَارُونُ الرَّشِيدُ دَخَلْنَا عَلَيْهِ وَجَلَسْنَا عِنْدَهُ فَجَاءَ بَعْضُ الْمُوَكِّلِينَ فَقَالَ إِنِّي قَدْ فَرَغْتُ فَأَنْصَرِفُ فَإِنْ كَانَ لَكَ حَاجَةٌ فِي شَيْءٍ آتِيكَ بِهَا حِينَ أَجِيئُكَ غَدًا فَقَالَ مَا لِي حَاجَةٌ ثُمَّ قَالَ لَنَا إِنِّي أَعْجَبُ مِنَ الرَّجُلِ سَأَلَنِي أَنْ أُكَلِّفَهُ حَاجَةً يَأْتِي بِهَا مَعَهُ إِذَا جَاءَ وَهُوَ مَيِّتٌ فِي هٰذِهِ اللَّيْلَةِ فُجَاءَةً فَمَاتَ الرَّجُلُ فِي لَيْلَتِهِ تِلْكَ فُجَاءَةً۔

انہوں نے کہا کہ جب ہارون رشید نے انکو قید کیا تو ہم انکے پاس گئے اور انکے پاس بیٹھ گئے۔ آپ کے پاس کوئی مامور و متعین شدہ شخص آیا اور کہنے لگا کہ میں ڈیوٹی سے فارغ ہو کر واپس جا رہا ہوں آپ اگر کسی چیز کی ضرورت یا خواہش رکھتے ہوں تو بتائیں میں کل لیتا آؤں گا۔ آپ نے اسے جواب دیا نہیں مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں پھر ہم سے فرمایا میں اس پر حیران ہوں کہ یہ شخص جو مجھ سے میری حاجت پوچھتا ہے۔ کہ اگر کچھ ہو تو میں کل لیتا

آؤں مگر یہ تورات ہی کو مرنے والا ہے چنانچہ وہ شخص اسی شب اچانک فوت ہو گیا۔

ایک اور بات یہ بھی ہے کہ اہلسنت کا مذہب ہمیشہ ظاہر و مشہور رہا۔ اور شیعوں کا مذہب اسکے برعکس ہمیشہ مستور و مخفی رہا (کسی سازش کی طرح) اور دین محمدی صلے اللہ علیہ وسلم کو ظاہر ہونا لازم ہے فرمان خداوندی ہے هُوَ الَّذِيْ أَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ (وہ، وہ ہے جس نے ہدایت و دین حق کے ساتھ اپنا رسول بھیجا تاکہ تمام دینوں پر اسکو غالب و ظاہر کرے) اور یہ بھی فرمایا وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُوْنَ (ہم نے زبور میں ذکر کے بعد یہ اعلان کر دیا تھا کہ زمین کے وارث میرے صالح بندے ہونگے) اور اس پر اتفاق ہے کہ عباد سے مراد امت محمد صلے اللہ علیہ وسلم ہے۔ عرب، عجم، شام، روم، مصر، مغرب کے وارث ہمیشہ اہلسنت ہی رہے ہیں۔ جب مسلمانوں کی شامت اعمال سے عراق و خراسان پر تاتاری کافروں اور چنگیزیوں کا تسلط ہوا۔ تو ان شہروں کے وارث شیعہ ہوئے گویا دولت محمدی کے اصل وارث اہلسنت ہیں۔ اور شیعوں کا یہ گروہ چنگیزیوں کے اگلے ہوئے لقمے کھانے والا ہے۔

اور ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ اہل تشیع اور اہلسنت کے اختلاف کا مدار اور مرکزی مسئلہ امامت کا معاملہ ہے۔ ان کے ہاں امامت کا مسئلہ ایسے پانچ اصولوں پر موقوف ہے جن میں سے کوئی ایک بھی قابل سماع دلیل سے ثابت نہیں۔ وہ اصول خمسہ یہ ہیں:۔

اصل اول :۔ یہ کہ حضرت امیر رضی اللہ عنہ۔ بلا فصل امام (خلیفہ) تھے۔

اصل دوم :۔ ائمہ کی تعداد میں نہ کمی ہو سکتی ہے نہ زیادتی۔

اصل سوم :۔ امام آخر کی درازی عمر۔ ان کا پوشیدہ رہنا۔ یا مرنے کے بعد انکی واپسی جیسا کہ انکے فرقوں میں اختلاف ہے۔ یہ تینوں باتیں کتاب اللہ اور اخبار متواترہ سے نہ آجتک ثابت کی جا سکی ہیں اور نہ قیامت تک ثابت ہونگی۔

اصل چہارم :۔ صحابہ کا مرتد و کافر ہونا۔ حق کو چھپانا باطل کو ظاہر کرنا۔ ناشائستہ امور پر ان سب کا اتفاق۔ حالانکہ قرآن مجید میں صحابہ کی شان میں اور انکے حال کی اچھائی اور انکے نتیجہ کی بہتری پر صاف اور کھلے طور پر شاہد و ناطق ہیں:

اصل پنجم :۔ ائمہ کے متعلق تقیہ کا اعتقاد رکھنا کہ شیعوں کو وہ ایسی باتیں بتا دیتے تھے جو اوروں سے چھپاتے تھے۔ حالانکہ وہ دوسرے بھی انہی کے شاگرد ہوتے انہی سے علم و طریقت حاصل کئے ہوتے۔ تو بلا وجہ اور بےسبب حضرات ائمہ کے لیے جھوٹ بولنا کیا ضرور تھا۔

ان پانچوں امور کو جنکو شیعہ۔ اسلام کے ارکان خمسہ، کی مانند جانتے ہیں۔ ہم نے ظاہری عقل، کتاب اللہ، سنت مشہورۂ محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) بلکہ ساری اگلی پچھلی شریعتوں کے قواعد پر ان کو جانچ پرکھ کر دیکھ لیا اور ان کو سب کے خلاف پایا اور یوں ہم نے یقین کے ساتھ جان اور سمجھ لیا کہ یہ مذہب خاندان نبوت سے نہیں لیا گیا بلکہ ایک مصنوعی اور اختراعی مذہب ہے۔ (جسکی پہلی بنیادی اینٹ عبداللہ بن سبا نے نصب کی اور پھر اسکے حواریوں نے موقعہ بموقعہ وقتاً فوقتاً اسکی تعمیر و تکمیل میں اہم کردار ادا کیا اور یہ کوئی سر

www.Ahlehaq.com

بستہ راز نہیں کہ ابن سبا کا استاد معلم الملکوت ہے۔ ن)
ان اصول کے ثبوت میں شیعوں نے جو دلائل دیئے ہیں وہ دو حال سے خالی نہیں۔ یا تو وہ ایسی احادیث ہیں جو ضعیف الحال راویوں سے مروی ہیں جنکا انکے زمانہ میں علماء میں شمار ہی نہ تھا۔ اور جنکے راوی خود انکے نزدیک جرح و قدح سے مجروح و مطعون اور جھوٹ و بد دیانتی سے متہم ہے۔ یا وہ قرآنی آیات ہیں کہ ان کے ساتھ جب تک اسباب نزول اور خصوصی واقعات شامل نہ کیئے جائیں ان کے ظاہر سے ان کا مقصد ہرگز حاصل نہیں ہوتا۔ اور وہ اسباب نزول یا خصوصی واقعات اکثر موضوع، ضعیف اور اقرار شدہ اخبارات ہوتی ہیں۔ لیکن پھر بھی اصل مطلب حاصل کرنے کے لیے گھڑے ہوئے ناقابل تسلیم مقدمات ملانے ضروری ہوتے ہیں۔ چنانچہ اسکی تفصیل گذر چکی ہے۔

ان امور میں جو بھی عقلمند غور و خوض سے کام لے اور حقیقت حال سے واقف ہو وہ بلا تأمل اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ یہ مذہب از ابتدا تا انتہا، فریب، مخترع، اور مصنوعی ہے۔ اور یہ بات روز روشن کی طرح اسپر عیاں ہو جائیگی۔ وَاللّٰهُ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ۔

ان کے مذہب کے مطالعہ کے دوران ایک یہ بات بھی ہم نے دیکھی اور محسوس کی کہ شیعہ مذہب اصول و فروع میں کافروں کے پانچ مذہبوں سے بہت مشابہت رکھتا ہے۔ یعنی یہود، نصاریٰ، صابئین، مجوس اور ہنود۔ دنیا بھر کے کفار میں علماء، کتب، اور تصنیف و تالیف کے نقطۂ نظر سے یہی پانچ مذہب ممتاز اور مشہور ہیں۔ اور ملت حنیفیہ کے سراسر خلاف ہیں۔

اور انتہائی غور و فکر سے کام لینے پر یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ شیعہ مذہب بحیثیت مجموعی بعینہ ان فرقوں کا مذہب ہے۔ ہر مذہب سے ایک نہ ایک چیز لے لی ہے۔ مثلاً۔ اپنی تعریف میں مبالغہ سے کام لینا۔ عذاب الٰہی سے امن میں رہنے کا دعویٰ، عذاب و عقاب سوال و جواب، وزن اعمال سے خود کو مستثنیٰ کرنا، اور ان امور کو دوسروں کے ساتھ مخصوص کرنا۔ یہ سب کچھ یہود سے لیا ہے کیونکہ وہ ہی کہتے تھے۔ نَحْنُ أَبْنَاءُ اللّٰهِ وَأَحِبَّاؤُهُ (ہم اللہ کے بیٹے اور اسکے دوست ہیں) لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ إِلَّا أَيَّامًا مَعْدُودَاتٍ (ہمیں آگ چندوں سے زیادہ نہ چھوئے گی) لَنْ يَدْخُلَ الْجَنَّةَ إِلَّا مَنْ كَانَ هُودًا أَوْ نَصَارَىٰ (یہودی و نصرانی کے سوا کوئی جنت میں داخل نہیں ہوگا) اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم سے بغض و عناد رکھنا اور خدا کے مقرب بندوں اور محبوب دوستوں سے تعصب۔ یہ بھی یہودیوں کی انکے لیے بخشش ہے قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِجِبْرِيلَ اسپر گواہ ہے۔ اللہ تعالےٰ کو مخلوق سے تشبیہ دینا۔ بدأ کا قول۔ یہ بھی یہود کی چھوڑی ہوئی ہنڈیاں یا لگے ہوئے لقمے ہیں جو ان کے خوان مذہب کا حصہ ہیں۔

ائمہ کی محبت میں غلو، انکو اکرامانا، ان میں روح الٰہی کے حلول کا عقیدہ، انکو معصوم جاننا، انکے لیے علم ثابت کرنا، موت ان کے ہاتھ میں ہونے کا عقیدہ رکھنا، جناب امیرؓ کو قاسم جنت و دوزخ تسلیم کرنا، ان کو روز جزا کا مالک قرار دینا اور اپنے کو انکی محبت کے سبب بخشا ہوا، نجات پایا ہوا سمجھنا، یہ سارے عقائد نصاریٰ کی پٹاریوں سے اڑائے ہوئے ہیں جو جناب مسیح علیہ السلام کی عبدیت کے منکر تھے۔ اور مذکورہ بالا مراتب انکے لیے ثابت کرتے تھے جسطرح شیعوں میں امام ہے نصاریٰ میں پوپ کا بھی وہی درجہ ہے۔ آدھے قرآن کو ظاہر پر محمول کرنا اور دوسرے آدھے کو جو صحابہ

ومہاجرین والانصار رضی اللہ عنہم کی تعریف میں ہے غلط سلط اور باطل تاویلات سے تحریف کرنا، یہ بھی یہود ونصاریٰ دونوں کی مشترک پلیٹ ہے جس میں یہ بھی منہ مار رہے ہیں۔ امامت کو جناب حسین رضی اللہ عنہ کی اولاد میں مخصوص ومحدود کرنا بھی یہود کے قول کے مشابہ ہے۔ وہ بھی نبوت کو حضرت اسحاق علیہ السلام کی اولاد کے ساتھ مخصوص مانتے ہیں۔ اپنے کو خدا کا دوست کہنا اور شیعۂ علی کی تعریف میں ایران توران کی ہانکنا بھی انہوں نے یہودیوں سے سیکھا ہے۔ یہودیوں کو تو اللہ تعالیٰ نے چیلنج دیا تھا کہ یہودیو! تم کو اگر یہ زعم ہے کہ تم ہی اللہ کے دوست ہو اور کوئی نہیں تو اپنا سچ ثابت کرنے کیلیے ذرا موت مانگ کر تو دکھاؤ۔ (ہم بھی ان پیروان یہود سے یہی کہتے ہیں کہ جب تم ہی اللہ کے دوست اور مستحق جنت ہو، مالک جنت بھی تمہارے اپنے پیارے ہیں تو پھر دنیا کے اس جہنم زار میں کیوں دنیا بھر کی لعنت پھٹکار سمیٹ رہے ہو مر کر جنت میں کیوں نہیں چلے جاتے۔ مرنا بس میں نہیں، مرنے کی آرزو تو کر سکتے ہو وہی کر کے دکھاؤ۔ ن) کتاب اللہ میں لفظی اور معنوی تحریف کر کے اس میں کچھ الفاظ کا اضافہ کرنا یہ بھی بعینہ یہودی حرکت ہے۔ یہود کہتے ہیں جب تک مسیح دجال نہ آئے جہاد جائز نہیں۔ اثنا عشری کہتے ہیں جب تک امام مہدی کا ظہور نہ ہو جہاد جائز نہیں۔ مغرب کی نماز کو ستارہ دیکھنے تک موخر کرنا بعینہ یہود کا مذہب ہے۔ تین طلاقوں کے یک وقت وقوع سے انکار کرنا بھی عین قول یہود کے مطابق ہے۔ یہودی کہتے ہیں مسلمانوں کی ایذا رسانی میں اتنا اتنا ثواب ہے اس مصرعہ پر شیعوں نے یہ گرہ لگائی کہ سنی کے قتل کی کوشش کو ستر سالہ عبادت کا درجہ دیا ہے۔ یہودی کہتے ہیں لَیْسَ عَلَیْنَا فِی الْاُمِّیّٖنَ سَبِیْلٌ (امیین کے حقوق غصب کرنے پر ہم سے کوئی جواب طلبی نہیں ہو سکتی ہے) امامیہ بھی یہی کہتے ہیں کہ سنیوں کی جان ومال وآبرو پر دست درازی میں کوئی مضائقہ نہیں۔

یہودی جناب عیسیٰ، مادر محترم مریم علیہما السلام اور ان کے حواریوں پر سب وشتم کرتے ہیں، شیعہ بھی اصحاب پیغمبر، خلفائے راشدین، امہات المومنین رضوان اللہ علیہم کو سب وشتم کرتے ہیں۔

نصاریٰ پیشاب پاخانے کی نجاست کو کوئی اہمیت نہیں دیتے وہ ناک کی ریزش یا تھوک کی طرح سمجھتے ہیں چنانچہ مذی، ودی، اور بعد پیشاب قضیب کو جھٹکنے اور خشک پاخانہ میں شیعوں کا بھی یہی مسلک ہے، ان کے نزدیک بھی یہ نجاسات کوئی اہمیت نہیں رکھتیں۔ نصاریٰ اپنی نمازوں میں قبلہ کو معین کرنے کی پابندی نہیں لگاتے چاروں طرف سجدہ کرنا جائز بتاتے ہیں، امامیہ بھی نوافل میں بلا عذر استقبال قبلہ کی قید اڑا دیتے ہیں۔ اور ہر طرف سجدہ کرتے ہیں۔ نئی اختراعی عیدوں کے منانے میں بھی نصاریٰ کے ساتھ پوری پوری مشابہت رکھتے ہیں کہ انہوں نے بھی بہت سی عیدیں اپنی طرف سے گھڑ لی ہے۔ یوم عاشورہ میں ائمہ کی قبروں پر تصاویر لگانا۔ ان کو سجدہ کرنا یا ان کے روبرو دست بستہ کھڑے رہنا نصاریٰ کے عمل سے ملتا جلتا ہے کہ وہ بھی کلیساؤں میں حضرت عیسیٰ، بی بی مریم (علیہما السلام) کی تصاویر بناتے ہیں، انکی تعظیم کرتے اور سجدہ کرتے ہیں،

اب ذرا صابئین سے مشابہت دیکھیے کہ جب قمر عقرب میں یا محاق میں ہوتا ہے اس سے احتراز کرتے ہیں۔ تاریخوں اور ایام کی سعادت ونحوست کے بارے میں بڑا پختہ عقیدہ رکھتے ہیں، نوروز اور شرف آفتاب کی تعظیم کرتے ہیں، صابئین تمام ستاروں کو فاعل مختار اور زمینی اشیاء کا خالق خیال کرتے ہیں، رافضی بھی تمام حیوانات

کو خالق و فاعل مختار جانتے ہیں۔
مجوسی نیکی و بدی کا الگ الگ خدا مانتے ہیں یعنی یزدان و اہرمن رافضی بھی خالق خیر خدا کو مانتے ہیں اور خالق شر شیطان و انسان کو ٹھیراتے ہیں۔ اسلیے علماء ملت نے انہیں اس ملت کے مجوسی ہونے کا خطاب دیا ہے۔ مجوسی عورت کے مباح کرنے میں فراخ دل، بلکہ انتہا درجہ بے غیرت و بے حیا معلوم ہوتے ہیں، مگر یہ رافضی بھی متعہ اور شرمگاہوں کے حلال کرنے میں انکے قدم بقدم ہیں۔ بلکہ متعہ اور تحلیل فروج میں بیٹیوں اور بہنوں کو حلال جانتے ہیں جسکی وجہ بیان ہو چکی۔
رہی ہنود سے مشابہت تو ہندو جو کچھ اپنے بتوں کے ساتھ کرتے ہیں وہی یہ لوگ ایام عاشورہ میں اپنے ائمہ کی قبور کی تصاویر کے ساتھ کرتے ہیں۔ انکو غسل دیتے ہیں، سوار کرتے نوبتیں بجاتے ہیں، انکے سامنے کھانا رکھتے ہیں، اور جھوٹا گوٹا بطور تبرک تقسیم کرتے ہیں، جناب قاسم اور بی بی سکینہ کا بیاہ، شادی، نکاح، رسم مہندی زندوں کی طرح عمل میں لاتے ہیں۔ بغور دیکھا جائے تو انکی توہم پرستی ہندوؤں سے بھی بڑھی ہوئی ہے۔ اسلیے کہ وہ تو صرف اشخاص کی تصویروں کی پرستش کرتے ہیں اور یہ قبروں اور اشخاص کے جنازوں کی تصویروں کی پوجا و پرستش کرتے ہیں ہندو گائے کے پیشاب اور گوبر کو پاک کہتے ہیں، یہ رافضی بھی انسان اور گائے دونوں کے پیشاب پاخانہ کو پاک جانتے ہیں، اور اسی طرح انکے نزدیک دونوں کا خشک پاخانہ بھی پاک ہے، ستر عورت ہندو کے ہاں لنگوٹی میں چھپنے والے تین اعضاء ہیں اور شیعہ مذہب میں یہی ستر عورت ہے، ہندو عبادت کے وقت ننگا رہنا اچھا خیال کرتے ہیں۔ رافضی بھی نماز و طواف میں برہنہ ہونے کو جائز کہتے ہیں بشرطیکہ آگے پیچھے کے اعضاء پر مٹی لتھیڑ لی جائے۔
ہندو اپنی پیشانی پر معبد کی خاک ملتے ہیں شیعہ بھی خاک ہی کو اپنی سجدہ گاہ بناتے اور قبلہ ٹھیرا لیتے ہیں۔
ہندو کے ہاں پرستش و پوجا کے وقت کپڑے کی پاکی شرط نہیں، امامیہ بھی اس کپڑے کو جو بدن سے متصل نہ ہو پاک ہونے کی شرط نہیں لگاتے، مثلاً پگڑی، ازار بند، کمربند، موزہ، سر پر چادر، پیشاب، مذی و دی ہندو کی طرح امامیہ کے نزدیک پاک ہیں، ہندو اپنی عبادت کیلیے کسی خاص سمت و جہت کو متعین نہیں کرتے، شیعہ بھی نوافل اور سجدہ تلاوت میں قبلہ رو ہونا فرض نہیں مانتے، ہندو اپنے روزے میں بعض اشیاء کا کھانا جائز رکھتے ہیں انکو روزہ توڑنے والی اشیاء شمار نہیں کرتے، شیعہ بھی غیر عادی اشیاء کھا لینے کو نواقض صوم نہیں جانتے مثلاً موم وغیرہ۔ ہندو کے نزدیک خون مسفوح حرام نہیں، رافضی بھی کھانے میں خون مسفوح بہت سا مل جانے کو بھی حلال کہتے ہیں، ہندو کے ہاں نکاح کی مشہوری اور گواہ ضروری نہیں، متعہ میں امامیہ بھی اسی روش کو مانتے ہیں۔
ہندو باندیوں کی شرمگاہیں جسکے لیے چاہیں حلال کر سکتے ہیں بعینہ یہی مسلک ان رافضیوں کا بھی ہے۔
غیر مسکوک چاندی سونے پر نہ ہندو کے ہاں زکوۃ ہے نہ ہی مذہب امامیہ میں۔

www.Ahlehaq.com

www.Ahlehaq.Com

بارھواں باب ۱۲

تولاّ ۔ اور تبرّا ۔

تولاّ کے معنی محبت کے ہیں اور **تبرّیٰ** کے معنی ہیں عداوت کے ۔

اس نازک بحث میں پڑنے سے پہلے چند مقدمات بترتیب گوش گذار کر لیجئے ضروری اور مفید ہیں ۔ یہ مقدمات شیعوں کے معتبر علماء کے اقوال اور آیات قرآنی کی رو سے ثابت شدہ ہیں ۔ پھر ان سے نتیجہ نکالکر وضاحت سے یہ معلوم کرنا چاہئے کہ قابل محبت کون ہے اور لائق عداوت کون ۔ اور یہ سب کچھ شیعوں کی مقرر کردہ اصول کی بنا پر ہوگا ۔ اہل سنت کے اقوال کو اس میں قطعًا کوئی دخل نہیں ۔

مقدمہ (۱) :۔ یہ کہ مخالفت اور عداوت میں فرق ہے ۔ مخالفت کو عداوت لازم نہیں ۔ بات اگرچہ صاف و ظاہر ہے ۔ محتاج دلیل نہیں مگر ضد توڑنے اور جائے فرار مسدود کرنے کی خاطر دو وجوہ سے اسے ثابت بھی کرتے ہیں

اوّل :۔ ملا محمد رفیع واعظ ۔ مصنف ابواب الجنان جو اثنا عشریہ میں ایک معتبر شخصیت شمار ہوتا ہے نے تصریح کی ہے کہ دو مومنوں کے درمیان امور دنیاوی میں مخالفت ممکن ہے ۔ گو بتقاضائے ایمان دونوں باہم محبت رکھتے ہوں

دوم :۔ اثنا عشریہ شیعوں کے اعتقاد کے موجب شیخ ابن بابویہ اور سید مرتضیٰ علم الہدیٰ کے درمیان فقہی مسائل یا مروی روایات کی تصحیح کے سلسلہ میں مثلاً میثاق وغیرہ میں باہم اختلاف متحقق اور ثابت ہے ۔ اس کے باوجود وہ اتحاد مذہب کے سبب باہم رابطۂ محبت بھی رکھتے ہیں ۔ لہذا مخالفت عداوت سے عام ہوگئی ۔ اس جہاں مخالفت ہو ضروری نہیں وہاں عداوت بھی ہو ۔ البتہ جہاں عداوت ہوگی وہاں مخالفت بھی ضرور ہوگی ۔

مقدمہ (۲) :۔ یہ کہ کبھی محبت و عداوت جمع بھی ہو جاتی ہیں ۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ عداوت دو قسم کی ہوتی ہے ۔ ایک دینی مثلاً مسلمان کی عداوت کافر کے ساتھ کہ محض اصول عقائد کی بنا پر ایک دوسرے کے دشمن ہوتے ہیں ۔ دوسرے دنیاوی مثلاً ایک مسلمان کی عداوت اپنے دوسرے مسلمان بھائی سے کسی دنیاوی نفع و نقصان کے سبب یا ایک دوسرے کے طور و طریقوں اور طرز عمل سے نفرت رکھنے کے باعث ۔ پس معلوم ہوا کہ مختلف الجنس یعنی دینی و دنیوی محبت و عداوت کا یکجا ہو جانا ناممکن الوقوع نہیں ہے بلکہ اکثر اوقات واقع ہو جاتا ہے ۔ اور متفق الجنس مختلف النوع یا مختلف النوع مختلف الصفت محبت و عداوت کا جمع ہونا بھی جائز الوقوع ہے ۔ جیسے مومن فاسق بحیثیت ایمان تو محبوب ہے اور بلحاظ فسق مبغوض ۔ (جیسے آیات المومنون والمومنات بعضھم اولیاء بعض ۔ اور ان اللہ لا یحب الخائنین ۔ یا ۔ ان اللہ لا یحب الظالمین) اور اسی دلیل سے کہ بری بات سے روکنا فرض ہے ۔ اور بری بات سے روکنے کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ اس سے دلی بغض رکھے ۔

اب یہاں ایک اور بحث ہے کہ بعض نیک اعمال کے صدور کے سبب مثلاً ، خیرات ، بھلائی ، انصاف ، دلوری ، مروت ، جوانمردی ، پاس عہد اور صدق کلامی کے کسی کافر سے بھی دینی محبت ہو سکتی ہے یا نہیں دوسری نظر تو مومن فاسق پر قیاس کرتے ہوئے محبت و عداوت کے جمع ہونے کا حکم لگاتی ہے مثلاً سخاوت کی

www.Alhaq.com

وجہ سے حاتم سے محبت یا عدالت کے سبب نوشیرواں سے محبت۔ مگر بنظر غور دیکھا جائے تو یہ محال نظر آتا ہے کہ دینی محبت وعداوت یکجا جمع ہوں۔ وجہ اور سلب یہ ہے کہ خدا کے ہاں کسی عمل کے مقبول ہونے کی شرط اول اعتقاد کی درستی ہے۔ یہاں چونکہ اعتقاد ہی فاسد ہے اسلئے اسکا عمل بھی دینی لحاظ سے خدا کے ہاں فاسد و نا مقبول ہوا اور قابل اعتبار نہ رہا چہ جائیکہ قابل محبت ہوتا۔ پس نیک اطوار کافر یا منصف مزاج کافر سے محبت دنیاوی تو ہو سکتی ہے، دینی نہیں، اللہ تعالےٰ فرماتے ہیں،

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍ بِقِيْعَةٍ يَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَاۤءً حَتّٰۤى اِذَا جَاۤءَهٗ لَمْ يَجِدْهُ شَيْـًٔا وَّوَجَدَ اللّٰهَ عِنْدَهٗ فَوَفّٰىهُ حِسَابَهٗ ؕ وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ،

جنھوں نے کفر کیا ان کے اعمال (خیر بھی) بیابانی سراب کی طرح ہیں کہ پیاسا ان کو دیکھ کر جب پہنچتا تو وہاں کچھ نہیں پاتا، وہاں قضائے الٰہی کو موجود پاتا ہے جو اسکا حساب برابر چکا دیگا۔ اللہ تعالےٰ حساب جلدی لینے والا ہے۔

لہٰذا معلوم ہو گیا کہ ایک شخص میں ایک ہی حیثیت سے محبت وعداوت کا جمع ہونا محال ہے۔ البتہ دو حیثیات سے جائز الوقوع ہے، چنانچہ ملا محمد رفیع واعظ صاحب ابواب الجنان نے سادات میں سے دو ائمہ کا قصہ نقل کیا ہے۔

اور یہ اجتماع جب عوام امت میں ممکن ہوا تو خواص امت میں بھی محال نہ رہا۔ کیونکہ مقتضائے بشریت تو ایک ہی ہے۔ عوام وخواص کے درمیان جو فرق ہے وہ اس حیثیت سے نہیں ہے کہ خواص سے بشریت کے احکام جاتے رہیں۔ اور عوام میں موجود رہیں۔ بلکہ یہ فرق فضائل ومناقب کی قلت وکثرت کے سبب۔ یا ایمان کی قوت وضعف کے باعث اور شریعت کے رواج دینے اور احکام الٰہی قبول کرنے میں آگے پیچھے ہونے کی وجہ سے ہے چنانچہ درجات ایمان کی لمبی حدیث میں بروایت کلینی جناب صادق رحمۃ اللہ علیہ سے یہ سب کچھ بیان ہو چکا۔ اور باتفاق رائے خواص امت کے تین طبقے ہیں" (۱) اہل بیت اولاد پیغمبر، آپکے اعزہ (۲) ازواج مطہرات (۳) مہاجرین والانصار میں سے چند مخصوص مخلصین (رضوان اللہ علیہم) اتنا ضرور ہے کہ ہر دو جانب مقابل باہم مناسبت رکھتے ہوں۔ مثلاً امت کے عام افراد کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ خواص کے ساتھ اسطرح پیش آئیں جیسے وہ آپس میں پیش آتے ہیں۔ اسپر کئی شرعی دلیلیں دی جا سکتی ہیں پہلی دلیل تو یہ مشہور حدیث شریف ہے۔

اَللّٰهَ اللّٰهَ فِيْ اَصْحَابِيْ لَا تَتَّخِذُوْهُمْ غَرَضًا مِّنْ بَعْدِيْ | دیکھو دیکھو میرے صحاب! میرے بعد انکو نشانہ نہ بنانا،

دوسری وہ حدیث جو اہل بیت والنصار کے بارے میں ہے، اَقْبَلُوْا عَنْ مُّحْسِنِهِمْ وَتَجَاوَزُوْا عَنْ مُّسِيْئِهِمْ (انکی بھلائیاں بیان کرنے والے کی بات مانو اور انکی برائی کرنے والوں سے کنارہ کش ہو جاؤ) ایک دلیل ہے وَ اَزْوَاجُهٗۤ اُمَّهٰتُهُمْ (آپ کی ازواج انکی مائیں ہیں) اور حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اِنَّ اَمْرَكُنَّ مِمَّا يُهِمُّنِيْ مِنْ بَعْدِيْ وَلَمْ يَصْبِرْ عَلَيْكُنَّ اِلَّا الصَّابِرُوْنَ (میرے بعد تمہارے جو حالات ومعاملات ہونگے مجھے وہ فکر مند کرتے ہیں۔ اور تمہارے معاملہ پر صابر ہی صبر واستقامت پر قائم رہ سکتا ہے) مطلب یہ کہ میرے بعد تمہاری اطاعت وفرمانبرداری اور تمہارے شایان شان حقوق تعظیم ہر کوئی بجالائے بڑا مشکل نظر آتا ہے ہاں وہی جو صبر واستقامت کامل رکھتا ہو۔

شرعی دلائل کے علاوہ اس سلسلہ میں عرف عام سے بھی بہت سی دلیلیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ کہ اولاد کیلئے یہ زیبا نہیں کہ وہ والدین کے ساتھ اسی طرح پیش آئے جسطرح آپس میں یا اپنے ہم جنسوں سے پیش آتا ہے۔ مثلاً انکے عیوب کی گرفت یا ان پر لعن و طعن وغیرہ۔ اور ایک دلیل یہ بھی ہے کہ ہر سلطنت میں خواص سلطنت کی ایک جماعت ہوتی ہے مثلاً شاہزادے، بیگمات، وزراء، عمائد اور امراء، جنہوں نے ابتداء میں اس سلطنت کی نشو و نما میں خاص کردار ادا کیا ہوا ہوتا ہے۔ اور انتہا میں وہ اسکے بقا کا سبب بنتے ہیں انہی ان تھک جد و جہد اور محنت کے سبب اس مملکت کا وجود ممکن ہو سکا۔ اب جو لوگ اس مملکت میں رہتے ہوئے فائدہ اٹھاتے ہیں انکے ذمہ ان حضرات کی سابقہ خدمات کا حق ادا کرنا اور انکے ربط قدیم کا اعتراف کرنا لازمی ہے ان قدیم ذمہ داران مملکت کے علاوہ ایک وہ جماعت ہوتی ہے جو قیام ملک کے بعد آئی اور اسکے وسائل سے مستفید ہو رہی ہے۔ تو یہ نئی جماعت جو برتاؤ اپنے ہم چشموں اور ہمعصروں سے کرتے ہیں ویسا ہی برتاؤ بانیان مملکت سے کریں گے تو وہ باعث طعن ہونگے اور لائق سرزنش ان خواص کا باہم معاملہ جیسا بھی ہو نئی جماعت اگر اپنے معاملات کو ان پر قیاس کریگی تو وہ توہین مملکت کا سبب بنیں گے۔ ایک دلیل یہ ہے کہ اگر کوئی رذیل کسی شریف کے ساتھ وہ معاملہ کرے جو اس شریف نے کسی دوسرے شریف کے ساتھ کیا ہو تو وہ عقلا کے نزدیک معذور نہیں سمجھا جائے گا بلکہ اسکو تنبیہ کریں گے سزا دیں گے اور کہیں گے۔ ایاز قدر خود بشناس۔

مقدمہ (۳):۔ یہ کہ مومنین کی آپس میں دشمنی جو کسی دنیاوی بات کے سبب ہو وہ ایمان میں خلل انداز نہیں ہوتی۔ البتہ قبیح اور قابل مذمت ضرور ہے اور پھر اس میں حفظ مراتب کا خیال نہ رکھا گیا تو بہت ہی زیادہ بری اور لائق مذمت ہے۔ اور لحاظ اور حفظ مراتب کا مطلب یہ ہے کہ دونوں ہم رتبہ ہوں چاہے خواص میں سے ہوں چاہے عوام میں سے اور عدم حفظ مراتب کی شکل یہ ہے کہ عامی کسی خاص سے الجھ جائے اور اس سے وہ سلوک کرے جو اپنے ہم جنس و ہم طبقہ سے کرتا ہے۔

صدر اول میں خواص تین قسم پہ تھے، اصحاب ازواج آل بیت۔ اسکے بعد کے زمانہ میں بھی تین ہی رہے۔ سادات علماء اور مشائخ طریقت (صوفیاء و اولیاء کرام)

گویا یہاں دو دعوے کئے گئے ہیں کہ باہم دشمنی ایمان میں خلل نہیں ڈالتی اور مذموم و قبیح ہے۔ ان دونوں دعوؤں کے لیے کافی کلینی کی ایک ہی روایت بطور ثبوت کافی ہے۔

ملا محمد رفیع واعظ جناب ابوعبداللہ رحمۃ اللہ علیہ کے قصۂ آزردگی کے ذیل میں صفوان جمال سے بحوالہ کافی جو روایت لایا ہے اسکے آخر میں کہتا ہے کہ حضرت ابوعبداللہ رحمۃ اللہ علیہ گفتگو پر ایک ہی رات گذرنے پر جناب عبداللہ بن حسن رحمۃ اللہ علیہ کے گھر تشریف لے گئے اور صلح کر لی۔ بحوالہ کافی اسنے یہ بھی بیان کیا ہے،

لَا يَفْتَرِقُ رَجُلَانِ عَلَى الْهِجْرَانِ إِلَّا اسْتَوْجَبَ أَحَدُهُمَا الْبَرَاءَةَ وَاللَّعْنَةَ وَرُبَّمَا اسْتَحَقَّ ذٰلِكَ كِلَاهُمَا قَالَ الرَّاوِيْ وَهُوَ مُعْتَبٌ جُعِلْتُ فِدَاكَ هٰذَا الظَّالِمُ فَمَا بَالُ الْمَظْلُوْمِ قَالَ لِاَنَّهٗ

دو شخص باہم بگڑ کر آزردگی دل میں رکھکر جدا نہیں ہوتے مگر ان میں سے ایک اللہ تعالیٰ کی طرف سے بیزاری و لعنت کا سزاوار ہوتا ہے اور بعض اوقات دونوں ہی مستحق ہوتے ہیں، معتب راوی نے کہا میں آپ پر فدا۔

لَا يَدْعُوا أَخَاهُ إِلَى الصُّلْحِ وَلَا يَتَغَامَضُ لَنَا ۔ | ظالم تو ٹھیک مستحق بے زاری ولعنت ہو مگر مظلوم وہ کس وجہ سے ؟ آپ نے فرمایا وہ اس لیے کہ نہ اس نے چشم پوشی کی اور نہ بھائی کو صلح ہی کی دعوت دی۔ اس سے یہ بات تو معلوم ہو گئی کہ خواص امت میں اس قسم کی آزردگیاں پیدا ہوتی رہی ہیں مگر ان کے ایمان پر خلل انداز نہیں ہو سکی ہیں۔ دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ اس قسم کی آزردگیاں ایمان میں خلل انداز نہ ہونے کے باوجود ہیں قبیح اور مذموم جنکا جلد دفعیہ ہو جانا چاہیئے۔ آزردگیٔ خواص کا گواہ وہ قصہ ہے جو بتقاضائے بشریت باوجود درجہ و مرتبہ مساوی ہونے کے وقوع پذیر ہوا۔ اور جسکے سلسلہ میں جناب امیر رضی اللہ عنہ لقب ابو تراب سے مفتخر ہوئے یہ واقعہ آپ اور سیدۃ النساء بی بی فاطمۃ الزھراء رضی اللہ عنہم کے مابین پیش آیا، ملا محمد رفیع واعظ نے اس قصہ کو بیان کر کے تقاضائے بشریت پر محمول کیا ہے،

مقدمہ (۴) یہ کہ مطلق دینی عداوت کا دار و مدار کفر پر ہے۔ ہر کافر کو دشمن جاننا چاہیئے کیونکہ احکام قرآنی کی رو سے دینی عداوت کا سبب کفر ہے اور جب علت وسبب ایک ہو تو حکم بھی ایک ہوتا ہے۔ اللہ تعالےٰ کا ارشاد ہے۔ لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَادُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَوْ كَانُوْۤا اٰبَآءَهُمْ اَوْ اَبْنَآءَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِيْرَتَهُمْ ۔ یا اللہ تعالےٰ کا قول يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰۤى اَوْلِيَآءَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ یا فرمایا لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللّٰهِ فِىْ شَىْءٍ ۔ پہلی آیت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اگر مسلمان کے کسی کافر سے، باپ بیٹا، عزیز و دوست ہونے کے دنیاوی تعلقات ہوں تو کفر کے ہوتے ہوئے سب تعلقات قابل ترک اور بے اعتبار ہونگے۔ انکو نظر انداز کر کے مدار عداوت پر رکھنا چاہیئے اور محبت دینی کا ایمان پر۔ لہٰذا تمام اہل ایمان سے بحیثیت ایمان محبت رکھنا واجب ہے خواہ وہ فرماں بردار ہوں یا نافرمان کیونکہ وجوب محبت کا جو سبب ہے وہ دونوں میں موجود و مشترک ہے اور جب علت پائی جائے تو حکم کا وجود واجب ہوتا ہے جیساکہ ارشاد ربانی ہے وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ اور یہ طے شدہ بات ہے کہ ایک شی کا محب، اسکے محب ومحبوب دونوں ہی کا محب ہوتا ہے۔ اللہ تعالےٰ تمام مسلمانوں کا محبوب ہے، اللہ تعالےٰ کی محبت ہر مسلمان کے دل میں باقی دوسروں سے زیادہ ہونی چاہیئے جیساکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ (اہل ایمان اللہ کی محبت سب سے زیادہ رکھتے ہیں) اور جب اللہ تعالےٰ مومنوں کو مطلقاً دوست رکھتا ہے تو یہ لازم ہوا کہ ہر مومن تمام مومنوں کو دوست رکھے ورنہ پھر وہ خدا کا دوست نہ رہے گا۔ اَللّٰهُ وَلِىُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ (اللہ مسلمانوں کا دوست ہے، انہیں اندھیروں سے نکال کر نور کی طرف لاتا ہے) نیز فرمایا ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ مَوْلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاَنَّ الْكٰفِرِيْنَ لَا مَوْلٰى لَهُمْ (اور یہ اس لیے کہ اللہ ایمان لانے والوں کا حامی دوست ہے، اور کافروں کا کوئی دوست نہیں) یا یہ ارشاد اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا (وہ لوگ جو ایمان لائے اور پسندیدہ کام کئے ان پر عنقریب اللہ کی دوستی ظاہر ہو جائیگی) قرآن سے یہ بات بھی یقینی طور پر معلوم ہوتی ہے کہ مومنوں کی دوستی کسی صغیرہ یا کبیرہ گناہ سے زائل نہیں ہوتی۔ اِذْ هَمَّتْ طَّآئِفَتٰنِ مِنْكُمْ اَنْ تَفْشَلَا وَاللّٰهُ وَلِيُّهُمَا

(جب تمہارے دو گروہوں نے بزدلی دکھانے کا ارادہ کیا۔ مگر اللہ تو ان دونوں کا دوست ہے) ان دونوں فرقوں سے مراد بالاتفاق بنو سلمہ اور بنو حارثہ ہیں۔ جنہوں نے یوم احد کے موقعہ پر رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی کے بہکانے میں آکر میدان جنگ سے بھاگنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ ظاہر ہے یہ حرکت گناہ کبیرہ شمار ہوتی ہے خصوصاً ایسے جہاد کے وقت کہ خود پیغمبر صلے اللہ علیہ وسلم اس میں بنفس نفیس موجود ہوں اور بھاگ جانے پر آپ کی ہلاکت کا پورا پورا گمان اور خطرہ ہو۔ اور پھر جبکہ وقت ایسا نازک ہو کہ ملت اسلامیہ کی نشو و نما پورے طور پر نہیں ہو سکی اسلام کا پودا ابھی پورے طور پر جڑ بھی نہیں پکڑ سکا ایسے وقت ذرا سی غلطی اور قصور سے نہایت ہی ہولناک اور تباہ کن اثرات بھی ظاہر ہو سکتے تھے ان سب کے باوجود اللہ تعالے نے ان کی دوستی سے دست برداری ظاہر نہیں فرمائی اور دونوں گروہوں کو مومنین ہی کے خطاب سے یاد کیا وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ (مومنوں کو بھروسہ اللہ ہی پر رکھنا چاہیئے) اتنی محبت تو محض بتقاضائے ایمانی ضروری ہے، اور جب مسلمانوں میں اعمال صالحہ بھی پائے جاتے ہوں مثلاً جہاد، قتال مرتدین توبہ طہارت، تقویٰ، اور اچھے اخلاق تو ایسی صورت میں تو وہ خاص اور یقینی طور پر اللہ تعالے کے محبوب ہونگے فرمایا اللہ تعالیٰ نے اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ یا فرمایا یا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗ یا ارشاد ہوا اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ یا فرمایا وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ یا یہ ارشاد ہوا وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ۔

مقدمہ (۵) :- یہ کہ مومن و کافر کے ساتھ محبت و عداوت کے مختلف مراتب اور جدا جدا درجے ہیں مثلاً باپ، بیٹا، بھائی، چچا، ماموں، ماں اور بہن کے ساتھ محبت اور تعلق خاطر میں جو تفاوت اور فرق پایا جاتا ہے اس سے ہر عقلمند واقف ہے اور محسوس کرتا ہے۔ اسی طرح دنیاوی دشمنوں میں عداوت کے قوی و ضعیف ہونے یا آثار عداوت کی قلت و کثرت میں جو تفاوت اور فرق و اختلاف ہے وہ بھی کوئی پوشیدہ بات نہیں۔ بعینہٖ اسی طرح وہ محبت دینی جو ایمان کی وجہ سے ہو اسمیں تفاوت اور اختلاف ہونا بلحاظ ایمانی قوت یا اسمیں زیادتی کے بموجب درجۂ ایمان کے علو و بلندی کے اور بمقدار اختلاف و تفاوت مسلمانوں کے محب یا محبوب خدا ہونے میں۔ لہٰذا جسکا درجہ محبوبیت زیادہ ہو اس سے محبت بھی زیادہ رکھنی چاہیئے۔

بالاتفاق محبت کا بلند درجہ وہی ہے جو سید المرسلین رسول رب العالمین حبیب خدا صلے اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک سے ہو۔ اس کے بعد ان سارے مسلمانوں سے جنکو آپ کی ذات مبارک سے انتہائی نزدیکی اور بڑا قرب حاصل ہے یہ جماعت تین طبقوں پر مشتمل ہے۔

(۱) اولاد و اقارب جو آپ کے جسم اطہر کا جز اور جگر پارے ہیں، جنکے بارے میں ارشاد فرمایا۔ اَحِبُّوا اللّٰهَ لِمَا يَغْذُوْكُمْ مِنْ نِعْمَةٍ۔ وَاَحِبُّوْنِيْ لِحُبِّ اللّٰهِ۔ وَاَحِبُّوْا اَهْلَ بَيْتِيْ لِحُبِّيْ۔ (اللہ کو محبوب رکھو کہ وہ تم کو نعمتوں سے پالتا ہے اور اللہ کی محبت کی خاطر مجھ سے محبت رکھو۔ اور میری محبت کے حصول کیلیے میرے اہل بیت سے محبت کرو)

(۲) ازواج مطہرات، جو آپ کے اجزائے بدن کے بمنزلہ ہیں (جو آپ کی ناموس عزت و آبرو ہیں اور آپ کی جلوت و خلوت کی محبوب ہستیاں ہیں) جنکی شان میں ارشاد ربانی ہے۔ وَاَزْوَاجُهٗ اُمَّهٰتُهُمْ۔

بنی نوع انسان اس پر متفق ہے کہ بیویاں انتہائی خلط ملط۔ اور الفت و محبت کے سبب (اعزاز و اکرام اور تعلق

خاطر ہیں) شوہر (شخص) کا حکم رکھتی ہیں (وہ درحقیقت یک جان دو قلب کا درجہ رکھتی ہیں) اسی لیے شریعت میں محرمیت (محرم ہونے) و میراث کے معاملہ میں سسرالی تعلق کو معتبر مانا ہے اور احسان جتاتے وقت نسب وصہر دونوں کو شانہ بشانہ رکھکر ایک لڑی میں پرو دیا ہے،

وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ مِنَ الْمَاءِ بَشَرًا فَجَعَلَهٗ نَسَبًا وَّصِهْرًا ۔ | وہ وہ ذات ہے جسنے پانی سے انسان کو پیدا کیا پھر اسکو نسب اور سسرال میں تقسیم کیا۔

(۳) رفقائے سفر، اصحاب کرام، جو زندگی کے سفر میں آپکے ہم قدم و ہم عنان و ہم آواز رہے، آپ کی نصرت و امامت میں ہمیشہ بڑھ بڑھ کر اپنی جانوں کے نذرانے پیش کئے صحیح معنوں میں آپکے پسینہ کی جگہ اپنا خون بہایا، جان و مال و عزت و آبرو سب کچھ آپکے لیے خطرہ میں ڈالا۔ گھر بار کو خیرباد کہا، سارے دنیاوی رشتہ و پیوند توڑ ڈالے اور آپ کی خوشنودی کی خاطر ماں، باپ، بھائی بیٹے، بیوی، بہن، اور سارے اقارب سے ناطہ توڑ لیا۔ ان کی یہی قربانیاں اور جذبات ایثار و محبت اللہ تعالےٰ کی نظر میں معتبر اور وقیع ٹھیریں اور ان کے اس عمل کی قدردانی فرمائی اور انکے حق میں خاص عنایت کا یوں اظہار فرمایا۔ لِلْفُقَرَاءِ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا وَّيَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ تَبَوَّءُو الدَّارَ وَالْاِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۔ یہ بات سارا عالم جانتا ہے کہ اس قسم کی سچائی اور خلوص، نزدیکی اور قرب میں نسب سے بھی اعلیٰ و ارفع ہے جیسا کہ کسی عربی شاعر نے کہا ہے ؎

اَلْقَوْمُ اِخْوَانُ صِدْقٍ بَيْنَهُمْ سَبَبٌ ❊ مِنَ الْمَوَدَّةِ لَمْ يَعْدِلْ بِهٖ نَسَبٌ

(یہ لوگ باہم برادران صداقت ہیں۔ ان کے درمیان دوستی کا وہ رشتہ ہے جس کی برابری نسب بھی نہیں کرسکتا) لہذا ان تینوں طبقوں میں عام مسلمانوں کی نسبت اور بلحاظ جملہ مسلمانوں کے محبت کے اسباب دو وجوہ سے قوی اور زیادہ بھرپور اور بکثرت ہیں۔

اول حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے ان کا انتہائی قرب و اتصال جسکی وجہ سے تمام بنی آدم سے محبوبیت میں ممتاز و منفرد ہیں دوم۔ دین شریعت کا ان کے ذریعہ رواج پانا اور دور و نزدیک اسکی اشاعت اور پھیلاؤ اور تقوی اور جہاد میں انکا بلند ترین درجہ۔ ہاں اس جماعت میں سے کوئی اگر گناہ کا مرتکب ہو۔ یا ایمان سے خالی ہو اور اس کے سبب اسکے سابقہ اعمال سوخت ہو گئے ہوں تو نص قرآنی کے مطابق انکے ساتھ عداوت و دشمنی واجب ہے۔ رسول محترم صلے اللہ علیہ وسلم کی قربت کا اعزاز اس برائی کی وجہ سے ساقط ہو جائیگا۔ اور یہ گروہ بالا کے حکم سے مستثنیٰ ہو جائے گا۔ مثلاً ابولہب وغیرہ۔ اب ان اشخاص کے ایمان و عدم ایمان اور اعمال و طاعات کے سوخت ہونے کے متعلق چھان بین اور تحقیق و تفتیش کرنی چاہیئے۔

خواجہ نصیر طوسی ایمان و کفر کی بحث اور حبط اعمال کے ذیل میں تجرید العقائد میں کہتا ہے۔ اَلْاِيْمَانُ التَّصْدِيْقُ بِالْقَلْبِ وَاللِّسَانِ (ایمان زبان و قلب کی تصدیق کا نام ہے) بِكُلِّ مَا جَاءَ بِهِ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَعُلِمَ مِنْ دِيْنِهٖ ضَرُوْرَةً وَلَا يَكْفِي الْاَوَّلُ (ہر اس چیز کے ساتھ جو نبی صلے اللہ علیہ وسلم لائے۔ اور ضروریات

دین کا جاننا۔ اور پہلے کا جاننا ہوا کافی نہیں) بسبب فرمان الٰہی وَاسْتَيْقَنَتْهَا أَنْفُسُهُمْ (یقین سے جان لیں ان کے نفوس) وَلَا الثَّانِيْ (تصدیق کے بغیر اقرار بھی کافی نہیں) بسبب قول خداوندی۔ قُلْ لَمْ تُؤْمِنُوْا (آپ کہیئے کہ تم ایمان ہی نہیں لائے)

خواجہ مذکور یہ بھی کہتا ہے۔ وَالْكُفْرُ عَدَمُ الْإِيْمَانِ۔ (اور کفر ایمان نہ ہونے کا نام ہے) اس قول میں اسکا اشارہ اسطرف ہے کہ ایمان وکفر میں کوئی واسطہ نہیں جیسا کہ معتزلہ کا مذہب ہے۔ إِمَّا مَعَ الضِّدِّ أَوْ بِدُوْنِهٖ (ضد کے ساتھ یا بغیر ضد (مخالف کے) وہ یہ بھی کہتا ہے۔ وَالْفِسْقُ الْخُرُوْجُ عَنْ طَاعَةِ اللّٰهِ مَعَ الْإِيْمَانِ (فسق اللہ تعالےٰ کی اطاعت سے نکل جانا ہے۔ سلامتی ایمان کے باوجود) یعنی وہ فسق جو ارتکاب معصیت کہلاتا ہے یہ ایمان سے منافات نہیں رکھتا۔ اور مومن فاسق ہوسکتا ہے۔ وہ یہ بھی کہتا ہے۔ وَالنِّفَاقُ إِظْهَارُ الْإِيْمَانِ مَعَ إِخْفَاءِ الْكُفْرِ۔ وَالْفَاسِقُ مُؤْمِنٌ مُطْلَقًا۔ (کفر چھپا کر ایمان کا اظہار نفاق ہے۔ اور فاسق مطلقاً مومن ہے) یعنی احکام دنیا و آخرت میں مثلاً تجہیز و تکفین، دعائے مغفرت، صدقات، تحریم لعن و تبرا۔ بحیثیت ایمان اس کی محبت واجب ہوتے ہیں۔ یا دخول جنت میں گو بعد از عذاب ہی ہو۔ اسکے لیے پیغمبر کی شفاعت ہوتی ہیں، اور اس امکان میں کہ اللہ تعالےٰ اسے معاف کرے جیسا کہ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

إِدَّخَرْتُ شَفَاعَتِيْ لِأَهْلِ الْكَبَائِرِ وَلِوُجُوْدِ جَدِّهٖ وَالْكَافِرُ مُخَلَّدٌ فِي النَّارِ وَعَذَابُ صَاحِبِ الْكَبِيْرَةِ مُنْقَطِعٌ لِاسْتِحْقَاقِ الثَّوَابِ بِإِيْمَانِهٖ فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهٗ وَلِقُبْحِهٖ عِنْدَ الْعُقَلَاءِ وَالسَّمْعِيَاتُ مُتَأَوَّلَةٌ وَدَوَامُ الْعِقَابِ مُخْتَصٌّ بِالْكَافِرِ وَالْعَفْوُ وَاقِعٌ لِأَنَّهٗ حَقُّهٗ تَعَالٰى فَجَازَ وُقُوْعُهٗ

میں نے شفاعت گناہ کبیرہ کرنے والوں یا اسکی کوشش کرنے والوں کیلیے اٹھا رکھی ہے اور کافر تو ہمیشہ دوزخ میں رہے گا۔ اور کبیرہ کے مرتکب کا عذاب ختم ہوجائے گا کیونکہ ایمان کی وجہ سے وہ مستحق ثواب بھی تو ہے۔ جیسے ذرہ بھر نیکی کی ہوگی وہ اسے ضرور دیکھے گا (یعنی اسکا اجر پائےگا) عقلاء کے نزدیک یہ قبیح ہے اور سمعیات قابل تاویل ہیں۔ عذاب کی ہمیشگی کافر کے ساتھ مخصوص۔ گناہ کی معافی ضرور ہوگی کیونکہ وہ اللہ تعالےٰ کا حق ہے، جو وقوع میں آئے گا۔

لہٰذا خواجہ نصیر کے پورے کلام سے پتہ چلا کہ فاسق پر لعنت بھیجنا اور اس سے بیزاری ظاہر کرنا جائز نہیں بلکہ اسکی شان دوسرے مومنوں کی طرح ہے کہ اس کی مغفرت کی دعا بھی کی جانی چاہیئے اس کے لیے بھی ایصال ثواب ہونا اور صدقہ وخیرات کی جانی چاہیئے تاکہ عذاب سے چھٹکارا پاوے اسکی نجات اور اس کے لیے پیغمبر کی شفاعت کی امید رکھنی چاہیئے۔ اور جب تک اس میں ایمان موجود ہے اس سے محبت رکھنا واجب ہے اور اس سے عداوت دینی نقطہ نظر سے حرام ہے۔ کیونکہ تبرا اور گالی اس وقت تو خیر ٹھیک ہوسکتی ہے کہ اس میں محبت کی کوئی وجہ موجود نہ ہو اور اس کی صرف ایک صورت ہے کہ اسکی موت کفر پر ہو۔ اس لیے کہ کفر کے ہوتے پھر کسی عمل خیر کا کوئی اعتبار نہیں۔ فسق وگناہ کے سبب اس سے اظہار بیزاری جائز نہیں ہاں اسکے فعل فسق وعصیان سے بیزاری ضرور ظاہر کرنی اور اسے برا سمجھنا چاہیئے۔

خواجہ نصیر نے تجرید میں یہ بھی کہا ہے۔ وَالْإِحْبَاطُ بَاطِلٌ لِاسْتِلْزَامِهِ الظُّلْمَ لِقَوْلِهٖ تَعَالٰى

Www.Ahlehaq.Com

فَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ خَیْرًا یَّرَہٗ ۔ (اعمال کی سوخت غلط بات ہے اسلیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے قول "جو ذرہ بھر بھی نیکی کرے گا اس کا اجر پائے گا" کی روشنی میں ظلم کو لازم کرتا ہے) لہذا جب تک اس سے کفر سرزد نہ ہو اس کا کوئی عمل سوخت نہ ہوگا۔

مقدمہ (۶) بالاتفاق صحابہ کرام، ازواج مطہرات رضوان اللہ علیہم سے وہ چیز صادر نہیں ہوئی جو ان کے کفر کا سبب ہو کر ان کے اعمال حبط کرنے کا باعث بنتی۔ یا حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے قائم ربط کو گھٹاتی یا کم کرتی یا اعتبار کھوتی سوائے اس کے فدک جیسے معاملات میں خلافت و غصب حقوق اہل بیت کے سلسلہ میں جناب امیر رضی اللہ عنہ سے مخالفت رونما ہوئی اور نوبت محاربہ تک پہنچی۔ اب ذرا یہاں یہ غور کر لیا جائے کہ علماء شیعہ کے نزدیک یہ مخالفت، محاربہ، غصب کفر ہے یا نہیں۔ اس سلسلہ میں خواجہ نصیر طوسی کا قول مشہور ہے۔ کہ مخالفوہ فسقۃ و محاربوہ کفرۃ (انکے مخالف فاسق ان سے لڑنے والے کافر ہیں) لہذا صحابہ میں سے جنہوں نے صرف مخالفت کی وہ تو تبرا کے لائق نہیں کیونکہ ان کے عمل کو کھینچ تان کر زیادہ سے زیادہ فسق کہہ سکتے ہو۔ اور فاسق مومن ہے۔ تو گویا شیخین اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہم پر خود اصول شیعہ کے مطابق تبرا جائز نہیں اور اتنی بات کا ان کے محقق علماء نے بھی اعتراف کیا ہے۔

قاضی نور اللہ شوستری نے مجالس المومنین میں تحریر کیا ہے کہ شیعوں کے بارے میں اہل سنت کا یہ کہنا کہ وہ شیخین (رضی اللہ عنہما) کو کافر ٹھیرلتے ہیں۔ یہ ایسی بات ہے کہ کتب اصول شیعہ میں نہ اسکی کوئی بنیاد ہے نہ اصلیت ان کا مذہب صرف اسیقدر ہے کہ حضرت علی (رضی اللہ عنہ) کے مخالف فاسق ہیں اور ان سے لڑنے والے کافر۔ جیسا کہ نصیر الدین طوسی نے تجرید میں لکھا ہے اور بمقتضائے حدیث حربک حربی وسلمک سلمی (تیری لڑائی میری لڑائی اور تیری صلح میری صلح ہے) یہی ثابت ہوتا ہے اور ظاہر بھی ہے کہ حضرات شیخین رضی اللہ عنہما نے حضرت امیر رضی اللہ عنہ سے جنگ تو نہیں بلکہ جنگ و قتال کئے اور نہ تلوار و بھالے کی زحمت برداشت کئے بغیر اپنے لاؤ لشکر اور پیروؤں کی زیادتی کے سبب انکے حق کو سلب کیا اور رسول کی خلافت کے حق کو غصب کیا، (شوستری کا بیان ختم ہوا)

ملا عبد اللہ مشہدی، مصنف کتاب اظہار الحق۔ اس اصل پر۔ بحث کرتے ہوئے اس کا جواب لکھتا ہے۔ بحث یہ کہ اگر کوئی کہے کہ خلافت مرتضی رضی اللہ عنہ کے بارے میں اگر نص صریح نہیں ہے تو امامیہ جھوٹے ہیں، اور اگر ہے تو جن صحابہ نے مسئلہ خلافت میں مخالفت کی ان کا مرتد ہونا لازمی ہوتا ہے۔ اس بحث کو بجنسہٖ لکھکر لکھتا ہے کہ جس نص کا انکار موجب کفر ہے وہ یہ ہے کہ نص شدہ کو باطل خیال کریں اور اس نص میں سرور عالم صلے اللہ علیہ وسلم کی معاذ اللہ تکذیب کریں۔ لیکن حق تو ان کا مانتے ہیں مگر اغراض دنیاوی، مصالح سیاسی، یا مال و جاہ کے سبب اسے نظر انداز کر دیں تو یہ فسق و عصیان ہوگا کفر نہیں ہوگا مثلاً زکوۃ باجماع امت واجب ہے اور قرآن و حدیث سے منصوص ہے لہذا جو اس کا انکار کرے گا مرتد ہو جائے گا۔ اور جو وجوب کا تو معتقد ہو مگر پیسے کی محبت یا بخل کے سبب ادائیگی سے روگردانی کرتا ہے تو وہ اپنے اوپر گناہ کا بوجھ لاتا ہے۔ اور یوں گنہ گار ہوتا ہے۔ جن حضرات نے خلیفہ اول کی خلافت پر اتفاق کیا وہ یہ نہیں کہتے تھے۔ کہ پیغمبر صلے اللہ علیہ وسلم نے اس پر نص، مگر صحیح نہیں کہا۔ بلکہ بعض اوقات بعض لوگ تو یہ کہتے کہ اس سلسلہ میں پیغمبر صلے اللہ علیہ وسلم سے کوئی نص مذکور نہیں اور بعض دوسرے کلام

www.Ahlehaq.com

پیغمبر علیہ السلام میں رکیک تاویلات کرتے۔ (اس کی بات ختم ہوئی)

ان کے اس کلام سے چند مفید نتائج حاصل ہوئے۔ اول تو یہ کہ نص کے معنی سے انکار یا اس کے مدلول میں فاسد تاویل سے کفر لازم نہیں آتا۔ بلکہ یہ ایک قسم کا فسق اعتقادی ہے جسے اہل سنت کے ہاں خطائے اجتہادی سے موسوم کیا جاتا ہے۔ دوسرے فدک کا غصب، یا قرطاس نہ دینا، یا اسکے علاوہ امور جو بعض حضرات سے صادر ہوئے اور اسکا سبب حدیث نحن معاشر الانبیاء لانورث ولانورث، یا آیت اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ۔ سے استدلال ہو تو یہ بھی کفر نہیں بلکہ فسق اعتقادی ہی کی ایک شکل ہے۔ جسے ہم خطائے اجتہادی کہتے ہیں۔ اسلیے کہ جب امامت کے مسئلہ کی نص میں باطل تاویل کفر کا سبب نہ بن سکی تو مسئلہ میراث یا کچھ لکھدینے میں جو مسئلہ امامت سے بالاتفاق ہزاروں درجہ کم ہیں آیت وحدیث سے تمسک کرنا کیوں کفر کا سبب ہوگا۔ اس کی تصریح خود انہوں نے بھی اپنے ہاں کی ہے۔

خلاصہ کلام یہ نکلا کہ مسئلہ خلافت میں اختلاف جب تاویل کی بنا پر ہو تو وہ اعتقادی فسق ہے۔ اس سے ہی یہ لازم آیا کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ کی امامت بلافصل کا اعتقاد انکے ہاں حقیقت ایمان میں داخل نہیں بخلاف نماز روزہ وزکواۃ کی فرضیت کے اعتقاد کے۔ اس فرق کو جو کہ پورے فرقہ کا اجماعی ہے قیمتی ثبوت اور دستاویز کی طرح ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہیئے۔ یہ تو خود اپنے ہاتھ پاؤں کاٹنے والی بات ہے۔ اس میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں۔ اسی لیے یہ سب خواجہ نصیر طوسی کا قول بطور گواہی بڑے زور کے ساتھ پیش کرتے ہیں گویا میدان مار لیا ہو۔ جب جناب مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی مخالفت کرنے والوں کا ایمان خود انہیں کے محققین کے اقرار واعتراف سے ثابت ہوگیا تو اب ان کے ظاہری اعمال واخلاق کی بحث لانی چاہیئے جو ان کے حسن سیرت پر دلالت کرتی ہے۔

آیت یَا اَیُّھَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَا اُنْزِلَ الخ۔ کے ذیل میں ملا عبداللہ مشہدی رقمطراز ہے کہ صرف شہادتین کا اقرار اور اجمالی تصدیق ہر اس چیز کی جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم لائے۔ اسلام کا ایک مرتبہ ہے اور جناب رسالتمآب صلے اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد پوری امت اجابت یہ مرتبہ رکھتی تھی اور اللہ تعالیٰ کی حفاظت ونگرانی کے وعدہ کے سبب اس مرتبہ سے باہر قدم نہیں نکالا۔ عقیدہ اسلامی کا اسی قدر حصہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے حکم کی تعمیل کے لیے کافی تھا۔ مثلاً مشرکین کو جزیرۂ عرب سے نکالدینا۔ مرتدین ومنکرین زکوۃ سے قتال، یا مدعیان نبوت سے جنگ۔ یا فارس وروم کے کافروں سے جہاد۔ اور جنہوں نے خلافت وریاست کے حصول کا قصد کیا، انہوں نے ان امور میں انتہائی جد وجہد اور کدوکاوش اختیار کی کہ لوگوں کی نظر میں استحقاق امیر خلافت پر دھبہ نہ آجائے اور ان میں سے بہت سے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی صحبت کا شرف پانے کے سبب اور قرب زمانہ کے باعث ان میں صحبت کی برکتیں موجود ہونے کی وجہ سے یہ حضرات صاحب زہد وورع وتقویٰ بھی تھے۔ جو مالیات محرمات ظاہریہ سے بھی محترز رہے۔ بلکہ بعض مباح اور جائز لذتوں کو بھی ترک کردیا۔ ان سے جو کچھ غفلت وسستی عمل میں آئی وہ امر خلافت اور حقوق اہل بیت میں تھی۔ (انتہی کلامہ)

اس تحریر سے معلوم ہوگیا۔ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی صحبت شریف کی برکت سے اور اس برکت شریف کے ان کے جان ودل میں گھر کرلینے سے یہ نفوس مقدسہ اصل ایمان کے علاوہ ورع زہد وتقویٰ سے بھی آراستہ تھے۔ نیز

www.Ahlehaq.com

یہ بھی معلوم ہوا کہ ان حضرات کا پیغمبر صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تعلق صحبت خلوص قلب کے ساتھ تھا۔ نفاق وظاہر داری کی تو ان حضرات کو ہوا بھی نہیں لگی تھی یہ نہ ہوتا تو صحبت مبارک سے اکتساب فیض اور حصول برکت کیسے کر سکتے تھے۔

اب یہاں عقلاء کے لیے قابل غور بات یہ ہے کہ جب خود انہی کے (بلا جبر واکراہ برضا ورغبت خود) اقرار واعتراف سے یہ معلوم ہو گیا کہ ایمان، ورع، تقوی، اور زہد ان میں بالیقین موجود تھا تو اسکے بعد یہ دعوے کرنا کہ امر خلافت اور اہل بیت کے حق میں ان سے گناہ صادر ہوا ایک یقینی الثبوت چیز کے خلاف دعوی کرنا ہے۔

معلوم تو ایسا ہوتا ہے کہ ان حضرات کا یہ عمل کسی دلیل سے تمسک یا کسی نص کے فہم کے سبب ہی وقوع میں آیا ہو گا کیونکہ جب صحبت پیغمبر صلے اللہ علیہ وسلم نے ان میں اتنا اثر کر لیا کہ وہ اتقاء زہد اور ورع کے لیے روشن پیکر بن گئے۔ کہ اپنے پرائے سب انکی ان خوبیوں کو سراہنے لگے۔ تو ایسی صورت کے بعد ان کے متعلق یہ تصور کر لینا کہ انہوں نے یہ حرکت دنیاوی لالچ یا حُب مال وجاہ کی خاطر دیدہ ودانستہ کی۔ ایسی متضاد بات ہے جو کوئی بھی عقلمند نہیں کہہ سکتا۔ اگر ایسا ہے تو پیغمبر صلے اللہ علیہ وسلم کے شرف صحبت پر تو حرف آئے گا مگر انکے زہد وتقوی وورع، اور محرمات سے بچنے کی صفت کہاں بچی کی جس کا انہوں نے خود ہی اعتراف کیا اور انہوں نے اپنی تحریر میں جو یہ جملہ ٹانک دیا ہے کہ ،، وہ یہ کدوکاوش اسلیے کرتے تھے کہ لوگوں کی نظروں سے گر کر امر خلافت کی اہلیت نہ کھو دیں۔ تو یہ انکی اٹکل اور بے سروپا ہوائی ہے بلکہ پھڑکتے اور دھڑکتے دل کو تھامنے کی کوشش ناکام ہے۔ یا پھر دل کی باتیں جاننے کا دعوی ہمیں اتنے تکلفات میں پڑنے کی تکلیف ہی نہیں دی گئی۔ ظاہری حال کے مطابق تکلیف دی گئی ہے۔ کسی کو بظاہر اچھا دیکھیں، اچھا سمجھیں، اچھا کہیں۔ اور پھر یہاں تو اس ظاہر کے ساتھ ساتھ اسکا اعتراف بھی کیا گیا ہے کہ انکے حالات کی حسن وخوبی صحبت شریف کی برکت سے تھی تو لامحالہ اس صحبت نے ان کے باطن پر بھی تو اثر کیا ہو گا۔

بہرحال یہ بات طے ہے کہ علماء شیعہ کے اعتراف سے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کی جماعت کے خصائص وفضائل کرسی نشیں ہو گئے۔ اور ثابت ہو گیا کہ وہ باایمان تھے زاہد ومتقی، اور ورع والے تھے۔ محرمات سے اجتناب کرتے تھے۔ بلکہ بعض مباحات سے بھی بچتے تھے۔ اسلام کو رائج کرنے مشرکین کو جزیرۃ العرب سے نکالنے کفار فارس وروم کے ساتھ جہاد کرنے میں انہوں نے کوشش کی۔

اب ہم اس بحث کا آغاز کریں گے کہ ان حضرات عالی وقار اور والا تبار کا درجہ اور مقام اللہ تعالے کے نزدیک کتنا بلند اور عالی تھا۔ اور انکے اعمال صالحہ کو دربار خداوندی میں کیسی پذیرائی ملی۔ یہ تو سب کو معلوم ہے کہ اللہ تعالی کی رضا اور خوشنودی سے بڑھ کر کوئی مرتبہ عالی اور بلند نہیں ہو سکتا۔ جسکو اللہ تعالے پسند فرمالے وہ خواہ کیسا ہی کیوں نہ ہو تمام اہل ایمان میں مقبول ہو گا۔ فرمایا۔ وَالسَّابِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهَاجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَاۤ اَبَدًا ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ۔ ملا عبداللہ مشہدی صاحب کتاب اظہار الحق نے کہا ہے کہ اس آیت سے صحابہ کی فضیلت پر اہل سنت کا استدلال ہر صورت میں صحیح ہے۔ اسکے جواب میں امامیہ کی مشہور باتیں اپنی روش کے مطابق نہ جاندار ہیں نہ کوئی قوت رکھتی ہیں۔ البتہ مشہور باتوں کے خلاف جواب دے سکتے ہیں۔

www.Ahlehaq.com

فریق مخالف کے طریق استدلال کی جو صورت ہے وہ تفسیر نیشاپوری میں یوں ہے۔

قَالَ اَهْلُ السُّنَّةِ لَاشَكَّ اَنَّ اَبَابَكْرٍ سَبَقَ اِلَى الْهِجْرَةِ فَهُوَ مِنَ السَّابِقِيْنَ وَقَدْ اَخْبَرَ اللّٰهُ تَعَالٰى بِاَنَّهُ رَضِيَ عَنْهُ وَلَاشَكَّ اَنَّ الرِّضٰى مُعَلَّلٌ بِالسَّبْقِ اِلَى الْهِجْرَةِ فَيَدُوْمُ بِدَوَامِهِ فَدَلَّ ذٰلِكَ عَلٰى صِحَّةِ اِمَامَتِهِ وَعَدَمِ جَوَازِ الطَّعْنِ فِيْهِ۔

اہلسنت نے کہا ابوبکر نے ہجرت میں سبقت کی تو وہ سابقین میں سے ہوئے اور سابقین سے اللہ تعالیٰ راضی ہوا تو ان سے بھی راضی ہوا اسمیں بھی کوئی شک نہیں کہ ہجرت میں سبقت ہی رضامندی کا سبب ہے اور ہجرت کی سبقت دائمی ہے لہٰذا اللہ تعالیٰ کی رضا بھی دائمی رہے گی۔ معلوم ہوا ان کی امامت صحیح ہے اور ان پر طعن ہرگز جائز نہیں۔

اس کلام کے بعد ملا مشہدی کہتا ہے کہ اس بات کا یہ جواب دینا کہ ہجرت ونصرت کی سبقت میں ایمان شرط ہے اور وہ شخص معاذاللہ کبھی ایماندار تھا ہی نہیں حتیٰ کہ امیرالمومنین رضی اللہ عنہ کے ساتھ ناخوشی ظاہر ہونے سے پہلے بھی انصاف سے بہت دور تھا۔ اور یہ کہنا بھی بلا مقصد ایک تکلف ہی ہے کہ سابقین ہجرت ونصرت سے وہ لوگ مراد ہیں، جنہوں نے جناب امیر رضی اللہ عنہ کے خلافت بلافصل کی تصدیق کی ہو اور امر خلافت میں حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی وصیت پر عمل کیا ہو کیونکہ آیت کے کسی لفظ سے اس قید کا پتہ نہیں چلتا۔ (انتھی کلامہ)

ملا جی کے اس کلام سے یہ بات صاف سمجھی جا سکتی ہے کہ جب جناب مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی امامت سے انکار بھی آیت کے عموم میں تخصیص نہ پیدا کر سکا تو دوسری کوتاہیاں مثلاً فدک وغیرہ جو وقوع میں آئیں۔ کہاں تخصیص پیدا کر سکیں گی کیونکہ آیت میں کوئی ایسی چیز ہی نہیں جو اس قید کی طرف اشارہ کرے۔

پھر عبداللہ مشہدی کہتا ہے بہتر ہے یوں جواب دیا جائے کہ یہ آیت صرف اس پر دلالت کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ مہاجرین وانصار کے سابقین سے اور اس ہجرت ونصرت میں پیغمبر صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان کی سبقت سے راضی ہوا۔ اور جب وہ انکے کسی فعل سے راضی ہوا تو لامحالہ اسکی جزا جنت میں ہمیشہ رہنے سے ہوگی۔ اور ظاہر ہے دخول جنت رضائے الٰہی پر موقوف ہے اور وہ موقوف اس رضائے الٰہی کے آخر عمر تک باقی رہنے پر حسن خاتمہ کے ساتھ اور ایمان کی بقا کے ساتھ اور اس شرط کے ساتھ کہ اس سے ایسے اعمال صادر نہ ہوں جو اچھے اعمال کو سوخت کر دیں، انتھی کلامہ

یہ تو انکے ہاں کے چوٹی کے دانشمندوں کی لیاقت علمی اور حافظہ کا حال ہے کہ وہ اپنے ہی کلام کے ہر پہلو کا بھی لحاظ نہیں رکھ سکتے۔ اور نہ اپنے اصول وعقائد ہی انہیں یاد رہتے ہیں۔

اول تو بروئے قواعد واصول یہ آیت اس مضمون پر صحیح طور سے دلالت نہیں کرتی جسکی اس نے تقریر کی ہے کیونکہ آیت کا مقصد رضامندی ظاہر کرنا ہے۔ مہاجرین وانصار کی ذاتوں سے اور جب انکی ذاتوں کو ہجرت ونصرت کے خاص وصف سے یاد کیا ہے تو یہ لازم آیا کہ یہ وصف تعلق رضا کا سبب ہو نہ یہ کہ رضا کا تعلق اسی سے ہو اور متعلق رضا ہونے اور تعلق رضا کا سبب ہونے میں جو فرق ہے وہ بالکل ظاہر ہے۔ ملا تو خیر خاص رسیدہ ہے مکتب کے بچے بھی اس فرق کو جانتے ہیں

اگر کلام اللہ میں اسی طرح دھاندلی چلنے لگے تو کسی بھی مقصد میں استدلال کی صورت قائم نہیں ہو سکتی مثلاً آیت موالات صرف اسی پر دلالت کرتی ہے کہ تمہاری ولایت اس وصف کے ساتھ متعلق ہے

یعنی نماز قائم کرنے اور بحالت رکوع زکواۃ دینے سے اور یہ وصف بشرط ہے اچھے خاتمہ اور فلاں فلاں باتوں سے اسی طرح کی اور بھی مثالیں دی جاسکتی ہیں۔

دوسرے یہ کہ جب اس عمل کی جزا بالیقین جنت کی دائمی رہائش ہوئی تو اس جزا سے روکنے والی دو ہی چیزیں ہو سکتی ہیں یا کفر و ارتداد، یا وہ بداعمالیاں جو اچھے اعمال کو سوخت کردیں۔ اول صورت میں مخالفوہ فسقہ کا قاعدہ درہم برہم ہوجاتا ہے۔ اسکے علاوہ ملا عبداللہ مشہدی نے مذکورۃ الصدر جواب و سوال کے ذیل میں اعتراف کیا ہے کہ کسی تاویل باطل کی بنا پر جناب امیر رضی اللہ عنہ کی امامت سے یا نص سے انکار موجب کفر نہیں۔

اور قاضی نور اللہ شوستری مجالس المؤمنین میں یہ لکھ چکا ہے کہ شیخین رضی اللہ عنہما مرتد نہیں اور یہ سب کچھ بیان ہو چکا ہے۔ دوسری صورت میں خود اپنے عقائد کے خلاف کرتا ہے۔ نصیر الدین طوسی تجرید العقائد میں کہہ ہی چکا ہے کہ حبط اعمال ایک قسم کا ظلم ہے۔ اور طرفہ تماشہ یہ کہ ملا جی کو اپنا یہ عقیدہ ایسا فراموش ہوا اور سخن پروری میں وہ اتنے غرق ہوگئے کہ خلفاء کے اعمال حبط کرنے والے گناہوں کی گنتی اور تعیین کرنے لگے۔ کہ چار اعمال کو حبط اعمال کا سبب بھی بیان کر ڈالا۔ اول یہ کہ وہ غزوہ احد میں جنگ سے بھاگے دوم خلافت مرتضی کو غصب کیا، سوم فدک بھی دبا لیا چہارم جناب فاروق ؓ نے قرطاس و قلم میں رکاوٹ ڈالی، حالانکہ اپنے کلام مذکورۃ الصدر میں خود اعتراف کر چکا ہے کہ امامت مرتضی سے انکار بھی آیت میں تخصیص پیدا نہیں کرسکتا۔ اور اسکو رضا اور خوشنودی سے کوئی منافات نہیں۔ جب وہ رضامندی کے منافی ہی نہیں تو اعمال کسطرح سوخت کرے گا۔ اگرچہ تمام شیعوں کے نزدیک بدلیل آیت لَئِنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ اعمال کا سوخت ہونا کفر و شرک کا خاصہ ہے۔ اور احد کے دن بھاگنا اول تو از روئے قرآن معاف ہوچکا ہے دوسرے وہ اس آیت کے نازل ہونے سے پانچ سال پہلے کا واقعہ ہے۔ وہ کس طرح اعمال کے حبط و سوخت کا سبب بنے گا۔ کہ اول تو عفو الٰہی کے باعث گویا نسیاً منسیاً ہوا۔ پھر اس آیت کے نزول کے بعد اگر وہ عمل حبط ہوچکا تھا تو حبط شدہ اعمال کے ساتھ رضائے الٰہی کا وابستہ ہونا کیا معنی رکھتا ہے۔

اس پر اتفاق ہے کہ سورۂ توبہ آخر میں نازل ہے۔ اور جنگ احد ہجرت کے تیسرے سال واقع ہوئی اور خلافت مرتضی کو غصب کرلینا باعتراف فضلائے شیعہ کفر نہیں تو اس سے اب حبط اعمال کی صورت کب متصور ہوسکتی ہے۔ اور فدک کا تو غصب واقع ہی نہیں ہوا۔ کیونکہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فدک بی بی فاطمہ رضی اللہ عنہا سے لیکر اپنے قبضہ میں نہیں لیا بلکہ میراث یا ہبہ ناتمام کی روک تھام کی ہے۔ اسے غصب کوئی فاتر العقل ہی کہہ سکتا ہے۔ اور پھر اسکے باوجود یہ روکنا بھی ایک حدیث مشہور کے سبب سے تھا اس لیے وہ گناہ بھی نہ تھا کفر تو دور کی بات ہے اور اعمال سوخت ہوجانے کا تو کوئی سوال ہی نہیں۔ رہا قرطاس و قلم کا معاملہ تو شیخین رضی اللہ عنہما نے اس سے بالکل نہیں روکا ایتونی بقرطاس کے مخاطب صرف شیخین رضی اللہ عنہما تو نہ تھے۔ تمام بنی ہاشم اور اہل بیت رضوان اللہ علیہم شریک ہیں جناب فاروق رضی اللہ عنہ نے تو مشورہ دیا تھا اور مشورہ حبط اعمال کا سبب کس اصول قاعدے سے ہوگا۔

حاصل کلام یہ کہ یہاں ملا جی کی بے دست و پائی دیکھنے کے لائق ہے بے چارہ چاروں طرف ٹامک ٹوئیاں مار رہا ہے۔ مگر مقصد کا کوئی پتہ ہاتھ نہیں لگ پا رہا۔

Www.Ahlehaq.Com

اسی طرح دوسری آیات اَجَعَلْتُمْ سِقَایَۃَ الْحَاجِّ الخ اور وَجَاھَدَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ لَا یَسْتَوٗنَ عِنْدَ اللّٰہِ الخ اور اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَھَاجَرُوْا وَجَاھَدُوْا بِاَمْوَالِھِمْ وَاَنْفُسِھِمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ الیٰ آخر السورۃ ۔ ان آیات مذکورہ بالا میں ملا محمد عبد اللہ مشہدی اور انکے ساتھ دوسرے شیعہ علماء نے بہت ہاتھ پاؤں مارے بہت کوشش کی کہ ادھر اُدھر سے کوئی مفید مطلب بات پلے پڑ جائے مگر۔ اے بسا آرزو کہ خاک شدہ، بالآخر ہار تھک کر اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔ اور چار و ناچار ان حضرات کے مراتب عالیہ کے قائل ہو گئے۔
یہ ہے ان شیعوں کے نزدیک ان مہاجرین و انصار کا حال جو ان کے خیال میں جناب امیر رضی اللہ عنہ و اہل بیت رضوان اللہ علیہم کے مخالف تھے جن میں خلفائے ثلاثہ رضوان اللہ علیہم بھی شامل تھے۔

اب رہا معاملہ ان مہاجرین اولین کا جنہوں نے جناب امیر رضی اللہ عنہ سے محاربہ کیا۔ مثلاً ام المؤمنین، جناب طلحہ و زبیر، رضی اللہ عنہم تو ان کے معاملہ میں شیعہ حضرات بڑے چکر اور تردد میں پڑے ہوئے ہیں۔ اسکی تفصیل یہ ہے کہ انکے لیڈر تو مخالف اور محارب میں کوئی فرق نہیں کرتے وہ تو سب کو کافر کہتے اور سب پر سب و شتم کرتے اور تبرا بھیجتے ہیں، مگر ان کے پچھلے سوچتے ہیں کہ اگر ہم نے امامت کو نبوت کا درجہ دیکر اسکے منکر کو کافر شمار کیا تو اصول مذہب میں بڑی گڑبڑ ہو جائیگی۔ ایک خلل اور گڑبڑ تو یہ ہے کہ حضرات ائمہ بلا کسی تکلف اور بغیر کسی مجبوری کے ان حضرات سے رشتہ مناکحت قائم کرتے اور اپنی لڑکیاں انکو دیتے بھی ہیں اور ان سے لیتے بھی ہیں چنانچہ جناب سکینہ رحمۃ اللہ علیہا کا جناب مصعب بن زبیر رضی اللہ عنہ سے نکاح ہوا۔ اور جناب قاسم بن محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہ کی لڑکی سے جناب امام محمد باقر رحمۃ اللہ علیہ نے نکاح کیا۔ اور اسی طرح کا عمل تمام حضرات ائمہ کے درمیان قائم، دائم، جاری رہا غرض ان حضرات کا معاملہ منکرین امامت کے ساتھ ہرگز ایسا نہ تھا جیسا کہ انکا معاملہ منکرین نبوت کے ساتھ۔ اور ہر امام کی امامت جناب امیر رضی اللہ عنہ کی امامت کی طرح ہے۔

دوسری گڑبڑ یہ کہ خود انکے اپنے عزیز و اقارب ائمہ کی امامت کے منکر ہوئے مثلاً محمد بن الحنفیہ رحمۃ اللہ علیہ جناب زین العابدین رحمۃ اللہ علیہ کی امامت سے منکر تھے۔ اور ان سے اختلاف رکھتے اور جھگڑا کرتے تھے۔ اور حجر اسود سے فیصلہ طلب کرنے کے بعد بھی اور اسکی شہادت کے باوجود جو جناب زین العابدین رحمۃ اللہ علیہ کے حق میں تھی اپنی امامت کے دعوے سے دست بردار نہ ہوئے۔ اور دنیا سے کوچ کے وقت اپنی اولاد کے حق میں امامت کی وصیت کر کے رخصت ہوئے۔ اور نذر و نیاز اور خمس وغیرہ جو کچھ مختار ثقفی ان کو بھیجتا اس میں جناب زین العابدینؓ کو بالکل شریک نہ کرتے۔ یا مثلاً زید شہید رحمۃ اللہ علیہ بلا شبہ اپنی ہی امامت کے مدعی تھے۔ اور امام محمد باقرؒ کی امامت کے منکر۔ انہوں نے اس بارے میں ہشام بن الحکم سے مناظرہ بھی کیا، مگر اس دعوی سے دست بردار نہ ہوئے حتی کہ شہید ہو گئے۔ پھر ان کی اولاد یحیٰ و متوکل جناب جعفر صادق رحمۃ اللہ علیہ سے برسر پرخاش رہے۔ پھر اسی طرح جناب صادق رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد آپس میں لڑتی رہی۔ مثلاً عبد اللہ افطح اور اسحٰق بن جعفر اپنی اپنی امامت کا دعوی کرتے رہے۔ اور اگر امام حسن رضی اللہ عنہ کی اولاد کو لیں تو ان میں سے بھی ایسے افراد مثلاً نفس زکیہ رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ تھے جو اپنی امامت کے مدعی ہوئے۔ اور دوسرے ائمہ کی امامت کے منکر۔ اور معاملہ تو تو میں میں سے گذر کر جنگ و قتال تک پہنچتا تھا۔ اور لڑائی کی آگ بھڑک اٹھتی تھی۔ بلکہ ان کے پیروؤں نے تو آپس

www.Ahlehaq.com

میں کشت وخون کیا ہے اور یہ ساری تفصیلات کتب تاریخ و انساب کے اوراق میں مذکور ہے۔
لہٰذا اگر انکار امامت انکار نبوت کی طرح کفر ہو تو یہ سب کے سب حضرات کافر ٹھیرتے ہیں۔ اور دوسری طرف وہ حضرات ائمہ جنہوں جناب زید شہید اور محمد بن الحنفیہ رحمہما اللہ یا ان جیسے حضرات کے بارے میں خوبی و فلاح کی شہادت دی ہے وہ جھوٹے قرار پاتے ہیں۔
اور اگر یہ کہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اولاد امام وقت کے انکار کے بعد بھی کافر نہیں ہوتی مگر دوسرے ہو جاتے ہیں تو موجبات کفر میں تفاوت و اختلاف اور تمیز لازم آتا ہے۔ حالانکہ موجبات کفر میں بالاتفاق کوئی تفاوت نہیں خواہ امام زادہ ہو یا علوی، ادھر زبان سے کلمہ کفر نکلا اُدھر کافر ہوا۔ بالآخر مجبور و لاچار ہو کر یہ کہنا پڑا کہ منکر امامت کافر نہیں ہوتا۔ پھر مخالف و محارب میں فرق نکال بیٹھے کہ منکر مخالف ہے اور مخالف فاسق اور محارب کافر لیکن یہاں ایک اور خرابی لازم آگئی۔ کیونکہ انکار امامت کفر نہیں اور محاربہ انکار کو لازم ہے جبکہ امام اپنا تصرف چاہتا ہے تو گویا کفر غیر کفر کو لازم ہوگا حالانکہ یہ محال ہے جو حکم لازم کا ہے وہی ملزوم کا ہوتا ہے۔ لہٰذا انکار بھی کفر ہوگا۔
یہ بھی ظاہر ہے کہ محاربہ خود انکار کا ایک مرتبہ ہے۔ کیونکہ جب امام تصرف کا ارادہ کرے تو انکار کی یہی شکل ہوگی اکثر شیعوں نے اس بات کا جواب اس طریقہ سے دیا ہے کہ اگرچہ قاعدہ کا تقاضہ یہی ہے کہ جب کسی چیز کا انکار کفر نہ ہو تو اس چیز کے مالک کے ساتھ محاربہ بھی کفر نہ ہونا چاہئے۔ کیونکہ محاربہ انکار ہی کی ایک شکل ہے لیکن اس قاعدہ کو خلاف عقل ہم نے محاربان حضرت امیر رضی اللہ عنہ کے حق میں ترک کر دیا ہے اس لیے کہ ہم کو متفق علیہ حدیث حربك حربی وسلمك سلمی پہنچی ہے۔
انکے اس جواب میں بچند وجوہ خلش موجود ہے۔ اول یہ کہ یہ کلام مجاز پر محمول ہے حرف تشبیہ کے حذف کے ساتھ۔ یعنی حربک کانہ حربی۔ اس لیے کہ معنی حقیقی تو بہرحال ممکن ہی نہیں ظاہر کہ حضرت امیر رضی اللہ عنہ کے ساتھ حرب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حقیقۃً تو حرب نہیں تھی بلکہ حکماً تھی۔ جب مجاز بحذف حرف تشبیہ ہوا تو اس حدیث سے اس کا مذموم و قبیح ہونا تو معلوم ہوا۔ مگر کفر نہیں ہوا کیونکہ تشبیہ میں مشبہ اور مشبہ بہ کا تمام احکام میں یکساں ہونا لازم نہیں، اور حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ الفاظ بہت سے صحابہ اور متعدد قبائل مثلاً اسلم، غفار، جہینہ، مزنیہ کے حق میں ارشاد فرمائے حالانکہ بالاتفاق ان سے محاربہ کفر نہیں۔
دوسرے یہ کہ کلام کے معنی یہ ہیں حاربك بالتخصیص حاربی۔ پس بہت سی جماعتوں کی لڑائی مثلاً قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ کی جن میں حضرت امیر رضی اللہ عنہ بھی ہوں گے حرب رسول نہ تھی۔ اور اس قسم کا اضمار مشہور بھی ہے اور رائج بھی۔ مثلاً اگر کوئی شخص اپنے دوست سے کہے کہ جو تیرا بدخواہ میرا بھی بدخواہ ہوگا۔ اور وہ دوست ایسی جماعت کے زمرہ میں ہے جنکا کوئی بدخواہ کسی امر عام مشترک کے سبب سے ہے تو وہ شخص عموم کلام میں داخل نہ ہوگا۔ نہ بروئے لغت نہ بلحاظ عرف اور صحابہ کرام اور ام المومنین رضی اللہ عنہم خصوصاً جناب امیر رضی اللہ عنہ کے ساتھ لڑائی کا کوئی ارادہ نہ رکھتے تھے بلکہ انکا تو قاتلین عثمان سے پورا قصاص لینے کا مطالبہ تھا جناب امیر رضی اللہ عنہ بھی اسی لشکر میں شریک تھے تو لا محالہ ان سے بھی لڑائی تھی۔
تیسرے حَرْبُكَ حَرْبِي۔ عَدَاوَتُكَ عَدَاوَتِي سے کنایہ ہے۔ ظاہر ہے یہ حضرات جناب امیر رضی اللہ عنہ سے

www.Ahlehaq.com

سے عداوت نہ رکھتے تھے۔ نہ انکی لڑائی عداوت کی بنا پر تھی محض رفع فساد کیلیے مقابلہ کی نوبت آئی اور بات جنگ وقتال تک جا پہنچی۔

چوتھے یہ کہ تمام اختیاری امور میں قصدوارادہ شرط ہے تاکہ وہ مدح وذم کا مصداق بن سکے۔ مثلاً ایک شخص کہے جو اس برتن کو توڑے گا میں اس کے ساتھ ایسا ایسا کروں گا۔ اب ایک شخص نے چلنے میں ٹھوکر کھائی اور اسکا پاؤں برتن سے لگا اور برتن ٹوٹ گیا تو بالاجماع اسے برتن توڑنے والا نہیں کہا جائے گا۔ اور وہ اس دھمکی کا مصداق نہیں ہوگا۔ چنانچہ معتبر تاریخوں کی روسے جناب امیر رضی اللہ عنہ سے انکی لڑائی بالکل اسی نوع کی تھی۔

پانچویں یہ کہ ہم تسلیم بھی کر لیں کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ کی لڑائی بہر حال محاربہ رسول ہے۔ لیکن محاربہ رسول بھی تو مطلقاً کفر نہیں۔ البتہ نبوت اور رسالت کے انکار کے ساتھ کفر ہے۔ دنیا اور مال کی طمع کے ساتھ کفر نہیں اس پر وہ آیت دال ہے جو قطاع الطریق کے حق میں وارد ہے اور ڈاکو بالاجماع کافر نہیں فاسق ہیں۔ اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَسْعَوْنَ فِي الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ يُّقَتَّلُوْٓا اَوْ يُصَلَّبُوْٓا۔ سود خوروں کے بارے میں بھی اسی قسم کی دھمکی آئی ہے۔ حالانکہ وہ بالاتفاق کافر نہیں۔ فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ۔ بلکہ یہاں تو ان خاسقین کے لیے خدا اور رسول ہر دو سے لڑائی لڑنا ثابت کیا ہے اور حدیث میں تو صرف حرب رسول کا ذکر ہے تو جب خدا اور رسول ہر دو سے لڑائی موجب کفر نہ ہوئی تو تنہا رسول سے محاربہ کیوں کفر ہوگا۔ ہاں رسول کے ساتھ لڑائی دین کے انکار کے ساتھ اور اسلام کی توہین کی غرض سے ہو تو وہ بلاشبہ کفر ہے مطلق لڑائی کفر نہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے متعلق کیا کہوگے؟ حضرت ہارون علیہ السلام سے محاربہ میں آپ نے کوئی تامل نہ کیا اور اتنا سخت محاربہ کیا کہ حضرت ہارون علیہ السلام زاری کرنے لگے اور فرمایا۔ يَا ابْنَ اُمَّ لَا تَاْخُذْ بِلِحْيَتِيْ وَلَا بِرَاْسِيْ۔ محاربہ اور لڑائی میں اس سے زیادہ اور کیا ہوتا ہے جناب امیر رضی اللہ عنہ بھی بمطابق اَنْتَ مِنِّيْ بِمَنْزِلَةِ هَارُوْنَ مِنْ مُّوْسٰى۔ وہ رتبہ رکھتے تھے۔ ادھر زوجہ رسول صلے اللہ علیہ وسلم نے آپ کو قاتلین عثمان کا حامی اور معاملہ قصاص میں ٹال مٹول کرنے والا سمجھ کر ان سے رنجش و پرخاش رکھی۔ دوسری حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت ہارون علیہ السلام کو گوسالہ پرستی کا حامی اور حدود تعزیر میں سستی کرنے والا جان کر اپنے بڑے بھائی اور پیغمبر کی اہانت کی۔ لہٰذا اگر محاربہ رسول کو کفر قرار دیا جائے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے متعلق کیا فیصلہ ہوگا۔ ان کا مقام کہاں ہوگا۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے حضرت یوسف علیہ السلام اور اپنے والد حضرت یعقوب علیہ السلام کے ساتھ جو معاملہ کیا اور جو صدمات پہنچائے کیا وہ محاربہ سے کم اذیت ناک تھے۔ پھر ان حضرات کو آپ کہاں اور کس مقام پہ لے جا کر کھڑا کریں گے۔

ایسے مباحث اور مواقع پر آدمی کو منصف مزاجی سے کام لینا چاہیئے اور ہر شخص کے مرتبہ اور مقام کو ملحوظ خاطر رکھنا چاہیئے۔ دوسری طرف کی شخصیت کوئی گری پڑی ہستی نہیں زوجہ ومحبوبہ رسول ہیں۔ جو قرآنی حکم کے مطابق ام المومنین ہیں۔ اور اس طرح جناب امیر خود کی بھی! ماں اپنے بیٹے کو اگرچہ قصور سے بری الذمہ ہو ڈانٹ ڈپٹ سکتی ہے۔ زمانہ کا اونچ نیچ سمجھا سکتی ہے۔ کسی بھی عمل کے متعلق باز پرس کر سکتی ہے۔ ہم تم بھولے

جو نہ تین میں نہ تیرہ میں۔ ہمیں کیا حق پہنچتا ہے کہ ان کی ماں پر لعن طعن کریں، سب وشتم کریں اور تبرا بازی کریں (یہ تو پرائے شگون اپنی ناک کٹانی ہوئی، یہ تو ماں بیٹوں کا قضیہ تھا یہاں حل نہ ہوا تو آگے بڑوں کی خدمت میں پہنچ کر طے ہو جائے گا اور سب باہم شیر وشکر ہو جائیں گے، کمبختی تو ان کی آئے گی جنہوں نے یہاں کرائے کے فوجیوں کا کردار ادا کیا، اپنی حیثیت کو بھول کر بڑے بول بولے۔ جنکی عزت وحرمت جزء ایمان تھی اسکے پاک دامن کو لعن طعن اور سب وشتم کے دھبوں سے داغدار کیا اور خوب دل کھول کر بڑی ڈھٹائی اور رعونت سے ڈنکے کی چوٹ بر سر منبر دنیا کو گواہ بنا کر دیدہ ودانستہ اپنی عاقبت خراب کی اپنی گور کو آتش جہنم سے بھرنے کا سامان کیا، اور پھر مست وبے خود ہو کر نعرہ لگایا، ”شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم“۔ (ن) چنانچہ حضرت موسیٰ اور حضرت یوسف علیہما السلام کے برادران پر زبان طعن دراز کرنے کا ہمیں کوئی حق نہیں جبکہ وہ برابر کے بھائی ہیں، اور یہاں تو ماں بیٹے کا تعلق ہے یہاں تو اور زیادہ محتاط ہونا چاہیئے، اگر فرق مراتب کا خیال نہ کیا اور ان کو بھول گئے، تو یاد رکھو زندیق کہلاؤ گے۔

حاصل کلام یہ کہ حدیث حربک حربی سے محاربان جناب امیر رضی اللہ کے کفر کے اثبات کیلئے تمسک کرنا قاعدہ کے لحاظ سے درست قرار نہیں پا سکتا اور بہت سے اصولوں کے خلاف رہتا ہے ان لڑائی لڑنے والوں کے نہ اعمال صالحہ کہیں جاتے ہیں اور نہ ان کا ایمان ضائع ہوتا ہے، اور یہی بغض وعداوت سب وشتم اور تبرا کو روکتے ہیں۔ اور محارب ومخالف کا فرق کسی طرح بھی سمجھنے میں آنے کے لائق نہیں۔

اس سلسلہ میں بھی علماء شیعہ کی آراء اور اقوال سنیئے۔

قاضی نور اللہ شوستری نے مجالس المومنین میں بیان کیا ہے کہ شیعیت کا مفہوم (خلاصہ) یہ ہے کہ حضور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد جناب علی رضی اللہ عنہ خلیفہ بلافصل تھے، اس سلسلہ میں سب وشتم اور لعن جائز نہیں اور خلفائے ثلاثہ (رضوان اللہ علیہم) کے نام زبان پر لانے کی گنجائش ہے۔ اگر جاہل شیعہ، وجوب طعن کا حکم لگائیں تو ان کی بات کا کوئی اعتبار نہیں، اور شیعوں پر جو یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی طرف خبث وفحش کی نسبت کرتے ہیں تو حاشا ثم حاشا ایسا ہرگز نہیں، فحش کی نسبت تو کسی عامی آدمی کی طرف بھی حرام ہے چہ جائیکہ حرم پیغمبر صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف یہ نسبت کی جائے البتہ جب حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا وقرن فی بیوتکن کی مخالفت کرتے ہوئے بصرہ آئیں اور جناب امیر رضی اللہ عنہ کے خلاف لڑائی کا اقدام کیا اور بموجب حدیث حربک حربی وسلمک سلمی، جسکو فریقین مناقب امیر رضی اللہ عنہ میں ذکر کرتے ہیں کہ نہ جناب امیرؓ کے ساتھ لڑائی مقبول ہے نہ حضرت پیغمبر علیہ السلام کے ساتھ، اس لیے وہ قابل طعن ٹھہریں۔ اسی کے متصل دوسرے ہی مجالس میں یہ بات بھی کہی کہ کتب شیعہ میں ایک ضعیف روایت یہ بھی دیکھنے میں آئی کہ جناب صدیقہ رضی اللہ عنہا نے جناب امیر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں توبہ کی۔ لیکن لڑائی کا قصہ متواتر ہے اور توبہ کی حکایت خبر آحاد۔ بہر حال اس بات کی بنا پر ان پر طعن جائز نہیں“ (انتہے کلامہ)۔

اہل تاریخ اس سے بھی واقف ہیں، کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ کے کسی لشکری کے حوالہ سے حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کی توبہ بھی منقول ہے۔ اور جناب امیر رضی اللہ عنہ کا جناب زبیر رضی اللہ عنہ کو حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی

حدیث یاد دلاتا جس سے آپ کی خلافت کی حقیت ثابت ہوتی تھی، اور جناب زبیر رضی اللہ عنہ کا معرکہ جنگ سے واپس ہو جانا بھی بطریق شہرت و تواتر مروی ہے تو ان روایات کی رو سے بھی شیعہ کے نزدیک ان اشخاص پر بھی طعن جائز نہ ہوگا۔ اور یہی مُدعا ہے۔

واضح رہے کہ شیعہ اسلاف میں سے مثلاً عبداللہ مشہدی اور انکے ساتھیوں نے اس عقیدہ سے رجوع کر لیا ہے کہ حضرت امیر کا محارب کافر ہے۔ اور صرف اتنے ہی پر قناعت کی ہے کہ جناب سے لڑائی کفر تو نہیں ہے لیکن فسق اور گناہ کبیرہ تک پہنچا دیتی ہے کیونکہ انہوں نے نص کی تکذیب بہرحال نہیں کی۔ اس میں کوئی غلط تاویل کی یا نص محاربہ سے انکار کر کے اسے حلال سمجھا۔ تو یہ صورت فسق اعتقادی کی ہے کفر کی نہیں، اُدھر خواجہ نصیرالدین طوسی بھی کوئی ایسا ویسا نہیں علمائے شیعہ کے نزدیک اس کا قول بھی "وحی ناطق" کا درجہ رکھتا ہے خاص طور پر باب اعتقاد میں اسلیے ان کے متاخرین میں سے بعض نے ملا عبداللہ اور خواجہ نصیرالدین کے اقوال میں تطبیق دی ہے کہ "بمقتضائے حدیث حربک حربی جناب مرتضی رضی اللہ عنہ سے لڑنے سے کفر لازم آتا ہے۔ اگرچہ التزام کفر نہ ہو۔ اور لزوم کفر شیعوں کے نزدیک بھی کفر نہیں۔ بلکہ التزام کفر، کفر ضرور ہے۔ لہذا خواجہ کا قول باعتبار لزوم ہے جو ظاہر حدیث کے موافق ہے اور جناب ملا اور اسکے ساتھیوں کا قول بلحاظ التزام ہے جب ان میں التزام کفر نہ ہوا تو ان پر مرتد کا لفظ راست نہ آیا،، انتہی کلامہ۔

حق یہ ہے کہ یہ کلام تکلف کا شاہکار ہے۔ اصول شیعہ میں اس سے بڑھ کر تکلف کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ایک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا۔ لیکن حدیث مشہور کو قابل تاویل ہے اور بالیقین اسکے حقیقی معنی مراد بھی نہیں پھر بھی یہ ان آیات قطعیہ سے بالکل نہیں ٹکراتی جو عام مہاجرین و انصار اور خصوصاً ازواج مطہرات اور ان دونوں بزرگوں (رضوان اللہ علیہم) کی شان میں وارد ہوئی ہیں۔ پھر شیعی قواعد کی رو سے بھی ان حضرات کا کفر صحیح نہیں بیٹھتا۔ بات جو زیادہ سے زیادہ کہی جا سکتی ہے وہ یہ کہ امام وقت کے خلاف لڑائی بغاوت ہے اور بغاوت فسق ہے کفر نہیں۔ اور اگر اسکی بنا بھی کسی تاویل یا شبہ پر ہو تو یہ بغاوت فسق بھی نہیں بلکہ خطائے اجتہادی ہے۔ یہ تھا شیعہ نکتہ نظر جناب امیر رضی اللہ عنہ اور انکی خلافت کے متعلق،

اسکے بعد یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مسئلہ میں اہلسنت کا جو مذہب ہے وہ بھی زیر بحث لے آیا جائے۔ اور اسکو بھی ذرا تفصیل کے ساتھ ناظرین کے گوش گذار کر دیا جائے۔

واضح رہے کہ فقہی اجتہادی مسائل مثلاً امامت، میراث پیغمبر، ہبہ قبل القبض کا تمام نہ ہونا، تقسیم خمس، حج تمتع، وغیرہ میں جناب امیر رضی اللہ عنہ کی مخالفت ہرگز کفر نہیں، کفر کیا معصیت و گناہ بھی نہیں کیونکہ آپ بھی منجملہ، مجتہدین ایک مجتہد تھے اور مسائل اجتہادیہ میں مجتہدوں کا اختلاف جائز ہے اور ہر مجتہد اجر کا مستحق ہے۔

ہاں بغض و عداوت اور عناد کے جذبہ سے جس نے آپ سے لڑائی لڑی وہ اہلسنت کے نزدیک بھی کافر ہیں اس پر سب کا اجماع ہے اور خوارج اور اہل نہروان کے بارے میں انکی یہی رائے اور مسلک ہے۔ اور حدیث حربک اسی قسم کے حرب پر محمول ہے۔ لیکن یہاں بھی لزوم کفر ہے التزام کفر نہیں تو ان پر مرتد کا اطلاق نہیں ہوگا اور انکا غیر معقول شبہ نصوص قطعیہ قرآنیہ اور احادیث متواترہ کے خلاف ہے تو وہ انکے عذر کا سبب نہیں

بن سکتا۔ گویا اہلسنت کے نزدیک احکام اخروی میں خوارج کافر ہیں۔ انکے لیے ایصال ثواب اور دعائے مغفرت نہیں کرنی چاہیئے۔ نہ نماز جنازہ پڑھنی چاہیئے وغیرہ وغیرہ۔
بغض وعداوت اور عناد کے جذبہ سے پاک محض کسی غلط شبہ، غلط فہمی یا غیر مناسب تاویل کی وجہ سے آپ سے لڑنے والے جیسے صاحبان جمل اور اصحاب صفین۔ تو یہ خطائے اجتہادی اور بطلان اعتقادی میں مشترک ہیں فرق یہ ہے کہ اصحاب جمل کی یہ خطائے اجتہادی اور فسق اعتقادی کسی طور پر بھی طعن و تحقیر کو سند جواز عطا نہیں کرتا اسلئے کہ انکی مدح خوانی، سبقت اسلامی میں اور جناب رسالتمآب صلے اللہ علیہ وسلم سے انکی قرابت ثابت ہونے میں اور حضور سے انکے نسبی اور سسرالی رشتے ثابت ہونے میں نصوص قطعیہ قرآنیہ اور احادیث متواترہ وارد ہیں، جیسا کہ حضرت موسی علیہ السلام کا معاملہ آپ کی عصمت اور علو مرتبہ پر جو قرآنی نصوص وارد ہیں وہ آپ پر طعن کرنے یا آپ کی تحقیر سے مانع ہوگئیں۔ جو آپ سے اپنے بھائی کے بارے میں سرزد ہوا۔ وہ بے تاملی اور عجلت کی بنا پر ہوا ورنہ یہ سب کچھ للہ، فی اللہ تھا، شیطانی وسوسہ کا تو آپ کے لیے تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔
رہا اصحاب صفین (رضی اللہ عنہم) کا معاملہ تو جو امور اصحاب جمل کے متعلق قطعی اور یقینی طور پر ثابت ہوئے ان حضرات کیلیے قطعی اور یقینی طور پر نصوص موجود نہیں اس لیے ان کے معاملہ میں توقف وسکوت لازمی ہے۔ ان آیات واحادیث کے عموم پر نظر کرتے ہوئے جو فضائل صحابہ کے سلسلہ میں وارد ہیں بلکہ تمام ہی مومنین کے فضائل پر مشتمل ہیں اور جو انکی نجات اور شفاعت کی امید پر وابستہ رکھنے کا حکم ظاہر کرتی ہیں،
اہل شام کی جماعت میں سے کسی کے متعلق جب تک قطعی اور یقینی طور پر یہ نہ جان لیں کہ وہ جناب امیر رضی اللہ عنہ کے ساتھ بغض وعداوت رکھتا تھا حتی کہ آپ کو کافر کہتا تھا اور سب وشتم اور لعن طعن کرتا تھا تو ہم ایسے شخص کو یقینیۃً کافر کہیں گے۔ اور جب یہ بات معتبر روایات سے پایۂ ثبوت تک نہ پہنچے تو چونکہ انکا اصل ایمان بالیقین ثابت ہے اس لیے ہمارے نزدیک وہ مسلمان ہونگے
خلاصہ کلام یہ کہ اہلسنت کا اس پر اتفاق ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو کافر کہنے والا آپ کے جنتی ہونے سے انکاری، یا دینی اوصاف، علم، عدالت، زہد، تقوی کے اعتبار سے آپ کو خلافت کیلیے نااہل کہنے والا اور آپ کی لیاقت کا منکر، کافر ہیں، یہ بات خوارج نہروان کے متعلق قطعی ثبوت کی حد تک پہنچنے کے سبب انکو کافر کہتے ہیں اور جنکے بارے میں پایۂ ثبوت تک نہیں پہنچی انکو کافر نہیں کہتے۔
اہلسنت کے مذہب کی یہ وضاحت وتحقیق انکے اصول طے شدہ کے بھی مطابق ہے کیونکہ انکا اتفاق ہے کہ ضروریات دین سے انکار کرنے والا کافر ہے۔ اور جناب امیر رضی اللہ عنہ کا ایمانی درجہ میں بلند ہونا، آپ کا جنتی ہونا، اور حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی خلافت کے لائق ہونا نہ صرف احادیث سے بلکہ آیات قرآنیہ سے ثابت ہے، لہذا ان کا منکر کافر ہوگا۔ اور کم ظرفی، حب مال وجاہ، تاویل باطل، غلط فہمی یا کسی کے بھڑکانے اور بہکانے کی وجہ سے آپ سے لڑائی کفر نہیں فسق عملی یا اعتقادی ہے۔
اما میہ جب اصل بنیاد میں اہلسنت سے اتفاق کرتے ہیں تو انہیں حکم میں بھی اتفاق کرنا چاہیئے
مقدمہ (۷) یہ کہ اگر کوئی مرد مومن مرتکب کبیرہ ہوجائے یا کسی غلط فہمی یا شبہ فاسد میں پڑ کر

کسی ناشائستہ حرکت کا مرتکب ہو جائے تو اسے سب وشتم اور لعن طعن کرنا جائز نہیں اور اس سلسلہ میں کئی دلیلیں دی جا سکتی ہیں مثلاً۔

(۱) اللہ تعالٰی کا ارشاد ہے فَاعْلَمْ اَنَّہٗ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْبِكَ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ۔ (سلو! اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ۔ اپنے اور مومن و مومنات کیلیے معافی چاہتے رہو) اس اصول قاعدہ پر سب کا اتفاق ہے کہ کسی چیز کا حکم دینا، اسکے خلاف کو روک دینا ہے، لہذا مومن فاسق جو محتاج استغفار ہیں انکو استغفار کا حکم دینا اس بات سے روکتا ہے کہ ان کے گناہ کے سبب ان کو زجر و توبیخ اور لعن طعن نہ کی جائے، نہ بد دعا کی جائے، کیونکہ یہ سب باتیں استغفار کے ضد ہونے کی وجہ سے ممنوع ہیں۔ اسی لیے نماز کی آخری رکعت میں تشہد و درود کے بعد دعائے ماثورہ مشتمل بر استغفار مؤمنین و مومنات مسنون ٹھیرا۔ اور لعن کرنا یا بد دعا دینا ان کو رحمت الٰہی سے دور پھینکنا ہے اور شریعت کے حکم سے مقابلہ کرنا حرام قرار دیا جا چکا ہے،

(۲) اَلَّذِيْنَ يَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَہٗ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ الآیہ معلوم ہوا کہ حاملین عرش الٰہی بھی مسلمانوں کیلیے استغفار میں مشغول و مصروف ہیں ۔ اور ظاہر ہے مقربان دربار کے خلاف حضور شاہ کوئی لب کشائی غضب و ناخوشی کا ہی سبب ہو سکتا ہے، ایسے مسلمان و مومن کے خلاف بد دعا یا سب وشتم جسکے لیے حاملان عرش استغفار میں مشغول ہوں ہرگز رضائے الٰہی نہیں ہو سکتی ۔

(۳) اہل کبائر کے حق میں انبیاء علیہم السلام کی شفاعت ثابت ہے اب تم ان کو گالی یا بد دعا دے کر دربار خداوندی میں پیغمبر کے مدمقابل ہونے کی جرأت نہیں کر رہے ہو؟ ۔

(۴) وَالَّذِيْنَ جَآءُوْا مِنْ بَعْدِهِمْ يَقُوْلُوْنَ الآیہ معلوم ہوا کہ اس امت کے پچھلے آنے والوں کو اس شاندار روایت کا پاس و لحاظ کرتے ہوئے اپنے سے پہلوں کیلیے دعائے مغفرت کرنی چاہیے اور اس روایت کو زندہ و تازہ رکھنا چاہیئے۔ تاکہ کل ہم جب اسکے محتاج ہوں تو ہمارے بعد والے ہمیں فراموش نہ کر دیں۔ اب جو اس کے خلاف کرے ۔ یعنی بجائے دعائے مغفرت و عفوان پر لعن طعن کرے وہ گویا ملت و دین کا حق تلف کر رہا ہے ۔

(۵) محبت و دوستی کا سبب ایمان ہے جو فاسق میں موجود ہوتا ہے، یہ فسق قابل نمائش تمغہ نہیں۔ یہ ایک مرض ہے جو علاج کا محتاج ہے اس سے تعلق اور ہمدردی کا تقاضا ہے کہ اسکا یہ مرض دور کیا جائے اس کے دو طریقے ہیں ۔ ایک زندگی میں ایک موت کے بعد۔ زندگی میں علاج یہ ہے کہ اسے اچھی باتوں کرنے اور بری باتوں سے رکنے کو کہا جائے، وعظ و نصیحت کی جائے، حد و تعزیر سے آلائش روحانی دور کی جائے ۔ اور جب وہ مر جائے تو دوسرا طریقہ کام میں لایا جائے کہ اسکے لیے دعائے مغفرت کی جائے ایصال ثواب کیا جائے، صدقہ و خیرات، کلمہ و کلام سے اسے فائدہ پہنچایا جائے، یہ تو ایک فطری سی اور انسانی زندگی کی پیش پا افتادہ حقیقت ہے کہ جب کسی کا بھائی بند، عزیز رشتہ، مبتلائے مرض ہوتا ہے تو وہ اسے گولی مار کر یا قتل کر کے ازالہ مرض کرنے کی نہیں سوچتا وہ اسے لیکر طبیب کی طرف بھاگتا ہے، جو اس کا علاج اس مرض کے اثر کو زائل کرنے کی صورت میں کرتا ہے، اسکے قتل اور اسکی روح مٹانے کی شکل میں نہیں کرتا، حدیث صحیح کا ایک مضمون ہے لعن المؤمن کقتلہٖ (مومن کو لعنت کرنا گویا اسکو قتل کرنا ہے) اسلیے کہ لعنت کے معنی رحمت سے دور کرنے کے ہیں، اور

www.Ahlehaq.com

اسمیں جب تک ایمان موجود ہے اسکی رحمت سے دوری نہیں ہو سکتی ایسی صورت میں اس پر لعنت کرنے والا اللہ سے یہ کہہ رہا ہے کہ آپ اس کا ایمان سلب کرلیں، اب وہ سوچ لے کہ کس نے کیا کہہ کر اپنے لیے کانٹے بورہا ہے، کیونکہ سلب ایمان تو ہلاکت ابدی ہے جو قتل سے ہزار درجہ سخت ہے۔

(۶) علت کا وجود چاہتا ہے کہ حکم موجود ہو اور علت کے زوال کا تقاضا ہے کہ علت نہ ہو تو حکم بھی نہ ہو۔ لہٰذا مومن فاسق کا ایمان دائم ہے روح کے دوام کے سبب۔ دوام روح کی صفت ہے۔ اور یہ ایمان دوستی و محبت کا سبب ہوتا ہے۔ تو وجوب محبت بھی دائم بدوام روح ہوگا فسق ایک بدنی عمل ہے جب روح کا بدن سے تعلق ختم ہوگا تو یہ فسق بھی معدوم ہو جائے گا۔ اور اسکے اسباب، بغض و عناد، سب و شتم، لعن طعن، اہانت و تحقیر بھی بعد موت زائل ہو جائیں گے اور ایمان کے تقاضے (بسبب دوام ایمان) باقی رہیں گے اور وہ مثلاً مغفرت و بخشش وغیرہ ہیں اسی لیے حدیث صحیح میں وارد ہے۔ لَا تَسُبُّوا الْاَمْوَاتَ فَاِنَّهُمْ اَفْضَوْا اِلٰى مَا قَدَّمُوْا (مردوں کو گالی نہ دو کیونکہ وہ تو اپنی آگے بھیجی ہوئی اشیاء تک پہنچ چکے) موت اس لحاظ سے فاسق کے حق میں توبہ کا حکم رکھتی ہے کہ وہ عمل بد کا سلسلہ تو منقطع کر دیتی ہے مگر عمل سابق کو نہیں مٹا سکتی اور توبہ عمل سابق کو بھی ملیا میٹ کر دیتی ہے۔ اب موت کی وجہ سے جب عمل بد ختم ہوگیا، تو اب صرف ایمان رہ گیا۔ وجوب محبت جسکا تقاضا ہے۔

(۷) وَعَدَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا۔ (سورۃ توبہ)
ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے محض ایمان پر جنت کا وعدہ فرمایا ہے (آگے پیچھے کوئی تعلیق نہیں) لہٰذا مسلمان اور مومن پر لعن کرنا اور اسکے عذاب کی آرزو، یا دعا کرنا گویا خدا تعالیٰ سے یہ چاہنا ہے کہ وہ، ان کی، خاطر وعدہ خلافی کر جائے قطع نظر اس سے کہ خدا کے ہاں وعدہ خلافی کا خانہ ہی نہیں۔ ان دشمنان دین و ایمان کی سادگی کی بھی تو داد دینی چاہیئے۔ اللہ تعالیٰ نے بہت پہلے فرمایا کہ وَاللّٰهُ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ۔ پس یہاں طلب محال کے ساتھ نتیجہ میں سوء ادبی بھی!

مقدمہ (۸):۔ امور دنیا کے سبب بزرگوں میں باہم بہت دفعہ آزردگی پیدا ہوتی ہے مگر اسکے باوجود یہ بزرگ اس آزردگی باہم کے سبب کبھی اپنے مرتبہ سے نہیں گرے اور نہ تحقیر و اہانت کے سزاوار پائے جیسے حضرت یوسف علیہ السلام اور انکے برادران۔ کہ ان کے مابین تو بہت کچھ ہوا کیا ہے۔ مگر ہمارے لیے صرف یہی حکم ہے کہ ان کی عزت و تکریم کریں اور انکی تعظیم ملحوظ خاطر رکھیں۔

ائمہ اور امام زادوں میں جو اختلاف پیدا ہوا حتی کہ بعض نے بعض کی امامت تک سے انکار کر دیا تو ان حضرات کے معاملہ میں شیعہ حضرات کا طرز عمل بھی یہی ہے کہ سب کچھ ہوتے علی الرغم وہ سب کی عزت و تکریم کرتے ہیں اب اس عزت و تعظیم کی وجہ انکے نزدیک چاہے جو کچھ ہو مگر اس سے تو مجال انکار نہیں کہ ان میں سے معصوم تو صرف ایک ہی ہوگا۔ اب اپنی تعلیم مذہب اور افتاد طبیعت کے مطابق انکو معصوم کے مدمقابل کو جو کہنا چاہیے عجیب بات یہ ہے کہ وہ نہیں کہتے۔ ان کے حق میں کفر تو بڑی بات ہے فسق تک کا اعتقاد بھی نہیں رکھتے۔ اب جس وجہ سے امام زادگان رحمۃ اللہ علیہم سے شیعوں کا یہ طرز عمل ہے۔ اسی وجہ سے اہل سنت بھی رسول رحمت صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلقین، اصحاب، ازواج مطہرات، اور اہل بیت رضوان اللہ علیہم کی تعظیم و تکریم کام میں لاتے ہیں اور سرد و فریقوں کو اپنے اپنے طرز

عمل میں معذور رکھتے ہیں۔

اور ملا عبداللہ مشہدی جوان شیعوں میں نسبتاً ذرا اکبری نظر رکھتا ہے اور حاضر دماغ رہتا ہے اس متوجہ پر متنبہ ہوکر مطلق منع کو نا کافی جان کر اس لئے چشم پوشی نہ کر سکا اور خود ایک سوال قائم کرکے اسکے جواب کی کوشش کی ہے وہ کہتا ہے کہ یہ مقام شبہ کا ہے اور عقلمند کو چاہیے کہ شبہ کی صورت واضح کرکے بیان کرے پھر اسکو دور کرنے کی کوشش کرے اگر کوئی کہے کہ دو ہمرتبہ اشخاص ہوں یا جماعت مقبولان الٰہی میں سے ہوں اور ان کے درمیان کسی شبہ، شک یا اختلاف رائے کیوجہ سے نزاع یا رنجش پیدا ہوجائے اس صورت میں ہمیں حق نہیں پہنچتا کہ ان میں سے کسی پر بھی طعن کریں اور اس سے بدگوئی سے پیش آئیں (اب اسکے جواب میں کہتا ہے) یہ فرضی اگر ایسے تمام علمائے امت کے درمیان پیش آئے جو سب کے سب جائز الخطا ہوں تو ممکن ہے۔ اور اگر زیر غور مقام ایسا ہو کہ ایک طرف معصوم ہوں اور دوسری طرف جائز الخطا تو یہ جائز نہیں اس صورت کو اس پر قیاس نہیں کرسکتے کیونکہ یہاں مخاصمہ کے ہر دو اطراف برابر نہیں ایک طرف معصوم ہیں تو دوسری طرف جائز الخطاء معصوم چونکہ خطا کا احتمال نہیں رکھتا اس لیے وہ مقابل سے ناحق آزردہ نہ ہوگا۔ اور دوسری طرف چونکہ جائز الخطا ہے وہ اگر کسی بنا پر شبہ کرکے معصوم سے آزردہ ہوکر عداوت رکھے گا تو وہ معذور نہ ہوگا کیونکہ معصوم کی محبت اور اس کی رعایت تعظیم پر نص آچکی ہے، تو اس کے شبہ کا کوئی اعتبار نہیں جسطرح شیطان کا شبہ حضرت آدم علیہ السلام اور انکی اولاد کی عداوت میں کہ اس کا یہ شبہ قابل عذر نہیں، (انتھی کلامہ)

اس جواب میں بڑی ہوشیاری اور چالاکی کا مظاہرہ کرکے گڑبڑانے کی کوشش کی گئی ہے، اور یہ دانستہ مغالطہ میں ڈالنے کیلیے کی گئی ہے، ورنہ وہ اتنے کودن نہیں کہ یہ بھی نہ سمجھ پائے کہ ہم نے اپنے کلام کی بنیاد ہی ایسی صورت پر رکھی ہے کہ اگر دو معصوموں میں باہم آزردگی و ناراضگی پیدا ہو۔ جب وہ دونوں ہی معصوم ہیں تو پھر کہاں ابلیس کہاں آدم۔

اور ایسی مثالیں کہ فریقین معصوم ہوں اور ان میں باہم آزردگی پیدا ہو۔ اور دونوں ایک دوسرے کی حق تلفی کریں ہم کتب امامیہ سے بہت سی پیش کر سکتے ہیں۔

(۱) حضرت آدم علیہ السلام کا تنازعہ کہ حضرات ائمہ کا درجہ ان سے بلند کیوں ہوگیا، پھر ان سے مخالفت کرنا، ان سے حسد رکھنا، ان کی محبت کا عہد باوجود حکم الٰہی کے پورا نہ کرنا، اسکی پوری تفصیل بحث نبوت میں بیان ہوچکی ہے۔

(۲) حضرت موسیٰ علیہ السلام کا اپنے بڑے اور نبی بھائی حضرت ہارون علیہ السلام کی اہانت و تحقیر کرنا، داڑھی پکڑنا ان کے سر کے بال کھینچنا۔ یہ واقعہ قرآن مجید میں موجود ہے کسی کو مجال انکار نہیں۔

(۳) شیعوں کی معتبر کتاب، بحر المناقب میں مناقب اخطب خوارزمی سے ابوتراب کی وجہ تسمیہ بیان کرتے ہوئے نقل ہے کہ جناب رسالتمآب صلے اللہ علیہ وسلم بی بی زہرا رضی اللہ عنہا کے گھر میں تشریف لائے جناب علی رضی اللہ عنہ کو وہاں نہ دیکھا تو پوچھا میرا عم زاد کہاں ہے۔ بی بی فاطمہ رضی اللہ عنہا نے کہا مجھ میں ان میں کچھ ناچاقی ہوگئی اس لیے یہاں قیلولہ کرنے کے بجائے وہ باہر چلے گئے حضور صلے اللہ علیہ وسلم باہر تشریف لائے تو دیکھا کہ مسجد میں پہلو کے بل لیٹے سو رہے ہیں، اور سر و چہرہ صحن مسجد کی خاک سے خاک آلودہ ہے حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قُم یا ابا تراب، قم یا ابا تراب۔ (ابوتراب اٹھو۔ ابوتراب اٹھو) یہ واقعہ صحیح بخاری میں بھی آیا ہے، (انتھی کلامہ)۔

(۴) ابومخنف لوط بن یحییٰ ازدی، امامیہ کا بہترین محدث ہے حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کرتا

ہے کَانَ یُبْدِیْ الکَرَاھَۃَ لِمَا فَعَلُوْہُ اَخُوْہُ الْحَسَنُ مِنْ صُلْحِ مُعَاوِیَۃَ وَیَقُوْلُ لَوْ جُزَّ اَنْفِیْ کَانَ اَحَبَّ اِلَیَّ مِمَّا فَعَلَہٗ اَخِیْ (آپ اپنے بھائی جناب حسن رضی اللہ عنہ کے امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے صلح کر لینے پر بڑے خفا تھے اور فرماتے تھے، کہ اگر میری ناک کٹ جاتی تو وہ مجھے زیادہ پسند تھی اس بات کے مقابلہ میں جو میرے بھائی نے کیا) لہٰذا ان صورتوں میں آزردگی و ناراضگی ہر دو جانب حق ہو تو اجتماع نقیضین لازم آتا ہے اور اگر ایک طرف حق اور دوسری طرف باطل ہو تو طرف باطل کی عصمت درہم برہم ہوتی ہے اور یہ خلاف مفروض ہے۔ پس معلوم ہوا کہ معصوم کے ساتھ آزردگی دو قسم کی ہوتی ہے، ایک وہ جو عداوت، تعصب، عناد اور بغض پر مبنی ہو جیسے خوارج نواصب کی اہل بیت اور مسلمانوں سے، دوسری وہ کہ باقتضائے بشریت ہو یا کسی ایسی دلیل سے جسکا اس پر انکشاف ہو گیا ہو جیسے جناب سیدہ کی آزردگی جناب مرتضیٰ (رضی اللہ عنہما) سے یا حضرت موسیٰ کی کبیدگی حضرت ہارون علیہما السلام سے۔ یا جناب حسین کی جناب حسن (رضی اللہ عنہما) سے، اور ایسی آزردگی جو بتقاضائے بشریت ہو یا ظہور دلیل کے سبب ہو نہ فسق ہے، نہ موجب طعن کہ عصمت میں خلل پڑے، جب ایسی آزردگی سے عصمت معصوم میں کوئی خلل نہیں پڑتا تو عدالت و تقویٰ میں بدرجہ اولیٰ کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ اور ہم یہی بات ذہنوں میں بٹھانا چاہتے ہیں، فدک وغیرہ کے سلسلہ میں صحابہ کرام کو جناب مرتضیٰ و بی بی زہرا رضی اللہ عنہما سے جو آزردگیاں پیدا ہو گئی تھیں وہ اسی نوعیت کی تھیں، صاحب اظہار الحق اس جواب پر متنبہ ہو کر چپ نہ رہ سکا اور خود ہی ایک سوال قائم کر کے اس کے جواب کی فکر میں لگ گیا۔ لیکن جو سوال اس نے قائم کیا ہے اسکا وہ صحیح جواب دے ہی نہ پائے گا۔ اس نے سوال قائم کیا کہ ممکن ہے نیک لوگوں کی ایک جماعت ایک بات چاہیں یا کسی بات کو مسلمانوں کے مفاد میں دیکھیں مگر وہ بات اہل بیت کے لیے بے فائدہ اور فضول ہو اور وہ بتقاضائے بشریت اور اس سبب سے کہ یہ انسانی فطرت ہے کہ وہ اپنا مفاد پہلے دیکھتا ہے نیک لوگوں کی مخالفت کریں اور ان سے ناراضگی رکھیں اور اس کا اظہار بھی کریں اس لیے ہو سکتا ہے کہ اہل بیت کے کلام میں ناراضگی و ناخوشی ظاہر کرنے والی باتیں اسی وجہ سے ہوں اور اس طرف سے رنجش و عداوت مطلق نہ ہو۔

اس سوال کا بڑا طول طویل جواب بڑے گھما و پھراؤ سے دیا ہے، خلاصہ یہ ہے کہ آیت تطہیر کی رو سے جناب امیر معصوم ہیں، اور حقائق شرعیہ کو زیادہ جاننے والے تو آپکے لیے یہ کہاں زیبا ہے کہ حق کے خلاف نیکوں کی مخالفت کریں لہٰذا آپ کی کیفیت صحابہ کے ساتھ ایسی ہے جیسے نیکوں کی باہم ہوتی ہے،

مگر یہ جواب بھی بچند وجوہ پُر خلل ہے، اوّل، بی بی زہرا، جناب حسین رضی اللہ عنہما، اور حضرت آدم و حضرت موسیٰ علیہما السلام بھی معصوم ہی تھے، تو انکے لیے کب مناسب تھا کہ حق کے خلاف معصوموں کی مخالفت کریں اور اگر ہر دو طرف حق مانا جائے گا تو اجتماع ضدین لازم آئے گا یا یہ کہ ان میں سے ایک فریق معصوم نہ ہو،

دوسرے بعض اوقات متقابلہ "ٹھیک" اور "زیادہ ٹھیک" کا ہوتا ہے اور کبھی "ٹھیک" اور "غلط" کا جواز روئے دلیل مجتہد کے حق میں ٹھیک ہی کا درجہ رکھتا ہے اس طرح گویا کسی جانب سے بھی حق کے خلاف نہ ہوا،

مقدمہ (۹):۔ ہر عقلمند جب اپنی سمجھ بوجھ کا جائزہ لے اور دوسروں کے حالات و واقعات پر بھی نظر رکھے تو یہ بات یقیناً اس کی سمجھ میں آجائے گی کہ بسا اوقات خوفناک و ہولناک واقعات کے سبب یا الفت و عداوت کے باعث وہ مقررہ طے شدہ بلکہ بدیہی اصول بھی فراموش کر بیٹھتا ہے۔ یا ان کے خلاف کسی گفتگو یا عمل کا مرتکب

ہو جاتا ہے، اور بعض اوقات یہ غفلت و فراموشی طول بھی کھینچ جاتی ہے، اور بعض اوقات متنبہ ہو کر، صحیح معلومات کی طرف رجوع ہو جاتا ہے اور یہ غفلت و فراموشی بتقاضائے بشریت ہوتی ہے جس میں کسی کا کوئی استثنار نہیں نبی، غیر نبی، معصوم، غیر معصوم، ولی، غیر ولی، متقی، غیر متقی، سب اسمیں شامل و شریک ہیں اور اس نے سب کا احاطہ کر رکھا ہے، ہاں یہ ضرور ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو اس کیفیت میں زیادہ دیر نہیں رکھا جاتا فوراً متنبہ ہو جاتا ہے۔ دوسروں کیلئے ضروری نہیں ہے کہ جلد متنبہ ہو جائے قرآن و حدیث سے بے شمار دلیلیں اسکی ملتی ہیں،

اول:۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کوہ طور پر درخت سے اِنِّیْ اَنَا اللّٰہُ سن کر یقین ہو گیا تھا کہ یہ تجلی الٰہی ہے جو مصروف تکلم ہے، اور عصا ڈال دینے کا حکم دے رہی ہے ایسی صورت کا یہ تقاضا تھا کہ آپ کسی بھی مخلوق کا خوف و خطرہ اپنے دل میں نہ لائیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ قادر بھی ہے اور پورا پورا محافظ بھی مگر پھر بھی جب عصا سانپ کی صورت میں متحرک نظر آیا تو آپ ایسے ڈرے کہ بھاگ اٹھے اور مڑ کر بھی نہ دیکھا اسی وقت دوران کلام لَا تَخَفْ اِنِّیْ لَا یَخَافُ لَدَیَّ الْمُرْسَلُوْنَ (ڈرو نہیں میرے پاس رسول ڈرا نہیں کرتے) سے متنبہ ہوا،

دوسرے:۔ فرعون کے جادوگروں سے مقابلہ کے وقت وعدۂ الٰہی کے مطابق آپ کو پختہ یقین تھا کہ ان کے مقابلہ میں غلبہ مجھ ہی کو حاصل ہو گا، اسکے باوجود جب جادوگروں نے رسیوں اور لاٹھیوں کے سانپ بنا بنا کر میدان میں پھینکنے اور اپنے مخصوص نعرے لگانے اور شور مچانا شروع کیا تو اچانک آپکے دل میں خوف آ گھسا یہاں پھر آپ کو اس کیفیت سے نکالنے کیلئے فوری طور پر متنبہ ہوا، لَا تَخَفْ اِنَّکَ اَنْتَ الْاَعْلٰی (ڈرو نہیں تم ہی فتحمند رہو گے)

تیسرے:۔ کوہ طور سے واپسی پر قوم کو گئو سالہ پرستی میں مبتلا دیکھ کر اور حضرت ہارون علیہ السلام کی جانب سے عدم اطلاع پا کر آپ ایک دم مشتعل ہو گئے غصہ دماغ میں چڑھا تو یہ بھی خیال نہ رہا کہ ہارون تو پیغمبر ہیں معصوم ہیں پیغمبر و معصوم، شرک و بت پرستی پر کیسے راضی ہو سکتا ہے، عدم اطلاع کی کوئی وجہ ہی ہوگی،

چوتھے:۔ آپ نے خضر علیہ السلام سے عہد کیا کہ آپکے معاملہ میں مطلقاً دخل نہ دوں گا نہ آپکے اعمال کے اسباب آپ سے پوچھوں گا، لیکن جوں ہی آپ نے کوئی اچھنبے کی بات دیکھی تو عہد ذہن سے فراموش ہو گیا۔ اور حضرت خضر علیہ السلام کے فعل پر سخت نکتہ چینی کی اور بالآخر خضر علیہ السلام کی یاد دہانی پر متنبہ ہوئے،

پانچویں:۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام یہ جانتے تھے کہ قوم لوط کافر اور مستحق عذاب ہے نیز یہ اعتقاد بھی پختہ تھا کہ حکم الٰہی ٹالا نہیں جا سکتا، اسکے باوجود مجرموں کی پیروی میں استغاثہ لے کر بارگاہ الٰہی میں جا پہنچے۔

ارشاد خداوندی ہے،

فَلَمَّا ذَهَبَ عَنْ اِبْرَاهِيْمَ الرَّوْعُ وَجَآءَتْهُ الْبُشْرٰى يُجَادِلُنَا فِىْ قَوْمِ لُوْطٍ ؕ اِنَّ اِبْرَاهِيْمَ لَحَلِيْمٌ اَوَّاهٌ مُّنِيْبٌ۔ يَآ اِبْرَاهِيْمُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا ۚ اِنَّهٗ قَدْ جَآءَ اَمْرُ رَبِّكَ ۚ وَاِنَّهُمْ اٰتِيْهِمْ عَذَابٌ غَيْرُ مَرْدُوْدٍ۔

جب ابراہیم کا ڈر نکلا۔ اور خوشخبری سن لی تو وہ قوم لوط کے معاملہ میں ہم سے جھگڑنے لگے، ابراہیم بڑے بھلے خدا ترس اور خدا کی طرف رجوع کرنے والے ہیں۔ ہم نے کہہ دیا ابراہیم اس خیال سے درگذرو تمہارے رب کا فیصلہ ہو چکا یہ عذاب آ کر رہے گا اسے لوٹایا نہیں جا سکتا۔

www.Ahlehaq.com

چھٹے: ۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم مسجد میں معتکف تھے، عشا بعد جب سب نمازی جا چکے تو ام المؤمنین بی بی صفیہ رضی اللہ عنہا ملاقات کیلیے تشریف لائیں، بہت دیر تک بیٹھی رہیں جب واپسی کا ارادہ ہوا تو چونکہ رات خاصی گذر چکی تھی، اسلیے آنحضرت صلے اللہ علیہ ان کو گھر تک پہنچانے کیلیے مسجد سے باہر تشریف لائے، اثنائے راہ میں دو بڑے مخلص ایمان والے انصاری ملے جب انہوں نے حضور کو پہچان لیا اور یہ بھی دیکھ لیا کو ساتھ میں محترمہ بھی ہیں، تو راستہ سے ایک سمت سمٹ کر تیزی سے نکل جانا چاہا مگر حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے انکو روکا اور فرمایا یہ عورت میری بیوی صفیہ ہیں، انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! غلاموں کی یہ گستاخانہ جرأت کہاں کہ وہ آپکے متعلق کوئی غلط خیال کرتے۔ آپ نے فرمایا شیطان آدمی کا دشمن ہے، مجھے اندیشہ ہوا کہ شیطان تمہارے دلوں میں گمان بد اور خیال فاسد نہ ڈال دے،

اس سے معلوم ہوا کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا عصمت اعتقاد رکھتے ہوئے بھی یہ ممکن تھا کہ اس حالت کو دیکھتے ہوئے جو عام لوگوں کیلیے سبب تہمت ہوسکتی ہے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق بھی ایسی تہمت کا وہم کسی کے دل میں پیدا ہو جائے، اور یہ بات ایمان واعتقاد کے منافی نہیں،

ساتویں: ۔ امامیہ کی ساری کتب اخبار میں بحوالہ ابی حمزہ الثمالی علی بن حسین رحمۃ اللہ علیہ کی یہ روایت بیان کی ہے

قَالَ اَبُوْحَمْزَۃَ قَالَ لِیْ عَلِیُّ بْنُ الْحُسَیْنِ کُنْتُ مُتَّکِأً عَلَی الْحَائِطِ وَاَنَا حَزِیْنٌ مُتَفَکِّرٌ اِذْ دَخَلَ عَلَیَّ رَجُلٌ حَسَنُ الثِّیَابِ طَیِّبُ الرَّائِحَۃِ فَنَظَرَ فِیْ وَجْھِیْ ثُمَّ قَالَ مَا سَبَبُ حُزْنِکَ قُلْتُ اَتَخَوَّفُ مِنْ فِتْنَۃِ ابْنِ الزُّبَیْرِ قَالَ فَضَحِکَ ثُمَّ قَالَ یَا عَلِیُّ ھَلْ رَاَیْتَ اَحَدًا خَافَ اللّٰہَ فَلَمْ یُنْجِہٖ قُلْتُ لَا قَالَ یَا عَلِیُّ ھَلْ رَاَیْتَ اَحَدًا سَاَلَ اللّٰہَ فَلَمْ یُعْطِہٖ، قُلْتُ لَا ثُمَّ نَظَرْتُ فَلَمْ اَرَ قُدَّامِیْ اَحَدًا تَعَجَّبْتُ مِنْ ذٰلِکَ فَاِذَا الْقَائِلُ اَسْمَعُ صَوْتَہٗ وَلَا اَرٰی شَخْصَہٗ یَقُوْلُ یَا عَلِیُّ ھٰذَا الْخِضْرُ۔

حمزہ کہتا ہے مجھ سے علی بن حسین نے کہا میں دیوار سے ٹیک لگائے غمزدہ وفکر مند سا بیٹھا تھا کہ اچانک سی ایک خوش لباس وخوشبو میں بسا ہوا شخص میرے سامنے آکھڑا ہوا، اور میرے چہرہ پر نظر ڈال کر بولا تمہارے غم وفکر کی کیا وجہ ہے میں نے کہا میں فتنۂ ابن زبیر سے خوفزدہ ہوں یہ سنکر وہ شخص ہنسا اور پھر بولا اے علیؓ کیا تم نے کوئی آدمی ایسا دیکھا ہے جو اللہ تعؔ سے ڈرتا ہو اور اللہ تعالےٰ نے اسے نجات نہ دی ہو، میں نے کہا نہیں پھر وہ بولے کیا تم نے کوئی ایسا آدمی دیکھا ہے جس نے اللہ تعالیٰ سے کچھ مانگا ہو اور اللہ تعالیٰ نے اسے نہ دیا ہو، میں نے کہا نہیں۔ یہ کہکر میں سامنے نظر اٹھاتا ہوں، تو وہاں کوئی نہیں تھا، میں اس پر متعجب ہی تھا کہ یہ ماجرا کیا ہے کہ غیب سے میرے کانوں میں آواز آئی، میں آواز ہی سن سکتا تھا بولنے والے کو دیکھ نہیں سکتا تھا، اے علی یہ خضر تھے۔

اس قصہ میں جناب امام کو شدت خوف کے سبب ان دو باتوں سے غفلت ہوگئی جن سے ہر مومن آگاہ وباخبر ہوتا ہے اس لیے حضرت خضر علیہ السلام کے ذریعہ آپ کو متنبہ فرما کر یہ غفلت دور کردی گئی۔ لہذا اگر بعض صحابہ پر اہل بیت کی جانب سے یا اہل بیت پر بعض صحابہ (رضوان اللہ علیہم) کی طرف سے ایسے حالات طاری ہوجائیں اور وہ طول بھی کھینچ جائیں اور ایک دوسرے کے فضائل ومناقب سے بھی غفلت رہے تو اسمیں نہ تو تعجب کی کوئی بات ہے اور نہ ایسا ہونا دور از خیال بات ہے پھر یہ کیفیت محل طعن وتشنیع کیوں بنے،

مقدمہ (۱۰) :- یہ کہ فضیلت خاص اگر نہ ہو تو فضیلت عام کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے اور نہ اسکے تقاضوں اور حقوق سے چشم پوشی کرنی چاہیئے۔ اور یہ مقدمہ عقل و نقل دونوں سے ثابت ہے عقل سے تو اس طرح کہ یہ ظاہر ہے کہ خاص کے اٹھ جانے سے عام نہیں اٹھتا مثلاً انسان و حیوان کا انتفاء اور جب عام نہیں اٹھا یعنی اس کی نفی نہیں ہوئی تو اسکا اثبات اور وجود ہے اور جب وہ خود موجود ہے تو اس کے لوازم بھی موجود ہیں، تاکہ لزوم کے معنے صادق آسکیں اسی لیے یہ مقولہ ہے کہ جب کوئی شئی پائی گئی تو اسکے لوازم بھی پائے گئے۔

اور نقل سے ثبوت اس طرح ہے کہ اہل کتاب جو اہل ملت میں داخل ہیں بہت سے احکامات میں انکو غیر اہل کتاب پر ترجیح دی گئی ہے مثلاً ان کا ذبیحہ کھانے اور ان کی عورتوں سے نکاح کرتے ہیں۔ اسی نقطۂ نظر سے کہ گو فضیلت خاص یعنی محمد صلے اللہ علیہ وسلم پر ایمان ان میں موجود نہیں ہے، لیکن مطلق انبیاء پر ان کا ایمان ہے یہی صفت ان کو ایک ایسے شخص سے ممتاز کرتی ہے جو اس وصف سے عاری ہو یا مثلاً عرب کو بلحاظ کفو عجم پر ترجیح ہے کہ وہ اولاد اسمٰعیل ہیں، گو قریشی کفارت ان میں نہ ہو۔ اسی طرح قریش کو تمام عرب پر برتری دی گئی ہے گو وہ خمس لینے اور زکوۃ کے حرام ہونے میں ہاشمیوں کی طرح نہ ہوں اسی طرح اور بھی مثالیں ہو سکتی ہیں، غرض شریعت میں جا بجا اس مقدمہ کو ملحوظ رکھا گیا ہے طول کلام کا اندیشہ نہ ہوتا تو اس کی جزئیات بالتفصیل بھی بیان کی جاسکتی تھیں، فی الحال یہی کافی و وافی ہے، اس سے قطع نظر کہ اس مقدمہ کو عقل و نقل دونوں کی پشت پناہی حاصل ہے امامیہ فرقہ خود بھی اسے تسلیم کرتا ہے اس لیے کہ ان کے نزدیک اولاد علی ہونا ایسی فضیلت ہے، جو تمام علویوں میں مشترک اور باعث محبت ہے یہ بات انکی کتب میں صراحت کے ساتھ مسطور و موجود ہے، حالانکہ بعض علوی، ائمہ کی امامت کے منکر ہوئے پھر بھی وہ فضیلت عامہ یعنی علوی ہونے سے نہیں نکلتے خواہ ان میں فضیلت خاص یعنی اعتقاد امامت تمام ائمہ ہو یا نہ ہو،

اسی طرح محب علی ہونا، اور خود کو شیعۂ علی کہنا ان کے نزدیک ایسی خوبی ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے ائمہ کی امامت کے منکرین پر بھی بدگوئی، لعن طعن و طعن جائز نہیں۔ پہلی بات کا ثبوت تو یہ کہ جناب محمد بن الحنفیہ رحمۃ اللہ علیہ صاحبزادہ جناب امیر نے اپنی امامت کا دعویٰ کیا اور امام زین العابدین رحمۃ اللہ علیہ کی امامت کا انکار کیا اور ان کے ساتھ پرخاش رکھی حتی کہ حجر اسود سے فیصلہ کرانے کی نوبت آئی اور حجر اسود نے جناب زین العابدین رحمۃ اللہ علیہ کے حق میں گواہی دی مگر پھر بھی محمد بن الحنفیہ" آخر عمر تک اپنے دعویٰ سے دست بردار نہیں ہوئے، مختار ثقفی کو اپنا نائب مقرر کیا، کوفہ کے شیعوں کو اس کی اعانت و رفاقت کے لیے خطوط لکھے اور اسکو اہل شام سے لڑنے اور جناب حسین رضی اللہ عنہ کا بدلہ لینے کیلیے مقرر کیا، مختار نے بھی بعد فتح امرائے شام کے سروں کو فتحنامہ اور تیس ہزار دینار کے ساتھ محمد بن الحنفیہ" ہی کو بھیجا، جناب زین العابدین رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں نہیں اور رحلت کے وقت اپنے بیٹے ابو ہاشم کو امامت کی وصیت کی اب وہ اعتقاد جو شیعہ محمد بن الحنفیہ" اور ان کے بیٹے ابو ہاشم کے بارے میں رکھتے ہیں یا جو تعظیم و توقیر وہ ان کی کرتے ہیں وہ ان کی کتابوں خصوصاً مجالس المومنین میں دیکھنی چاہیئے۔

اور اسی طرح کا واقعہ جناب زید شہید رحمۃ اللہ علیہ کا ہے کہ انہوں نے بجائے کسی امام کی بیعت کرنے کے خود اپنی امامت کا دعویٰ کیا، اور تلوار لہرا کر اعلان کیا کہ اہل بیت میں امام وہی ہے جو مرد میدان ہو تلوار لے کر خروج کرے

Www.Ahlehaq.Com

جو پوشیدہ اور چھپا رہے وہ امام نہیں چنانچہ قاضی نور اللہ اور دوسرے شیعوں نے ابوبکر حضرمی کے حوالہ سے مجالس وغیرہ میں یہ باتیں بیان کی ہیں، اور اس دعویٰ وامامت کا سلسلہ آپ کی اولاد میں جاری رہا یحییٰ اور متوکل نے بھی خروج کیا اور امامت کا دعویٰ ان بزرگوں سے متعلق شیعی عقیدت و محبت کا احوال ان کی کتابوں میں مرقوم و محفوظ ہے یہ سب ان کو نیکی سے یاد کرتے اور واجب المحبت جانتے ہیں بلکہ جناب جعفر رحمۃ اللہ علیہ سے مناقب زید شہید رحمۃ اللہ علیہ میں نص صریح نقل کرتے ہیں کہ آپ نے ان کی شہادت کے بعد فرمایا۔ اللہ مجھے بھی ان کے خونوں میں حصہ دار بنائے، قسم بخدا زید میرے چچا ہیں وہ اور انکے ساتھی ایسے ہی شہید ہیں جیسے علی بن ابی طالب اور ان کے ساتھی" شیخ ابن بابویہ نے امالی میں فضیل بن یسار سے اسکی روایت کی ہے، اور قاضی نور اللہ نے بھی مجالس المومنین میں فضیل بن یسار کے حالات کے ذیل میں یہ روایت نقل کی ہے۔ اور یہ بات بھی اسی ذیل میں آتی ہے کہ جناب جعفر صادقؒ کے پانچوں لڑکے محمد، اسحاق، عبداللہ موسیٰ، اسمٰعیل، امامت کے سلسلہ میں باہم مخالفت رکھتے تھے۔

عبداللہ افطح، اسمعیل کے سگے بھائی ہیں انکی ماں فاطمہ بنت حسین بن حسین بن علی رحمہم اللہ تھیں، اسمٰعیل جناب جعفر کی اولاد میں سب سے بڑے تھے، وہ آپ کی زندگی ہی میں فوت ہوگئے تھے، اسمٰعیل کی وراثت کے سبب جناب جعفر رحمۃ اللہ علیہ کے بعد امامت کا دعویٰ انہوں نے یعنی عبداللہ افطح نے کیا اور دلیل میں جناب امام جعفرؒ کا یہ قول پیش کیا کہ ان ھذا الامر فی الاکبر ما لم یکن فیہ عاھۃ، (امامت بڑے ہی میں رہے گی تاآنکہ اس میں کوئی خرابی نہ ہو) جناب جعفرؒ کو غسل بھی انہوں نے دیا نماز جنازہ بھی پڑھائی قبر میں بھی انہی نے اتارا انگوٹھی بھی انہوں نے لی، امام وصی نے امانتیں بھی انہیں کے سپرد کیں،

ادھر محمد نے بھی امامت کا دعویٰ کیا ان کی سند یہ تھی کہ جناب محمد باقر نے جناب صادق (رحمہما اللہ) سے فرمایا تھا کہ تمہارے گھر میں میرے بعد ایک لڑکا پیدا ہوگا جس کا نام تم محمد رکھوگے۔ وہ امام ہوگا۔

اسمٰعیلیہ، اسماعیل کو امام مانتے ہیں تو اسحاقیہ اسحٰق کو، اور موسویہ امام موسیٰ کاظم کو امام تسلیم کرتے ہیں، امام علی رضا کے بعد امام محمد نقی بچے اور حالات سے بے خبر تھے اکثر شیعہ ان کی امامت کے منکر ہیں، امام نقی کے بعد موسیٰ بن محمد نے بھی امامت کا دعویٰ کیا ایک جماعت ان کی پیرو ہولی، جناب امام علی تقی کے بعد جعفر بن علی نے امامت کا دعویٰ کیا مگر امام حسن عسکری کی امامت کے قائل تھے ان کا حمار یہ لقب رکھا، جب امام حسن عسکری نے وفات پائی تو جعفر نے اپنے دعویٰ میں قوت حاصل کرلی اور کہا کہ حسن بن علی نے کوئی جانشین نہیں چھوڑا امام کے لیے شرط یہ ہے کہ وہ کوئی خلف وجانشین رکھتا ہو، لہٰذا امام حسن کے ماننے والے بہت سے لوگوں نے جعفر کی طرف رجوع کرلیا، ان میں سے ایک شخص حسن بن علی بن فضال تھے، یہ شخص شیعوں کے مجتہدین، محدثین و معتبرین میں سے تھا،

جعفر بن علی کے بعد ان کا لڑکا علی بن جعفر اور ان کی لڑکی فاطمہ جعفر نے شرکت میں امامت کا دعویٰ کیا اور جو امام حسن عسکری کی امامت کے معتقد تھے وہ بھی گیارہ فرقوں میں بٹ گئے،

مقصد کلام یہ کہ ان حضرات کی آپس کی مخالفتیں اور ایک دوسرے کی امامت کا انکار کوئی راز سربستہ قسم کی چیز نہیں تھی، بلکہ سلجھے کی ہانڈی کی طرح علی الاعلان پھوٹی جا رہی تھی جلوتی اور خلوتی سارے ہی راز ہائے

درون پردہ سے آگاہ ہو چکے تھے، خصوصاً امام حسن عسکری اور جعفر بن علی کے درمیان تو طعن بازی، فسق اور ارتکاب کبائر تک کے الزامات کی نوبت پہنچ گئی تھی شیعہ اسے خوب جانتے ہیں،

خاتمہ کلام کے طور پر کہنے کی بات صرف اتنی ہے کہ ان ساری مخالفتوں عداوتوں اور تو تو میں میں کے باوجود ان بزرگوں کو اولاد علی ہونے کی نسبت حاصل ہے اس لیے ان کی ساری خامیاں، اپنی جگہ مگر یہ ان سب کے نزدیک مقبول اور واجب التعظیم والمحبت ہیں، اور ان کی شکر رنجیاں اور عداوتیں، مخالفتیں وغیرہ سب لائق اغماض و چشم پوشی ہیں

اب دوسری بات۔ محب علی یا شیعہ علی کی طرف آئیے۔ سب کو معلوم ہے کہ مختار امامت زین العابدین کا منکر تھا، نہ صرف منکر بلکہ معاند بھی، کہ آپ کے ایک صلبی بیٹے عبداللہ کو اس نے کوفہ میں قتل کر دیا اس کے علاوہ بھی بہت سی قبیح اور ناشائستہ حرکات اس سے سرزد ہوتی رہیں ان سب باتوں کے ہوتے ہوئے قاضی نور اللہ نے مختار ثقفی کے حالات میں لکھا ہے کہ اس کی حسن عقیدت میں کسی شیعہ کو کوئی کلام نہیں ہے، زیادہ سے زیادہ جب اس کے اعمال پر لوگوں کو اس پر اعتراض ہوا تو وہ اس پر سب و شتم کرنے لگے، امام باقر کو جب علم ہوا تو آپ نے شیعوں کو اس سے روکا کہ اس پر لعن طعن نہ کی جائے وہ تو ہمارا بہت بڑا محسن ہے، اس نے ہمیں مارنے والوں کو مارا، ہم کو اموال بھیجے اور دولت دی، (انتہی کلامہ)

تو گویا جس نے اپنے اوپر شیعہ علی کا لیبل چسپاں کر لیا، اب اسکے لیے دنیا بھر کی ساری خباثتیں حلال ہو گئیں۔ آپ سے نسبت پیدا کر لینے کے بعد اسکے ساتھ برائی سے پیش آنا حرام ہے، اور اثنا عشریوں کے ہاں چونکہ بنی فضال اور دوسرے واقفیہ، ناؤسیہ کی روایات مقبول ہیں ان پر بھی لعن طعن جائز نہیں کیونکہ آخر وہ محب علی تھے اور خود کو شیعہ علی کہتے تھے، کیا ہوا جو بہت سے ائمہ کی امامت کو ٹھکراتے اور انکار کرتے تھے،

جب یہ مقدمہ ہر پہلو سے ثابت ہو گیا اور کسی کے لیے انکار کی گنجائش نہ رہی تو اب اہل سنت کہتے ہیں کہ علی کی جگہ محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) کو فرض کرنا چاہیئے، اور آپ کی محبت اور آپ پر ایمان کو علی کی محبت اور علی کی امامت کے اعتقاد کی جگہ جاننا چاہیئے، اور اقارب و ازواج و اصحاب محمد صلے اللہ علیہ وسلم کو مہاجرین و انصار میں سے بجائے اولاد علی فرض کرنا چاہیئے اور ان لوگوں کو جنہوں نے محمد صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محبت رکھنے کا دعوی کیا ان پر ایمان رکھا محمد صلے اللہ علیہ وسلم کے دشمنوں کے ساتھ جہاد کیا، ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن اور آپ کے خاندان کی خدمات بجا لائے اگرچہ ان سے انکار، قدر ناشناسی، اور اعمال قبیحہ کا صدور ہوا ان کو بجائے مختار و بنی فضال کے سمجھنا چاہیئے۔ اور ان میں آپس میں موازنہ کرنا چاہیئے،

اب جو یہ کہتا ہے کہ محبت علی اور شیعیت علی یہ تاثیر رکھتی ہے کہ وہ اس کا دعوی کرکے بے شک ائمہ کی امامت کا انکار کرے ان کی شان میں بدگوئی کرے ان سے پرخاش رکھے مگر یہ تعلق اسے یہ تحفظ فراہم کرتا ہے کہ وہ لوگوں کے لعن طعن سے محفوظ رہتا ہے۔ وہ یہ بتائے کہ محمد صلے اللہ علیہ وسلم سے محبت اور آپ کی امت میں خود کو شمار کرنا اتنی تاثیر کیوں نہیں رکھتا کہ علی کی امامت کے انکار کے بعد وہ شیعوں کے لعن وطعن سے محفوظ رہ سکے،

ہم کہتے ہیں یہ امر دو حال سے خالی نہیں۔ کہ یا تو محمد صلے اللہ علیہ وسلم کا درجہ جناب علی رضی اللہ عنہ کے درجہ سے، (العیاذ باللہ) گھٹیا ہے، یا علی کا درجہ (خدانخواستہ) محمد صلے اللہ علیہ وسلم کے درجہ سے بڑھیا ہے اور یہ دونوں

www.Ahlehaq.com

www.Ahlehaq.com

صورتیں شیعوں کے نزدیک غلط و باطل ہیں بلکہ ان کے نزدیک محمد صلی اللہ علیہ وسلم و علیؓ باعتبار درجہ برابر و مساوی ہیں، جیسا کہ باب نبوت میں گذر چکا ہے اور محمد صلے اللہ علیہ وسلم کے منصب نبوت کی بلندی جناب علی رضی اللہ عنہ کی امامت کے منصب پر اس مساوات کے علاوہ ہے، اسی لیے تمام کتب شیعہ میں امامت کو نیابت نبی کہا گیا ہے،

جب یہ دس مقدمات ذہن نشیں ہو گئے تو اب ان سے نتیجہ نکال لیجئے اللہ تعالےٰ مقاصد و مبادی تک پہنچنے کی ہدایت اور توفیق مرحمت فرمائے،

منصف کا حرف آخر

اپنے موضوع کی عجیب تر کتاب "تحفہ اثنا عشریہ" بارھویں صدی ہجری کے بعد زیب تحریر سے مزین ہو کر نقش اختتام سے آراستہ ہوا خدا کا شکر و احسان ہے کہ اس کی ابتدا میں جس بات کی طرف اشارہ کیا گیا تھا اسی شرط کے تحت انجام تک پہنچا،

حضرت باری عز و جل اسمہ کے فضل عمیم سے امید ہے کہ اس تحفہ کو اپنی بارگاہ میں مقبولیت کا درجہ عطا فرما کر تمام مومن مرد و عورت کو اس سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کا موقع عطا فرمائیں گے، اور اپنے انتہائی کرم و فضل جود و احسان کے طفیل راقم کتاب کو بھی اجر نیک اور ثواب عظیم عطا فرمائیں گے۔ جناب باری میں انتہائی الحاح، عاجزی اور زاری سے ملتجی ہوں کہ زبان و قلم کی لغزش سے اثنائے تقریر و تحریر میں اپنی یا اپنے دوستوں کی مرضی کے خلاف اس کتاب میں کوئی بات درج یا سرزد ہو گئی ہو تو محض اپنی بے پناہ عنایت و مہربانی سے اسے معاف فرما کر درگذر فرمائیے اور دنیا و آخرت میں اسکے مواخذہ سے نجات بخشئے۔ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا إِنْ نَسِينَا أَوْ أَخْطَأْنَا، رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا إِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهُ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِنَا، رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهِ، وَاعْفُ عَنَّا، وَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا أَنْتَ مَوْلَانَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ وَصَلَّى اللّٰهُ عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهِ مُحَمَّدٍ وَّآلِهِ وَأَصْحَابِهِ أَجْمَعِينَ بِرَحْمَتِكَ يَا أَرْحَمَ الرَّاحِمِينَ وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ۔

تَمَّتْ بِالْخَيْر

خلیل الرحمان نعمانی مظاہری

۲۹ رمضان المبارک ۱۴۰۲ھ
۲۱ جولائی ۱۹۸۲ء چہارشنبہ،

کتبِ تصوّف وسُلوک

		قیمت
احیاء العلوم کا اردو ترجمہ مذاق العارفین حجۃ الاسلام امام غزالیؒ	احیاء علوم الدین امام غزالیؒ کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ تصوفؒ سلوک اور اسلامی فلسفے کی زندہ جاوید کتاب۔ ترجمہ: مولانا محمد احسن نانوتوی (چار جلد کامل) مجلد اعلیٰ	
کیمیائے سعادت کا اردو ترجمہ اکسیر ھدایت حجۃ الاسلام امام غزالیؒ	اسرار تصوف تزکیۂ نفس اور اصلاح ظاہر و باطن میں بے نظیر کتاب کا نہایت مستند اردو ترجمہ۔ کتابت، طباعت اعلیٰ، مضبوط و حسین جلد	
مجموعۂ رسائل امام غزالیؒ اردو ۳ جلد	اس مجموعے میں تصوف، عقائد، کلام اور فلسفہ پر امام غزالیؒ کی ۱۲ وہ مستقل کتابیں شامل ہیں جو عرصے سے نایاب تھیں۔	
مکاشفۃ القلوب	تصوف کی مشہور کتاب	
بیاض یعقوبی مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ	مولانا کی قلمی بیاض جس میں تصوف و سلوک کے مسائل کے علاوہ عملیات، وظائف، تعویذات اور طبی نسخہ جات درج ہیں۔ مجلد	
تربیت السالک حکیم الامت مولانا اشرف علی	اصلاح ظاہر و باطن اور تزکیۂ نفس اور راہ طریقت کی مشکلات کا حل اور روحانی علاج کی قرابادین۔ تین جلد کامل	
حجۃ اللہ البالغہ (اردو) شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ	اسلامی شریعت کے حقائق و اسرار اور تمام علوم اسلامی پر محققانہ کتاب کا مستند اردو ترجمہ۔ مجلد اعلیٰ	
مجالس الابرار شیخ احمد رومی	وعظ و تقریر اور نصیحت میں بلند پایہ کتاب جس میں احادیث سے شرک و بدعت کا رد اور صوفیائے متقدمین کے حالات ہیں۔ مجلد	
مجالسِ حکیم الامت	مولانا تھانویؒ کے ملفوظات جمع کردہ مفتی محمد شفیع	
کلیاتِ امدادیہ	حضرت حاجی امداد اللہؒ کی جملہ دس تصانیف کا مجموعہ مجلد	
شریعت وطریقت کا تلازم	اس موضوع پر بہترین کتاب۔ شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب	
نور الصدور فی شرح القبور	امام جلال الدین سیوطی کی کتاب کا ترجمہ۔ مولانا محمد عیسیٰؒ	
تعلیم الدین مدلل	حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی (تصوف و اخلاق)	
فیوض یزدانی	شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے مواعظ کا عام فہم ترجمہ۔ ترجمہ مولانا عاشق الٰہی میرٹھی	
غنیۃ الطالبین	شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی عقائد اسلام و تصوف پر بے نظیر کتاب۔ ترجمہ عبدالدائم جلالی	

فہرست کتب مفت ڈاک کے ٹکٹ بھیج کر طلب فرمائیں

دارالاشاعت اردو بازار کراچی

Www.Ahlehaq.Com

Www.Ahlehaq.com

کتاب عقائد و مناظرہ وغیرہ

اختلاف امت اور صراط مستقیم	گروہی اختلافات کی حقیقت اور اس میں اعتدال کا طریقہ	مولانا محمد یوسف صاحب
آیات بینات	تردید شیعہ میں بے نظیر کتاب۔	محسن الملک محمد مہدی خاں
ایرانی انقلاب	امام خمینی اور شیعیت	مولانا محمد منظور نعمانی
المہند علی المفند	عقائد علمائے اہل سنت	مولانا خلیل احمد صاحب
براہین قاطعہ	جواب انوار ساطعہ (مجلد)	مولانا خلیل احمد محدث
بریلوی علماء ومشائخ	کے لئے لمحۂ فکریہ	مولانا محمد عاشق الٰہی مہاجر مدنی
تقویۃ الایمان کلاں	شرک و بدعات کی رد میں مشہور کتاب	شاہ اسماعیل شہیدؒ
تقویۃ الایمان	توحید و سنت کے احیاء اور شرک و بدعت کا رد	شاہ اسماعیل شہیدؒ
تاریخ میلاد	مروجہ میلاد و قیام کی مفصل تاریخ	مولانا عبد الشکور مرزا پوری
تحفۂ اثنا عشریہ	(جدید ترجمہ) تردید شیعہ میں لاجواب کتاب۔	شاہ عبد العزیز دہلوی (مجلد)
تاریخ مذہب شیعہ	یعنی فتنۂ ابن سبا اور شیعہ مذہب کی تاریخ۔	مولانا عبد الشکور لکھنوی
تصفیۃ العقائد	دینی مسائل و عقائد اسلام پر سرسید احمد خاں سے مراسلت۔	مولانا محمد قاسم نانوتوی
تحذیر الناس	ختم نبوت اور فضائل محمدیہ	مولانا محمد قاسمؒ نانوتوی
حجۃ الاسلام	حقانیت اسلام	مولانا محمد قاسمؒ نانوتوی
دھماکہ	بریلوی کتاب زلزلہ کا جواب	انجمن خدام التوحید برمنگھم
شریعت یا جہالت	شرک و بدعات اور رسوم کا رد اور دعوت حق	محمد یاسین حقانی
عقائد علمائے دیوبند	احمد رضا خاں کی کتاب حسام الحرمین کے تین جوابوں کا مجموعہ	مولانا منظور نعمانی
عیسائیت کیا ہے؟	عیسائیت اور اس کے بانی کی تاریخ	مولانا محمد تقی عثمانی
قادیانی چہرہ	خود اپنے آئینے میں	مولانا محمد عاشق الٰہی مہاجر مدنیؒ
مسلک علمائے دیوبند	دیوبندی ہی اہل سنت ہیں	مولانا قاری محمد طیبؒ
مودودی صاحب	کی تحریرات کے متعلق مضامین	از علمائے دیوبند
مباحثہ شاہجہانپور	ہندوؤں اور عیسائیوں کے ساتھ مشہور مباحثہ	مولانا محمد قاسم نانوتویؒ
میلہ خدا شناسی	مشہور میلہ خدا شناسی کا آنکھوں دیکھا حال	مولانا محمد قاسم نانوتویؒ
ہدایۃ الشیعہ	علمائے شیعہ کے دس سوالوں کا مفصل جواب	مولانا رشید احمد گنگوہیؒ

فہرست کتب مفت ڈاک کے ٹکٹ بھیج کر طلب فرمائیے

ملنے کا پتہ: دار الاشاعت اردو بازار کراچی فون ۲۱۳۷۶۸